یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ھیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ھیں.

منجانب .

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

Knowledge for All

SABIL-E-SAKINA

یا عباسؑ

۷۸۶

۹۲-۱۱۰

یا صاحب الزماں ادرکنیؑ

DvD Version

لبیک یا حسینؑ

خصوصی تعاون: نذر عباس
رضوان رضوی

اسلامی کُتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری ۔

www.ziaraat.com

SABIL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.page.tl
sabeelesakina@gmail.com

NOT FOR COMMERCIAL

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ھیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ھیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

اثرِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد ۱۳

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

مِصباحُ القُرآن ٹرسٹ

پیشکش: حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر لاہور

حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب ـــــــ تفسیر نمونہ

جلد ـــــــ ۱۳

زیرِ نظر ـــــــ آیت اللہ العظمٰی ناصر مکارم شیرازی

مترجم ـــــــ حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی

ناشر ـــــــ مصباح القرآن ٹرسٹ۔ ۱۰ رگنگارام بلڈنگ
شاہراہِ قائدِاعظم، لاہور

مطبع ـــــــ معراج دین پرنٹرز، لاہور

تاریخ اشاعت ـــــــ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ

ہدیہ ـــــــ 200/=

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر

۲۴، الفضل مارکیٹ اُردو بازار، لاہور

فون: ۷۲۲۴۲۲۳-۷۳۱۴۳۱۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَرضِ ناشر

قارئین محترم! السّلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ ــــ کلامِ حکیم اور عہدِ حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغازِ کار میں موجودہ دور کی شہرہ آفاق تفسیر ــــ تفسیر نمونہ ــــ کو فارسی سے اُردو زبان میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر محسنِ ملت حضرت علامہ سیّد صفدر حسین نجفی قبلہ اعلی اللہ مقامہ، کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونین کی فراخدلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ستائیس جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکراً للہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کُتب کے علاوہ سیّد العلماء السید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ، کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اُردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیرِ موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی "پیامِ قرآن" از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور "قرآن کا دائمی منشور" از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل یک جلدی قرآنِ پاک عہدِ حاضر کے مقبول اُردو تراجم کے ساتھ زیرِ طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں روشن فکر اور جید عالمِ دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہ، کا ترجمہ "انوار القرآن" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری اُمتِ مُسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے لہٰذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہل علم کی تجویز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ ستائیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتّب کر کے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پیدا کی جاسکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیبِ نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں مکمل ہو جائیں لیکن اس میں یہ سُقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سُورتوں کا کچھ حصّہ ایک جلد میں اور بقایا حصّہ اس سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت سے بچانے کی خاطر اس تفسیر کو سُورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سُورت دو حصّوں میں تقسیم نہیں ہونے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سُورت کی کامل تفسیر پر ختم ہو گئی۔ اس طرح پُوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں آگئی ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۳ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں سابقہ جلد ۲۲ میں سے صفحہ ۳۴۹ تا ۴۷۸، جلد ۲۳ مکمّل اور جلد ۲۴ میں سے صفحہ ۲۷ تا ۱۹۲ شامل کیے گئے ہیں، چنانچہ یہ جلد سُورہ طور، سُورہ نجم، سُورہ قمر، سُورہ رحمٰن، سُورہ واقعہ، سُورہ حدید، سُورہ مجادلہ، سُورہ حشر، سُورہ ممتحنہ، سُورہ صف، سُورۂ جمعہ، سُورہ منافقون اور سُورۂ تغابن کی تفسیر کا مجموعہ ہے۔

ہم نے زیرِ نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی آرا ہمارے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیّر مردِ مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہارِ تشکّر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ بحق معصومینؑ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسّلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اِھدٰاء

"مرکز مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش
تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا
چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم

یہ تفسیر

حسب ذیل علما و مجتہدین کی باہمی کاوش قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبد اللہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

◎

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے:

①	تفسیر مجمع البیان	تصنیف	مشہور مفسّر علامہ طبرسی
②	تفسیر تبیان	تصنیف	دانشمند فقید بزرگ شیخ طوسی
③	تفسیر المیزان	تصنیف	علاّمہ طبا طبائی
④	تفسیر صافی	تصنیف	علاّمہ محسن فیض کاشانی
⑤	تفسیر نور الثقلین	تصنیف	مرحوم عبدعلی بن جمعۃ الحویزی
⑥	تفسیر برہان	تصنیف	مرحوم سیّد ہاشم بحرینی
⑦	تفسیر رُوح المعانی	تصنیف	علاّمہ شہابُ الدین محمود آلوسی
⑧	تفسیر المنار	تصنیف	محمّد رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمّد عبدہٗ
⑨	تفسیر فی ظلال القرآن	تصنیف	سیّد قطب مصری
⑩	تفسیر قرطبی	تصنیف	محمّد بن احمد انصاری قرطبی
⑪	اسباب النزول	تصنیف	واحدی (ابوالحسن علی بن متویہ نیشاپوری)
⑫	تفسیر مراغی	تصنیف	احمد مصطفٰے مراغی
⑬	تفسیر مفاتیح الغیب	تصنیف	فخر رازی
⑭	تفسیر رُوح الجنان	تصنیف	ابوالفتوح رازی

گذارش

تفسیرِ نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اُردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ محسنِ ملّت حضرت علاّمہ سیّد صفدر حسین نجفی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوندِ کریم مولانا مرحوم کو جوارِ معصومینؑ میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

اس تفسیر میں مدِّ نظر اہداف

پوری دُنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان بھی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں، جن میں سے ایک "ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دُنیا کے مختلف خطّوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

باالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمۂ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکارِ علماً میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققینِ اسلام کی محنتوں اور حاصلِ فکر سے استفادہ کر کے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گرہیں کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسّر....؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسّر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسّر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوتے یا جان بُوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسّرین اور عالی قدر محققین اسلام نے آغازِ اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پَرتو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعیھم)۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتبِ فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے وسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریاتِ زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دَور کی تفاسیر کو دینا ہو گا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناقابلِ ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کر سکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیشِ نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہٰذا مَیں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمقدم اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہو سکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شاملِ حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی دس جلدیں جو اس وقت تک منظرِ عام پر آ چکی ہیں (اور یہ اس کی گیارہویں ہے) بار ہا چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیقِ الٰہی کا مَیں از حد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بات مَیں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بارہا یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہو گی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہو گی [1]

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرضِ خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلاوطنی [2] کے مقام پر، حتیٰ کہ بسترِ بیماری پر بھی مَیں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس طرح سے کام کرنا چاہیئے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

---

[1] بعد میں یہ اندازہ کم ثابت ہوا اور کل جلدوں کی تعداد ستائیس تک جا پہنچی (مترجم)

[2] سابق شاہ ایران معدوم کے دَور میں مؤلف کو جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

اس میں ہم آہنگی نہیں ہوگی ۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا۔ لیکن پھر اس صورتِ حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں ۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں ۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو ۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں ۔ (یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے) ۔

خداوندا !

ہماری آنکھوں کو بینا، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب، کارساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں ۔

خداوندا !

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنانِ اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے، اس امتِ اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کر دے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگا لیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں ۔

بارالٰہا !

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں ۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یکجا مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں ۔

اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے) ۔

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ قم ۔ ایران
ذوالحجہ ۱۴۰۱ ہجری قمری

تفسیر نمونہ جلد ۱۳

فہرست

سُورۂ طُور

سُورہ طور کے مطالب	۲۷
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	۲۸
آیت ۱ تا ۸	۲۸
بھڑکتے ہوئے سمندر کی قسم	۳۰
آیت ۹ تا ۱۶	۳۱
تمہاری جزا صرف تمہارے اعمال ہیں	۳۵
چند نکات	۳۶
۱۔ مجرموں کو دوزخ میں کس طرح لے جائیں گے۔	۳۸
۲۔ وہ لوگ جو باطل باتوں میں غوطہ زن ہیں	۳۹
آیت ۱۷ تا ۲۱	۴۰
ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروی ہے۔	۴۱
آیت ۲۲ تا ۲۸	۴۷
ہم اس دن خوف زدہ تھے اور آج انتہائی امن میں ہیں۔	۴۸
چند قابلِ توجہ نکات	۵۱
آیت ۲۹ تا ۳۴	۵۳
شانِ نزول	۵۴
اگر سچ کہتے ہیں تو اس کے مانند کلام لے آئیں۔	۵۴
آیت ۳۵ تا ۴۳	۶۰
سچ سچ بتاؤ تمہاری صحیح بات کون سی ہے؟	۶۱
آیت ۴۵ تا ۴۹	۶۸
تو ہماری مکمل حفاظت میں ہے	۶۹

سُورۂ النجم

سُورہ النجم کے مطالب و مضامین	۷۴
اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت	۷۵
آیت ۱ تا ۴	۷۶
تفسیر	۷۸
آیت ۵ تا ۱۲	۷۸
دوست کا پہلا دیدار	۸۳
آیت ۱۳ تا ۱۸	۸۴
دوسرا دیدار	۹۱
چند نکات	۹۲

۱۔ معراج ایک مسلّمہ حقیقت ہے	۹۵
۲۔ معراج کا مقصد	۹۶
۳۔ معراج اور بہشت	۹۶
۴۔ معراج اسلامی روایات میں	۹۶
۵۔ معراج کی رات خدا کی پیغمبر سے باتوں کا ایک گوشہ	۹۹
آیت ۱۹ تا ۲۳	۱۰۴
تفسیر	۱۰۵
چند نکات	
۱۔ عربوں کے تین مشہور بُت	۱۰۷
۲۔ اسمهای بے مسمّٰی	۱۰۸
۳۔ بُت پرستی کا نفسیاتی اور فکری سرچشمہ	۱۰۹
۴۔ پھر بھی "غرانیق" کا افسانہ	۱۰۹
آیت ۲۴ تا ۲۶	۱۱۱
شفاعت بھی اسی کے اذن سے ہوگی	۱۱۱
چند نکات	
۱۔ آرزوؤں کے دامن کا پھیلاؤ	۱۱۳
۲۔ شفاعت کے بارے میں گفتگو	۱۱۴
آیت ۲۷ تا ۳۰	۱۱۵
ظن وگمان ہرگز کسی کو حق تک نہیں پہنچاتے	۱۱۶
ایک نکتہ	
دنیا پرستوں کا سرمایہ	۱۱۹
آیت ۳۱، ۳۲	۱۲۰
خودستائی نہ کرو، وہ تمہیں پہچانتا ہے	۱۲۱
چند نکات	
۱۔ خدا کا علم بے پایاں ہے	۱۲۴
۲۔ کبائر الاثم کیا ہے؟	۱۲۴
۳۔ خودستائی اور تزکیہ نفس	۱۲۵
آیت ۳۳ تا ۴۱	۱۲۸
شان نزول	۱۲۹
ہر شخص اپنے اعمال کا ذمّہ دار ہے	۱۳۰
چند نکات	
۱۔ تین اہم اسلامی اصول	۱۳۳
۲۔ آیت کے مفاد سے سوء استفادہ	۱۳۴
۳۔ چند سوالات کا جواب	۱۳۴
۴۔ صحفِ ابراہیمؑ وموسیٰؑ	۱۳۵
۵۔ گذشتہ کُتب میں اعمال کے مقابلہ میں اصل مسئولیت	۱۳۶
آیت ۴۲ تا ۴۹	۱۳۷
تمام خطوط اسی تک پہنچتے ہیں	۱۳۸
چند نکات	
۱۔ یہ سب سروصدا اسی کی طرف سے ہے۔	۱۴۱
۲۔ ستارہ شعریٰ کے عجائبات	۱۴۲
۳۔ پیغمبرؐ کی ایک پُرمعنی حدیث	۱۴۳
آیت ۵۰ تا ۵۵	۱۴۵
کیا یہ سب درسِ عبرت کافی نہیں ہیں؟	۱۴۶
آیت ۵۶ تا ۶۲	۱۴۹

سب اس کے لیے سجدہ کرو ۱۵۰

سُورہ قمر ۱۵۴

سُورہ قمر کے مضامین ۱۵۵
فضیلت سُورہ قمر ۱۵۶
آیت ۱ تا ۳ ۱۵۷
چاند شق ہو گیا ۱۵۷
چند نکات ۱۶۰
۱۔ شق القمر، پیغمبر اسلامؐ کا ایک عظیم معجزہ۔ ۱۶۰
۲۔ "شق القمر" موجودہ زمانے کے علوم کے لحاظ سے۔ ۱۶۰
(الف) نظامِ شمسی کی تخلیق ۱۶۱
(ب) بڑے شہاب ۱۶۱
(ج) آسمانی کُرّوں کے انشقاق کا ایک دوسرا نمونہ۔ ۱۶۱
(د) آسمانی کُروں کے پھٹنے کا ایک اور نمونہ ۱۶۲
۳۔ "شق القمر" تاریخی اعتبار سے ۱۶۲
اس عظیم معجزہ کے وقوع کی تاریخ ۱۶۳
آیت ۴ تا ۸ ۱۶۵
وہ دن کہ جب سب قبروں سے باہر نکلیں گے۔ ۱۶۶
ایک نکتہ
قیامت کا دن کیوں بہت سخت ہے ۱۶۸
آیت ۹ تا ۱۷ ۱۷۰
قومِ نوحؑ کا ماجرہ درسِ عبرت تھا ۱۷۱
آیت ۱۸ تا ۲۲
اور اسی طرح قومِ عاد کی سرگزشت ۱۷۶
ایک نکتہ
نیک اور بد دن ۱۷۸
آیت ۲۳ تا ۳۲ ۱۸۲
قومِ ثمود کا دردناک انجام ۱۸۴
آیت ۳۳ تا ۴۰ ۱۸۹
قومِ لوط زیادہ منحوس صورتِ حال سے دوچار ہوئی۔ ۱۹۰
آیت ۴۱ تا ۴۶ ۱۹۴
کیا تم گزشتہ اقوام سے افضل و برتر ہو۔ ۱۹۵
ایک نکتہ
ایک واضح اور معجزہ کی کیفیت رکھنے والی پیش گوئی ۱۹۸
آیت ۴۷ تا ۵۵ ۱۹۹
مقامِ صدق میں خداوند مقتدر کے پاس ۲۰۰
چند ایک نکات
۱۔ اس جہان کی تمام چیزیں حساب و کتاب کی تابع ہیں ۲۰۳
۲۔ تقدیرِ الٰہی اور اس کے ارادہ کی آزادی۔ ۲۰۴

۳۔ خدا کا فرمان صرف ایک ہی کلمہ ہے ۲۰۶
۴۔ سُورہ قمر کا آغاز و اختتام ۲۰۶

سُورہ رحمٰن ۲۰۸

سُورہ رحمٰن کا مضمون ۲۰۹
سُورہ رحمٰن کی تلاوت کی فضیلت ۲۱۱
آیت ۱ تا ۶ ۲۱۲
خدا کی نعمتوں کا آغاز ۲۱۳
ایک نکتہ
چند روایات پر ایک نظر ۲۱۷
آیت ۷ تا ۱۳ ۲۱۸
آسمان کو بلند کیا اور ہر چیز کے لیے میزان قرار دی۔ ۲۱۹
چند نکات
۱۔ نعمتوں کی شناخت خدا کی معرفت کا زینہ ہے۔ ۲۲۳
۲۔ زندگی میں نظم و حساب کا مسئلہ ۲۲۳
آیت ۱۴ تا ۱۸ ۲۲۵
انسان کی خلقت ٹھیکری جیسی خاک سے ہوئی ہے۔ ۲۲۵
آیت ۱۹ تا ۲۵ ۲۲۹
سمندر اپنے گراں بہا ذخائر کے ساتھ ۲۳۰
چند نکات
۱۔ سمندر خدا کی نعمتوں کا مرکز ۲۳۳
۲۔ گلف سٹریم، بڑے بڑے سمندری دریا اور نہریں ۲۳۴
۳۔ بطون آیات میں سے ایک تفسیر ۲۳۵
آیت ۲۶ تا ۳۰ ۲۳۶
ہم سب فانی ہیں اور بقاء صرف تیرے لیے ہے۔ ۲۳۷
چند نکات
۱۔ فنا کی کیا حقیقت ہے؟ ۲۳۹
۲۔ وہ ہر روز ایک نئی چیز کی تخلیق کرتا ہے۔ ۲۴۰
۳۔ حرکتِ جوہری ۲۴۱
آیت ۳۱ تا ۳۶ ۲۴۳
اگر قدرت رکھتے ہو تو آسمانوں کی سرحدوں سے آگے نکل جاؤ ۲۴۴
آیت ۳۷ تا ۴۵ ۲۴۸
گنہگار اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے ۲۴۹
آیت ۴۶ تا ۵۵ ۲۵۳
یہ دونوں جنتیں خائفین کے انتظار میں ہیں ۲۵۴
آیت ۵۶ تا ۶۱ ۲۵۹
ایک نکتہ
نیکی، نیکی کی جزا ہے ۲۶۲
آیت ۶۲ تا ۶۹ ۲۶۳
دو اور جنّتیں اپنے حیران کُن اوصاف کے ساتھ۔ ۲۶۴

ایک نکتہ
پھلوں کی قدر وقیمت ۲۶۶
آیت ۷۰ تا ۷۸ ۲۶۸
جنّت کی بیویوں کا دوسری مرتبہ تذکرہ ۲۶۹
چند نکات

سُورۂ واقعہ ۲۷۴

سُورہ واقعہ کے مضامین ۲۷۵
اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت ۲۷۶
آیت ۱ تا ۱۲ ۲۷۸
آیت ۱۳، ۱۴ ۲۷۹
عظیم واقعہ ۲۸۰
آیت ۱۵ تا ۲۶ ۲۸۵
جنّت کی وہ نعمتیں جو مقربین کی منتظر ہیں ۲۸۶
آیت ۲۷ تا ۳۹ ۲۹۱
آیت ۴۰ ۲۹۲
وہ نعمتیں جو اصحابِ یمین کو حاصل ہوں گی ۲۹۳
آیت ۴۱ تا ۵۰ ۲۹۷
اصحاب الشمال کو ملنے والی سزائیں اور ان پر نازل ہونے والے دردناک عذاب۔ ۲۹۸
آیت ۵۱ تا ۵۶ ۳۰۲
ان گمراہ مجرموں پر نازل ہونے والے عذاب کا ایک اور حصّہ۔ ۳۰۳
آیت ۵۷ تا ۶۲ ۳۰۵
عقیدہ معاد پر سات دلیلیں ۳۰۶
ایک نکتہ
آیت ۶۳ تا ۶۷ ۳۱۰
دانوں کو اُگانے والا خدا ہے یا تم ہو۔ ۳۱۰
آیت ۶۸ تا ۷۴ ۳۱۲
یہ پانی اور آگ کس کی طرف سے ہیں ۳۱۴
ایک نکتہ
آیت ۷۵ تا ۸۲ ۳۱۹
صرف پاکیزہ افراد حریم قرآن تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ ۳۲۰
چند نکات ۳۲۳
آیت ۸۳ تا ۸۷ ۳۲۵
جس وقت کہ جان گلے تک پہنچ جائیگی ۳۲۷
چند نکات
۱۔ جبارین کی ناتوانی کا لمحہ ۳۲۸
کیا جانکنی تدریجی امر ہے؟ ۳۲۹
آیت ۸۸ تا ۹۵ ۳۳۰
نیک کاروں اور بدکاروں کا انجام ۳۳۱
ایک نکتہ
عالمِ برزخ ۳۳۴

سُورہ حدید ۳۳۶

سُورہ حدید کے مشمولات ۳۳۷
سُورہ حدید کی تلاوت کی فضیلت ۳۳۸

آیت ۱ تا ۳ ۳۳۹
گہری فکر رکھنے والوں کی علامات ۳۴۰
ایک نکتہ
خدا کی صفات میں اضداد کا جمع ہونا ۳۴۲
آیت ۴ تا ۶ ۳۴۵
وہ ہمیشہ قدرت پر جلوہ گر ہے ۳۴۶
ایک نکتہ
خدا کے اسم اعظم کی نشانیاں ۳۵۰
آیت ۷ تا ۱۰ ۳۵۱
آیت ۱۱ ۳۵۲
ایمان و انفاق نجات و خوش بختی کے لیے دو عظیم سرمائے ہیں ۳۵۳
چند نکات
۱۔ انفاق کے اسباب ۳۵۷
۲۔ راہِ خدا میں انفاق کے شرائط ۳۵۷
۳۔ ایمان، جہاد اور انفاق میں پیش قدمی کرنے والے ۳۵۹
آیت ۱۲ تا ۱۵ ۳۶۱
ہمیں اپنے نور سے استفادہ کرنے دو ۳۶۲
ایک نکتہ
قیامت میں مجرموں کا بے مقصد مدد کرنا ۳۶۶
آیت ۱۶ تا ۱۸ ۳۶۸
شانِ نزول ۳۶۹
غفلت و بے خبری کب تک ۳۶۹
وہ گنہگار افراد جنہوں نے یہ آیت سُن کر توبہ کی۔ ۳۷۲
آیت ۱۹، ۲۰ ۳۷۵
۱۔ دُنیا متاعِ غرور کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔ ۳۷۶
چند نکات ۳۷۹
دنیاوی زندگی ان اسباب و علل کا مجموعہ ہے۔ ۳۸۰
آیت ۲۱ تا ۲۴ ۳۸۱
ایک عظیم معنوی مقابلہ ۳۸۳
آیت ۲۵ ۳۸۹
بعثتِ انبیاء کا مقصدِ اعلیٰ ۳۸۹
چند نکات
۱۔ منطق اور زبردستی کی قلمرو ۳۹۲
۲۔ زندگی کی عُمدہ ضرورتیں لوہے سے تعلّق رکھتی ہیں ۳۹۳
آیت ۲۶، ۲۷ ۳۹۵
ہم نے یکے بعد دیگرے انبیاء بھیجے ۳۹۶
چند نکات ۳۹۹
۱۔ اسلام اور رہبانیت ۳۹۹
۲۔ رہبانیت کا تاریخی سرچشمہ ۴۰۰
۳۔ رہبانیت سے پیدا ہونے والے اجتماعی اور اخلاقی مفاسد ۴۰۱
۴۔ انجیل یا اناجیل ۴۰۳

آیت ۲۸ تا ۲۹ — ۴۰۴
شانِ نزول — ۴۰۵
ایک نکتہ
تقویٰ اور نگاہِ دُور رس کا رابطہ — ۴۰۷

سُورہ مجادلہ — ۴۰۹

سُورہ "مجادلہ" کے مضامین — ۴۱۰
سُورہ "مجادلہ" کی تلاوت کی فضیلت — ۴۱۰
آیت ۱ تا ۴ — ۴۱۲
شانِ نزول — ۴۱۴
ظہار زمانۂ جاہلیت کا ایک قبیح عمل — ۴۱۵
بعض احکامِ ظہار — ۴۱۹
آیت ۵ تا ۷ — ۴۲۱
وہ جو خدا سے دُشمنی کرتے ہیں — ۴۲۲
اس آیت میں چند نکات قابلِ توجہ ہیں — ۴۲۴
ایک نکتہ — ۴۲۵
آیت ۸ تا ۱۰ — ۴۲۷
شانِ نزول — ۴۲۸
چند نکات
۱۔ نجویٰ کی اقسام اور سرگوشی کی باتیں — ۴۳۱
۲۔ خدا کا سلام کون سا ہے ؟ — ۴۳۲
آیت ۱۱
شانِ نزول — ۴۳۳
مجالس میں پہلے آنے والوں کا احترام — ۴۳۴
چند نکات — ۴۳۵
۲۔ آدابِ مجلس — ۴۳۷
آیت ۱۲، ۱۳ — ۴۳۸
شانِ نزول — ۴۳۹
ایک جاذبِ توجہ امتحان — ۴۳۹
چند نکات
آیت نجویٰ وصدقہ پر عمل کرنے والا تنہا شخص — ۴۴۰
۱۔ نجویٰ سے پہلے صدقہ کی تشریع اور پھر نسخ کا فلسفہ۔ — ۴۴۲
۲۔ کیا یہ فضیلت تھی — ۴۴۲
۳۔ مدتِ حکم اور مقدار صدقہ — ۴۴۳
آیت ۱۴ تا ۱۹ — ۴۴۴
حزبِ شیطان — ۴۴۶
آیت ۲۰ تا ۲۲ — ۴۵۰
حزب اللہ کامیاب ہے — ۴۵۱
چند نکات
۱۔ حزب اللہ اور حزبِ شیطان کی اصل نشانی۔ — ۴۵۵
۲۔ حُب فی اللہ اور بغض فی اللہ کا اجر — ۴۵۶

سُورہ حشر — ۴۵۸

سُورہ حشر کے مضامین — ۴۵۹
اس سورہ کی فضیلت — ۴۶۰
آیت ۱ تا ۵ — ۴۶۱

شانِ نزول	۴۶۲
یہود بنی نظیر کی مدینہ میں سازش کا خاتمہ	۴۶۴
چند نکات	
۱۔ خدا کے غیر مرئی لشکر	۴۶۹
۲۔ موجودہ زمانے میں یہودیوں کی سازشیں	۴۷۰
آیت ۶، ۷	۴۷۱
شانِ نزول	۴۷۲
ان اموالِ غنیمت کے بارے میں حکم جو جنگ کے بغیر ہاتھ لگیں۔	۴۷۲
ایک نکتہ	
۱۔ فئی کا مصرف (وہ اموالِ غنیمت جو بغیر جنگ کے حاصل ہوں، ان کا مصرف)	۴۷۶
۲۔ ایک سوال کا جواب	۴۷۶
۳۔ فدک کی غم انگیز داستان	۴۷۷
آیت ۸ تا ۱۰	۴۷۹
تین گروہ مہاجرین، انصار اور تابعین اور ان کے نمایاں اوصاف	۴۸۰
ایک نکتہ	
صحابہ قرآن و تاریخ کی میزان میں	۴۸۵
آیت ۱۱ تا ۱۴	۴۸۶
شانِ نزول	۴۸۸
یہودیوں کی فتنہ انگیزی اور اس میں منافقین کی شمولیت	۴۸۸
آیت ۱۵ تا ۲۰	۴۹۲
شیطان کی بوسیدہ رسیوں کے ساتھ کنویں میں نہ جاؤ	۴۹۳
چند نکات	۴۹۷
۱۔ اہلِ نفاق کے ساتھ بے مقصد شرکتِ عمل	۴۹۷
۲۔ برصیصا عابد کی حیرت انگیز داستان	۴۹۸
۳۔ جو کچھ آگے بھیجنا چاہیے	۴۹۹
آیت ۲۱ تا ۲۴	۵۰۱
اگر قرآن پہاڑوں پر نازل ہوتا تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتے۔	۵۰۲
چند نکات	
۱۔ قرآن کا حد سے زیادہ نفوذ	۵۰۷
۲۔ سُورہ حشر کی آخری آیات	۵۰۷
سُورہ ممتحنہ	۵۰۹
سُورہ ممتحنہ کے مضامین	۵۱۰
سُورہ ممتحنہ کی تلاوت کی فضیلت	۵۱۰
آیت ۱ تا ۳	۵۱۲
شانِ نزول	۵۱۳
خدا سے دوستی کرنے کا انجام	۵۱۵
آیت ۴ تا ۶	۵۱۸
ابراہیمؑ تو سب کے لیے نمونہ ہیں	۵۱۹
چند نکات	
۱۔ ابدی نمونے	۵۲۴
۲۔ خدا سب سے بے نیاز ہے	۵۲۵

حُبّ فی اللہ اور بغض فی اللہ بنیادی اصل ہے ۵۲۶
آیت ۷ تا ۹ ۵۲۷
ان کفّار سے دوستی جو برسرِ پیکار نہیں ہیں ۵۲۸
آیت ۱۰، ۱۱ ۵۳۱
شانِ نزول ۵۳۲
مسلمانوں اور کفّار کے نقصان کی تلافی ۵۳۳
آیت ۱۱
دشمنوں کے لیے بھی عدالت ۵۳۷
آیت ۱۲ ۵۳۸
عورتوں کی بیعت کی شرائط ۵۳۹
چند نکات
۱۔ عورتوں کی بیعت کا ان کی اسلامی شخصیّت کے ساتھ ربط ۵۴۰
۲۔ ابوسفیان کی بیوی ہندہ کا ماجرا ۵۴
۳۔ معروف میں اطاعت ۵۴۲
آیت ۱۳ ۵۴۳
اس مغضوب علیہ قوم سے دوستی نہ کرو ۵۴۴

سُورۂ صف

۵۴۰
سُورہ صف کے مضامین ۵۴۰
سُورہ صف کی تلاوت کی فضیلت ۵۴۷
آیت ۱ تا ۴ ۵۴۹
شانِ نزول ۵۵۰
فولادی دیوار کی طرح جم کر لڑنے والے ۵۵۰
چند نکات
۱۔ صفوں میں وحدت کی ضرورت ۵۵۴
۲۔ گفتار با عمل ۵۵۴
آیت ۵، ۶ ۵۵۰
مَیں احمد کے ظہور کی بشارت لے کر آیا ہوں ۵۵۸
چند نکات
۱۔ بشارت اور تکمیلِ دین کا ربط ۵۶۰
۲۔ عہدین کی بشارتیں اور فارقلیطا کی تعبیر ۵۶۱
۳۔ کیا پیغمبر اسلامؐ کا نام احمد ہے ۵۶۲
آیت ۷ تا ۹ ۵۶۶
وہ نُورِ خدا کو اپنی پھونکوں سے خاموش کرنا چاہتے ہیں۔ ۵۶۶
آیت ۱۰ تا ۱۳ ۵۷۱
سُودمند اور بے نظیر تجارت ۵۷۱
چند نکات
۱۔ فتح قریب کون سی ہے؟ ۵۷۴
۲۔ مساکنِ طیبہ کیا ہے؟ ۵۷۴
۳۔ دُنیا اولیاء خدا کا تجارت خانہ ہے ۵۷۵
آیت ۱۴ ۵۷۶
حواریوں کی طرح ہو جاؤ ۵۷۶
ایک نکتہ
حوارئین کون ہیں؟ ۵۷۸

سُورہ جمعہ

۵۸۰

سُورہ جمعہ کے مضامین ۵۸۱
سُورہ جمعہ کی تلاوت کی فضیلت ۵۸۱
آیت ۱ تا ۴ ۵۸۳
پیغمبرؐ کی بعثت کا مقصد ۵۸۴
ایک نکتہ
فضلِ خدا حساب سے ہوتا ہے ۵۸۹
آیت ۵ تا ۸ ۵۹۰
ایسا چوپایہ جس پر کتابیں لدی ہوں ۵۹۱
چند نکات
۱۔ عالم بے عمل ۵۹۵
۲۔ مَیں موت سے کیوں ڈروں؟ ۵۹۷
آیت ۹ تا ۱۱ ۵۹۹
شانِ نزول ۶۰۰
ہفتہ کا عظیم ترین عبادی سیاسی اجتماع ۶۰۰
چند نکات
آ۔ اسلام میں پہلی نماز جمعہ ۶۰۴
۲۔ نماز جمعہ کی اہمیت ۶۰۵
۳۔ نماز عبادی سیاسی جمعہ کا فلسفہ ۶۰۶
۴۔ نماز جمعہ کے آداب اور خطبوں کے مطالب و مضامین۔ ۶۰۹
نماز جمعہ کے وجوب کی شرائط ۶۱۱

سُورۂ منافقون ۶۱۳

سُورۂ منافقون کے مطالب ۶۱۴
سُورہ منافقون کی تلاوت کی فضیلت ۶۱۴
آیت ۱ تا ۴ ۶۱۶
سرچشمۂ نفاق اور منافقین کی نشانیاں ۶۱۷
آیت ۵ تا ۸ ۶۲۴
شانِ نزول ۶۲۵
منافقین کی دیگر نشانیاں ۶۲۶
چند نکات
۱۔ منافق کی دس نشانیاں ۶۳۱
۲۔ منافقین کا خطرہ ۶۳۳
۳۔ منافقین بے اخلاص اور ٹوٹنے والا ہے۔ ۶۳۴
۴۔ عزّت خدا اور اس کے دوستوں کیلیے مخصوص ہے ۶۳۴
آیت ۹ تا ۱۱ ۶۳۶
مال اور اولاد تمہیں خدا کی راہ سے غافل نہ کردیں۔ ۶۳۷
چند نکات
۱۔ پریشانیوں پر غلبہ کی راہ ۶۳۹
۲۔ نفاق، اعتقادی و عملی ۶۴۰

سُورۂ تغابن ۶۴۲

سُورۂ تغابن کے مضامین و مطالب ۶۴۳
اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت ۶۴۴
آیت ۱ تا ۶ ۶۴۵

وہ دلوں میں چھپے ہوئے اسرار سے آگاہ ہے۔ ۶۴۶
آیت ۷ تا ۱۰ ۶۵۱
تغابن کا دن اور غبنوں کا آشکار ہونا ۶۵۲
آیت ۱۱ تا ۱۳ ۶۵۷
تمام مصائب اسی کے فرمان سے ہیں ۶۵۷
آیت ۱۴ تا ۱۸ ۶۶۱
شانِ نزول ۶۶۲
تمہارے اموال و اولاد تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں۔ ۶۶۳
ایک نکتہ
ایک پُر معنی حدیث ۶۶۹

٭ ٭ ٭

بسم الله الرحمن الرحیم

اللهم صل على محمد وآل محمد وعجل فرجهم

تفسیر نمونہ جلد ۱۳

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں

سورۂ طور : مکّی سورت ہے اور اس کی ۴۹ آیات ہیں۔

پارہ ـــــ ۲۷

سورۂ نجم : مکّی سورت ہے اور اس کی ۶۲ آیات ہیں۔

پارہ ـــــ ۲۷

سورۂ قمر : مکّی سورت ہے اور اس کی ۵۵ آیات ہیں۔

پارہ ـــــ ۲۷

سورۂ رحمٰن : مدنی سورت ہے اور اس کی ۷۸ آیات ہیں۔

پارہ ـــــ ۲۷

سورۂ واقعہ : مکّی سورت ہے اور اس کی ۹۶ آیات ہیں۔

پارہ ـــــ ۲۷

سورۂ حدید : مدنی سورت ہے اور اس کی ۲۹ آیات ہیں۔

پارہ ـــــ ۲۷

سورۂ مجادلہ : مدنی سورت ہے اور اس کی ۲۲ آیات ہیں۔

پارہ ـــــ ۲۸

سورۂ حشر : مدنی سورت ہے اور اس کی ۲۴ آیات ہیں۔

پارہ ـــــ ۲۸

سُورۂ ممتحنہ : مدنی سُورت ہے اور اس کی ۱۳ آیات ہیں ۔

پارہ ــــ ۲۸

سُورۂ صف : مدنی سُورت ہے اور اس کی ۱۴ آیات ہیں ۔

پارہ ــــ ۲۸

سُورۂ جمعہ : مدنی سُورت ہے اور اس کی ۱۱ آیات ہیں ۔

پارہ ــــ ۲۸

سُورۂ منافقون : مدنی سُورت ہے اور اس کی ۱۱ آیات ہیں ۔

پارہ ــــ ۲۸

سُورۂ تغابن : مدنی سُورت ہے اور اس کی ۱۸ آیات ہیں ۔

پارہ ــــ ۲۸

سورۂ طور

یہ سورہ مکّہ میں نازل ہوا
اور
اس کی ۴۹ آیات ہیں

آغاز
جمعہ ۱۰ صفر ۱۴۰۶ھ
۱۳۶۴/۸/۳

سورۂ طور کے مطالب

یہ سورہ بھی انہی سورتوں میں سے ہے جس کے مباحث کا زیادہ زور، ایک طرف تو معاد اور نیک اور پاک لوگوں کی تقدیر کے مسئلہ پر ہے، اور دوسری طرف اس عظیم دن مجرموں اور بدی کرنے والوں سے متعلق ہے، اگرچہ کچھ دوسرے مطالب بھی اس میں مختلف اعتقادی سلسلوں میں نظر آتے ہیں۔

مجموعی طور پر اس سورہ کے مضامین کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ اس سورہ کی پہلی آیات، جو پے در پے قسموں سے شروع ہوتی ہیں۔ عذاب الٰہی، قیامت کی نشانیوں، جہنم کی آگ اور کفار کی سزاؤں کے بارے میں بحث کرتی ہیں، (آیت ۱ تا آیت ۱۶)۔

۲۔ اس سورہ کا ایک دوسرا حصہ بہشت کی نعمتوں اور قیامت میں مواہب الٰہی جو پرہیزگاروں کے انتظار میں ہیں انہیں تفصیل سے بیان کرتا ہے، اور یکے بعد دیگرے ان کی طرف توجہ دلاتا ہے، اور حقیقت میں بہشت کی اکثر نعمتوں کا سورہ کے اسی حصہ میں اشارہ ہوا ہے، (آیت ۱۷ تا ۲۸)۔

۳۔ اس سورہ کا تیسرا حصہ پیغمبر اسلامؐ کی نبوت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، اور ان اتہامات کو جو دشمنوں نے ان پر لگائے تھے بیان کرتا ہے، اور مختصر طور پر ان کا جواب دیتا ہے (آیت ۲۹ تا ۳۴)۔

۴۔ چوتھے حصہ میں توحید کے سلسلہ میں گفتگو ہے اور اس مسئلہ کو واضح استدلال کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ (آیت ۳۵ تا ۴۳)

۵۔ سورہ کے اس حصہ میں پھر مسئلہ معاد، اور روز قیامت کی کچھ مخصوص باتوں کی طرف لوٹتا ہے (آیت ۴۴ تا ۴۷)

۶۔ آخر میں، سورہ کے آخری حصہ میں، جو دو سے زیادہ آیات نہیں ہیں، پیغمبر گرامی اسلامؐ کو، صبر و استقامت، اور پروردگار کی تسبیح و حمد کے احکام، اور خدا کی طرف سے حمایت کے وعدے کے ساتھ، گذشتہ مباحث کو ختم کرتا ہے، اور اس طرح سے ایک منظم، جاذب، منطقی اور عاطفی مجموعہ کو تیار کرتا ہے جو سننے والوں کے دلوں کو اپنا مسخر کرتا ہے۔

ضمنی طور پر اس سورہ کا نام "طور" کے ساتھ، اس کی پہلی آیت کی مناسبت سے ہے۔

اس سورت کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا:

"من قرأ سورة الطور، كان حقاً على الله ان يؤمنه من عذابه و ان ينعمه في جنته"

"جو شخص سورۂ طور کی تلاوت کرے تو خدا پر لازم ہے کہ اسے اپنے عذاب سے مامون قرار دے، اور اسے اپنی بہشت کی نعمتوں سے بہرہ ور کرے"۔[1]

ایک اور حدیث میں امام باقرؑ سے منقول ہے:

من قرأ سورة الطور جمع الله له خير الدنيا والأخرة

"جو شخص سورۂ طور کی تلاوت کرے خدا دنیا و آخرت کی بھلائی اس کے لیے جمع کر دے گا"۔[2]

واضح ہے کہ یہ سب اجر اور عظیم پاداش دنیا و آخرت میں ان لوگوں کے لیے ہے، جو اس "تلاوت کو غور و فکر کا وسیلہ اور اس (غور و فکر) کو راہ "عمل" کے لیے آمادگی کا وسیلہ قرار دے۔

---

[1] و [2] مجمع البیان جلد ۹ ص ۱۶۲ تفسیر برہان جلد ۴ ص ۲۴۰۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ وَالطُّوۡرِ ○

۲۔ وَکِتٰبٍ مَّسۡطُوۡرٍ ○

۳۔ فِیۡ رَقٍّ مَّنۡشُوۡرٍ ○

۴۔ وَّالۡبَیۡتِ الۡمَعۡمُوۡرِ ○

۵۔ وَالسَّقۡفِ الۡمَرۡفُوۡعِ ○

۶۔ وَالۡبَحۡرِ الۡمَسۡجُوۡرِ ○

۷۔ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ ○

۸۔ مَّا لَہٗ مِنۡ دَافِعٍ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ قسم ہے "کوہ" طور کی۔

۲۔ اور اس کتاب کی جو لکھی گئی ہے۔

۳۔ وسیع صفحہ پر۔

۴۔ اور بیت المعمور کی قسم۔

۵۔ اور بلند کی ہوئی چھت کی۔

۶۔ اور بھڑکتے ہوئے لبریز سمندر کی۔

۷. کہ تیرے پروردگار کا عذاب واقع ہو کر رہے گا۔

۸. اور کوئی چیز اس سے مانع نہیں ہوگی۔

تفسیر

بھڑکتے ہوئے سمندر کی قسم

یہ سورہ ان سوروں میں سے ایک اور سورہ ہے جو قسم سے شروع ہوتے ہیں ایسی قسمیں جو ایک اہم واقعیت کو بیان کرتی ہیں یعنی مسئلہ معاد و قیامت، قبروں سے اٹھنا اور انسانوں کے اعمال کا محاسبہ۔

اس مسئلہ کی اہمیت اس قدر ہے، کہ خدا نے قرآن کی مختلف آیات میں بہت سے مقدسات کے حصوں کی قسم کھائی ہے تاکہ اس دن کی عظمت اور اس کے حتمی طور پر واقع ہونے کو واضح کرے۔

وہ پانچ قسمیں، جو اس سورہ کے آغاز میں نظر آتی ہیں، ایسے سربستہ اور فکر انگیز معانی رکھتی ہیں کہ مفسرین نے ان کی تفسیر میں اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارے ہیں۔

فرماتا ہے: "کوہ طور کی قسم" (والطور)۔

"اور قسم ہے اس کتاب کی جو لکھی گئی ہے" (وکتاب مسطور)۔

"وسیع اور کشادہ صفحہ پر" (فی رق منشور)۔

"اور بیت المعمور کی قسم" (والبیت المعمور)۔

"اور بلند چھت کی قسم" (والسقف المرفوع)۔

"اور بھڑکتے ہوئے لبریز سمندر کی قسم" (والبحر المسجور)۔

"کہ تیرے پروردگار کا عذاب حتمی طور پر واقع ہو کر رہے گا" (ان عذاب ربك لواقع)۔

"اور کوئی چیز اس سے مانع نہیں ہوگی" (ماله من دافع)۔

"طور" لغت میں "پہاڑ" کے معنی میں ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ لفظ قرآن مجید کی ۱۰ آیات میں بیان ہوا ہے، جن میں سے ۹ مواقع پر "طور سینا" — وہی پہاڑ جہاں موسیٰ پر وحی نازل ہوئی تھی — سے متعلق گفتگو ہے معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت میں (خصوصاً الف ولام عہد کی طرف توجہ کرتے ہوئے) یہاں بھی اسی معنی میں ہے۔

اس بنا پر خدا نے پہلے مرحلہ میں روئے زمین کے مقدس مقامات میں سے ایک مقدس مقام کی — جس میں وحی الٰہی نازل ہوئی تھی — قسم کھائی ہے۔

"کتاب مسطور" کی تفسیر میں بھی طرح طرح کے احتمال دیئے گئے ہیں۔

بعض نے اسے لوح محفوظ کی طرف اشارہ سمجھا ہے، اور بعض نے قرآن مجید کی طرف، اور بعض نے نامۂ اعمال کی طرف، اور بعض نے اس تورات کی طرف جو موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔

لیکن اس قسم کی مناسبت سے جو اس سے پہلے آئی ہے یہ تعبیر یا تو تورات کی طرف اشارہ ہے یا سب کتب آسمانی کی طرف۔

"رق" کا لفظ "رقت" کے مادہ سے اصل میں نازک اور لطیف ہونے کے معنی میں ہے۔ اور کاغذ یا اس باریک چمڑے کو بھی کہا جاتا ہے، جس پر کوئی مطلب لکھا جائے۔ اور "منشور" پھیلے ہوئے کے معنی میں ہے (بعض کا نظریہ ہے کہ یہ لفظ درخشندگی اور لمعان کو بھی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے)۔

اس بنا پر یہ قسم ایسی کتاب کی کھائی گئی ہے جو بہترین صفحات میں سے ایک بہترین صفحہ پر لکھی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ کھلی ہوئی اور کشادہ ہے نہ کہ لپٹی ہوئی۔

"بیت المعمور" کے بارے میں بھی گوناں گوں تفاسیر ہوئی ہیں، بعض نے تو اسے ایسے گھر کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو آسمانوں میں خانہ کعبہ کے عین اوپر ہے۔ اور فرشتوں کی عبادت کے ساتھ معمور و آباد ہے، یہ معنی ان متعدد روایات میں۔ جو مختلف اسلامی منابع میں آئی ہیں — نظر آتا ہے [1]

ایک روایت کے مطابق ہر روز ستر ہزار فرشتے اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں، اور دوبارہ کبھی بھی اس کی طرف پلٹ کر نہیں آتے۔

بعض نے اس کی کعبہ اور زمین میں خانہ خدا سے تفسیر کی ہے جو زوار اور حاجیوں کے ساتھ ہمیشہ معمور اور آباد رہتا ہے۔

اور ہم جانتے ہیں کہ یہ پہلا گھر ہے جو روئے زمین پر عبادت کے لیے بنایا گیا ہے اور آباد ہوا ہے۔

لیکن آیت کا ظاہر پہلے دو معانی میں سے کوئی ایک ہے اور مختلف تعبیروں کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو قرآن میں "کعبہ" کے سلسلہ میں "بیت" کے عنوان سے آئی ہیں، دوسرا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

باقی رہا "سقف مرفوع" تو اس سے مراد آسمان ہے۔ کیونکہ سورۂ انبیاء کی آیت ۳۲ میں آیا ہے کہ: وجعلنا السماء سقفًا محفوظًا۔ اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت قرار دیا ہے، اور سورۂ نازعات کی آیت ۲۷ اور ۲۸ میں آیا ہے کہ: ءانتم اشد خلقًا ام السماء بناها: کیا تمہاری نئے سرے سے خلقت زیادہ اہم ہے یا آسمان کی خلقت کہ جسے خدا نے برپا کیا ہے۔ اس کی چھت کو بلند کیا ہے اور اسے منظم و مرتب بنایا ہے۔

"سقف" کی تعبیر ممکن ہے اس لحاظ سے ہو، کہ ستاروں اور آسمانی کرات نے اس طرح سے سارے آسمان کو ڈھانپ رکھا ہے، کہ وہ چھت کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اطراف زمین کی فضا کی طرف اشارہ ہو، کہ ہوا کے پھیلے ہوئے

---

[1] بحار الانوار میں دس سے زیادہ روایات اس سلسلہ میں نقل ہوئی ہیں (جلد ۵۸ ص ۵۵ کے بعد)۔

فشر نے ایک مضبوط چھت کی طرح اس کے اطراف کو گھیرا ہوا ہے۔ اور اس کی آسمانی پتھروں کے حملوں اور نقصان دہ کیہانی شعاعوں سے اچھی طرح حفاظت کرتی ہے۔

"مسجور" کے لیے لغت میں دو معانی ذکر ہوتے ہیں، ایک "بھڑکنے والا" اور دوسرا "پُر" راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "سجر" (بروزن فجر) آگ کے شعلہ ور ہونے کے معنی میں ہے، اور اوپر والی آیت کو بھی اسی معنی میں سمجھتا ہے، وہ دوسرے معنی کی بات درمیان میں نہیں لایا۔ لیکن مرحوم "طبرسی" نے "مجمع البیان" میں پہلا معنی یہی ذکر کیا ہے، اور بعض کتب لغت میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے، قرآن کی دوسری آیات بھی پہلے معنی کی تائید کرتی ہیں، جیسا کہ سورۂ مؤمن کی آیت ۷۱، ۷۲ میں آیا ہے کہ:
یسحبون فی الحمیم ثم فی النار یسجرون: انہیں جلانے والے پانی میں کھینچیں گے، پھر وہ شعلہ ور آگ میں ہوں گے۔"

امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے ارشادات میں "حدیدہ محماۃ" کی داستان میں جو ان کے بھائی عقیل کے ساتھ تھی، یہ بیان ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

اتأن من حدیدۃ احماھا انسانھا للعبہ و تجرنی الی نار سجرھا جبارھا لغضبہ،

"کیا اس لوہے سے جسے ایک انسان نے مذاق کے طور پر گرم کیا ہے، تم نالہ و فریاد کر رہے ہو۔ لیکن مجھے ایسی آگ کی طرف کھینچتے ہو، جسے پروردگار نے اپنے غضب سے بھڑکایا ہے"؟[1]

لیکن یہ "بحر مسجور" اور بھڑکتا ہوا سمندر کہاں ہے؟ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد ہمارے کرۂ زمین کے سمندر ہی مراد ہیں، جو قیامت کے قریب بھڑک اٹھیں گے اور پھر پھٹ جائیں گے، جیسا کہ سورۂ تکویر کی آیت ۶ میں آیا ہے: واذا البحار سجرت: "جب دریا بھڑک اٹھیں گے" اور سورۂ انفطار آیہ ۳ میں پڑھتے ہیں واذا البحار فجرت: جب دریا پھٹ جائیں گے

لیکن بعض نے اس کی ان معدنی مادوں کے ساتھ تفسیر کی ہے جو کرۂ زمین کے اندر ہیں۔ ایک حدیث بھی جو تفسیر عیاشی میں امام باقرؑ سے نقل ہوئی ہے اس معنی پر شاہد ہے، اس حدیث میں آیا ہے کہ "قارون" کو "بحر مسجور" میں عذاب ہو رہا ہے[2] حالانکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ: "قارون اور اس کا گھر اور خزانہ زمین کی گہرائیوں میں دھنس گیا۔" "فخسفنا بہ و بدارہ الارض" (قصص۔ ۸۱)۔

یہ دونوں تفسیریں ایک دوسرے کے ساتھ منافات نہیں رکھتیں اور ممکن ہے کہ اوپر والی آیت میں دونوں کی قسم کھائی گئی ہو کیونکہ دونوں خدا کی آیات اور اس جہان کے عظیم عجائبات میں سے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ مفسرین نے ان پانچوں قسموں کے مفہوم کی، ایک دوسرے کے ساتھ ربط کی کیفیت کے بارے

---

[1] "نہج البلاغہ" خطبہ ۲۲۴۔
[2] "نور الثقلین" جلد ۵ صفحہ ۱۳۸۔

ہیں کوئی خاص بحث نہیں کی ہے، لیکن نظر یہ آتا ہے کہ پہلی تین قسمیں تو ایک دوسرے کے ساتھ قریبی ربط رکھتی ہیں، کیونکہ وہ سب وحی اور اس کے خصوصیات کی بات کرتی ہیں "کوہ طور" محلِ نزولِ وحی تھا، اور "کتاب مسطور" بھی آسمانی کتاب کی طرف اشارہ ہے چاہے وہ تورات ہو یا قرآن، اور "بیت المعمور" فرشتوں اور خدا کے پیکِ وحی کے آنے جانے کا محل ہے۔

لیکن دوسری دو قسمیں آیات "تکوینی" کی بات کرتی ہیں، (پہلی تین قسموں کے مقابلہ میں جو "تشریعی آیات" کی باتیں کرتی ہیں) ان دو قسموں میں سے ایک توحید کی اہم ترین نشانی یعنی باعظمت آسمان کی طرف اشارہ ہے۔ اور دوسری معاد و قیامت کی ایک اہم نشانی ہے جو قربِ قیامت میں قبروں سے زندہ ہو کر اٹھنے کے وقت رونما ہوگی۔

اس بنا پر ان پانچوں قسموں میں "توحید" "نبوت" اور "معاد" جمع ہے۔

بعض مفسرین جو ان تمام آیات کو "موسیٰؑ" اور ان کی سرگزشت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، ان آیات کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق اس طرح سے بیان کیا ہے: طور تو وہی پہاڑ ہے جس میں موسیٰؑ پر وحی نازل ہوتی تھی، اور "کتاب مسطور" تورات ہے۔ بیت المعمور فرشتہ وحی کی آمد و رفت کا مرکز ہے (اور احتمال ہے کہ مراد بیت المقدس ہو) اور سقف مرفوع وہی ہے جو بنی اسرائیل کی داستان میں آیا ہے: واذ نتقنا الجبل فوقھم کانّہ ظلّۃ، اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے پہاڑ کو سائبان کی طرح بنی اسرائیل کے سر پر بلند کر دیا" (اعراف - ۱۷۱)۔

اور "بحر مسجور" آگ کا وہ سمندر ہے جس میں قارون کو دین موسیٰؑ کی مخالفت کی بنا پر عذاب ہو رہا ہے۔"

لیکن یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے، اور ان روایات کے ساتھ بھی، جو منابع اسلامی میں آئی ہیں، سازگار نہیں ہے، اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، سقف مرفوع قرآن کی دوسری آیات اور ان روایات کی گواہی سے جو آیت کی تفسیر میں نقل ہوئی ہیں، آسمان کی طرف اشارہ ہے۔

جو نکتہ یہاں باقی رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ان قسموں کا اس موضوع کے ساتھ جس کے لیے یہ قسمیں کھائی گئی ہیں کیا ربط ہے؟

اس سوال کا جواب ان مطالب کی طرف توجہ کرنے سے جو اوپر بیان ہوئے ہیں واضح ہو جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اوپر والی قسمیں، جو عالم "تکوین و تشریع" میں خدا کی قدرت کے محور پر گردش کر رہی ہیں، اس حقیقت کو بیان کر رہی ہیں کہ ایسی ذات اس بات پر اچھی طرح سے قادر ہے کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کر دے، اور قیامت برپا کرے، یہ وہی چیز ہے کہ جس کے لیے یہ قسمیں کھائی گئی ہیں، جیسا کہ ان آیات کے آخر میں بیان ہوا ہے، "ان عذاب ربک لواقع مالہ من دافع"

۹۔ يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝

۱۰۔ وَّ تَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۝

۱۱۔ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝

۱۲۔ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ۝

۱۳۔ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۝

۱۴۔ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝

۱۵۔ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۝

۱۶۔ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ
مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ

۹۔ (یہ عذاب الٰہی) اس دن آئے گا جب آسمان شدت کے ساتھ ہل رہا ہوگا۔

۱۰۔ اور پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ کر حرکت کر رہے ہوں گے۔

۱۱۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔

۱۲۔ وہی لوگ جو باطل باتوں میں لہو ولعب کر رہے ہیں۔

۱۳۔ وہ دن جس میں انہیں زبردستی جہنم کی آگ کی طرف دھکیلا جائے گا۔

۱۴۔ (اور ان سے کہا جائے گا) یہی ہے وہ آگ جس کا تم انکار کیا کرتے تھے۔

۱۵۔ کیا یہ جادو ہے ؟ یا تم دیکھتے ہی نہیں ہو ؟

۱۶۔ اس میں داخل ہو جاؤ، اور جلتے رہو، چاہے صبر کرو یا نہ کرو، تمہارے لیے کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ تمہیں صرف تمہارے اعمال کی ہی جزا ملے گی۔

تفسیر

تمہاری جزا صرف تمہارے اعمال ہیں

گذشتہ آیات میں، قیامت میں عذاب الٰہی کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہوا تھا، زیر بحث آیات اس معنی کی توضیح و تفسیر ہے، پہلے تو قیامت کی بعض خصوصیات کو بیان کرتا ہے اور پھر تکذیب کرنے اور جھٹلانے والوں کے عذاب کی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔

فرماتا ہے: "یہ عذاب الٰہی اس دن آئے گا جب آسمان (آسمانی کرات) شدت کے ساتھ حرکت کر رہے ہوں گے، اور ہر طرف آ جا رہے ہوں گے، (یوم تمور السماء مورًا)۔[1]

"مور" (بروزن قول) لغت میں مختلف معانی میں آیا ہے "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے "مور" تیزی کے ساتھ رواں دواں ہونے کے معنی میں ہے، وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس گرد و غبار کو بھی جسے ہوا ہر طرف لے جاتی ہے "مور" کہتے ہیں۔

"لسان العرب" میں بھی یہ بیان کیا گیا ہے کہ "مور" حرکت اور آنے جانے کے معنی میں ہے، لہروں اور تیزی کے معنی میں بھی آیا ہے، اور بعض نے "مور" کی دورانی حرکت سے بھی تفسیر کی ہے۔

ان تفاسیر کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "مور" اسی حرکت سریع اور دورانی کو کہتے ہیں جو آمد و رفت اور اضطراب و تموج کے ساتھ ہوتی ہے۔

اس طرح سے کرات آسمانی پر حکمران نظام، قیامت کے قریب درہم برہم ہو جائے گا، وہ اپنے مداروں سے منحرف ہو جائیں گے، اور ہر طرف آمد و رفت کریں گے، اور پھر انہیں لپیٹ کر تہ کر دیا جائے گا، اور ان کی جگہ خدا کے حکم سے ایک نیا آسمان برپا ہوگا جیسا کہ سورۂ انبیاء کی آیت ۱۰۴ میں کہتا ہے: یوم نطوی السماء کطی السجل للکتب: وہ دن جس میں آسمان کو طومار کی طرح لپیٹ دیں گے۔

اور سورۂ ابراہیم کی آیت ۴۸ میں یہ آیا ہے: یوم تبدل الارض غیر الارض والسماوات:

---

[1] "یوم" منصوب ہونے ظرفیت کے عنوان سے اور "واقع" سے متعلق ہے جو گزشتہ آیات میں آیا ہے۔

"وہ دن جس میں یہ زمین دوسری زمین سے، اور یہ آسمان دوسرے آسمانوں سے بدل جائیں گے۔"

قرآن کی دوسری آیات میں بھی ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں، جو کرات آسمانی کے شگافتہ ہونے کی خبر دیتی ہیں۔ (انفطار۔۱) اور ان کے اپنی جگہ سے اکھڑ جانے کی (تکویر۔۱۱) اور ان کے درمیان فاصلہ پڑنے کی (مرسلات۔۹) حکایت کرتی ہیں۔ ہم انشاءاللہ ان آیات کے ذیل میں بھی اس سلسلہ میں بحث کریں گے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور وہ دن کہ جس میں پہاڑ حرکت میں آجائیں گے۔" (و تسیر الجبال سیرًا)۔

ہاں پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے اور حرکت کرنے لگیں گے اور اس کے بعد قرآن کی دوسری آیات کی شہادت کی بنا پر بکھر جائیں گے "کالعھن المنفوش" (دھنکی ہوئی روئی) کی طرح ہو جائیں گے۔ (قارعہ۔۵) اور اس کی جگہ ایک صاف اور ہموار بے آب و گیاہ زمین ظاہر ہوگی، فیذرھا قاعًا صفصفًا۔ (طٰہٰ۔۱۰۶)[1]

یہ سب اس بات کی طرف اشارہ ہیں کہ یہ دنیا اور اس کی تمام پناہ گاہیں درہم برہم ہو جائیں گی، اور ایک نیا جہان نئے نظاموں کے ساتھ اس کی جگہ لے گا، اور انسان اپنے اعمال کے نتائج کے روبرو ہوگا۔

لہٰذا اس کے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "جب ایسا ہے تو پھر اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے وائے ہے"! (فویل یومئذ للمکذبین)۔[2]

ہاں! جب عالم کی دگرگونی سے پیدا ہونے والے اضطراب اور وحشت نے سب کو گھیر رکھا ہوگا، اس وقت ایک عظیم وحشت مکذبین کو لاحق ہوگی، جو کہ عذاب الٰہی ہے، چونکہ "ویل" ایک نامطلوب حادثہ کے وقوع پر تاسف واندوہ کا اظہار ہے۔

اس کے بعد ان مکذبین کا تعارف کراتے ہوئے فرماتا ہے: "وہی لوگ جو باطل باتوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہیں" (الذین هم فی خوض یلعبون)۔

یہ آیات قرآن کو "جھوٹ" اور پیغمبرؐ کے معجزات کو "جادو" کہتے ہیں، اور ان کے لانے والے کو "مجنون" شمار کرتے ہیں، تمام حقائق کو کھیل تماشا قرار دیتے ہوئے ان کا مذاق اڑاتے اور ٹھٹھا کرتے ہیں۔

باطل اور بے دلیل باتوں کے ساتھ حق سے جنگ کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے کسی تہمت اور جھوٹ سے انکار نہیں کرتے۔

"خوض" (بروزن حوض) باطل اور غلط باتوں میں وارد ہونے کے معنی میں ہے، اور اصل میں پانی میں وارد ہونے اور اس سے عبور کرنے کے معنی میں ہے۔

دوبارہ اس دن کا تعارف اور ان مکذبین کی سرگذشت کے بیان کے لیے ایک دوسری وضاحت کرتے ہوئے مزید کہتا

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۷ ص ۴۲۳ (سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۰۵ کے ذیل میں) رجوع کریں۔

[2] "فویل" میں "فا" تفریع کا ہے، یعنی چونکہ اس دن کوئی پناہ گاہ نہیں ہے لہٰذا ان تکذیب کرنے والوں پر وائے ہے۔

"وہ دن جس میں وہ خشونت اور سختی کے ساتھ جہنم کی آگ کی طرف ہانکے جائیں گے" (یوم یدعون الیٰ نار جھنم دعًا)۔[1]

"ان سے کہا جائے گا یہ وہی آگ ہے جس کا تم انکار کیا کرتے تھے (ھٰذہ النار التی کنتم بھا تکذبون)۔

اور ان سے یہ بھی کہا جائے گا: "کیا یہ جادو ہے؟ یا تم دیکھتے نہیں ہو"؟ (افسحر ھٰذا ام انتم لا تبصرون)۔

تم ہمیشہ دنیا میں یہ کہا کرتے تھے، محمدؐ جو کچھ لایا ہے وہ جادو ہے، اس نے جادوگری کے ذریعہ ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے تاکہ ہم حقائق کو نہ دیکھیں، ہماری عقل کو ختم کر دیا ہے، اور کچھ امور کو "معجزہ" کے نام سے تعارف کراتا ہے، اور کچھ باتیں "وحی الٰہی" کے عنوان سے ہمارے سامنے پڑھتا ہے، لیکن یہ سب چیزیں بے بنیاد ہیں، اور جادو کے سوا کچھ نہیں ہیں۔

لہٰذا قیامت کے دن سرزنش اور توبیخ کے عنوان سے — جب کہ وہ جہنم کی آگ کو دیکھیں گے اور اس کی حرارت کو محسوس کریں گے — ان سے کہا جائے گا، "کیا یہ جادو ہے"؟ کیا تمھاری آنکھوں پر پردہ ڈالا گیا ہے"؟

اسی طرح ان سے کہا جائے گا: "اس آگ میں داخل ہو جاؤ، اور اس میں جلتے رہو، چاہے صبر و شکیبائی کرو یا بیتابی اور گڑگڑاؤ، تمھارے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا" (اصلوھا فاصبروا اولا تصبروا سواء علیکم)۔

"کیونکہ تمھارے اعمال کا بدلہ صرف تمھارے اپنے ہی اعمال ہیں" (انما تجزون ما کنتم تعملون)۔

ہاں! یہ تمھارے اعمال ہی ہیں جو تمھاری طرف پلٹے ہیں، اور تمھارے پاؤں کی زنجیریں بن گئے ہیں، اس بنا پر گڑگڑانا اور آہ و نالہ اور اضطراب و بے تابی کوئی اثر نہیں رکھتی۔

یہ آیت "تجسم اعمال" کے مسئلہ اور ان کی انسان کی طرف بازگشت پر ایک جدید تاکید ہے، اور یہ پروردگار کی عدالت کے مسئلہ پر بھی ایک تاکید مجدد ہے، چونکہ جہنم کی آگ چاہے جتنی بھی جلانے والی ہو، اور اس کا عذاب چاہے جتنا دردناک ہو وہ خود انسانوں کے اعمال کے نتیجے اور ان کی تبدیل شدہ شکلوں کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔

چند نکات

۱۔ مجرموں کو دوزخ میں کس طرح لے جائیں گے۔

اس میں تو شک نہیں کہ انھیں جہنم کی طرف حقارت کے ساتھ، ذلیل کرتے ہوئے، جھڑکتے ہوئے، اور عذاب کرتے ہوئے لے جائیں گے، لیکن قرآن کی مختلف آیات میں اس سلسلہ میں گوناں گوں تعبیریں نظر آتی ہیں۔

سورہ "حاقہ" کی آیت ۳۰ و ۳۱ میں آیا ہے کہ: خذوہ فغلوہ ثم الجحیم صلوہ: اس کو پکڑلو، اور طوق و زنجیر میں جکڑ لو اور اس کے بعد جہنم کی آگ میں ڈال دو۔"

اور سورہ "دخان" کی آیت ۴۷ میں اس طرح آیا ہے کہ: خذوہ فاعتلوہ الیٰ سواء الجحیم: اس کو

---

[1] "دع" (بروزن جد) شدت کے ساتھ دھکیلنے اور خشونت و سختی کے ساتھ ہانکنے کے معنی میں ہے "یوم" ظرفیت کی وجہ سے منصوب ہے یا قبل کی آیت کے لفظ "یومئذٍ" کا بدل ہے۔

پکڑلو، اور سختی کے ساتھ اسے جہنم میں دھکیل دو۔"

متعدد آیات میں "سوق" اور ہانکنے کی تعبیر آئی ہے مثلاً سورۂ مریم کی آیت ۸۶: ونسوق المجرمین الی جھنم وردًا: ہم مجرموں کو (ان پیاسے اونٹوں کی طرح جنہیں پانی کی جگہ کی طرف لے جایا جاتا ہے) جہنم کی طرف ہانکیں گے۔

اس کے برعکس پرہیزگاروں اور متقیوں کو انتہائی احترام و اکرام کے ساتھ بہشت کی طرف لے جائیں گے، اور خدا کے فرشتے ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھیں گے، بہشت کے دروازوں کو ان کے لیے کھول دیا جائے گا، اور خازنان جنّت انہیں سلام اور خوش آمدید کہیں گے، اور انہیں بہشت میں ہمیشہ ہمیشہ کی سکونت کی بشارت دیں گے۔ (زمر-۷۳)۔

اس طرح سے "بہشت" اور "دوزخ" نہ صرف خدا کی "مہر" اور "قہر" کا مرکز ہے، بلکہ اُن میں سے ہر ایک میں داخلہ کے لیے پذیرائی بھی اسی مفہوم کو بیان کرنے والی ہے۔

۲۔ وہ لوگ جو باطل باتوں میں غوطہ زن ہیں

اگرچہ اوپر والی آیات میں، قرآن کا ہدف کلام زمانہ پیغمبر کے مشرکین ہیں، لیکن بلاشک یہ آیات عمومیت رکھتی ہیں۔ اور تمام مکذبین ان میں شامل ہیں، یہاں تک کہ مادی فلاسفہ (سائنس دان) جو مٹھی بھر ناقص خیالات و افکار میں غوطہ زن ہیں، عالم ہستی کے حقائق کو کھیل بنائے ہوئے ہیں، اور سوائے اس چیز کے جسے وہ اپنی قاصر عقل سے دریافت کرتے ہیں، کسی چیز کو قبول نہیں کرتے، وہ اسی بات کی توقع رکھتے ہیں کہ تمام چیزوں کو اپنی آزمائش گاہ میں دوربین کے ذریعہ دیکھیں، یہاں تک کہ خدا کی پاک ذات کو بھی، ورنہ اس کے وجود کو رسمی طور پر قبول نہیں کرتے۔

یہ بھی "فی خوض یلعبون" کے مصداق ہیں، اور باطل خیالات و نظریات کے ایک انبوہ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

انسانی عقل اپنے تمام تر فروغ کے باوجود نور وحی کے مقابلہ میں ایک شمع کے مانند ہے جو آفتاب عالم تاب کے سامنے روشن ہو۔ یہ شمع اس کو اجازت دیتی ہے کہ جہان مادہ کے تاریک ماحول سے نکل کر اور ماوراء طبیعت عالم کی طرف دروازہ کھولے، اور پھر آفتاب وحی کے نور میں ہر طرف پرواز کرے، اور بے کراں جہان کو دیکھے اور پہچانے۔

۱۷۔ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَعِیْمٍ ۝
۱۸۔ فٰكِهِیْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَ وَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ۝
۱۹۔ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا هَنِیْٓــًٔۢا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝
۲۰۔ مُتَّكِـــٕیْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ ۝
۲۱۔ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ مَاۤ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ كُلُّ امْرِیٴٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِیْنٌ ۝

ترجمہ

۱۷۔ لیکن پرہیزگار جنت کے باغوں اور فراواں نعمتوں میں ہوں گے۔

۱۸۔ اور جو کچھ ان کے پروردگار نے انہیں دیا ہے اس پر شاد و مسرور ہوں گے۔ اور ان کا پروردگار انہیں دوزخ کے عذاب سے بچالے گا۔

۱۹۔ (انہیں کہا جائے گا) کھاؤ اور پیو اور خوش رہو یہ سب کچھ ان اعمال کی وجہ سے ہے جنہیں تم انجام دیا کرتے تھے۔

۲۰۔ ان کی حالت یہ ہوگی کہ وہ قطاروں میں بچھائے گئے تختوں کے اوپر پہلو بہ پہلو تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے، اور ہم ان کی حور العین کے ساتھ تزویج کریں گے۔

۲۱۔ اور جو لوگ ایمان لائے، اور ان کی اولاد نے ان کی پیروی میں ایمان قبول کیا، تو ہم نے انکی اولاد کو بھی جنت میں ان کے ساتھ ملحق کر دیں گے، اور ان کے عمل میں سے کسی چیز کی کمی نہیں کریں گے، اور ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروی ہے۔

تفسیر

ہر شخص اپنے اعمال کے بدلہ میں گروی ہے

ان مباحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں مجرمین کی سزاؤں اور ان کے دردناک عذاب کے بارے میں گزرے ہیں۔ زیر بحث آیات میں ان کے نقطۂ مقابل یعنی فراواں نعمتوں اور بیکراں صلوں کے لیے جو مومنین اور پرہیزگاروں کو عطا کئے جائیں گے اشارہ کرتا ہے تاکہ ایک واضح موازنہ میں ہر ایک کی حیثیت واضح ہو جائے۔

پہلے کہتا ہے، "پرہیزگار جنت کے باغات میں فراواں نعمتوں میں مقیم ہوں گے" (ان المتقین فی جنات و نعیم)۔

"مومنین" کی بجائے "متقین" کی تعبیر اس لیے ہے کہ یہ لفظ ایمان کو بھی اپنے اندر لئے ہوئے ہے، اور عمل صالح کے پہلوؤں کو بھی، جیسا کہ قرآن سورۂ بقرہ کی آیت ۲ میں کہتا ہے: ذالک الکتٰب لاریب فیہ ھدًی للمتقین: اس آسمانی کتاب میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ اور یہ پرہیزگاروں کے لیے سبب ہدایت ہے۔

کیونکہ اگر انسان ذمہ داری قبول کرنے، احساس مسئولیت اور روح حق جوئی و حق طلبی کا حامل نہ ہو، جو تقویٰ کا ایک مرحلہ ہے، تو وہ کبھی بھی دین حق کی تحقیق کی کوشش نہیں کرتا، اور قرآنی ہدایت کو قبول نہیں کرتا۔

"جنات" اور "نعیم" صیغۂ جمع (باغات اور نعمتیں) کی صورت میں اور وہ بھی "نکرہ" کی صورت میں، ان باغات اور نعمتوں کے تنوع اور عظمت کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بعد بہشتوں کی روح پر ان عظیم نعمتوں کے اثرانداز ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ اس چیز سے جو ان کے پروردگار نے انہیں دی ہے شاد و مسرور ہیں، اور اس سلسلہ میں دلپذیر باتیں کرتے ہیں" (فاکھین بما اٰتاھم ربھم)[۱]

---

[۱] "فاکھین" "فکہ" (بروزن نظر) کے مادہ سے اور "فکاھہ" (بروزن شباھہ) مسرور اور ہنسی خوشی رہنے اور دوسروں کو شیریں باتوں اور مزاح سے مسرور کرنے کے معنی میں ہے، "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے "فاکھہ" ہر قسم کے پھل کے معنی میں ہے اور "فکاھت" صاحبان انس کی باتوں کے معنی میں ہے، بعض نے اوپر والی آیت میں یہ احتمال دیا ہے کہ "فاکھین بما اٰتاھم ربھم" کا جملہ انواع واقسام کے پھل کھانے کی طرف اشارہ ہے، لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے۔

ہاں! وہ خوشی سے اپنے جامہ میں پھولے نہ سمائیں گے ہمیشہ آپس میں ایک دوسرے سے مزاح کرتے رہیں گے، اور ان کے دل ہر قسم کے غم واندوہ سے خالی ہوں گے، اور وہ حد سے زیادہ آرام وسکون محسوس کریں گے۔

خاص طور سے یہ بات کہ: خدا نے انہیں عذاب وسزا کی طرف سے مطمئن کر دیا ہے، "اور ان کے پروردگار نے انہیں دوزخ کے عذاب سے بچالیا ہے" (ووقاھم ربھم عذاب الجحیم)۔

اس جملہ کے دو معانی ہوسکتے ہیں، پہلا پروردگار کی دوسری نعمتوں کے مقابلہ میں کسی مستقل نعمت کا بیان، دوسرے یہ کہ یہ سابقہ کلام کا پچھلا حصّہ ہو، یعنی جنتی دو چیزوں سے مسرور ہوں گے، ایک ان نعمتوں کی وجہ سے جو خدا نے انہیں دی ہیں، اور دوسرے ان عذابوں کی بنا پر جنہیں ان سے دور کر دیا ہے۔

ضمنی طور پر "ربھم" (ان کا پروردگار) کی تعبیر دونوں جملوں میں، خدا کے انتہائی لطف وکرم کی طرف، اور عالم میں اس کی ربوبیت کے جاری وساری ہونے کی طرف، ایک اشارہ ہے۔

اس اجمالی اور سربستہ اشارے کے بعد جنت میں پرہیز گاروں کی نعمتوں، اور سرور وشادمانی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے، "انہیں کہا جائے گا، مزے کے ساتھ کھاؤ اور پیو" (کلوا واشربوا ھنیئًا)۔

"یہ سب چیزیں ان اعمال کی وجہ سے ہیں جنہیں تم انجام دیا کرتے تھے" (بما کنتم تعملون)۔

"ھنیئًا" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہشت کی کھانے اور پینے کی چیزوں سے کسی قسم کے نامطلوب عوارض پیدا نہیں ہوتے، اور وہ اس جہان کی نعمتوں کے مانند نہیں ہیں، جو بعض اوقات مختصر طور پر کم یا زیادہ بیماری اور تکلیف پیدا کر دیتی ہیں۔

علاوہ ازیں ان کے حاصل کرنے کے لیے نہ تو کوئی مشقت کرنے کی ضرورت ہے، اور نہ ہی ان کے ختم ہونے اور تمام ہو جانے کا کوئی خوف ہے، اور اسی بنا پر یہ نعمتیں کامل طور پر گوارا اور مزہ دینے والی ہیں۔[1]

مسلمہ طور پر بہشت کی نعمتیں اپنے طور پر گوارا پر لطف اور مزیدار ہوں گی، لیکن یہ بات کہ فرشتے جنتیوں سے یہ کہیں گے، مزے لو اور لطف اٹھاؤ، یہ خود ایک دوسرا لطف اور مزیدار بات ہے۔

دوسری نعمت یہ ہے کہ وہ "قطاروں میں بچھے ہوئے تختوں کے اوپر ایک دوسرے کے ساتھ تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے" (متکئین علی سرر مصفوفة)۔

اور وہ دوسرے دوستوں اور مومنوں کے انس کی لذت سے بہت زیادہ بہرہ ور ہوں گے، کیونکہ یہ ایک معنوی لذت ہے جو بہت سی لذتوں سے مافوق ہے۔

"سرر" جمع ہے "سریر" کی "سرور" کے مادہ سے اصل میں ان تختوں کو کہا جاتا ہے جنہیں انس وسرور کی محافل کے لیے ترتیب دیتے ہیں، اور ان پر تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں۔

---

[1] "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے: الھنئ کل مالا یلحق فیہ المشقة ولا یعقبہ وخامة: ھنی وہ ایسی چیز ہے جس کے پیچھے مشقت اور دشواری نہ ہو۔

" مصفوفۃ" "صف" کے مادہ سے اس معنی میں ہے کہ یہ تخت ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے بچھائے گئے ہیں اور ایک عظیم محفلِ انس برپا کرتے ہیں۔

قرآن کی متعدد آیات میں یہ آیا ہے کہ بہشتی تختوں کے اوپر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھیں گے، " علی سرر متقابلین" (حجر ۴۷۔ صافات ۴۴)۔

یہ تعبیر اس چیز سے برعکس نہیں جو زیرِ بحث آیت میں آئی ہے، کیونکہ مجالس انس و سرور، جن میں کوئی فرق و امتیاز نہیں ہوتا، وہاں کرسیاں ایک دوسری کے ساتھ ساتھ بھی رکھتے ہیں اور مجلس کے گرداگرد بھی، جو ایک دوسری سے پیوستہ صفوں میں بھی ہوتی ہیں اور ایک دوسری کے آمنے سامنے بھی۔

" متکئین" کی تعبیر ان کے انتہائی سکون و آرام کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ انسان عام طور پر آرام و سکون کی حالت میں تکیہ کی ٹیک لگاتا ہے، اور وہ لوگ جو پریشان اور بے آرام ہوں وہ عام طور پر اس طرح نہیں ہوتے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے، گوری گوری، سفید رخ، خوبصورت اور موٹی موٹی آنکھوں والی عورتوں سے ہم ان کی تزویج کریں گے" (وزوجناھم بحور عین)[1]

یہ سب کچھ بہشتیوں کی " مادی" اور " معنوی" نعمتوں کا ایک حصہ ہیں، لیکن خدا صرف انہیں پر اکتفا نہیں کرے گا، بلکہ معنوی اور مادی نعمتوں کے ایک اور دوسرے حصہ کا بھی اس پر اضافہ کرے گا، : " جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور ان کی اولاد نے ان کی پیروی میں ایمان اختیار کیا ہے، ہم ان کی اولاد کو بھی جنت میں ان کے ساتھ ملحق کر دیں گے اور ہم ان کے عمل میں بھی کسی چیز کی کمی نہیں کریں گے" (والذین اٰمنوا واتبعتھم ذریتھم بایمان الحقنا بھم ذریتھم وما التناھم من عملھم من شیء)۔

یہ بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے کہ انسان اپنی صاحبِ ایمان اولاد اور اپنے متعلقین کو جنت میں اپنے پاس دیکھے، اور ان سے انس کی بنا پر ان سے لذت حاصل کرے، اور ان کے اعمال میں سے بھی کسی چیز کی کمی نہ کی جائے۔

آیت کی تعبیروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ بالغ اولاد ہے جو ماں باپ کے راستے میں قدم اٹھاتی ہے اور ایمان میں ان کی پیروی کرتی ہے اور دین و مذہب کے لحاظ سے ان سے ملحق ہوتی ہے۔

ایسے افراد اگر عمل کے لحاظ سے کچھ کوتاہی اور تقصیرات بھی رکھتے ہوں تو خدا ان کے صالح آباؤ اجداد کے احترام میں انہیں گا،

---

[1] " حور" جمع " حوراء" و " احور" اسے کہا جاتا ہے جس کی آنکھ کی سیاہی کامل طور پر مشکی اور اس کی سفیدی پورے طور پر شفاف ہو۔ یا یہ کلی طور سے کامل جمال اور خوبصورتی سے کنایہ ہے : کیونکہ خوبصورتی ہر چیز سے زیادہ آنکھوں میں تجلی کرتی ہے اور " عین" جمع " اعین" اور " عیناء" کی موٹی آنکھ کے معنی میں ہے اور اس طرح سے لفظ " حور" اور " عین" کا مذکر و مؤنث دونوں پر اطلاق ہوتا ہے، اور اس کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ جو جنت کی تمام بیویوں کو شامل ہے، باایمان مردوں کی ازواج اور بیویاں اور مومن عورتوں کے ازواج اور شوہر۔

(غور کیجئے)

اور ان کے مقام کو بلند کرے گا، اور انہیں بھی ان کے درجہ تک پہنچا دے گا، اور یہ والدین اور اولاد کے لیے ایک عظیم نعمت ہے[1]

لیکن مفسرین کی ایک جماعت نے یہاں "ذریہ" کو ایک عام معنی میں تفسیر کیا ہے، اس طرح سے یہ خورد سال بچوں کو بھی شامل ہے حالانکہ یہ تفسیر ظاہر آیت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی، کیونکہ ایمان میں پیروی بلوغ کے مرحلہ تک یا اس کے نزدیک پہنچنے کی دلیل ہے۔

مگر اس صورت میں کہ یہ کہا جائے کہ خورد سال بچے قیامت میں مرحلۂ بلوغ کو پہنچ جائیں گے، اور ان کی آزمائش ہوگی، جب وہ اس آزمائش میں کامیاب ہو جائیں گے تو وہ اپنے والدین سے ملحق ہو جائیں گے، جیسا کہ کتاب کافی میں یہ معنی ایک حدیث میں منقول ہوا ہے کہ لوگوں نے امامؑ سے مومنین کے اطفال کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا:

"جب قیامت کا دن ہوگا تو خدا ان سب کو جمع کرے گا ایک آگ روشن کرے گا، اور انہیں حکم دے گا کہ وہ اپنے آپ کو آگ میں گرا دیں، جو اس حکم پر عمل کریں گے آگ ان کے لیے سرد اور سالم ہو جائے گی، اور وہ سعادت مند ہیں، اور جو روگردانی کریں گے تو وہ لطف خدا سے محروم ہو جائیں گے۔"[2]

لیکن یہ حدیث علاوہ اس کے کہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہے دوسرے اعتراضات بھی اس کے متن پر وارد ہوتے ہیں جن کی تشریح کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

البتہ اس میں کوئی بات مانع نہیں ہے کہ چھوٹے بچے بھی والدین کے احترام میں جنت میں جائیں اور ان کے پاس قرار پائیں، گفتگو اس پر ہے کہ اوپر والی آیت اس مطلب کی طرف ناظر ہے یا نہیں؟ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ایمان میں والدین کی پیروی کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس سے مراد بالغ اولاد ہے۔

بہر حال چونکہ اس اولاد کا ارتقاء والدین کے درجہ تک ممکن ہے۔ تو اس سے یہ خیال ہوتا تھا کہ ماں باپ کے اعمال اولاد کو دے دیئے جائیں گے، لہٰذا اس کے بعد یہ بیان ہوا ہے کہ: "وما التناهم من عملهم من شيء" "ہم ان کے عمل میں سے کسی چیز کی کوئی کمی نہیں کریں گے۔"

ابن عباس پیغمبر گرامی اسلامؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

اذا دخل الرجل الجنة سأل عن ابويه وزوجته وولده فيقال له انهم لم يبلغوا درجتك وعملك، فيقول رب قد عملت لي ولهم فيؤمر بالحاقهم به:

"جس وقت انسان جنت میں داخل ہوگا، تو وہ اپنے ماں باپ بیوی اور اولاد کے بارے میں پوچھ گچھ

---

[1] ظاہر یہ ہے کہ والذین امنوا .... کا جملہ ایک مستقل جملہ ہے اور "واؤ" استیناف کے لیے ہے، مفسرین کی ایک جماعت (مثلاً علامہ طباطبائی، مراغی، اور مؤلف فی ظلال) نے یہی معنی اختیار کیا ہے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ زمخشری نے "کشاف" میں "حورالعین" پر اس کا عطف سمجھا ہے، حالانکہ یہ کوئی ایسا مناسب معنی نہیں رکھتا جو قرآن کی فصاحت و بلاغت کے ساتھ، مطابقت رکھتا ہو۔

[2] نور الثقلین ج ۵ ص ۱۴۹ (تلخیص کے ساتھ)۔

کرے گا، تو اسے کہیں گے کہ: وہ تیرے درجہ و مقام اور عمل تک نہیں پہنچے ہیں، تو وہ عرض کرے گا،
پروردگارا! میں نے اپنے لیے بھی اور ان کے لیے بھی عمل کیا تھا، تو اس وقت حکم دیا جائے گا کہ
انہیں بھی اس کے ساتھ ملحق کر دو۔" [1] و [2]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ: آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "ہر شخص اپنے اعمال میں گروی اور ان کے ہمراہ ہے" (کل امرئ بما کسب رھین)۔

اس بنا پر کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ پرہیزگاروں کے اعمال اور ان کے صلوں میں سے کسی چیز کی کمی نہ کی جائے۔ کیونکہ یہ اعمال ہر جگہ انسان کے ساتھ ہوں گے۔ اور اگر خدا متقین کی اولاد کے بارے میں کوئی لطف اور مہر کرے گا، اور انہیں جنت میں پرہیزگاروں کے ساتھ ملحق کرے گا، تو اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ ان کے اعمال کے بدلے سے کسی چیز کی کمی کر لی جائے گی۔

بعض مفسرین نے یہاں "رھین" کو مطلق طور سے "گروی رکھے ہوئے افراد" کے معنی میں لیا ہے، اور ان کا نظریہ یہ ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر انسان اپنے اعمال کے بدلے گروی رکھا ہوا ہے، چاہے اچھے ہوں یا برے اور ان کے مطابق ہی جزا و سزا پائے گا۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ تعبیر نیک اعمال کے بارے میں چنداں مناسبت نہیں رکھتی، بعض مفسرین نے یہاں "کل نفس" کو صرف بدکاروں کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ اور وہ یہ کہتے ہیں کہ: ہر انسان اپنے غلط اور شرک آلود اعمال کے بدلے میں "گروی" ہے، اور حقیقت میں ان کا اسیر اور محبوس ہے۔

اور بعض اوقات سورۂ مدثر کی آیہ ۳۸، ۳۹ سے بھی استدلال کیا ہے:

کل نفس بما کسبت رھینۃ الا اصحاب الیمین:

"ہر شخص ان اعمال کے بدلے گروی ہے جو اس نے انجام دیئے تھے سوائے اصحاب یمین کے۔"

(وہ لوگ جن کا نامہ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ اہل نجات ہیں)

لیکن یہ تفسیر بھی اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے، کہ قبل و بعد کی سب آیتیں متقین اور پرہیزگاروں کے بارے میں ہیں، اور ان میں شرک، مشرکین اور مجرموں کے بارے میں گفتگو موجود ہی نہیں ہے، مناسب نظر نہیں آتی۔

ان دونوں تفاسیر کے مقابلہ میں جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی جہت سے نامناسب ہے۔ ایک تیسری تفسیر بھی ہے، جو صدر آیت کے ساتھ بھی اور ماقبل و مابعد کی آیات سے بھی مکمل طور پر مطابقت رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ "رھن" کے معانی میں سے ایک معنی، لغت میں کسی چیز کی ملازمت اور اس کے ہمراہ ہونا بھی ہے، اگرچہ "رھن" کا مشہور معنی "وثیقہ" ہی ہے جو قرض کے مقابلہ میں ہوتا ہے، لیکن اصل لغت کے کلمات سے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معانی میں سے ایک ہمیشگی اور خدمت

---

[1] تفسیر مراغی جلد ۲۷ ص ۲۶۔

[2] "التناهم" "الت" (بروزن شرط) کے مادہ سے کم کرنے کے معنی میں ہے۔

گزاری بھی ہے۔[1]

بلکہ ان میں سے بعض تو اس کا اصلی معنی صراحت کے ساتھ وہی دوام و ثبوت ہی سمجھتے ہیں، اور انہوں نے " رھن بمعنی" وثیقہ" کو فقہا کی اصطلاحات میں سے شمار کیا ہے لہٰذا جب یہ کہا جاتا ہے کہ " نعمة راهنة " تو اس کا معنی پائیدار اور برقرار نعمت ہے۔[2]

امیرالمومنین علی علیہ السلام گزشتہ اقوام کے بارے میں فرماتے ہیں :

هاهم رهائن القبور ومضامين اللحود

" وہ قبروں کے رہین اور لحدوں میں سونے والے ہیں "۔[3]

اس طرح سے " كل امرئ بما كسب رهين " کے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص کے اعمال اس کے ساتھ اور ہمراہ ہوں گے، اور کبھی بھی اس سے جدا نہیں ہوں گے، چاہے نیک عمل ہوں یا بد ؟ اور اسی بنا پر "متقین" جنت میں اپنے اعمال کے ساتھ ہیں، اور اگر ان کی اولاد ان کے پاس قرار پائے گی تو اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ ان کے اعمال میں سے کچھ کمی کر دی جائے گی۔

سورہ "مدثر" کی آیت کے بارے میں جس نے " اصحاب الیمین" کو اس معنی سے استثنا کیا ہے۔ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ ایسے الطاف کے مشمول ہیں جو بے حساب ہے۔ اس طرح سے کہ ان کے اعمال ان الطاف الٰہی کے مقابلہ میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے۔[4]

بہرحال یہ جملہ اس واقعیت کی تاکید ہے کہ انسان کے اعمال کبھی بھی اس سے جدا نہیں ہوں گے، اور ہمیشہ تمام مراحل اور مواقف میں اس کے ہمراہ ہوں گے۔

---

[1] " لسان العرب" مادہ "رھن"۔

[2] "مجمع البحرین" مادہ رھن۔

[3] "نہج البلاغہ" خطبہ ۴۵۔

[4] سورۂ مدثر میں "اصحاب الیمین" کے استثنا کے بارے میں دوسری تفاسیر بھی موجود ہیں جو انشاء اللہ اسی آیت کے ذیل میں آئے گی۔

۲۲- وَ اَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّ لَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ○
۲۳- يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ○
۲۴- وَ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ○
۲۵- وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ○
۲۶- قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ○
۲۷- فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ وَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ○
۲۸- اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ○ ع

ترجمہ

۲۲- ہمیشہ انواع واقسام کے پھل اور گوشت جن کی وہ خواہش کریں گے ہم ان کے اختیار میں دے دیں گے۔

۲۳- وہ جنت میں شراب طہور سے پر جام، جن میں نہ بیہودگی ہے اور نہ گناہ، ایک دوسرے سے لیں گے۔

۲۴- اور ہمیشہ ان کے گرداگرد نوجوان لڑکے ان کی خدمت کے لیے گردش کریں گے، جو ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے صدف میں مروارید ہوں۔

۲۵- اس وقت ایک دوسرے کی طرف رخ کرکے (ماضی کے بارے میں) سوال کریں گے۔

۲۶- کہیں گے کہ ہم اپنے گھر والوں کے درمیان خوف وہراس میں تھے۔

۲۷- لیکن خدا نے ہم پر احسان کیا اور ہلاک کرنے والے عذاب سے ہمیں محفوظ رکھا۔

۲۸۔ ہم پہلے سے خدا کو نیکو کار اور رحیم کے القاب سے پکارتے تھے (اور پہچانتے تھے)۔

تفسیر

ہم اس دن خوف زدہ تھے اور آج انتہائی امن میں ہیں

گذشتہ آیات میں جنت کی نعمتوں میں سے نو حصوں کی طرف اشارہ ہوا تھا، اور زیر بحث آیات میں ان کو جاری رکھتے ہوئے، دوسرے پانچ حصوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے، اس طرح ان سب کے مجموعہ سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ آرام و آسائش و لذت و سرور و شادی کے لیے جو کچھ لازم و ضروری ہے وہ سب کچھ ان کے لیے جنت میں فراہم ہوگا۔

پہلے بہشتیوں کی غذاؤں میں سے دو حصوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہمیشہ انواع و اقسام کے پھلوں اور گوشت میں سے جس نوع کی طرف وہ مائل ہوں گے ہم اسے ان کے اختیار میں دے دیں گے" (وامددناھم بفاکھۃ ولحم مما یشتھون)۔

"امددناھم" "امداد" کے مادہ سے ادامہ و افزائش اور عطا کرنے کے معنی میں ہے یعنی جنت کے پھل اور کھانے اس قسم کے نہیں ہیں کہ وہ کھانے سے کم ہو جائیں، یا وہ دنیا کے پھلوں کے مانند نہیں ہیں۔ جو سال کی فصلوں میں بہت سی تبدیلیاں رکھتے ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، بلکہ ان میں ہمیشگی، جاودانی اور استمرار اور تسلسل ہے۔

"مما یشتھون (وہ جس میں سے چاہیں گے) کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بہشتی ان پھلوں اور غذاؤں کی نوع مقدار اور کیفیت کے انتخاب میں کامل طور سے آزاد ہوں گے وہ جو بھی چاہیں ان کے اختیار میں ہے۔

البتہ جنت کے کھانے صرف انہیں دو میں منحصر نہیں ہیں، لیکن یہ دو اہم غذائیں ہیں، "فاکھۃ" کو "لحم" پر مقدم رکھنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ "پھلوں" کو "گوشتوں" پر برتری حاصل ہے۔

اس کے بعد بہشتیوں کے خوشگوار اور مزیدار مشروبات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ بہشت میں شراب طہور سے پر جام ——— جن میں نہ تو مستی ہوگی، اور نہ ہی بیہودہ گوئی اور نہ کوئی گناہ ——— ایک دوسرے سے لیں گے" (یتنازعون فیھا کاسا لا لغو فیھا ولا تاثیم)۔

بلکہ وہ ایسی شراب ہے جو خوشگوار و لذت بخش ہے، نشاط آفرین اور روح پرور ہے، اور اس میں کسی قسم کا نشہ اور عقل کا فساد اور خرابی نہیں ہے، اور اس کے پینے سے کسی قسم کی بیہودہ گوئی اور گناہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اس میں سراسر ہوش اور جسمانی و روحانی لذت ہے۔

"یتنازعون" "تنازع" کے مادہ سے ایک دوسرے سے لینے کے معنی میں ہے۔ اور بعض اوقات کھینچا تانی اور لڑائی جھگڑے کے معنی میں بھی آتا ہے، لہٰذا بعض مفسرین نے کہا ہے: یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہشتی شوخی و مزاح اور سرور

وانبساط کی فراوانی کے باعث شراب طہور کے جام ایک دوسرے کے ہاتھ سے چھین چھین کر پئیں گے۔

لیکن جیسا کہ بعض ارباب لغت نے کہا ہے کہ: "تنازع" جب کسی موقع پر "کأس" (جام) کے لیے استعمال ہوتا ہے تو ایک دوسرے سے لینے کے معنی میں ہوتا ہے، کشمکش اور کھینچا تانی کے معنی میں نہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "کأس" اس جام کو کہتے ہیں جو شراب سے پر ہو، اور خالی برتن کو "کأس" نہیں کہتے۔[1]

بہرحال چونکہ کأس کی تعبیر بعض اوقات دنیا کی نشہ دینے والی شرابوں کے معنی کی یاد دلاتی ہے، لہٰذا مزید کہتا ہے: اس شراب میں نہ تو لغو اور بے ہودہ گوئی ہے اور نہ ہی گناہ، کیونکہ وہ ہرگز انسان کی عقل و ہوش کو زائل نہیں کرے گی، اس بناپر وہ غیر موزوں باتیں اور قبیح اعمال جو مستوں سے سرزد ہوتے ہیں، ہرگز ان سے سرزد نہیں ہوں گے۔ بلکہ اس بناپر کہ وہ شراب طہور ہے، انہیں زیادہ خالص، زیادہ پاک اور زیادہ ہوشیار کر دے گی۔

اس کے بعد چوتھی نعمت کو ـــــ جو بہشت میں خدمت گذاروں کے ہونے کی نعمت ہے ـــــ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے، "ہمیشہ ان کے گرداگرد نوجوان لڑکے ان کی خدمت کے لیے گردش کریں گے، جو ان موتیوں کی طرح ہوں گے جو صدف میں ہوتے ہیں" (ویطوف علیهم غلمان لهم کانهم لؤلؤ مکنون)۔

"مروارید صدف کے اندر" اس قدر تازہ صاف شفاف اور خوبصورت ہوتے ہیں، جس کی کوئی حد نہیں ہے، اگرچہ صدف کے باہر بھی ان کی خوبصورتی جوں کی توں باقی رہتی ہے لیکن ہوا کا گرد وغبار، اور ہاتھوں کی آلودگی، کچھ نہ کچھ اس کی صفائی میں کمی کر دیتی ہے، جنت کے خدمت گزار اس قدر خوبصورت، سفید چہرہ اور باصفا ہوں گے جیسا کہ صدف کے اندر مروارید ہوتے ہیں۔

"یطوف علیهم" (ان کے گرد طواف کریں گے) کی تعبیر خدمت کے لیے ان کی دائمی آمادگی کی طرف اشارہ ہے، اگرچہ بہشت میں خدمت گار کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی اور وہ جو کچھ چاہیں گے ان کے اختیار میں ہوگا، لیکن یہ خود بہشتیوں کے زیادہ سے زیادہ احترام کے لیے ہوگا۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اکرمؐ سے لوگوں نے سوال کیا کہ اگر خدمت گذار صدف میں موجود مروارید کی طرح ہوں گے تو پھر مخدوم یعنی جنت کے مؤمنین کس طرح کے ہوں گے تو آپؐ نے فرمایا:

والذی نفسی بیده فضل المخدوم علی الخادم کفضل القمر لیلة البدر علی سائر الکواکب

"مخدوم کی وہاں پر خادم پر برتری ایسی ہوگی جیسی کہ چودھویں کے چاند کو باقی ستاروں پر برتری ہے"۔[2]

---

[1] "راغب مفردات میں کہتا ہے: الکأس الاناء بما فیه من الشراب: "مجمع البحرین" میں بھی یہی تفسیر کأس کے بارے میں آئی ہے اور اگر شراب سے خالی ہو تو اسے "قدح" کہا جاتا ہے۔

[2] "مجمع البیان"، "کشاف"، "قرطبی"، "روح البیان" و "ابوالفتوح رازی"۔

"لھم" کی تعبیر اس بات کی نشاندھی کرتی ہے کہ مومنین میں سے ہر ایک کے لیے کچھ مخصوص خدمت گذار ہوں گے، اور چونکہ جنت غم و اندوہ کی جگہ نہیں ہے اس لیے وہ خدمت گذار بھی مومنین کی خدمت سے لذت حاصل کریں گے۔

اور اس سلسلہ کی آخری نعمت وہی مکمل سکون وآرام اور ہر قسم کے عذاب وسزا سے دلی اطمینان ہے۔ جیساکہ بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "اس حالت میں جب کہ وہ ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے ہوں گے، تو گذرے ہوئے دنوں کے حالات کے بارے میں ایک دوسرے سے سوال کریں گے" اور اس کا جنت کے حالات سے موازنہ کرتے ہوئے لذت حاصل کریں گے (و اقبل بعضھم علیٰ بعض یتساءلون)۔

"وہ کہیں گے ہم تو اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں خائف وترساں رہتے تھے" (قالوا انا کنا قبل فی اھلنا مشفقین)۔

باوجود اس کے کہ ہم اپنے گھر والوں کے درمیان رہتے تھے لہذا ہمیں تو امن وامان کا احساس کرنا چاہیئے تھا اگر پھر بھی ہم خائف ہی تھے، ہمیں اس بات کا ڈر لگا رہتا تھا کہ ناگوار حوادث اور عذاب الٰہی کسی بھی لمحہ آن پہنچے گا، اور ہمیں پکڑے گا۔

ہم اس بات سے ڈرتے تھے کہ ہماری اولاد اور گھر والے غلط راستے پر چل پڑیں گے، اور وادیِ ضلالت میں گمراہ وسرگرداں پھریں گے۔

اور ہمیں اس بات کا بھی خوف تھا کہ سنگدل دشمن ہمیں غفلت میں رکھ کر ہم پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں گے۔

"لیکن خدا نے ہم پر احسان کیا، اور اس کی رحمت واسعہ ہمارے شامل حال ہوئی، اور ہمیں ہلاک کرنے والے عذاب سے محفوظ رکھا" (فمن اللہ علینا و وقانا عذاب السموم)۔

ہاں! مہربان پروردگار نے ہمیں دنیا کے زندان سے اس کی تمام وحشتوں کے ساتھ نجات بخشی، اور اپنی نعمتوں کے مرکز یعنی جنت میں ہمیں جگہ دی۔

وہ جب اپنے ماضی کو یاد کرتے ہیں، اور اس کے جزئیات اپنے حافظہ میں لاتے ہیں، اور موجود حالات کے ساتھ ان کا موازنہ کرتے ہیں تو خدا کی عظیم نعمتوں اور اس کے مواہب کی قدر وقیمت کو زیادہ سے زیادہ پاتے ہیں، اور یہ بات ان کے لیے اور بھی زیادہ لذت بخش اور دلچسپ ہو جاتی ہے، کیونکہ اس موازنہ کے ذریعہ ان کی قدر وقیمت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

اہلِ جنت اس آخری گفتگو میں جو ان کی طرف سے یہاں نقل ہوئی ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں، کہ وہ خدا کے رحیم ہونے کو، وہاں ہر زمانہ سے زیادہ محسوس کرتے ہیں، وہ کہیں گے،: "ہم پہلے سے خدا کو پکارتے تھے اور اس کو نیک مطلوب اور رحیم کہہ کر تعریف کرتے تھے" (انا کنا من قبل ندعوہ انہ ھو البر الرحیم)۔

لیکن ہم یہاں ان صفات کی حقیقت کی تہ تک پہنچ جائیں گے، کہ اس نے ہمارے حقیر اعمال کے مقابلہ میں کتنی نیکیاں کی ہیں، اور ہماری اس قدر لغزشوں کے باوجود ہمیں اپنی رحمت کا مشمول کیا ہے۔

ہاں! قیامت کا منظر اور جنت کی نعمتیں خدا کے اسماء وصفات کی تجلی گاہ ہیں اور مومنین ان مناظر کا مشاہدہ کرکے ہر زمانہ سے زیادہ ان اسماء وصفات کی حقیقت سے آشنا ہوں گے، یہاں تک کہ دوزخ بھی اس کے صفات کو ہی بیان کرتی ہے، اور اس

کی حکمت، عدالت اور قدرت کی نشاندہی کرتی ہے۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ "یتساءلون" "سؤال" کے مادہ سے ایک دوسرے سے سوال کرنے کے معنی میں ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اہل جنت میں سے تمام اپنے دوستوں سے سوال کریں گے، اور ان کے ماضی کے حالات ان سے دریافت کریں گے، کیونکہ ان مسائل کو یاد کرنا، اور ان تمام مصائب و آلام سے نجات پانا، اور ان تمام نعمتوں کا حصول، خود بھی ایک لذت ہے، ٹھیک اسی طرح سے کہ جب انسان کسی خطرناک سفر سے لوٹتا ہے، اور امن و امان کے ماحول میں بیٹھتا ہے، تو اپنے ساتھیوں سے ان کے گذرے ہوئے حالات کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، اور ان کے نجات پانے سے اظہار خوشی کرتا ہے۔

۲۔ "مشفقین" "اشفاق" کے مادہ سے، جیساکہ "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے "خوف سے ملی ہوئی توجہ" کے معنی میں ہے اور جب وہ "من" کے لفظ سے متعدی ہو جائے تو "خوف" کا مفہوم اس میں زیادہ ظاہر ہوتا ہے۔ اور جس وقت "فی" کے لفظ سے متعدی ہو تو "توجہ اور عنایت" کا مفہوم اس میں زیادہ ظاہر ہوگا۔

یہ لفظ اصل میں "شفق" کے مادہ سے لیا گیا ہے یہ وہی روشنی ہے جو تاریکی کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے۔

اب یہ دیکھنا پڑے گا کہ وہ دنیا میں کس چیز کا خوف رکھتے تھے، اور کس چیز کی طرف توجہ اور عنایت رکھتے تھے۔

یہاں تین احتمال ہیں، جن کو ہم نے آیت کی تفسیر میں جمع کر دیا ہے۔ کیونکہ ان کے درمیان اختلاف نہیں ہے (خدا کا خوف اور اپنی نجات کی طرف توجہ، گھر والوں کے انحراف کا خوف اور ان کی تربیت کے معاملہ پر توجہ، دشمنوں کا خوف اور ان کے مقابلہ میں اپنی حفاظت کی طرف توجہ) اگرچہ بعد والی آیات کی طرف توجہ خصوصاً جملہ "فمن اللہ علینا ووقانا عذاب السموم" "خدا نے ہم پر احسان کیا، اور مار ڈالنے والے عذاب سے ہمیں بچا لیا"، سے پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

۳۔ "فی اھلنا" کی تعبیر یہاں ایک وسیع معنی رکھتی ہے۔ اور سب اولاد و ازواج اور احباب کو شامل ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اصولی طور پر اس قسم کی جمعیت کے درمیان ہر جگہ سے زیادہ امنیت کا احساس کرتا ہے۔ جب انہی کے درمیان خوف زدہ اور ہیبناک ہو، تو دوسرے حالات میں تو اس کی وضع و کیفیت معلوم ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تعبیر ایسے لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔ جو غیر مومن گھرانوں میں گرفتار تھے، یہاں تک کہ وہ خود ان سے ڈرتے تھے، لیکن اس کے باوجود ڈٹے رہے۔ اور لطف الٰہی پر بھروسہ کرتے ہوئے استقلال دکھایا اور ان جیسے نہ بنے۔

۴۔ "سموم" اس حرارت کے معنی میں ہے جو "مسام" بدن (وہ چھوٹے چھوٹے سوراخ جو جلد کی سطح پر ہوتے ہیں) میں داخل ہو جاتی ہے، اور انسان کو تکلیف پہنچاتی ہے یا اسے ہلاک کر دیتی ہے، اور باد سموم بھی ایسی ہی ہوا کو کہتے ہیں، اور "عذاب سموم" بھی اسی قسم کا عذاب ہے، "سم" کے لفظ کا ہلاک کرنے والے مواد پر اطلاق بھی، تمام بدن میں ان کے نفوذ کی بنا پر ہے۔

۵۔ "بر" جیساکہ "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے اصل میں خشکی کے معنی میں ہے (سمندر اور دریا کے مقابلہ میں)

اس کے بعد ان افراد پر جن کے نیک اعمال بہت زیادہ اور وسیع ہوں اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے، اور اس پاک نام کے لیے زیادہ شائستہ اور لائق خدا کی پاک ذات ہے، جس کی نیکی اور احسان نے تمام جہان والوں کو گھیر رکھا ہے۔

۶۔ "آیات کی جمع بندی": ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان آیات میں اور گزشتہ آیات میں حقیقت میں جنت کی نعمتوں کے چودہ حصے بیان کئے گئے ہیں۔

جنت کے باغات (جنات) ـــ اس کی گوناں گوں نعمتیں (نعیم) ـــ سرور و شادمانی ـــ عذاب جہنم سے امن و امان ـــ بہشت کے ماکولات و مشروبات میں سے گوارا طور پر کھانا پینا ـــ ایک دوسرے سے ملے ہوئے تختوں پر تکیہ لگا کر بیٹھنا ـــ حور العین میں سے بیویاں ـــ مومن اولاد کا ان کے ساتھ ملحق ہونا ـــ انواع و اقسام کے لذت بخش پھل ـــ انواع و اقسام کے گوشت ـــ جو کچھ وہ چاہیں گے ـــ شراب طہور سے پر جام ـــ مروارید جیسے خدمت گذار ـــ اور آخر میں مجلس انس برپا کر کے ماضی کو یاد کرنا اور موجودہ حالت سے لذت حاصل کرنا!

ان نعمتوں کا ایک حصہ تو مادی پہلو رکھتا ہے، اور دوسرے حصہ میں معنوی پہلو غالب ہے، ان سب چیزوں کے باوجود پھر بھی جنت کی مادی اور معنوی نعمتیں انہیں میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ جو کچھ بیان ہوا ہے وہ صرف ان کا ایک گوشہ ہے۔

۲۹۔ فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ۝ؕ
۳۰۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝
۳۱۔ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ۝ؕ
۳۲۔ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۝ۚ
۳۳۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ۚ
۳۴۔ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝ؕ

ترجمہ

۲۹۔ اب جبکہ ایسا ہے تو تم نصیحت کرتے رہو، کیونکہ تم اپنے پروردگار کے لطف سے کاہن و مجنون نہیں ہو۔

۳۰۔ بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک شاعر ہے، جس کی موت کا ہم انتظار کر رہے ہیں۔

۳۱۔ کہہ دو! کہ تم انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں (تم میری موت کا انتظار کرو اور میں اپنی کامیابی اور تمہاری نابودی کا انتظار کرتا ہوں)۔

۳۲۔ کیا ان کی عقلیں انہیں ان کاموں کا حکم دیتی ہیں؟ یا وہ سرکش قوم ہیں۔

۳۳۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کا اس نے خدا پر افتراء باندھا ہے، لیکن وہی ایمان نہیں رکھتے۔

۳۴۔ اگر وہ سچ کہتے ہیں تو وہ بھی اسی قسم کا کلام لے آئیں۔

شانِ نزول

ایک روایت میں آیا ہے کہ قریش "دارالندوہ" [1] میں جمع ہوئے تاکہ پیغمبر اسلامؐ کی دعوت کو روکنے کے لیے ـــــ جو ان کے نامشروع منافع کے لیے ایک عظیم خطرہ سمجھی جاتی تھی ـــــ غور و فکر کریں۔

"بنی عبدالدار" کے قبیلہ کے ایک شخص نے کہا: ہمیں اس کے مرنے کا انتظار کرنا چاہیئے، کیونکہ بہرحال وہ ایک شاعر ہے اور عنقریب دنیا سے چل بسے گا، جیسا کہ "زہیر" "نابغہ" اور "اعشیٰ" (زمانۂ جاہلیت کے تین شاعر) دنیا سے چلے گئے (جن کی بساط لپٹ گئی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بساط بھی اس کی موت کے ساتھ ہی لپٹ جائے گی) یہ کہہ کر وہ پراگندہ ہو گئے، تو اوپر والی آیات نازل ہوئیں، اور انہیں جواب دیا۔[2]

تفسیر

اگر سچ کہتے ہیں تو اس کے مانند کلام لے آئیں

گزشتہ آیات میں جنت کی نعمتوں اور پرہیزگاروں کی پاداشوں کے ایک قابلِ توجہ حصہ کو بیان کیا گیا تھا، اور ان سے پہلے کی آیات میں بھی دوزخیوں کے دردناک عذاب کا ایک حصہ آیا تھا۔

پہلی زیر بحث آیت میں گزشتہ آیات سے نتیجہ نکالتے ہوئے فرماتا ہے: "اب جبکہ معاملہ اس طرح ہے تو تم نصیحت کرتے رہو اور یاد دلاتے رہو" (فذکّر)۔

کیونکہ حق طلب لوگوں کے دل ان باتوں کے سننے سے زیادہ آمادہ ہوں گے، اور اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ تو ان کے لیے حق باتیں بیان کرے۔

یہ تعبیر اس بات کی اچھی طرح سے نشاندہی کرتی ہے، کہ ان دونوں گروہوں کی سزاؤں اور نعمتوں کے ذکر کرنے کا اصل مقصد، نئے حقائق کو قبول کرنے کے لیے روحانی طور پر آمادہ کرتا ہے اور حقیقت میں ہر بات کرنے والے کو اپنے کلام کے نفوذ اور بات کی تاثیر کے لیے اس روش سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

---

[1] "دارالندوہ" "قصی بن کلاب" عربوں کے مشہور جدِ اعلیٰ کا گھر جس میں اہم امور کے بارے میں مشورہ کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے، اور مشورے کرتے تھے، یہ گھر خانہ خدا کے قریب تھا، اور اس کا دروازہ کعبہ کی جانب کھلتا تھا، اور اس کی مرکزیت مجالس مشورت کے لیے خود قصی بن کلاب کے زمانہ سے تھی (سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۲۴ و جلد اول ص ۱۳۲)۔

[2] تفسیر مراغی جلد ۲۷ ص ۳۱۔

اس کے بعد ان اتہامات اور ناروا نسبتوں کا ذکر کرتے ہوئے جو ہٹ دھرم اور عناد رکھنے والے افراد پیغمبر کو دیا کرتے تھے، فرماتا ہے، ؛" اپنے پروردگار کے لطف وکرم اور اس کی نعمتوں کی برکت سے تو کاہن ومجنون نہیں ہے" (فما انت بنعمة ربك بكاهن ولا مجنون)۔

"کاھن" اس کو کہا جاتا تھا جو اسرار غیبی کی خبر دیتا تھا اور غالباً اس کا دعوٰی یہ تھا کہ وہ جنات کے ساتھ ارتباط رکھتا ہے، اور ان سے غیب کی خبریں حاصل کرتا ہے۔ خصوصاً زمانہ جاہلیت میں کاہن بہت تھے، منجملہ ان کے دو مشہور کاہن "شق" اور "سطیح" تھے، حقیقت میں وہ ایسے ہوشیار لوگ تھے جو اپنی ہوش وخرد سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے ان دعووں کے ذریعہ لوگوں کو سرست رکھتے تھے، کہانت اسلام میں حرام وممنوع ہے۔ اور کاہنوں کے قول کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ کیونکہ اسرار غیب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، اور اس کے بعد انبیاء اور ائمہ میں سے جس کے متعلق مصلحت سمجھتا ہے وہ انہیں ان کی تعلیم دیتا ہے۔

بہر حال قریش لوگوں کو پیغمبر اسلامؐ کے پاس سے ہٹانے کے لیے یہ تہمتیں ان پر لگاتے تھے، کبھی تو انہیں کاہن اور کبھی مجنون، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ ان دونوں صفات کے تضاد سے بھی واقف نہیں تھے، کیونکہ کاہن تو ہوشیار لوگ تھے، جو مجنون ہونے کے برعکس بات ہے۔ اور اوپر والی آیت میں ان دونوں افتراؤں کو جمع کرنا شاید ان کی اسی پراگندہ گوئی کی طرف اشارہ ہو۔

اس کے بعد تیسرے اتہام کو پیش کرتا ہے کہ وہ بھی گزشتہ صفات سے تضاد رکھتا ہے، فرماتا ہے: "بلکہ وہ کہتے ہیں کہ وہ ایک شاعر ہے جس کی موت کا ہم انتظار کر رہے ہیں" (ام یقولون شاعر نتربص به ریب المنون)۔

جب تک وہ زندہ ہے اس وقت تک اس کے اشعار کی رونق رہے گی اور وہ لوگوں کو اپنی طرف جذب کرتا رہے گا تھوڑی سی دیر کے لیے صبر کرو، یہاں تک کہ اس کی موت آجائے۔

اور اس کے اشعار کا دفتر اس کی عمر کے طومار کی طرح لپیٹ دیا جائے، اور طاق نسیاں کے سپرد ہو جائے، اس دن ہمیں راحت و آرام نصیب ہو جائے گا۔

جیسا کہ کتب لغت وتفسیر سے معلوم ہوتا ہے، "منون" "من" کے مادہ سے اصل میں دو معنی کے لیے آیا ہے "نقصان" اور "قطع و برید کرنا" اور یہ دونوں بھی ایک دوسرے سے قریبی مفہوم رکھتے ہیں۔

اس کے بعد لفظ "منون" موت کے بارے میں بھی اطلاق ہونے لگا، کیونکہ وہ "ینقص العدد و یقطع المدد" (افراد کو کم اور امداد کو منقطع کر دیتی ہے)

بعض اوقات "منون" زمانہ کے گذر جانے کو بھی کہا جاتا ہے، اس مناسبت سے کہ وہ بھی موت اور مرنے کا سبب، تعلقات کے ٹوٹنے اور افراد کی کمی کا باعث ہوتا ہے، اور بعض اوقات رات اور دن کو بھی "منون" کہتے ہیں اور وہ بھی ظاہراً اسی مناسبت کی وجہ سے ہے۔[1]

باقی رہا لفظ "ریب" اصل میں شک و تردد اور اس چیز کے توہم کے معنی میں ہے کہ جس کے اوپر سے بعد میں پردہ اٹھ جائے

---

[1] "لسان العرب"، "مفردات راغب"، "المنجد" اور "تفسیر قرطبی"، (طرف ... رجوع کیا جائے۔

گا اور حقیقت واضح و آشکار ہو جائے گی۔

یہ تعبیر جب موت کے بارے میں استعمال ہو، اور " ریب المنون " کہا جائے تو وہ اس لحاظ سے ہے کہ اس کے آنے کا وقت معلوم نہیں ہے، نہ کہ اس کا حقیقت میں واقع ہونا[1]

لیکن مفسرین کی ایک جماعت نے " ریب المنون " کی ، زیر بحث آیت میں " حوادث روزگار " کے معنی میں تفسیر کی ہے، یہاں تک کہ ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ لفظ " ریب " قرآن میں ہر جگہ " شک و تردد " کے معنی میں ہے، سوائے سورۂ طور کی اس آیت کے کہ جہاں " حوادث کے معنی میں ہے[2]

بعض مفسرین نے اس کی " اضطراب اور پریشانی کی حالت کے معنی میں بھی تفسیر کی ہے، اس بناپر " ریب المنون " وہ اضطرابی حالت ہے جو موت سے پہلے اکثر افراد کو عارض ہوتی ہے۔

ممکن ہے یہ تفسیر اوپر والے معنی کی طرف ہی لوٹے ، کیونکہ عام طور پر شک و تردید کی حالت اضطراب و پریشانی کا سرچشمہ بنتی ہے، اسی طرح ایسے حوادث بھی جن کی پیش بینی نہ ہو ایک قسم کا اضطراب اور شک و تردید اپنے ہمراہ لاتے ہیں، اس طرح سے یہ سب کے سب مفاہیم " شک و تردید " کی جڑ کی طرف ہی، جو اصل میں اس لفظ کا معنی ہے، منتہی ہوتے ہیں۔

اور دوسرے لفظوں میں " ریب " کے لیے تین معنی بیان ہوئے ہیں ، شک ، اضطراب ، حوادث ، اور یہ سب ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

بہر حال وہ اس چیز سے اپنے دل کو خوش کرتے تھے کہ کوئی حادثہ پیش آئے اور پیغمبرؐ کی عمر کا دفتر لپیٹ جائے ، اور ان کے گمان کے مطابق ، اس عظیم مشکل سے — جو آنحضرتؐ کی دعوت نے ان کے سارے معاشرے میں پیدا کر دی تھی — انہیں رہائی مل جائے۔

قرآن ایک پر معنی اور تہدید آمیز جملہ سے ، ان دل کے اندھے اور عناد رکھنے والے افراد کو جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے: " کہہ دو تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں " (قل تربصوا فانی معکم من المتربصین)۔

تم اپنی خام خیالی کے پورا ہونے کے انتظار میں رہو ، اور میں تمہارے لیے عذاب الٰہی کے انتظار میں ہوں۔

تم اس انتظار میں رہو کہ میری موت کی وجہ سے اسلام کی بساط لپیٹ دی جائے ، اور میں بھی پروردگار کی مدد سے اس انتظار میں ہوں کہ میری زندگی ہی میں دین اسلام عالمگیر ہو جائے ، اور میرے بعد بھی اپنے راستے کو جاری و ساری رکھے اور آفاقی و جاودانی ہو جائے۔

ہاں ! تم تو اپنے خیالات و تصورات پر تکیہ کئے ہوئے ہو ، اور میں پروردگار کے لطف خاص پر متکی ہوں۔

اس کے بعد انہیں شدید ترین طریقہ سے سرزنش و ملامت کرتے ہوئے کہتا ہے ، : " کیا ان کی عقلوں نے انہیں ان اعمال کا

---

[1] " راغب " (در مفردات)۔

[2] " قرطبی " جلد ۹ صفحہ ۶۲۴۲۔

حکم دیا ہے ؟ یا وہ ایک سرکش قوم ہیں ؟ (ام تأمرھم احلامھم بھٰذا ام ھم قوم طاغون)[1]۔

سرداران قریش اپنی قوم میں " ذوی الاحلام " (صاحبان عقل) کے لقب سے پہچانے جاتے تھے! قرآن کہتا ہے: یہ کون سی عقل ہے جو اس وحی آسمانی کو، جس کے تمام مضامین و مطالب سے حقانیت کی نشانیاں واضح ہیں، شعر و کہانت کا نام دیتی ہے؟ اور اس کے لانے والے کو — جو ایک زمانہ دراز سے امانت وعقل میں شہرت کا مالک ہے — کاہن و مجنون اور شاعر کہتی ہے؟

اس بناپر اس قسم کی تہمتوں اور الزامات کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ ان کی عقل کا فرمان نہیں ہے، بلکہ ان سب کا سرچشمہ روحِ عصیان و سرکشی ہے، جو ان افراد پر غالب ہے۔ جونہی کہ وہ اپنے نامشروع منافع کو خطرے میں دیکھتے ہیں، تو عقل کو الوداع کہہ دیتے ہیں اور حق تعالیٰ کے فرمان کے مقابلہ میں طغیان و سرکشی پر اتر آتے ہیں۔

" احلام " جمع " حلم " (بروزن فھم) " عقل " کے معنی میں ہے۔ لیکن " راغب " کے قول کے مطابق " حلم " حقیقت میں " ہیجان و غضب کے وقت اپنے اوپر کنٹرول کرنے " کے معنی میں ہے، جو عقل و درایت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی شمار ہوتا ہے، اور حلم (بروزن علم) کے ساتھ ایک مشترک تعلق رکھتا ہے) یہ لفظ (حلم) بعض اوقات " خواب و رؤیا " کے معنی میں بھی آیا ہے۔ اور زیر بحث آیت میں بھی اس قسم کی تفسیر بعید نہیں ہے یعنی ان کی باتیں پریشان خوابوں کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔

پھر ایک اور دوسری تہمت کی طرف — جو درحقیقت ان اتہامات کے سلسلہ کی چوتھی تہمت شمار ہوتی ہے۔ اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے، : " وہ کہتے ہیں : اس نے اس قرآن کا خدا پر افترا باندھا ہے۔ لیکن وہ ایمان نہیں رکھتے " (ام یقولون تقوّلہ بل لایؤمنون)۔

" تقوّلہ " " تقول " (بروزن تکلف) کے مادہ سے، اس گفتگو کے معنی میں ہے جسے انسان اپنی طرف سے گھڑ لیتا ہے درحالیکہ اس میں کوئی حقیقت و واقعیت نہیں ہوتی[2]۔

مشرکین اور ہٹ دھرم کافروں کا قرآن مجید اور پیغمبر کی دعوت کو تسلیم نہ کرنے کا یہ ایک اور بہانہ تھا، جس کی طرف قرآن کی آیات میں بار ہا اشارہ ہوا ہے۔

لیکن قرآن مجید انہیں ایک دندان شکن جواب دیتا ہے: فرماتا ہے " اگر وہ سچ کہتے ہیں کہ یہ بشر کا کلام ہے، اور فکر انسانی کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ تو پھر وہ بھی اس قسم کی بات بنا کر لے آئیں " (فلیأتوا بحدیث مثلہ ان کانوا صادقین)۔

---

[1] اس بارے میں کہ یہاں " ام " " استفہامیہ " ہے یا " منقطعہ " اور " بل " کے معنی میں، مفسرین میں سے ہر ایک نے ایک جدا احتمال دیا ہے اگرچہ اکثر نے دوسرے کو ترجیح دی ہے، لیکن آیات کا سیاق پہلے معنی سے مناسبت رکھتا ہے۔ لیکن توجہ رکھنا چاہیے کہ " ام " اس قسم کے مواقع پر حتمی طور سے ہمزہ استفہام کے بعد ہونا چاہیئے، اسی لیے فخر رازی نے اس کے لیے ایک تقدیر بیان کی ہے، اور وہ یہ ہے کہ " اانزل علیھم ذکر ام تأمرھم احلامھم بھٰذا " (کیا ان پر خدا کی طرف سے کوئی بات نازل ہوئی ہے یا ان کی عقلیں اس قسم کا حکم کرتی ہیں؟) جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کو یا تو دلیل منقول کا تابع ہونا چاہیئے یا دلیل عقل کا۔"

[2] " مجمع البیان " میں آیا ہے : التقول: تکلف القول ولا یقال ذالک الا فی الکذب۔

تم بھی انسان ہو، اور خود اپنے قول کے مطابق تم مکمل ہوش، بیان کی استطاعت اور انواع واقسام کی گفتگو سے آگاہی اور اس پہ قدرت رکھتے ہو، تو تمہارے خطیب اور مفکرین اس جیسی بات بنا کر لانے کی طاقت کیوں نہیں رکھتے ؟

"فلیأتوا" (پس لے آؤ) کا جملہ اصطلاح کے مطابق امر تعجیزی ہے، اور اس کا ھدف اور مقصد یہ ہے کہ قرآن کے مقابلہ میں ان کے عجز وناتوانی کو مقابلہ بالمثل سے ثابت کرے، اور یہ وہی چیز ہے جسے علم کلام میں "تحدی" اور چیلنج سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی مخالفین کو معجزات کے مقابلہ میں معارضہ اور مقابلہ بالمثل کی دعوت۔

بہر حال یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے، جو وضاحت کے ساتھ قرآن کے اعجاز کو روشن وآشکار کرتی ہیں، اور اس کا مفہوم پیغمبر کے زمانہ کے لوگوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے، بلکہ تمام ایسے لوگ جو کسی بھی قرن اور زمانہ میں یہ کہتے ہوں کہ قرآن انسان کا کلام ہے، اور خدا پر افترا باندھا گیا ہے، وہ بھی اس خطاب کے مخاطب ہیں، کہ اگر وہ سچ کہتے ہیں تو اس جیسا کلام لے آئیں۔

اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں، قرآن کی یہ ندا، اس آیت میں بھی، اور اس کے مشابہ دوسری آیات میں بھی، ہمیشہ سے بلند ہے، اور چودہ صدیوں کے اندر، جو بعثت پیغمبرؐ کے بعد سے گذر چکی ہیں، کوئی بھی اس کا مثبت جواب نہیں دے سکا، حالانکہ مسلمہ طور سے دشمنانِ اسلام خصوصاً ارباب کلیسا (عیسائی) اور یہودی، اربوں ڈالر سالانہ اسلام کے برخلاف پروپیگنڈے پر صرف کر رہے ہیں، ان کے لیے کوئی بات مانع نہیں تھی کہ ان کا ایک حصہ مخالف دانشمندوں ادیبوں اور سخن وروں کے کسی گروہ کو دے دیتے تاکہ وہ قرآن کے مقابلہ میں معارضہ ومقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں، اور "فلیأتوا بحدیث مثلہ" کا مصداق بنیں، اور یہ عمومی عجز، اس وحی آسمانی کی اصالت کا ایک زندہ گواہ ہے۔

ایک مفسر نے یہاں ایک نکتہ پیش کیا ہے جو قابل توجہ ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ اس قرآن میں ایک مخصوص راز ہے، اور جو شخص بھی اس کی آیات کے مقابل آتا ہے، وہ اسے محسوس کر لیتا ہے۔ اس سے پہلے کہ اسرار اعجاز کے بارے میں گفتگو کی جائے۔

وہ اس قرآن کی عبارتوں میں ایک خاص نفوذ وغلبہ کو محسوس کرتا ہے۔ اور ان معانی کے ماوراء ایک اور چیز عقل انسانی میں منعکس ہوتی ہے، اس کی عبارتوں کے اندر ایک ایسا عنصر پوشیدہ ہے۔ جو سننے کے ساتھ ہی انسان کے وجود میں سما جاتا ہے، بعض اس کا آشکارا طور پر اور بعض پنہاں طور سے ادراک کرتے ہیں۔ لیکن بہر حال یہ غلبہ اور نفوذ موجود ہے، ایسا اسرار آمیز نفوذ جس کے ظہور کو اچھی طرح مشخص نہیں کیا جا سکتا۔

کیا یہ قرآن کے کلمات اور عبارتیں ہیں جو اس قسم کا انداز رکھتی ہیں ؟

یا اس کے معانی کے عمق اور گہرائی میں کوئی راز چھپا ہوا ہے،

یا وہ عکس ہیں جو اس کے انوار سے چمکتے ہیں،

یا یہ سب ملے جلے امور ہیں ؟

غرض وہ جو کچھ بھی ہے، ان سب کلمات ومفاہیم سے۔ جو لغات کے قالب میں ڈھالے جاتے ہیں مختلف ہے۔

یہ وہ راز ہے جو قرآن کی آیات میں چھپا ہوا ہے، اور ہر شخص پہلی ہی مرتبہ جب اس کے سامنے ہوتا ہے تو اسے محسوس کرلیتا ہے اور اس کے بعد دوسرے اسرار کی تلاش میں لگ جاتا ہے، جو غور و فکر کے ذریعہ سارے قرآن سے حاصل ہوتے ہیں۔[1]

اعجاز قرآن کے سلسلہ میں مختلف طریقوں سے مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی پہلی جلد (سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳ کے ذیل میں) کی طرف رجوع کریں، وہاں ایک تفصیلی بحث اس سلسلہ میں پیش کی گئی ہے، اسی طرح جلد ۶ (سورۂ اسراء کی آیت ۸۸ کے ذیل میں)۔

---

[1] "فی ظلال القرآن" جلد ۷ صفحہ ۵۰۶

۳۵۔ اَمۡ خُلِقُوۡا مِنۡ غَيۡرِ شَیۡءٍ اَمۡ هُمُ الۡخٰلِقُوۡنَ ؕ
۳۶۔ اَمۡ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ ۚ بَلۡ لَّا يُوۡقِنُوۡنَ ؕ
۳۷۔ اَمۡ عِنۡدَهُمۡ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمۡ هُمُ الۡمُصَۜيۡطِرُوۡنَ ؕ
۳۸۔ اَمۡ لَهُمۡ سُلَّمٌ يَّسۡتَمِعُوۡنَ فِيۡهِ ۚ فَلۡيَاۡتِ مُسۡتَمِعُهُمۡ بِسُلۡطٰنٍ
مُّبِيۡنٍ ؕ
۳۹۔ اَمۡ لَهُ الۡبَنٰتُ وَلَكُمُ الۡبَنُوۡنَ ؕ
۴۰۔ اَمۡ تَسۡــَٔلُهُمۡ اَجۡرًا فَهُمۡ مِّنۡ مَّغۡرَمٍ مُّثۡقَلُوۡنَ ؕ
۴۱۔ اَمۡ عِنۡدَهُمُ الۡغَيۡبُ فَهُمۡ يَكۡتُبُوۡنَ ؕ
۴۲۔ اَمۡ يُرِيۡدُوۡنَ كَيۡدًا ؕ فَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا هُمُ الۡمَكِيۡدُوۡنَ ؕ
۴۳۔ اَمۡ لَهُمۡ اِلٰهٌ غَيۡرُ اللّٰهِ ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ

ترجمہ

۳۵۔ کیا وہ کسی چیز (سبب) کے بغیر پیدا کئے گئے ہیں یا وہ خود ہی اپنے خالق ہیں ؟
۳۶۔ کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے ؟ بلکہ وہ یقین کے طلبگار ہی نہیں ہیں۔
۳۷۔ کیا ان کے پاس پروردگار کے خزانے ہیں ؟ یا وہ عالم کی تمام چیزوں پر غلبہ و تسلط رکھتے ہیں ؟
۳۸۔ کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے (جس کے ذریعہ وہ آسمان کے اوپر چڑھ جاتے ہیں) اور اس کے ذریعہ اسرار وحی کو سنتے ہیں ؟ ان میں سے جو بھی کوئی یہ دعویٰ رکھتا ہو تو وہ کوئی واضح دلیل پیش

کرے !

۲۹۔ کیا خدا کے حصّہ میں تو لڑکیاں ہیں اور تمہارے حصّہ میں لڑکے ؟ (کہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہو)۔

۴۰۔ کیا تو ان سے اجر اور مزدوری کا مطالبہ کرتا ہے جس کے بھاری بوجھ کے نیچے وہ دب گئے ہیں ؟

۴۱۔ کیا ان کے پاس غیب کے اسرار ہیں جسے وہ لکھ لیتے ہیں ؟

۴۲۔ کیا وہ تیرے لیے کوئی شیطانی منصوبہ بنانا چاہتے ہیں ؟ لیکن وہ جان لیں کہ ان شیطانی منصوبوں کے جال میں خود کافر ہی گرفتار ہوں گے۔

۴۳۔ یا وہ خدا کے علاوہ کوئی اور معبود رکھتے ہیں (جس نے ان کی مدد کرنے کا وعدہ کیا ہوا ہے) جسے وہ خدا کا شریک بناتے ہیں خدا کی ذات اس سے پاک اور منزہ ہے۔

تفسیر

سچ سچ بتاؤ تمہاری صحیح بات کونسی ہے ؟ !

یہ آیات، قرآن، نبوت اور پروردگار کی قدرت کے منکرین کے مقابلہ میں اسی طرح سے گزشتہ استدلالی بحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

یہ ایسی آیات ہیں، جو سب کی سب " ام " کے ساتھ، جو یہاں استفہام کے لیے ہے، شروع ہوئی ہیں، اور " گیارہ پے در پے سوالوں کی " ایک عمدہ لڑی کو (استفہام انکاری کی صورت میں) ایک استدلال کے طور پر بیان کرتی ہیں۔ اور زیادہ واضح تعبیر میں —— مخالفین کے سامنے فرار کے تمام راستوں کو بند کر رہی ہیں —— اور ان مختصر اور پر نفوذ عبارتوں میں گھیر کر انہیں اس طرح سے ایک تنگ جگہ میں لے آئی ہیں۔ کہ انسان اس کی عظمت اور انتظام کے سامنے بے اختیار سر تعظیم جھکاتے ہوئے، اقرار و اعتراف کرتا ہے۔

پہلے مسئلہ خلقت و آفرینش سے شروع کرتے ہوئے کہتا ہے : " کیا بغیر کسی سبب کے پیدا ہوئے ہیں، یا خود ہی اپنے خالق ہیں " (ام خلقوا من غیر شیء ام ھم الخالقون)۔[۱]

---

[۱] اس آیت کی تفسیر میں دوسرے احتمال بھی دیئے گئے ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ آیت کا مفاد یہ ہے کہ " کیا وہ بلا مقصد (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

یہ کوتاہ اور مختصر عبارت حقیقت میں "علیت کی معروف دلیل" کی طرف اشارہ ہے۔ جو فلسفہ و کلام میں خدا کے وجود کے اثبات کے لیے بیان کی جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ عالم جس میں ہم رہتے ہیں بلاشک وشبہ حادث ہے (کیونکہ وہ ہمیشہ تغیر و تبدیلی کی حالت میں ہے، اور جو چیز تغیر اور دگرگونی کی حالت میں ہو وہ حادث ہوتی ہے، اور جو چیز حادث ہو اس کے لیے محال ہے کہ وہ قدیم وازلی ہو)۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر عالم حادث ہے تو وہ پانچ حالتوں سے خالی نہیں ہے۔

۱۔ وہ بغیر کسی علت وسبب کے وجود میں آیا ہے۔

۲۔ وہ خود اپنے وجود کی علت ہے۔

۳۔ عالم کے معلولات اس کے وجود کی علت ہیں۔

۴۔ یہ جہان ایک ایسی علت کا معلول ہے کہ وہ بھی اپنی نوبت میں ایک دوسری علت کی معلول ہے، اور غیر متناہی سلسلہ تک معاملہ آگے جاتا ہے۔

۵۔ یہ جہان خداوند واجب الوجود کی مخلوق ہے جس کی ہستی اور وجود خود اسی کی ذات پاک سے ہے۔

پہلے چار احتمالوں کا باطل ہونا معلوم ہے، کیونکہ:

معلول کا وجود علت کے بغیر محال ہے، ورنہ ہر چیز ہر طرح کے حالات میں وجود میں آسکتی ہے جبکہ ایسا نہیں ہے۔

دوسرا احتمال کہ کوئی چیز خود اپنے آپ کو وجود میں لے آئے، یہ بھی محال ہے، کیونکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے وجود سے پہلے موجود ہو، اور یہ اجتماع نقیضین ہے (غور کیجئے)

اسی طرح تیسرا احتمال بھی، کہ انسان کی مخلوقات ومعلول اس کی خالق وعلت ہو، واضح طور پر باطل ہے (کیونکہ اس سے دور لازم آتا ہے)۔

اور چوتھا احتمال بھی، یعنی علل واسباب کا تسلسل اور اس سلسلہ کا غیر متناہی حد تک کھنچ جانا بھی ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ غیر متناہی معلول ومخلوق آخر مخلوق ہے، اور وہ ایک خالق کی محتاج ہے، جس نے اس کو ایجاد کیا ہے، کیا غیر متناہی صفر کوئی عدد بن سکتا ہے؟ یا غیر متناہی ظلمت سے نور پھوٹ سکتا ہے؟ یا غیر متناہی فقر و نیاز سے بے نیازی وجود میں آسکتی ہے؟

اس بنا پر پانچویں احتمال یعنی واجب الوجود کے خالق ہونے کو قبول کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ باقی نہیں رہتا، (پھر بھی غور کیجئے)۔

اور چونکہ اس برہان کا اصلی رکن، پہلے اور دوسرے احتمال کی نفی ہی ہے، لہٰذا قرآن نے اسی پر قناعت کی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ کا) اور ہدف کے پیدا کئے گئے ہیں، اور وہ کوئی پروگرام اور مسئولیت نہیں رکھتے"؟ اگرچہ اس معنی کو مفسرین کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے، لیکن دوسرے جملہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے (ام ھم الخالقون) سے واضح ہو جاتا ہے، کہ اس سے مراد وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے یعنی "کیا وہ بغیر کسی علت اور سبب کے پیدا کئے گئے یا وہ خود اپنی علت آپ ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مختصر سی عبارت میں کیا استدلال چھپا ہوا ہے۔

بعد والی آیت، ایک اور سوال کو بیان کرتے ہوئے ــ جو نچلے مرحلہ کے دعویٰ کے بارے میں ہے ــ کہتی ہے: کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے" (ام خلقوا السماوات والارض)۔

اگر وہ کسی علت کے بغیر وجود میں نہیں آئے، اور وہ خود اپنے وجود کی علت بھی نہیں ہیں تو کیا وہ واجب الوجود اور آسمانوں اور زمین کے خالق ہیں، اور اگر عالم ہستی کا مبدء نہیں ہیں، تو کیا خدا نے آسمان و زمین کی خلقت کا معاملہ ان کے سپرد کر رکھا ہے؟ اور اس طرح سے وہ ایک ایسی مخلوق ہیں جو خود فرمان خلقت رکھتی ہو ؟

مسلّمہ طور سے وہ ہرگز اس قسم کا باطل دعویٰ نہیں کر سکتے لہٰذا اس بات کے آخر میں مزید کہتا ہے، : "بلکہ وہ ہٹ دھرم ہیں اور یقین و ایمان لانا ہی نہیں چاہتے" (بل لا یوقنون)۔

ہاں ! وہ ایمان سے فرار کرنے کے لیے کسی بہانہ کی تلاش میں ہیں۔

اور اگر وہ ان امور کے مدعی نہیں ہیں، اور امر خلقت میں وہ کوئی حصہ نہیں رکھتے تو: "کیا تیرے پروردگار کے خزانے ان کے پاس ہیں"؟ (ام عندھم خزائن ربك)۔

تاکہ وہ جسے چاہیں نبوت و علم و دانش کی نعمت یا دوسرے رزق بخشیں، اور جس سے چاہیں روک لیں۔

یا پھر یہ بات ہے کہ عالم کی تدبیر کا کام ان کے سپرد کر دیا گیا ہے، اور وہ ہر چیز پر تسلط و اقتدار رکھتے ہیں"؟ (ام ھم المصیطرون)۔

وہ ہرگز بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وہ پروردگار کے خزانہ دار ہیں، اور نہ ہی وہ اس جہاں کی تدبیر کے معاملہ میں کوئی تسلط رکھتے ہیں، چونکہ ایک حادثہ، ایک بیماری یا کسی حقیر سے موذی جانور کے مقابلہ میں ان کا ضعف و ناتوانی، اور اسی طرح زندگی کے بالکل ابتدائی وسائل کے لیے ان کی ضرورت و احتیاج، ان قدرتوں کی ان سے نفی کی بہترین دلیل ہے۔ صرف ہوائے نفس، جاہ طلبی، خودخواہی، تعصب اور ہٹ دھرمی ہے جس نے انہیں حقائق سے انکار پر آمادہ کیا ہے۔

"مصیطرون" "ارباب الانواع" کی طرف اشارہ ہے جو گزشتہ لوگوں کی خرافات اور بے ہودہ باتوں کا ایک حصہ ہے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ عالم کی انواع میں سے ہر نوع کا۔ چاہے وہ انسان ہوں یا حیوانات یا نباتات وغیرہ انواع، ایک خاص مدبر و مربی ہوتا ہے جسے وہ اس نوع کا رب النوع کہتے تھے۔ اور خدا کو "رب الارباب" کا خطاب دیتے تھے۔ یہ شرک آمیز عقیدہ اسلام کی نظر میں مردود ہے۔ اور قرآن کی آیات میں تمام جہان کی تدبیر خدا ہی کے ساتھ مخصوص کی گئی ہے، اور اس کو ہم "رب العالمین" کہہ کر پکارتے ہیں۔

لہ "خزائن" جمع ہے "خزینہ" کی جو کسی چیز کے منبع اور مرکز کے معنی میں ہے، جس کی حفاظت اور دوسروں کی رسائی سے بچانے کے لیے اُسے وہاں جمع اور ذخیرہ کیا گیا ہو، قرآن مجید کہتا ہے : وان من شیء الا عندنا خزائنہ و ما ننزلہ الا بقدر معلوم : "ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم ایک معلوم اندازے کے مطابق ہی اُسے نازل کرتے ہیں"۔ (حجر۔ ۲۱)۔

یہ لفظ اصل میں "سطر" سے لیا گیا ہے، جو لکھنے کے وقت کلمات کی صفوں کے معنی میں ہے اور "مسیطر" اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کام پر تسلط رکھتا ہو اور اسے خط اور لائن دے، جیسا کہ لکھنے والا اپنے کلام کی سطور پر تسلط رکھتا ہے۔ (یہ بات دھیان میں رہے کہ یہ لفظ "صاد" کے ساتھ بھی لکھا جاتا ہے اور "سین" کے ساتھ بھی) اور دونوں کا ایک ہی معنی ہے اگرچہ قرآن کا مشہور رسم الخط "صاد" کے ساتھ ہے۔

یہ بات مسلّم ہے کہ پیغمبرؐ کی نبوت کے منکر اور زمانۂ جاہلیت کے مشرکین اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں میں سے کوئی بھی اوپر والے پانچ امور کا مدعی نہیں تھا۔ اس لیے بعد والی آیت میں ایک دوسرے مرحلہ کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: "کیا وہ اس بات کے مدعی ہیں کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، یا ان کے پاس کوئی ایسی سیڑھی ہے جس سے وہ آسمان کے اوپر چڑھ جائیں، اور وحی کے اسرار اس ذریعہ سے سن لیں"؟ (ام لهم سلم يستمعون فيه)۔

اور چونکہ یہ ممکن تھا کہ وہ اسرار آسمانی سے آگاہی کا دعویٰ کر دیں، لہٰذا قرآن بلا فاصلہ ان سے دلیل کا مطالبہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "جو شخص ان میں سے اس قسم کا دعویٰ رکھے اور یہ کہے کہ: میں آسمان پر چڑھ کر اسرار الٰہی کو سنتا ہوں تو وہ اپنے اس دعوے کے لیے کوئی واضح دلیل پیش کرے" (فليأت مستمعهم بسلطان مبين)۔

یقیناً اگر وہ اس قسم کا دعویٰ کرتے تو ایک بھی بات نہ کر سکتے، اور اس مطلب پر ہرگز کوئی دلیل پیش نہ کرتے۔[1]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: کیا یہ ناروا نسبت جو وہ فرشتوں کی طرف دیتے ہیں کہ وہ خدا کی بیٹیاں ہیں قابل قبول ہے؟ "کیا خدا کے حصہ میں بیٹیاں اور تمہارے حصہ میں بیٹے ہیں"؟ (ام له البنات ولكم البنون)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے باطل عقائد و افکار میں سے ایک یہ تھا کہ وہ بیٹیوں سے شدید نفرت کرتے تھے، اور اگر انہیں خبر ملتی تھی کہ ان کی بیوی نے بیٹی جنی ہے، تو ان کا چہرہ غم و اندوہ اور شرم و حیا کی شدت سے سیاہ ہو جاتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔

اگر ان کا عالم بالا کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ اور وہ اسرار وحی سے آشنا ہیں، تو کیا ان کی وحی کا نمونہ یہی مضحکہ خیز خرافات اور ننگین و شرم آگیں عقائد ہیں؟

یہ بات واضح ہے کہ لڑکی اور لڑکا انسانی قدر و قیمت کے لحاظ سے آپس میں کوئی فرق نہیں رکھتے، اور اوپر والی آیت کی تعبیر حقیقت میں طرف مقابل کے باطل عقیدے کے برخلاف استدلال کے قبیل سے ہے۔

قرآن نے متعدد آیات میں اس بیہودہ عقیدہ کی نفی پر تکیہ کیا ہے، اور انہیں اس سلسلہ میں محاکمہ میں لے جا کر رسوا کرتا ہے۔[2]

---

[1] "سلّم" (بروزن خرم) سیڑھی کے معنی میں ہے، اور بعض اوقات ہر قسم کے وسیلہ اور ذریعہ کے معنی میں آیا ہے، اس بارے میں کہ وہ کس چیز کے سننے کے مدعی تھے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض نے اس کی وحی کے ساتھ تفسیر کی ہے، اور بعض نے ان نسبتوں کے لیے جو وہ پیغمبر کو دیتے تھے جیسے شاعر و مجنون کی، یا وہ شریک جنہیں وہ خدا کے لیے خیال کرتے تھے، اور بعض نے پیغمبر سے نبوت کی نفی کے معنی میں تفسیر کی ہے (ان معانی میں جمع کرنا بھی بعید نہیں ہے اگرچہ پہلا معنی سب سے زیادہ واضح ہے۔

[2] اس بارے میں کہ زمانہ جاہلیت کے لوگ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کیوں سمجھتے تھے؟ جب کہ بیٹی سے متنفر اور بیزار تھے؟ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پھر اس مرحلہ سے ایک منزل اور نیچے اترا ہے، اور ایک دوسری بات کی طرف جو ان کی بہانہ جوئی کا وسیلہ ہو سکتی ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے،: "کیا تو تبلیغ رسالت کے مقابلہ میں ان سے کسی اجر و صلہ کا مطالبہ کرتا ہے، جو ایک بھاری بوجھ کی طرح ان کے دوش پر رکھا ہے"؟ (ام تسئلھم اجرًا فھم من مغرم مثقلون)۔

"مغرم" (بروزن مکتب) "غرم کے مادہ سے، اس نقصان کے معنی میں ہے جو بلا سبب انسان کے دامنگیر ہو جاتا ہے اور "غریم" طلب گار اور مقروض دونوں پر بولا جاتا ہے۔

"مثقل" "اثقال" کے مادہ سے، تحمیل، مشقت، اور بھاری بوجھ کے معنی میں ہے، اس بنا پر جملہ کا معنی اس طرح ہوگا، : "کیا تو تبلیغ رسالت کے لیے ان سے تاوان کا مطالبہ کرتا ہے جس کو ادا کرنے سے وہ ناتواں ہیں اور اس لیے وہ ایمان نہیں لاتے"؟

یہ معنی قرآن مجید میں — نہ صرف پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں بلکہ بہت سے پیغمبروں کے بارے میں — بارہا تکرار سے آئے ہیں کہ انبیاء کی سب سے پہلی باتوں میں سے یہ ہوتی تھی کہ وہ یہ کہتے تھے: "ہم تم سے دعوت الٰہی کی تبلیغ کے مقابلہ میں کسی قسم کے اجر و صلہ کا مطالبہ نہیں کرتے" تاکہ ان کی بے مثالی بھی ثابت ہو اور کسی طمع ولالچ کا نہ ہونا بھی۔ اور بہانہ تلاش کرنے والوں کے لیے کوئی بہانہ بھی باقی نہ رہے۔

ان سے دوبارہ سوال کرتے ہوئے کہتا ہے،: "کیا غیب کے اسرار ان کے پاس ہیں۔ اور وہ اس سے لکھ لیتے ہیں"؟ (ام عندھم الغیب فھم یکتبون)۔

یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پیغمبر ایک شاعر ہے، اور ہم اس کی موت اور شیرازۂ زندگی کے بکھر جانے کی انتظار میں ہیں اور اس کی موت سے تمام چیزیں ختم ہو جائیں گی اور اس کی دعوت نسیان کے سپرد ہو جائے گی، (جیسا کہ گزشتہ چند آیات میں مشرکین کا یہ قول بیان ہوا ہے: "نتربص بہ ریب المنون"

انہیں یہ کہاں سے پتہ چل گیا کہ وہ پیغمبر کی وفات کے بعد زندہ رہیں گے؟ یہ غیب انہیں کس نے بتایا ہے؟

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ: اگر تم اس بات کے مدعی ہو کہ تمھیں غیب کا علم ہے، اور تم احکام خداوندی کا علم رکھتے ہو، اور تم قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین سے بے نیاز ہو، تو یہ ایک عظیم جھوٹ ہے [1]

اس کے بعد ایک دوسرے احتمال کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "اگر ان امور میں سے کوئی بھی بات نہیں ہے، تو پھر انہوں نے شیطانی منصوبے بنائے ہیں، تاکہ پیغمبر کو درمیان سے ہٹا دیں یا اس کے دین سے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ کا) اور قرآن نے جو عمدہ دلائل ان کے برخلاف قائم کئے ہیں زیادہ تر جلد ۱۱ ص ...... سے آگے (آیہ ۷۵ سورہ نحل کے ذیل میں) اور جلد ۱۹ ص .... سے آگے سورہ صافات کی آیت ۱۴۹ کے ذیل میں بیان کئے جا چکے ہیں۔

[1] مفسرین کی ایک جماعت نے یہاں غیب کی "لوح محفوظ" کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ ان دعووں کی طرف اشارہ ہے جو بعض مشرکین رکھتے تھے اور کہتے تھے، : اگر کوئی قیامت ہونی ہوگی تو ہمارے لیے خدا کے ہاں بلند مرتبہ ہوگا۔ لیکن یہ تفاسیر اوپر والی آیات کے مفہوم اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ ارتباط سے کوئی زیادہ مناسبت نہیں رکھتیں۔

انہیں جان لینا چاہیے کہ کفار خدائی منصوبوں کے مقابلے میں مغلوب ہوں گے اور خدا کا منصوبہ ان کے منصوبے سے کہیں بلند ہے"
(ام یریدون کیدًا فالذین کفروا ھم المکیدون)[1]۔

اوپر والی آیت اس تفسیر کے مطابق سورۂ آل عمران کی آیت ۵۴ کی مانند ہے جو کہتی ہے :، ومکروا ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین :

مفسرین کی ایک جماعت نے یہ احتمال بھی قبول کیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ" ان کی سازشیں انجام کار انہی کے برخلاف تمام ہوں گی، جیساکہ سورۂ فاطر کی آیت ۴۳ میں آیا ہے، ولا یحیق المکر السیئ الا باھلہ : بُرے منصوبے صرف اپنے بنانے والوں کے ہی دامن گیر ہوتے ہیں "۔

دونوں تفسیروں کو جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ آیت گذشتہ آیت کے ساتھ ایک دوسرا تعلق رکھتی ہو، اور وہ یہ ہے کہ دشمنان اسلام کہتے تھے کہ : ہم محمدؐ کی موت کے انتظار میں ہیں، قرآن کہتا ہے کہ معاملہ دو حال سے خارج نہیں ہے، یا تو تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ وہ تم سے پہلے طبیعی موت سے مر جائے گا، تو اس بات کا لازمہ یہ ہے کہ تم اسرار غیب سے آگاہ ہو، اور اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ وہ تمہاری سازشوں کے ذریعہ ختم ہو جائے گا۔ تو یہ جان لو کہ خدا کے منصوبے تمہارے منصوبوں سے کہیں بالا ہیں اور تمہاری سازشیں خود تمہیں دامنگیر ہو جائیں گی۔

اور اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ" دارالندوہ " میں جمع ہو کر اور پیغمبر پر "کہانت"، "جنون"، "شاعری" جیسی تہمتیں لگانے سے، اس پر کامیاب ہونے میں قادر ہو جاؤ گے۔ تو یہ تمہارا خیال خام ہے، کیونکہ خدا کی قدرت تمام قدرتوں سے برتر ہے۔ اور اس نے اس عالمی دعوت کی تبلیغ کے لیے، اپنے پیغمبر کی سلامتی، نجات اور کامیابی کی ضمانت کرلی ہے۔

آخر میں آخری سوال میں ان سے پوچھتا ہے : کیا اُن کا خیال یہ ہے کہ وہ کوئی حامی اور مددگار رکھتے ہیں ؟"کیا خدا کے علاوہ ان کا کوئی اور معبود ہے"؟ (ام لھم الٰہ غیر اللہ)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے،؛" وہ پاک اور منزہ ہے اس سے جسے اس کا شریک قرار دیتے ہیں" (سبحان اللہ عما یشرکون)۔

اس بنا پر کوئی شخص ان کی حمایت پر قادر نہیں ہے۔

اس طرح سے وہ ان سے گیارہ عجیب وغریب مسلسل اور پے در پے سوالات کے ذریعہ باز پرس کرتا ہے، اور انہیں مرحلہ بہ مرحلہ ان کے دعووں سے پیچھے ہٹاتا اور نیچے اتارتا چلا جاتا ہے، اور اس کے بعد فرار کے تمام راستے ان کے سامنے بند کر دیتا ہے، اور انہیں مکمل طور پر محصور کر دیتا ہے۔

---

[1] "کید" (بروزن صید) ایک قسم کی چارہ جوئی کو کہتے ہیں جو بعض اوقات اچھی چارہ جوئیوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے لیکن زیادہ تر بُرے مقام پر استعمال ہوتا ہے، یہ لفظ مکر وفریب، سعی وکوشش اور جنگ کے معنی میں بھی آیا ہے۔

قرآن کے استدلالات کتنے دلنشین ہیں، اور اس کے سوالات اور طرز باز پرس کتنی عمدہ ہے، کہ اگر کسی میں حق جوئی اور حق طلبی کی روح موجود ہو، تو وہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کرلے گا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ آخری آیت میں دوسرے معبودوں کی نفی کے لیے کوئی دلیل بیان نہیں کی ہے اور صرف "سبحان اللہ عما یشرکون" کے جملہ پر اکتفا کر لیا ہے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ ان بتوں کی الوہیت کے دعوے کا بطلان — جو پتھر اور لکڑی سے بنائے گئے ہیں، یا کوئی بھی دوسری مخلوق، ان حاجات وضروریات اور کمزوریوں کے ساتھ، جو اُن میں پائی جاتی ہیں — اس سے کہیں زیادہ واضح و روشن ہے کہ اس کی تشریح کی جائے اور اس پر گفتگو کی جائے۔ علاوہ ازیں دوسری آیات میں بارہا اس موضوع کے ابطال کے لیے استدلال ہوا ہے۔

۴۴۔ وَإِن يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا يَقُولُوا سَحَابٌ مَّرْكُومٌ ○
۴۵۔ فَذَرْهُمْ حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُصْعَقُونَ ○
۴۶۔ يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ○
۴۷۔ وَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا دُونَ ذَٰلِكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ○
۴۸۔ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا ۖ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ○
۴۹۔ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ ○

ترجمہ

۴۴۔ (ایسے ہٹ دھرم ہیں کہ) اگر وہ یہ دیکھ لیں کہ پتھر کا کوئی ٹکڑا آسمان سے (ان کے عذاب کے لیے) گر رہا ہے تو وہ یہ کہیں گے یہ تو ایک تہ بہ تہ بادل ہے۔

۴۵۔ یہ بات ہے تو انہیں چھوڑ دے یہاں تک کہ ان کی اپنی موت کے دن سے ملاقات ہو جائے۔

۴۶۔ وہ دن جس میں ان کے منصوبے ان کی حالت کے لیے کچھ بھی مفید نہیں ہوں گے، اور کوئی بھی ان کی مدد نہیں کرے گا۔

۴۷۔ اور ظالموں کے لیے اس سے پہلے بھی ایک عذاب ہے (جو اسی جہان میں ہوگا) لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں۔

۴۸۔ اپنے پروردگار کے حکم کی تبلیغ کے راستہ میں صبر و استقامت سے کام لے کیونکہ تو مکمل طور سے

ہماری حفاظت میں ہے، اور جب تو کھڑا ہو تو اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد وثنا بیان کر۔

۴۹۔ (اسی طرح) رات میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے پشت پھیرنے اور طلوع صبح کے وقت۔

تفسیر

تو ہماری مکمل حفاظت میں ہے

اس بحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں مشرکین اور ہٹ دھرم منکرین کے بارے ہیں آئی ہے، جو ایک ایسی بحث تھی کہ ہر حق طلب انسان کے لیے حقیقت کو واضح کرتی تھی، ان آیات میں ان کے تعصب اور ہٹ دھرمی سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہتا ہے: "وہ ایسے ہٹ دھرم ہیں کہ اگر وہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں کہ ایک ٹکڑا آسمانی پتھروں کا عذاب الٰہی کے طور پر نیچے گر رہا ہے تو وہ یہ کہیں گے "تمھیں مغالطہ ہوا ہے، یہ پتھر نہیں ہے، یہ تو تہ بہ تہ بادل ہے۔ جو زمین پر برسنے والا ہے" (وان یروا كسفًا من السماء ساقطًا يقولوا سحاب مركوم)[1]۔

جو لوگ اس قدر ہٹ دھرم ہوں کہ محسوس حقائق کا بھی انکار کر دیں اور آسمانی پتھروں کو تہ بہ تہ بادل کہنے لگیں، حالانکہ تمام لوگوں نے بادل کو ــــ جب وہ زمین کے قریب ہوتا ہے ــــ دیکھا ہے کہ وہ بخارات کے مجموعہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، یہ لطیف بخارات تہ بہ تہ ہو کر پتھر میں کیسے تبدیل ہو سکتے ہیں ؟

ان افراد کی حقائق معنوی کے مقابلہ میں تکلیف و ذمہ داری واضح ہے۔

ہاں! گناہ، ہوا پرستی، عناد اور ہٹ دھرمی کی تاریکی انسان کی نگاہ کے افق کو اس طرح سے تیرہ و تاریک کر دیتی ہے کہ آخرکار وہ محسوسات کا بھی انکار کرنے لگ جاتا ہے، اور اس حالت میں اس کی ہدایت کی کوئی اُمید نہیں رہتی۔

"مرکوم" "متراکم" کے معنی میں ہے اور وہ ایک ایسی چیز ہوتی ہے جس کا بعض حصہ دوسرے بعض حصہ پر قرار پایا ہو۔

لہٰذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "اب جب کہ ایسا ہے تو ان کو چھوڑ دے اور اس ہٹ دھرم گروہ کی ہدایت کے لیے زور نہ دے، تاکہ وہ اپنے موت کے دن کی ملاقات کرتے ہوئے خدا کے عذابوں کو ــــ جو ان کے انتظار میں ہیں۔

---

[1] "کسف" (بر وزن فسق) کسی بھی چیز کے ٹکڑے کے معنی میں ہے اور من السماء کی تعبیر کی طرف توجہ کرتے ہوئے، یہاں آسمانی پتھر کا ٹکڑا مراد ہے، بعض کتب لغت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ کسفہ کی جمع ہے (جیسا کہ کسف بروزن پدر بھی جمع ہے) لیکن اکثر مفسرین نے اسے مفرد کے معنی میں لیا ہے۔ زیر بحث آیت سے ظاہر یہ ہے کہ یہ لفظ مفرد ہے کیونکہ اس کی صفت کو مفرد کی صورت میں لایا ہے۔

اپنی آنکھ سے دیکھ لیں" (فذرهم حتّی یلاقوا یومهم الذی فیه یصعقون)۔

"یصعقون" "صعق" اور "اصعاق" کے مادہ سے مار ڈالنے کے معنی میں ہے۔ اور اصل میں "صاعقہ" سے لیا گیا ہے، اور چونکہ صاعقہ لوگوں کو ہلاک کر دیتی ہے۔ لہٰذا یہ لفظ ہلاک کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بعض مفسرین نے اس جملہ کی، اختتام جہاں پر انسانوں کی عمومی موت سے، جو قیامت کا مقدمہ ہے، تفسیر کی ہے، لیکن یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے، کیونکہ وہ اس زمانہ تک باقی نہیں رہیں گے، بلکہ وہی پہلا معنی ہے۔ یعنی ان کو موت کے دن تک کے لیے ـــــ جو اخروی سزاؤں اور عذابوں کا سرآغاز ہے، چھوڑ دے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہو گیا ہے کہ "ذرهم" (انہیں چھوڑ دے) کا جملہ ایک تہدید آمیز امر ہے، اور اس سے مراد ایسے ناقابل ہدایت افراد کی تبلیغ پر اصرار کو ترک کر دینا ہے۔ اس بنا پر نہ تو پیغمبر کی طرف سے عمومی سطح پر تبلیغ کو جاری رکھنے کے ساتھ منافات رکھتا ہے اور نہ ہی فرمان جہاد کے ساتھ۔

اس بنا پر بعض کا یہ کہنا کہ: یہ آیت آیات جہاد کے ساتھ نسخ ہو گئی ہے، کسی طرح سے بھی قابل قبول نہیں ہے۔

اس کے بعد اس دن کا تعارف کراتے ہوئے کہتا ہے: "وہی دن، جس میں ان کی چارہ جوئی اور منصوبے انہیں کوئی فائدہ نہیں دیں گے، اور فرار کے تمام راستے ان کے سامنے بند ہو جائیں گے، اور کسی طرف سے ان کی مدد نہ کی جائے گی" (یوم لا یغنی عنهم کیدهم شیئاً ولا هم ینصرون)۔

ہاں جو شخص مرجاتا ہے اس کی قیامت صغریٰ برپا ہو جاتی ہے (من مات قامت قیامته) اور وہ جزاؤں اور سزاؤں کے لیے ابتداء ہوتی ہے، جن میں سے بعض تو برزخی پہلو رکھتی ہیں، اور بعض دوسری قیامت کبریٰ میں، یعنی انسانوں کی عمومی قیامت میں انہیں دامنگیر ہوں گی، اور ان دونوں مراحل میں نہ تو چارہ جوئیاں مؤثر ہوں گی اور نہ ہی ارادہ الٰہی کے مقابلہ میں کوئی ناصر و مددگار ہوگا۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ یہ تصور نہ کر بیٹھیں کہ صرف برزخ اور قیامت کا عذاب ہی ہوگا، بلکہ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم و ستم کیا ہے اور کفر و شرک اختیار کیا ہے، اس سے پہلے بھی اس دنیا میں ان کے لیے سزا و عذاب ہے، اگرچہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے" (وان للذین ظلموا عذاباً دون ذالك ولكن اكثرهم لا یعلمون)۔

ہاں! انہیں اس دنیا میں بھی ان عذابوں کے انتظار میں رہنا چاہیئے، جیسا کہ گزشتہ اقوام پر ہوئے، مثلاً صاعقے، زلزلے، آسمانی پتھر، خشک سالی، قحط یا سپاہ توحید کے مجاہدین کے توانا ہاتھوں سے قتل ہونا، جیسا کہ جنگ بدر میں سرداران شرک کے ایک گروہ کے لیے اتفاق ہوا، مگر یہ کہ وہ بیدار ہو جائیں، توبہ کر لیں اور خدا کی طرف پلٹ آئیں۔

یقیناً ان میں سے ایک گروہ تو قحط اور خشک سالی میں گرفتار ہوا، اور ایک گروہ۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ـــــ جنگ بدر میں قتل کر دیا گیا، لیکن ایک عظیم گروہ نے توبہ بھی کر لی، اور ایمان لے آئے، اور سچے مسلمانوں کی صف میں شامل ہو گئے، اور خدا نے انہیں اپنی عفو و بخشش میں شامل قرار دیا۔[1]

---

[1] وہ لوگ جو "فیه یصعقون" کو روز قیامت اور ابتداء قیامت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، انہوں نے زیر بحث (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"ولکن اکثرھم لا یعلمون" (لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے) کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ وہ عام طور پر اس عذاب سے، جو دنیا و آخرت میں ان پر آنے والا ہے، بے خبر ہیں، اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی اقلیت اس معنی سے آگاہ ہے لیکن اس کے باوجود ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے اپنی مخالفت پر اصرار کرتے ہیں۔

بعد والی آیت میں پیغمبر کو ان تمام کارشکنیوں، تہمتوں اور ناسزا باتوں کے مقابلہ میں صبر و استقامت کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: "اپنے پروردگار کے حکم کی تبلیغ کی راہ میں صبرِ و استقامت و شکیبائی اختیار کر" (واصبر لحکم ربك)[1]

اگر وہ تجھے کاہن، مجنون اور شاعر کہتے ہیں تو تُو صبر کر، اسی طرح اگر وہ آیات قرآنی کو افترا خیال کرتے ہیں جو خدا پر باندھے گئے ہیں تو تُو صبر و شکیبائی اختیار کر، اور اگر وہ ان تمام منطقی دلیلوں کے مقابلہ میں پھر بھی ہٹ دھرمی اور عناد کو جاری رکھتے ہیں، تو، تو استقامت اختیار کر، کہیں ایسا نہ ہو کہ تو مایوس اور ضعیف و ناتواں ہو جائے۔

"کیونکہ تو ہمارے علم کی نگاہوں کے سامنے ہے اور ہماری مکمل حفاظت میں ہے" (فانك باعیننا)۔

ہم ہر چیز کو دیکھ رہے ہیں اور ہر چیز سے باخبر ہیں، اور ہم تجھے تنہا نہیں چھوڑیں گے۔

"فانك باعیننا" کا جملہ بہت لطیف تعبیر ہے، جو پروردگار کے علم و آگاہی کو بھی بتاتا ہے، اور اس کی کامل حمایت اور لطف کو بھی بیان کرتا ہے۔

ہاں! انسان جب یہ احساس کرلے کہ کوئی بزرگ ہستی حاضر و ناظر ہے، اور وہ اس کی تمام کوششوں اور جدوجہد کو دیکھ رہی ہے، اور وہ دشمنوں کے مقابلہ میں اس کی حمایت کرتی ہے، تو اس موضوع کا ادراک اسے طاقت و توانائی بخشتا ہے، اور زیادہ سے زیادہ مسئولیت کا احساس بھی۔

اور چونکہ خدا سے راز و نیاز اور اس کی عبادت و بندگی اور اس کی ذات پاک کی تسبیح و تقدیس انسان کو آرام و سکون اور قوت و طاقت بخشتی ہے۔ لہٰذا صبر کا حکم دینے کے بعد فرماتا ہے: "جس وقت تو کھڑا ہو تو اپنے پروردگار کی تسبیح و حمد بجالا" (وسبح بحمد ربك حین تقوم)۔

جس وقت تو سحر کے وقت عبادت اور نماز شب کے لیے اٹھے۔

جس وقت تو نیند سے واجب نماز کے لیے اٹھے۔

اور جب بھی تو کسی مجلس و محفل سے کھڑا ہو تو اس کی حمد و تسبیح کر۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ کا) آیت میں عذابِ قبر اور عذابِ برزخ کے معنی میں لیا ہے، لیکن چونکہ وہ تفسیر ضعیف ہے لہٰذا یہ احتمال بھی ضعیف ہے۔

[1] "حکم ربك" سے مراد ممکن ہے وہی احکامِ الٰہی کی تبلیغ ہو کہ پیغمبر اس کی راہ میں صبر و شکیبائی کرنے پر مامور ہے، یا خدا کا عذاب ہے جس کا دشمنوں کو وعدہ دیا گیا ہے، یعنی انتظار کر یہاں تک کہ عذابِ الٰہی انہیں پکڑلے۔ یا اوامر الٰہی اور فرمان خدا کے معنی میں ہے، یعنی چونکہ خدا نے حکم دیا ہے کہ صبرِ و استقامت کر، اگرچہ تینوں تفاسیر کا جمع کرنا بھی ممکن ہے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے، خصوصاً "انك باعیننا" کے جملہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے۔

مفسرین نے اس آیت کی گوناں گوں تفسیریں کی ہیں لیکن ان سب کے درمیان جمع کرنا بھی ممکن ہے، چاہے وہ سحر کے وقت نماز تہجد کے لیے ہو، چاہے نیند کے بعد نماز فریضہ کے ادا کرنے کے لیے ہو، اور چاہے وہ ہر مجلس سے قیام کے بعد ہو۔

ہاں! اپنی روح اور جان کو خدا کی حمد و تسبیح کے ساتھ نور و صفا بخش، اور اپنی زبان کو اس کے ذکر سے معطر بنا، اس کی یاد سے مدد لے، اور دشمن کی کارشکنیوں سے مبارزہ کرنے کے لیے آمادہ ہو جا!

متعدد روایات میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ جس وقت کسی مجلس سے اٹھتے تھے تو خدا کی تسبیح اور حمد بجالاتے تھے اور فرماتے تھے:

"انه کفارة المجلس" یہ حمد و تسبیح مجلس کا کفارہ ہے۔[1]

منجملہ ان کے ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ جس وقت کسی مجلس سے اٹھتے تو فرماتے:

سبحانك اللّٰهم و بحمدك اشهد ان لا اله الّا انت، استغفرك و اتوب اليك

بعض لوگوں نے عرض کیا: اے رسول خدا یہ کیا کلمات ہیں جو آپ نے کہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

هن كلمات علمنيهن جبرئيل، كفارات لما يكون في المجلس

"یہ وہ کلمات ہیں جن کی جبرئیل نے (خدا کی طرف سے) مجھے تعلیم دی ہے، اور یہ اس چیز کا کفارہ ہے جو مجلس میں واقع ہوتی ہے"[2]

اس کے بعد آخری آیت میں مزید کہتا ہے: "اسی طرح رات میں اس کی تسبیح کر، اور ستاروں کے پشت پھیرنے کے وقت اور طلوع صبح کے وقت" (ومن الليل فسبّحه وادبار النجوم)۔

بہت سے مفسرین نے "ومن الليل فسبّحه" کے جملہ کی نماز شب کے ساتھ تفسیر کی ہے "وادبار النجوم" کی صبح کی دو رکعت نافلہ کے ساتھ، جو طلوع فجر کے آغاز اور نور صبح میں ستاروں کے پنہاں ہونے کے وقت پڑھی جاتی ہے۔

ایک حدیث میں حضرت علیؑ سے بھی آیا ہے کہ "ادبار النجوم" صبح کی دو رکعت نافلہ ہے جو نماز صبح سے پہلے اور ستاروں کے غروب کے وقت بجالاتے ہیں۔

باقی رہا "ادبار السجود" (جو سورۂ ق کی آیت ۴۰ میں آیا ہے) تو اس سے مراد وہ دو رکعت نافلہ ہیں، جو نماز مغرب کے بعد پڑھی جاتی ہیں (لیکن مغرب کے نوافل چار رکعتیں ہیں جن میں سے اس حدیث میں صرف دو رکعت کی طرف اشارہ ہوا ہے[3]

بہرحال، عبادت اور تسبیح و حمد خدا رات کے اندر اور طلوع فجر کے آغاز میں ایک اور ہی دوسرا لطف و صفا رکھتی ہیں، اور دکھاوے اور ریاکاری سے بہت دور ہوتی ہے، اور اس کے لیے روح کی آمادگی اور زیادہ ہو جاتی ہے، کیونکہ دن کی زندگی میں

---

[1] "تفسیر المیزان" جلد ۱۹ صفحہ ۲۴۔

[2] "در المنثور" جلد ۶ صفحہ ۱۲۰۔

[3] "مجمع البیان" سورہ ق کی آیت ۴۰ کے ذیل میں (جلد ۹ صفحہ ۱۵۰)۔

مشغول رکھنے والے کاموں سے فراغت ہوتی ہے، اور رات کی استراحت نے انسان کو آرام و سکون بخشا ہوا ہوتا ہے اور قیل وقال اور شور و غوغا نہیں ہوتا۔

حقیقت میں یہ وقت وہی وقت ہے جس میں پیغمبرؐ معراج پر گئے تھے۔ اور مقام "قاب قوسین" پر راز و نیاز کی خلوت گاہ میں پہنچے تھے، اور اپنے خدا کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کی تھیں۔

اسی بنا پر زیر بحث آیات میں ان دو اوقات پر تکیہ ہوا ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہوا ہے:

رکعتا الفجر خیر من الدنیا و ما فیہا

"تیرے لیے صبح کی نافلہ دو رکعت دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں"[1]

خداوندا! مجھے عمر بھر سحر خیزی اور اپنی ذات سے راز و نیاز کی توفیق مرحمت فرما۔

پروردگارا! ہمارے قلب کو اپنے عشق سے مطمئن اور اپنی محبت سے نورانی، اور اپنے لطف و کرم کا امیدوار بنا دے۔

بارالہا! ہمیں شیطانی قوتوں اور اپنے دشمنوں کی کارشکنیوں کے مقابلہ میں صبر و شکیبائی اور استقامت و پامردی مرحمت فرما۔ تاکہ ہم تیرے پیغمبرؐ کی پیروی کریں، ان کی سنت کے مطابق زندگی گذاریں، اور ان کی سنت پر ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہیں۔

آمین یا رب العالمین

سورۂ طور کا اختتام

۲۲ صفر ۱۴۰۶

۱۳۶۴/۸/۱۵

اختتام ترجمہ

تیئیسویں شب رمضان المبارک

۹ بجے شب ۱۴۰۷ھ قم بر مکان حقیر

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۶۲۵۱ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

سورۂ النجم

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا
اور
اس کی ۶۲ آیات ہیں

تاریخ شروع
۲۲، صفرالخیر ۱۴۰۶
۱۵ — ۸ — ۱۳۶۴

سورۂ النجم
کے
مطالب و مضامین

بعض مفسرین کے قول کے مطابق یہ سورہ وہ سب سے پہلا سورہ ہے جسے پیغمبرؐ نے اپنی دعوت کا اعلان کرنے کے بعد آشکارا اور بلند آواز سے حرم مکہ میں تلاوت کیا۔ اور مشرکین نے اُسے غور سے سنا، اور اس دن تمام مومنین کے ساتھ مشرکین تک نے بھی سجدہ کیا۔[1]

یہ سورہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق، بعثت کے پانچویں سال ماہِ مبارک رمضان میں نازل ہوا۔[2]

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ پہلا سورہ ہے جس میں سجدۂ واجب کی آیت نازل ہوئی۔[3] لیکن اس بات کے پیش نظر کہ مشہور روایت کے مطابق، سورہ "اقرأ" اس سے پہلے نازل ہوا تھا، اور اس کے آخر میں آیت سجدہ ہے۔ یہ روایت بعید نظر آتی ہے۔

بہرحال اس سورہ میں "مکی" ہونے کی بنا پر اصول عقائد کے مباحث خصوصاً "نبوت" و "معاد" کے بارے میں بیان ہوئے ہیں۔ اور یہ سرکوبی کرنے والی تہدیدوں اور بار بار کے انذار اور عذابِ الٰہی سے ڈرانے کے باعث کفار کو بیدار کرتی ہے۔

اس سورہ کے مضامین و مطالب کو سات حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ سورہ کے آغاز میں قرآن ایک پُرمعنی قسم کے بعد وحی کی حقیقت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ اور پیغمبرؐ کے پیک وحی "جبرائیل" سے براہ راست رابطہ اور تعلق کو واضح و روشن کرتا ہے۔ اور پیغمبرؐ کی ذات اقدس کو اس بات سے کہ وہ وحی الٰہی کے علاوہ کوئی اور بات کرے مبرا قرار دیتا ہے۔

۲۔ اس سورہ کے دوسرے حصہ میں قرآن پیغمبرؐ کی معراج سے متعلق گفتگو کرتا ہے، اور اس کے کچھ گوشوں کو مختصر اور پُرمعنی عبارتوں کے ساتھ مجسم کرتا ہے، کہ وہ بھی وحی کے ساتھ ایک مستقیم رابطہ ہے۔

۳۔ اس کے بعد بتوں کے سلسلہ میں مشرکین کے خرافات، فرشتوں کی عبادت اور دوسرے امور جو ہوا و ہوس کے سوا اور کچھ نہ تھے، پیش کرتے ہوئے ان کی سخت مذمت کرتا ہے، اور ان کی پرستش سے ڈراتا ہے۔ اور ایک قومی منطق کے ساتھ اس معنی کو ثابت کرتا ہے۔

---

[1] تفسیر روح البیان، جلد ۹ ص ۲۰۸۔

[2] تفسیر روح البیان، جلد ۹ ص ۲۰۸۔

[3] تفسیر "مراغی" جلد ۲۷ ص ۴۱۔

۴۔ ایک دوسرے حصہ میں ان منحرفین اور عام گنہگاروں پر توبہ کی راہ کھولتے ہوئے انہیں حق تعالیٰ کی "مغفرت واسعہ" کی نوید سناتا ہے، اور تاکید کرتا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہے، اور کوئی بھی شخص دوسرے کے گناہ کا بار اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا۔

۵۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے اس سورہ کے ایک اور دوسرے حصہ میں "مسئلہ معاد" کے کچھ گوشوں کو قرآن منعکس کرتا ہے، اور اس دنیا کی زندگی میں جو کچھ موجود ہے اس سے اس مسئلہ کے لیے ایک واضح دلیل قائم کرتا ہے۔

۶۔ حسب دستور گزشتہ اقوام کی دردناک سرنوشت کی طرف ـــــ جو حق سے دشمنی کے طریق میں اصرار، ہٹ دھرمی اور عناد رکھتے تھے، (جیسے قوم عاد، ثمود، نوح اور لوط) ـــــ کچھ اشارے کرتا ہے، تاکہ بے خبر غافلوں کو اس طریقہ سے بیدار کرے۔

۷۔ اور آخر میں پروردگار کی عبادت اور سجدہ کے امر کے ساتھ سورہ کو ختم کرتا ہے۔

اس سورہ کے امتیازات میں سے آیات کا مختصر ہونا، اور ان آیات کا ایک خاص آہنگ اور طرز پر ہونا ہے، جو اس کے مفاہیم کو ایک گہرا اور عمیق اثر بخشتا ہے، اور سوئے ہوئے لوگوں کے دل وروح کو بیدار کرتے ہوئے اپنے ساتھ آسمان کی طرف لے جاتا ہے۔

ضمنی طور پر اس سورہ کا نام "النجم" کے ساتھ اس سورہ کی پہلی آیت کی بنا پر ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

روایات میں اس سورہ کی تلاوت کے بارے میں کئی ایک اہم فضائل بیان ہوتے ہیں:

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

من قرأ سورة النجم اعطی من الاجر عشر حسنات بعدد من صدق بمحمد (ص) ومن جحد به

"جو شخص سورۂ النجم کو پڑھے گا خدا ان لوگوں کی تعداد کے مطابق جو پیغمبرؐ پر ایمان لائے تھے اور ان لوگوں کی تعداد کے مطابق جنہوں نے آپ کا انکار کیا دس نیکیاں اُسے عطا کرے گا"۔[1]

ایک اور حدیث میں امام صادق جعفر بن محمدؑ سے منقول ہے:

من کان یدمن قرائة "والنجم" فی کل یوم، او فی کل لیلة، عاش محمودًا بین الناس وکان مغفورًا له وکان محبیًا بین الناس

[1] "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۱۷۰۔

"جو شخص سورہ "النجم" کو ہر دن اور ہر رات تلاوت کرے گا، وہ لوگوں کے درمیان ایک قابلِ تعریف اور شائستہ شخص سمجھا جائے گا، خدا اس کو بخش دے گا۔ اور وہ لوگوں کے درمیان محبوب رہے گا"۔[1]

مسلمہ طور سے اتنی عظیم نعمتیں انہیں لوگوں کے لیے ہوں گی جو اس سورہ کی تلاوت کو غور و فکر، اور اس کے بعد عمل کا وسیلہ اور ذریعہ بنالیں، اور اس سورہ کی مختلف تعلیمات ان کی زندگی میں سایہ فگن ہوں۔

---

[1] "بحارالانوار" جلد ۹۲ ص ۳۰۵۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

۱۔ وَالنَّجۡمِ اِذَا هَوٰىۙ

۲۔ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمۡ وَمَا غَوٰىۚ

۳۔ وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰىؕ

۴۔ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ يُّوۡحٰىۙ

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ قسم ہے ستارے کی جس وقت وہ افول (غروب) کرے۔

۲۔ نہ تو تمھارا ساتھی (محمد) منحرف ہوا ہے اور نہ ہی اس نے مقصد کو گم کیا ہے۔

۳۔ اور وہ ہرگز بھی ہوائے نفس سے بات نہیں کرتا۔

۴۔ جو کچھ بھی وہ کہتا ہے اس وحی کے سوا کچھ نہیں ہے جو اس کی طرف وحی ہوئی ہے۔

تفسیر

قابل توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ سورہ (سورۂ طور) "النجوم" (ستاروں) کے لفظ پر ختم ہوئی تھی اور یہ سورہ "النجم" (ستارہ) کے لفظ سے شروع ہو رہی ہے، جس کی خدا نے قسم کھائی ہے، فرماتا ہے، "قسم ہے ستارے کی جس وقت وہ غروب کرتا ہے" (والنجم اذا ھوٰی)۔

اس بارے میں کہ یہاں "النجم" سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے بہت سے آرا دیئے ہیں، اور ہر ایک نے ایک الگ تفسیر

پیش کی ہے۔

ایک جماعت اسے "قرآن مجید" کی طرف اشارہ سمجھتی ہے، چونکہ یہ بعد والی آیات کے مناسب ہے جو وحی کے بارے میں ہیں، اور "نجم" کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ عرب اس چیز کو جو تدریجاً اور مختلف وقفے سے انجام پائے، "نجوماً" سے تعبیر کرتے ہیں (قرضوں کی اقساط اور اس قسم کے دوسرے امور میں "نجوماً" کی تعبیر بہت زیادہ استعمال ہوتی ہے) اور چونکہ قرآن ۲۳ سال کے عرصہ میں اور مختلف ٹکڑوں اور حصوں میں پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہوا ہے، لہٰذا "نجم" کے عنوان سے اس کا ذکر ہوا ہے۔ اور "اذا ھویٰ" سے مراد اس کا رسول خدا کے قلب پاک پر نزول ہے۔

ایک دوسری جماعت نے اسے آسمان کے ایک ستارہ مثلاً "ثریا"[1] یا "شعریٰ"[2] کی طرف اشارہ سمجھا ہے، کیونکہ یہ ستارے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "النجم" سے مراد وہ شہاب ہیں جن کے ذریعہ شیاطین کو آسمان کے منظر سے بھگایا جاتا ہے اور عرب ان شہابوں کو "نجم" کہتے ہیں۔

لیکن ان چاروں تفسیروں میں سے کوئی ایک بھی واضح دلیل نہیں رکھتی، بلکہ آیت کا ظاہر۔ جیسا کہ لفظ "النجم" کے اطلاق کا تقاضا ہے۔ آسمان کے تمام ستاروں کی قسم ہے، جو خدا کی عظمت کی ظاہر و آشکار نشانیوں میں سے ہیں، اور عالم آفرینش کے عظیم اسرار میں سے ہیں، اور پروردگار کی حد سے زیادہ عظیم مخلوقات میں سے ہیں۔

یہ پہلی مرتبہ نہیں ہے کہ قرآن جہانِ خلقت کے عظیم موجودات کی قسم کھا رہا ہے، دوسری آیات میں بھی سورج چاند اور اس قسم کی چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔

ان کے غروب پر تکیہ کرنا۔ حالانکہ ان کا طلوع زیادہ پرکشش ہوتا ہے۔ اس بنا پر ہے کہ ستاروں کا غروب ان کے حدوث کی دلیل ہے، اور ستارہ پرستوں کے عقیدہ کی نفی کی دلیل بھی ہے۔ جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کی داستان میں آیا ہے: "فلما جن علیہ اللیل رای کوکبًا قال ھٰذا ربی فلما افل قال لا احب الاٰفلین" "جس وقت رات کی تاریکی نے اسے چھپا لیا تو اس نے ایک ستارہ دیکھا اور کہا: کیا یہ میرا خدا ہے؟ لیکن جب اس نے غروب کیا تو کہا، میں غروب کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا" (سورہ انعام۔ ۷۶)

یہ معنی بھی قابل توجہ ہے۔ کہ مسئلہ "طلوع" "نجم" کے لفظ کے مادہ میں موجود ہے، کیونکہ "مفردات" میں راغب کے قول کے مطابق اصل "نجم" وہی "طلوع کرنے والا ستارہ ہے" اور یہی وجہ ہے کہ زمین میں گیاہ کے اُگنے، اور منہ میں دانت کے

---

[1] "ثریا" ایک سات ستاروں کا مجموعہ ہے جن میں چھ ظاہر ہیں اور ایک بہت ہی کم نور ہے، عام طور پر لوگوں کی نظر کی طاقت جانچنے کے لیے اس کے ذریعہ آزمائش کرتے ہیں اس ستارہ کی قسم ہو سکتا ہے اس کی ہم سے زیادہ مسافت کی بنا پر ہو۔

[2] "شعریٰ" آسمان کا ایک روشن ترین ستارہ ہے جس کے بارے میں ہم انشاء اللہ اسی سورہ کی آیہ ۴۹ کے ذیل میں مزید تشریح کریں گے اس کی قسم کھانے کی رمز ممکن ہے اس لحاظ سے ہو کہ وہ حد سے زیادہ روشن، درخشاں اور کئی خصوصیات کا حامل ہے۔

نکلنے، اور ذہن میں کسی نظریہ کے پیدا ہونے کو "نجم" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس طرح سے خدا نے ستاروں کے طلوع ہونے کی بھی قسم کھائی ہے، اور ان کے غروب کی بھی، کیونکہ یہ ان کے حدوث اور قوانینِ خلقت کے پابند ہونے کی دلیل ہے [1]

لیکن آیئے دیکھتے ہیں کہ یہ قسم کس لیے کھائی گئی ہے؟ بعد والی آیت اس طرح سے وضاحت کرتی ہے، : "ہرگز تمہارا ساتھی (اور دوست محمدؐ) منحرف نہیں ہوا ہے، اور اس نے اپنے مقصد کو کھویا نہیں ہے" (ماضل صاحبکم وما غوٰی)۔

وہ ہمیشہ حق کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے، اور اس کے گفتار و کردار میں معمولی سا بھی انحراف نہیں ہے۔

"صاحب" کی تعبیر جو دوست اور ہمنشین کے معنی میں ہے، ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ جو کچھ وہ کہتا ہے تمہاری محبت اور بھلائی کی بنا پر ہے۔

بہت سے مفسرین نے "ضلّ" اور "غوٰی" کے درمیان کوئی فرق قرار نہیں دیا، اور وہ انہیں ایک دوسرے کی تاکید سمجھتے ہیں، لیکن بعض کا کہنا یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان فرق ہے، "ضلالت" یہ ہے کہ انسان کبھی مقصد کی طرف کوئی راہ ہی نہ پائے۔ لیکن "غوایت" یہ ہے کہ اس کی راہ مستقیم اور غلطی سے خالی نہ ہو، پہلی کفر کی مانند ہے، اور دوسری "فسق و گناہ" کی طرح۔

لیکن "راغب" "مفردات" میں "غی" کے معنی میں کہتا ہے کہ : "وہ ایک ایسی جہالت ہے جو اعتقاد فاسد کے ساتھ ہو"۔

اس بنا پر ضلالت تو مطلق جہالت، نادانی اور بے خبری ہے لیکن غوایت ایسی جہالت ہے جو باطل عقیدے کے ساتھ ہو، بہر حال خدا یہ چاہتا ہے کہ اس عبارت میں اپنے پیغمبر سے ہر قسم کے انحراف، جہالت، گمراہی اور غلطی کی نفی کرے، اور وہ تہمتیں جو اس سلسلہ میں دشمنوں کی طرف سے آپ پر لگائی جاتی تھیں انہیں بے معنی قرار دے۔

اس کے بعد اس مطلب کی تاکید کے لیے، اور اس مطلب کو ثابت کرنے کے لیے، کہ وہ جو کچھ بھی کہتا ہے، خدا کی طرف سے کہتا ہے، : وہ ہرگز بھی ہوائے نفس کی بنا پر بات نہیں کرتا" (وما ینطق عن الھوٰی)۔

یہ تعبیر اسی استدلال سے مشابہ ہے جو گزشتہ آیت میں ضلالت و غوایت کی نفی کے سلسلہ میں بیان ہوئی ہے، کیونکہ عام طور پر گمراہیوں کا سرچشمہ ہوائے نفس کی پیروی ہی ہے۔

سورۂ ص کی آیت ۲۶ میں آیا ہے : ولا تتبع الھوٰی فیضلک عن سبیل اللّٰہ "ہوائے نفس کی پیروی نہ کرنا کیونکہ وہ تجھے خدا کے راستہ سے بھٹکا دے گی"۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علی علیہ السلام کی مشہور حدیث میں بھی یہ آیا ہے کہ :

اما اتباع الھوٰی فیصد عن الحق

---

[1] اگر بعض روایات میں "نجم" ذات پیغمبرؐ سے تفسیر ہوا ہے، اور ھوٰی ان کے شبِ معراج آسمان سے نزول ہے، تو وہ حقیقت میں آیت کے بطون میں سے ایک ہے، نہ کہ اس کا ظاہر۔

"باقی رہا ہوائے نفس کی پیروی کرنا تو وہ انسان کو راہِ حق سے روک دیتی ہے"۔ ؎

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ "ماضل صاحبکم" کا جملہ پیغمبر سے جنون کی نفی کو ظاہر کرتا ہے۔ اور "وما غوی" کا جملہ شاعر ہونے کی نفی کو ظاہر کرتا ہے، یا شعر کے ساتھ ہر قسم کے ارتباط سے، کیونکہ سورۂ شعراء کی آیت ۲۲۴ میں آیا ہے کہ:
"والشعراء یتبعھم الغاوون" شعراء ہی تو ہیں جن کی گمراہ لوگ پیروی کرتے ہیں، (خیال پرداز اور بے مقصد شعر کہنے والے)
اور "وما ینطق عن الھوٰی" کا جملہ کہانت کی نسبت کی نفی ہے۔ کیونکہ کاہن حرص پرست اور ہوس باز لوگ ہوتے ہیں۔

اس کے بعد پوری صراحت کے ساتھ کہتا ہے: "وہ جو کچھ لے کر آیا ہے وہ صرف وحی ہے جو خدا کی جانب سے اس کی طرف بھیجی گئی ہے" (ان ھو الا وحی یوحیٰ)۔

وہ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرتا، اور قرآن اس کی فکر کا نتیجہ نہیں ہے۔ وہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔ اور اس دعوے کی دلیل خود اسی میں چھپی ہوئی ہے، آیات قرآنی کا اچھی طرح مطالعہ اس بات کی گواہی دیتا ہے، کہ کوئی بھی انسان، چاہے وہ کتنا ہی عالم و مفکر ہو —— کجا وہ انسان جس نے کچھ لکھا پڑھا نہ ہو، اور اس نے ایک ایسے ماحول میں پرورش پائی ہو، جو جہالت و خرافات سے پُر ہو —— ہرگز بھی یہ قدرت نہیں رکھتا کہ وہ ایسی مطالب سے بھرپور باتیں بیان کرے، جو صدیاں گزرنے کے بعد بھی مفکرین کے دماغ کے لیے الہام بخش ہوں۔ اور وہ صالح، سالم، مومن اور پیش رفت کرنے والے معاشرے کے بنانے کی بنیاد بن سکیں۔

ضمنی طور پر اس بات پر توجہ رکھنا چاہیئے کہ یہ گفتگو صرف آیات قرآنی کے بارے میں نہیں ہے۔ بلکہ گزشتہ آیات کے قرینہ سے سنت پیغمبرؐ بھی اس میں شامل ہے، کیونکہ وہ بھی وحی الٰہی کے مطابق ہے، یہ آیت صراحت کے ساتھ کہتی ہے کہ وہ ہوا و ہوس سے گفتگو نہیں کرتا، وہ جو کچھ بھی کہتا ہے وحی سے کہتا ہے۔

ذیل کی جالب حدیث اس مدعا کا دوسرا شاہد ہے۔

"سیوطی" جو اہل سنت کے مشہور علماء میں سے ہے، تفسیر "درالمنثور" میں اس طرح نقل کرتا ہے:

"ایک دن رسولؐ خدا نے حکم دیا کہ تمام دروازے جو پیغمبرؐ کی مسجد کے اندر کھلتے تھے (علیؑ کے گھر کے دروازے کے سوا) بند کر دیئے جائیں۔ یہ امر مسلمانوں پر گراں گزرا، یہاں تک کہ رسولؐ کے چچا "حمزہ" نے اس بات کا گلہ کیا، کہ آپ نے اپنے چچا اور ابوبکر و عمر و عباس کے گھر کا دروازہ کس لیے بند کرایا اور اپنے چچازاد بھائی کے گھر کا دروازہ کھلا کیوں رکھا، (اور اس کو دوسروں پر ترجیح کیوں دی)"۔

جب پیغمبرؐ اس بات کی طرف متوجہ ہوئے کہ یہ بات ان پر گراں گزری ہے، تو آپ نے لوگوں کو مسجد میں آنے کی دعوت دی، اور خدا کی تمجید و توحید میں ایک بے نظیر خطبہ ارشاد فرمایا، اس کے بعد مزید فرمایا:

ایھا الناس ما انا سددتھا، ولا انا فتحتھا، ولا انا اخرجتکم و

؎ نہج البلاغہ کلام ۴۲۔

اسکنتہ ، ثم قرأ " والنجم اذا ھوٰی ما ضل صاحبکم وما غوٰی وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الّا وحی یوحٰی ،

" اے لوگوں نہ تو میں نے دروازوں کو بند کیا ہے، اور نہ ہی کھولا ہے نہ ہی میں نے تمھیں مسجد سے نکالا ہے اور نہ ہی میں نے اُسے (علی کو) ساکن کیا ہے (جو کچھ ہوا وہ فرمانِ الٰہی تھا) پھر آپ نے ان آیات کی تلاوت کی والنجم اذا ھوٰی ..... ان ھو الّا وحی یوحٰی "[1]

یہ حدیث جو پیغمبرؐ کے بعد امیرالمؤمنین علیؑ کے تمام امت اسلامی کے درمیان مقام والا کو بیان کرتی ہے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ نہ صرف پیغمبرؐ کے ارشادات اور اقوال ہی وحی کے مطابق ہوتے ہیں بلکہ ان کے اعمال و کردار بھی اسی طرح کے ہیں۔

---

[1] تفسیر درالمنثور جلد ۶ ص ۱۲۲ (کچھ تلخیص کے ساتھ)۔

۵۔ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝
۶۔ ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى ۝
۷۔ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝
۸۔ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝
۹۔ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝
۱۰۔ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝
۱۱۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝
۱۲۔ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝

ترجمہ

۵۔ اسے اس ہستی نے تعلیم دی ہے جو عظیم قدرت رکھتی ہے۔
۶۔ وہی ذات جو حد سے زیادہ توانائی اور ہر چیز پر تسلط رکھتی ہے۔
۷۔ جبکہ وہ افق اعلیٰ میں تھا۔
۸۔ پھر وہ نزدیک ہوا پھر اور نزدیک ہوا۔
۹۔ یہاں تک کہ اس کا فاصلہ دو کمان یا اس سے بھی کچھ کم ہوگیا۔
۱۰۔ یہاں خدا نے جس چیز کی وحی کرنی تھی اپنے بندے کو وحی کی۔
۱۱۔ اُس کے دل نے جو کچھ دیکھا اس میں ہرگز جھوٹ نہیں بولا۔

۱۲۔ کیا تم اُس سے اس چیز کے بارے میں جو اس نے دیکھا ہے مجادلہ کرتے ہو۔

تفسیر

دوست کا پہلا دیدار

گزشتہ آیات کے بعد، جو پیغمبرؐ اسلام پر نزولِ وحی کی گفتگو کر رہی تھیں، ان آیات میں معلم وحی کے بارے میں گفتگو ہے۔

لیکن پہلے یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ پہلی نظر میں ان آیات کو ابہام کا ایک ہالہ گھیرے ہوئے ہے، لہٰذا ان ابہامات کو دور کرنے کے لیے پوری دقت کے ساتھ، ان پر غور و فکر اور تحقیق کرنی چاہیئے۔

پہلے ہم ان آیات کی اجمالی تفسیر پیش کرتے ہیں، پھر ان کی تفصیلی تحقیق پیش کریں گے۔

فرماتا ہے: "اسے اُس ہستی نے تعلیم دی ہے، جو عظیم قدرت رکھتی ہے" (علمه شديد القوٰى)۔

پھر مزید تاکید کے لیے اضافہ کرتا ہے: "وہی ذات جو حد سے زیادہ توانائی اور ہر چیز پر تسلط رکھتی ہے" (ذومرة فاستوٰى)۔

(یہ تعلیم اسے اس وقت دی) "جب کہ وہ افقِ اعلیٰ میں تھا" (وهو بالافق الاعلٰى)۔

"پھر وہ نزدیک ہوا پھر اور نزدیک ہوا" (ثم دنٰى فتدلّٰى)۔

"یہاں تک کہ اس کے اور اس کے معلم کے درمیان کا فاصلہ دو کمان یا اس سے بھی کچھ کم ہو گیا" (فكان قاب قوسين او ادنٰى)۔

"اور یہاں خدا نے جس چیز کی وحی کرنی تھی وہ اپنے بندے کو وحی کی" (فاوحٰى الٰى عبده ما اوحٰى)۔

"پیغمبر کے دل نے جو کچھ دیکھا وہ سچ تھا اور اس نے ہرگز جھوٹ نہیں بولا" (ماكذب الفؤاد ما راٰى)۔

"کیا تم اس سے اس چیز کے بارے میں جو اس نے دیکھا ہے، جھگڑتے ہو، اور یقین نہیں کرتے" (افتمارونه علٰى ما يرٰى)۔

ان آیات کی تفسیر میں دو مختلف نظریے موجود ہیں، جن میں سے ایک مشہور اور دوسرا غیر مشہور ہے، لیکن پہلے ضروری ہے کہ آیت کے مفردات اور بعض الفاظ کے معنی بیان کریں اس کے بعد ان دونوں نظریوں کو پیش کریں۔

"مرة" جیسا کہ بہت سے اربابِ لغت اور مفسرین نے لکھا ہے "پلٹے ہوئے" کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ رسی کو جتنا بہتر طریقہ سے بٹا جائے اتنی ہی زیادہ محکم ہوتی ہے، لہٰذا یہ لفظ قدرت، توانائی اور مادی یا معنوی استحکام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور بعض اسے "مرور" بمعنی عبور سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ بات اس چیز سے جو اہلِ لغت نے لکھی ہے چنداں سازگار نہیں ہے۔

" تدلّٰی " مادۂ " تدلی " (بروزن تجلی) سے ، " مفردات " میں " راغب " کے قول کے مطابق، نزدیک ہونے کے معنی میں ہے۔ تو اس بنا پر یہ جملہ " دنی " کی تاکید ہے جو اس سے پہلے آیا ہے، اور دونوں کا ایک ہی معنی ہے، جبکہ بعض ان دونوں کے درمیان اختلاف کے قائل ہیں، انہوں نے یہ کہا ہے کہ " تدلی " وابستگی، تعلق اور آویزاں ہونے کے معنی میں ہے، جس طرح پھل درخت سے وابستگی رکھتا ہے، لہٰذا ان پھلوں کو جو ابھی درختوں کے ساتھ آویزاں ہیں (دوالی) کہتے ہیں [1]

" قاب " اندازہ کے معنی میں ہے اور " قوس " کمان کے معنی میں، اس بنا پر " قاب قوسین " یعنی دو کمانوں کے اندازے کے مطابق، (کمان قدیم زمانہ کے تیراندازی کے ہتھیاروں میں سے ہے)۔

بعض نے " قوس " کو " قیاس " کے مادہ سے " مقیاس " کے معنی میں سمجھا ہے۔ اور چونکہ عرب کی مقیاس ذراع کی مقدار تھا، (انگلیوں کے سر سے لے کر کہنی تک کا فاصلہ) اس بنا پر قاب قوسین دو ذراع کے معنی میں ہوگا۔

بعض لغت کی کتابوں میں " قاب " ایک دوسرے معنی میں ذکر ہوا ہے، اور وہ کمان کو درمیان سے پکڑنے کی جگہ سے کمان کی مڑی ہوئی نوک تک کا فاصلہ ہے (کمانیں قوسی شکل کی ہوتی تھیں جن کے دونوں آخری سرے مڑے ہوئے ہوتے تھے)

اس بنا پر " قاب قوسین " کمان کے ٹیڑھے حصوں کے مجموعہ کے معنی میں ہے، (غور کیجئے) [2]

اب ہم دونوں تفسیروں کے بیان کی طرف لوٹتے ہیں۔

مفسرین کا مشہور نظریہ یہ ہے کہ پیغمبرؐ کا معلم وہی " جبرئیل امین " پیک وحی خدا تھا، جو حد سے زیادہ قدرت رکھتا تھا۔ وہی جو عام طور پر ایک خوبصورت انسان کی صورت میں پیغمبرؐ کے سامنے ظاہر ہوا کرتا تھا، اور پیغام الٰہی پہنچاتا تھا، آنحضرتؐ کی پوری زندگی میں صرف دو مرتبہ اپنے اصلی قیافہ اور چہرے کے ساتھ آنحضرتؐ کے سامنے ظاہر ہوا۔

پہلی مرتبہ تو وہی ہے جو اوپر والی آیات میں آیا ہے۔ کہ وہ افق اعلیٰ میں ظاہر ہوا۔ (اور وہ تمام مشرق ومغرب کو ڈھانپے ہوئے تھا، اور اس قدر با عظمت تھا کہ پیغمبرؐ ہیجان میں آگئے) اور وہ جبرئیل ہی تھا جو پیغمبرؐ سے نزدیک ہوا تھا۔ انتہا نزدیک کہ ان کے درمیان چنداں فاصلہ باقی نہ رہا تھا، اور " قاب قوسین " کی تعبیر انتہائی قرب اور نزدیکی سے کنایہ ہے۔

دوسری مرتبہ پیغمبرؐ کے معراج کے واقعہ میں ہوا تھا جس کے بارے میں آئندہ آیات میں گفتگو ہوئی ہے۔ اور ہم انشاء اللہ اس سلسلہ میں مزید بیان کریں گے۔

بعض مفسرین جنہوں نے اس نظریہ کو انتخاب کیا ہے، تصریح کی ہے کہ پیغمبرؐ نے جبرئیل کا اصلی صورت میں پہلا دیدار غار " حرا " کے پاس " جبل النور " میں کیا تھا [3]

---

[1] " اقتباس " از " روح البیان " زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] بعض نے کہا ہے کہ اس صورت میں کلام میں " قلب " (الٹ پھیر) واقع ہوا ہے اور اصل میں " قابی قوس " تھا۔

[3] اس تفسیر کو کہ " شدید القویٰ " سے مراد جبرئیل امین ہیں۔ ایک گروہ کثیر نے اختیار کیا ہے، منجملہ ان کے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لیکن یہ تفسیر اپنے تمام طرفداروں کے باوجود اشکالات سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ :

۱۔ "فاوحی الی عبدہ ما اوحی" (جو کچھ وحی کرنا تھی اپنے بندہ کی طرف وحی کی) کی آیت میں مسلمہ طور سے ضمیروں کا مرجع (خصوصاً عبدہ کی ضمیر کا مرجع) خدا ہے۔ لیکن اگر "شدید القویٰ" سے مراد جبرئیل ہو تو پھر تمام ضمیروں کو اس کی طرف لوٹنا چاہیئے، یہ ٹھیک ہے کہ خارجی قرائن سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اس آیت کا معاملہ بقیہ آیات سے جدا ہے، لیکن آیات اور ضمیروں کے مرجع کی یکسانیت کا ٹکراؤ مسلمہ طور سے ظاہر کے خلاف ہے۔

۲۔ "شدید القویٰ" ایسی ذات کے معنی میں ہے جس کی تمام قدرتیں حد سے زیادہ ہوں، اور یہ صرف پروردگار کی ذات پاک کے ساتھ ہی مناسب ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سورۂ تکویر کی آیت ۲۰ میں جبرئیل کو "ذی قوۃ عند ذی العرش مکین" کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے، لیکن "شدید القویٰ" جو ایک عام اور وسیع مفہوم رکھتا ہے، اور "ذی قوۃ" کے درمیان جس میں "قوۃ" مفرد اور نکرہ کی صورت میں ذکر ہوا ہے۔ بہت زیادہ فرق ہے۔

۳۔ بعد والی آیات میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے اسے "سدرۃ المنتہٰی" کے نزدیک (آسمانوں کی بلندی پر دیکھا) اگر اس سے مراد جبرئیل ہو، تو وہ تو سفر معراج میں روئے زمین کے شروع سے ہی پیغمبر کے ساتھ تھا، اور اسے صرف آسمان کی بلندی پر ہی نہیں دیکھا تھا۔ سوائے اس صورت کے کہ یہ کہا جائے کہ ابتدا، میں تو اسے انسانی صورت میں دیکھا تھا، اور آسمان میں اُسے اس کی اصلی صورت میں، حالانکہ آیات میں اس مطلب پر کوئی قرینہ نہیں ہے۔

۴۔ "علمہ" یا اس کے مانند تعبیر کبھی بھی قرآن مجید میں جبرئیل کے لیے استعمال نہیں ہوئی۔ جبکہ یہ تعبیر خدا کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ اور دوسرے پیغمبروں کے لیے بہت زیادہ ہے، اور دوسرے لفظوں میں جبرئیل پیغمبرؐ کا معلم نہیں تھا، بلکہ وہ وحی کا واسطہ تھا اور ان کا معلم صرف خدا ہے۔

۵۔ یہ ٹھیک ہے کہ جبرئیل ایک بلند مرتبہ فرشتہ ہے لیکن مسلمہ طور سے پیغمبرؐ اسلام اس سے بھی زیادہ والا تر مقام رکھتے ہیں۔ جیسا کہ معراج کے واقعہ میں آیا ہے کہ جبرئیل معراج کی سیر صعودی میں پیغمبرؐ کے حضور میں حاضر تھے، ایک مقام پر پہنچ کر وہ رک گئے اور کہا: اگر میں ایک پور کے برابر بھی آگے بڑھوں تو میرے پر و بال جل جائیں، لیکن پیغمبر نے اسی طرح سے اپنی سیر کو جاری رکھا۔

ان حالات میں جبرئیل کو ان کی اصلی صورت میں دیکھنے کی کوئی ایسی اہمیت نہیں ہے جیسی کہ ان آیات میں دی گئی ہے۔ اور زیادہ سادہ لفظوں میں، پیغمبرؐ کے لیے اس بات کی زیادہ اہمیت نہیں تھی، کہ اس قسم کا دیدار انہیں حاصل ہو۔ حالانکہ یہ آیات اس دیدار کے لیے حد سے زیادہ اہمیت کی قائل ہوئی ہیں۔

۶۔ "ماکذب الفؤاد ما رای" (پیغمبرؐ کے دل نے جو کچھ دیکھا ہے وہ اس کے برخلاف نہیں کہتا)

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ کا) طبرسی نے "مجمع البیان" میں بیضاوی نے "انوار التنزیل" میں زمخشری نے "کشاف" میں "قرطبی" نے اپنی تفسیر "روح البیان" میں فخر رازی نے "تفسیر کبیر" میں سید قطب نے "فی ظلال القرآن" میں، اور مراغی نے اپنی تفسیر میں، علامہ طباطبائی کی تعبیر میں بھی "المیزان" میں زیادہ تر اسی طرف مائل ہیں۔

کا جملہ بھی ایک باطنی شہود کی دلیل ہے نہ کہ آنکھ کے ساتھ جبرئیل کا ایک حسی مشاہدہ ۔

۷۔ ان سب سے قطع نظر متعدد روایات میں جو منابع اہل بیت سے نقل ہوئی ہیں ان آیات کی جبرئیل سے تفسیر نہیں ہوتی ، بلکہ روایات دوسری تفسیر کے مطابق ہیں جو یہ کہتی ہیں کہ ان آیات سے مراد خدا کی پاک ذات کا ایک خاص قسم کا باطنی شہود ہے، جو اس منظر میں پیغمبر کو حاصل ہوا تھا ، اور معراج میں اس کا دوبارہ تکرار ہوا ، اور رسول اللہ نے اس دیدار سے ایک معنوی جذبہ کا اثر لیا ۔[1]

مرحوم شیخ طوسی " امالی ' میں ابن عباس کے واسطہ سے پیغمبر اسلام سے نقل کرتے ہیں :

لما عرج بی الی السماء دنوت من ربی عز وجل حتی کان بینی و بینہ قاب قوسین او ادنی

"جب میں آسمان پر معراج کے لیے گیا ، تو اپنے پروردگار کی ساحت قدس سے اتنا قریب ہوا کہ میرے اور اس کے درمیان دو کمانوں کا یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا ۔"[2]

مرحوم "صدوق" نے " علل الشرائع " میں اسی مضمون کو ہشام بن حکم کے واسطہ سے امام موسیٰ بن جعفرؑ سے نقل کیا ہے ۔ آپ ایک طولانی حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں :

فلما اسری بالنبی (ص) و کان من ربہ کقاب قوسین او ادنی رفع لہ حجاب من حجبہ

"جس وقت پیغمبر کو معراج پر لے جایا گیا تو ان کا فاصلہ ان کے پروردگار کی ساحت قدس سے دو کمانوں یا اسے بھی کم کا رہ گیا تھا تو حجابوں میں سے ایک حجاب آپ کی آنکھوں کے سامنے سے اٹھا دیا گیا تھا ۔"[3]

تفسیر علی بن ابراہیم " میں بھی آیا ہے :

ثم دنی یعنی رسول اللہ من ربہ عز وجل

---

[1] دعائے ندبہ میں ایک تعبیر نظر آتی ہے جو اسی معنی کے ساتھ مناسب ہے جہاں کہتا ہے :

یا بن من دنی فتدلی فکان قاب قوسین او ادنی دنواً و اقتراباً من العلی الاعلی

" اے اس کے فرزند جو قریب سے قریب تر ہوا ، یہاں تک کہ اس کا فاصلہ دو کمان یا اس سے بھی کم رہ گیا ، اور یہ نزدیکی خدا وند علی اعلیٰ سے صورت پذیر ہوئی ، اسی دعا کے ذیل میں خدا کا ایک لقب " شدید القویٰ " بھی ذکر ہوا ہے جہاں آیا ہے " وارہ سیدہ یا شدید القویٰ "۔

[2] نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۱۴۹ ۔

[3] نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۱۴۹ ۔

"پھر وہ قریب ہوئے یعنی رسول اللہ خداوند تعالیٰ سے"۔ [1]

یہ معنی دوسری متعدد روایات میں بھی آیا ہے، اور ان تمام روایات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

اہل سنت کی روایات میں بھی "درالمنثور" کی ایک روایت میں یہی معنی ابن عباس سے دو طریقوں سے نقل ہوا ہے [2]

یہ تمام قرائن سبب بنتے ہیں کہ ہم دوسری تفسیر کو ـــــ جو یہ کہتی ہے کہ "شدید القویٰ" سے مراد خدا ہے، اور پیغمبر بھی اسی کی ذات پاک سے نزدیک ہوئے تھے ـــــ انتخاب کریں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز جو زیادہ تر مفسرین کی اس تفسیر سے روگردانی اور پہلی تفسیر کی طرف جانے کا سبب بنی۔ یہ ہے کہ اس تفسیر سے تجسم خدا اور اس کے لیے مکان کی بو آتی ہے، حالانکہ یہ بات مسلم ہے کہ نہ وہ مکان رکھتا ہے اور نہ ہی جسم، لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار "آنکھیں اس کو نہیں دیکھتیں اور وہ تمام آنکھوں کو دیکھتا ہے" (انعام - ۱۰۳)؛ فاینما تولوا فثم وجه الله "تم جس طرف بھی منہ کروگے وہیں پر خدا ہے" (البقرہ ۱۱۵)؛ وھو معکم اینما کنتم "تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمھارے ساتھ ہے" (حدید - ۴)

اور شاید ان مسائل کا مجموعہ ہی اس بات کا سبب بنا ہے کہ بعض مفسرین ان آیات کی تفسیر سے عجز و ناتوانی کا اظہار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ اسرار غیب میں سے ہے جو ہم سب سے پوشیدہ و پنہاں ہیں۔

کہتے ہیں: ایک عالم سے ان آیات کی تفسیر پوچھی گئی تو اس نے کہا، وہ جگہ جہاں جبرئیل ناتواں ہو جائے۔ میں کون ہوں کہ اس معنی کے ادراک پر قادر ہوں [3]

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن کتاب ہدایت ہے۔ اور انسانوں کے غور و فکر اور نصیحت کے لیے نازل ہوا ہے۔ اس معنی کو قبول کرنا بھی مشکل ہے۔

لیکن اگر ہم آیات کی دوسرے معنی کے ساتھ، یعنی ایک قسم کے شہود اور ایک خاص معنوی قرب کے ساتھ، تفسیر کریں، تو یہ تمام مشکلات ختم ہو جاتی ہیں۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ: بلاشک و شبہ خدا کے لیے حسی رؤیت نہ تو دنیا میں امکان پذیر ہے اور نہ ہی آخرت میں، کیونکہ اس کا لازمہ جسمانیت اور مادی ہونا ہے، اور اسی طرح اس کا لازمہ تبدیلی، اور ایک حالت سے دوسری حالت میں آنا اور فساد پذیر ہونا ہے، اور زمان و مکان کی نیاز و احتیاج رکھنا ہے۔ اور ذات واجب الوجود ان تمام امور سے مبرا ہے۔

لیکن خدا کا مشاہدہ دل اور عقل کی نگاہ سے کیا جا سکتا ہے، اور یہ وہی چیز ہے جس کی طرف امیرالمومنین علیؑ نے "ذعلب یمانی" کے جواب میں اشارہ فرمایا تھا:

"لا تدرکه العیون بمشاهدة العیان ولکن تدرکه القلوب بحقائق

---

[1] نورالثقلین جلد ۵ صفحہ ۱۴۸۔

[2] درالمنثور جلد ۶ ص ۱۲۳۔

[3] "روح البیان" جلد ۹ ص ۲۱۹۔

الایمان"

"آنکھوں نے حسی مشاہدہ کے ذریعہ ہرگز اسے نہیں دیکھا، لیکن دلوں نے حقیقت ایمان کے ساتھ اسے پالیا ہے" ۱

لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ "باطنی نگاہ" دو قسم کی ہوتی ہے، ایک "نگاہ عقلانی" جو طریق استدلال سے حاصل ہوتی ہے، اور دوسری "شہود قلبی" جو ادراک عقلی سے مافوق ایک درک ہے اور اس کی نگاہ سے ماوراء ایک نگاہ ہے۔

یہ وہ مقام ہے جسے مقام "استدلال" کا نام نہیں دینا چاہیئے۔ بلکہ یہ مقام "مشاہدہ" ہے۔ لیکن ایک ایسا مشاہدہ جو دل کے ساتھ اور باطنی طریقے سے ہو، یہ وہ مقام ہے جو "اولیاء اللہ" کے لیے فرق مراتب کے ساتھ اور سلسلہ درجات سے حاصل ہوتا ہے، کیونکہ شہود باطنی بھی بہت سے مراتب و درجات رکھتا ہے، البتہ اس حقیقت کا ادراک ان لوگوں کے لیے جو اس تک نہیں پہنچے مشکل ہے۔

اوپر والی آیات سے ان قرائن کے ذریعہ اس طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام مقام شہود پر فائز ہونے کے باوجود اپنی عمر مبارک کے دوران دو مرتبہ اتنی بلندی پر پہنچے کہ مقام "شہود کامل" پر سرفراز ہوئے۔

ایک احتمالاً آغاز بعثت میں ہوا تھا، اور دوسرا معراج کے موقع پر، اس طرح خدا کے قریب ہوئے، اور اس کے بساطِ قرب پر قدم رکھا، کہ بہت سے فاصلے اور حجاب ختم کر دیئے گئے۔ ایسا مقام جہاں جبرئیل امین یعنی خدا کا مقرب ترین فرشتہ تک پہنچنے سے عاجز تھا۔

یہ بات واضح ہے کہ "فکان قاب قوسین او ادنٰی" جیسی تعبیریں، سب کی سب کنایہ کی صورت میں، اور شدت قرب کے بیان میں ہیں۔ ورنہ وہ اپنے بندوں سے مکانی فاصلہ نہیں رکھتا، تاکہ اسے "قوس" اور "ذراع" کے ساتھ ناپا جائے اور "رؤیت" سے مراد بھی ان آیات میں آنکھ سے دیکھنا نہیں ہے، بلکہ وہی شہود باطنی ہے۔

گزشتہ مباحث میں "لقاء اللہ" (پروردگار کی ملاقات) کی تفسیر میں، جو قرآن کی مختلف آیات میں روز قیامت کے مشخصات میں سے ایک کے عنوان سے بارہا آیا ہے، ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ ملاقات بھی —— اس کے برخلاف جو بعض کوتاہ فکر لوگوں نے سمجھ لیا ہے —— حسی ملاقات اور مادی مشاہدہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک طرح کا شہود باطنی ہے اگرچہ وہ کئی مرحلہ نچلے درجہ میں ہے۔ اور وہ ہرگز بھی اولیاء و انبیاء کے مشاہدہ کے مرحلہ تک نہیں پہنچتا، چہ جائیکہ معراج کی شب پیغمبر کے شہود کامل کے مرحلہ تک پہنچے۔

اس وضاحت کی طرف توجہ کرتے ہوئے وہ اعتراضات جو اس تفسیر کے بارے میں نظر آتے تھے، برطرف ہو جائیں گے اور اگر ان ماوراء مادی مسائل کی تشریح میں، ہمارے الفاظ و بیان کی تنگی کی بنا پر، کچھ خلاف ظاہر باتیں دکھائی دیتی ہوں، تو وہ ان اشکالات کے مقابلہ میں جو پہلی تفسیر پر ہیں، حقیر اور معمولی نظر آتی ہیں۔

---

۱ "نہج البلاغہ" خطبہ ۱۷۹۔

جو کچھ یہاں تک بیان کیا گیا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے زیر بحث آیات پر اب نئے سرے سے ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اور آیات کے مضمون کا اس نئے زاویہ سے مطالعہ اور تحقیق کرتے ہیں۔

اس تفسیر کے مطابق، قرآن پیغمبرؐ پر نزول وحی کی اس طرح تشریح کرتا ہے: پر قدرت اور شدید القویٰ خدا نے اسے تعلیم دی، درحالیکہ وہ مکمل صورت اور حد اعتدال میں آگیا، اور افق اعلیٰ میں قرار پایا[۱]

اس کے بعد وہ نزدیک ہوا، اور زیادہ نزدیک ہوا، اس طرح سے کہ اس کے اور اس کے پروردگار کے درمیان دو کمانوں سے زیادہ فاصلہ نہ رہا، اور یہ وہ منزل تھی، جہاں خدا نے جو وحی کرنی تھی وہ اپنے بندے پر وحی کی۔

اور چونکہ یہ شہود باطنی ایک جماعت پر گراں گزرا تھا۔ لہٰذا تاکید کرتا ہے کہ پیغمبرؐ کے دل نے جو کچھ دیکھا ہے حقیقتاً و واقعتاً دیکھا ہے، اور تمھیں اس بات کے خلاف اس سے جھگڑا نہیں کرنا چاہیئے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ ان آیات کی تفسیر خدا کی نسبت پیغمبرؐ کے شہود باطنی کے ساتھ زیادہ صحیح اور روایات اسلامی کے ساتھ زیادہ موافق، اور پیغمبرؐ کے لیے ایک برتر فضیلت اور زیادہ لطیف مفہوم ہے۔ (واللّٰہ اعلم بحقائق الامور)[۲]

ہم اس بحث کو پیغمبرؐ کی ایک حدیث اور علیؑ کے ایک ارشاد پر ختم کرتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ سے لوگوں نے پوچھا: هل رأيت ربك ؟: "کیا آپ نے کبھی اپنے پروردگار کو دیکھا ہے" ؟

آپؐ نے جواب میں فرمایا: رأيته بفؤادي: "میں نے اُسے دل کی آنکھ سے دیکھا ہے"[۳]

اور نہج البلاغہ میں اسی "ذعلب یمانی" والے خطبہ کے درمیان آیا ہے کہ اس نے آنحضرت سے سوال کیا: هل رأيت ربك يا امير المؤمنين ؟!: "اے امیر المومنین کیا آپ نے کبھی اپنے خدا کو دیکھا ہے" ؟

آپ نے جواب میں فرمایا: افأعبد مالا اراه ؟!: "تو کیا میں اس کی عبادت کرتا ہوں جسے میں نے دیکھا نہیں"۔

اس کے بعد آپ نے وحی تشریح پیش کی، جسے ہم پہلے نقل کر چکے ہیں، کہ یہ شہود باطنی کی طرف اشارہ ہے[۴]

۱۔ "فاستویٰ" کی ضمیر، اور اسی طرح "هو بالافق الاعلیٰ" کی ضمیر ممکن ہے کہ پیغمبرؐ کی طرف یا خدا کی ذات پاک کی طرف لوٹے۔

۲۔ یہاں اس نکتہ کو بھی اجمالی طور پر نظر میں رکھیں، کہ معراج کے بارے میں علماء کے درمیان یہ اختلاف ہے کہ یہ پیغمبرؐ کی زندگی میں ایک مرتبہ ہوئی ہے یا دو مرتبہ لہٰذا ممکن ہے کہ یہ آیات دونوں معراجوں میں دو شہود باطنی کی طرف اشارہ ہوں۔

۳۔ "بحار الانوار" جلد ۱۸ ص ۲۸۷ (ذیل مباحث معراج)۔

۴۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۹۔

۱۳۔ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۙ

۱۴۔ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ○

۱۵۔ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ؕ

۱۶۔ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۙ

۱۷۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ○

۱۸۔ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ○

ترجمہ

۱۳۔ اور دوبارہ اس کا مشاہدہ کیا۔

۱۴۔ سدرۃ المنتہٰی کے نزدیک۔

۱۵۔ کہ جہاں جنت المأوٰی ہے

۱۶۔ اس وقت جب کہ ایک چیز (خیرہ کرنے والے نور) نے سدرۃ المنتہٰی کو ڈھانپ رکھا تھا۔

۱۷۔ نہ تو اس کی آنکھ نے انحراف کیا، اور نہ ہی سرکشی کی۔

۱۸۔ اس نے اپنے پروردگار کی چند عظیم آیات اور نشانیوں کا مشاہدہ کیا۔

تفسیر

دوسرا دیدار

یہ آیات، وحی اور پیغمبرؐ کے خدا سے ارتباط، اور اس کے شہود باطنی کے مسئلہ کے بارے میں، اسی طرح سے گزشتہ آیات کی بحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

فرماتا ہے: "ایک مرتبہ پھر پیغمبر نے اس کا مشاہدہ کیا" (ولقد رأه نزلة اخرٰی)۔

"اور یہ شہود سدرہ المنتہیٰ کے پاس حاصل ہوا" (عند سدرة المنتھٰی)۔

"وہی کہ جنت الماویٰ اور بہشت بریں اس کے پاس ہے" (عند ھا جنة المأوٰی)۔

اس وقت جب کہ کسی چیز نے "سدرۃ المنتہیٰ کو گھیرا ہوا تھا اور ڈھانپ رکھا تھا" (اذ یغشی السدرة مایغشٰی)۔

یہ وہ واقعات و حقائق تھے جن کا پیغمبر نے مشاہدہ کیا تھا، "اور اس کی آنکھ نے ہرگز انحراف نہیں کیا تھا، اور نہ ہی سرکشی کی تھی اور باطل تصوّرات کو حق کے لباس میں نہیں دیکھا تھا" (مازاغ البصر وما طغٰی)۔

"اس نے وہاں اپنے پروردگار کی عظیم اور بڑی آیات اور نشانیوں کا مشاہدہ کیا تھا" (لقد رأی من اٰیات ربه الکبرٰی)۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں وہی ابہام، جس نے شروع شروع میں گزشتہ آیات کو گھیرا ہوا تھا، اسی نے ان آیات پر بھی جو انہیں مطالب کا دوسرا حصہ ہے سایہ ڈالا ہوا ہے۔ لہٰذا ان آیات کے مفاد کو واضح کرنے کے لیے ہر چیز سے پہلے ہم مفردات کو بیان کریں گے، اس کے بعد اس کے مجموعہ پر نظر ڈالیں گے۔

"نزلۃ" ایک مرتبہ نازل ہونے کے معنی میں ہے اس بنا پر "نزلۃ اخرٰی" یعنی ایک مرتبہ اور نازل ہونے میں۔[1]

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ "نزول" دو مرتبہ ہوا ہے، اور یہ ماجرا دوسرے نزول سے مربوط ہے۔

"سدرۃ" (بروزن حرفۃ) مفسرین اور علماء لغت کے عمومی قول کے مطابق، ایک درخت ہے جو گھنے پتوں والا اور سایہ دار ہوتا ہے (بیری) اور "سدرۃ المنتہیٰ" کی تعبیر اس سایہ دار اور گھنے پتوں والے درخت کی طرف اشارہ ہے جو آسمان کی بلندی پر فرشتوں، ارواح شہداء، علوم انبیاء اور انسانوں کے اعمال کے بلند ہونے کی انتہا پر واقع ہے، وہ جگہ جس سے اوپر

---

[1] بعض ارباب لغت اور مفسرین نے "نزلۃ" کو "مرۃ" کے معنی میں تفسیر کیا ہے، اس بنا پر اس میں نزول کا معنی نہیں ہے۔ اور "نزلۃ اخرٰی" صرف دوسری مرتبہ کے معنی میں ہے، لیکن معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے "نزلۃ" کے اصلی مادہ کو کیوں چھوڑ دیا ہے۔ جب کہ دوسروں نے اسے محفوظ رکھا ہے۔ اور ہمارے بیان کے مطابق تفسیر کی ہے (غور کیجئے)۔

پروردگار کے فرشتے نہیں جاتے۔ اور جبرئیل بھی سفر معراج میں جب اس جگہ پہنچے تو رک گئے۔

سدرۃ المنتہیٰ کے بارے میں اگرچہ قرآن مجید میں کوئی وضاحت نہیں آئی ہے، لیکن اسلامی روایات واخبار میں اس کے بارے میں گوناں گوں توصیفات بیان کی گئی ہیں۔ اور وہ سب کی سب اس واقعیت اور حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ اس تعبیر کا انتخاب ایک قسم کی تشبیہ کے عنوان سے ہے اور اس قسم کے بزرگ واقعات کے بیانات ہماری لغات اور زبانوں کی کوتاہی کی بنا پر ہیں۔

ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

رأیت علیٰ کل ورقۃ من اوراقھا ملکا قائمًا یسبح اللہ تعالیٰ

"میں نے اس کے ہر پتہ پر ایک فرشتہ کو دیکھا کہ وہ کھڑا ہوا تھا اور خدا کی تسبیح کرتا تھا۔"[1]

ایک دوسری حدیث میں امام صادقؑ سے نقل ہوا ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا:

انتھیت الی سدرۃ المنتھٰی، واذا الورقۃ منھا تظل امۃ من الامم

"میں سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا تو دیکھا کہ اس کے ہر پتہ کے سایہ میں ایک امت قرار پائی ہے۔"[2]

یہ تعبیرات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ جیسے درخت ہم زمین پر دیکھتے ہیں ان کے مشابہ درخت ہرگز مراد نہیں ہے، بلکہ یہ ایک عظیم سائبان کی طرف اشارہ ہے، جو رحمت حق کے قرب و جوار میں واقع ہے، جس کے پتوں پر فرشتے تسبیح کرتے ہیں، اور مختلف امتوں کے نیک اور پاک لوگ اس کے سایے میں قرار رکھتے ہیں۔

"جنۃ المأویٰ" اس بہشت کے معنی میں ہے جو جائے سکونت ہے،[3] اور اس بارے میں کہ یہ کونسی بہشت ہے مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض نے اسے وہی بہشت جاودانی "جنۃ الخلد" سمجھا ہے، جو تمام اہلِ ایمان اور پرہیزگاروں کے انتظار میں ہے، اور وہ اس کی جگہ آسمان میں سمجھتے ہیں، اور سورہ سجدہ کی آیت ۱۹ کو اس پر شاہد سمجھتے ہیں: فلھم جنات المأویٰ نزلًا بما کانوا یعملون" صالح عمل والے مؤمنین کے لیے جنت کے باغات ہیں جن میں وہ قیام کریں گے، اور یہ ان کے ان اعمال کے مقابلہ میں جنہیں وہ انجام دیا کرتے تھے، پذیرائی کا ایک ذریعہ ہے" کیونکہ یہ آیت بعد والی آیت کے قرینہ سے مسلمہ طور پر بہشت جاودانی کی بات کر رہی ہے۔

لیکن چونکہ ایک دوسری جگہ یہ بھی آیا ہے کہ "وسارعوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضھا السماوات والارض" "پروردگار کی مغفرت میں اور اس جنت کی طرف، جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ (آل عمران۔۱۳۳)۔ لہٰذا بعض نے اس معنی کو بعید شمار کیا ہے، کیونکہ زیر بحث آیات کا ظاہر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے

---

[1] "مجمع البیان" زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۵۵۔

[3] "مأویٰ" اصل میں محل انضمام (ملنے) کے معنی میں ہے، اور چونکہ ایک مکان میں لوگوں کی سکونت ان کے ایک دوسرے سے انضمام اور ملنے کا سبب ہے اس لیے یہ لفظ محل سکونت پر بولا گیا ہے۔

کہ "جنۃ الماوٰی" آسمان میں ہے اور یہ اس بہشت جاودانی کے علاوہ ہے جس کی وسعت تمام آسمانوں اور زمین کے برابر ہے لہٰذا کبھی اس کی بہشت کی ایک مخصوص جگہ کے ساتھ تفسیر کی ہے جو "سدرۃ المنتہیٰ" کے پاس ہے اور جو خواص اور مخلصین کی جگہ ہے۔

اور بعض اوقات یہ کہا ہے کہ وہ برزخی جنت کے معنی میں ہے، جس میں شہداء اور مومنین کی ارواح وقتی طور پر جائے گی آخری تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے، اور وہ امور جو وضاحت کے ساتھ اس بات کی گواہی دیتے ہیں یہ ہے کہ معراج کی بہت سی روایات میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے اس جنت میں ایک گروہ کو متنعم دیکھا جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ کوئی شخص قیامت کے دن سے پہلے بہشت جاوداں میں وارد نہیں ہوگا، کیونکہ قرآنی آیات بخوبی دلالت کرتی ہیں کہ پرہیزگار قیامت میں حساب کتاب کے بعد جنت میں داخل ہوں گے نہ کہ موت کے بعد بلا فاصلہ، اور ارواح شہداء بھی برزخی جنت میں ہی قرار رکھتے ہیں، کیونکہ وہ بھی قیام قیامت سے پہلے بہشت جاوداں میں وارد نہیں ہوں گے۔

"ما زاغ البصر وما طغیٰ" کی آیہ اس معنی کی طرف اشارہ ہے، کہ پیغمبرؐ کی آنکھ اپنے مشاہدہ میں نہ تو دائیں بائیں ہوئی، اور نہ ہی حد اور مقصد سے تجاوز کیا، اور جو کچھ دیکھا ہے وہ عین واقعیت تھی، (کیونکہ " زاغ " " زیغ " کے مادہ سے دائیں یا بائیں انحراف کے معنی میں ہے اور " طغیٰ " " طغیان " کے مادہ سے حد سے تجاوز کرنے کے معنی میں ہے۔

دوسرے لفظوں میں انسان کسی چیز کے مشاہدہ کے موقع پر جب خود اس چیز کی طرف توجہ نہیں کرتا، یا دائیں بائیں یا اس سے ہٹ کر دیکھنے لگتا ہے تو اس وقت وہ غلطی میں پڑ جاتا ہے۔[1]

ہم آیات کے مفردات کی تفسیر سے فارغ ہو چکے تو اب آیات کی اجتماعی تفسیر پیش کرتے ہیں۔

یہاں پھر وہی دو نظریے، جو سابقہ آیات کی تفسیر میں تھے، بیان ہوئے ہیں۔

بہت سے مفسرین نے آیات کو، دوبارہ جبرئیل سے اس کی اصلی صورت میں، پیغمبرؐ کی ملاقات کی طرف واضح سمجھا ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ رسولؐ خدا نے معراج سے نزول کے وقت اسے "سدرۃ المنتہیٰ" کے پاس اس کی اصلی صورت میں دوبارہ دیکھا، اور آپ کی آنکھ اس منظر کے مشاہدہ سے کسی قسم کے اشتباہ اور غلطی میں گرفتار نہیں ہوئی، پیغمبرؐ نے وہاں حق تعالیٰ کی بعض عظیم آیات کا مشاہدہ کیا۔ جس سے مراد یا تو وہی جبرئیل کی صورت واقعی ہے، یا آسمانوں کی عظمت کی آیات اور ان کے عجائبات، یا یہ دونوں۔

لیکن وہی اشکالات و اعتراف جو اس تفسیر کے لیے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں وہ اسی طرح سے باقی ہیں۔ بلکہ کچھ اور اعتراضات کا ان پر اور اضافہ ہو گیا ہے، منجملہ۔

---

[1] تفسیر "المیزان" میں پہلا لفظ "کسی چیز کے مشاہدہ کی کیفیت میں خطا کرنے" کے معنی سے تفسیر ہوا ہے، اور دوسرا لفظ "اصل دیکھنے میں خطا کرنے" کے معنی میں، لیکن اس فرق کے لیے کوئی واضح دلیل بیان نہیں کی گئی، بلکہ لغت میں جو کچھ آیا ہے وہ وہی تفسیر ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے۔

"ونزلۃ اخریٰ" (ایک دوسرے نزول میں) کی تعبیر اس تفسیر کے مطابق کوئی واضح مفہوم نہیں رکھتی، لیکن دوسری تفسیر کے مطابق پیغمبر اکرمؐ نے ایک "دوسرے شہود باطنی" میں آسمانوں کے اوپر معراج کے موقع پر خدا کی ذات پاک کا مشاہدہ کیا، اور دوسرے لفظوں میں خدا نے ایک مرتبہ پھر ان کے پاک دل پر نزول فرمایا، (نزلۃ اخریٰ) اور شہود کامل حاصل ہوگیا، ایسے مقام پر جہاں بندوں کی طرف سے اللہ کی طرف قرب کی انتہا ہوتی ہے، سدرۃ المنتہیٰ کے قریب، جہاں جنت المأویٰ واقع ہے، ایسی حالت میں کہ سدرۃ المنتہیٰ کو نور کے حجابوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔

پیغمبرؐ کے دل کی نگاہ، اس شہود میں ہرگز غیر حق پر نہیں پڑی، اور اس کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا، اور وہیں پر خدا کی عظمت کی نشانیاں آفاق والنفس میں بھی مشاہدہ کیں۔

شہود باطنی کا مسئلہ — جیسا کہ ہم پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں — ایک قسم کا ایسا ادراک اور دیکھنا ہے جو نہ تو ادراکات عقلی سے مشابہت رکھتا ہے، اور نہ ہی ادراکات حسی کے ساتھ، کہ جنہیں انسان حواس ظاہر کے ذریعہ درک کرتا ہے اور اسے کئی جہات سے انسان کے اپنے وجود اور اپنے افکار و تصورات کے علم کے مشابہ سمجھا جا سکتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ: ہم اپنے وجود کا یقین رکھتے ہیں، اپنے افکار کا ادراک کرتے ہیں، اور اپنے ارادہ و خواہشات اور رجحانات سے باخبر ہیں، لیکن یہ آگاہی نہ تو طریق استدلال سے ہمیں حاصل ہوئی ہے، اور نہ ہی مشاہدہ ظاہری کے طریق سے، بلکہ یہ ہمارے لیے ایک قسم کا شہود باطنی ہے، کہ ہم اس طریقہ سے اپنے وجود اور اپنی نفسیات سے واقف ہیں۔

اسی علمی دلیل کی بنا پر — جو شہود باطنی کی طرف سے حاصل ہوتی ہے — اس میں کسی قسم کی کوئی خطا واقع نہیں ہوتی، کیونکہ وہ نہ تو استدلال کے طریقے سے ہے، کہ جس کے مقدمات میں کوئی غلطی واقع ہوئی ہو، اور نہ ہی وہ حسی طریقہ سے ہے کہ حواس کے طریقہ سے اس میں کوئی خطا رونما ہو۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہم اس شہود کی حقیقت کو، جو پیغمبرؐ نے معراج کی اس تاریخی رات میں خدا کی نسبت پیدا کی، نہیں پا سکتے، لیکن ہم نے ایک مناسب راہ سے نزدیک ہونے کے لیے ایک مثال دی ہے، اور اسلامی روایات بھی ہمارے راستہ کی راہ کشائی کر رہی ہیں۔

چند نکات

۱۔ معراج ایک مسلّمہ حقیقت ہے

علماء اسلام کے درمیان اصل مسئلہ معراج میں کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ قرآنی آیات بھی یہاں اور سورۂ اسراء کے آغاز میں اس پر گواہ ہیں، اور متواتر روایات بھی، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ بعض لوگ پہلے سے کئے ہوئے فیصلوں کی بنا پر اس بات کو قبول نہیں کر سکے کہ پیغمبرؐ نے اپنے جسم اور روح کے ساتھ پرواز کیا تھا، لہٰذا انہوں نے اس کی "معراج روحانی" اور حالت خواب سے مشابہ ایک چیز کے ساتھ تفسیر کی ہے۔

حالانکہ پیغمبرؐ کی اس جسمانی پرواز میں نہ تو کوئی عقلی اشکال ہے۔ اور نہ ہی موجودہ زمانہ کے علوم کی طرف سے اس پر کوئی اعتراض

وارد ہوتا ہے، جس کی تفصیل ہم سورۂ اسراء کی تفسیر میں بسوط طریقہ پر بیان کر چکے ہیں [1]

اس بنا پر استبعادات کی خاطر، ظاہر آیات اور صریح روایات کو ترک کرنے کے لیے کوئی دلیل اور وجہ نہیں ہے۔

اس سے قطع نظر اوپر والی آیات کی تعبیریں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ایک گروہ اس مسئلہ کے خلاف لڑنے جھگڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا، تاریخ بھی یہی کہتی ہے کہ مسئلہ معراج نے مخالفین کے درمیان ایک شور و غوغا کھڑا کر دیا تھا۔

اگر پیغمبر معراج روحانی اور خواب سے مشابہ کسی چیز کے مدعی ہوتے، تو اس کے استبعاد پر یہ شور و غوغا برپا نہ ہوتا۔

۲۔ معراج کا مقصد

پیغمبر کا شہود و باطنی تک پہنچنا ایک طرف سے، اور آسمان کی وسعتوں میں اسی ظاہری آنکھ سے خدا کی عظمت کو دیکھنا دوسری طرف سے تھا، جس کی طرف یہاں بھی آخری زیر بحث آیت میں (لقد رأی من اٰیات ربہ الکبریٰ) اور سورۂ اسراء کی آیہ ایک میں بھی (لنریہ من اٰیاتنا) اس کی طرف اشارہ ہوا ہے، اس کے علاوہ اور بہت سے دوسرے اہم مسائل ـــــ فرشتوں، اہل جنّت، دوزخیوں اور ارواح انبیاء ـــــ سے متعلق آگاہی حاصل کی، جو آپ کی عمر مبارک کے سارے عرصہ میں خلق خدا کی تعلیم و تربیت میں آپ کے لیے الہام بخش تھی۔

۳۔ معراج اور بہشت

زیر بحث آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر شب معراج جنت کے قریب سے گزرے یا اس میں وارد ہوئے۔

یہ بہشت چاہے بہشت جاوداں اور "جنۃ الخلد" ہو ـــــ جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے بیان کیا ہے ـــــ یا وہ جنت برزخ ہو، جسے ہم نے اختیار کیا ہے۔ بہرصورت آپ نے اس بہشت میں انسانوں کے مستقبل کے بہت سے اہم مسائل مشاہدہ فرمائے ہیں، جن کی تشریح و تفصیل اسلامی روایات میں آئی ہے، اور ہم انشاء اللہ ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کریں گے۔

۴۔ معراج اسلامی روایات میں

ان مسائل میں سے، جو روایات معراج، بلکہ اس سارے ہی مسئلہ کو بعض کی نظر میں قابل اعتراض بناتے ہیں، ان کے درمیان بعض ضعیف اور مجہول روایات کا وجود ہے، جب کہ "مجمع البیان" میں معروف مفسر مرحوم "طبرسی" کے قول کے مطابق، معراج کی روایات کو چار گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

الف : وہ روایات جو متواتر ہونے کی بنا پر قطعی و یقینی ہیں (مثلاً معراج کا اصل مسئلہ)

ب : وہ روایات جو معتبر منابع سے نقل ہوئی ہیں) اور ایسے مسائل پر مشتمل ہیں جن کے قبول کرنے میں کوئی عقل مانع نہیں ہے، مثلاً وہ روایات جو آسمانوں میں عظمت خدا کی بہت سی آیات کے مشاہدے کے بارے میں بات کرتی ہیں۔

ج : وہ روایات جن کا ظاہر ان اصولوں کے ساتھ جو آیاتِ قرآنی اور مسلم اسلامی روایات سے حاصل ہوئے ہیں منافات

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۱۲۔ صفحہ ۴۰ اور اس سے بعد

رکھتی ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کی توجیہ کی جاسکتی ہے۔ مثلاً وہ روایات جو یہ کہتی ہیں کہ پیغمبر گرامیؐ نے جنتیوں کے ایک گروہ کو جنت میں اور دوزخیوں کے ایک گروہ کو دوزخ میں دیکھا۔ (تو اس کے لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہشت و دوزخ سے مراد برزخی بہشت و دوزخ ہیں، ان میں سے ایک میں تو مؤمنین اور شہداء کی ارواح رہتی ہیں، اور دوسری میں کفار و مجرمین کی ارواح ٹھہرتی ہیں[1]

د ۔ وہ روایات جو ایسے باطل و بے بنیاد مطالب پر مشتمل ہیں۔ جو کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہیں، اور ان کے مطالب ہی ان کے مجعول ہونے پر گواہ ہیں، مثلاً وہ روایات جو کہتی ہیں کہ پیغمبرؐ نے خدا کو "ظاہری آنکھ" کے ساتھ دیکھا، یا اس سے گفتگو کی۔ اور اس کا مشاہدہ کیا، اس قسم کی روایات اور ان کی مانند قطعاً مجعول ہیں، (مگر یہ کہ شہود باطنی کے ساتھ ان کی تفسیر کی جائے)

اس تقسیم بندی کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہم معراج کی روایات کا ایک اجمالی مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

مجموعہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر گرامی اسلامؐ نے یہ آسمانی سفر چند مرحلوں میں کیا۔

پہلا مرحلہ، مسجد الحرام اور مسجد اقصیٰ کے درمیانی فاصلہ کا مرحلہ تھا، جس کی طرف سورۂ اسراء کی پہلی آیت میں اشارہ ہوا ہے: سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ "منزہ ہے وہ خدا جو ایک رات میں اپنے بندہ کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا"

بعض معتبر روایات کے مطابق آپؐ نے اثناء راہ میں جبرئیل کی معیت میں سرزمین مدینہ میں نزول فرمایا اور وہاں نماز پڑھی[2]

اور مسجد الاقصیٰ میں بھی ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ جیسے عظیم انبیاء کی ارواح کی موجودگی میں نماز پڑھی، اور امام جماعت پیغمبرؐ تھے۔ اس کے بعد وہاں سے پیغمبرؐ کا آسمانی سفر شروع ہوا۔ اور آپ نے ساتوں آسمانوں[3] کو یکے بعد دیگرے عبور کیا، اور ہر آسمان میں ایک نیا ہی منظر دیکھا۔ بعض آسمانوں میں پیغمبروں اور فرشتوں سے۔ بعض آسمانوں میں دوزخ اور دوزخیوں سے اور بعض میں جنت اور جنتیوں سے ملاقات کی۔ اور پیغمبرؐ نے ان میں سے ہر ایک سے بہت سی تربیتی و اصلاحی قیمتی یادیں اپنی روح پاک میں ذخیرہ کیں، اور بہت سے عجائبات کا مشاہدہ کیا جن میں سے ہر ایک عالم ہستی کے اسرار میں سے ایک سر اور رمز تھا، اور واپس آنے کے بعد ان کو صراحت کے ساتھ اور بعض اوقات کنایہ اور مثال کی زبان میں امت کی آگاہی کے لیے مناسب فرصتوں میں بیان فرماتے تھے، اور تعلیم و تربیت کے لیے اس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھاتے تھے۔

---

[1] قرآن کی بعض آیات میں آیا ہے کہ قیامت کے دن پرہیزگار گروہ گروہ جنت میں داخل ہوں گے، اور کفار گروہ گروہ دوزخ میں داخل ہوں گے۔ (سورۂ زمر آیات ۷۱، ۷۳) دوسری آیات بھی اس معنی پر گواہی دیتی ہیں (مثلاً آیت ۷۔ زخرف ۸۵، ۸۶ تا ۸۶ مریم، ۴۷ دخان)۔

[2] بحار الانوار جلد ۱۸ صفحہ ۳۱۹۔

[3] قرآن کی بعض آیات کے مطابق مثلاً "انا زینا السماء الدنیا بزینة الکواکب" ہم نے نچلے آسمان کو ستاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے (صافات۔ ۶) ہم جو کچھ عالم بالا سے دیکھتے ہیں اور تمام ستارے اور کہکشائیں یہ سب پہلے آسمان کا حصہ ہیں۔ اس بنا پر چھ اور آسمان ان کے اوپر کے عوالم ہیں؟

یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس آسمانی سفر کا ایک اہم مقصد، ان قیمتی مشاہدات کے تربیتی وعرفانی نتائج سے استفادہ کرنا تھا، اور زیر بحث آیات میں قرآن کی یہ پُرمعنی تعبیر " لقد رأى من اٰيات ربه الكبرٰى " ان تمام امور کی طرف ایک اجمالی اور سربستہ اشارہ ہو سکتی ہے ۔

البتہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ بہشت اور دوزخ جس کو پیغمبرؐ نے سفر معراج میں مشاہدہ کیا، اور کچھ لوگوں کو وہاں عیش میں اور عذاب میں دیکھا، وہ قیامت والی جنت اور دوزخ نہیں تھیں، بلکہ وہ برزخ والی جنت ودوزخ تھیں، کیونکہ ان آیات کے مطابق جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں قرآن مجید کہتا ہے کہ قیامت والی جنت ودوزخ قیام قیامت اور حساب وکتاب سے فراغت کے بعد نیکوکاروں اور بدکاروں کو نصیب ہوگی ۔

آخر کار آپ ساتویں آسمان پر پہنچ گئے، وہاں نُور کے بہت سے حجابوں کا مشاہدہ کیا، وہی جگہ جہاں پر " سدرة المنتهٰى " اور جنة المأوٰى " واقع تھی، اور پیغمبرؐ اس جہانِ سراسر نُور وروشنی میں، شہود باطنی کی اوج، اور قربِ الی اللہ اور مقام " قاب قوسین او ادنٰی " پر فائز ہوئے۔ اور خدا نے اس سفر میں آپ کو مخاطب کرتے ہوئے بہت سے اہم احکام دیئے اور بہت سے ارشادات فرمائے جن کا ایک مجموعہ اس وقت اسلامی روایات میں " احادیث قدسی " کی صورت میں ہمارے لیے یادگار رہ گیا ہے۔ اور انشاء اللہ آئندہ فصل میں ہم اس کے ایک حصہ کی طرف اشارہ کریں گے ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بہت سی روایات کی تصریح کے مطابق پیغمبرؐ نے اس عظیم سفر کے مختلف حصوں میں اچانک علیؑ کو اپنے پہلو میں دیکھا، اور ان روایات میں کچھ ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں، جو پیغمبر اکرمؐ کے بعد علیؑ کے مقام کی حد سے زیادہ عظمت کی گواہ ہیں۔

معراج کی ان سب روایات کے باوجود کچھ ایسے پیچیدہ اور اسرار آمیز جملے ہیں جن کے مطالب کو کشف کرنا آسان نہیں ہے، اور اصطلاح کے مطابق روایات متشابہ کا حصہ ہیں۔ یعنی ایسی روایات جن کی تشریح کو خود معصومین کے سپرد کر دینا چاہیئے۔

(روایات معراج کے سلسلہ میں مزید اطلاع کے لیے بحار الانوار کی جلد ۱۸ از ص ۲۸۲ تا ص ۴۱۰ رجوع فرمائیں)

ضمنی طور پر، معراج کی روایات اہلِ سنت کی کتابوں میں بھی تفصیل سے آئی ہیں، اور ان کے راویوں میں سے تقریباً ۳۰ افراد نے حدیث معراج کو نقل کیا ہے۔[1]

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے : یہ اتنا لمبا سفر طے کرنا اور یہ سب عجیب اور قسم قسم کے حادثات، اور یہ ساری لمبی چوڑی گفتگوئیں، اور یہ سب کے سب مشاہدات ایک ہی رات میں یا ایک رات سے بھی کم وقت میں کس طرح سے انجام پا گئے ؟

لیکن ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے، سفر معراج ہرگز ایک عام سفر نہیں تھا کہ اسے عام معیاروں سے پرکھا جائے ۔ نہ تو اصل سفر معمولی تھا اور نہ ہی آپ کی سواری معمولی اور عام تھی، نہ آپ کے مشاہدات عام اور معمولی تھے اور نہ ہی آپ کی گفتگوئیں، اور نہ ہی وہ پیمانے جو اس میں استعمال ہوئے ہمارے کرۂ خاکی کے محدود اور چھوٹے پیمانوں

---

[1] " تفسیر المیزان " جلد ۱۳ ص ۲۹ (سورۂ اسراء کی پہلی آیات کے ذیل میں۔ بحث روائی)

کے مانند تھے، اور نہ ہی وہ تشبیہات جو اس میں بیان ہوئی ہیں ان مناظر کی عظمت کو بیان کر سکتی ہیں جو پیغمبرؐ نے مشاہدہ کیے، تمام چیزیں خارق العادت صورت میں، اور اس مکان و زمان سے خارج کے پیمانوں میں ـــــ جس سے ہم آشنا نہیں ـــــ واقع ہوئیں۔

اس بنا پر کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ یہ امور ہمارے کرۂ زمین کے زمانی پیمانوں کے ساتھ ایک رات یا ایک رات سے بھی کم وقت میں واقع ہوئے ہوں، (غور کیجئے)

۵۔ معراج کی رات خدا کی پیغمبر سے باتوں کا ایک گوشہ

کتب حدیث میں ایک روایت امیرالمؤمنین علیؑ کے واسطہ سے پیغمبر اسلامؐ سے اس سلسلہ میں آئی ہے جو بہت ہی شرح کے ساتھ ہے اور طولانی ہے، ہم اس کے کچھ گوشوں کو یہاں پیش کرتے ہیں، ایسے مطالب جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس تاریخی رات کی باتیں کس محور پر تھیں، اور انہوں نے آسمانوں کی بلندی کی طرح کس طرح سے بلندی حاصل کی۔

حدیث کے شروع میں بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبرؐ نے شب معراج پروردگار سبحان سے اس طرح سوال کیا:

یا رب ای الاعمال افضل؟

"پروردگارا! کونسا عمل افضل ہے؟"۔

خداوند تعالیٰ نے فرمایا:

لیس شیء عندی افضل من التوکل علی، والرضا بما قسمت، یا محمد! وجبت محبتی للمتحابین فی، و وجبت محبتی للمتعاطفین فی، و وجبت محبتی للمتواصلین فی، و وجبت محبتی للمتوکلین علی، ولیس لمحبتی علم ولا غایة ولا نهایة

"کوئی چیز میرے نزدیک مجھ پر توکل کرنے، اور جو کچھ میں نے تقسیم کر کے دیا ہے، اس پر راضی ہونے سے، برتر نہیں ہے۔ اے محمدؐ! جو لوگ میری خاطر ایک دوسرے کو دوست رکھتے ہیں، میری محبت ان کے شامل حال ہوگی، اور جو لوگ میری خاطر ایک دوسرے پر مہربان ہیں اور میری خاطر دوستی کے تعلقات رکھتے ہیں، میں انہیں دوست رکھتا ہوں، علاوہ ازیں میری محبت ان لوگوں کے لیے جو مجھ پر توکل کرتے ہیں فرض اور لازم ہے، اور میری محبت کے لیے کوئی حد اور کنارہ اور انتہا نہیں ہے"۔

اس طرح سے محبت سے باتیں شروع ہوتی ہیں، ایسی محبت جس کی کوئی انتہا نہیں ہے، جو کشادہ اور وسیع ہے، اور اصولی طور پر عالم ہستی اسی محور محبت پر گردش کر رہا ہے۔

ایک اور دوسرے حصہ میں یہ آیا ہے۔

"اے احمد! بچوں کی طرح نہ ہونا، جو سبز و زرد اور زرق و برق کو دوست رکھتے ہیں، اور جب انہیں کوئی عمدہ اور شیریں غذا دیتے ہیں تو وہ مغرور ہو جاتے ہیں اور ہر چیز کو

بھول جاتے ہیں"۔[1]

پیغمبرؐ نے اس موقع پر عرض کیا :

پروردگارا ! مجھے کسی ایسے عمل کی ہدایت فرما جو تیری بارگاہ میں قرب کا باعث ہو۔

فرمایا : "رات کو دن اور دن کو رات قرار دے" !

عرض کیا : کس طرح ؟ !

فرمایا : "اس طرح کہ تیرا سونا نماز ہو، اور ہرگز اپنے شکم کو پورے طور پر سیر نہ کرنا"

ایک اور حصہ میں آیا ہے :

اے احمد ! میری محبت فقیروں اور محروموں کی محبت ہے۔ ان کے قریب ہو، اور ان کی مجلس کے قریب بیٹھ، تاکہ میں تیرے نزدیک ہوں، اور دنیا پرست ثروت مندوں کو اپنے سے دور رکھ اور ان کی مجالس سے بچتا رہ"

ایک اور حصہ میں فرماتا ہے :

"اے احمد ! دنیا کے زرق و برق اور دنیا پرستوں کو مبغوض شمار کر، اور آخرت اور اہل آخرت کو محبوب رکھ، عرض کرتے ہیں، !

"پروردگارا ! اہل دنیا اور اہل آخرت کون ہیں" ؟

فرمایا : اہل دنیا تو وہ لوگ ہیں، جو زیادہ کھاتے ہیں، زیادہ ہنستے ہیں، زیادہ سوتے ہیں، اور غصہ کرتے ہیں، اور تھوڑا خوش ہوتے ہیں، نہ تو برائیوں کے مقابلہ میں کسی سے عذر چاہتے ہیں۔ اور نہ ہی کسی عذر چاہنے والے سے اس کا عذر قبول کرتے ہیں، اطاعت خدا میں سست ہیں اور گناہ کرنے میں دلیر ہیں، لمبی چوڑی آرزوئیں رکھتے ہیں، حالانکہ ان کی اجل قریب آپہنچی ہے مگر وہ ہرگز اپنے اعمال کا حساب نہیں کرتے، اُن سے لوگوں کو بہت کم نفع ہوتا ہے۔ باتیں زیادہ کرتے ہیں، احساس مسئولیت نہیں رکھتے، کھانے پینے سے ہی غرض رکھتے ہیں۔

اہل دنیا نہ تو نعمت میں خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور نہ ہی مصائب میں صبر کرتے ہیں۔ زیادہ خدمات بھی ان کی نظر میں تھوڑی ہیں (اور خود ان کی اپنی خدمات تھوڑی بھی زیادہ ہیں) اپنی اس کام کے انجام پانے پر، جو انہوں نے انجام نہیں دیا ہے، تعریف کرتے ہیں، اور ایسی چیز کا مطالبہ

---

[1] قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس حدیث میں ہر جگہ پیغمبرؐ کا نام "احمد" کے عنوان سے ذکر ہوا ہے، سوائے آغاز حدیث کے کہ وہاں "محمدؐ" ہے ہاں! "محمد" آپ کا زمینی نام تھا، اور "احمد" آسمانی نام، ایسا کیوں نہ ہوتا، "احمد" چونکہ "افعل تفضیل" کا صیغہ ہے، لہٰذا یہ زیادہ حمد و تعریف کو بیان کرتا ہے، اور پیغمبرؐ کو اس تاریخی رات میں، اور قرب خدا کے اس مرحلہ میں "محمدؐ" سے گزر کر "احمد" تک پہنچ جانا چاہیئے خصوصاً جبکہ احمد کا احد سے فاصلہ بہت کم ہے۔

کرتے ہیں جو ان کا حق نہیں ہے۔
ہمیشہ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی بات کرتے ہیں، اور لوگوں کے عیوب تو یاد دلاتے رہتے ہیں لیکن ان کی نیکیوں کو چھپاتے ہیں عرض کیا: پروردگارا! کیا دنیا پرست اس کے علاوہ بھی کوئی عیب رکھتے ہیں؟

فرمایا: اے احمد! ان کا عیب یہ ہے کہ جہل اور حماقت ان میں بہت زیادہ ہے جس استاد سے انہوں نے علم سیکھا ہے وہ اس کی تواضع نہیں کرتے، اور اپنے آپ کو عاقل سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ صاحبان علم کے نزدیک نادان اور احمق ہیں"۔

اس کے بعد اہلِ آخرت اور بہشتیوں کے اوصاف کو یوں بیان کرتا ہے:

"وہ ایسے لوگ ہیں جو باحیا ہیں، ان کی جہالت کم ہے۔ ان کے منافع زیادہ ہیں۔ لوگ ان سے راحت و آرام میں ہوتے ہیں اور وہ خود اپنے ہاتھوں تکلیف میں ہوتے ہیں، اور ان کی باتیں سنجیدہ ہوتی ہیں۔

وہ ہمیشہ اپنے اعمال کا حساب کرتے رہتے ہیں، اور اسی وجہ سے وہ خود کو زحمت میں ڈالے رہتے ہیں، ان کی آنکھیں سوئی ہوئی ہوتی ہیں لیکن ان کے دل بیدار ہوتے ہیں، ان کی آنکھ گریاں ہوتی ہے اور ان کا دل ہمیشہ یادِ خدا میں مصروف رہتا ہے جس وقت لوگ غافلوں کے زمرہ میں لکھے جارہے ہوں وہ اس وقت ذکر کرنے والوں میں لکھے جاتے ہیں۔

نعمتوں کے آغاز میں حمد خدا بجالاتے ہیں اور ختم ہونے پر اس کا شکر ادا کرتے ہیں، ان کی دعائیں بارگاہ خدا میں قبول ہوتی ہیں، اور ان کی حاجتیں پوری کی جاتی ہیں، اور فرشتے ان کے وجود سے مسرور اور خوش ہیں۔ ...... (غافل) لوگ ان کے نزدیک مردہ ہیں، اور خدا ان کے نزدیک حیّ و قیوم و کریم ہے۔ (ان کی ہمت اتنی بلند ہے کہ وہ اس کے سوا کسی اور پر نظر نہیں رکھتے)....

لوگ تو اپنی عمر میں صرف ایک ہی دفعہ مرتے ہیں، لیکن وہ جہاد بالنفس، اور ہوا و ہوس کی مخالفت کی وجہ سے ہر روز ستر مرتبہ مرتے ہیں، (اور نئی زندگی پاتے ہیں)! ......

جس وقت عبادت کے لیے میرے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو ایک فولادی بند اور بنیان مرصوص کے مانند ہوتے ہیں، اور ان کے دل میں مخلوقات کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی، مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم ہے کہ میں انہیں ایک پاکیزہ زندگی بخشوں گا۔ اور عمر کے اختتام پر میں خود ان کی روح کو قبض کروں گا اور ان کی روح کی پرواز کیلئے آسمان کے دروازوں کو کھول دوں گا تمام حجابوں کو ان کے سامنے سے ہٹا دوں گا، اور حکم دوں گا کہ بہشت خود کو ان کے لیے آراستہ کرے! ......

اے احمد! عبادت کے دس حصہ ہیں جن میں سے نو حصہ طلب حلال میں ہیں، جب تیرا کھانا اور

پینا حلال ہو گا تو تو میری حفظ و حمایت میں ہو گا، ......"

ایک اور حصہ میں آیا ہے :

"اے احمد ! کیا تو جانتا ہے کہ کونسی زندگی زیادہ گوارا اور زیادہ دوام رکھتی ہے" ؟

عرض کیا : خداوند ! نہیں !

فرمایا : گوارا زندگی وہ ہوتی ہے جس کا صاحب ایک لمحہ کے لیے بھی میری یاد سے غافل نہ رہے۔ میری نعمت کو فراموش نہ کرے، میرے حق سے بے خبر نہ رہے۔ اور رات دن میری رضا کو طلب کرے۔

لیکن باقی رہنے والی زندگی وہ ہے جس میں اپنی نجات کے لیے عمل کرے، دنیا اس کی نظر میں حقیر ہو۔ اور آخرت بڑی اور بزرگ ہو، میری رضا کو اپنی رضا پر مقدم شمار کرے، اور ہمیشہ میری خوشنودی کو طلب کرے، میرے حق کو بڑا سمجھے۔ اور اپنی نسبت میری آگاہی کی طرف توجہ رکھے۔

ہر گناہ اور معصیت پر مجھے یاد کر لیا کرے، اور اپنے دل کو اس چیز سے جو مجھے پسند نہیں ہے پاک رکھے شیطان اور شیطانی وسوسوں کو مبغوض رکھے، اور ابلیس کو اپنے دل پر مسلط نہ کرے اور اُسے راہ نہ دے۔

جب وہ ایسا کرے گا تو میں ایک خاص قسم کی محبت کو اس کے دل میں ڈال دوں گا۔ اس طرح سے کہ اس کا سارا دل میرے اختیار میں ہو گا۔ اس کی فرصت اور مشغولیت اس کا ہم و غم اور اس کی بات ان نعمتوں کے بارے میں ہو گی جو میں اہل محبت کو بخشتا ہوں۔

میں اس کی آنکھ اور دل کے کان کھول دیتا ہوں تاکہ وہ اپنے دل کے کان سے غیب کے حقائق کو سننے اور اپنے دل سے میرے جلال و عظمت کو دیکھے" !

اور آخر میں یہ نورانی حدیث ان بیدار کرنے والے جملوں پر ختم ہو جاتی ہے :

"اے احمد ! اگر کوئی بندہ تمام اہل آسمان اور تمام اہل زمین کے برابر نماز ادا کرے، اور تمام اہل آسمان و زمین کے برابر روزہ رکھے، فرشتوں کی طرح کھانا نہ کھائے اور (کوئی فاخرہ) لباس بدن پر نہ پہنے (اور انتہائی زہد اور پارسائی کی زندگی بسر کرے) لیکن اس کے دل میں ذرہ برابر بھی دنیا پرستی یا ریاست طلبی یا زینت دنیا کا عشق ہو۔ تو وہ میرے جاودانی گھر میں میرے جوار میں نہیں ہو گا۔ اور اپنی محبت کو اس کے دل سے نکال دوں گا ! میرا اسلام و رحمت تجھ پر ہو، والحمد للہ رب العالمین" [1]

---

[1] بحار الانوار جلد ۷، ص ۲۱ تا ۳۰ (تلخیص کے ساتھ)

یہ عرشی باتیں ـــــ جو انسانی روح کو آسمانوں کی طرف بلند کرتی ہیں، اور معراج الٰہی کی طرف سیر کراتی ہیں، اور آستانۂ عشق و شہود کی طرف کھینچتی ہیں ـــــ حدیث قدسی کا صرف ایک حصہ ہے۔

مزید براں ہمیں اطمینان ہے کہ پیغمبرؐ نے اپنے ارشادات میں جو کچھ بیان فرمایا ہے ان کے علاوہ بھی، اس شب عشق و شوق اور جذبہ و وصال کی شب میں، ایسی باتیں، اسرار و رموز اور اشارے آپ کے اور آپ کے محبوب کے درمیان ہوئے ہیں جن کو نہ تو کان سننے کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ ہی عام افکار میں ان کے درک کی طاقت ہے۔ اور اسی بنا پر وہ ہمیشہ پیغمبرؐ کے دل و جان کے اندر ہی مکتوم اور پوشیدہ رہے، اور آپ کے خواص کے علاوہ کوئی بھی اُن سے آگاہ نہیں ہوا۔

۱۹۔ اَفَرَءَيۡتُمُ اللّٰتَ وَالۡعُزّٰىۙ

۲۰۔ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الۡاُخۡرٰى

۲۱۔ اَلَـكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الۡاُنۡثٰى

۲۲۔ تِلۡكَ اِذًا قِسۡمَةٌ ضِيۡزٰى

۲۳۔ اِنۡ هِىَ اِلَّاۤ اَسۡمَآءٌ سَمَّيۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بِهَا
مِنۡ سُلۡطٰنٍ‌ؕ اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهۡوَى الۡاَنۡفُسُ‌ۚ وَلَقَدۡ
جَآءَهُمۡ مِّنۡ رَّبِّهِمُ الۡهُدٰىؕ

ترجمہ

۱۹۔ مجھے بتاؤ کیا "لات" اور "عزیٰ" بت ......

۲۰۔ اور "منات" جوان میں سے تیسرا ہے (خدا کی بیٹیاں ہیں) ؟

۲۱۔ کیا تمھارا حصہ تو بیٹا ہے اور اس کا حصہ بیٹی؟ (درحالیکہ تمھارے خیال میں لڑکیاں لڑکوں کی نسبت کم قدر و قیمت رکھتی ہیں)۔

۲۲۔ تو اس صورت میں یہ تقسیم غیر عادلانہ ہے۔

۲۳۔ یہ تو فقط وہ نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آباؤ اجداد نے ان کے رکھے ہیں، (ایسے نام جو بے معنی و مطلب اور اسمائے بے مسمیٰ ہیں) اور خدا نے ہرگز کوئی دلیل اور حجت اس پر نازل نہیں کی ہے۔ وہ صرف بے بنیاد گمانوں اور ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہیں، حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف

سے ان کے لیے ہدایت آچکی ہے۔

تفسیر

"توحید" و "وحی" و "معراج" اور آسمانوں میں خدائے یگانہ کی عظمت سے مربوط مباحث کے بیان کے بعد بتوں کے بارے میں مشرکین کے شرک اور بیہودہ عقائد کے بطلان کو پیش کرتا ہے۔

فرماتا ہے:

خدا کی عظمت اور اس کی عظیم آیات اور نشانیوں کو جان لینے کے بعد مجھے بتاؤ تو سہی کیا پھر بھی "لات" و "عزیٰ" بت ہی ......" (افرءیتم اللات والعزّٰی)۔

اور اسی طرح سے "منات" جو ان کا تیسرا بت ہے۔ جسے ان کے بعد ذکر کرتے ہو، کیا یہ مورتیاں خدا کی بیٹیاں ہیں، اور تمھیں کوئی فائدہ یا نقصان پہنچا سکتے ہیں"؟ (ومناة الثالثة الاخرٰی) [1]

"کیا تمھارا حصہ تو بیٹے ہیں اور اس کا حصہ بیٹیاں"؟ (الکم الذکر وله الانثٰی)۔

حالانکہ تمھارے خیال میں بیٹیاں، بیٹوں سے کم قدر و قیمت ہیں، یہاں تک کہ جب تم یہ سنتے ہو کہ تمھاری بیوی نے بیٹی جنی ہے تو تم غم و اندوہ کی شدت اور غصہ سے سیاہ ہو جاتے ہو۔

اگر اسی طرح ہے تو پھر یہ تقسیم ایک غیر عادلانہ تقسیم ہے۔ جو تم نے خود اپنے اور خدا کے درمیان روا رکھی ہے" (تلك اذًا قسمة ضیزٰی) [2]

کیونکہ خدا کے حصہ کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہو۔

اس طرح قرآن ان کے گرے ہوئے اور بے ہودہ افکار کا مذاق اڑاتا ہے کہ تم ایک طرف تو بیٹیوں کو زندہ درگور کرتے ہو، انہیں ننگ و عیب سمجھتے ہو۔ اور دوسری طرف فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے ہو، تم نہ صرف خود ان کی پرستش کرتے ہو،

---

[1] ان تینوں بتوں کے بارے میں ہم انشاء اللہ نکات کی بحث میں تفصیل سے گفتگو کریں گے، جو چیز یہاں قابل توجہ ہے وہ "ثالثة" "تیسرا" اور "اُخرٰی" (متاخر) کی تعبیر ہے، جو منات بت کے بارے میں آئی ہے۔ علماء نے ان دونوں تعبیروں کے لیے بہت زیادہ تفسیریں بیان کی ہیں۔ جن میں سے اکثر بے بنیاد تکلفات ہیں، جو کچھ زیادہ مناسب نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ مشرکین عرب کے نزدیک ان بتوں کی اہمیت اسی ترتیب کے ساتھ ہے جو آیت میں بتائی گئی ہے۔ تو اس بنا پر "منات" تیسرے مرحلہ میں قرار پاتا ہے۔ اور "اخرٰی" کے ساتھ اس کی توصیف اس کے رتبہ و مقام کے تاخر کی بنا پر ہے۔

[2] "ضیزٰی" ناقص، ظالمانہ اور غیر معتدل کے معنی میں ہے۔

بلکہ ان کے بے روح مجسمے بھی بتوں کی صورت میں تمھاری نظر میں اتنے محترم ہیں کہ ان کے سامنے سجدہ کرتے ہو، مشکلات میں ان سے پناہ مانگتے ہو، اور اپنی حاجتیں ان سے طلب کرتے ہو۔ حقیقتاً یہ ایک مذاق اور شرم والی بات ہے۔

اسی سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ کم ازکم پتھر اور لکڑی کے بہت سے بت جن کی عرب پرستش کیا کرتے تھے، ان کے گمان میں فرشتوں کے مجسمے تھے، وہ فرشتے جنہیں وہ "رب النوع" اور عالم ہستی کا مدیر و مدبر سمجھتے تھے، اور خدا سے ان کی نسبت بیٹی اور باپ کی نسبت خیال کرتے تھے۔

جس وقت ان خرافات کا ایک دوسری بیہودگی کے ساتھ، جو وہ بیٹیوں کے بارے میں سمجھتے تھے مقابلہ کیا جاتا ہے تو ان کا عجیب وغریب تضاد، خود ان کے عقائد وافکار کے بے بنیاد ہونے کا ایک بہترین گواہ بن جاتا ہے، اور کتنی عمدہ بات ہے کہ یہ چند مختصر سے جملوں کے ساتھ قرآن ان سب پر خط بطلان کھینچتے ہوئے ان کے مذاق اور مسخرہ پن کو آشکار کر دیتا ہے۔

اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ قرآن کا ہرگز منشا یہ نہیں ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عربوں کے بیٹی اور بیٹے کے درمیان فرق کے بارے میں اعتقاد کو قبول کرلے، بلکہ وہ اس طریقہ سے مدمقابل کے مسلمات کو اس کے خلاف پیش کرنا چاہتا ہے جسے منطق کی اصطلاح میں "جدل" کہتے ہیں، ورنہ اسلام کی منطق میں، انسانی قدر ومنزلت کے لحاظ سے، نہ تو بیٹے اور بیٹیوں میں کوئی فرق ہے، اور نہ ہی فرشتے بیٹی یا بیٹا ہیں اور نہ اصلاً وہ خدا کی اولاد ہیں، اور نہ ہی اصولاً خدا اولاد رکھتا ہے، یہ بے بنیاد مفروضے ہیں جن کی بنیاد دوسرے بے بنیاد مفروضوں پر ہے۔ لیکن یہ ان لغو بت پرستوں کے فکر ومنطق کے ضعف وکمزوری کو ثابت کرنے کے لیے بہترین جواب ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں قرآن قاطعیت کے ساتھ کہتا ہے، یہ تو فقط نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آباؤ اجداد نے ان کے رکھے ہوئے ہیں، (ایسے نام جو بے معنی اور اسمائے بے مسمی ہیں) اور خدا نے ہرگز کوئی دلیل اور حجت اس پر نازل نہیں کی ہے" (ان هی الا اسماء سمیتموها انتم وآباؤكم ما انزل الله بها من سلطان)[1]

نہ تو اس پر تم کوئی عقلی دلیل رکھتے ہو، اور نہ ہی وحی کے طریق سے کوئی دلیل تمھارے پاس ہے۔ اور یہ مٹھی بھر اوہام و خرافات اور کھوکھلے الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

آخر میں مزید کہتا ہے: وہ تو صرف بے بنیاد گمانوں اور ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہیں" اور یہ موہوم باتیں سب کی سب خیال اور ہوائے نفس کی پیداوار ہیں، (ان یتبعون الا الظن وما تهوی الانفس)[2]

"حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے" (ولقد جاءهم من ربهم الهدی)۔

---

[1] "سلطان" تسلط اور غلبہ کے معنی میں ہے اور زندہ ویقینی دلائل کو "سلطان" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ دشمن پر غلبہ کا سبب ہوتے ہیں۔

[2] "ما تهوی الانفس" میں "ما" "موصولہ" ہے، یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ مصدریہ ہو، البتہ نتیجہ کے لحاظ سے کچھ فرق نہیں ہے۔

لیکن وہ آنکھیں بند کر کے اس سے پیٹھ پھیر لیتے ہیں اور ان اوہام کی ظلمتوں میں ڈوب جاتے ہیں۔

چند نکات

۱۔ عربوں کے تین مشہور بت

مشرکین عرب کے بہت سے بت تھے، لیکن بلاشک وشبہ ان میں سے تین بت "لات" و "عزیٰ" اور منات ایک خاص اہمیت اور شہرت رکھتے تھے۔

ان ناموں کے ساتھ ان تینوں کے نام رکھنے کے بارے میں، اور اسی طرح سب سے پہلے ان بتوں کے بنانے والے کے متعلق اور ان کے مقام اور پرستش کرنے والے قبیلہ کے سلسلہ میں بہت سی باتیں اور اختلافات ہیں۔ اور ہم یہاں صرف اسی بات پر ـــــ جو کتاب "بلوغ الارب فی معرفة احوال العرب" میں آیا ہے۔ اکتفا کرتے ہیں۔

"پہلا معروف بت، جسے عربوں نے انتخاب کیا، بت "منات" تھا، جو "عمرو بن لحی" کی طرف سے، بت پرستی کو شام سے حجاز کی طرف منتقل کرنے کے بعد، بنایا گیا تھا، یہ بت بحرۂ احمر کے پاس مدینہ اور مکہ کے درمیان کے علاقہ میں رکھا گیا تھا، اور تمام عرب اس کا احترام کیا کرتے تھے، اور وہ اس کے پاس قربانی کرتے تھے، لیکن سب سے زیادہ اسے دو قبیلے، "اوس" اور "خزرج" اہمیت دیتے تھے۔ یہاں تک کہ آٹھویں ہجری میں، جو فتح مکہ کا سال تھا، جس وقت پیغمبرؐ مدینہ سے مکہ کی طرف جا رہے تھے" آپؐ نے امیر المومنین علیؑ کو بھیج کر اسے تڑوا دیا۔

زمانہ جاہلیت کے عربوں نے بت "منات" بنانے کے ایک مدت بعد "لات" کو بنایا، جو ایک چار کونوں والے پتھر کی صورت میں تھا، اور سرزمین طائف میں رکھا گیا تھا، اس جگہ پر جہاں آج مسجد طائف کی بائیں طرف کا منارہ ہے اس بت کے خادم زیادہ تر قبیلۂ ثقیف میں سے تھے، جب وہ مسلمان ہو گئے، تو پیغمبرؐ نے مغیرہ کو بھیج کر اسے تڑوا دیا، اور اس نے اُسے آگ میں پھینک کر جلا دیا۔

تیسرا بت جس کا زمانہ جاہلیت کے عربوں نے انتخاب کیا تھا، "عزّٰی" تھا جو مکہ سے عراق کے راستے میں " ذات عرق" کے قریب رکھا ہوا تھا، اور قریش اس کا بہت ہی زیادہ احترام کیا کرتے تھے۔

وہ ان تینوں بتوں کو اتنی اہمیت دیا کرتے تھے، کہ وہ خانۂ خدا کے گرد طواف کرتے وقت کہتے تھے، :" واللّات والعزّٰی ومناة الثالثة الاخرٰی، فانهن الغرانيق العلی، وان شفاعتهن لترتجی":

لات وعزیٰ اور منات خوبصورت اور بلند مقام پرندے ہیں کہ جن سے شفاعت کی اُمید کی جاتی ہے" !!

اور وہ انہیں خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے (ظاہر یہ ہے کہ وہ انہیں فرشتوں کی مورتیاں خیال کرتے تھے جنہیں وہ خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے تھے)[1]

---

[1] "بلوغ الارب فی معرفت احوال العرب" جلد ۲ ص ۲۰۲، ۲۰۳۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کا نام رکھنے میں بھی غالباً انہوں نے خدا کے ناموں سے استفادہ کیا ہوا تھا، زیادہ سے زیادہ تانیث کی علامت کے ساتھ، تاکہ وہ اوپر والے عقیدہ کو ظاہر کرے، اس طرح سے کہ "اللّات" اصل میں "اللاھہ" تھا، اس کے بعد حرف "ھ" ساقط ہوگیا، اور اللّات ہوگیا[1] اور "العزّیٰ" "اعز" کی مؤنث ہے اور "منات" "منی اللہ الشیء"، کسی چیز کے خدا کی طرف سے مقدر ہونے سے لیا گیا ہے۔

بعض اسے "نوء" کے مادہ سے جانتے ہیں جو ان ستاروں میں سے تھا جن کے بارے میں عربوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جب وہ طلوع کرتے ہیں تو ان کے ساتھ ہی بارش ہوتی ہے، اور بعض اسے "منی" (بروزن سعی) کے مادہ سے خون بہانے کے معنی میں جانتے ہیں، کیونکہ وہ قربانی کے خون ان کے پاس بہایا کرتے تھے۔[2]

بہرحال عرب ان بتوں کا اس قدر احترام کیا کرتے تھے، کہ بعض قبیلوں یا افراد کا نام "عبدالعزیٰ" اور "عبدمنات" کی طرح کے رکھا کرتے تھے۔[3]

۲۔ اسمہای بے مسمّٰی

شرک اور دو خداؤں یا کئی خداؤں کی پرستش کے قدیم ترین سرچشموں میں سے ایک، موجودات عالم کا تنوع ہے، کیونکہ کوتاہ فکر افراد یہ باور نہیں کرسکتے تھے، کہ یہ گوناں گوں اور متنوع موجودات، جو آسمان اور زمین میں ہیں، ایک ہی خدا کی مخلوق ہوں (کیونکہ انہوں نے اپنے اوپر قیاس کرلیا تھا جو ہمیشہ ایک آدھ کام یا چند کاموں میں ہی مہارت رکھتے تھے) لہٰذا وہ موجودات کی ہر نوع کے لیے ایک علیحدہ خدا مانتے تھے۔ جسے وہ "رب النوع" سے تعبیر کرتے تھے مثلاً رب النوعِ دریا، رب النوعِ صحرا رب النوعِ باران، رب النوعِ آفتاب، رب النوعِ جنگ اور رب النوعِ صلح۔

یہ خیالی خدا جنہیں وہ بعض اوقات فرشتوں سے یاد کیا کرتے تھے، ان کے عقیدہ کے مطابق اس جہان کے حکمران تھے اور جس حصہ میں بھی کوئی مشکل پیدا ہوتی تو وہ اسی کے رب النوع سے پناہ مانگتے تھے، اس کے بعد چونکہ یہ سارے کے سارے موجودات کے رب النوع محسوس نہیں ہوتے تھے لہٰذا ان کی مورتیاں بنا کر ان کی عبادت کرنے لگے۔

یہ بیہودہ عقائد یونان سے دوسرے علاقوں کی طرف اور آخر کار حجاز کے علاقے کی طرف منتقل ہوئے۔ لیکن چونکہ عرب توحید ابراہیمی کی بناپر، جو ان کے درمیان بطور یادگار رہ گئی تھی، اللہ کے وجود کے منکر نہیں ہوسکتے تھے، لہٰذا انہوں نے ان عقائد کو آپس میں ملادیا، اور خداوند تعالیٰ کے وجود کا عقیدہ برقرار رکھتے ہوئے، فرشتوں کا عقیدہ بھی اپنا لیا جن کا وہ خدا کے ساتھ باپ اور بیٹی کا رابطہ سمجھتے تھے، اور پتھر اور لکڑی کے بتوں کو ان کے مظہر اور ان کی مورتیاں سمجھتے تھے۔

---

[1] اس معنی کے مطابق اللات کو اللاۃ (گول تاء) کے ساتھ لکھا جانا چاہیے، لیکن چونکہ وقفی حالت میں (ھاء) کے ساتھ تبدیل ہوجاتی ہے اور ممکن ہے کہ لفظ "اللہ" کے ساتھ اشتباہ ہوجاتے لہٰذا اسے "اللّات" کی صورت میں لکھتے ہیں۔

[2] پہلا احتمال کشاف میں اور دوسرا بلوغ الارب میں آیا ہے۔

[3] بلوغ الارب جلد ۲ ص ۲۰۲ اور ۲۰۳۔

قرآن ایک مختصر، لیکن جامع عبارت کے ساتھ جو اوپر والی آیات میں بیان ہوئی ہے، کہتا ہے: "یہ سب بے معنی نام اور اسمائے بے مسمّٰی ہیں، جنہیں تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے بغیر کسی دلیل و مدرک کے انتخاب کر لیا ہے"!

نہ تو بارش کے خدا سے جس کا تم نے یہ نام رکھا ہے کوئی کام ہو سکتا ہے، اور نہ ہی سورج، دریا، جنگ اور صلح کے خیالی خداؤں سے کچھ ہو سکتا ہے۔

تمام چیزیں خدا ہی کی طرف سے ہیں، اور سب عالم ہستی اسی کا مطیع ہے۔ اور ان مختلف موجودات کی ایک دوسرے سے ہم آہنگی ان کے خالق کی وحدت کی بہترین دلیل ہے، کیونکہ اگر کئی "الله" اور بہت سے خدا ہوتے تو نہ صرف یہ کہ یہ ہم آہنگی موجود نہ ہوتی، بلکہ اس کا انجام یہ ہوتا کہ سارا عالم تضاد اور فساد کا شکار ہو جاتا ہے: لوکان فیھما اٰلھة الّا الله لفسدتا۔

۳۔ بت پرستی کا نفسیاتی اور فکری سرچشمہ

بت پرستی کے سرچشمے تو ہمیں معلوم ہو گئے ہیں، لیکن بت پرستی کے کچھ اور نفسیاتی اور فکری سرچشمے بھی ہیں جن کی طرف اوپر والی آیات میں اشارہ ہوا ہے، اور وہ بے بنیاد گمانوں اور ہوائے نفس کی پیروی ہے۔

وہ ایک ایسا خیال اور تصور ہے جو نادان افراد میں پیدا ہو جاتا ہے، اور مقلدین آنکھیں اور کان بند کر کے ایک دوسرے سے لے لیتے ہیں اور پھر وہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے،

البتہ بت جیسا معبود، جو اپنے بندوں پر کسی قسم کا کوئی کنٹرول نہیں رکھتا، اور نہ ہی کوئی معاد و قیامت اور حساب و کتاب رکھتا ہے، اور نہ ہی کوئی بہشت و دوزخ ہے۔ اور اس نے انہیں مکمل آزادی دے رکھی ہے، وہ صرف مشکلات میں اس کی طرف رخ کرتے ہیں اور اپنے خیال میں اس سے مدد طلب کرتے ہیں، یہ بات ان کی سرکش ہوا و ہوس کے ساتھ اچھی طرح سازگار ہے۔ اور ان کی خواہشات کے لیے میدان کو کھول دیتا ہے۔

اصولی طور پر، ہوائے نفس خود ایک عظیم ترین اور خطرناک ترین بت ہے۔ اور دوسرے بتوں کی پیدائش کا سرچشمہ ہے، اور بت پرستی کا بازار گرم ہونے کا سبب ہے۔

۴۔ پھر بھی "غرانیق" کا افسانہ

اس بحث کے دوران، جو ہم نے عربوں کے تین بتوں "لات و عزیٰ اور منات کے بارے میں تاریخی لحاظ سے بیان کی تھی، اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا تھا، کہ وہ ان بتوں کو بلند پایہ "غرانیق" سمجھتے تھے، جن سے وہ شفاعت کی اُمید رکھتے تھے، (غرانیق" جمع "غرنوق" (بر وزن مزدور) سفید یا سیاہ رنگ کے پانی کے ایک قسم کے پرندے کے معنی میں ہے) لہٰذا وہ بعض اوقات ان بتوں کے ناموں کے ذکر کے بعد "تلك الغرانیق العلیٰ و ان شفاعتھن لترتجی" کے جملوں کے ساتھ ان کی تعریف اور قصیدہ خوانی کیا کرتے تھے۔

بعض کتابوں میں اس جگہ ایک بے ہودہ داستان بیان کی گئی ہے، کہ پیغمبرؐ جب زیر بحث آیت "افرءیتم اللات والعزّٰی" پر پہنچے۔ تو (معاذ اللہ) آپ نے ان دو جملوں کا خود سے اضافہ کر دیا: "تلك الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجی" اور یہ چیز مشرکین کے خوش ہونے کا سبب بن گئی اور اس کو انہوں نے پیغمبرؐ کی طرف سے بت پرستی کے مسئلہ

کی طرف ایک قسم کا جھکاؤ سمجھا۔ اور اس سورہ کے آخر میں جب لوگوں کو سجدہ کی دعوت دی تو مشرک بھی مسلمانوں کے ساتھ سجدے میں گر پڑے۔ اور یہ خبر مشرکین کے اسلام لانے کے طور پر سب جگہ پھیل گئی، یہاں تک کہ حبشہ کے مہاجر مسلمانوں کے کانوں تک پہنچ گئی اور ان میں سے بعض اتنے خوش ہوئے اور امن کا احساس کیا کہ اپنی ہجرت گاہ حبشہ سے مکہ کی طرف پلٹ آئے [1]

لیکن جیسا کہ ہم نے سورۂ حج کی آیت ۵۲ کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، یہ ایک ایسی ناروا نسبت اور رسوا جھوٹ ہے۔ جس کے بطلان کو بہت سے دلائل اور قرائن واضح کرتے ہیں، جن لوگوں نے یہ جھوٹ گھڑا انھوں نے یہ بالکل نہیں سوچا کہ قرآن انہیں زیر بحث آیات میں صراحت کے ساتھ بت پرستی کی سرکوبی کر رہا ہے۔ اور اسے خیال خام اور ہوائے نفس کی پیروی شمار کرتا ہے۔ اور بعد والی آیات میں بھی صراحت اور پوری شدت کے ساتھ بت پرستوں کے عقائد کی مذمت کر رہا ہے، اور اسے ان کی بے ایمانی بے علمی اور عدم آگاہی کی نشانی قرار دیتا ہے، اور صراحت کے ساتھ پیغمبرؐ کو یہ حکم دیتا ہے کہ اپنا معاملہ اُن سے الگ کرلے اور ان سے منہ پھیر لے۔

اس طرح یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ دو جملے پیغمبرؐ کی طرف سے ہوں، یا مشرکین اس قدر احمق ہوں کہ وہ یہ جملے تو سن لیں لیکن بعد والی آیات کو جو صراحت کے ساتھ بت پرستی کی سرکوبی کرتی ہیں نظر انداز کردیں۔ اور آخر میں خوش ہو جائیں اور سورہ کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کے ساتھ سجدہ میں گر پڑیں ؟

حقیقت یہ ہے کہ اس افسانے کو گھڑنے والوں نے بہت ہی ناتجربہ کاری، اور کسی مطالعہ کے بغیر اسے گھڑا ہے۔

یہ ہوسکتا ہے کہ پیغمبرؐ کی طرف سے اس آیت افرءیتم اللات والعزّٰی ..... کی قرأت کے وقت اچانک شیطان نے یا حاضر گروہ مشرکین میں سے کسی شیطان صفت انسان نے ان دو جملوں کا اضافہ کر دیا ہو، (کیونکہ دونوں جملے ان کا شعار بن چکے تھے جن کے ذریعہ وہ ان تینوں بتوں کی تعریف کیا کرتے تھے) اور اس طرح سے ایک گروہ وقتی طور پر اشتباہ میں پڑ گیا ہو۔

لیکن اس سورہ کے آخر پر نہ تو ان کا سجدہ کرنا کوئی مفہوم رکھتا ہے، اور نہ ہی پیغمبرؐ کا بت پرستی کے سلسلے میں جھکاؤ جیسا کہ تمام آیات قرآنی اور آپ کی تاریخ زندگی اس حقیقت اور واقعیت پر گواہ ہیں، کہ آپ نے کبھی بھی بت پرستی کے مسئلہ کے ساتھ مبارزہ کرنے میں، کسی بھی شکل وصورت میں، معمولی سے معمولی جھکاؤ نہیں دکھایا، اور اس سلسلہ میں آپ نے کسی بھی پیش نہاد کو قبول نہیں کیا، کیونکہ سارے اسلام کا خلاصہ توحید اور "لا الٰہ الا اللہ" ہے۔

لہٰذا پیغمبر اسلامؐ کسی طرح بھی اسلام کے اصلی مطلب اور مفہوم پر معاملہ نہیں کر سکتے ؟

ہم اس سلسلے میں مزید دلائل اور استدلالات سورۂ حج کی آیت ۵۲ (جلد ۷، ص ۵۸۴ میں پیش کر چکے ہیں۔

---

[1] اس بیہودہ کہانی کو "طبری" نے اپنی تاریخ کی دوسری جلد کے ص ۷۵ سے آگے تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔

۲۴۔ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى
۲۵۔ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى
۲۶۔ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى

ترجمہ

۲۴۔ کیا جو کچھ انسان آرزو رکھتا ہے وہ اسے مل جاتا ہے ؟

۲۵۔ حالانکہ آخرت بھی اور دنیا بھی خدا ہی کے لیے ہے۔

۲۶۔ اور کتنے ہی زیادہ فرشتے آسمانوں میں ایسے ہیں جن کی شفاعت کوئی فائدہ نہیں دیتی، مگر اس کے بعد کہ خدا ــــ جس کے لیے چاہے اس سے راضی ہوکر (شفاعت کرنے کی) اجازت دے دے۔

تفسیر

شفاعت بھی اسی کے اذن سے ہوگی

یہ آیات اسی طرح سے بت پرستی کی بیہودگی کو بیان کرتے ہوئے اس کی مذمت کر رہی ہیں، اور گزشتہ آیات کے مضمون ہی کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

پہلے بت پرستوں کی بے بنیاد آرزوؤں، اور ان توقعات کو جو وہ بتوں سے رکھتے تھے بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "کیا جو کچھ انسان آرزو رکھتا ہے وہ اُسے مل جاتا ہے"؟ (ام للانسان ما تمنّٰی)۔

کیا یہ ممکن ہے کہ یہ بے روح اور بے قدر و قیمت اجسام اس کی شفاعت کے لیے بارگاہ خدا میں کھڑے ہو سکیں گے؟ یا اُسے دنیا و آخرت کی مشکلات میں پناہ دے سکیں گے؟

"حالانکہ دنیا و آخرت صرف خدا ہی کے لیے ہیں": (فللّٰہ الاٰخرۃ والاولیٰ)۔

عالم اسباب اس کے ارادے کے محور پر گردش کر رہا ہے۔ اور ہر موجود کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اس کے وجود کی برکت سے ہے شفاعت بھی اسی کی طرف سے ہے، اور مشکلات کا حل بھی اسی کے دست قدرت میں ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ پہلے آخرت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ اور اس کے بعد دنیا کے متعلق، کیونکہ وہ چیز جو سب سے زیادہ انسانی فکر کو اپنی طرف مشغول رکھے ہوئے ہے وہ آخرت کی نجات ہی ہے۔ اور خدا کی حاکمیت دوسرے گھر میں اس گھر سے زیادہ آشکار ہے۔

اس طرح سے قرآن مشرکین کو بتوں کی شفاعت، اور ان کے وسیلہ سے مشکلات کے حل سے، کلی طور پر مایوس، اور نا اُمید کر رہا ہے، اور یہ بہانہ ان سے چھین رہا ہے کہ ہم تو اس بنا پر ان کی پرستش کرتے ہیں کہ وہ بارگاہ خدا میں ہماری شفاعت کریں:

(و یقولون ھٰؤلآء شفعاؤنا عند اللّٰہ)۔ (یونس، ۱۸)

اُوپر والی دو آیات میں ایک اور احتمال بھی ہے، اور وہ انسان کے، اپنی آرزوؤں اور خواہشات پر دسترس حاصل نہ کرنے کے طریق سے، پروردگار کے وجود کی طرف توجہ کرتا ہے۔ کیونکہ پہلی آیت میں ایک استفہام انکاری کی صورت میں کہتا ہے،: "کیا انسان اپنی تمام آرزوؤں کو پا لیتا ہے" اور چونکہ اس سوال کا جواب قطعاً نفی میں ہے۔ یعنی انسان ہرگز اپنی اکثر آرزوؤں میں کامیاب نہیں ہوتا، اور اصطلاح کے مطابق انہیں قبر میں اپنے ساتھ لے جاتا ہے، یہی چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس عالم کی تدبیر کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ اور صرف اس کا ارادہ اس جہان پر حاکم ہے، اس لیے دوسری آیت میں کہتا ہے، جب یہ بات ہے تو آخرت اور دنیا خدا ہی کے لیے ہیں۔

یہ معنی اسی چیز کے مشابہ ہے جو علیؑ کی مشہور گفتگو میں آئی ہے،:

عرفت اللّٰہ سبحانہ بفسخ العزائم وحل العقود و نقض الھمم

"میں نے خدا کو پختہ ارادوں کے ٹوٹنے وعدوں کے ناتمام رہنے اور ہمتوں کے پست ہونے سے پہچانا ہے۔"[1]

اس تفسیر اور سابقہ تفسیر کے درمیان جمع بھی بعید نہیں ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں اس مسئلہ پر اور زیادہ تاکید کے لیے مزید ارشاد ہوتا ہے: "آسمانوں میں کتنے ہی زیادہ فرشتے ایسے ہیں جن کی شفاعت کوئی فائدہ نہیں دے گی، مگر جس کسی کے لیے خدا چاہے اور اس سے راضی ہو کر اس کی شفاعت کی اجازت دے دے" (وکم من ملک فی السماوات لا تغنی شفاعتھم شیئًا الا من بعد ان یأذن اللّٰہ لمن یشاء ویرضیٰ)۔

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار کلمہ ۲۵۰۔

جہاں آسمان کے فرشتے اپنی ساری عظمت کے باوجود اجتماعی صورت میں بھی شفاعت پر قدرت نہیں رکھتے، جب تک کہ پروردگار کا اذن اور رضا نہ ہو، تو پھر ان بے شعور اور بے قدر و قیمت بتوں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے؟ جہاں تیز پرواز عقابوں کے پر و بال گر جاتے ہوں وہاں ناتواں مچھروں سے کیا ہو سکتا ہے، کیا یہ شرم کی بات نہیں ہے کہ تم یہ کہتے ہو کہ ہم تو ان بتوں کی اس لیے پرستش کرتے ہیں تاکہ وہ بارگاہ خدا میں ہمارے شفیع ہوں؟

"کم" (کتنے بہت سے) کی تعبیر یہاں عموم کے معنی میں ہے۔ یعنی کوئی فرشتہ بھی اس کے اذن و رضا کے بغیر شفاعت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ تعبیر بعض اوقات لغت عرب میں ایک جمعیت کے معنی میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ جیسا کہ سورۂ اسراء کی آیت ۷۰ میں لفظ کثیر عموم کے معنی میں ہے: "وفضلناهم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا" "ہم نے بنی آدم کو اپنی ساری مخلوقات پر فضیلت اور برتری بخشی ہے" اس کے علاوہ سورۂ شعراء کی آیت ۲۲۳ میں شیاطین کے بارے میں یہ آیا ہے کہ: "واکثرهم کاذبون" "ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں، جب کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ سب کے سب جھوٹے ہیں[1]

باقی رہا "اذن" اور "رضا" میں فرق تو وہ اس لحاظ سے ہے، کہ "اذن" اس مقام پر بولا جاتا ہے جہاں کوئی اپنی باطنی رضا کو ظاہر و آشکار کرے، لیکن رضا اس سے عام ہے، اور کسی چیز یا کام کو انجام دینے کے لیے ملائمت طبع کے معنی میں بھی ہے۔ اور چونکہ بعض اوقات کوئی شخص اذن تو دیتا ہے جب کہ وہ دل سے راضی نہیں ہوتا لہٰذا اوپر والی آیت میں تاکید کے لیے اذن کے بعد "رضا" کا مسئلہ بھی آیا ہے، اگرچہ خداوند تعالیٰ کے بارے میں اذن، رضا سے جدا نہیں ہے، اور اس کے بارے میں تقیہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔

چند نکات

۱۔ آرزوؤں کے دامن کا پھیلاؤ

تمنا اور آرزو کا سرچشمہ انسان کی قدرت کا محدود ہونا اور اس کی ناتوانی ہے، کیونکہ جب کبھی اسے کسی چیز سے لگاؤ پیدا ہوا اور وہ اُسے حاصل نہ کر سکا، تو وہ آرزو اور تمنا کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اور اگر ہمیشہ کسی چیز کی خواہش کرتے ہی وہ چیز حاصل ہو گئی ہوتی، اور جو کچھ وہ چاہتا تھا وہ اسے فوراً مل گیا ہوتا تو پھر آرزو کوئی معنی نہ رکھتی۔

البتہ بعض اوقات انسان کی تمنائیں سچی بھی ہوتی ہیں، اور وہ اس کی بلند روح سے سرچشمہ حاصل کرتی ہیں، اور وہ اس کی حرکت وسعی اور کوشش و جہاد اور سیر تکامل کے لیے ایک عامل بن جاتی ہیں، مثلاً انسان اس بات کی آرزو کرے کہ وہ علم و دانش اور تقویٰ و شخصیت میں تمام دنیا جہاں کے لوگوں سے بڑھ جائے۔

لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کی یہ آرزوئیں جھوٹی ہوتی ہیں، اور ٹھیک سچی آرزوؤں کے برعکس غفلت، بےخبری، اور پس ماندگی کا سبب ہوتی ہیں، مثلاً عمر جاوداں تک پہنچنے کی آرزو۔ اور زمین پر ہمیشہ رہنے کی تمنا، اور تمام اموال اور ثروتوں پر قبضہ جمانا،

---

[1] "شفاعتهم" میں جمع کی ضمیر باوجود اس کے "ملک" مفرد ہے، مفہوم کلام کی رعایت کی بنا پر ہے، جو جمع کا معنی رکھتا ہے۔

اور تمام انسانوں پر حکومت کرنا اور اسی طرح کے دوسرے موہومات۔

اسی بنا پر اسلامی روایات میں اس بات کا شوق دلایا گیا ہے کہ لوگ اچھی آرزوئیں کریں، ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ:

من تمنی شیئًا وھو للہ عز وجل رضی لم یخرج من الدنیا حتی یعطاہ

"جو شخص کسی ایسی چیز کی تمنا کرے جو رضائے خدا کا موجب ہے، تو وہ دنیا سے اس وقت تک نہیں جاتا جب تک وہ پوری نہ ہو جائے۔"[1]

اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ دنیا میں اُسے حاصل نہ ہو تو اُسے اس کا اجر و ثواب ملے گا۔[2]

۲۔ شفاعت کے بارے میں گفتگو

آخری آیت ان آیات میں سے ہے، جو فرشتوں کے ذریعہ امکان شفاعت کی وضاحت کے ساتھ خبر دیتی ہے، جہاں وہ اذن و رضائے خدا سے شفاعت کا حق رکھتے ہیں، انبیاء اور اولیائے معصوم بطریق اولیٰ اس قسم کے حق کے حق دار ہیں۔

لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ اوپر والی آیت صراحت کے ساتھ یہ کہہ رہی ہے کہ: یہ شفاعت بے قید و شرط کے نہیں ہو گی، بلکہ یہ اذن و رضائے خدا کے ساتھ مشروط ہے۔ اور چونکہ اس کا اذن و رضا حساب و کتاب کے بغیر نہیں ہے لہٰذا انسان اور اس کے درمیان ایسا رابطہ ہونا چاہیئے تاکہ وہ اس کے لیے، اپنے مقربان درگاہ کو، شفاعت کی اجازت دے۔ اور یہ وہ مقام ہے جہاں امیدِ شفاعت، انسان کے لیے ایک تربیتی مکتب کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اور خدا سے اس کے تمام رشتوں کے ٹوٹنے سے مانع ہو جاتی ہے۔[3]

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۱۷، ص ۲۶۱ (باب ثواب تمنی الخیرات)۔

[2] گذشتہ مآخذ۔

[3] "من یشاء" کی تعبیر جو اوپر والی آیت میں آئی ہے ممکن ہے ایسے انسانوں کی طرف اشارہ ہو جن کی شفاعت کی خدا اجازت دیتا ہے، یا اُن فرشتوں کی طرف اشارہ ہو جنہیں وہ شفاعت کی اجازت دیتا ہے، لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

۲۷۔ إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ لَيُسَمُّونَ الْمَلَائِكَةَ تَسْمِيَةَ الْأُنْثَىٰ ○

۲۸۔ وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ۖ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ○

۲۹۔ فَأَعْرِضْ عَنْ مَنْ تَوَلَّىٰ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ○

۳۰۔ ذَٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدَىٰ ○

ترجمہ

۲۷۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ فرشتوں کو (خدا) کی بیٹی کا نام دیتے ہیں۔

۲۸۔ انہیں ہرگز اس بات کا یقین نہیں ہے، وہ تو صرف بے بنیاد گمان کی پیروی کرتے ہیں، حالانکہ گمان ہرگز بھی انسان کو حق سے بے نیاز نہیں کرتا۔

۲۹۔ اب جبکہ ایسا ہے، تو تم بھی ان لوگوں سے، جو ہمارے ذکر سے منہ موڑتے ہیں، اور مادی دنیا کے سوا کسی چیز کو طلب نہیں کرتے، منہ موڑ لو۔

۳۰۔ یہ ان کی آگاہی کی آخری حد ہے، تیرا پروردگار ان لوگوں کو جو اس کی راہ سے گمراہ ہو گئے ہیں اچھی طرح پہچانتا ہے، اور ہدایت یافتہ لوگوں کو سب سے بہتر طور پر جانتا ہے۔

تفسیر

ظن وگمان ہرگز کسی کو حق تک نہیں پہنچاتے

یہ آیات مشرکین کے عقیدہ کی نفی کے سلسلہ میں اسی طرح گزشتہ آیات کے موضوع کو بیان کر رہی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: "وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کو (خدا کی) بیٹیاں کہتے ہیں" (ان الذین لا یؤمنون بالاٰخرة لیسمون الملائکة تسمیة الانثٰی)۔

ہاں! یہ قبیح اور بے غیرتی کی گفتگو صرف انہیں لوگوں سے سرزد ہوتی ہے جو حساب وکتاب اور جزائے اعمال کا عقیدہ نہیں رکھتے کیونکہ اگر وہ آخرت کا عقیدہ رکھتے تو اس طرح دیدہ دلیری کے ساتھ گفتگو نہ کرتے، ایسی گفتگو جس کے لیے کوئی معمولی سی دلیل بھی ان کے پاس نہیں ہے۔ بلکہ عقلی دلائل اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ نہ تو خدا کے کوئی اولاد ہے اور نہ ہی فرشتے اس کی بیٹیاں ہیں۔

"تسمیة الانثٰی" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے، جو گزشتہ آیات میں بیان ہو چکی ہے۔ کہ یہ باتیں بے معنی نام اور اسمائے بے مسمّٰی ہیں دوسرے لفظوں میں وہ برائے نام کی حد سے آگے کی کوئی بات نہیں یعنی ان میں کوئی واقعیت اور حقیقت نہیں ہے۔

اس کے بعد اس نام رکھنے کے بطلان کی ایک واضح دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید ارشاد ہوتا ہے: "وہ اس بات کے بارے میں علم ویقین نہیں رکھتے، بلکہ وہ بے بنیاد ظن کی پیروی کرتے ہیں، حالانکہ گمان ہرگز انسان کو حق سے بے نیاز نہیں کرتا اور کسی کو حق تک نہیں پہنچاتا" (وما لھم بہ من علم ان یتبعون الّا الظن وان الظن لا یغنی من الحق شیئًا)۔

ہدایت یافتہ اور صاحبِ عقیدہ انسان کوئی بات علم وآگاہی کے بغیر نہیں کہتا، اور کسی کی طرف کوئی نسبت بغیر دلیل کے نہیں دیتا، ظن وگمان اور خیال پر تکیہ کرنا شیطان یا شیطان صفت انسانوں کا کام ہے۔ اور خرافات اور موہومات کو قبول کرنا انحراف اور بے عقلی کی دلیل ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ "ظن" (گمان) کے دو مختلف معانی ہیں کبھی تو یہ بے بنیاد گمانوں کے معنی میں آتا ہے جو گزشتہ آیات کی تعبیروں کے مطابق "ہوائے نفس اور اوہام وخرافات" کے ہم پلہ وہم وزن ہے، زیر بحث آیات میں اس لفظ سے مراد یہی معنی ہے۔

دوسرا معنی وہ گمان ہیں جو معقول اور پسندیدہ ہیں اور اکثر اوقات واقع کے مطابق اور روزمرہ کی زندگی میں عقلاء کے کاموں کی بنیاد ہوتے ہیں، مثلاً محکمہ عدالت میں گواہوں کی گواہی، یا اہلِ خبرہ کا قول، یا "ظاہری الفاظ" اور اسی قسم کی دوسری باتیں کہ

اگر اس قسم کے گمانوں کو نوعِ بشر کی زندگی سے نکال لیں، اور صرف قطعی یقین پر ہی تکیہ کریں تو نظامِ زندگی کلی طور پر بکھر جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا ظن وگمان ان آیات میں مراد نہیں ہے۔ اور خود انہیں آیات میں اس معنی پر بہت سے شواہد موجود ہیں۔ دوسرے لفظوں میں دوسری قسم حقیقت میں ایک قسم کا عرفی علم ہے نہ کہ گمان وظن، تو اس بنا پر جو لوگ اس آیت (ان الظن لا یغنی من الحق شیئًا) سے اور اسی قسم کی دوسری آیات سے "حجیتِ ظن" کی کلی طور پر نفی کے لیے استدلال کرتے ہیں، وہ قابل قبول نہیں ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ فقہاء اور اصولیین کی اصطلاح میں "ظن" اعتقادِ راجح کے معنی میں ہے، (وہ اعتقاد جس میں احتمال کا ایک پہلو انسان کی نظر میں ترجیح رکھتا ہو) لیکن لغت میں اس کا ایک وسیع مفہوم ہے یہاں تک کہ یہ "وہم" اور ضعیف احتمالات پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور بت پرستوں کا ظن اسی طرح کا تھا، کوئی سی بیہودہ بات ایک ضعیف احتمال کی صورت میں ان کے دماغ میں ظاہر ہوتی تھی، اس کے بعد ہوائے نفس اس پر عمل کرنے کے لیے کھڑی ہو جاتی تھی، اور اس کو زینت دیتی تھی، اور دوسرا احتمال جو اس کے مقابل میں ہوتا تھا وہ زیادہ قوی ہوتا تھا، اس کو بھلا دیتے تھے۔ اور وہ آہستہ آہستہ ایک راسخ عقیدہ کی صورت اختیار کر لیتا تھا حالانکہ اس کی کچھ بھی بنیاد نہیں ہوتی تھی۔

اس کے بعد یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ یہ گروہ اہل استدلال ومنطق نہیں ہے۔ اور حبِّ دنیا اور خدا کی یاد کو بھلا دینے نے انہیں ان موہومات اور خرافات کی گندگی کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے، مزید کہتا ہے: جب ایسا ہے تو تم بھی ان لوگوں سے —— جنہوں نے ہماری یاد سے پہلوتہی کی ہے اور وہ دنیا کی مادی زندگی کے سوا اور کسی چیز کے طالب نہیں ہیں —— منہ پھیر لو اور ان کی بالکل پروا نہ کرو کیونکہ وہ گفتگو کرنے کے لائق ہی نہیں ہیں، (فاعرض عمن تولّٰی عن ذکرنا ولم یرد الّا الحیاۃ الدنیا)۔

بعض مفسرین کے عقیدہ کے مطابق "ذکر خدا" سے مراد قرآن ہے، اور کبھی یہ احتمال دیا گیا ہے کہ اس سے مراد منطقی اور عقلی دلائل ہیں، جو انسان کو خدا تک پہنچاتے ہیں، یہ احتمال بھی دیا ہے کہ اس سے مراد وہی یادِ خدا ہے جو غفلت کا نقطۂ مقابل ہے۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ تعبیر ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے، جس میں خدا کی طرف ہر قسم کی توجہ شامل ہے —— چاہے وہ توجہ قرآن کے ذریعہ ہو، یا دلیل عقل سے ہو، چاہے سنّت کے طریق سے ہو، یا قیامت کی یاد کے ذریعہ ہو۔

ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یادِ خدا سے غفلت اور مادیات اور زرق وبرق دنیا کی طرف متوجہ رہنے کے درمیان ایک رابطہ ہے۔ اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک دوسرے کے مقابل تاثیر ہے خدا کی یاد سے غفلت انسان کو دنیا پرستی کی طرف ہانک کرلے جاتی ہے، جیسا کہ دنیا پرستی انسان کو خدا کی یاد سے غافل کر دیتی ہے۔ اور یہ دونوں ہوا پرستی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور طبعی طور سے وہ خرافات جو ان کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں وہ انسان کی نظر میں جلوہ دکھاتے ہیں اور آہستہ آہستہ ایک عقیدہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

شاید یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہ ہو کہ اس گروہ سے منہ پھیر لینے کا حکم تبلیغ رسالت کے ساتھ جو پیغمبرؐ کا وظیفہ اصلی ہے ہرگز اختلاف نہیں رکھتا، چونکہ انذار وتبلیغ وبشارت ایسے موقعوں کے ساتھ مخصوص ہیں جہاں اثر کرنے کا کچھ نہ کچھ

احتمال ہو، جہاں اثر کے نہ ہونے کا یقین ہو وہاں اپنی توانائیوں کو فضول صرف نہیں کرنا چاہیے۔ اور اتمام حجت کے بعد اعراض کر لینا چاہیے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہ حکم پیغمبرؐ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ یہ راہ حق کے تمام ندا دینے والوں کو شامل ہے تاکہ وہ اپنی قیمتی تبلیغی توانائیوں کو صرف ایسے مقام پر صرف کریں جہاں اثر کی اُمید ہو۔ لیکن مغرور وسیاہ دل دنیا پرست جن کی ہدایت کی کوئی امید نہ ہو ان کو اتمام حجت کے بعد ان کی حالت پر چھوڑ دینا چاہیے، تاکہ خدا ان کے بارے میں فیصلہ کرے۔

آخری زیر بحث آیت میں اس گروہ کے فکری انحطاط کو ثابت کرنے کے لیے مزید کہتا ہے،: "یہ ہے ان کی معلومات کی آخری حد" (ذالك مبلغهم من العلم)۔

ہاں ! ان کے افکار کی بلندی یہاں پر آکر ختم ہو جاتی ہے کہ ملائکہ کے بارے میں خدا کی بیٹیاں ہونے کا افسانہ گھڑیں، اور اوہام وخرافات کی تاریکیوں میں ہاتھ پاؤں مارتے پھریں، اور یہ ہے ان کی ہمت کا آخری نقطہ کہ خدا کو بھلا کر دنیا کی طرف رخ کریں۔ اور اپنے تمام انسانی شرف اور حیثیت کو درھم و دینار کے بدلے میں فروخت کر ڈالیں۔

آخر میں کہتا ہے "تیرا پروردگار ان لوگوں کو جو اس کے راستے سے گمراہ ہو گئے ہیں اچھی طرح سے پہچانتا ہے، اور ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی اچھی طرح سے جانتا ہے" (ان ربك هو اعلم بمن ضل عن سبيله و هو اعلم بمن اهتدٰى)۔

"ذالك مبلغهم من العلم" کا جملہ ہو سکتا ہے کہ بت پرستی اور فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھنے جیسی خرافات کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی اس گروہ کی آخری آگاہی اور علم یہی موہومات ہیں۔

یا دنیا پرستی اور ان کے مادیات کے چنگل میں اسیر ہونے کی طرف اشارہ ہو، یعنی ان کا انتہائی فہم اور شعور یہ ہے کہ انھوں نے خواب وخور، عیش ونوش، اور فانی و زود گذر متاع اور زرق و برق دنیا پر قناعت کرلی ہے۔

ایک مشہور دعا میں جو ماہ شعبان کے اعمال میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے نقل ہوئی ہے یہ آیا ہے کہ :

ولا تجعل الدنيا اكبر همنا و لا مبلغ علمنا

"خداوندا ! دنیا کو ہمارے لیے سب سے بڑی فکری مشغولیت، اور ہمارے علم وآگاہی کی انتہا قرار نہ دے۔"[1]

آیت کا اختتام اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے، کہ خدا گمراہوں کو بھی اچھی طرح پہچانتا ہے اور ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی ایک کو اپنے غضب کا مشمول بناتا ہے اور دوسرے کو اپنے لطف کا مشمول قرار دیتا ہے۔ اور قیامت میں ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق جزا دے گا۔

---

[1] یہ دعا اس اشارہ کے بغیر کہ یہ ماہ شعبان کے اعمال سے مربوط ہے۔ مجمع البیان اور بعض دوسری تفسیروں میں بھی زیر بحث آیت کے ذیل میں آئی ہے۔

ایک نکتہ

دنیا پرستوں کا سرمایہ

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیات میں، دنیا پرستوں کے لیے علم و آگاہی کے قائل ہونے کے باوجود، انہیں گمراہ شمار کرتا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کی نگاہ میں وہ علوم جن کا آخری اور اصلی مقصد صرف مادیات کا حصول ہو اور اس کے سوا کوئی اور بلند تر مقصد نہ ہو، وہ علم نہیں ہے، بلکہ وہ ضلالت و گمراہی ہے، اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ وہ تمام بدبختیاں جو موجودہ دنیا میں پائی جاتی ہیں —— تمام جنگیں، خونریزیاں، ظلم و ستم، تجاوزات، فسادات اور آلودگیاں —— انہیں ضلالت آفرین علوم سے پیدا ہوتی ہیں، ان کے علم کی انتہا وہی حیات دنیا ہے، اور ان کی نگاہ کا افق ان کی حیوانی احتیاجات و ضروریات سے آگے نہیں جاتا۔

ہاں! جب تک علم بلند تر مقاصد کے لیے آلہ نہ بنے جہالت ہے۔ اور جب تک وہ نور ایمان کے لیے ایک سرچشمہ اور اس کی راہ کا ایک ذریعہ نہ ہو، وہ ضلالت و گمراہی ہے۔

۳۱۔ وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۙ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوْا بِمَا
عَمِلُوْا وَیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی ۚ
۳۲۔ اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ
وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ
اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ
بِمَنِ اتَّقٰی ۧ

ترجمہ

۳۱۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے وہ بھی اور جو کچھ زمین میں ہے وہ خدا ہی کے لیے ہے، تاکہ بدکاروں کو ان کے بُرے اعمال کی بنا پر سزا دے، اور نیکو کاروں کو ان کے نیک اعمال کے لیے اجر و پاداش عطا کرے۔

۳۲۔ وہی لوگ جو گناہانِ کبیرہ اور بُرے اعمال سے، سوائے صغیرہ کے، دوری اختیار کرتے ہیں، تیرے پروردگار کی بخشش وسیع ہے۔ وہ تمھاری نسبت سب سے زیادہ آگاہ ہے، اس وقت سے جب اس نے تمھیں زمین سے پیدا کیا، اور جس وقت کہ تم جنینوں کی صورت میں اپنی ماؤں کے شکم میں تھے، پس تم خودستائی نہ کرو کیونکہ وہ پرہیز گاروں کو بہتر طور سے جانتا ہے۔

تفسیر

خودستائی نہ کرو وہ تمہیں اچھی طرح پہچانتا ہے،

چونکہ گزشتہ آیات میں گمراہوں اور ہدایت یافتہ لوگوں کی نسبت علم خدا کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیات میں اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے، "جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب خدا کے لیے ہی ہے" (و للہ ما فی السماوات و ما فی الارض)۔

عالم ہستی میں مالکیت مطلقہ اسی کے لیے ہے، اور حاکمیت مطلقہ بھی اسی کے لیے ہے، اسی بنا پر عالم ہستی کی تدبیر بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور جب یہ بات ہے تو پھر اس کے علاوہ اور کوئی عبودیت و شفاعت کے لائق نہیں ہے۔

اس وسیع مخلوق کی خلقت سے اس کا سب سے بڑا ھدف اور مقصد یہ ہے کہ انسان یعنی عالم ہستی کے گل سرسبد کو تکوینی اور تشریعی پروگراموں اور انبیاء کی تعلیم و تربیت کے ذریعہ تکامل و ارتقاء کی راہ میں آگے لے جائے۔

لہٰذا آیت کے آخر میں اس مالکیت کے نتیجہ کے عنوان سے فرماتا ہے: "غرض و مقصد یہ ہے کہ بدکاروں کو ان کے بُرے اعمال کی بنا پر سزا اور عذاب دے اور نیکوکاروں کو ان کے اچھے اعمال کے لیے اجر و پاداش عطا کرے" (لیجزی الذین اساٰءوا بما عملوا و یجزی الذین احسنوا بالحسنٰی)[1]

اس کے بعد نیکوکاروں کے اس گروہ کی توصیف و تعریف کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے،: "وہ وہی لوگ ہیں جو گناہان کبیرہ اور برے اعمال سے دوری اختیار کرتے ہیں، اور اگر ان سے کوئی گناہ ہوتا بھی ہے تو وہ صرف صغیرہ ہوتا ہے" (الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللمم)۔

"کبائر" جمع ہے کبیرہ کی اور "اثم" اصل میں اس عمل کو کہتے ہیں جو انسان کو خیر و ثواب سے دور کر دیتا ہے، لہٰذا عام طور پر گناہوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

"لمم" (بروزن قلم) "مفردات" میں "راغب" کے قول کے مطابق، گناہ سے قریب ہونے کے معنی میں ہے، اور گناہانِ صغیرہ کو بھی لمم کہا جاتا ہے، اصل میں یہ لفظ "المام" کے مادہ سے لیا گیا ہے، جو کسی چیز کو انجام دیئے بغیر اس کے قریب ہونے کے معنی میں ہے، اور بعض اوقات "قلیل اور کم اشیاء" پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے، (گناہ صغیرہ پر اطلاق بھی اسی بنا پر ہے)۔

---

[1] "لیجزی" میں "لام" "لام غایت" ہے، تو اس بنا پر جزاء و سزا خلقت کی غایت و مقصد ہے اگرچہ بعض نے اسے گزشتہ آیت کے لفظ "اعلم" کے متعلق سمجھا ہے۔ اور (للہ ما فی السماوات و ما فی الارض) کے جملہ کو جملہ معترضہ جانتے ہیں، لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔

مفسرین نے بھی "لمم" کے لیے تقریباً اسی قسم کی تفسیریں بیان کی ہیں، بعض نے اس کی "گناہ صغیرہ" کے ساتھ، اور بعض نے اسے معصیت کی نیت اسے انجام دیئے بغیر، اور بعض نے "کم اہمیت معاصی" کے ساتھ اس کی تفسیر کی ہے۔

بعض اوقات یہ بھی کہا گیا ہے کہ "لمم" ہر قسم کے گناہ کو شامل ہے، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، لیکن اس کی عادت نہ پڑ گئی ہو، اور وہ کبھی کبھار سرزد ہو جاتا ہو۔ اور انسان متذکر ہو کر اس سے توبہ کرے۔

اسلامی روایات میں بھی اس لفظ کے لیے گوناں گوں تفسیریں آئی ہیں، ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہوا ہے کہ آپؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

هوالذنب يلم به الرجل فيمكث ما شاء الله، ثم يلم به بعد

"اس سے مراد وہ گناہ ہے جسے انسان کر بیٹھتا ہے پھر ایک مدت تک اس سے رکا رہتا ہے، اور پھر دوبارہ اس سے آلودہ ہو جاتا ہے، (لیکن یہ اس کا ہمیشہ کا عمل ہرگز نہیں ہے) [1]

ایک اور دوسری حدیث میں اُسی امامؑ سے یہ منقول ہوا ہے کہ:

اللمم الرجل يلم به الذنب فيستغفر الله منه

"لمم یہ ہے کہ انسان کوئی گناہ کر بیٹھے اور پھر اس سے استغفار کرے"۔ [2]

اور دوسری روایات بھی اسی مفہوم کی نقل ہوئی ہیں۔

آیت میں موجود قرائن بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ "لمم" ان گناہوں کے معنی میں ہے جو کبھی کبھار انسان سے سرزد ہو جاتے ہوں، پھر وہ متوجہ ہو کر انہیں چھوڑ دیتا ہے،

کیونکہ "کبائر" سے "لمم" کا استثناء (اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے استثناء کا ظاہر، استثناء متصل ہے) اس معنی پر ایک گواہ ہے۔

علاوہ ازیں قرآن بعد والے جملہ میں کہتا ہے، "تیرے پروردگار کی بخشش بہت وسیع ہے" (ان ربك واسع المغفرة)۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے جس کے لیے پروردگار کے غفران کی ضرورت ہے، نہ کہ صرف قصد و نیت، اور گناہ سے اس کا مرتکب ہوئے بغیر قریب ہونا۔

بہر حال مراد یہ ہے کہ ممکن ہے نیکوکاروں سے کوئی لغزش ہو گئی ہو، لیکن گناہ ان کی طبیعت اور عادت کے برخلاف ہے، ان کی روح اور قلب ہمیشہ پاک رہتے ہیں، اور آلودگیاں عارضی قسم کی ہوتی ہیں، لہٰذا گناہ کرتے ہی پشیمان ہو جاتے ہیں، اور خدا سے بخشش کی التجا کرتے ہیں، جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیت ۲۰۱ میں آیا ہے: ان الذين اتقوا اذا مسهم طائف من الشيطان تذكروا فاذا هم مبصرون "پرہیزگار جس وقت ان شیطانی وسوسوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ جو ان کے وجود کے گرد گردش کر رہے ہیں، تو وہ خدا کو یاد کرتے ہیں اور بینا ہو جاتے ہیں (اور توبہ کر لیتے ہیں)۔

---

[1] "کافی" جلد ۲ کتاب الایمان والکفر باب اللمم (ص ۴۴۰)۔

[2] "کافی جلد ۲ کتاب الایمان والکفر باب اللمم (ص ۴۴۰)۔

اسی معنی کی نظیر سورۂ آل عمران کی آیت ۱۳۵ میں بھی آئی ہے، جہاں وہ "متقین اور محسنین" کی تعریف و توصیف میں فرماتا ہے:
والذین اذا فعلوا فاحشة او ظلموا انفسهم ذکروا الله فاستغفروا لذنوبهم: "وہ وہی لوگ تو ہیں کہ جس وقت وہ کسی برے کام کا ارتکاب کر لیتے ہیں، یا اپنے آپ پر کوئی ظلم کر لیتے ہیں، تو وہ خدا کو یاد کرتے ہیں، اور اپنے گناہوں کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں"
یہ سب باتیں اس تفسیر پر گواہ ہیں جو "لمم" کے لیے بیان کی گئی ہیں۔
یہاں ہم امام صادقؑ کی ایک دوسری حدیث کے ساتھ اس بحث کو ختم کرتے ہیں، جو آپ نے زیر بحث آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کے جواب میں فرمائی۔

اللمام العبد الذی یلم بالذنب بعد الذنب لیس من سلیقته، ای من طبیعته

"لمم" کو انجام دینے والا وہ بندہ ہے جس سے کبھی کبھار گناہ سرزد ہو جاتا ہے لیکن اس کی طبیعت اور عادت ایسی نہیں ہوتی"[۱]

آیت کے آخر میں اجر و ثواب اور سزا و عذاب کے مسئلہ میں عدالت پروردگار کی تاکید کے لیے، اس کے علم بے پایاں کے بارے میں، جو تمام بندوں اور ان کے اعمال کو محیط ہے گفتگو کرتا ہے، اور فرماتا ہے: "وہ تمہاری نسبت سب سے زیادہ آگاہ ہے اسی وقت سے جب اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا، اور جس وقت کہ تم جنینوں کی صورت میں اپنی ماؤں کے شکم میں تھے" (هو اعلم بکم اذ انشاکم من الارض واذ انتم اجنة فی بطون امهاتکم)[۲]
انسان کی زمین سے خلقت یا تو اس کی پہلی خلقت کے اعتبار سے ہے، جو حضرت آدم کے طریقہ سے ہوئی کہ وہ مٹی سے پیدا ہوئے تھے، یا اس اعتبار سے ہے کہ انسانی وجود کے تشکیل دینے والے تمام مادے زمین سے لئے گئے ہیں، جو تغذیہ کے طریق سے نطفہ کی ترکیب بندی میں، اور اس کے بعد جنین کی پرورش کے مراحل میں بھی اثر رکھتے ہیں، اور بہر حال مقصد یہ ہے کہ خدا اسی وقت سے، جب تمہارے وجود کے ذرات زمین کی مٹی کے درمیان تھے اور اسی دن سے، جب کہ تم رحم مادر میں، رحم کے تاریک ظلمانی پردوں کے اندر، ایک ناچیز نطفہ تھے، تمہارے وجود کے تمام جزئیات سے آگاہ تھا، تو ان حالات میں کس طرح ممکن ہے کہ وہ تمہارے اعمال سے بے خبر ہو؟
یہ تعبیر ضمنی طور سے بعد والی گفتگو کے لیے ایک مقدمہ ہے جس میں وہ فرماتا ہے: "پس تم خود ستائی نہ کرو اور اپنے پاک اور طاہر ہونے کے بارے میں باتیں نہ بناؤ، کیونکہ وہ پرہیزگاروں کو سب سے بہتر طور سے جانتا ہے" (فلا تزکوا انفسکم هو اعلم بمن اتقی)۔
نہ تو اسے تمہارے تعارف کی ضرورت ہے، اور نہ ہی تمہارے نیک اعمال کی تشریح و تفصیل کی، وہ تمہارے اعمال

---

[۱] "کافی" جلد ۲ باب لمم ص ۴۴۱۔
[۲] "اجنة"، جمع جنین، اس بچے کے معنی میں ہے جو شکم مادر میں ہو۔

سے بھی آگاہ ہے، اور تمھاری نیت کے خلوص کی میزان سے بھی، یہاں تک کہ وہ تمھیں خود تم سے بہتر طور پر پہچانتا ہے، اور تمہارے اندرونی صفات اور بیرونی اعمال سے بخوبی آگاہ ہے۔

بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت ایسے گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو نماز و روزہ کو انجام دینے کے بعد اپنی تعریف کرنے لگتے تھے اور کہا کرتے تھے، : ہماری نماز اس طرح کی تھی، اور ہمارا روزہ ایسا تھا! تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور انہیں اس کام سے منع کیا[1]

چند نکات

۱۔ خدا کا علم بے پایاں

ان آیات میں علم خدا اور اس کی بے انتہا وسعت کی طرف پھر اشارہ ہوا ہے، لیکن یہ تعبیر ایک نئی تعبیر ہے، کیونکہ اس میں دو نکتوں پر تکیہ کیا گیا ہے جو انسان کے مخفی ترین اور پیچیدہ ترین حالات میں سے ہے: مٹی سے انسان کی خلقت کی حالت، جس میں ابھی تک ماہر علماء کی عقلیں حیران ہیں، کہ ایک زندہ موجود کا بے جان موجود سے وجود میں آنا کس طرح ممکن ہے؟ اس قسم کا کوئی امر گزشتہ زمانہ میں قطعی اور یقینی طور پر واقع ہوا ہے۔ خواہ انسان کے بارے میں ہوا ہو یا دوسرے جانداروں کے بارے میں، لیکن کن حالات میں ایسا ہوا یہ معلوم نہیں ہے۔ یہ مسئلہ اس قدر پیچیدہ اور پراسرار ہے، کہ ابھی تک اس کے اسرار نوع بشر کے علم و دانش سے پوشیدہ چلے آرہے ہیں۔

دوسرا مسئلہ جنینی دور میں وجودِ انسانی کی اسرار آمیز تبدیلیوں کا ہے، کہ وہ بھی انسان کی خلقت کی کیفیات میں سے پراسرار ترین حالت ہے، اگرچہ انسان کے علم و دانش کے لیے اس کا ایک ہیولا سا کشف ہو چکا ہے، لیکن جنین کے بارے میں اسرار آمیز مسائل، اور جواب کے بغیر رہے ہوئے سوالات تاحال بھی کم نہیں ہیں۔

وہ ہستی جو انسان کے وجود کی ان دونوں حالتوں کے تمام اسرار، اور اس کی تبدیلیوں اور تغیرات سے آگاہ ہے، اور اس کی ہدایت و رہبری اور تربیت کرتی ہے، کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کے اعمال و افعال سے باخبر نہ ہو اور ہر کسی کو اتنی جزا نہ دے جو اُس کے لیے لازم ہے؟

پس یہ علم بے پایاں اس کی عدالت مطلقہ کا سہارا ہے۔

۲۔ کبائر الاثم کیا ہے؟

گناہانِ کبیرہ کے بارے میں جن کی طرف چند آیاتِ قرآن میں اشارہ ہوا ہے،[2] ایک طرف تو مفسرین نے اور دوسری طرف فقہا اور محدثین نے بہت اختلاف کیا ہے۔

---

[1] "روح المعانی" جلد ۷، ص ۵۵۔

[2] نساء آیت ۳۱ شوریٰ آیت ۳۷ اور زیر بحث آیات۔

بعض تو سب گناہوں کو ہی کبیرہ کہتے ہیں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں ہر گناہ بڑا ہے۔

جب کہ بعض دوسروں نے "کبیرہ" اور "صغیرہ" کو ایک امر نسبتی گردانا ہے، اور وہ ہر گناہ کو زیادہ اہم گناہ کے مقابلہ میں صغیر سمجھتے ہیں، اور چھوٹے گناہ کی نسبت کبیرہ جانتے ہیں۔

بعض نے کبیرہ ہونے کا معیار، اس کے لیے متن قرآن میں عذاب الٰہی کو سمجھا ہے۔

بعض اوقات یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر وہ گناہ "گناہ کبیرہ" ہے، جس کے لیے شرعی حد جاری ہوتی ہے۔

لیکن سب سے بہتر بات یہ ہے، کہ یہ کہا جائے، کہ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے، کہ "کبیرہ" کی تعبیر عظمت گناہ کی دلیل ہے، لہٰذا ہر وہ گناہ جس میں ذیل کی شرائط پائی جاتی ہوں، گناہ کبیرہ شمار ہوگا:

الف: وہ گناہ جن پر خدا نے عذاب کی دھمکی دی ہے۔

ب: وہ گناہ جو اہل شرع کی نظر میں اور روایات کی زبان میں کبیرہ کہے گئے ہیں۔

ج: وہ گناہ جو منابع شرعی میں ان گناہوں سے بڑے شمار ہوئے ہیں جو کبائر کا حصہ ہیں۔

د: اور آخر میں وہ گناہ جن کے کبیرہ ہونے کی معتبر روایات میں تصریح ہوئی ہے۔

اسلامی روایات میں کبائر کی تعداد مختلف بیان کی گئی ہے، بعض میں ان کی تعداد سات گناہ ہیں، (قتل نفس، عقوق والدین، سُود خوری، ہجرت کے بعد دارالکفر کی طرف پلٹ جانا، پاک دامن عورتوں کی طرف زنا کی نسبت دینا، یتیم کا مال کھانا، اور جہاد سے فرار کرنا) [1]

اور بعض دوسری روایات میں اس کی تعداد، اس فرق کے ساتھ، سات گناہ شمار ہوئی ہے، کہ عقوق والدین کی جگہ "کلما اوجب اللہ علیہ النار" (ہر وہ گناہ جس پر خدا نے جہنم واجب کی ہے) ذکر ہوا ہے۔

بعض دوسری روایات میں اس کی تعداد دس شمار ہوئی ہے، اور بعض میں انیس، اور بعض میں بہت زیادہ تعداد نظر آتی ہے [2]

کبائر کی تعداد کے شمار کرنے میں یہ فرق اس بنا پر ہے، کہ تمام گناہانِ کبیرہ بھی یکساں نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے بعض زیادہ اہمیت کے حامل ہیں، دوسرے لفظوں میں وہ اکبر الکبائر ہیں، اس بنا پر ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

۲۔ خودستائی اور تزکیۂ نفس

اس کام کی برائی اس حد تک ہے کہ یہ مطلب ایک ضرب المثل کی صورت اختیار کر گیا ہے کہ: تزکیۃ المرء نفسہ قبیحہ "خودستائی قبیح اور ناپسندیدہ کام ہے۔"

---

[1] "وسائل الشیعہ" جلد ۱۱ "ابواب جہاد النفس" باب ۴۶ حدیث ۱۔

[2] مزید توضیح کے لیے اوپر والے مدرک (باب ۴۶ از ابواب جہاد النفس) کی طرف رجوع کریں وہاں کبائر کے تعین کے بارے میں ۳۷ احادیث ذکر ہوئی ہیں۔

اس ناپسند عمل کا اصلی سرچشمہ اپنے اپ کو نا پہچاننا ہے، کیونکہ اگر انسان اپنے آپ کو اچھی طرح پہچان لے، پروردگار کی عظمت کے مقابلہ میں اپنے چھوٹے پن کو، اور اپنے ذمہ سنگین ذمہ داریوں کے مقابلہ میں اپنے اعمال کے ناچیز ہونے کو، اور ان عظیم نعمتوں کو جو خدا نے اُسے بخشی ہیں جان لے، تو پھر وہ ہرگز خودستائی کی راہ میں قدم نہیں رکھے گا۔

غرور و غفلت، اور خود کو بڑا سمجھنا، اور زمانہ جاہلیت کے افکار بھی اس قبیح کام کے لیے دوسرے اسباب و محرکات ہیں۔

خودستائی چونکہ اپنے کامل ہونے کے عقیدہ کو بیان کرتی ہے، لہٰذا پیچھے رہ جانے اور پسماندگی کا سبب بن جاتی ہے۔ کیونکہ تکامل وارتقاء کا رمز اپنی تقصیر و کوتاہی کا اعتراف، اور نقائص اور کمزوریوں کے وجود کو قبول کرنا ہے۔

اسی بنا پر اولیائے خدا ہمیشہ خدائی وظائف اور ذمہ داریوں کے مقابلہ میں اپنی تقصیر و کوتاہی کے معترف رہتے تھے اور لوگوں کو خودستائی اور اپنے اعمال کو بڑا سمجھنے سے منع کیا کرتے تھے۔

ایک حدیث میں امام باقرؑ سے زیر بحث آیت (فلا تزکوا انفسکم) کی تفسیر میں آیا ہے:

لا یفتخر احدکم بکثرۃ صلاتہ و صیامہ و زکوتہ ونسکہ لان اللہ عز وجل اعلم بمن اتقی:

"تم میں سے کوئی بھی شخص اپنی نماز و روزہ و زکوٰۃ اور مناسک حج و عمرہ کے زیادہ ہونے پر فخر نہ کرے کیونکہ خدا تم میں سے پرہیزگاروں کو سب سے بہتر جانتا ہے۔"[1]

امیرالمومنین علیہ السلام، معاویہ کے نام اپنے ایک خط میں، جس میں بہت ہی اہم مسائل تحریر کئے تھے، فرماتے ہیں:

ولولا ما نھی اللہ عنہ من تزکیۃ المرء نفسہ لذکر ذاکر فضائل جمۃ، تعرفھا قلوب المؤمنین، ولا تمجھا اٰذان السامعین

"اگر یہ بات نہ ہوتی کہ خدا نے خودستائی سے منع کیا ہے، تو بیان کرنے والا اپنے بہت سے ایسے فضائل کو شمار کرتا جن سے آگاہ مومنین کے دل آشنا ہیں اور سننے والوں کے کانوں کو ان کے سننے سے انکار نہیں ہے۔ (بیان کرنے والے سے مراد خود امام علیہ السلام ہیں)[2]

اس سلسلہ کی ایک تفصیلی بحث جلد ۳ سورۂ نساء کی آیت ۴۹ کے ذیل میں بھی آچکی ہے۔

یہاں یہ بات واضح کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ بعض اوقات ضرورتیں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ انسان اپنے تمام امتیازات وخصوصیات کے ساتھ جو اس میں پائی جاتی ہیں اپنا تعارف کرائے کیونکہ اس کے بغیر مقدس اہداف و مقاصد پامال ہو جاتے ہیں اس قسم کی باتوں اور خودستائی اور تزکیہ نفس کے درمیان بہت زیادہ فرق ہے۔

اس بات کا نمونہ امام سجادؑ کا مسجد شام (دمشق) کا وہ خطبہ ہے۔ جبکہ آپ یہ چاہتے تھے کہ اپنا اور اپنے خاندان واہلِ بیت

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۱۶۵۔

[2] نہج البلاغہ خط ۲۸۔

کا شام کے لوگوں سے تعارف کرائیں تاکہ شہدائے کربلا کے خارجی ہونے کے سلسلہ میں بنی امیہ کا سازشی منصوبہ ناکام، اور ان کے شیطانی منصوبے نقش برآب ہو جائیں۔

ایک روایت میں امام صادق ؑ سے بھی منقول ہوا ہے کہ جب لوگوں نے آپ سے خود ستائی اور اپنی تعریف آپ کرنے کے بارے میں سوال کیا تو آپ ؑ نے فرمایا:

"بعض اوقات کچھ ضرورتوں کی وجہ سے لازمی ہو جاتی ہے۔"

اور اس کے بعد آپ ؑ نے انبیاء کے کلام سے دو مواقع جو قرآن میں آئے ہیں، استدلال میں پیش کئے۔

پہلے یوسف ؑ جنہوں نے عزیز مصر کو یہ تجویز پیش کی، کہ وہ انہیں ملک مصر کا خزانہ دار بنائے، تو انہوں نے کہا:

انی حفیظ علیم (یوسف - ۵۵)

"میں ایک آگاہ اور صاحب علم نگہبان ہوں۔"

اور دوسرا خدا کے عظیم پیغمبر "ھود" کے بارے میں جنہوں نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

انا لکم ناصح امین۔ (اعراف - ۶۸)

"میں تمہارے لیے امین خیر خواہ ہوں۔"

۳۳۔ اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ تَوَلّٰى ۙ
۳۴۔ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ۝
۳۵۔ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ۝
۳۶۔ اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِىْ صُحُفِ مُوْسٰى ۙ
۳۷۔ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِىْ وَفّٰٓى ۙ
۳۸۔ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۙ
۳۹۔ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۙ
۴۰۔ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝
۴۱۔ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۙ

ترجمہ

۳۳۔ کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اسلام (یا انفاق) سے روگردانی کی؟
۳۴۔ اور تھوڑا سا دیا اور زیادہ کو روک لیا۔
۳۵۔ کیا اس کے پاس علم غیب ہے اور اس نے دیکھ لیا ہے (کہ دوسرے اس کے گناہوں کو اپنے کندھے پر لے سکتے ہیں)
۳۶۔ کیا وہ اس سے باخبر نہیں ہوا ہے کہ جو موسٰیؑ کی کتابوں میں نازل ہوا ہے؟
۳۷۔ اور اسی طرح ابراہیمؑ کی کتابوں میں جس نے اپنی ذمہ داری کو پوری طرح سے ادا کیا تھا۔

۳۸۔ کہ کوئی بھی شخص کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنے کندھے پر نہیں لے گا۔

۳۹۔ اور یہ کہ انسان کے لیے اس کی اپنی سعی وکوشش کے علاوہ اور کوئی حصہ نہیں ہے۔

۴۰۔ اور یہ کہ اس کی سعی وکوشش عنقریب دیکھی جائے گی (اور وہ اس کا نتیجہ پالے گا)۔

۴۱۔ اس کے بعد اسے پوری پوری جزا دی جائے گی۔

شانِ نزول

اکثر مفسرین نے اوپر والی آیات کے لیے علیحدہ علیحدہ شان نزول نقل کئے ہیں، لیکن یہ شان نزول آپس میں ہم آہنگ نہیں ہیں۔ ان میں سے جو سب سے زیادہ مشہور ہیں وہ ذیل کی دو شان نزول ہیں:

۱۔ ان آیات میں عثمان کا واقعہ بیان ہوا ہے، اس کے پاس بہت زیادہ مال و دولت تھی، اور وہ اپنے مال میں سے خرچ کیا کرتا تھا، اس کے رشتہ داروں میں سے ایک "عبداللہ بن سعد" نامی شخص نے کہا، اگر تیری یہی حالت رہی تو ایک دن تیرے پاس کچھ بھی باقی نہ بچے گا، عثمان نے کہا، میں نے بہت گناہ کئے ہیں۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اس ذریعہ سے خدا کی رضا اور عفو و بخشش حاصل کروں عبداللہ نے کہا، اگر تو اپنی سواری کا اونٹ اس کے سازوسامان سمیت مجھے دے دے تو میں تیرے سارے گناہ اپنی گردن پر لے لیتا ہوں، عثمان نے ایسا ہی کیا، اور اس قرارداد پر گواہ لئے، اور اس کے بعد اس نے انفاق کرنے سے ہاتھ کھینچ لیا، (تو اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور اس کام کی شدت سے مذمت کی اور اس حقیقت کو واضح کیا کہ کوئی شخص دوسرے کے بارِ گناہ کو اپنے کندھے پر نہیں لے سکتا، اور ہر شخص کی سعی وکوشش کا نتیجہ خود اسی کو ملے گا۔[1]

۲۔ یہ آیت "ولید بن مغیرہ" کے بارے میں ہے، وہ پیغمبرؐ کے پاس آیا، اور دین اسلام سے قربت حاصل کی تو بعض مشرکین نے اسے سرزنش کی اور کہا کہ تو نے ہمارے بزرگوں کے دین کو چھوڑ دیا ہے اور انہیں گمراہ شمار کرتا ہے، اور تو نے یہ گمان کیا کہ وہ جہنم کی آگ میں ہیں۔ اس نے کہا کہ واقعاً میں خدا کے عذاب سے ڈر گیا ہوں، تو سرزنش کرنے والے نے کہا اگر تو اپنے مال کا کچھ حصہ مجھے دے دے اور شرک کی طرف پلٹ آئے تو میں تیرا عذاب اپنی گردن پر لے لیتا ہوں ولید بن مغیرہ نے ایسا ہی کیا، لیکن جو مال دینا تھا اس میں سے تھوڑے سے حصہ کے سوا ادا نہ کیا، تو اوپر والی آیت نازل ہوئی، اور ولید کے

---

[1] اس شان نزول کو طبرسی نے "مجمع البیان" میں نقل کیا ہے، اور دوسرے مفسرین مثلاً "زمخشری" نے "کشاف" میں "فخر رازی" نے "تفسیر کبیر" میں بھی نقل کیا ہے "طبرسی" نے اسے نقل کے بعد مزید کہا ہے، کہ یہ شانِ نزول ابن عباس، کلبی اور مفسرین کی ایک جماعت سے نقل ہوئی ہے۔

ایمان سے منہ پھیرنے پر مذمت کی۔[1]

تفسیر

ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

گزشتہ آیات میں اس سلسلہ میں گفتگو تھی کہ خدا بدکاروں کو ان کے برے کاموں کے بدلے میں سزا اور عذاب کرے گا اور نیکو کاروں کو اجر دے گا، چونکہ ممکن ہے بعض یہ تصور کرلیں کہ کسی کو کسی دوسرے کے بدلے میں بھی سزا ہو جاتی ہے۔ یا کوئی دوسرے کے گناہ اپنی گردن پر لے لیتا ہو، تو یہ آیات اس توہم کی نفی میں آئی ہیں، اور اس اہم اسلامی اصل کی کہ ہر شخص کے اعمال کا نتیجہ صرف اسی کی طرف لوٹتا ہے تشریح کرتی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: "کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اسلام (یا انفاق) سے منہ پھیر لیا ہے" (افرءیت الذی تولی)۔

"اور تھوڑا سا مال دیا اور انفاق (یا مزید مال دینے سے) ہاتھ روک لیا" (اس گمان سے کہ دوسرا اس کے گناہ کے بوجھ کو اپنے کندھے پر اٹھا سکتا ہے) (واعطی قلیلاً واکدی)۔[2]

"کیا وہ علم غیب رکھتا ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ دوسرے اس کے گناہوں کو اپنے کندھے پر لے سکتے ہیں": (أعنده علم الغیب فھو یری)۔

قیامت کے دن سے پلٹ کر کون آیا ہے اور ان کے لیے یہ خبر لایا ہے کہ لوگ رشوت لے کر دوسروں کے گناہ اپنی گردن پر لے سکتے ہیں؟ یا کون شخص خدا کی طرف سے آیا ہے اور انہیں یہ خبر دی ہے کہ خدا اس معاملہ پر راضی ہے؟ کیا اس کے سوا بھی کوئی اور بات ہے کہ انہوں نے کچھ اوھام دل سے گھڑ لیے ہیں، اور اپنی ذمہ داریوں سے فرار کرنے کے لیے انہوں نے خود کو ان اوہام کے تانے بانے میں پھنسا دیا ہے؟

اس شدید اعتراض کے بعد، قرآن ایک اصل کلی کو جو باقی آسمانی دینوں میں بھی آئی ہے پیش کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے، کیا وہ شخص جس نے ان خیالی وعدوں پر "انفاق (یا ایمان) سے ہاتھ اٹھا لیا ہے، اور وہ یہ چاہتا ہے کہ مختصر سا مال ادا کر کے خود کو خدائی عذاب سے رہائی دلائے: "کیا وہ اس سے جو موسیٰ کی کتابوں میں نازل ہوا ہے باخبر نہیں ہوا ہے"؟

---

[1] اس شان نزول کو بھی "مجمع البیان"، "قرطبی"، "روح البیان"، "روح المعانی" اور بعض دوسری تفاسیر میں نقل کیا گیا ہے۔

[2] "اکدٰی" اصل میں "کدیہ" (بروزن حجرہ) زمین کی سختی اور صلابت کے معنی میں ہے اس کے بعد ممسک اور بخیل لوگوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔

(ام لم ینبأ بما فی صحف موسیٰ)۔

اور اسی طرح جو کچھ ابراہیم کی کتاب میں نازل ہوا ہے۔ "وہی ابراہیم جس نے اپنی ذمہ داری کو مکمل طور پر پورا کیا ہے" (و ابراھیم الذی وفّٰی)۔[1]

وہی عظیم پیغمبر جس نے خدا کے تمام عہد اور پیمانوں کو پورا کیا، اس کے حق رسالت کو ادا کیا، اور اس کے دین کی تبلیغ کے سلسلہ میں کسی مشکل، تہدید اور آزار سے ہراساں نہیں ہوا، وہی شخص جو کئی امتحانات سے گزرا، یہاں تک کہ اپنے بیٹے کو خدا کے حکم سے قربانگاہ میں لے گیا اور اس کے گلے پر چھری رکھ دی۔ اور ان تمام امتحانوں سے سربلند اور سرفراز ہو کر باہر آیا، اور خدا نے اُسے مخلوق کی رہبری و امامت کا بلند مقام عطا فرمایا جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۴ میں آیا ہے: واذ ابتلی ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن قال انی جاعلك للناس اماما: اس وقت کو یاد کرو جب خدا نے ابراہیم کو چند احکام کے ذریعہ آزمایا، اور وہ ان تمام امتحانات سے عہدہ برآ ہوئے اور انہیں مکمل کر دیا تو خدا نے اُن سے فرمایا کہ میں نے تجھے لوگوں کا امام و پیشوا قرار دیا۔"

بعض مفسرین نے اس آیت کی وضاحت میں یہ کہا ہے: بذل نفسہ للنیران، و قلبہ للرحمٰن، و ولدہ للقربان و مالہ للاخوان: "ابراہیم نے راہ خدا میں اپنا نفس آگ کے حوالے کر دیا اور اپنا دل خدائے رحمٰن کے لیے اور اپنا بیٹا قربانی کے لیے اور اپنا مال بھائیوں اور دوستوں کے لیے خرچ کیا"۔[2]

"کیا اسے یہ خبر نہیں دی گئی کہ ان تمام کتب آسمانی میں یہ حکم نازل ہوا ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنے دوش پر نہیں لیتا"؟ (الّا تزر وازرۃ وزر اخرٰی)۔

"وزر" اصل میں "وزر" (بروزن خطر) سے لیا گیا ہے، جو پہاڑی پناہ گاہوں کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد لفظ "وزر" بھاری بوجھ کے لیے استعمال ہونے لگا، اس شباہت کی وجہ سے جو وہ پہاڑ کے بڑے بڑے پتھروں سے رکھتا ہے۔ اس کے بعد گناہ پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے کیونکہ وہ ایک بھاری بوجھ انسان کے کندھے پر ڈال دیتا ہے۔

"وازرۃ" سے مراد وہ انسان ہے جو گناہ کے بوجھ کو اٹھاتا ہے"۔[3]

اس کے بعد مزید توضیح کے لیے کہتا ہے: "کیا اسے اس بات کی خبر نہیں ہے کہ ان آسمانی کتابوں میں یہ آیا ہے کہ انسان کے لیے اس کی سعی اور کوشش کے علاوہ اور کوئی حصہ نہیں ہے" وان لیس للانسان الّا ما سعٰی)۔[4]

"سعٰی" اصل میں تیزی کے ساتھ راستہ چلنے کے معنی میں ہے۔ جو دوڑنے کے مرحلہ تک نہ پہنچا ہو۔ لیکن عام طور پر یہ لفظ

---

[1] "وفّٰی" "توفیہ" کے مادہ سے، بذل اور مکمل ادائیگی کے معنی میں ہے۔

[2] "روح البیان" جلد ۹ ص ۲۴۶۔

[3] "وازرۃ" کا مؤنث ہونا اس بنا پر ہے کہ یہ نفس کی صفت ہے جو محذوف ہوا ہے، اور اسی طرح اخرٰی کا مؤنث ہونا بھی۔

[4] "ماسعٰی" میں "ما" مصدریہ ہے۔

سعی و کوشش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، کیونکہ کاموں میں سعی و کوشش کے وقت انسان تیز حرکات انجام دیتا ہے، چاہے وہ نیک کام ہو یا بُرا۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ یہ نہیں فرماتا، کہ انسان کے حصہ میں وہ کام ہے جو اس نے انجام دیا ہے، بلکہ فرماتا ہے کہ وہ سعی و کوشش جو اس نے کی ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اہم چیز سعی و کوشش ہے، چاہے انسان وقتی طور سے اپنے مقصد اور مقصود تک نہ پہنچے، کیونکہ اگر اس کی نیت نیک ہے تو خدا اس کو اچھا اجر دے گا، کیونکہ وہ تو نیتوں اور ارادوں کا خریدار ہے، نہ کہ صرف انجام شدہ کاموں کا۔

"اور کیا اسے اس بات کی خبر نہیں ہے کہ اس کی سعی و کوشش عنقریب دیکھی جائے گی"؟ (وان سعیہ سوف یرٰی)۔

نہ صرف اس سعی و کوشش کے نتائج، چاہے وہ خیر کی راہ میں ہوں یا شر کی راہ میں، بلکہ خود اس کے اعمال اس دن اس کے سامنے آشکار ہوں گے، جیسا کہ ایک دوسری جگہ فرماتا ہے: یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرًا، "وہ دن جس میں ہر شخص ان نیک اعمال کو جنہیں اس نے انجام دیا ہے حاضر پائے گا" (آل عمران۔ ۳۰)

اور قیامت میں نیک و بد اعمال کے مشاہدہ کے بارے میں بھی سورۂ زلزال کی آیت ۷، ۸ میں آیا ہے، (فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرًا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرًّا یرہ) ـــــــ "جس شخص نے ذرہ برابر بھی خیر و نیکی کی ہو گی وہ اسے دیکھے گا، اور جس نے ذرہ برابر بُرا کام کیا تو وہ اسے بھی دیکھے گا"۔

"اس کے بعد اس کے عمل کے لیے اسے پوری پوری جزا دی جائے گی" (ثم یجزاہ الجزاء الاوفٰی)[۱]

"جزاء اوفٰی" سے مراد وہ جزا ہے جو ٹھیک ٹھیک عمل کے عین مطابق ہو، البتہ یہ بات نیک اعمال کے سلسلہ میں تفضل الٰہی کے ساتھ دس گنا یا کئی سو گنا یا کئی ہزار گنا سے اختلاف نہیں رکھتی، اور یہ جو بعض مفسرین نے "جزاء اوفٰی" کو حسنات کے بارے میں زیادہ اجر کے معنی میں لیا ہے، صحیح نظر نہیں آتا، کیونکہ یہ آیت گناہوں کو بھی شامل ہے، بلکہ آیت کی اصلی گفتگو ہی وزر اور گناہ کے بارے میں ہے (غور کیجئے)

---

[۱] "یجزی" کا نائب فاعل ایک ضمیر ہے جو "انسان" کی طرف لوٹتی ہے اور اس سے متصل ضمیر "عمل" کی طرف لوٹتی ہے حرف جر کے حذف کے ساتھ اور تقدیر میں اس طرح تھا: ثم یجزی الانسان بعملہ (او علی عملہ) الجزاء الاوفی "زمخشری" "کشاف" میں کہتا ہے، ممکن ہے کہ تقدیر میں حرف جر نہ ہو۔ کیونکہ "یجزی العبد سعیہ" کہا جاتا ہے (لیکن توجہ رکھنی چاہیئے کہ عام طور پر "جزاہ اللہ علی عملہ" کہا جاتا ہے "جزاہ اللہ عملہ" صحیح نہیں ہے) اور "الجزاء الاوفی" کی تعبیر ہو سکتا ہے کہ "یجزی" کا ایک اور دوسرا مفعول ہو یا مفعول مطلق ہو۔

چند نکات

۱۔ تین اہم اسلامی اصول

اوپر والی آیات میں اسلام کے تین مسلم اصولوں کی طرف اشارہ ہوا ہے، جو گزشتہ آسمانی کتابوں میں بھی مسلم اصول کے عنوان سے پہچانے گئے ہیں۔

الف : ہر شخص اپنے گناہوں کا مسئول اور جوابدہ ہے۔

ب : آخرت میں ہر شخص کا حصہ اس کی سعی و کوشش ہی ہے۔

ج : خدا ہر شخص کو اس کے عمل کے مقابلہ میں پوری پوری جزا دے گا۔

اور اس طرح قرآن بہت سے اوہام اور خرافات پر جو عام لوگوں میں پائے جاتے ہیں یا بعض مذاہب میں وقتی طور پر ایک عقیدہ کی صورت میں آگئے ہیں، خطِ بطلان کھینچ رہا ہے۔

قرآن اس طریقہ سے نہ صرف مشرکین عرب کے عقیدہ کی ـــــ جو زمانہ جاہلیت میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ایک انسان دوسرے کے گناہوں کو اپنے ذمہ لے سکتا ہے ـــــ نفی کر رہا ہے، بلکہ اس مشہور اعتقاد پر بھی ـــــ جو عیسائیوں کے درمیان رائج تھا اور اب بھی ہے، کہ خدا نے اپنے بیٹے مسیح کو دنیا میں اس لیے بھیجا ہے تاکہ وہ سولی پر چڑھ جائے اور آزاد و تکلیف اٹھائے اور گنہگاروں کے گناہ کا بوجھ اپنے کندھے پر لے ـــــ خطِ تنسیخ کھینچ رہا ہے۔

اسی طرح پادریوں کے ایک گروہ کے برے اعمال کی ـــــ جو قرونِ وسطی میں مغفرت نامے اور استحقاق بہشت کے پروانے بیچا کرتے تھے اور موجودہ زمانہ میں بھی گناہ بخشی کے مسئلہ کو جاری رکھے ہوئے ہے ـــــ مذمت کرتا ہے۔

عقل کی منطق بھی اسی چیز کا تقاضا کرتی ہے کہ "ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے، اور اپنے ہی اعمال سے نفع پائے گا۔

یہ اسلامی عقیدہ اس بات کا سبب بنتا ہے، کہ انسان خرافات کی طرف پناہ لینے، یا اپنا گناہ کسی اور کی گردن میں ڈالنے کے بجائے، اعمال خیر کے لیے سعی و کوشش اور جدوجہد کرے، اور گناہ سے پرہیز کرے، اور جب کبھی اس سے کوئی لغزش ہو جائے اور اس سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تو واپس لوٹے اور توبہ کرے اور تلافی مافات کرے۔

انسانوں میں اس تربیتی عقیدہ کی تاثیر مکمل طور پر واضح اور ناقابل انکار ہے۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت کے ان مخرب عقائد کا اثر بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ یہ آیات آخرت کے لیے سعی و کوشش اور دوسرے گھر میں اس کا اجر و پاداش مشاہدہ کرنے کو بیان کر رہی ہیں، لیکن اس کا مدرک اور اصلی معیار دنیا کو بھی اپنے اندر لے لیتا ہے، اس معنی میں کہ اہل ایمان کو دوسروں کے انتظار میں نہیں بیٹھنا چاہیے کہ وہ ان کے لیے کام کریں، اور ان کے معاشرے کی مشکلات کو حل کریں، بلکہ خود کمر ہمت کس کر کھڑے ہو جائیں اور سعی و کوشش کریں۔

ان آیات سے مسائل جزائی و قضاوت کی ایک حقوقی اصل کا بھی استفادہ ہوتا ہے، کہ سزائیں ہمیشہ واقعی اور اصلی گنہگاروں

اور مجرموں کو ہی دی جائیں گی، اور کوئی شخص کسی دوسرے کی سزا کو اپنے ذمہ نہیں لے سکتا۔

۲۔ آیت کے مفاد سے سوء استفادہ

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، یہ آیات گزشتہ اور بعد میں آنے والی آیات کے قرینہ سے، آخرت کے لیے انسان کی سعی و کوشش کو بیان کر رہی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ یہ چیز ایک مسلم عقلی حکم کی بنیاد پر ہے، لہٰذا اس کے نتیجہ کو عمومیت دی جاسکتی ہے، اور دنیا کی کوششوں کو بھی اس میں شامل سمجھا جاسکتا ہے، اور اسی طرح دنیوی اجر و صلہ اور سزاؤں کو بھی۔

لیکن یہ اس معنی میں نہیں ہے، جو سوشلسٹ مکتب کے زیر اثر بعض لوگ اسے سند کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں، کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے، کہ مالکیت صرف کام کے طریقہ سے حاصل ہوتی ہے، اور اس طرح وہ قانون میراث، مضاربہ اور اجارہ و کرایہ وغیرہ پر خط بطلان کھینچ دیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ اسلام کا دم بھرتے ہیں، اور قرآنی آیات سے استدلال بھی کرتے ہیں، حالانکہ مسئلہ میراث اسلام کے قطعی اصولوں میں سے ہے۔ اور اسی طرح زکوٰۃ و خمس ہیں، حالانکہ نہ تو وارث نے ہی اپنے مورث کے مال کے لیے کوئی سعی و کوشش کی ہے، اور نہ ہی خمس و زکوٰۃ کے مستحقین نے، اور نہ ہی وصیتوں اور نذر وغیرہ کے موارد میں، حالانکہ یہ تمام امور قرآن مجید میں آئے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ ایک اصل ہے، لیکن عام طور پر ہر اصل کے مقابلہ میں ایک استثناء ہوتا ہے، مثلاً "بیٹے" کا "باپ" سے میراث لینا ایک اصل ہے۔ لیکن اگر بیٹا باپ کا قاتل ہو یا اسلام سے خارج ہو جائے تو اُسے میراث نہیں ملے گی۔

اسی طرح ہر شخص کی کوشش کے نتیجہ کا اس تک پہنچنا ایک اصل ہے۔ لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اجارہ کی قرار داد کے مطابق جو ایک قرآنی اصول ہے۔[1] اسے اس چیز کے مقابلہ میں، جس پر طرفین رضامند ہیں، واگزار کر دے، یا وصیت و نذر کے طریق سے کہ یہ دونوں بھی قرآن میں ہیں دوسرے کو منتقل کر دے۔

۳۔ چند سوالات کا جواب

یہاں چند سوال سامنے آتے ہیں جن کا جواب دینا ضروری ہے:

پہلا یہ کہ اگر ہر انسان کا حصہ قیامت میں صرف اس کی سعی و کوشش کا ماحصل ہے۔ تو پھر "شفاعت" کیا معنی رکھتی ہے؟

دوسرا یہ کہ سورۂ طور کی آیت ۲۱ میں اہلِ بہشت کے بارے میں آیا ہے: الحقنا بھم ذریتھم: ہم ان کی اولاد کو بھی ان کے ساتھ ملحق کر دیں گے، حالانکہ "ذریۃ" نے تو اس راہ میں کوئی کوشش نہیں کی۔

اس کے علاوہ اسلامی روایات میں آیا ہے کہ جس وقت کوئی شخص اعمال خیر انجام دے تو اس کا نتیجہ اس کی اولاد کو پہنچے گا۔

---

[1] یہ اصل موسیٰ اور شعیب کی داستان میں سورہ قصص آیہ ۲۷ میں آئی ہے۔

ان سب سوالات کا جواب صرف ایک جملہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ: قرآن یہ کہتا ہے کہ انسان اپنی سعی و کوشش سے زیادہ کا حق نہیں رکھتا، لیکن یہ چیز اس بات میں مانع نہیں ہوگی کہ پروردگار کے لطف اور فضل کے طریق سے لائق افراد کو نعمتیں دی جائیں۔

"استحقاق" ایک مفہوم ہے اور "تفضل" ایک الگ مفہوم ہے جیسا کہ وہ نیکیوں کی دس گنا، کبھی سو گنا، یا ہزاروں گنا جزا دیتا ہے۔

اس کے علاوہ "شفاعت" — جیسا کہ ہم اس کے اپنے مقام پر بیان کر چکے ہیں۔ بے حساب نہیں ہوگی، بلکہ وہ بھی ایک قسم کی سعی و کوشش اور شفاعت کرنے والے کے ساتھ معنوی رابطہ پیدا کرنے کی محتاج ہے۔ اسی طرح اہلِ جنّت کی اولاد کے ان سے ملحق ہونے کے بارے میں بھی قرآن اسی آیت میں کہتا ہے:: واتبعتھم ذریتھم بایمان: "یہ اس صورت میں ہے جب کہ ان کی اولاد ایمان میں ان کی پیروی کرے۔

۴۔ صحف ابراہیم و موسیٰ

"صحف" جمع ہے "صحیفہ" کی جو اصل میں ہر وسیع چیز کے معنی میں ہے، اس لیے صورت کو "صحیفۃ الوجہ" کہتے ہیں اس کے بعد کتاب کے صفحات پر بھی اطلاق ہوا ہے۔

"صحف موسیٰ" سے مراد اوپر والی آیت میں وہی تورات ہے، اور "صحف ابراہیم" بھی ان کی آسمانی کتاب کی طرف اشارہ ہے۔

مرحوم طبرسی نے "مجمع البیان" میں سورۂ اعلیٰ کی تفسیر میں ایک حدیث پیغمبر گرامی اسلامؐ سے نقل کی ہے، جس کا خلاصہ اس طرح ہے:

ابوذر سوال کرتے ہیں: خدا کے پیغمبر کتنے ہوئے ہیں؟

آپ نے فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار

پھر سوال کیا: ان میں سے رسول کتنے ہیں؟

آپ نے فرمایا: تین سو تیرہ ہیں اور باقی نبی ہیں (رسول وہ ہوتا ہے جو ابلاغ و انذار پر مامور ہو جب کہ نبی کا مفہوم عام ہے)

پھر سوال کیا: کیا آدم پیغمبر تھے؟

آپ نے فرمایا: ہاں! خدا نے ان سے کلام کیا اور انہیں اپنے دست قدرت سے پیدا کیا۔

پھر پوچھا: خدا نے کتنی کتابیں نازل کیں؟

آپ نے فرمایا: ایک سو چار کتابیں: دس صحیفے آدم پر، پچاس صحیفے شیث پر، تیس صحیفے ادریس پر، دس صحیفے ابراہیم پر (جو مجموعی طور پر ایک سو صحیفے بنتے ہیں) اور تورات و انجیل و زبور و قرآن"[1]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۷۶ اس حدیث کو "روح البیان" نے بھی جلد ۹ ص ۲۴۶ پر نقل کیا ہے۔

۵۔ گزشتہ کتب میں اعمال کے مقابلہ میں اصل مسؤلیت

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ موجودہ تورات میں کتاب "حزقیل" میں بھی زیر بحث آیت کا کچھ مضمون آیا ہے، کیونکہ وہ اس طرح ہے :

" وہی جان جو گناہ کرے گی وہی مرے گی، بیٹا باپ کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، اور باپ بیٹے کے گناہ کا بار نہیں اٹھائے گا" [۱]

یہی مفہوم خصوصیت کے ساتھ قتل کے بارے میں "تورات" کے سفر تثنیہ میں بھی آیا ہے : " باپ اولاد کے بدلے میں قتل نہیں کئے جائیں گے، اور اولاد بھی باپوں کے بدلے میں قتل نہیں کی جائیں گی ، ہر شخص اپنے گناہ کے سبب ہلاک ہوگا" [۲]

البتہ گزشتہ انبیاء کی کتابیں مکمل طور پر اس وقت ہمارے پاس نہیں ہیں، ورنہ اس اصل کے بارے میں بہت سی باتیں ہیں مل جاتیں۔

---

[۱] کتاب "حزقیل" فصل ۱۸ ص ۲۰

[۲] "تورات" "سفر تثنیہ" باب ۲۴ شمارہ ۱۶ ۔

۴۲- وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ۙ
۴۳- وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ۙ
۴۴- وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ۙ
۴۵- وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۙ
۴۶- مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ۪
۴۷- وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ۙ
۴۸- وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ۙ
۴۹- وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ۙ

ترجمہ

۴۲- (اور کیا گزشتہ انبیاء کی کتابوں سے اسے پتہ نہیں چلا) کہ تمام امور تیرے پروردگار کی طرف لوٹتے ہیں۔

۴۳- اور وہی ہے جو ہنساتا بھی ہے اور رلاتا بھی۔

۴۴- اور وہی ہے جو مارتا ہے اور زندہ کرتا ہے۔

۴۵- اور وہی ہے جو دو دو جوڑے مذکر اور مؤنث کے پیدا کرتا ہے۔

۴۶- اس نطفہ سے جو نکلتا ہے (اور رحم میں گرتا ہے)۔

۴۷- اور یہ کہ خدا ہی پر ہے دوسرے عالم کا ایجاد کرنا (تاکہ عدالت کا اجراء ہو)۔

۴۸۔ اور یہ کہ وہی ہے جو بے نیاز کرتا ہے، اور باقی رہنے والا سرمایہ عطا کرتا ہے۔

۴۹۔ اور یہ کہ وہی ہے "ستارۂ شعریٰ" کا پروردگار۔

تفسیر

تمام خطوط اسی تک پہنچتے ہیں

یہ آیات خدا کی ان صفات کی تجلی گاہ ہیں جو مسئلہ توحید کو بھی واضح کرتی ہیں اور مسئلہ معاد کو بھی۔

ان آیات میں گزشتہ مباحث کو جاری رکھتے ہوئے جزائے اعمال کے سلسلہ میں فرماتا ہے: "کیا انسان کو اس بات کی خبر نہیں ہے کہ صحف موسیٰ و ابراہیم میں یہ آیا ہے کہ تمام امور تیرے پروردگار پر منتہی ہوتے ہیں" (و ان الی ربك المنتهٰی)۔

نہ صرف حساب و کتاب، ثواب و عقاب اور جزا و سزا آخرت میں اس کے دست قدرت میں ہے، بلکہ اس جہان میں بھی اسباب و علل کا سلسلہ اس کی پاک ذات تک جا کر منتہی ہوتا ہے، اس جہان کی تمام تدبیریں اس کی تدبیر سے پیدا ہوتی ہیں اور بالآخر عالم ہستی کی تکیہ گاہ اور اس کی ابتدا و انتہا خدا ہی کی پاک ذات ہے۔

بعض روایات میں اس آیت کی تفسیر میں امام صادقؑ سے اس طرح آیا ہے:

اذا انتھی الکلام الی الله فامسکوا[1]

"جس وقت گفتگو خدا کی ذات تک پہنچ جائے تو چپ ہو جاؤ۔"

یعنی اس کی ذات کے بارے میں گفتگو نہ کرو، کیونکہ عقلیں اس میں حیران ہیں۔ اور کہیں پہنچ نہیں پاتیں، اور ایک غیر محدود ذات کے بارے میں سوچ بچار کرنا محدود عقلوں کے لیے ناممکن ہے۔ کیونکہ جو کچھ تمہاری فکر میں آئے گا وہ بھی محدود ہی ہوگا، اور خدا کے لیے محال ہے کہ وہ محدود ہو جائے۔

البتہ یہ تفسیر اس آیت کے لیے ایک دوسرا بیان ہے جو اس بات سے جو ہم نے بیان کی ہے اختلاف نہیں رکھتی، اور دونوں آیت کے معنی جمع ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد امر ربوبیت میں اس کی حاکمیت، اور اس جہان کے تمام امور کے اس کی ذات پاک تک منتہی ہونے کو واضح کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: وہی ہے کہ جو ہنساتا بھی ہے اور رلاتا بھی" (وانه هو اضحك و ابكٰی)[2]

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۷۰۔

[2] یہ افعال اگرچہ ماضی کی صورت میں ہیں لیکن مستقبل کا معنی دیتے ہیں۔

"اور وہی ہے جو مارتا بھی ہے اور زندہ بھی کرتا ہے" (وانه هو امات واحیا)۔

"اور وہی ہے جو دو دو جوڑے مذکر اور مونث کے پیدا کرتا ہے" (وانه خلق الزوجین الذکر والانثٰی)۔

"اس نطفہ سے جو خارج ہوتا ہے اور قرار گاہ رحم میں گرتا ہے" (من نطفة اذا تمنٰی)۔

یہ چند آیات، تمام امور کے پروردگار کی ربوبیت اور تدبیر کی طرف منتہی ہونے والے مسئلہ کے لیے، حقیقتاً ایک جامع بیان اور عمدہ وضاحت ہیں، کیونکہ کہتا ہے: تمھاری موت اور زندگی اسی کے ہاتھ میں ہے، زوجین کی خلقت کے طریقہ سے نسل کا جاری رہنا بھی اسی کی تدبیر سے ہے، اسی طرح وہ تمام حوادث جو انسان کی زندگی میں پیش آتے ہیں، اس کی طرف سے ہیں۔ وہی رلاتا اور ہنساتا ہے، وہی مارتا اور زندہ کرتا ہے۔ اور اس طرح سے سررشتہ زندگی آغاز سے لے کر انجام تک اس کی پاک ذات پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں اس آیت کے ہنسنے اور رونے کے مفہوم کو وسعت دی گئی ہے، اور اس کی تفسیر میں اس طرح بیان ہوا ہے:

ابکی السماء بالمطر، واضحك الارض بالنبات

"خدا آسمان کو بارش کے ساتھ رلاتا ہے اور زمین کو نباتات کے ساتھ ہنساتا ہے"[1]

بعض شعراء نے اس مضمون کو اپنے شعر میں بیان کیا ہے،

ان فصل الربیع فصل جمیل
تضحك الارض من بكاء السماء

"فصل بہار ایک خوبصورت فصل ہے" "کیونکہ زمین آسمان کے رونے سے ہنسنے لگتی ہے"

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ انسان کے تمام افعال میں سے ہنسنے اور رونے کے مسئلہ پر تکیہ ہوا ہے، کیونکہ یہ دونوں اوصاف انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، اور دوسرے جانداروں میں اصلاً اس کا وجود نہیں ہے۔ یا بہت ہی شاذونادر ہے۔

انسانی جسم میں ہنسنے یا رونے کے وقت جو فعل وانفعال اور دگرگونی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور ان کا روحانی تغیرات کے ساتھ ارتباط بہت ہی پیچیدہ اور تعجب خیز ہے۔ اور مجموعی طور سے یہ حق تعالیٰ کی مدبریت کی ایک واضح نشانی ہو سکتی ہے، یہ بات اس مناسبت کے علاوہ ہے جو یہ دونوں افعال (ہنسنا اور رونا) موت وحیات کے مسئلہ کے ساتھ رکھتے ہیں۔

بہر حال خدا کی تدبیر اور ربوبیت پر تمام امور کی انتہا، انسان کے اختیار اور آزادیِ ارادہ کے ساتھ کسی قسم کا اختلاف نہیں رکھتی، کیونکہ اختیار و آزادی بھی اسی کی طرف سے ہے اور اس تک ہی منتہی ہوتی ہے۔

ان امور کے ذکر کے بعد، جو پروردگار کی ربوبیت اور تدبیر سے مربوط ہیں، امر معاد و قیامت کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے، "کیا انسان کو یہ خبر نہیں ہے کہ گزشتہ کتب میں یہ آیا ہے کہ دوسرے عالم کو ایجاد کرنا خدا پر لازم ہے" (وان علیه

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۷۲۔

النشأۃ الاخریٰ)۔

" نشأۃ " آفرینش اور کسی چیز کی تربیت کے معنی میں ہے ، " نشاۃ اخریٰ " قیامت کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے ،

" علیہ " (خدا پر لازم ہے) کی تعبیر اس لحاظ سے ہے کہ جب خدائے حکیم نے انسانوں کو پیدا کیا ، اور ان کے کندھے پر کچھ ذمہ داریاں ڈال دیں ، اور سب کو آزادی دے دی ، اس عرصہ میں مطیع وغیر مطیع اور ظالم و مظلوم افراد وجود میں آئے ، اور کوئی بھی اس جہان میں اپنی اصلی پاداش اور سزا کو نہیں پہنچا ، لہٰذا اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ ایک " نشاۃ ثانیہ " ہو تاکہ عدالت کی جا سکے ۔

علاوہ ازیں ایک حکیم ذات اس وسیع و عریض جہان کو ، ان تمام ناملائم اور نامناسب امور کے ساتھ ، چند روزہ زندگی کے لیے خلق نہیں کرسکتا ، لہٰذا حتمی اور یقینی طور سے یہ ایک وسیع زندگی کے لیے — جو اس وسیع پروگرام کی قیمت ہے — ایک مقدمہ ہوگی ، یا دوسرے لفظوں میں اگر دوسری زندگی نہ ہو تو اس جہان کی خلقت اپنے اصلی ہدف اور مقصد تک نہیں پہنچ سکتی ۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ خدا نے یہ وعدہ اپنے بندوں کو ایک حتمی وعدہ کے عنوان سے دیا ہے ۔ اور اس کے کلام کی صداقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے وعدے پورے ہوں ۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے : " اور وہی تو ہے جو بندوں کو بے نیاز بھی کرتا ہے اور باقی رہنے والے سرمائے ان کے اختیار میں دیتا ہے " (وانہ ھو اغنٰی واقنٰی) ۔

خدا نے نہ صرف مادی پہلوؤں میں انسان کی ضروریات اور حاجتوں کو اپنے لطف و کرم سے برطرف کیا ہے ، بلکہ ہمیشہ رہنے والے سرمائے بھی اسے عطا کئے ہیں ، کیونکہ معنوی زندگی میں بھی انسانوں کی احتیاجات —— تعلیم و تربیت اور تکامل و ارتقاء کے سلسلہ میں —— انبیاء و رسل کے بھیجنے اور آسمانی کتب کے نازل کرنے اور معنوی مواہب و نعمات عطا کرنے کے ذریعہ برطرف کی ہیں ۔

" اغنٰی " " غنی " کے مادہ سے بے نیازی کے معنی میں ہے ، اور " اقنٰی " " قنیہ " کے مادہ سے (جزیہ کے وزن پر) ان سرمایوں اور اموال کے معنی میں ہے جنہیں انسان ذخیرہ کرتا ہے ، [1]

اس بناء پر " اغنی " تو موجودہ حاجات و ضروریات کو پورا کرتا ہے ، اور " اقنی " ذخیرہ نعمتوں کی عطائیگی ہے ، جو مادی امور میں تو باغ و املاک وغیرہ کے مانند ہے اور معنوی امور میں خدا کی رضا و خوشنودی جیسی باتیں ہیں ، جو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا عظیم ترین سرمایہ شمار ہوتا ہے ۔

یہاں ایک اور تفسیر بھی ہے جو " اغنی " کو " اقنی " کے مدِ مقابل قرار دیتی ہے ، یعنی غنی و فقیر اسی کے دستِ قدرت میں ہیں ، اس کی نظیر سورۂ رعد کی آیت ۲۶ میں آئی ہے : اللّٰہ یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر : خدا جس

---

[1] مفردات " راغب " مادہ " قنی " ۔

کے لیے چاہتا ہے روزی کو وسیع کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے محدود و تنگ کر دیتا ہے۔
لیکن یہ تفسیر اس چیز کے ساتھ جو منابع لغت میں آئی ہے سازگار نہیں ہے اور اوپر والی آیت اس معنی کی شاہد نہیں بن سکتی۔

آخر میں آخری زیر بحث آیت میں فرماتا ہے: "کیا انسان یہ نہیں جانتا کہ گزشتہ کتب میں یہ آچکا ہے کہ ستارۂ شعریٰ کا پروردگار وہی ہے"؟ (وانہ ھو رب الشعریٰ)۔

"ستارۂ شعری" کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ــــ اس کے علاوہ، کہ یہ ستارہ آسمان کے ستاروں میں سب سے زیادہ چمکنے والا ہے۔ جو عام طور پر سحر کے وقت صورت فلکی "جوزا" کے پاس آسمان میں ظاہر ہوتا ہے، توجہ کو مکمل طور سے اپنی طرف کھینچتا ہے ــــ اس سبب سے ہے کہ مشرکین عرب کا ایک گروہ اس کی پرستش کرتا تھا، قرآن کہتا ہے: تم شعری کی پرستش کیوں کرتے ہو؟ اس کے پیدا کرنے والے پروردگار کی پرستش کرو۔

ضمنی طور پر توجہ رکھنی چاہیئے کہ آسمان میں دو ستارے ہیں جو شعری کے نام سے موسوم ہیں، جن میں سے ایک تو "جنوب" کی سمت میں ظاہر ہوتا ہے، اور اسی بنا پر اس کو "شعرای یمانی" کہتے ہیں (کیونکہ یمن جزیرہ عربستان کے جنوب میں ہے) اور دوسرا "شعرای شامی" جو شمال کی طرف نکلتا ہے، لیکن مشہور وہی "شعرای یمانی" ہے
اس ستارہ کی عمدہ خصوصیات کے بارے میں دوسرے مباحث بھی ہیں جو نکات کی بحث میں آئیں گے۔

چند نکات

۱۔ یہ سب سرو صدا اسی کی طرف سے ہے

ان آیات کے مباحث حقیقت میں اس معنی کی طرف ایک اشارہ ہیں کہ اس عالم میں ہر قسم کی تدبیر اسی کی پاک ذات کی طرف لوٹتی ہے۔ موت و حیات کے مسئلہ سے لے کر، بے مقدار نطفہ سے انسان کی پیچیدہ خلقت تک اور اسی طرح سے وہ گوناں گوں حادثات جو انسان کی زندگی میں پیش آتے ہیں، جو اُسے کسی نہ کسی طرح سے رلاتے ہے یا ہنساتے ہیں، یہ سب کچھ اسی کی طرف سے ہیں۔

آسمان میں درخشندہ ترین ستارے اسی کے فرمان اور اسی کی ربوبیت کے ماتحت ہیں، اور زمین میں انسانوں کی غنا اور بے نیازی بھی اسی کی پاک ذات کی طرف لوٹتی ہے، اور طبعاً "نشأۃ آخرت" بھی اسی کے فرمان سے ہے، کیونکہ وہ بھی اس جہان کی زندگی کو جاری رکھنے کے سلسلہ میں ایک جدید زندگی ہے۔

یہ بیان ایک طرف توخطِ توحید کو واضح کرتا ہے اور دوسری طرف سے خطِ معاد و قیامت کو، کیونکہ رحم کے اندر ایک بے مقدار نطفہ سے انسان کو خلق کرنے والا، اس کو نئے سرے سے زندگی عطا کرنے پر بھی قادر ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ سب چیزیں خدا کی، "توحید افعالی" اور "توحید ربوبیت" کو بیان کرتی ہیں، ہاں! یہ سب سرو صدا اور آوازے اسی کی طرف سے ہیں۔

۲۔ ستارۂ شعریٰ کے عجائبات

یہ ستارہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے آسمان کے ستاروں میں سب سے زیادہ چمکنے والا ستارہ ہے۔ اور "شعرای یمانی" کے نام سے مشہور ہے۔ چونکہ یہ جنوب کی سمت ظاہر ہوتا ہے۔ اور یمن جزیرۂ عرب کے جنوب میں واقع ہے لہٰذا انہوں نے اس کو یہ نام دیا ہے۔

عربوں کا ایک گروہ جیسے قبیلہ "خزاعہ" اس کو مقدس جانتا تھا اور اس کی پرستش کیا کرتا تھا، اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ روئے زمین کے سارے موجودات کا مبدء ہے، اس مسئلہ پر قرآن کی تاکید کہ خدا شعریٰ کا پروردگار ہے اس گروہ اور ان جیسے لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے ہے، کہ انہوں نے مخلوق پر خالق ہونے کا اشتباہ کیا اور مربوب کو رب کی جگہ قرار دے لیا ہے۔

یہ عجیب الخلقت ستارہ جو اپنی حد سے زیادہ درخشندگی کی وجہ سے ستاروں کا بادشاہ کہلاتا تھا، بہت سی عجائبات کا حامل ہے۔ جن میں سے بعض کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جاتا ہے۔ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس زمانہ میں ستارۂ شعریٰ کے بارے میں یہ حقائق دریافت نہیں ہوئے تھے، قرآن کا اس موضوع کو سامنے لانا پُرمعنی ہے۔

الف۔ ان تحقیقات کے مطابق، جو دنیا کے مشہور رصدگاہوں میں عمل میں آئی ہیں، وہ عظیم حرارت جو شعریٰ کی سطح پر پائی جاتی ہے، ۱۲۰ ہزار درجہ سینٹی گراڈ تک معلوم کی گئی ہے۔

جب کہ ہمارے سورج کے کرّہ کی سطح کی حرارت کو صرف ۶۵۰۰ درجہ سمجھتے ہیں۔ اور یہ چیز ستارۂ شعریٰ کی، سورج کی نسبت عظیم گرمی کے فرق کا پتہ دیتی ہے۔

ب۔ اس ستارہ کا مخصوص جرم پانی سے تقریباً ۵۰ ہزار گنا زیادہ وزنی ہے۔ یعنی وہاں کے ایک لیٹر پانی کا وزن کرۂ زمین کے ۵۰ ٹن کے برابر ہوگا۔ حالانکہ ہمارے نظامِ شمسی کے سیاروں میں سے، جو سب سے زیادہ وزنی ہے، اس کا مخصوص وزن پانی کے وزن سے ۶ گنا سے زیادہ نہیں ہے۔

اس تعریف کے باوجود دیکھنا چاہیے کہ یہ عجیب وغریب ستارہ کس عنصر سے بنا ہے جو اس قدر وزنی ہے؟

ج۔ ستارۂ شعریٰ جو ہمارے زمانہ میں سردیوں میں ظاہر ہوتا ہے، لیکن مصر کے قدیم منجمین کے زمانہ میں اس ستارہ کا ظہور گرمیوں کے آغاز کے قریب ہوا کرتا تھا، یہ ایک بہت ہی عظیم کرّہ ہے جس کا حجم کرۂ آفتاب سے ۲۰ گنا ہے، اور اس کا ہم سے فاصلہ زمین سے سورج کے فاصلے کی نسبت انتہائی حد تک زیادہ ہے۔ اس طرح سے کہ اس فاصلہ کو سورج کے فاصلہ سے دس لاکھ گنا حساب کیا گیا۔

ہم جانتے ہیں کہ نور اور روشنی کی رفتار ایک سیکنڈ میں ۳۰۰ ہزار کلومیٹر ہے، اور سورج کی روشنی ۸ منٹ اور ۱۳ سیکنڈ میں ہم تک پہنچتی ہے جب کہ اس کا چاند سے فاصلہ ۱۵ ملین کلومیٹر ہے۔ لیکن اگر آپ تعجب نہ کریں تو کرۂ شعریٰ کی پہلی شعاع ہم تک تقریباً دس (۱۰) سال بعد پہنچتی ہے، تو اب آپ خود حساب کرلیں کہ اس کا فاصلہ کتنا ہے۔

د۔ شعرای یمانی کے ساتھ ایک اور ستارہ ہے، جو آسمان کے مرموز و پراسرار ستاروں میں سے ہے، سب سے

پہلے "بسل" نامی ماہر دانش مند نے اسے دریافت کیا، اور یہ ۱۸۴۴ عیسوی کی بات ہے، لیکن ۱۸۶۲ میں دوربین کے ذریعہ معلوم ہوا کہ اس ستارہ کی گردش کا دور اصلی ستارے کے گرد ۵۰ سال ہے۔[1]

یہ سب چیزیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ قرآن کی تعبیریں کس حد تک پُر معنی ہیں۔ اور اس کی چھوٹی سی چھوٹی باتوں میں کیسے کیسے حقائق چھپے ہوئے ہیں۔ جو اگر اس کے نزول کے دن پورے طور پر مشخص نہیں تھے تو زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ واضح ہو گئے ہیں۔

۲۔ پیغمبرؐ کی ایک پُر معنی حدیث

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ ایک گروہ کے قریب سے گزرے جو ہنسنے میں مشغول تھا۔ آپؐ نے فرمایا:

لو تعلمون ما اعلم لبکیتم کثیرًا و لضحکتم قلیلًا

"اگر تم اس چیز کو جانتے جسے میں جانتا ہوں تو تم روتے زیادہ اور ہنستے کم۔"

جس وقت پیغمبرؐ وہاں سے گذر گئے تو جبرئیل ان پر نازل ہوئے اور عرض کیا۔

ان اللّٰہ ھو اضحک و ابکٰی

"ہنسنا اور رونا دونوں خدا ہی کی طرف سے ہیں۔"

پیغمبرؐ ان کے پاس پلٹ آئے اور فرمایا کہ میں چالیس قدم نہیں چلا تھا کہ جبرئیل میرے پاس آئے اور کہا: تم ان کے پاس لوٹ کر جاؤ اور ان سے یہ کہو: ان اللّٰہ اضحک و ابکٰی[2]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک صاحب ایمان شخص ہمیشہ روتا ہی رہے۔ خوفِ خدا سے اور گناہوں کے ڈر سے رونا بھی اپنی جگہ ضروری ہے اور نشاط اور خوشی کے وقت ہنسنا بھی۔ کیونکہ یہ سب کچھ خدا ہی کی طرف سے ہے۔

بہر حال یہ تعبیرات انسان کے اصل اختیار اور آزادی ارادہ کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتیں، کیونکہ اس بیان کا مقصد علت العلل اور ان غرائز و احساسات کے خالق کا بیان ہے۔

اور اگر دوسری جگہ (سورۂ توبہ کی آیت ۸۲ میں) یہ فرمایا ہے کہ: فلیضحکوا قلیلًا و لیبکوا کثیرًا جزاءً بما کانوا یکسبون: انہیں چاہیے کہ تھوڑا ہنسیں اور زیادہ روئیں ان کاموں کی سزا کی بنا پر جو وہ انجام دیا کرتے تھے"، تو یہ منافقین کے ساتھ مربوط ہے، جیسا کہ اس کے قبل اور بعد کی آیات گواہی دے رہی ہیں۔

---

[1] دائرۃ المعارف الاسلامیہ" مادہ شعری اور " فرہنگ نامہ" مادہ ستارہ اور " دائرۃ المعارف فارسی مصاحب" مادۂ شعری۔

[2] تفسیر در المنثور، جلد ۶ صفحہ ۱۳۰۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ سورہ کی ابتداء میں تو ستارہ کی قسم کھا رہا ہے اس وقت کہ جب وہ غروب کرتا ہے ، و النجم اذا ھوٰی اور یہاں شعری کے پروردگار کی قسم ہے جس وقت ہم ان دونوں آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھ کر دیکھتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ شعری کیوں معبود نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ بھی افول وغروب رکھتا ہے اور قوانین خلقت کے پنجہ میں اسیر ہے۔

۵۰۔ وَاَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَا ࣙالْاُوْلٰى ۝

۵۱۔ وَثَمُوْدَاۡ فَمَآ اَبْقٰى ۝

۵۲۔ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ۝

۵۳۔ وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ۝

۵۴۔ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ۝

۵۵۔ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ۝

ترجمہ

۵۰۔ (اور کیا انسان کو یہ پتہ نہیں چلا کہ گزشتہ انبیاء کی کتب میں آیا ہے) کہ خدا نے "پہلی قوم عاد کو ہلاک کر دیا؟

۵۱۔ اور اسی طرح "قوم ثمود" کو اور ان میں سے کسی کو باقی نہیں چھوڑا۔

۵۲۔ اور ان سے پہلے قوم نوح کو بھی، کیونکہ وہ سب سے زیادہ ظالم اور سب سے زیادہ طوفان اٹھانے والے تھے۔

۵۳۔ اور (قوم لوط) کے زیر و زبر شدہ شہروں کو زمین پردے مارا۔

۵۴۔ اس کے بعد انہیں سنگین عذاب کے ساتھ ڈھانپ لیا۔

۵۵۔ (کہہ دے) تو اپنے پروردگار کی کونسی نعمت میں شک رکھتا ہے۔

تفسیر

کیا یہ سب درسِ عبرت کافی نہیں ہیں؟

یہ آیات اسی طرح انہیں مطالب کو جاری رکھے ہوئے ہیں، جو گزشتہ کتب صحف ابراہیم و موسٰی سے نقل ہوئی ہیں، گزشتہ آیات میں دس مطالب دو حصوں میں بیان کیے گئے ہیں، پہلا حصہ ہر شخص کے اپنے اعمال کے لیے مسئولیت اور ذمہ داری کے بارے میں ہے، اور دوسرا حصہ تمام خطوط کے پروردگار تک منتھی ہونے کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ اور زیر بحث آیات میں، جو صرف ایک ہی مطلب کو بیان کررہی ہے وہ گزشتہ چار اقوام میں سے چار قوموں کے عذاب اور دردناک ہلاکت کی بات کرتی ہے، وہ ان لوگوں کے لیے ایک تنبیہ ہے جو گذشتہ احکام سے روگردانی کرتے ہیں اور مبدء و معاد پر ایمان نہیں رکھتے[1]

پہلے فرماتا ہے، "کیا انسان کو اس بات کی خبر نہیں ہے کہ گزشتہ کتب میں یہ آیا ہے، کہ خدا نے پہلی قوم عاد کو ہلاک کردیا؟" (وانہ اھلک عادا الاولٰی)۔

قوم "عاد" کی توصیف "الاولٰی" (پہلی) کے ساتھ یا تو اس قوم کی قدامت کی بنا پر ہے۔ جیسا کہ عربوں کے درمیان معمول ہے کہ ہر قدیم چیز کو "عادی" کہتے ہیں۔ اور یا اس بنا پر ہے کہ تاریخ میں "عاد" نامی دو قومیں ہوئی ہیں، اور مشہور قوم جن کے پیغمبر "ہود" تھے وہی پہلی عاد ہے[2]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اسی طرح خدا نے قوم ثمود کو ان کی سرکشی کی بنا پر ہلاک کیا اور ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا" (وثمود فما ابقٰی)۔

اس کے بعد قوم نوح کے بارے میں فرماتا ہے: اور ان سے پہلے قوم نوح کو بھی ہم نے ہلاک کیا" (وقوم نوح من قبل)۔

"کیونکہ وہ سب سے زیادہ ظالم، اور سب سے زیادہ سرکشی کرنے والے تھے" (انھم کانوا ھم اظلم واطغٰی)۔

کیونکہ ان کے پیغمبر نوح نے تمام انبیاء کی نسبت، بہت طویل مدت تک انہیں تبلیغ کی تھی، لیکن اس کے باوجود تھوڑی سی تعداد کے سوا ان کی دعوت کو کسی نے قبول نہ کیا، اور شرک و بت پرستی اور نوح کی تکذیب اور آزار پہنچانے میں حد سے زیادہ سختی کی، جیسا کہ اس کی تفصیل انشاء اللہ سورۂ نوح کی تفسیر میں آئے گی۔

---

[1] اس بات پر توجہ رکھیئے کہ یہ گیارہ مطالب سب کے سب "ان" کے ساتھ شروع ہوتے ہیں جن میں سے پہلا آیت ۳۸ "الّا تزر وازرۃ وزر اخرٰی" اور آخری" وانہ اھلک عادا الاولٰی" ہے۔

[2] "مجمع البیان" "روح المعانی" و "تفسیر فخر رازی"۔

قوم لوط چوتھی قوم ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "خدا نے قوم لوط کے زیر وزبر شدہ شہروں کو زمین پر دے مارا" (والمؤتفکۃ اھوٰی)۔

ظاہر میں ایک شدید زلزلہ نے ان آبادیوں کو آسمان کی طرف پھینک دیا اور پھر سرنگوں کر کے زمین پر پٹخ دیا۔ اور روایات کے مطابق جبرئیل نے انہیں خداداد قوت کے ساتھ زمین سے اکھاڑ کر اوندھے منہ زمین پر دے مارا۔

"اس کے بعد انہیں ایک سنگین عذاب کے ساتھ ڈھانپ لیا" (فغشّٰھا ما غشّٰی)۔ [1]

ہاں! آسمانی پتھروں کی ایک بارش ان پر برسی اور ان سارے ڈولتے ہوئے شہروں کو پتھروں کے ایک ڈھیر کے نیچے دفن کر دیا۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس آیت اور اس سے قبل کی آیات میں قوم لوط کے نام کی تصریح نہیں ہوئی، لیکن عام طور پر مفسرین نے یہاں بھی اور سورۂ توبہ کی آیت ۷۰ اور سورۂ حاقہ کی آیت ۹ میں بھی جہاں "مؤتفکات" کی تعبیر ہوئی ہے، یہی معنی سمجھے ہیں۔ اگرچہ بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ یہ تمام بلا دیدہ اور مصیبت زدہ درہم برہم شہروں کو اپنے اندر لے لیتی ہے، لیکن قرآن کی دوسری آیات اس چیز کی جو مشہور مفسرین سمجھے ہیں تائید کرتی ہیں۔

سورۂ ہود کی آیت ۸۲ میں آیا ہے: فلما جاء امرنا جعلنا عالیھا سافلھا و امطرنا علیھا حجارۃ من سجیل منضود: جس وقت ہمارا فرمان آپہنچا تو اس شہر و دیار کو زیر وزبر کر دیا، اور پتھروں اور پتھریلی مٹی کی — جو تہ بہ تہ جمی ہوئی تھی ان پر بارش کر دی۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں آیا ہے کہ "مؤتفکہ" (زیر وزبر شدہ شہر) بصرہ کا شہر ہے، کیونکہ ایک روایت میں آیا ہے کہ امیر المؤمنین علیؑ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

یا اھل البصرۃ ویا اھل المؤتفکۃ و یا جند المرأۃ و اتباع البھیمۃ:

"اے اہل بصرہ، اے زیر وزبر شدہ زمین کے رہنے والو! اے عورت کے لشکر، اے اونٹ کی پیروی کرنے والو! (جنگ جمل کی طرف اشارہ ہے جس کی کماندار بی بی عائشہ تھیں اور بصرہ کے لوگ ان کے اونٹ کے پیچھے چل پڑے تھے)" [2]

لیکن یہ بات معلوم ہے کہ امیر المؤمنین علیؑ کے کلام میں یہ تعبیر ایک قسم کی تطبیق کے عنوان سے ہے نہ کہ تفسیر کے طور پر، شاید اس زمانے میں اس شہر کے لوگ اخلاق یا خدائی عذاب کے لحاظ سے قوم لوط کے ساتھ مشابہت رکھتے تھے۔

---

[1] "ماغشّٰی" میں "ما" ممکن ہے مفعول ہو یا فاعل جیسے والسماء و ما بناھا لیکن پہلا احتمال آیت کے ظاہر کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے پہلی صورت میں اس جملہ کا معنی وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا اور دوسری صورت میں معنی اس طرح ہے "وہ خدا جس نے عذاب کا پردہ ان پر بھیجا جس نے انہیں ڈھانپ لیا بہر حال یہ تعبیر کسی چیز کی عظمت و شدت کے بیان کے سلسلہ میں ذکر ہوتی ہے۔

[2] "تفسیر صافی" زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

اس بحث کے آخر میں ان نعمتوں کے بارے میں جو گزشتہ آیات میں بیان ہوئی تھیں اشارہ کرتے ہوئے ایک استفہام انکاری کی صورت میں فرماتا ہے: "تجھے اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کونسی نعمت میں شک ہے" (فبای الاء ربك تتماری)۔

کیا نعمت حیات میں، یا اصل نعمت خلقت میں، یا اس نعمت میں کہ خدا کسی کو دوسرے کے جرم کی سزا نہیں دیتا، خلاصہ یہ کہ جو کچھ گزشتہ صحیفوں میں آیا ہے، اور قرآن میں بھی اس پر تاکید ہوئی ہے ان میں سے کسی میں تجھے شک ہے؟

کیا تم اس نعمت میں، کہ خدا نے تمھیں گزشتہ اقوام کے عذابوں سے بچائے رکھا ہے، اور اپنی عفو و درگذر اور رحمت کو تمھارے شامل حال کیا ہے، شک کرتے ہو؟

یا نزول قرآن کی نعمت اور رسالت و ایمان اور ہدایت کے مسئلہ میں تمھیں شک ہے؟

یہ ٹھیک ہے کہ اس آیت میں مخاطب پیغمبرؐ کی ذات ہے لیکن اس کا مفہوم سب کو شامل ہے، بلکہ ہدف اصلی زیادہ تر دوسرے افراد ہی ہیں۔

"تتماری" "تماری" کے مادہ سے (محاجہ جو شک و تردید سے توأم ہو) کے معنی میں ہے [1]

"الاء" جمع "أُلا" یا إلی (بروزن فعل) نعمت کے معنی میں ہے۔ اگرچہ بعض ایسے مطالب، جو گذشتہ آیات میں آئے ہیں — جیسے کہ دوسری قوموں کے عذاب اور ہلاکت — نعمت کے مصداق نہیں ہیں، لیکن اس لحاظ سے کہ خدا نے مسلمانوں کو، بلکہ پیغمبرؐ کے زمانے کے کفار تک کو بھی، ان امور سے محفوظ رکھا ہے، ایک عظیم نعمت ہوگی۔

---

[1] اگرچہ باب "تفاعل" عام طور پر ایسے موقعوں میں استعمال ہوتا ہے، جب کوئی فعل دو افراد سے ایک دوسرے کے مقابلہ میں صادر ہو لیکن یہاں صرف ایک ہی شخص کے فعل کی صورت میں ذکر ہوا ہے جو یا تو تاکید کی بنا پر ہے یا نعمتوں کے موارد کے تعدد کی بنا پر (غور کیجئے۔)

۵۶۔ هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ○
۵۷۔ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ○ۚ
۵۸۔ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ○ؕ
۵۹۔ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ○ۙ
۶۰۔ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ○ۙ
۶۱۔ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ○
۶۲۔ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ○ع السجدة

ترجمہ

۵۶۔ یہ (پیغمبر) پہلے ڈرانے والوں میں سے ایک ڈرانے والا ہے۔
۵۷۔ جسے نزدیک ہونا چاہیے وہ نزدیک ہوگئی ہے، (اور قیامت آنے ہی والی ہے)
۵۸۔ اور خدا کے سوا کوئی شخص اس کے شدائد کو برطرف نہیں کرسکتا۔
۵۹۔ کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو ؟
۶۰۔ اور ہنستے ہو اور روتے نہیں ؟
۶۱۔ اور تم ہمیشہ غفلت اور ہوس رانی میں زندگی بسر کرتے ہو ؟
۶۲۔ اب جب کہ ایسا ہے تو تم سب اللہ کے لیے سجدہ کرو اور عبادت کرو۔

تفسیر

سب اس کے لیے سجدہ کرو

گزشتہ آیات کے بعد ـــ جو گزشتہ اقوام کی ستمگری اور طغیان کی وجہ سے ان کی ہلاکت کی بات کرتی تھی زیر بحث آیات اپنا روئے سخن مشرکین، کفار اور پیغمبرؐ کی دعوت کے منکرین کی طرف کرتے ہوئے کہتی ہیں: "یہ پیغمبر (یا یہ قرآن) گزشتہ ڈرانے والوں کی طرح ہی ایک ڈرانے والا ہے" (ھٰذا نذیر من النذر الاولیٰ)۔

یہ جو کہتا ہے کہ: پیغمبر (یا قرآن) پہلے انذار کرنے والوں اور ڈرانے والوں کی نوع میں سے ہے اس کا مفہوم یہ ہے، کہ محمدؐ کی رسالت، اور ان کی آسمانی کتاب قرآن کوئی نیا موضوع نہیں ہے، گزشتہ زمانہ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں پس یہ تمہارے لیے باعث تعجب کیوں ہے؟

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "ھٰذا" ان اخبار کی طرف اشارہ ہے جو گزشتہ آیات میں پہلی اقوام کی سرگزشت کے سلسلہ میں بیان ہوئی ہیں، کیونکہ یہ بھی اپنی نوبت پر ڈرانے والی ہیں، لیکن پہلے والی دونوں تفاسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہیں۔

اس غرض سے، کہ مشرکین اور کفار اس خطرے پر، جو انہیں درپیش ہے، زیادہ توجہ دیں، مزید کہتا ہے: "جسے نزدیک ہونا چاہیئے وہ نزدیک ہو گئی ہے" (ازفت الآزفۃ)۔

ہاں! قیامت نزدیک ہے، اپنے آپ کو سوال و حساب اور جزا کے لیے تیار کرو۔

"آزفۃ" کی تعبیر قیامت کے متعلق اس کے نزدیک ہونے اور وقت کی تنگی کی بنا پر ہے۔ کیونکہ یہ لفظ کلمہ "ازف" (بروزن نجف) سے۔ "تنگی وقت کے معنی میں" لیا گیا ہے۔ اور طبعاً نزدیک ہونے کے معنی کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

اس نام کے ساتھ قیامت کا نام، زیر بحث آیت کے علاوہ سورۂ مومن کی آیت ۱۸ میں بھی آیا ہے، اور یہ ایک گویا اور بیدار کرنے والی تعبیر ہے۔ یہی مفہوم ایک دوسری صورت میں سورۂ قمر کی آیت ۱ میں بھی بیان ہوا ہے، اقترب الساعۃ: "قیامت نزدیک ہو گئی ہے" بہر حال دنیا کی عمر کی کوتاہی کی طرف توجہ کرتے ہوئے قیامت کی نزدیکی قابل ادراک ہے۔ خصوصاً اس چیز کو دیکھتے ہوئے کہ جو شخص مرتا ہے اس کی تو قیامت صغریٰ برپا ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے، : اہم بات یہ ہے کہ "اس دن خدا کے علاوہ کوئی شخص ان کی فریاد کو نہیں پہنچ سکتا" اور نہ ہی اس کے شدائد کو برطرف کر سکتا ہے" (لیس لھا من دون اللہ کاشفۃ)[1]

---

[1] "لھا" کی ضمیر "آزفۃ" کی طرف لوٹتی ہے۔ اور "کاشفۃ" کا مؤنث ہونا اس بنا پر ہے کہ وہ صفت ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"کاشفة" یہاں شدائد کو برطرف کرنے والے کے معنی میں ہے۔
لیکن بعض نے کاشفة کو تاخیر قیامت کے عامل کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔ اور بعض نے "وقوع قیامت کی تاریخ کو کشف کرنے" کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن پہلا معنی سب سے زیادہ مناسب ہے۔
بہرحال حاکم و مالک اور صاحب قدرت اس دن بھی اور (ہمیشہ) خدا ہی ہے، اگر نجات چاہتے ہو تو اس کے لطف کے دامن کی طرف ہاتھ بڑھاؤ اور اگر آرام و سکون کے طالب ہو تو اس پر ایمان لے آؤ۔
بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو" (افمن هٰذا الحدیث تعجبون)۔
یہ جملہ ممکن ہے کہ قیامت اور قبروں سے زندہ ہو کر اٹھنے کی طرف اشارہ ہو، جو گذشتہ آیات میں آیا ہے، یا قرآن کی طرف اشارہ ہو۔ (کیونکہ دوسری آیات میں اس کی "حدیث" کے لفظ سے تعبیر ہوئی ہے [1]، یا وہ باتیں جو گذشتہ اقوام کی ہلاکت کے بارے میں کہی گئی ہیں۔ یا ان سب کی طرف۔
اس کے بعد مزید کہتا ہے، "اور تم ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو" (وتضحکون ولا تبکون)۔
"اور ہمیشہ غفلت، بے خبری، لہو و لعب اور گناہ آلود سرگرمیوں میں زندگی بسر کرتے ہو" (وانتم سامدون)۔
حالانکہ یہاں نہ تو ہنسنے کی جگہ ہے اور نہ ہی غفلت اور بے خبر رہنے کی جگہ ہے۔ بلکہ یہ تو ہاتھ سے نکلی ہوئی فرصتوں، ترک شدہ اطاعتوں، اور ان گناہوں پر جو تم سے سرزد ہوئے ہیں، رونے کی جگہ ہے۔ بیداری اور ان امور کی تلافی کی جگہ ہے جو ہاتھ سے نکل گئے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ توبہ کی اور لطف خدا کے سائے کی طرف پلٹنے کی جگہ ہے۔
"سامدون" "سمود" کے مادہ سے (بروزن جمود) لہو و لعب، جوش اور کبر و غرور سے سر اونچا کرنے کے معنی میں ہے۔ اور اصل میں اونٹ جب چل رہا ہو اور اپنا سر بے اعتنائی سے فضا میں بلند کرے تو اس فعل کو سمود کہا جاتا ہے۔
یہ مغرور متکبر کرنے والے جانوروں کی طرح خواب و خور میں مشغول ہیں، اور عیش و نوش میں غرق ہیں، اور دردناک حوادث اور ان شدید عذابوں سے۔ جو انہیں درپیش ہیں اور ان سے دامنگیر ہونے ہی والے ہیں —— بے خبر ہیں۔

٭ ٭ ٭

اس سورہ کی آخری آیت میں، ان بہت سے مباحث کے بعد جو اثبات توحید اور نفی شرک کے سلسلہ میں بیان ہوئے ہیں، کہتا ہے: "اب جب کہ ایسا ہے تو خدا کے لیے سجدہ کرو اور اس کی پرستش کرو" (فاسجدوا لله واعبدوا)۔
اگر تم یہ چاہتے ہو کہ حق کی صراط مستقیم پر چلو تو صرف اسی کی ذات کو سجدہ کرو، جس کی پاک ذات تک تمام عالم ہستی کے خطوط منتہی ہوتے ہیں، اور اگر تم یہ چاہتے ہو کہ گزشتہ اقوام کی دردناک سرنوشت میں —— جو شرک و کفر و ظلم و ستم کی بنا پر عذاب الٰہی کے چنگل میں گرفتار ہوئی ہیں —— گرفتار نہ ہوں، تو صرف اسی کی عبادت کرو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ کا) "نفس" کی جو محذوف ہے، بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "کاشفة" کی "تا" مبالغہ کے لیے ہے "علامة" کی طرح۔

[1] سورۂ طور آیت ۳۴۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بہت سی روایات میں یہ نقل ہوا ہے کہ جس وقت پیغمبرؐ اس سورہ کی تلاوت کرتے ہوئے اس آیت پر پہنچے تو تمام مومنین و کفار جو اسے سن رہے تھے سجدہ میں گر پڑے، ایک روایت کے مطابق جس نے سجدہ نہیں کیا وہ صرف "ولید بن مغیرہ" تھا (جو شاید سجدہ کرنے کے لیے جھک نہیں سکتا تھا) اس نے مٹھی بھر مٹی اٹھائی اور اس پر پیشانی رکھ دی اور اس طرح سے سجدہ کیا۔

اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ بت پرست تک بھی سجدے میں گر پڑے۔ کیونکہ اس سورہ کے لب ولہجہ کی اثر پذیری ایک طرف سے، اور اس سورہ کا ہیجان انگیز مضمون دوسری طرف سے، اور مشرکین کے لیے وحشتناک تہدیدیں تیسری طرف سے، اور پیغمبر گرامی اسلامؐ کے منہ سے نزول وحی کے پہلے مرحلہ میں ان مبارک آیات کا نکلنا چوتھی طرف سے، اس قدر گہرائی کے ہول مؤثر اور پُر نفوذ تھا کہ جس نے ہر دل پر بے اختیار اثر کیا، اور عناد، ہٹ دھرمی، تعصب اور خود خواہی کے پردوں کو — چاہے وقتی طور پر ہی سہی — آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیا، اور نور توحید کا دلوں پر سایہ ڈال دیا۔

اگر ہم بھی اس سورہ کو دقت و تأمل اور حضور قلب و توجہ سے تلاوت کریں، اور خود کو پیغمبر گرامی اسلامؐ کے سامنے نزول قرآن کی فضا میں رکھیں تو ہم دیکھیں گے کہ — اسلام کے مخصوص عقائد سے قطع نظر — ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ جس وقت آخری آیت پر پہنچیں تو سجدہ میں گر پڑیں۔ اور حق تعالیٰ کی بارگاہ میں سرِ تعظیم جھکا دیں۔

یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ قرآن نے منکرین کے دلوں میں بھی اثر ڈالا، اور انہیں بے اختیار اپنی طرف جذب کر لیا جیسا کہ "ولید بن مغیرہ" کی داستان میں آیا ہے کہ جس وقت اس نے سورۂ حٰمٓ سجدہ (فصلت) کی آیات کو سنا اور جب پیغمبرؐ نے اس آیت کی تلاوت کی: فان اعرضوا فقل انذرتکم صاعقة مثل صاعقة عاد و ثمود — تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور لرزنے لگا۔ اور بال اس کے بدن پر سیدھے کھڑے ہو گئے گھر میں آیا تو اس حالت میں کہ مشرکین نے خیال کیا کہ وہ پورے طور پر محمدؐ کے دین میں جذب ہو گیا ہے۔

اس بنا پر یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ چونکہ بعض شیطانوں، یا شیطان صفت انسانوں نے افرأیتم اللّات والعزّٰی...... کی تلاوت کے وقت — جو عربوں کے مشہور بتوں کی بات کرتی ہے — ان بتوں کی تعریف و توصیف میں زبان کھولی تھی۔ اور "تلك الغرانيق العلىٰ" کہہ دیا تھا، اس وجہ سے مشرکین کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ لہٰذا وہ بھی اس بنا پر سجدہ میں گر پڑے۔

کیونکہ — جیسا کہ ہم نے ان آیات کی تفسیر میں پہلے بیان کیا ہے — ان آیات میں جو ان بتوں کے نام لینے کے بعد آئی ہیں ان میں ان کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ اور اس نے کسی قسم کے شک اور تردید اور خطا و اشتباہ کی گنجائش کسی کے لیے بھی باقی نہیں چھوڑی (مزید وضاحت کے لیے اسی سورہ کی آیت ۱۹ و ۲۰ کی طرف رجوع کریں)

یہ نکتہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ "اوپر والی آیت" ان آیات میں سے ہے جس کی تلاوت کے وقت سب پر سجدہ واجب ہے: آیت کا لب و لہجہ بھی جو اس کے صیغۂ امر سے ظاہر ہے، اور امر وجوب کی دلیل ہے، اس معنی کی گواہی دیتا ہے، اور اس طرح سے سورہ "الم سجدہ" اور "حٰمٓ سجدہ" کے بعد یہ تیسرا سورہ ہے، جس میں سجدہ واجب آیا ہے۔ اگرچہ

بعض روایات کے مطابق، تاریخ نزول کے لحاظ سے وہ پہلا سورہ، جس میں سجدہ واجب کی آیت نازل ہوئی ہے، یہی سورہ ہے۔

خداوندا! ہمیشہ معرفت کے انوار کو ہمارے دلوں پر سایہ فگن کر، تاکہ ہم تیرے غیر کی پرستش نہ کریں اور تیرے غیر کے سامنے سجدہ نہ کریں۔

بارالہا! تمام خیرات کی کلید تیرے ہی دست قدرت میں ہے، ہمیں اپنے بہترین مواہب وعطایا سے یعنی اپنی خوشنودی اور رضا سے بہرہ مند کردے۔

پروردگارا! ہمیں عبرت بین نگاہ عطا فرما، تاکہ ہم گذشتہ ظالم وستمگر اقوام کے حالات سے عبرت سیکھیں اور ان کے راستے پر قدم رکھنے سے بچے رہیں۔

آمین یارب العالمین

اختتام سورۂ نجم اور تفسیر نمونہ کی جلد ۲۲ کا اختتام

۱۵/ ربیع الاول ۱۴۰۶

۱۳۶۴/ ۹/ ۳

اختتام ترجمہ

بتاریخ ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۸ مئی ۱۹۸۷ء بروز جمعرات بوقت پونے آٹھ بجے صبح بر مکان حقیر قم المقدسہ جمہوری اسلامی ایران، محل سلطان محمد شریف کوی جمشیدی بلاک ۱ خیابان انقلاب ـــــ الحمد للہ اولاً وآخراً وصلی اللہ علی محمد وآلہ ابداً دائماً۔

احقر صفدر حسین عفی عنہ

سُورۂ قمر

یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہُوا ۔

اِس میں ۵۵ آیتیں ہیں ۔

تاریخ آغاز: ۱۳۶۴/۹/۷ھ ش، ۱۵ ربیع الاول ۱۴۰۶ھ ق

سورۂ قمر کے مضامین

یہ سورہ اپنے اندر مکی سورتوں کی خصوصیتیں یعنی مبداء و معاد کے عظیم مباحث کی خصوصیات لیے ہوئے ہے۔ یہ سورہ گزشتہ اقوام سے تعلق رکھنے والے ایک گروہ کی بدکاری کو بیان کرتا ہے جو ہٹ دھرمی، عناد، کفر، ظلم اور فساد کے راستے پر چلنے کی وجہ خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے سرکوبی کرنے والے پے بہ پے عذاب میں گرفتار ہو کر ہلاک ہوئے۔ ان افراد کے متعلق بیان ہونے والی ہر سرگزشت کے بعد یہ سورہ (ولقد یسّرنا القراٰن للذکر فھل من مدّکر) "ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے والوں کی نصیحت کے لیے آسان کیا ہے تو کوئی ہے کہ جو نصیحت حاصل کرے" کی تکرار کرتا ہے تاکہ مسلمانوں اور کافروں دونوں کے لیے درسِ عبرت ثابت ہو۔

اس سورہ کے مضامین کو مجموعی طور پر چند حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ سورہ کے آغاز میں قُربِ قیامت، شق القمر اور مخالفین کی طرف سے آیاتِ الٰہی کے انکار پر گفتگو کی گئی ہے۔

۲۔ دُوسرے حصہ میں سب سے پہلی سرکش، متمرّد اور ہٹ دھرم قوم یعنی قوم نوح اور طوفانِ نُوح کے بارے میں مختصر بحث ہے

۳۔ تیسرا حصہ قومِ عاد کی داستان بیان کرتا ہے اور ان پر آنے والے دردناک عذاب کی کیفیت پیش کرتا ہے۔

۴۔ چوتھے حصہ میں قوم ثمود اور ان کی مخالفت کا ذکر ہے جو انہوں نے اپنے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام سے روا رکھی۔ ناقہ صالح کے معجزہ کا بھی ذکر ہے۔ آخر میں اس عذابِ الٰہی کا بیان ہے جو اس گروہ پر آیا۔

۵۔ اس کے بعد قوم لوط کا ذکر ہے اور ان کے کفر کی جانب اور اخلاق سے انحراف کی طرف ضمنی طور پر مختصر سا اشارہ ہے اور ان پر نازل ہونے والے دردناک عذاب کا بیان ہے۔

۶ ۔ ایک اور حصّہ میں آلِ فرعون اور ان پر عذاب و سزا کے بارے میں مختصر سی گفتگو ہے ۔
۷ ۔ آخری حصّہ میں گزشتہ اقوام، مُشرکینِ مکّہ اور مخالفینِ پیغمبرِ اسلامؐ کا موازنہ ہے اور مُشرکینِ مکّہ کے اُس بھیانک مُستقبل کا تذکرہ ہے جو وہ اپنی روش کی وجہ سے اپنے لیے متعیّن کر چکے تھے ۔

یہ سُورہ مُجرموں کی سزا ، ان پر نازل ہونے والے عذاب اور پرہیزگاروں کو ملنے والے اُجر و ثواب کے بیان پر ختم ہوتا ہے ۔
اِس سُورہ کی آیتیں عام طور پر مختصر اور دل ہلا دینے والی ہیں ۔
اِس سُورہ کا نام پہلی آیت کی مناسبت سے " قمر " رکھا گیا ہے ۔ پہلی آیت شق القمر کو موضوعِ بحث بناتی ہے ۔

فضیلتِ تلاوتِ سُورۂ قمر

ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلامؐ فرماتے ہیں : " من قرأ سورة اقتربت الساعة فی کل غب بعث یوم القیامة و وجهه علی صورة القمر لیلة البدر ومن قرأ ها کل لیلة کان افضل وجاء یوم القیامة ووجهه مسفر علی وجوه الخلائق " ۔ " جو شخص سُورہ اقتربت کو ایک دن چھوڑ کر پڑھے گا وہ قیامت کے دن اس حالت میں اُٹھے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی مانند چمکتا ہوگا اور جو اسے ہر شب میں پڑھے تو یہ اس سے بھی افضل ہے ۔ قیامت میں ایسے شخص کے چہرے کی روشنی تمام مخلوق پر برتری رکھتی ہوگی " [۱]

میدانِ قیامت میں چہرے کی یہ چمک یقیناً مضبوط اور سچّے ایمان کی علامت ہوگی ۔ یہ چمک اس سُورہ کی تلاوت، اس میں غور و فکر اور اس کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہوگی، صِرف تلاوت سے نہیں ۔

---

[۱] " مجمع البیان " جلد ۹ آغاز سورۂ قمر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ ۝

۲۔ وَاِنۡ یَّرَوۡا اٰیَۃً یُّعۡرِضُوۡا وَیَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ ۝

۳۔ وَکَذَّبُوۡا وَاتَّبَعُوۡۤا اَہۡوَآءَہُمۡ وَکُلُّ اَمۡرٍ مُّسۡتَقِرٌّ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ قیامت قریب ہوئی اور چاند شق ہوگیا۔

۲۔ جس وقت نشانی اور معجزہ کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں یہ سحر مستمر ہے۔

۳۔ اُنھوں نے (خدا کی آیتوں کی) تکذیب کی، اپنی خواہش نفس کی پیروی کی اور ہر امر کے لیے ایک قرار گاہ ہے۔

تفسیر

چاند شق ہوگیا

پہلی آیت میں دو اہم باتوں کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ ایک تو قیامت کا آنا کہ جس کا ورود اس عالم فانی کے لیے اپنے ہمراہ ایک عظیم انقلاب لیے ہوئے ہے۔ دوسرا عنوان ہے "نئی زندگی کی ابتداء"۔ وہ ایسی دُنیا ہے کہ جس کی عظمت و وُسعت اس دُنیائے دَنی میں مقید رہنے والوں کے لیے ناقابل فہم و ناقابل توصیف ہے۔

دُوسرا واقعہ "معجزہ شق القمر" کا ہے جو خدائے بزرگ و برتر کی ہر شے پر قدرت رکھنے کی دلیل بھی ہے اور اس کے پیغمبر گرامی قدر

کی صداقت کی نشانی بھی۔ قیامت قریب ہوئی اور چاند شق ہوگیا۔ (اقتربت الساعۃ وانشق القمر)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ سُورہ "سُورۂ نجم" قربِ قیامت کو بیان کرنے والے جُملوں پر ختم ہوا۔ "ازفت الاٰزفۃ" یہ سُورہ بھی اسی معنی و مفہوم سے شروع ہو رہا ہے۔ یہ تاکید ہے اِس بات کی کہ قیامت قریب ہے خواہ یہ قُرب دُنیا کے پیمانے کے اعتبار سے ہزاروں سال ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس دُنیا کی مجموعی عمر کی طرف توجہ کرتے ہُوئے اور اس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ اس دُنیا کی تمام عمر قیامت کے مقابلے میں ایسے ایک لمحہ سے زیادہ نہیں جو جلدی سے گزر جائے، اس سے مقصود یہ ہے کہ اس تعبیر کا مفہوم واضح ہو جائے۔

مفسّرین کی ایک جماعت کے قول کے مطابق ان دونوں حادثوں کا اکٹھا ذکر اس وجہ سے ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ جو کہ خُدا کے آخری پیغمبر ہیں، ان کا ظہور اصولی طور پر خُود قُربِ قیامت کی ایک نشانی ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی ایک حدیث ہے، آپؐ نے فرمایا: بعثت انا والساعۃ کھاتین" "میرا مبعوث ہونا اور قیامت مثل ان دو کے ہے[1]" یہ آپؐ کی دو اُنگلیوں کی طرف اشارہ ہے جو اُس وقت ایک دُوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔

دُوسری طرف چاند کا دو ٹکڑے ہونا ستاروں کے نظام کے درہم برہم ہونے کے اِمکان پر خُود ایک دلیل ہے اور ایک چھوٹا سا نمونہ ہے ان عظیم حادثات کا جو قُربِ قیامت میں ظہور پذیر ہوں گے کیونکہ تمام ستارے بمع زمین ٹُوٹ پھُوٹ جائیں گے اور ان کی جگہ ایک نئی دُنیا معرضِ وجود میں آجائے گی۔ ایسی مشہور روایات کے مطابق کہ جن کے بارے میں بعض راویوں نے متواتر ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے مُشرکین پیغمبرؐ کے پاس آئے اور کہا کہ اگر آپ سچ کہتے ہیں اور خُدا کے پیغمبر ہیں تو ہم کو چاند کے دو ٹکڑے کرکے دکھائیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ "اگر میں یہ کام کرکے دکھا دوں تو کیا تم ایمان لے آؤ گے"؟ اُنہوں نے کہا جی ہاں۔ وہ چودھویں کی رات تھی۔ پیغمبرؐ نے بارگاہِ ایزدی میں دُعا کی کہ جو کچھ یہ چاہتے ہیں وہ تو کردے۔ چاند اچانک دو ٹکڑے ہوگیا۔ رسول اللہؐ ایک ایک شخص کو آواز دیتے تھے اور فرماتے تھے[2]"یہ مُعجزہ دیکھ لو"

اِس سلسلہ میں چند سوالات ہیں مثلاً یہ کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک آسمانی کُرّہ شق ہوکر دو ٹکڑے ہو جائے نیز اس قسم کا حادثہ کُرّہ زمین اور نظامِ شمسی کے لیے اپنے اندر کیا تاثیر رکھتا ہے۔ شگافتہ ہو جانے کے بعد چاند کے دونوں ٹکڑوں کے ملنے کی کیفیت اور یہ کہ اس قسم کے حادثہ کا ہونا کس طرح ممکن ہے۔ پھر یہ بھی کہ تواریخ عالم نے اس کا ذکر بھی نہ کیا ہو۔ اِس ضمن میں کچھ یہ اور کچھ ایسے ہی دوسرے سوالات ہیں۔ انشاء اللہ نکات کے ذیل میں ہم یہ سب تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

وہ نکتہ کہ جس کا ذکر یہاں ضروری ہے یہ ہے کہ بعض ایسے مفسّرین، کہ جن کی شہرت اچھی نہیں ہے اور جو ہر قسم کے اس عمل کے جو خارقِ عادت ہو "سوائے قرآن کے" پیغمبرِ اسلامؐ کے ذریعے انجام پانے کے مُنکر ہیں، باوجود اس کے کہ مذکورہ بالا آیت واضح ہے اور اس عنوان پر عُلمائے اسلام کی کتابوں میں روایات کثرت سے موجود ہیں، وہ اُلجھن میں گرفتار ہیں کہ اس خارقِ عادت عمل کی کس طرح توجیہ کریں۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس موضوع کو اس طرح زیرِ بحث لائیں کہ اس واقعہ کے معجزانہ پہلو کی نفی ہو جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ

---

[1] "تفسیر فخر رازی" جلد ۲۹، ص ۲۹

[2] "مجمع البیان" اور دُوسری کتب تفاسیر زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

شق القمر کا واقعہ بطور اعجاز ظہور پذیر ہوا ہے اور بعد میں آنے والی آیتیں اس امر پر اپنے اندر واضح شواہد لیے ہوئے ہیں۔ اگر کچھ آیاتِ قرآنی معجزہ کی نفی کرتی ہیں تو وہ ایسے معجزات کی طرف اشارہ ہے کہ بہانے بنانے والے افراد جن کا مطالبہ کرتے تھے۔ وہ نہ تو حق کو قبول کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور نہ اس کے انجام پا جانے کے بعد حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔ وہ معجزات کہ جن کی تحقیق کے لیے مطالبہ ہوتا تھا پیغمبرؐ کی طرف سے انجام پاتے تھے۔ اس امر پر بہت سے شواہد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخِ زندگی میں موجود ہیں۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے "ہٹ دھرم اور کج بحثی کرنے والے مخالفین جب تیری تبلیغ کی صداقت کے بارے میں کوئی معجزہ یا نشانی دیکھتے ہیں تو اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ واقعی مستقل جادو ہے" (وان یروا ایة یعرضوا ویقولوا سحر مستمر)۔ مستمر کا لفظ اس لیے کہا کہ انہوں نے پیغمبرِ اسلامؐ کی طرف سے پے در پے معجزات دیکھے تھے اور "شق القمر" اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ وہ اِن سب باتوں کو مستقلاً جادو قرار دیتے تھے اگرچہ یہ تہمت حق کو تسلیم نہ کرنے کا محض ایک بہانہ تھی۔ کچھ مفسرین نے "مستمر" کے معنی طاقتور قرار دیے ہیں۔ جیسا کہ (حبل مریر) کہا جاتا ہے جس کے معنی مضبوط رسی کے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس کے معنی ناپائیدار کے لیے ہیں۔ لیکن صحیح پہلی تفسیر ہی ہے۔

بعد والی آیت میں ان کے مخالفانہ نکتے اور اس مخالفت کے نتیجے میں ظاہر ہونے والی نحوست کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ "انہوں نے تکذیب کی اور اپنی ہوائے نفس کی پیروی کی اور ہر چیز کی ایک قرار گاہ ہے"۔ (وكذبوا واتبعوا اهواءهم وكل امر مستقر)۔

پیغمبرِ اسلامؐ کی مخالفت یا آپؐ کے دلائل اور معجزات کی تکذیب اور قیامت کے انکار کا سبب ان کی ہوائے نفس کی پیروی تھی۔ تعصب، ہٹ دھرمی اور نفس پرستی انہیں حق کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرنے دیتی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ بلا کسی قید کے مفادات کا حاصل کرنا اور ہر قسم کے گناہ میں آلودہ ہونا اس راہ میں حائل تھا کہ وہ دعوتِ حق کو قبول کریں کیونکہ دعوتِ حق کا قبول کرنا ذمہ داری عائد کرتا تھا۔ جی ہاں ہمیشہ ایسا ہوتا رہا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا کیونکہ حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مفاد پرستی ہی ہوتی ہے۔

(وكل امر مستقر) "ہر چیز کی ایک قرار گاہ ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کیے کی سزا پائے گا۔ نیکی کرنے والوں کی نیکی کی قرار گاہ اور برائی کرنے والوں کی برائی کی قرار گاہ۔ اس تفسیر سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس جہان میں کوئی چیز ختم نہیں ہوتی اور ہر نیکی اور برائی باقی رہتی ہے یہاں تک انسان اس کی جزا یا سزا پائے۔

مندرجۂ بالا تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ جھوٹے الزامات حق کے چہرے کو ہمیشہ نہیں چھپا سکتے۔ ہر چیز اپنی قرار گاہ کی طرف جاتی ہے اور زیادہ دیر نہیں لگتی کہ حق کا خوبصورت اور باطل کا قبیح چہرہ آشکار ہو جاتا ہے۔ یہ اس دنیا کی ایک مستقل روایت ہے۔ یہ تفسیریں ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب کی سب آیت کے مفہوم میں داخل ہوں۔

چند ایک نکات

۱۔ شق القمر، پیغمبرؐ اسلام کا ایک عظیم معجزہ : اگرچہ بعض کوتاہ نظر مفسرین کا اس بات پر اصرار ہے کہ اس معجزہ کی اس طرح توجیہ کریں کہ اس کی خارق العادت حیثیت باقی نہ رہے، ان کا کہنا ہے کہ مندرجہ بالا آیت آئندہ اور مستقبل کے بارے میں خبر دیتی ہے' قیامت کی شرائط سے متعلق ہے اور اس سے پہلے کے حوادث میں سے ہے۔لیکن ایسی متعدد قرآنی آیات موجود ہیں جو اس کے معجزہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک بات یہ بھی ہے کہ اس معجزہ کا بیان ماضی کے صیغے میں کیا گیا ہے جو بتاتا ہے کہ شق القمر واقع ہو چکا ہے جیسا کہ آخری پیغمبرؐ کے مبعوث ہونے کی وجہ سے قرب قیامت کی تصدیق ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں اگر گفتگو معجزے کے بارے میں نہ ہو تو پیغمبرؐ کی طرف سحر کی نسبت' جو بعد والی آیت میں آئی ہے' کوئی مناسبت نہیں رکھتی اور اس طرح (وکذبوا واتبعوا اھواءھم) کا جملہ جو ان کی تکذیب کی خبر دیتا ہے' وہ بھی کوئی مناسبتِ کلام نہیں رکھتا۔

قطع نظر اس سے کتبِ اسلامی میں اس معجزے کے وقوع کے بارے میں بہت سی روایات بھی موجود ہیں جو حدِ تواتر و شہرت تک پہنچی ہوئی ہیں اور اس وجہ سے قابلِ انکار نہیں ہیں۔ ہم فخرالدین رازی اور طبرسی اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے دو معروف مفسرین کی گفتگو کا حوالہ دیتے ہیں۔ فخرالدین رازی کا کہنا ہے کہ زیادہ تر مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے اور صحیح روایتیں بھی اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کا وقوع ایسا نہیں کہ اس کے ماننے میں کسی قسم کے شک یا تردّد کو دخل ہو۔ پھر پیغمبرِ اسلامؐ نے اس کی خبر دی ہے۔اس بناء پر اسے قبول کرنا چاہیئے۔ باقی رہی عدم فرق والتیام کی داستان (مطابق عقیدۂ ابطال شدہ بطلیموس) تو وہ بے بُنیاد ہے اور اس کا علم سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ دلائلِ عقلیہ سے ثابت ہے کہ افلاک میں سے کسی چیز کا ٹوٹنا اور پھر جڑ جانا ممکن ہے۔ مرحوم طبرسی مجمع البیان میں رقم طراز ہیں کہ مفسرین اس آیت کو زمانۂ پیغمبرؐ اسلام میں رونما ہونے والے معجزۂ شق القمر سے متعلق سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد ان چند مخالفین کے بے اعتنائی کے ساتھ نام لیتے ہیں۔ وہ نام یہ ہیں عطا، حسن اور بلخی۔

بعض افراد نے نقل کیا ہے کہ حذیفۂ یمانی جو مشہور صحابی تھے اُنہوں نے شق القمر کا واقعہ مسجد مدائن میں ایک کثیر جماعت کے سامنے بیان کیا۔ وہاں ان پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ حالانکہ ان میں سے بہت سے حاضرین ایسے تھے جنھوں نے پیغمبرِ اسلامؐ کا زمانہ دیکھا تھا (اس حدیث کو دُرِ منثور اور قرطبی نے اس آیت کے عنوان کے ماتحت پیش کیا ہے)

آیت میں جس مفہوم کے قرائن موجود ہیں' جو روایات اس سلسلہ میں ہیں اور جو مفسرین کے اقوال ہیں' ان سب سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی شق القمر کا واقعہ قابلِ انکار نہیں ہے۔ یہاں چند سوالات ذہن میں اُبھرتے ہیں جن کے جواب ہم پیش کرتے ہیں۔

۲۔ "شق القمر" موجودہ زمانے کے علوم کے لحاظ سے : وہ اہم سوالات جو اس بحث میں سامنے آتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اجرامِ سماوی میں شگاف کا پیدا ہونا اصولی طور پر ممکن ہے یا نہیں اور علم اس کی تائید کرتا ہے یا تردید۔ ماہرینِ فلکیات کے انکشافات کے مطالعہ سے اس سوال کا جواب مشکل نہیں ہے۔ ان کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کے واقعات نہ صرف یہ کہ محال نہیں ہیں بلکہ ایسے امور کا مشاہدہ ہوا ہے اگرچہ ہر مشاہدہ میں مخصوص عوامل کارفرما تھے۔ نظامِ شمسی کے متعلقات اور

دُوسرے آسمانی کُرّوں میں سے کسی آسمانی کُرّہ کا اس طرح شق ہونا اور پھر مل جانا ایک ممکن اَمر ہے۔ نمونے کے طور پر چند باتیں درج ذیل ہیں

(الف) **نظامِ شمسی کی تخلیق**: اِس نظریے کے تمام ماہرین نے تصدیق کی ہے کہ نظامِ شمسی سے تعلق رکھنے والے تمام کُرّے اِبتداء میں سُورج کے اجزا تھے۔ کسی وقت اس سے الگ ہوئے اور اپنے اپنے مدار میں گردش کرنے لگے۔ یہ بات ضرور ہے کہ الگ ہونے کے اس عمل کے اسباب و عوامل میں اختلاف ہے۔" لاپلاس" کا نظریہ یہ ہے کہ کسی چیز کے الگ ہونے کے اس عمل کا سبب مرکز سے گریز کی وُہ قوت ہے جو سُورج کے منطقۂ استوائی میں پائی جاتی ہے۔ وہ اس طرح کہ جس وقت سُورج ایک جلانے والی گیس کے ٹکڑے کی شکل میں تھا (اور اَب بھی ایسا ہی ہے) اور اپنے گرد گردش کرتا تھا تو اس گردش کی سُرعت منطقۂ استوائی میں اس بات کا سبب بنی کہ سُورج کے کچھ ٹکڑے اس سے الگ ہو جائیں اور فضا میں بکھر جائیں اور مرکزِ اصلی یعنی خُود سُورج کے گرد گردش کرنے لگیں لیکن " لاپلاس" کے بعد بعض دوسرے ماہرین کی تحقیقات ایک دوسرے مفروضہ پر منتہی ہوئیں۔ وہ اس علیحدگی کا سبب اس شدید مدّ و جزر کو قرار دیتے ہیں جو سُورج کی سطح پر سے ایک بہت بڑے ستارے کے عبور کرنے کی وجہ سے ہوا۔ اس مفروضہ سے اتفاق کرنے والے اس وقت کی سُورج کی حرکتِ وضعی کو سُورج کے ٹکڑوں کے علیحدہ ہونے کی توجیہ کو کافی نہیں سمجھتے۔ وہ اس مفروضہ کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مذکورہ مدّ و جزر نے سُورج کی سطح پر بہت بڑی بڑی لہریں اس طرح پیدا کیں جیسے پتھر کا کوئی بہت بڑا ٹکڑا سمندر میں گرے اور اس سے لہریں پیدا ہوں اس طرح سُورج کے ٹکڑے یکے بعد دیگرے باہر نکل کر گر پڑے اور خُود سُورج کے گرد گردش کرنے لگے۔ بہرحال اس علیحدگی کا عامل کچھ بھی ہو اس پر سب متفق ہیں کہ نظامِ شمسی کی تخلیق انشقاق کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئی۔

(ب) **بڑے شہاب**: یہ بڑے بڑے آسمانی پتھر ہیں کہ جو نظامِ شمسی کے گرد گردش کر رہے ہیں اور جو کبھی کبھی چھوٹے کرات اور سیاروں سے مشابہت رکھنے والے قرار دیے جاتے ہیں۔ بڑے اس وجہ سے کہ ان کا قطر ۲۵ کلومیٹر تک ہوتا ہے لیکن وہ عموماً اس سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ ماہرین کا نظریہ یہ ہے کہ " استروئیدھا " ایک عظیم سیّارے کے بقیہ جات ہیں کہ جو مشتری اور مریخ کے درمیان مدار میں حرکت کر رہا تھا اور اس کے بعد نامعلوم عوامل کی بنا پر وہ پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اَب تک پانچ ہزار سے زیادہ اس طرح کے ٹکڑے شہاب معلوم کیے جا چکے ہیں اور ان میں سے جو بڑے ہیں ان کے نام بھی رکھے جا چکے ہیں بلکہ ان کا حجم، مقدار اور سُورج کے گرد ان کی گردش کا حساب بھی لگایا جا چکا ہے۔ بعض ماہرینِ فضا ان استروئیدوں کی خاص اہمیت کے قائل ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ فضا کے دُور دراز حصّوں کی جانب سفر کرنے کے لیے اوّلین قدم کے عنوان سے ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

آسمانی کُروں کے انشقاق کا ایک دُوسرا نمونہ

(ج) شہابِ ثاقب چھوٹے چھوٹے آسمانی پتھر ہیں جو کبھی کبھی چھوٹی اُنگلی کے برابر بھی ہوتے ہیں۔ بہرحال وہ سُورج کے گرد ایک خاص مدار میں بڑی تیزی کے ساتھ گردش کر رہے ہیں اور جب کبھی ان کی سمتِ سفر کُرّۂ زمین کے مدار کو کاٹ کر گزرتی ہے تو وُہ زمین کا رُخ اختیار کرتے ہیں۔ یہ چھوٹے پتھر، اس ہوا سے شدّت کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے، کہ جو زمین کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور تھرتھراہٹ پیدا کرنے والی اس تیزی کی وجہ سے کہ جو ان کے اندر ہے زیادہ گرم ہو کر اس طرح بھڑک اُٹھتے ہیں کہ ان میں سے شعلے

نکلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ہم انہیں ایک پُر نُور، خوبصورت لکیر کی شکل میں فضائے آسمانی میں دیکھتے ہیں اور انہیں "شہاب کے تیر" کے نام سے موسُوم کرتے ہیں اور کبھی یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک دُور دراز کا ستارہ ہے جو گر رہا ہے حالانکہ وہ چھوٹا شہاب ہے کہ جو بہت ہی قریبی فاصلہ پر بھڑک کر خاک ہو جاتا ہے۔

شہابوں کی گردش کا مدار زمین کے مدار سے دو نقطوں پر ملتا ہے۔ اسی بناء پر مرداد (ایرانی مہینے کا نام ہے) اور آبا نماہ (یہ بھی ایرانی مہینے کا نام ہے) میں جو دو مداروں کے نقطہ تقاطع ہیں، شہاب ثاقب زیادہ نظر آتے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ دُمدار ستارے کے بقیہ حصّے ہیں جو نامعلوم حوادث کی بناء پر پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔

آسمانی کُرّوں کے پھٹنے کا ایک اور نمُونہ

بہرحال آسمانی کُرّوں کا انفجار و انشقاق یعنی پھٹنا اور پھٹ کر بکھرنا کوئی بے بُنیاد بات نہیں ہے اور جدید علوم کی نظر میں یہ کوئی فعلِ محال بھی نہیں کہ یہ کہا جائے کہ معجزہ کا تعلق امرِ محال کے ساتھ نہیں ہوا کرتا۔ یہ سب انشقاق یعنی پھٹنے کے سلسلہ کی باتیں ہیں۔ دو ٹکڑوں میں جو قوتِ جاذبہ ہوتی ہے اس بنا پر اس انشقاق کی بازگشت ناممکن نہیں ہے۔

اگرچہ ہیئتِ قدیم میں بطلیوس کے نظریہ کے مطابق نو آسمان پیاز کے تہہ بہ تہہ چھلکوں کی طرح ہیں اور گھومتے رہتے ہیں اور یوں یہ نو آسمان ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں جن کا ٹوٹنا اور جڑنا ایک جماعت کی نظر میں امرِ محال تھا۔ اس لیے اس نظریہ کے حامل افراد معراجِ آسمانی کے بھی منکر تھے اور "شق القمر" کے بھی لیکن اب جب کہ ہیئتِ بطلیوس کا مفروضہ خیالی افسانوں اور کہانیوں کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور نو آسمانوں کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا تو اب ان باتوں کی گنجائش بھی باقی نہیں رہی۔ یہ نکتہ کسی یاددہانی کا محتاج نہیں کہ "شق القمر" ایک عام طبیعی عامل کے زیرِ اثر رُونما نہیں ہوا بلکہ اعجاز نمائی کا نتیجہ تھا لیکن چونکہ اعجاز محالِ عقلی سے تعلق نہیں رکھتا لہٰذا یہاں مطلوب اس مقصد کے امکان کو بیان کرنا تھا، غور فرمائیں۔

۳۔ "شق القمر" تاریخی اعتبار سے

ایک اور اعتراض جو بعض بے خبر افراد "شق القمر" پر کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ شق القمر کا اپنی اس اہمیت کے ساتھ کہ جو وہ رکھتا ہے حقیقت پر مبنی ہوتا تو دُنیا کی تاریخوں میں اس کا ذکر ملتا جب کہ ایسا نہیں ہوا۔

یہ واضح کرنے کے لیے کہ اس اعتراض کی حقیقت کیا ہے اس مسئلہ کا تجزیہ اور اس کی تحلیل کی جاتی ہے۔

(الف) یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ چاند ہمیشہ صرف آدھے کُرۂ اَرض سے نظر آتا ہے اور سارے کُرۂ ارض سے بیک وقت نظر نہیں آتا۔ اسی وجہ سے زمین کے آدھے حصّہ کے لوگ تو اس حساب سے خارج ہیں یعنی ان کے اس واقعہ کے دیکھنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔

(ب) اس نیم کُرہ کے جو آدھے لوگ ہیں ان میں، اکثریت کا سویا ہوا ہونا ممکن ہے، چونکہ معاملہ آدھی رات کے بعد کا ہے۔ اس لیے ساری دُنیا کے چوتھائی افراد اس واقعہ سے باخبر ہو سکتے ہیں۔

(ج) قابلِ رویت حصّہ میں بھی عین ممکن ہے کہ آسمان کا کوئی خاص حصّہ اَبر آلود ہو اور چاند کا چہرہ بادلوں میں پوشیدہ ہو۔

(د) آسمانی حوادث افراد کی توجہ صرف اس صُورت میں اپنی طرف مبذول کرتے ہیں جب بجلیوں کی سی شدید کڑک اپنے اندر رکھتے ہوں یا مکمل گرہن کی صُورت میں کہ جب چاند بالکل ہی غائب ہو جائے اور وہ بھی ایک طویل وقفہ کے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر منجمین کی طرف سے اعلان نہ ہو تو چھوٹے موٹے گہن کی بہت کم لوگوں کو خبر ہوتی ہے۔ بہت سے افراد تو مکمل چاند گرہن سے بھی بے خبر رہتے ہیں۔ صرف وہ لوگ کہ جو اجرامِ فلکی یعنی چاند وغیرہ کا رصدگاہوں میں مشاہدہ کرتے رہتے ہیں یا وہ لوگ کہ اتفاق سے جن کی نگاہ آسمان پر پڑ جائے تو ان کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایسے واقعہ سے باخبر ہوں اور کچھ اور لوگوں کو بھی باخبر کریں۔ یہی وجہ ہے کہ چاند کا مختصر وقت کے لیے رُونما ہونے والا واقعہ جیسا کہ ابتدا میں سمجھا جاتا تھا، پُوری دنیا کے لوگوں کی توجہ تو جذب کرنے کا سبب نہیں بن سکتا۔ علی الخصوص اس زمانے کے لوگ کہ جو اجرامِ سماوی کی اہمیت کے اصولی طور پر بہت کم قائل تھے۔

(ھ) علاوہ ازیں تاریخ میں مندرج مطالب اور ان کی نشر و اشاعت کے وسائل اس زمانے میں محدُود تھے، یہاں تک کہ لکھے پڑھے افراد بہت کم تھے اور کتابیں صرف ہاتھ سے لکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ اس وقت موجودہ دَور کی کیفیت نہیں تھی کہ اہم واقعات بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعے تمام دنیا میں پھیل جاتے ہیں۔ ان پہلوؤں کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو اس واقعہ کے غیر اسلامی تاریخوں میں مندرج نہ ہونے پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے اور اس صُورتِ حال کو اس واقعہ کی نفی پر محمول نہیں کرنا چاہیئے۔

۴۔ اِس عظیم معجزہ کے وقوع کی تاریخ

راویانِ حدیث اور مفسرین میں اس بات پر قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے کہ شق القمر کا معجزہ پیغمبرِ اسلام کی ہجرت سے پہلے قیامِ مکہ کے زمانے میں رُونما ہوا۔ لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ابتدائے بعثتِ پیغمبرؐ میں ہوا ہے[۱] جب کہ بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ قیامِ مکہ کے آخری دَور میں ہجرت کے قریب ہوا اور وہ بھی کچھ حقیقت کے متلاشی افراد کے تقاضے پر۔ وہ مدینہ میں پیغمبرؐ کی خدمت میں آئے اور انہوں نے عقبہ میں آپ کی بیعت کی۔[۲] بعض روایات سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ کی طرف سے شق القمر کا اعجاز دکھانے کی علّت یہ تھی کہ جادو اور سحر کے اثرات زمینی امور سے متعلق ہوتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس بات کا اطمینان حاصل کر لیں کہ محمدؐ کے معجزات جادو نہیں ہیں۔[۳]

متعصب اور ہٹ دھرم لوگوں کی ایک جماعت نے اس معجزہ کو دیکھ کر کہا کہ ہم اسے قبول نہیں کریں گے یہاں تک کہ شام اور یمن کے قافلے آن پہنچیں اور ہم ان سے سوال کریں کہ کیا اُنہوں نے یہ واقعہ دیکھا ہے لیکن جب آنے والے مسافروں نے اس واقعہ

۱۔ "بحار الانوار" جلد ۱۷، ص ۳۵۴ (حدیث ۸)

۲۔ 〃 〃 〃 ۳۵۲ (حدیث ۱)

۳۔ 〃 〃 〃 ۳۵۵ (حدیث ۱۰)

کی تصدیق کی تب بھی وہ مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے۔[1]

آخری نکتہ کہ جس کا ذکر یہاں ضروری ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے اور بہت سے معجزات کی طرح یہ معجزہ بھی تاریخ اور ضعیف روایتوں کے خرافات میں آمیزش کا شکار ہوگیا ہے جس کی وجہ سے اس کا چہرہ غور و فکر کرنے والوں کی نظر سے اوجھل ہوگیا۔ مثلاً یہ کہ چاند کے ایک ٹکڑے کا زمین پر آنا وغیرہ۔ مناسب یہ ہے کہ ایسی خرافات کو اس واقعہ سے جدا رکھنا چاہیئے تاکہ معجزہ کی اصل حقیقت اس میں ملوّث نہ ہو۔

---

[1] درالمنثور جلد ۶ صفحہ ۱۳۳۔

۴۔ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۙ

۵۔ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۙ

۶۔ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ۙ

۷۔ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۙ

۸۔ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ۭ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ○

ترجمہ

۴۔ بُرائیوں سے عبرت حاصل کرنے کے لیے کافی خبریں ان تک پہنچی ہیں۔

۵۔ یہ آیتیں خُدا کی حکمتِ بالغہ ہیں لیکن ڈرانے والی چیزیں (ہٹ دھرم لوگوں کے لیے) مفید نہیں ہیں۔

۶۔ اس بنا پر ان سے مُنہ پھیر لے اور اس دن کو یاد کر جب خُدا کی طرف بُلانے والا لوگوں کو اعمال کے حساب کے لیے بلائے گا۔

۷۔ وُہ قبروں سے نکلیں گے اس صُورت میں کہ ان کی آنکھیں دحشت کی وجہ سے جُھکی ہوئی ہوں گی اور وہ منتشر ٹڈی دل کی طرح بلا مقصد ہر طرف دوڑ رہے ہوں گے۔

۸۔ درآنحالیکہ (وحشت و اضطراب کے زیرِ اثر) اس بلانے والے کی طرف سر اُٹھا کر دیکھیں گے اور کافر کہیں گے کہ آج سخت اور دردناک دن ہے۔

تفسیر

وہ دن کہ جب سب قبروں سے باہر نکلیں گے

اس بحث کے بعد کہ جو گزشتہ آیتوں میں کفار کی ایک ایسی جماعت کے بارے میں کہ جس نے پیغمبرِ اسلامؐ کی تکذیب کی تھی اور کسی بھی معجزے کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا تھا، یہ آیتیں آئیں۔ ان میں اس قسم کے افراد کے بارے میں مزید تفصیل ہے اور یہ کہ قیامت میں دردناک عذاب کی وجہ سے ان کا کیا حال ہوگا۔

پروردگارِ عالم پہلے ارشاد فرماتا ہے کہ اس طرح نہیں ہے کہ یہ لوگ بے خبر ہوں بلکہ وہ خبریں کہ جو ان کے لیے برائیوں سے اور قبیح چیزوں سے دامن بچانے کا موجب بن سکتی ہیں، کافی مقدار میں ان کے پاس آئی ہیں (ولقد جاءهم من الانباء ما فيه مزدجر)۔ خدا کی طرف بلانے والوں کی تبلیغ میں کوئی کمی نہیں تھی بلکہ یہ ان کا بے غیرت پن ہے۔ یہ نہ تو سننے والے کان رکھتے ہیں اور نہ ان میں حق طلبی کی روح ہے۔ ان میں اس حد تک تقویٰ بھی موجود نہیں کہ جو انہیں آیاتِ الٰہی میں تحقیق و تدبر کی دعوت دے۔

"انباء" (خبریں) سے مراد گزشتہ امتوں اور قوموں کی خبریں ہیں جو مختلف النوع سزاؤں اور عذاب سے ہلاک ہوئیں۔ اس میں قیامت کی خبریں ہیں اور ظالموں اور کافروں کی ان سزاؤں کے بارے میں بیان ہے جس کا ذکر وضاحت سے قرآن میں موجود ہے۔

اس کے بعد مزید ارشاد فرماتا ہے کہ یہ آیتیں حکمتِ بالغۂ الٰہی ہیں اور اپنے اندر گہرائی رکھنے والی نصیحتیں ہیں لیکن یہ ڈرانے والی چیزیں ان ہٹ دھرم افراد کے لیے مفید نہیں ہیں۔ (حكمة بالغة فما تغن النذر)[1، 2]

خلاصہ یہ ہے کہ فاعل کی فاعلیت میں کوئی نقص نہیں ہے۔ جو نقص ہے وہ قابل کی قابلیت میں ہے ورنہ گزشتہ انبیاء کے پاس ان کی امتوں کے بارے میں جو خبریں آئی ہیں اور وہ خبریں جو قیامت کے بارے میں ان تک پہنچی ہیں، ان میں سے ہر ایک حکمتِ بالغہ ہے اور اتنی پُر تاثیر ہے کہ ان کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو سکتی ہے بشرطیکہ ان میں تھوڑی سی روحانی توجہ موجود ہو۔

بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "اب جبکہ یہ حق سے بیگانہ افراد قبول کرنے کی طرف قطعاً آمادہ نہیں ہیں تو تو انکو انکی حالت پر چھوڑ دے اور ان سے منہ پھیر لے اور آمادگی رکھنے والے لوگ تلاش کر" (فتول عنهم)۔

۱۔ "حكمة بالغة" مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیرِ کلام میں هذه حكمة بالغة ہے۔

۲۔ "نذر" جمع ہے نذیر کی یعنی ڈرانے والی چیزیں عام اس سے کہ وہ آیاتِ الٰہی ہوں یا گزشتہ انبیاء اور امتوں کی خبریں کہ جن کی صدا لوگوں کے کانوں تک پہنچی ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی تسلیم کیا ہے کہ "نذر" مصدر ہے انذار کے معنوں میں، لیکن پہلے معنی زیادہ مناسب ہیں۔ ضمناً "ما" "ما تغن النذر" میں نافیہ ہے نہ کہ استفہامیہ۔

اور اس دن کو یاد کر کہ جس دن خدا کی طرف بلانے والے ایک وحشت ناک امر کی جانب لوگوں کو بُلا رہے ہوں گے یعنی حساب کتاب اور نامہ اعمال کی جانچ پڑتال کی جانب (یوم یدع الداع الیٰ شیء نکر [1])۔

اس بنا پر (یوم یدع الداع) ایک مستقل جملہ ہے کہ جو (فتول عنھم) کے جملے سے الگ ہے اگرچہ بعض مفسرین نے اسے گزشتہ جملہ کا آخری حصّہ سمجھا ہے۔ ان کے خیال میں مراد یہ ہے کہ جب قیامت میں خدا کی طرف بلانے والے بلائیں گے اور وہ لوگ تیرا دامنِ شفاعت تھامیں گے تو تُو ان سے منہ پھیر لیجو، لیکن یہ تفسیر بعید از عقل ہے۔

خدا کی طرف یہ بلانے والا یا خُود خدا ہے یا اس کے فرشتے یا اسرافیل کہ جو صور پھونک کر لوگوں کو قیامت میں بُلائے گا، یا یہ سب ہیں۔ مفسّرین نے مختلف احتمالات تجویز کیے ہیں۔ سُورہ " اسرا " کی آیت ۵۲ جس میں خدا فرماتا ہے کہ :

" یوم یدعوکم فتستجیبون بحمدہ "

" یاد کرو اس دن کو جب خدا تمہیں تمہاری قبروں سے بلائے گا اور تم بھی اس کی پُکار پر لبیک کہو گے اِس حالت میں کہ اس کی حمد و ثنا کر رہے ہو گے "۔ اس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے پہلے معنی زیادہ مناسب نظر آتے ہیں اگرچہ بعد والی آیتیں ان معنی کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہیں اور اس سے مراد فرشتے ، حساب کتاب اور جزا و سزا کے مامورین ہوں (شیء نکر) نہ پہچانے ہوئے سے مُراد یا تو خدا کی طرف سے باریک بینی کے ساتھ حساب کتاب ہے جو قیامت سے پہلے تک ان کے لیے غیر معروف تھا، یا اجنبی قسم کے عذاب ہیں کہ جنھیں وہ کبھی تسلیم نہیں کرتے تھے، یا یہ سب امور ہیں کیونکہ قیامت کے تمام معیار انسانوں کے لیے اجنبی اور غیر مانوس ہوں گے۔

بعد والی آیت میں اس سلسلہ میں مزید وضاحت کرتے ہوئے پروردگارِ عالم فرماتا ہے :

" وہ قبروں سے نکلیں گے اس حالت میں کہ ان کی آنکھیں وحشت کی شدت کے باعث جھکی ہوئی ہوں گی اور وہ بلا مقصد ٹڈی دل کے مانند اِدھر اُدھر دَوڑ رہے ہوں گے " (خشعًا ابصارھم یخرجون من الاجداث کانھم جراد منتشر)۔

آنکھوں سے " خشوع " کی نسبت اس وجہ سے دی ہے کہ منظر اس قدر ہولناک ہو گا کہ آنکھیں اُسے دیکھنے کی تاب نہ رکھتیں ہوں گی۔ لہذا نگاہیں نیچی ہوں گی اور " پراگندہ ٹڈی دَل " کی تشبیہ اس مشابہت کی وجہ سے ہے کہ دوسرے پرندوں کے برعکس کہ جو اُڑتے وقت اپنے اندر ایک طرح کا نظم اور ترتیب رکھتے ہیں، ٹڈی دل اپنے اندر کسی قسم کی ترتیب نہیں رکھتا۔ ٹڈیاں درہم و برہم رہتی ہیں اور بغیر کسی مقصد ہر طرف چل پڑتی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ اس دن ٹڈی دَل کی طرح کمزور اور ناتواں ہوں گے۔ جی ہاں! یہ دل کے اندھے اور بے خبر لوگ اس طرح وحشت زدہ ہوں گے کہ بدمست افراد کی طرح ہر طرف رُخ کریں گے اور ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے گویا وہ اپنے وجود سے بے خبر ہوں گے جیسا کہ سورہ حج کی آیت ۲ میں ہمیں ملتا ہے (وتری النّاس سکاریٰ وماھم بسکاریٰ)

" اُس دن تُو لوگوں کو مست دیکھے گا حالانکہ وہ مست نہیں ہوں گے "۔ حقیقت میں یہ تشبیہ اس مفہوم کو لیے ہوئے ہے جو سُورہ قارعہ کی آیت ۴ میں آیا ہے: " یوم یکون النّاس کالفراش المبثوث "

---

[1] " نکر " مفرد ہے۔ اس کا مادہ " نکارہ " ہے۔ جس کے معنی ایسی چیز کے ہیں کہ جو غیر معروف اور وحشت ناک ہو۔

"یاد کر اس دن کو کہ جب لوگ پراگندہ ٹڈیوں کے مانند ہوں گے"۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے کہ "جس وقت یہ لوگ اس پکار کے بعد قبروں سے نکلیں گے تو شدتِ وحشت کی وجہ سے پکارنے والے فرشتوں کی طرف گردنیں اُٹھا کر دیکھ رہے ہوں گے"۔ (مھطعین الی الداع)۔ "مھطعین" کا مادہ "اھطاع" ہے۔ اس کے معنی گردن اُٹھا کر دیکھنے کے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس کے معنی کسی چیز کی طرف تیزی سے دوڑنے یا نگاہِ خیرہ سے دیکھنے کے لیے ہیں۔ مذکورہ معانی میں سے اس تفسیر میں ہر ایک کا احتمال ہے، اگرچہ پہلے معنی زیادہ مناسب نظر آتے ہیں، کیونکہ جب انسان کسی وحشت ناک صدا کو سُنتا ہے تو فوراً گردن اُونچی کر کے اس طرف دیکھتا ہے جہاں سے آواز آرہی ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تمام امور آیت میں اکٹھے موجود ہوں۔ یعنی وہ خدا کی طرف بلانے والے کی آواز سُننے کے بعد گردنیں اُٹھا کر خیرہ نگاہی کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہے ہوں گے اور پھر تیزی کے ساتھ اس کی طرف دوڑ پڑیں گے اور بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوں گے۔ یہ وہ دن ہے کہ اس دن برپا ہونے والے سخت حوادث کی وحشت ان کے وجود کو گھیرے گی۔ اس لیے اس آیت کے آخر میں ہے "کافر کہیں گے کہ آج سخت اور دردناک دن ہے" (یقول الکافرون ھٰذا یوم عسر) وہ دن واقعی سخت ہوگا کیونکہ خدا ان معنوں کی تصدیق کرتا ہے اور سورۂ فرقان کی آیت ۲۶ میں فرماتا ہے:

"وکان یومًا علی الکافرین عسیرًا"

"وہ کافروں کے لیے سخت دن ہے" اس تعبیر سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ دن مومنین کے لیے سخت نہیں ہوگا۔

ایک نکتہ

قیامت کا دن کیوں بہت سخت ہے؟

وہ دن سخت کیوں نہ ہو جب کہ خوف و دہشت کے تمام عوامل مجرموں کا احاطہ کیے ہوئے ہوں گے۔ جب نامۂ اعمال ان کے ہاتھوں میں دیے جائیں گے تو ان کی فریاد بلند ہوگی:

"یا ویلتنا مالھٰذا الکتاب لایغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الّا احصاھا"

"وائے ہو ہم پر یہ کیسا نامۂ اعمال ہے کہ چھوٹا یا بڑا کوئی کام ایسا نہیں جو اس میں مندرج نہ ہو" (کہف۔۴۹)

پھر یہ کہ کوئی اچھا یا بُرا، چھوٹا یا بڑا کام جو اُنہوں نے کیا ہوگا اس سب کا حساب انتہائی باریک بینی کے ساتھ کیا گیا ہوگا۔

"ان تک مثقال حبّۃ من خردل فتکن فی صخرۃ او فی السمٰوٰت او فی الارض یأت بھا اللہ ان اللہ لطیف خبیر"

"اگر خردل کے دانہ کے برابر اچھا یا بُرا عمل کسی پتھر کے اندر یا آسمانوں کے کسی گوشہ میں یا ذہن کے اندر چھُپا ہوگا تو خُدا اس کو حساب کے لیے حاضر کرے گا کیونکہ خدا باریک بیں اور آگاہ ہے"۔ (لقمان ۱۶)

تیسری بات یہ ہے کہ وہاں کسی قسم کی تلافی کا امکان نہیں ہوگا اور کوئی عُذر بھی نہیں سُنا جائے گا نیز واپسی کی راہ بھی مسدود ہوگی جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے:۔

"واتقوا یوماً لا تجزی نفس عن نفس شیئاً ولا یقبل منها شفاعة ولا یؤخذ منها عدل ولا ھم ینصرون"

"اس دن سے ڈرو کہ جس میں کوئی شخص سزا و جزا میں دوسرے کی جگہ نہیں لے گا نہ اس کے بارے میں شفاعت قبول ہوگی اور نہ تاوان یا بدل ہی قابلِ قبول ہوگا اور نہ کوئی شخص اس کی مدد کے لیے کھڑا ہوسکے گا" (بقرہ ۴۸)

پھر ہم یہ بھی پڑھتے ہیں :

"ولو ترٰی اذ وقفوا علی النار فقالوا یالیتنا نرد ولا نکذب بایات ربنا ونکون من المؤمنین"

"اگر تو ان کی حالت دیکھے جس وقت وہ جہنم کی آگ کے سامنے کھڑے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ اے کاش ہم دنیا کی طرف دوبارہ پلٹ جاتے اور اپنے پروردگار کی آیتوں کی تکذیب نہ کرتے اور مومنین میں سے ہوتے" (لیکن یہ باتیں ان سے قبول نہیں کی جائیں گی) (انعام ۲۷)

چوتھا امر یہ ہے کہ خدا کا عذاب اس قدر شدید ہے کہ مائیں اپنی اولاد کو بھول جائیں گی ، حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہوجائیں گے اور لوگ مبہوت اور مست نظر آئیں گے حالانکہ وہ مست نہیں ہوں گے۔ لیکن خدا کا عذاب شدید ہے۔

"یوم ترونها تذهل کل مرضعة عما ارضعت وتضع کل ذات حمل حملها وتری الناس سکاری وما هم بسکاری ولکن عذاب الله شدید" (حج ۲)

"اس بنا پر گنہگار اضطراب و وحشت میں اس قدر گرفتار ہوں گے کہ وہ پسند کریں گے کہ جو کچھ اس جہان میں ان کے پاس ہے اسے دے دیں اور عذابِ الٰہی سے نجات حاصل کرلیں"۔

"یود المجرم لو یفتدی من عذاب یومئذ ببنیه وصاحبته و اخیه وفصیلته التی تؤویه ومن فی الارض جمیعاً ثم ینجیه کلا انها لظی"

"مجرم خواہشمند ہوگا کہ اس دن کے عذاب سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنا بیٹا، بیوی اور رشتہ دار جو مشکلات میں اس کے مددگار تھے حتیٰ کہ تمام لوگ جو روئے زمین پر ہیں فدا کردے لیکن کوئی چیز کچھ فائدہ نہ دے گی۔ جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ اس کے انتظار میں ہے" (معارج ۱۱ تا ۱۵)

کیا ان چیزوں کے ہوتے ہوئے اور دوسری ان دل ہلا دینے والی باتوں کی موجودگی میں کہ جو قرآن میں مذکور ہیں یہ ممکن ہے کہ وہ دن سخت دردناک اور تکلیف دہ نہ ہو (خدا ہم سب کو اس دن اپنے لطف و کرم کی پناہ میں رکھے)

۹۔ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ
وَّازْدُجِرَ ۝

۱۰۔ فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ ۝

۱۱۔ فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝

۱۲۔ وَّفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَى أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝

۱۳۔ وَحَمَلْنَاهُ عَلَى ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ۝

۱۴۔ تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا جَزَاءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝

۱۵۔ وَلَقَدْ تَّرَكْنَاهَا آيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝

۱۶۔ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ۝

۱۷۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝

ترجمہ

۹۔ اس سے پہلے قوم نوح نے تکذیب کی (جی ہاں) ہمارے بندے (نوحؑ) کی اور کہا وہ دیوانہ ہے۔ اور انہیں جھڑکیاں دیں۔

۱۰۔ اُس نے بارگاہ پروردگار میں عرض کیا میں اس سرکش قوم سے مغلوب ہوں ان سے میرا

اِنتقام لے۔

۱۱۔ اس وقت ہم نے آسمانوں کے دروازے کھول دیے اور بہت زیادہ اور مسلسل پانی برسنے لگا۔

۱۲۔ اور زمین کو ہم نے شگافتہ کیا اور بہت سے چشمے نکالے اور یہ دونوں قسم کے پانی جس مقدار میں بھی تھے آپس میں مل گئے۔

۱۳۔ اور ہم نے نوحؑ کو ایک سواری (کشتی) پر کہ جو تختوں اور میخوں سے بنائی گئی تھی سوار کیا۔

۱۴۔ ایسی سواری کہ جو ہماری نگرانی میں چلتی تھی۔یہ عذاب تھا اس گروہ کے لیے کہ جو اس کا مُنکر تھا۔

۱۵۔ ہم نے یہ واقعہ نشانی کے عنوان سے اُمتوں کے درمیان باقی رکھا۔تو کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے۔

۱۶۔ اَب دیکھو کہ میرا عذاب اور تخویف دونوں کیسے تھے۔

۱۷۔ ہم نے قرآن کو ذکر کے لیے آسان قرار دیا۔تو کیا کوئی ہے کہ جو نصیحت حاصل کرے۔

تفسیر

قومِ نوحؑ کا ماجرا درسِ عبرت تھا

قرآن کی سُنّت یہ ہے کہ کفار و مجرمین کو خوف دلانے کے بعد گزشتہ قوموں کی سرگزشت اور ان کی عبرتناک عاقبت کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے تاکہ انہیں سمجھائے کہ اگر تم اپنے غلط راستے پر چلتے رہے تو تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہوگا۔ اس سُورہ میں بھی ان مباحث کے بعد کہ جو گزشتہ آیتوں میں مذکور ہوئے مختصر اور پُرمعنی اشارے گزشتہ اقوام میں سے پانچ قوموں کے متعلق موجود ہیں کہ جن میں سے پہلی قوم، قومِ نُوحؑ تھی۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "ان سے پہلے قومِ نوحؑ نے اپنے پیغمبر کی تکذیب کی" (کذبت قبلھم قوم نوح)۔ جی ہاں! اُنہوں نے ہمارے بندے نوحؑ کی تکذیب کی اور کہا کہ یہ شخص دیوانہ ہے اور اس کے بعد طرح طرح کی ایذارسانیوں کے ذریعے اسے اپنی پیغام رسانی جاری رکھنے سے منع کیا" (فکذبوا عبدنا وقالوا مجنون وازدجر)۔

"کبھی اس سے کہتے کہ اگر تو اپنے کام سے باز نہ آیا تو ہم تجھے سنگسار کر دیں گے۔"

"قالوا لئن لم تنتہ یا نوح لتکونن من المرجومین" (شعرا - ۱۱۶)

اور کبھی اس کا گلا اس طرح دباتے کہ وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑتا لیکن جب ہوش میں آتا تو کہتا:

"اللّٰھم اغفر لی لقومی فانھم لا یعلمون"

"خداوندا! میری قوم کو بخش دے یہ نہیں جانتے" [1]

خلاصہ یہ کہ جس طرح ان سے ہو سکا انہوں نے اسے ایذا پہنچائی لیکن وہ تبلیغ سے دستبردار نہ ہُوا۔ قابل توجہ یہ ہے کہ اس آیت میں تکذیب کا ذکر دو مرتبہ ہوا ہے۔ بظاہر اس بنا پر کہ پہلی مرتبہ اجمالی شکل میں ہے اور دوسری مرتبہ تفصیل کے ساتھ۔ "عبدنا" "ہمارا بندہ" سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ مغرور و سرکش قوم نوح کی نہیں بلکہ ہماری مدِ مقابل تھی۔ (وازدجر) کا جملہ اصل میں زجر سے ہے اس کے معنی دُور کرنے کے ہیں اور بلند آواز سے کسی کو دھتکارنے کے ہیں لیکن یہ لفظ ہر ایسے عمل کے لیے بولا جاتا ہے جس کا روکنا مقصود ہو۔ قابل توجہ یہ امر ہے کہ زیر بحث آیت میں "قالوا" فعل معلوم کی شکل میں آیا ہے اور (ازدجر) فعل مجہول کی شکل میں شاید اس وجہ سے کہ ان کے اعمال نوحؑ کے زجر و توبیخ کے مقابلے میں اتنے زیادہ نامناسب تھے کہ پروردگار عالم ان میں سے کسی گروہ کا نام تک لینا گوارا نہیں کرتا۔

اس کے بعد فرماتا ہے: "جس وقت نوحؑ ان کی ہدایت سے کُلّی طور پر مایوس ہو گئے تو اُنہوں نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی پروردگارا! یہ باغی اور مُجرم گروہ مجھ پر غالب آگیا ہے۔ پروردگارا! ان سے میرا انتقام لے" (فدعا ربه انی مغلوب فانتصر)۔ انہوں نے دلیل، حجت اور بُرہان کے ذریعہ مجھ پر غلبہ حاصل نہیں کیا بلکہ ظلم، تکذیب، انکار اور مختلف قسم کے دباؤ کے ذریعہ مجھ پر غلبہ حاصل کیا ہے۔ تو اَب یہ قوم باقی رہنے کے قابل نہیں ہے۔ لہٰذا ان سے میرا انتقام لے اور مجھے ان کے مقابلے میں کامیابی عطا فرمائیے [2]۔ جی ہاں! یہ عظیم پیغمبر جب تک ان کے ہدایت پانے کی اُمید رکھتا تھا اس وقت تک خدا سے دعا کرتا رہا کہ انہیں بخش دے لیکن جب بالکل مایوس ہو گیا تو پھر اس نے ان پر نفرین کی اور ان کے حق میں بددعا کی۔

اس کے بعد ان کے عذاب کی کیفیت کی طرف صاف اور دل ہلا دینے والا اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے کہ "ہم نے نوح کی اس درخواست کے بعد آسمان کے دروازے کھول دیے۔ پھر شدید اور مسلسل بارش ہونے لگی" (ففتحنا ابواب السماء بماء منھمر)۔

آسمان کے دروازوں کو کھول دینے کے الفاظ بہت ہی خوبصورت ہیں کہ جو شدید بارش کے وقت استعمال کیے جاتے ہیں جیسا کہ ہم اُردو میں بھی کہتے ہیں "گویا آسمان کے دروازے کھُل گئے اور جتنا پانی تھا سب برس گیا"۔ منھمر کا مادّہ "ھمر" بروزن "صبر" ہے اس کے معنی شدّت سے آنسوؤں کا بہنا یا پانی کا برسنا ہے۔ یہ لفظ جانور کے تھن کو دُودھ کے آخری قطرہ تک دوہنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ تعجب اس امر پر ہے کہ مفسّرین کے بعض اقوال میں آیا ہے کہ وہ برسوں سے خشک سالی کا شکار تھے اور بارش کے انتظار میں تھے

---

[1] "تفسیر کشاف" "ابوالفتوح رازی" در ذیل آیات زیر بحث۔

[2] "انتصر" کے معنی مدد طلب کرنے کے ہیں جیسا کہ سورہ شوریٰ کی آیت ۴۱ میں آیا ہے لیکن یہاں انتقام کے معنی میں ہیں۔ ایسا انتقام جو عدل و حکمت پر مبنی ہو۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ تقدیر عبارت میں "انتصر لی" تھا۔

یہاں تک کہ اچانک بارش ہونے لگی مگر زندہ کرنے والی بارش نہیں بلکہ جان سے مار دینے والی[1]

نہ صرف یہ کہ آسمان سے زیادہ پانی برسنے لگا بلکہ زمین سے بھی اُبلنے لگا جیسا کہ آیت میں آیا ہے: "اور ہم نے زمین کو شگافتہ کیا اور اس سے زیادہ چشمے نکالے"[2] (وفجرنا الارض عیونًا)۔

اور یہ دونوں پانی اتنی مقدار میں کہ جس قدر مطلوب تھے آپس میں مل گئے اور اس نے ساری زمین کو گھیر لیا۔ فالتقی الماء علیٰ امر قد قدر)۔ بعض مفسّرین نے "قد قدر" کے لفظ کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ یہ دونوں پانی پورے طور پر ایک دوسرے کی مقدار کے برابر تھے لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ساری زمین سے پانی اُبلنے لگا، چشمے نکل آئے، آسمان سے پانی برسنے لگا، یہ دونوں آپس میں مل گئے اور انہوں نے ایک عظیم سمندر اور طوفان تشکیل دیا۔ یہاں قرآن نے طوفان کے مسئلہ کو چھوڑ دیا، کیونکہ جو کچھ کہنا تھا وہ گزشتہ جملوں میں کہا جا چکا تھا۔ اب نوحؑ کی کشتیِ نجات کی طرف توجہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم نے نوحؑ کو ایک سواری پر کہ جو تختوں اور میخوں سے بنائی گئی تھی سوار کیا"۔ (وحملناہ علیٰ ذات الواح ودسر)۔ "دسر" جمع ہے "دسار" کی "کتاب" کے وزن پر جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "دسر" کے معنی کسی کو غصّہ سے دھتکارنے کے ہیں اور چونکہ میخ ان شدید چوٹوں کی وجہ سے کہ جو اس پر پڑتی ہیں، لکڑی وغیرہ میں گھس جاتی ہے اس لیے اسے دسار کہتے ہیں۔ بعض مفسّرین نے اس لفظ کے معنی طناب یعنی رسّی کے لیے ہیں۔ وہ اس سے کشتی کے بادبان کی رسّیوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ لیکن پہلے معنی علی الخصوص الواح کی مناسبت سے زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ بہرحال یہاں قرآن کی تعبیر جاذبِ توجہ اور پُرمعنی ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے کہ اس عظیم مجسّم طوفان کے درمیان کہ جو ہر چیز کو نگل گیا تھا، ہم نے حضرت نوحؑ اور ان کے اصحاب کی نجات کا فرمان مُٹھی بھر میخوں اور لکڑی کے تختوں کے سپرد کر دیا اور انہوں نے یہ ذمّہ داری عُمدہ طریقہ سے پوری کی اور یہ قُدرت کا عظیم مظاہرہ تھا۔ ممکن ہے کہ یہ قرآنی تعبیر اِس زمانے کی ترقی یافتہ صُورت رکھنے والی کشتیوں کے مقابلے میں اُس زمانے کی ان سادہ کشتیوں کی طرف اشارہ کے طور پر ہو جن میں خصوصی طور پر بیٹھنے کی جگہیں تھیں اور نہ ان کی خاص صورتیں تھیں۔

پھر بھی حضرت نوحؑ کی کشتی کافی بڑی تھی اور تاریخ کے بیان کے مطابق اس کی تعمیر کے سلسلے میں نوحؑ نے برسوں محنت اور مشقت کی تھی تاکہ مختلف جانوروں کا ایک ایک جوڑا اس میں سما سکے۔ اس کے بعد خدا اپنی خاص عنایت کے ساتھ نوحؑ کی کشتیِ نجات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ "یہ کشتی ہمارے (علم) کی نظروں کے سامنے موجوں کے سینے کو چیرتی ہوئی ہمارے مشاہدہ اور حفاظت کے ماتحت اپنے سفر کو جاری رکھے رہی" (تجری باعیننا)۔ "باعیننا" کی تعبیر (ہماری آنکھوں کے سامنے) ایک لطیف اشارہ ہے کسی چیز کی طرف خصوصی توجہ اور اس کی مکمل نگرانی کی طرف۔ ایسا ہی سورہ ہُود کی آیت ۳۷ میں بھی ہم اسی موضوع کے ایک اور حصّہ میں پاتے ہیں۔ "واصنع الفلك باعيننا ووحينا" "ہم نے اس پر وحی کی کہ ہماری نظروں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنا" بعض مفسّرین نے اس کا یہ مفہوم لیا ہے کہ یہ ان انسانوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو کشتی پر سوار تھے۔[3]

---

[1] "رُوح المعانی" زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] "عیونًا" ہو سکتا ہے کہ الارض کے لیے تمیز ہو اور تقدیر عبارت میں (فجرنا عیون الارض) ہو۔ اس کے بعد "عیون" جو کہ مفعول ہے جُدا ہوا ہے اور تمیز کی شکل میں آیا ہے تاکہ مبالغہ اور اہمیت کو بتلائے یعنی ساری زمین چشمے میں بدل گئی تھی۔

[3] "اعین" جمع ہے "عین" کی جس کے ایک معنی آنکھ اور دوسرے معنی انسان کے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی معنی ہیں۔

اس وجہ سے " تجری باعیننا " کے جملے کے معنی ہیں کہ وہ کشتی ہمارے مخلص بندوں کو ساتھ لیے ہوئے ہے لیکن قرآن کی دوسری آیتوں میں اس تعبیر کے دوسرے موارد پیشِ نظر رکھتے ہوئے پہلی تفسیر صحیح نظر آتی ہے۔

ایک یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ " باعیننا " ان فرشتوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو کشتیِ نوح کے سلسلہ میں ہدایات آئی تھیں ان میں دخل رکھتے تھے لیکن یہ تفسیر بھی اس دلیل کی بنا پر کہ جو ہم نے اُوپر بیان کی ضعیف ہے۔

اس کے بعد پروردگارِ عالم فرماتا ہے : " یہ تمام سزا تھی ان لوگوں کے لیے کہ جنھوں نے نوحؑ کی تکذیب کی اور کافر ہوئے "۔ (جزاء لمن کان کفر)[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت نوحؑ بھی دوسرے انبیاء کی طرح خدا کی بڑی مہربانیوں اور نعمتوں میں سے ایک تھے جن کی بے خبر اور جاہل افراد نے تکذیب کی اور کافر ٹھہرے[2]

اس کے بعد اس عظیم واقعہ سے نتیجہ اُخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے : " ہم نے اس واقعہ کو درس عبرت اور اُمتوں کے درمیان نشانی کے طور پر باقی رکھا ہے تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے "۔ (ولقد ترکناھا اٰیۃ فھل من مدکر)۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ وہ تمام باتیں جو اہم تھیں اس واقعہ کے ذیل میں بیان کر دی گئی ہیں اور ایک بیدار مغز انسان کو جو کچھ سمجھنا چاہیئے وہ اس واقعہ سے سمجھ سکتا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق کہ جو قبل و بعد کی آیتوں سے مطابقت رکھتی ہے " ترکناھا " کی ضمیر واقعہ طوفان، سرگزشت نوح اور ان کی مخالفت سے تعلق رکھتی ہے لیکن بعض مفسرین اسے کشتیِ نوحؑ کی طرف اشارہ قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ کشتی ایک مُدت تک عام لوگوں کے درمیان باقی رہی تھی اور جس شخص کی نظر اس پر پڑتی تھی اس کی نظروں کے سامنے طوفانِ نوحؑ کا تمام واقعہ مجسم ہو جاتا تھا اگر ہم اس روایت کو تسلیم کرلیں کہ اس کشتی کے بچے ہوئے تختے پیغمبرِ اسلامؐ کے زمانہ تک باقی تھے اور اس بات کو پیشِ نظر رکھیں کہ بعض افراد کا یہ دعویٰ تھا کہ ان کے زمانے میں اس کشتی کے بقیہ حصّے کوہ قفقاز و ارارات میں دیکھے گئے ہیں تو پھر یہ احتمال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ ایک اشارہ دونوں جانب ہو یعنی واقعہ نوح بھی ایک نشانی تھا اور لوگوں کے درمیان رہنے والی کشتی بھی ایک نشانی تھی[3]

پروردگارِ عالم بعد والی آیت میں ایک تہدید آمیز اور پُرمعنی سوال کے عنوان کے ماتحت ان کافروں کے متعلق کہ جو زمانہ نوح کے کافروں والے راستے پر چل رہے ہیں فرماتا ہے : " اب بتاؤ کہ میرا عذاب اور تخویف دلاتے والے امور کس طرح کے تھے " (فکیف کان عذابی ونذر)۔ کیا وہ حقیقت تھے یا محض ایک افسانہ؟

اس بحث سے متعلق آخری آیت میں اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ :

" ہم نے قرآن کو ذکر کے لیے آسان کیا ہے کیا کوئی ہے کہ جو نصیحت حاصل کرے " (ولقد یسّرنا القراٰن للذکر فھل من مدکر)۔

---

[1] توجہ کرنی چاہیئے کہ یہاں " کفر " فعل مجہول کی شکل میں ہے جو کہ حضرت نوحؑ کی طرف اشارہ ہے جن کی نسبت وہ لوگ کافر ہوئے تھے نہ کہ فعل معلوم ہے اور کفار کی طرف اشارہ ہے ۔ [2] اگر آیت میں کسی چیز کا مقدر نہ مانا جائے تو کفر کا نائب فاعل حضرت نوحؑ کی ذات ہوگی کہ جو وہ نعمت تھے کہ جس کا کفران ہوا اور اگر کہیں تقدیر میں کفر بہ تھا تو حضرت نوحؑ اور ان کی تعلیمات پر عدم اطمینان کی طرف اشارہ ہوگا۔

[3] قوم نوحؑ کے بارے میں ہم تفصیلی مباحث سورہ ھود کی آیت ۲۵ تا ۴۹ (جلد ۵ تفسیر نمونہ) میں تحریر کر چکے ہیں۔

بلا شک وشبہ اس قرآن میں کسی قسم کا اُلجھاؤ نہیں ہے۔ تاثیر کی تمام شرائط اس میں جمع ہیں۔ اس کے الفاظ شیریں اور پُرکشش ہیں۔ اس کی تعبیریں زندہ اور پُرمعنی ہیں۔ اس کے خوف اور بشارتیں واضح اور صریح ہیں۔ اس کی داستانیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس کے دلائل مضبُوط و مستحکم ہیں۔ اس کی منطق فصیح و بلیغ و متین ہے۔ خلاصہ یہ کہ جو کچھ کسی کلام کو پُر تاثیر بنانے کے لیے ضروری ہے وہ اس میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی آمادگی رکھنے والا دل اس کی طرف جُھکے گا تو وہ اس میں کشش محسُوس کرے گا۔

اِسلام کی طویل تاریخ میں قرآن کی اس عمیق تاثیر کے بارے میں کہ جو توجہ رکھنے والے دلوں میں موجود تھی اور اس امر (تاثیر) کی واضح شاہد تھی، عجیب وغریب شواہد ملتے ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اگر کسی تخم کا جوہرِ حیات ہی مُردہ ہو چکا ہو تو اسے اگر بہترین زمین میں بھی بو دیں اور بہترین باغبانوں کی زیرِ نگرانی اس کی آبِ کوثر سے آبیاری کریں تب بھی وہ نشوو نما نہیں پائے گا اور اِس سے پھُول اور سبزہ پیدا نہیں ہوگا۔

۱۸۔ كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ○

۱۹۔ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ○

۲۰۔ تَنزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنقَعِرٍ ○

۲۱۔ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ○

۲۲۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ○

ترجمہ

۱۸۔ قوم عاد نے (اپنے پیغمبر کی) تکذیب کی تو اب دیکھو کہ میرا عذاب اور تخویف کیسے تھے۔

۱۹۔ ایک منحوس اور طویل دن ہم نے ان کی طرف سرد تیز اور وحشت ناک آندھی بھیجی۔

۲۰۔ کہ جس نے لوگوں کو کھجور کے گھن کھائے ہوئے تنوں کی طرح اپنی جگہ سے اکھاڑ دیا۔

۲۱۔ (اب دیکھو) کہ میرا عذاب اور تخویف کس طرح کے تھے۔

۲۲۔ ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے آسان کیا ہے۔ کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے۔

تفسیر

اور اسی طرح قوم عاد کی سرگزشت

دوسری قوم کہ جس کی سرگزشت اس سورہ میں حضرت نوحؑ کی سرگزشت کے بعد آئی ہے، "قوم عاد" ہے۔ قرآن کافروں اور مجرموں کو خبردار اور متنبہ کرنے کے لیے زیر بحث آیات میں مختصر طور پر اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "قوم عاد" نے بھی اپنے پیغمبر کی تکذیب کی (کذبت عاد)۔

ان کے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام تبلیغ پر جتنا زیادہ زور دیتے اور مختلف طریقوں سے انہیں خوابِ غفلت سے جگانے کی کوشش کرتے ان کی کج فہمی اور ہٹ دھرمی میں اتنا ہی اضافہ ہوتا۔ اپنی دولت و ثروت کے غرور اور خواہشات میں مستغرق رہنے کی وجہ سے جو اُن میں غفلت آگئی تھی اس کے باعث وہ سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھ سے محروم ہو چکے تھے۔

آخرکار خدا نے انہیں دردناک عذاب کی سزا دی۔ اس لیے اس آیت کے آخر میں پروردگارِ عالم اجمالی طور پر فرماتا ہے کہ "دیکھو میرا عذاب اور تخویف کس طرح کے تھے"؟ (فکیف کان عذابی ونذر)۔

اس کے بعد والی آیت میں اس اجمال کی تفصیل پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے کہ:

"ہم نے وحشت ناک، سرد اور تیز آندھی، ایک ایسے منحوس دن کہ جو بہت طویل تھا، ان کی طرف بھیجی" (انا ارسلنا علیھم ریحًا صرصرًا فی یوم نحس مستمر)۔ "صرصر" کا مادہ "صر" بروزن شر ہے۔ اس کے معنی باندھنے اور محکم کرنے کے ہیں۔ صرصر کے لفظ میں اس کی تکرار تاکید کے لیے ہے اور چونکہ یہ ہوا سرد، شدید، پُرسوز اور گونج سے بھری تھی، اس وجہ سے یہ لفظ اس کے لیے استعمال ہوا ہے۔ نحس اصل میں اس شدید سُرخی کے معنوں میں ہے جو کبھی کبھی اُفق پر نمودار ہوتی ہے اور اس طرح وہ شعلہ ہے جس میں دُھواں نہ ہو۔ عرب اسے "نحاس" کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ لفظ ہر اس منحوس کے لیے استعمال ہوا ہے جو نیک کے مقابل ہو۔ "مستمر" "یوم" کی یا "نحس" کی صفت ہے۔ پہلی صورت میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس دن کے حوادث اسی طرح طولانی تھے جس طرح کہ سورہ حاقہ کی آیت ۷ میں مذکور ہیں "سات رات اور آٹھ دن یہ عذابِ الٰہی ان پر مسلط رہا۔ یہاں تک کہ اس نے سب کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور کسی کو زندہ نہ چھوڑا"۔

دوسری صورت میں اس کے معنی یہ ہیں کہ اس دن کی صورت برقرار رہی یہاں تک کہ سب کو ہلاک کر دیا۔

بعض مفسّرین نے نحس کے معنی گرد و غبار سے لبریز کے لیے ہیں اس لیے کہ یہ آندھی اس قدر غبار آلود تھی کہ وہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جب یہ آندھی دُور سے ظاہر ہوئی تو وہ یہ سمجھے کہ گھنگھور گھٹا ان کی طرف آ رہی ہے لیکن بہت جلد وہ سمجھ گئے کہ تیز آندھی ہے جو ان پر عذاب کی صُورت میں ہلاک کرنے کے لیے وارد ہوئی ہے۔ سورہ احقاف کی آیت ۲۴ میں آیا ہے۔ "فلما راوہ عارضًا مستقبل اودیتھم قالوا ھٰذا عارض ممطرنا بل ھو ما استعجلتم بہ ریح فیھا عذاب الیم"

یہ دونوں تفسیریں ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ آیت کے معنوں میں دونوں مفہوم موجود ہوں۔ اس کے بعد اس تیز آندھی کی کیفیّت کے بارے میں پروردگارِ عالم فرماتا ہے کہ "لوگوں کو گھُن کھائے ہوئے کھجور کے تنوں کی طرح اُکھاڑ دیا اور وہ ان کو ہر طرف پھینکتی تھی۔ (تنزع الناس کانھم اعجاز نخل منقعر)۔ "منقعر" کا مادہ "قعر" ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کا سب سے نیچے کا نقطہ۔ اس لیے یہ لفظ جڑ سے اکھاڑنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ مفہوم یا تو اس بنا پر ہے کہ قوم عاد کے لوگ قوی الجثہ تھے اور سخت جسم رکھتے تھے یا یہ کہ انہوں نے تیز آندھی سے بچنے کے لیے زمین میں گڑھے کھود رکھے تھے اور زیرِ زمین پناہ گاہیں بنا رکھی تھیں لیکن اس روز آنے والی آندھی اتنی زور دار اور طاقتور تھی کہ ان کو ان کی پناہ گاہوں سے باہر نکالتی تھی اور اِدھر اُدھر پھینکتی تھی۔ وہ ان کو اس زور سے زمین پر پٹختی تھی کہ ان کے سر تن سے جُدا ہو جاتے تھے۔ "اعجاز" جمع "عجز" "رجل کے وزن پر"۔ عجز کے معنی ہیں کسی چیز کا نچلا یا پچھلا حصّہ۔ ان لوگوں کو کھجوروں کے تنوں کے نچلے حصّہ سے تشبیہ اس لیے دی ہے کہ وہ ہوا پہلے ان کے سروں اور ہاتھوں

کو جُدا کر کے اپنے ساتھ اُڑا کر لے جاتی تھی اور اس کے بعد بدن کے باقی حصّہ کو بے شاخ و برگ کھجور کے تنے کی طرح جا بجا جس طرف پھینک دیتی تھی۔ یا اس وجہ سے کہ، جیسا کہ ہم نے اُوپر اشارہ کیا ہے، ہوا اس قدر تیز تھی کہ وہ ان کو سر کے بل زمین پر گراتی تھی اور ان کی گردنوں کو توڑ کر سروں کو الگ کر دیتی تھی۔

اس کے بعد قرآن تنبیہ کے طور پر کہتا ہے: "اب دیکھو کہ میرا عذاب اور میری تخویف کس طرح کی تھی" (فکیف کان عذابی ونذر)۔ ہم نے دوسری ایسی قوموں کے ساتھ کہ جنہوں نے تکذیب، کبر و غرور اور گناہ و عصیان کا راستہ اختیار کیا تھا اس طرح کا سلوک کیا ہے تو تم اپنے بارے میں کیا سوچتے ہو کیونکہ تم بھی تو اُنہی کے راستے پر چل رہے ہو۔ پھر اس واقعہ کے آخر میں مزید کہتا ہے: "ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے آسان کر دیا ہے تو کیا کوئی ہے کہ جو پند و نصیحت حاصل کرے۔ کیا تم خدا کی طرف سے آنے والی تنبیہ و تخویف کے لیے کوئی دیکھنے والی آنکھ رکھتے ہو" (ولقد یسّرنا القراٰن للذکر فهل من مدّکر)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ: فکیف کان عذابی ونذر کے جملے کی قوم عاد کے بارے میں تکرار ہوئی ہے یعنی وہ دو مرتبہ استعمال ہوا ہے ایک تو اس سرگزشت کے بیان کے آغاز میں اور ایک مرتبہ اس کے آخر میں۔ یہ بات غالباً اس لیے ہے کہ اس گروہ پر آنے والا عذاب دوسری قوموں پر آنے والے عذاب کی نسبت زیادہ شدید اور وحشت ناک تھا۔ اگرچہ سارے عذاب شدید ہی ہوتے ہیں۔

ایک نکتہ

نیک اور بد دن

یہ بات لوگوں کے معمولات میں سے ہے کہ وہ بعض ایام کو نیک اور بعض کو نحس قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ اس نیک یا منحوس ہونے کے تعین کے بارے میں اختلافات بھی بہت ہیں۔ یہاں گفتگو یہ ہے کہ آیا یہ عقیدہ اسلام کے نقطۂ نظر سے قابلِ قبول ہے یا نہیں یا پھر کیا یہ نظریہ اسلام سے اخذ کیا گیا ہے؟۔ بہرکیف یہ نظریہ عقلی طور پر محال نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے زمانے کے اجزا ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہوں اور ان میں فرق موجود ہو۔ بعض اجزا میں نحوست کے اثرات ہوں اور بعض میں اس کی ضد کے اثرات ہوں، اگرچہ کسی دن کو منحوس اور کسی کو نیک ثابت کرنے کے لیے ہمارے پاس عقلی دلیلیں نہیں ہیں۔ پس اس قدر ہم کہہ سکتے ہیں کہ "یہ ممکن ہے" لیکن عقلی لحاظ سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ اگر شریعتِ محمدیہ کی طرف سے، اس وحی الٰہی کے ذریعہ کہ جو نہایت وسیع آفاق کو ظاہر کرتی ہے، ہمارے پاس دلیلیں ہوں تو ان کے قبول کرنے میں ہمارے لیے کوئی امر مانع نہیں ہے بلکہ اس کا ماننا ہمارے لیے ضروری ہے۔

آیاتِ قرآنی میں صرف دو مواقع ایسے ہیں جن میں "دنوں کی نحوست" کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک تو زیرِ بحث آیتوں میں اور دوسرے سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۱۶ میں کہ جہاں اسی قوم عاد کے بارے میں گفتگو ہے۔ وہاں ہمیں یہ ملتا ہے کہ (فارسلنا علیهم ریحاً صرصراً فی ایّام نحسات) "ہم نے سخت تیز اور سرد آندھی منحوس دنوں میں ان پر مسلّط کی"۔ [1]

---

[1] توجہ کرنی چاہیئے کہ "نحسات" اس آیت میں "ایّام" کی صفت ہے یعنی ایام مذکور کی نحوست کے ساتھ توصیف ہوئی ہے جب کہ زیرِ بحث آیات میں (فی یوم نحس مستمر) "یوم" کی "نحس" کی طرف اضافت ہوئی ہے۔ اور وہ وصفی معنی نہیں رکھتا البتہ اُوپر والی آیت کے قرینے سے ہمیں کہنا چاہیئے کہ یہاں موصوف کی صفت کی طرف اضافت کی وجہ سے ہے۔

اس کے برعکس لفظ "مبارک" کی تعبیر بھی بعض آیاتِ قرآنی میں ہمیں نظر آتی ہے۔ چنانچہ شب قدر کے بارے میں پروردگارِ عالم فرماتا ہے: انّا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ "ہم نے قرآن کو بابرکت رات میں نازل کیا" (دخان۔۳) نحس اصل میں جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے عرض کیا ہے اُفق کی شدید سُرخی کے معنی میں ہے کہ جو اُسے "نحاس" یعنی آگ کے اُس شدید شعلے کی شکل میں پیش کرتا ہے جو دھوئیں سے خالی ہو۔ پھر اسی مناسبت سے "شوم و منحوس" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس طرح قرآن اس مسئلہ کے بارے میں اجمالی اشارہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کہتا لیکن اسلامی روایات میں "ایامِ نحس و سعد" سے متعلق بہت سی روایات ہم تک پہنچی ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بہت سی روایات و احادیث ضعیف ہیں اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں پھر بھی ان روایات میں ایسی چیزیں موجود ہیں جو قابلِ وثوق ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا آیتوں کی تفسیر میں مفسّرین نے اس کی تائید کی ہے۔ محدّثِ اعظم علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ نے بھی اس سلسلہ میں بہت سی روایتیں بحارالانوار میں نقل کی ہیں[1]۔

یہاں مختصراً جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے:

(الف) بہت سی روایتوں میں نیک اور منحوس دن ان حادثات سے متعلق ہونے کی وجہ سے کہ جو ان دنوں میں واقع ہوئے ہیں تفسیر کے ذیل میں مذکور ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک روایت میں حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ کی زبانی ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے، بدھ کی جو بدشگونیاں مشہور ہیں، ان کے بارے میں سوال کیا اور پوچھا کہ یہ کونسا بُدھ کا دن ہے تو آپ نے فرمایا:

آخر اربعاء فی الشھر وھو المحاق وفیہ قتل قابیل ھابیل اخاہ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ویوم الاربعاء ارسل اللہ عزوجل الریح علیٰ قوم عاد

مہینے کا آخری بدھ کہ جو محاق میں واقع ہو۔ اس دن قابیل نے اپنے بھائی ھابیل کو قتل کیا تھا ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ اور خدا نے اسی بُدھ کو تیز آندھی قومِ عاد کی طرف بھیجی تھی[2]۔

اس لیے بہت سے مفسّرین متعدد روایات کی پیروی کرتے ہوئے مہینے کے آخری بدھ کو منحوس سمجھتے ہیں اور اسے (اربعاء لا تدور) وہ بُدھ مانتے ہیں کہ جو پلٹ کر نہیں آتا۔ بعض دوسری روایتوں میں ہمیں ملتا ہے کہ مہینے کی پہلی تاریخ نیک ہوتی ہے کیونکہ حضرت آدمؑ اسی تاریخ کو پیدا ہوئے تھے۔ اسی طرح ۲۶ ویں تاریخ کیونکہ خدا نے دریائے نیل کو حضرت موسٰیؑ کے لیے اسی تاریخ کو شگافتہ کیا تھا[3]۔

یا یہ کہ مہینے کی تیسری تاریخ نحس ہے کیونکہ اس تاریخ کو حضرت آدمؑ و حوّاؑ جنّت سے نکالے گئے تھے اور جنّت کا لباس ان کے بدن سے اُتارا گیا تھا[4]۔ یا یہ کہ مہینے کی ساتویں تاریخ مُبارک ہے کیونکہ اس تاریخ کو حضرت نوحؑ اپنی کشتی پر سوار ہوئے (اور انہوں نے غرق ہونے سے نجات پائی)[5]۔

---

[1] بحارالانوار جلد ۵۹ کتاب السماء والعالم ص ۱ تا ۹۱ اور کچھ اس کے بعد۔

[2] تفسیر نورالثقلین جلد ۵ ص ۱۸۳ (حدیث ۲۵)

[3] گزشتہ مدرک ص ۱۰۵

[4] تفسیر نورالثقلین جلد ۵ ص ۵۸

[5] تفسیر نورالثقلین ج ۵ ص ۶۱

یا پھر یہ کہ نوروز کے سلسلہ میں امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث ہماری نظر سے گزرتی ہے۔ آپ نے فرمایا یہ وہ دن ہے کہ "کشتی نوحؑ کوہِ جودی پر آکر ٹھہری اور جبرئیل پیغمبرِ اسلامؐ پر نازل ہوئے اور یہی وہ دن بھی ہے کہ حضرت علیؑ نے دوشِ پیغمبرؐ پر سوار ہوکر بتوں کو توڑا اور واقعہ غدیر بھی نوروز ہی کو واقع ہوا۔[1]

روایتوں میں اس قسم کی اطلاعات عام ہیں کہ جو دنوں کی نحوست اور نیکی کو اچھے واقعات اور ناپسندیدہ حوادث سے وابستہ کرتی ہیں خصوصاً روزِ عاشورہ کہ جسے بنو اُمیہ اہلبیت کے مقابلہ میں کامیاب ہونے کی وجہ سے نیک دن شمار کرتے ہیں ہماری روایتوں میں اس دن کو بابرکت قرار دینے کی شدت سے مخالفت کی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اس دن کو آذوقہ و مال کے ذخیرہ وغیرہ کا دن قرار نہ دیا جائے بلکہ اس روز اپنے کاروبار کی تعطیل کی جائے اور عملی طور پر بنو اُمیہ سے اپنا نظام الاوقات مختلف قرار دیں۔ ان روایات کے مجموعہ کی وجہ سے بعض لوگوں نے نیک اور بد ایام کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ اسلام کا مقصد مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کرنا ہے کہ وہ عملی طور پر خود کو ان تاریخی واقعات کے ساتھ مربوط رکھیں اور ناپسندیدہ حوادث اور ان کی بُنیاد رکھنے والے لوگوں سے احتراز کریں۔ یہ تفسیر، ممکن ہے کہ، ان روایتوں کے ایک حصہ کے بارے میں ٹھیک ہو لیکن سب کے بارے میں یقیناً ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ان میں سے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک پوشیدہ تاثیر بعض دنوں سے تعلق رکھتی ہے جس سے ہم آگاہ نہیں ہیں۔

(ب) یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ بعض لوگ نیک و بد ایام کے بارے میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ جس کام کو وہ کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے وہ ایام کے نیک و بد کی تلاش میں لگ جاتے ہیں اور عملی طور پر بہت سے ضروری کاموں سے غافل ہو جاتے ہیں اور کئی سنہرے مواقع ہاتھ سے کھو دیتے ہیں، یا پھر یہ کہ بجائے اس کے کہ اپنی اور دوسروں کی شکست و کامیابی کے اسباب و عوامل کی تحقیق کریں اور زندگی کے گراں بہا تجربات سے فائدہ اُٹھائیں، وہ یہ کرتے ہیں کہ اپنی تمام ناکامیوں کا ذمہ دار اور کامیابیوں کا سبب ایام کی نحوست اور ان کے سعد ہونے کو سمجھتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا حقیقت سے فرار ہے اور افراط کا شکار ہونا ہے۔ نیز حوادثِ زندگی کی نامعقول توجیہ ہے۔ اس قسم کے طرزِ عمل سے شدت کے ساتھ پرہیز کرنا چاہیئے اور عامۃ الناس میں جو چیزیں مشہور ہیں ان کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیئے۔ نجومیوں اور فال نکالنے والوں کی پیشین گوئیوں کو بھی نظر انداز کرنا چاہیئے۔

صرف معتبر حدیث ایک ایسی چیز ہے کہ اس کی رُو سے اگر کوئی حقیقت ثابت ہو تو اسے صدقِ دل سے تسلیم کر لینا چاہیئے۔ اس کے علاوہ دوسرے جتنے عوامل ہیں ان کو نظر انداز کر کے زندگی کے کام کرنے چاہئیں اور کاوشِ پیہم سے کام لے کر زندگی کی راہ میں قدم آگے بڑھانا چاہیئے، خدا پر توکل رکھنا اور اس کے لُطف و کرم سے مدد طلب کرنا سب سے مقدم ہے۔

(ج) دنوں کے نیک و بد کی طرف توجہ کرنا نہ صرف یہ کہ انسان کے دل و دماغ کو تاریخی حوادث سے رُوشناس کراتا ہے بلکہ پروردگارِ عالم کی ذات والا صفات کے ساتھ توسّل کرنے کی توفیق بھی بخشتا ہے نیز اس سے امداد طلبی کا درس دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایسی متعدد روایات پڑھتے ہیں کہ وہ ایام جن کو نحس قرار دیا گیا ہے ان میں ہمیں صدقہ دینے، دُعا مانگنے اور پروردگارِ عالم سے مدد طلب کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ہم قرآن پاک کی تلاوت کریں، ذاتِ خدا پر توکل رکھیں۔ صرف اسی صُورت میں ہم اپنی جدوجہد میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ منجملہ دیگر باتوں کے ہم حدیث میں ایک ایسے واقعہ سے باخبر ہوتے ہیں کہ امام حسن عسکری علیہ السلام

---

[1] بحارالانوار ج ۵۹ ص ۹۲

کے ایک محبِ منگل کو خدمتِ امام میں وارد ہوئے تو امامؑ نے فرمایا کہ مَیں نے تمہیں کل نہیں دیکھا۔ وہ عرض کرنے لگا کہ میں پیر کو کہیں آنا جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا: (من احب ان یقیه الله شر یوم الاثنین فلیقرأ فی اول رکعة من صلاة الغداة هل اتیٰ علی الانسان ثم قرأ ابوالحسنؑ فوقهم الله شر ذالك الیوم ولقّٰهم نضرة وسرورًا) "جو شخص پسند کرتا ہے کہ پیر کے شر سے محفوظ رہے تو وہ نمازِ فجر کی پہلی رکعت میں سُورہ "هل اتیٰ علی الانسان" تلاوت کرے۔ پھر امامؑ نے سُورہ هل اتیٰ کی اس آیت کی کہ جو دفعِ شر کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے، تلاوت فرمائی فوقاهم الله شر ذالك الیوم..." خُدا نیک لوگوں کو قیامت کے دن کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ وہ انہیں ظاہری مسرتیں اور باطنی خوشحالی عطا کرے گا۔[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ چھٹے امام کے اصحاب میں سے ایک شخص نے آپ سے پوچھا کیا کسی صُورت میں بُدھ جیسے مکروہ اور ناپسندیدہ دن میں سفر کرنا مناسب ہے؟ امام نے فرمایا کہ اپنے سفر کا آغاز صدقہ سے کرو اور روانگی کے وقت آیت الکرسی کی تلاوت کرلو۔ (اور پھر جہاں کہیں جانا چاہتے ہو چلے جاؤ)۔[2]

ایک اور حدیث میں ہے کہ دسویں امام علی نقیؑ کا ایک صحابی کہتا ہے کہ مَیں امامؑ کی خدمت میں پہنچا، اس حالت میں کہ راستے میں میری اُنگلی زخمی ہوگئی تھی اور اثنائے راہ میں ایک سوار نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے میرے کاندھے پر ضرب بھی لگائی تھی اور مَیں ایک ہجوم میں پھنس کر رہ گیا تھا جنھوں نے میرے کپڑے پھاڑ دیے تھے تو مَیں نے اس دن کو مخاطب کرکے کہا کہ خدا مجھے تیرے شر سے محفوظ رکھے تو کیسا منحوس دن ہے۔ یہ سُن کر امامؑ نے فرمایا کہ تو ہم سے عقیدت بھی رکھتا ہے اور پھر ایسی نامناسب بات زبان پر لاتا ہے۔ وہ دن کہ جس کی کوئی ذمّہ داری نہیں ہے تو اسے ذمّہ دار قرار دیتا ہے۔ وہ شخص بیان کرتا ہے کہ امامؑ کی بات سُن کر مَیں سنبھلا اور مَیں نے محسوس کیا کہ مَیں نے غلطی کی ہے۔ میں نے عرض کیا مولا میں خدا سے اپنی غلطی کے سلسلہ میں استغفار کرتا ہوں اور اس سے اپنی بخشش طلب کرتا ہوں۔ پھر امامؑ نے مزید فرمایا: ماذنب الایام حتیٰ صرتم تتشأمون بها اذا جوزیتم باعمالکم فیها "دِنوں کا کیا قصور ہے کہ تم انہیں منحوس قرار دیتے ہو حالانکہ صورتِ حال یہ ہے کہ تمہاری اپنی پستیٔ کردار تمہیں گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔" اس شخص نے کہا کہ فرزندِ رسولؐ میں ہمیشہ کے لیے خدا سے استغفار کرتا ہوں اور اس سے توبہ کرتا ہوں۔ تو امامؑ نے فرمایا: (ماینفعکم ولکن الله یعاقبکم بذمها علی ما لاذم علیها فیه اما علمت ان الله هو المثیب والمعاقب والمجازی بالاعمال عاجلا واٰجلا؟ قلت: بلیٰ یا مولای، قال لاتعد ولاتجعل للایام صنعًا فی حکم الله)۔ یہ چیز تمہارے لیے فائدہ نہیں رکھتی۔ خدا تمہیں اس چیز کی مذمّت کرنے کی سزا دیتا ہے کہ جو قابلِ مذمّت نہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ خدا ہی جزا و سزا دیتا ہے؟ وہ بندوں کو اعمال کی جزا و سزا اس دنیا میں بھی دیتا ہے اور اس جہان میں بھی دے گا۔ پھر فرمایا ایسی بات آئندہ زبان پر مت لانا اور دنوں کے بارے میں حکمِ خدا کے برخلاف اثرات قرار نہ دینا۔[3]

یہ پُرمعنی حدیث اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ دنوں کی اگر کوئی تاثیر ہے تو وہ حکمِ خدا کے مطابق ہے لہٰذا ان کے لیے مستقل تاثیر کا کبھی قائل نہیں ہونا چاہیے اور اپنے آپ کو پروردگارِ عالم کے لطف و کرم سے بے نیاز نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ حوادث کہ جو عام طور پر انسان کے غلط افعال و اعمال کا کفّارہ ہوتے ہیں انہیں دنوں کی تاثیر سے منسُوب نہیں کرنا چاہیے اور اس طرح خُود کو بری الذمّہ قرار نہیں دینا چاہیے۔ ممکن ہے کہ امام کا یہ بیان اس باب کی مختلف احادیث کے جمع کرنے کی بہترین راہ ہو۔

---

[1] بحارالانوار ج ۵۹ ص ۳۹ حدیث ۷، [2] وہی مدرک ص ۲۸، [3] "تحف العقول" مطابق نقل بحارالانوار جلد ۵۹ ص ۲ (مختصر سی تلخیص کے ساتھ)

۲۳۔ كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذُرِ ۝

۲۴۔ فَقَالُوا أَبَشَرًا مِنَّا وَاحِدًا نَتَّبِعُهُ إِنَّا إِذًا لَفِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ۝

۲۵۔ أَأُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌ ۝

۲۶۔ سَيَعْلَمُونَ غَدًا مَنِ الْكَذَّابُ الْأَشِرُ ۝

۲۷۔ إِنَّا مُرْسِلُو النَّاقَةِ فِتْنَةً لَهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ۝

۲۸۔ وَنَبِّئْهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُحْتَضَرٌ ۝

۲۹۔ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَى فَعَقَرَ ۝

۳۰۔ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ۝

۳۱۔ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمِ
الْمُحْتَظِرِ ۝

۳۲۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ ۝

ترجمہ

۲۳۔ قوم ثمود نے بھی تخویفِ خدا کی تردید کی۔

۲۴۔ اور کہا کہ کیا ہم اپنے جیسے ہی ایک بشر کی پیروی کریں، اور اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم جنون اور گمراہی کا شکار ہوں گے۔

۲۵۔ کیا ہمارے درمیان صرف اس شخص پر وحی نازل ہوئی ہے؟ نہیں وہ بہت ہی جھوٹا ہے اور ہوس کا شکار ہے۔

۲۶۔ لیکن کل انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون جھوٹا اور خواہش کا پرستار ہے۔

۲۷۔ ہم ناقہ کو ان کی آزمائش کے لیے بھیجیں گے۔ تو ان کے انجام کے انتظار میں رہ اور صبر کر۔

۲۸۔ اور انہیں بتا دے کہ بستی کا پانی ان کے درمیان تقسیم ہونا چاہیئے (ایک دن ناقہ کے لیے اور دُوسرا دن ان کے لیے) اور ہر ایک کو اپنے مقررہ وقت پر حاضر ہونا چاہیئے۔

۲۹۔ انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو پکارا۔ وہ اس کام کے لیے آیا اور (ناقہ) کی کونچیں کاٹ دیں۔

۳۰۔ اَب دیکھو کہ میرا عذاب اور تخویف کیسے تھے۔

۳۱۔ ہم نے ان کی طرف صرف ایک چیخ بھیجی جس کے بعد وہ سب ایسی خشک گھاس میں تبدیل ہو گئے کہ جسے چوپاؤں کے مالک اپنے باڑہ میں جمع کرتے ہیں۔

۳۲۔ ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے آسان کیا ہے پس کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے۔

تفسیر

قومِ ثمود کا دردناک انجام

وہ تیسری قوم کہ جس کی زندگی کی داستان، مختصر طور پر، درسِ عبرت کے عنوان سے گزشتہ مباحث کے بعد اس سُورہ میں پیش ہوئی، قومِ ثمود ہے کہ جو سرزمین "حجر" میں، کہ جو حجاز کے شمال میں واقع ہے، رہائش پذیر تھے۔ ان کے پیغمبر حضرتِ صالحؑ نے انتہائی کوشش کی کہ وہ ہدایت پالیں لیکن ان کی تمام محنت رائیگاں گئی۔

پروردگارِ عالم اس سلسلے میں پہلے فرماتا ہے کہ "قومِ ثمود نے بھی خدائی تنبیہ کی تکذیب کی اور اس کی طرف سے دیے جانے والے خوف کی کوئی پرواہ نہیں کی" (كذبت ثمود بالنذر) اگرچہ بعض مفسّرین نے یہاں "نذر" کو ڈرانے والے پیغمبروں کے معنی میں لیا ہے اور قومِ ثمود کے حضرتِ صالحؑ کی تکذیب کرنے کو تمام پیغمبروں کی تکذیب قرار دیا ہے۔ وہ اس لیے کہ تمام پیغمبروں کی دعوت تبلیغ ہم آہنگ ہوتی ہے لیکن ظاہرِ آیت یہ ہے "نذر" یہاں "انذار" کی جمع کے طور پر آیا ہے اور اس سے مُراد تخویف یعنی ڈرانا ہے اور یہ قدرتی طور پر ہر پیغمبر کے کلام میں موجود ہے۔ اس کے بعد پروردگارِ عالم ان لوگوں کی طرف سے جو تکذیب کی گئی اس کی علت کو پیش کرتے ہوئے، فرماتا ہے: "انہوں نے کہا کیا ہم اپنی نوع کے ایک انسان کی پیروی کریں؟ اگر ایسا کریں تو گمراہی اور جنون میں مبتلا ہوں گے" (فقالوا ابشرا منا واحدا نتبعه انا اذا لفى ضلال وسعر)۔

جی ہاں، کبر و غرور، خُود بینی و خُود پسندی، ان کے لیے انبیا کی دعوتِ فکر کے مقابلہ میں ایک عظیم حجاب تھے۔ انہوں نے کہا صالحؑ ہم جیسا ہی ایک شخص ہے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کی پیروی کریں۔ اگر ایسا کریں گے تو جنون اور گمراہی میں مبتلا ہوں گے۔ وہ ہمارے مقابلہ میں کونسا امتیاز رکھتا ہے جو رہبر بنے اور ہم اس کی پیروی کریں۔ یہ وہی اعتراض ہے کہ جو گمراہ اُمتیں زیادہ تر اپنے پیغمبروں پر کیا کرتی تھیں کہ وہ ہماری ہی طرح کے افراد ہیں لہٰذا خدا کے پیغمبر کس طرح ہو سکتے ہیں۔ مفسّرین کی ایک جماعت نے "واحدا" کی تعبیر سے اس طرح استفادہ کیا ہے کہ صالحؑ کے دُشمنوں کی مُراد یہ تھی کہ وہ ایک عام شخص ہے۔ زیادہ مال و دولت نہیں رکھتا۔ اس کا کوئی عظیم نام و نسب بھی نہیں ہے۔ بعض نے اس کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ وہ فردِ واحد ہے۔ اس کا اپنا کوئی گروہ نہیں ہے۔ حالانکہ رہبر کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی ایسے گروہ کا مالک ہو جس پر اسے اختیار حاصل ہو۔ وہ اس امتیاز کے ذریعے دوسروں کو اپنی طرف بلائے۔

یہاں ایک تیسری تفسیر بھی ہے، وہ یہ کہ وہ لوگ "واحدِ عددی" پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا اعتقاد "واحدِ نوعی" پر تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہماری ہی جنس و نوع کا فرد ہے اور نوعِ بشر رسالتِ الٰہی کا عہدہ نہیں سنبھال سکتی۔ پیغمبر کو فرشتوں کی نوع میں سے ہونا چاہیئے تھا۔ تینوں تفسیروں کو ایک جگہ جمع کرنا ممکن ہے لیکن بہرحال ان کا دعویٰ بے بنیاد تھا۔ "سعر" بروزن "شتر" ہے جمع اس کی سعیر ہے۔ مفہوم اس کا بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ اسی لیے پاگل اُونٹنی کو "ناقۂ مسعورہ" کہتے ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ قومِ ثمود نے یہ تعبیر اپنے پیغمبر صالحؑ سے لی ہو کہ جو ان سے کہتے تھے کہ اگر تم بُت پرستی سے باز نہ آئے اور میری دعوتِ حق کی پیروی نہ کی تو "ضلال وسعر" (گمراہی اور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ) میں ہو گے۔ تو وہ جواب میں کہتے: "اگر ہم اپنے جیسے

بشر کی پیروی کریں تو " ضلال و سعر " میں ہوں گے ۔ بہرحال " سعر " کا ذکر جمع کی شکل میں حقیقتاً دوام اور تاکید کے لیے ہے خواہ جنون کے معنی میں ہو یا بھڑکتی ہوئی آگ کے معنوں میں ۔ اس کے بعد وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر بفرض محال وحی الٰہی کسی انسان ہی پر نازل ہوتی ہے تو کیا ہمارے درمیان میں اسی کم حیثیت پر وحی نازل ہوئی ہے ؛ حالانکہ زیادہ جانے پہچانے مشہور اور دولت مند افراد مل سکتے تھے (ء القی الذکر علیه من بیننا) ۔

حقیقت یہ تھی کہ قوم ثمود کی باتیں مشرکین مکہ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی تھیں جو کبھی یہ اعتراض کرتے تھے کہ مال ھٰذا الرسول یأکل الطعام ویمشی فی الاسواق لولا انزل الیه ملك فیکون معه نذیرًا " یہ پیغمبر کھانا کیوں کھاتا ہے اور بازار میں چلتا پھرتا ہے ۔ فرشتہ کیوں نہیں نازل ہوا جو اس کے ساتھ مل کر تخویف کا فرض انجام دیتا ۔ (فرقان -۷) کبھی وہ کہتے : لولا نزل هٰذا القراٰن علٰی رجل من القریتین عظیم " یہ قرآن مکہ اور طائف کے کسی بڑے اور دولت مند شخص پر کیوں نہیں نازل ہوا " (زخرف -۳۱) ۔ اَب بنیادِ کلام یہ ہے کہ خدا کا رسول کوئی بشر ہی ہو تو پھر کوئی تہی دست بے کس اور بے کار بشر ہی کیوں ہو ۔ یہ دل کے اندھے کہ جو گویا پورے دَورِ تاریخ میں ایک ہی طرح کی باتیں کرتے تھے یعنی اگر کوئی شخص صاحب مال و دولت ہو کسی اُونچے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہو ، مقام و منصب کے اعتبار سے بلند ہو اور شہرت بھی رکھتا ہو تو وہ تو خدا کا رسول ہو سکتا ہے ۔ معمولی شخص کس طرح رسول ہو سکتا ہے حالانکہ جو لوگ ظالم و جابر ہوتے تھے وہ زیادہ تر ایسے ہی دولت مند نام نہاد طبقوں سے تعلق رکھتے تھے ۔

اس تفسیر میں بعض مفسرین نے اس نقطۂ نظر کو بھی تسلیم کیا ہے کہ وہ لوگ کہتے تھے کہ کیا وحی صرف اس شخص پر نازل ہوئی ہے ۔ ہم سب پر نازل کیوں نہیں ہوئی ۔ ہمارے اور اس کے درمیان کیا فرق ہے جیسا کہ سُورہ مدثر کی آیت نمبر ۵۲ میں آیا ہے : بل یرید کل امرئ منهم ان یؤتٰی صحفاً منشرة " بلکہ ان میں سے ہر شخص توقع رکھتا ہے کہ اس پر آسمان سے کتابیں نازل ہوں " ۔ اس کے بعد پروردگارِ عالم آیت کے آخر میں فرماتا ہے : " انہوں نے اس موضوع کو اپنے پیغمبر صالحؑ کے کذب کی دلیل قرار دیا اور کہا کہ وہ بہت جھوٹا ، نفس پرست اور متکبر شخص ہے " (بل هو کذّاب اشر) ۔ وہ اس لیے کہ وہ چاہتا ہے کہ ہم پر حکومت کرے اور ہر چیز اپنے قبضہ میں رکھے اور اپنی خوشی کے مطابق کام کرے ۔ لفظ " اشر " کا مادہ " اشر " بروزن قمر ہے جس کے معنی ہیں ایسی خوشحالی جس میں نفس پرستی شامل ہو ۔ لیکن قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے " کل ان کی سمجھ میں آجائے گا کہ کونسا شخص جھوٹا اور نفس پرست ہے " (سیعلمون غدًا من الکذّاب الاشر) ۔ وہ وقت کہ جب عذاب الٰہی نازل ہوگا اور ان کی سرکوبی کرے گا اور ان کو ایک مُشتِ خاک میں تبدیل کر دے گا اور " موت کے بعد کا عذاب " اس پر مستزاد ہوگا تو یہ سمجھ لیں گے کہ ان باتوں کا تعلق کس قسم کے افراد کے ساتھ ہو سکتا ہے اور یہ پوشاک کس کے جسم سے مناسبت رکھتی ہے ۔

یہ بات واضح ہے کہ " غدًا " کل سے مُراد مستقبل قریب ہے اور یہ مفہوم پُرکشش بھی ہے اور لطیف بھی ۔ ممکن ہے یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ جس وقت یہ آیتیں نازل ہوئی ہوں تو وہ اپنے عذاب کو واقعی دیکھ چکے ہوں ۔ لہٰذا اَب اس بات کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہ کہا جائے کہ کل وہ سمجھ لیں گے کہ جھوٹا اور نفس پرست کون ہے ۔ اس سوال کے دو جواب دیئے جا سکتے ہیں ۔ پہلا یہ کہ حقیقت میں یہ بات خدا نے اپنے پیغمبر صالحؑ سے کہی تھی اور بعد والے دن کے ساتھ مشروط کر کے کہی گئی تھی اور یہ واضح حقیقت ہے کہ جس دن یہ بات کہی گئی اس دن تک عذاب نازل نہیں ہوا تھا ۔

دوسرے یہ کہ کل سے مراد روزِ قیامت ہو کہ جس روز ہر چیز نہایت واضح طور پر سامنے آئے گی۔ (پہلی تفسیر زیادہ مناسب اور بعد والی آیتوں کے ساتھ زیادہ سازگار ہے)۔ یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشرکینِ قوم ثمود نے نزولِ عذاب سے پہلے ہی صالحؑ کی حقانیت کو سمجھ لیا تھا اور ان کے ناقابلِ تردید معجزہ کو دیکھ چکے تھے تو پھر ان سے کیوں کہا جاتا ہے کہ یہ کل سمجھ لیں گے۔ اس سوال کا جواب بھی ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ کسی چیز کے جاننے کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ ممکن ہوتا ہے کہ مقابل اس کا انکار کر دے لیکن بعض اوقات وہ ایسے مرحلے میں پہنچ جاتا ہے کہ پھر اس کے لیے گنجائش انکار باقی نہیں رہتی اور ہر چیز بالکل واضح انداز میں نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ علم یعنی جاننے سے یہاں سمجھ لینے کی یہی انتہا مراد ہے۔ اس کے بعد پروردگارِ عالم صالحؑ کے ناقہ کی جو ایک معجزہ تھا اور ان کی صداقت کی سند کے طور پر بھیجا گیا تھا، داستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "صالح کی طرف ہم نے وحی کی کہ ہم ناقہ کو ان کی آزمائش اور امتحان کے لیے بھیجیں گے لہٰذا آپ ان کے انجام کار کا انتظار کریں اور صبر سے کام لیں" (انا مرسلوا الناقة فتنة لهم فارتقبهم واصطبر)۔ "ناقہ" وہی اُونٹنی کہ جو حضرت صالحؑ کے معجزہ کی حیثیت سے بھیجی گئی تھی، کوئی عام اُونٹنی نہیں تھی بلکہ معجز نما کیفیتوں کی حامل تھی۔ مشہور روایتوں کی رُو سے یہ اُونٹنی پہاڑ کے ایک پتھر سے برآمد ہوئی تھی تاکہ وہ کج فہم اور ہٹ دھرم منکرین کے لیے ایک منہ بولتا معجزہ ثابت ہو۔ "فتنہ" جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں، سونے کی کٹھالی میں ڈال کر آگ پر پگھلا کر اس کے کھرے ہونے کو ثابت کرنے کے لیے ہے۔ اور یہ ہر طرح کے امتحان اور آزمائش کے لیے بولا جاتا ہے۔

یہ امر بالکل واضح ہے کہ قوم ثمود اب ایک عظیم آزمائش میں ڈالی جانے والی تھی۔ اس لیے بعد والی آیت میں پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "ہم نے صالح سے کہا کہ انہیں بتا دے کہ بستی کا پانی ان کے درمیان تقسیم ہونا چاہیئے۔ (ایک دن ناقہ کے لیے اور ایک دن بستی والوں کے لیے) اس طرح ایک فریق کو اپنے مقررہ دن پانی استعمال کرنا چاہیئے اور دوسرے کو مداخلت نہیں کرنی چاہیئے۔ (ونبئهم ان الماء قسمة بينهم كل شرب محتضر)[1]

اگرچہ قرآن نے اس سلسلہ میں اس سے زیادہ وضاحت نہیں کی لیکن بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ صالحؑ کی اُونٹنی کے پانی پینے کا جو دن ہوتا تھا، اس دن وہ سارا پانی پی جاتی تھی لیکن بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ اس کی ہیئت کذائی ایسی تھی کہ جس وقت وہ پانی کے قریب آتی تو دوسرے جانور بھاگ جاتے تھے اور اس کے پاس نہیں پھٹکتے تھے۔ لہٰذا اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ ایک دن پانی پینے کا حق اس اُونٹنی کو دیا جائے اور دوسرے دن ان لوگوں کے اختیار میں ہو۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ، جیسا کہ کچھ مفسرین نے کہا ہے کہ، ان کی آبادی میں پانی بہت کم تھا۔ اگرچہ یہ معنی آیت ۱۴۶ تا ۱۴۸ سے مناسبت نہیں رکھتے، کیونکہ ان آیتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم ایسی سرزمین میں زندگی بسر کرتی تھی جو باغوں اور چشموں سے پُر تھی۔ بہرکیف اس سرکش، ہٹ دھرم اور مفاد پرست قوم نے یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ ناقہ صالحؑ کو ختم کر دیں حالانکہ صالحؑ انہیں خبردار کر چکے تھے کہ اگر انہوں نے ناقہ کو کوئی اذیت پہنچائی تو جلد ہی ان پر عذابِ الٰہی نازل ہو جائے گا لیکن انہوں نے اس امر کی کوئی پرواہ نہیں کی اور "اپنے ایک ساتھی کو آواز دی وہ اس کام کے لیے آیا اور اس نے ناقہ کی کونچیں کاٹ دیں" (فنادوا صاحبهم فتعاطى فعقر)۔ "صاحب" سے

---

[1] "محتضر" کا مادّہ حضور ہے۔ یہ اسم مفعول ہے اور "شرب" پانی کے حصّہ یا مقررہ وقت کے معنوں میں ہے۔ اس بنا پر "کل شرب محتضر" کے معنی یہ ہیں کہ ہر مقررہ وقت پر جس کو اجازت ہے وہ پانی پیئے گا اور دوسرا اس روز نہیں آئے گا اور اُسے مزاحمت کا حق نہیں ہوگا۔

یہاں مُراد ممکن ہے کہ قوم عاد کا کوئی سَردار ہو۔ ان لوگوں میں کا ایک بہت ہی شریر شخص " قدارہ بن سالف " تھا[1] جس کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔ تعاطی کسی چیز کو پکڑنے یا کسی مقصد کے لیے جدوجہد کرنے کے معنی میں ہے۔ نیز اہم اور خطرناک کاموں کے انجام دینے کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ جس کام میں زحمت بہت ہو یا اس کی کوئی مزدوری مقرر کی گئی ہو، اس کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ یہ تمام مفاہیم زیرِ بحث آیت میں موجود ہیں اور وُہ اس لیے کہ مذکورہ ناقہ کو قتل کرنے کے لیے اچھی خاصی جرأت اور جسارت کی ضرورت تھی۔ اس کام کے لیے مشقت بھی درکار تھی اور حسبِ قاعدہ انہوں نے اس کام کے لیے اُجرت بھی مقرر کی تھی۔

"عقر" کا مادہ "عقر" ہے جو ظلم کے وزن پر ہے اور بنیاد اور جڑ کے معنوں میں ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن یہاں ناقہ کے قتل کو ایک فرد کی طرف منسوب کرتا ہے جب کہ سُورہ والشمس میں پوری قوم کی طرف منسُوب کرتے ہوئے فرماتا ہے: " فعقروھا " قوم ثمود نے ناقہ کو مار ڈالا۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ناقہ کو مار ڈالنے والے ایک شخص نے پوری قوم کی رضامندی سے ان سب کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ کام کیا تھا اور ہم جانتے ہیں کہ جو شخص کسی دوسرے کے کام سے خوش ہو وہ اس میں شریک ہوتا ہے۔[2]

بعض روایات میں آیا ہے کہ قدارہ نے پہلے شراب پی پھر نشہ کی حالت میں اس نے اس امرِ قبیح کو سرانجام دیا۔ ناقہ کے قتل اور اس کی کیفیت کے بیان بھی مختلف قسم کے ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ تلوار سے اس کی کونچیں کاٹیں۔ بعض کا قول ہے کہ پہلے وہ اس کی گھات میں بیٹھا پھر اس کے تیر مارا آخر میں اس پر تلوار سے حملہ آور ہوا۔ بعد والی آیت اس سرکش قوم پر آنے والے وحشت ناک عذاب کے ذکر کے لیے ایک تمہید کی حیثیت رکھتی ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے: " اب دیکھو کہ میرا عذاب اور میری تخویف کس طرح کی تھی۔" (فکیف کان عذابی ونذر)۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: " ہم نے ان کی طرف ایک چیخ بھیجی جس کے نتیجے میں وہ ایسی خشک اور روندی ہوئی گھاس کی طرح ہو گئے کہ جس کو گڈریا اپنے جانوروں کے لیے باڑہ میں جمع کرتا ہے۔" (انا ارسلنا علیھم صیحة واحدة فکانوا کھشیم المحتظر)۔ "صیحة " سے یہاں مُراد ایک عظیم آواز ہے کہ جو آسمان سے اُٹھتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ ایک وحشت ناک چیخ کی طرف اشارہ ہو کہ جو ان کے شہر میں سنائی دی جیسا کہ سورہ حٰمٓ سجدہ کی آیت ۱۳ میں آیا ہے: فان اعرضوا فقل انذرتکم صاعقة مثل صاعقة عاد وثمود " اگر وہ رُوگردانی کریں تو ان سے کہہ دے کہ مَیں تمہیں قوم ثمود و عاد کے صاعقے سے مشابہ صاعقہ سے ڈراتا ہوں۔"

"ھشیم" کا مادّہ "ھشم" بروزن "خشم" ہے۔ یہ کمزور چیزوں کے توڑنے کے معنی میں آتا ہے۔ یہ اس کٹری ہوئی گھاس کے لیے بولا جاتا ہے جو گوسفندوں کے مالک گوسفندوں کے لیے کاٹ کر رکھتے ہیں۔ کبھی اس خشک گھاس کو بھی کہا جاتا ہے جو جانوروں کے قدموں کے نیچے باڑہ میں روندی جاتی ہے۔ "محتظر" کا مادّہ "حظر" بروزن "مغز" ہے۔ اس کے معنی منع کرنے کے ہیں۔ اسی لیے اس باڑہ کو جو بھیڑ بکریوں وغیرہ کے لیے بنایا جاتا ہے اور جو انہیں باہر نکلنے سے روکتا ہے اور وحشی جانوروں کے حملے سے بچاتا ہے، حظیرہ کہتے ہیں اور "محتظر" بروزن "محتسب" وہ شخص ہے جو باڑہ کا مالک ہو۔ وہ مفہوم کہ جو اس آیت میں قوم ثمود پر نازل ہونے والے عذاب کو لیے ہوئے ہے بہت ہی عجیب اور پُرمعنی ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے اس سرکش قوم کو نیست و نابود کرنے کے لیے زمین یا آسمان سے لشکر ہی ہرگز روانہ

---

[1] " قدارہ " بروزن " منارہ " ایک قبیح صُورت بدسیرت اور شوم ترین فرد تھا۔

[2] اس مطلب کی تشریح ہم نے "پیوند مکتبی" کے عنوان کے ماتحت جلد ۵ سورۂ ھود کی آیت ۶۵ کے ذیل میں بیان کی ہے۔

نہیں کیے۔ صرف ایک آسمانی چیخ سے، ایک ایسی آواز سے کہ جو کانوں کے پردے پھاڑ دے، ایک پھاڑ دینے والی عظیم موج سے کہ جس نے اپنے راستے کی ہر چیز کو ایک وسیع و عریض چمک کی لپیٹ میں لے لیا ہوا نہیں کوٹ پیس کر رکھ دیا اور ختم کر ڈالا۔

ان کے آباد محل اور مکانات گوسفندوں کے باڑوں کی طرح ہوگئے اور ان کے بے جان لاشے اس کٹی ہوئی خشک گھاس کی طرح ہوگئے کہ جو بھیڑ بکریوں کے قدموں کے نیچے روندی جاتی ہے۔

مذکورہ صورتِ حال گزشتہ لوگوں کے لیے ممکن ہے کہ مشکل ہو لیکن اس زمانے کے لوگوں کے لیے جو کسی چیز کے پھٹنے اور دھماکے سے پیدا ہونے والی ان موجوں کے اثرات سے باخبر ہیں، جو اپنے دائرۂ اثر میں آنے والی ہر چیز کو پیس کر رکھ دیتی ہیں، نہایت آسانی سے قابلِ فہم ہے۔ ہاں البتہ عذابِ الٰہی کی گڑگڑاہٹ کا انسانوں کے بنائے ہوئے بموں کی گڑگڑاہٹ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر ان لوگوں پر اس صاعقہ سے نازل ہونے والی مصیبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا بحث کو پیش کرنے والی آیتوں میں سب سے آخری آیت میں اس دردناک اور عبرت انگیز سرگزشت کے خاتمہ پر پروردگارِ عالم دوبارہ فرماتا ہے کہ:

"ہم نے قرآن کو نصیحت اور انسانوں کے بیدار کرنے کے لیے آسان کیا ہے تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے"؟

(ولقد یسّرنا القراٰن للذکر فهل من مدکر)۔

قرآن کے مفاہیم زندہ اور واضح ہیں، اس کے واقعات اور داستانیں زبانِ حال سے گویا ہیں اور اس کی تخویف و تہدید دل ہلا دینے والی اور بیدار کرنے والی ہے۔

۳۳۔ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍ بِالنُّذُرِ ○

۳۴۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ○

۳۵۔ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ○

۳۶۔ وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ○

۳۷۔ وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا
عَذَابِيْ وَنُذُرِ ○

۳۸۔ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ○

۳۹۔ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ○

۴۰۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ○

ترجمہ

۳۳۔ قوم لوط نے اپنے پیغمبر کی طرف سے کی گئی تخویف کی پے در پے تکذیب کی۔

۳۴۔ ہم نے ان پر ایسی آندھی بھیجی کہ جو سنگریزوں کو اڑاتی تھی (اور ہم نے سب کو ہلاک کر دیا)،
سوائے لوطؑ کے گھر والوں کے کہ سحر کے وقت ہم نے ان کو نجات دی۔

۳۵۔ یہ نعمت تھی ہماری طرف سے۔ ہم اس طرح شکر گزار کو جزا دیتے ہیں۔

۳۶۔ اس نے انہیں ہماری سزاؤں سے ڈرایا لیکن وہ ایک تو شک سے کام لیتے تھے ، دُوسرے جھگڑا کرتے تھے۔

۳۷۔ اُنہوں نے لُوطؑ سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے مہمانوں کو ان کے قبضہ میں دے دیں لیکن ہم نے ان کی آنکھیں اندھی کر دیں اور انہیں نیست و نابُود کر دیا (اور کہا کہ) ہمارے عذاب اور تخویف کا مزہ چکھو۔

۳۸۔ آخر کار صبح کے وقت دن کے پہلے حصّہ میں پائیدار اور واقعی عذاب ان پر آپہنچا۔

۳۹۔ (اور ہم نے کہا) اَب ہمارے عذاب اور تخویف کا مزہ چکھو۔

۴۰۔ ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کیا ہے۔کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے ؟

تفسیر

قومِ لُوط زیادہ منحوس صُورتِ حال سے دوچار ہُوئی

اِن آیتوں میں واقعۂ قوم لوطؑ اور اس گمراہ اور بے شرم گروہ پر نازل ہونے والے وحشت ناک عذاب کے بارے میں مختصر اور دل ہلا دینے والے اشارے پائے جاتے ہیں۔

اِس سورہ میں گزشتہ اقوام کی سرگزشت کا یہ چوتھا حصّہ ہے۔

پروردگارِ عالم پہلے فرماتا ہے : " قومِ لُوط نے اپنے پیغمبر کی پے دَر پے تخویف کی تردید کی"۔ (کذبت قوم لوط بالنذر)

" نذر" جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے " انذار" کی جمع ہے جس کے معنی خوف دلانے اور متنبہ کرنے کے ہیں۔ اس تخویف کا ذکر جمع کے صیغوں کے ساتھ بہت ممکن ہے کہ اس عظیم پیغمبر کی پے در پے تنبیہوں کی طرف اشارہ ہو کہ اس کج فہم قوم نے ان تمام ڈرانے والی باتوں کو جھٹلایا۔ یا پھر یہ اشارہ ہے حضرت لوطؑ اور ان سے پہلے آنے والے پیغمبروں کی طرف سے کی جانے والی تنبیہوں کی طرف کیونکہ تمام پیغمبروں کی دعوتِ حق ایک ہی حقیقت کو لیے ہوئے ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک مختصر سے جملے میں ان کے عذاب کے ایک گوشہ اور حضرت لوطؑ کے گھر والوں کی نجات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : " ہم نے ان پر وہ تیز آندھی کہ جو سنگریزوں کو اُڑاتی تھی، بھیجی"۔ (انا ارسلنا علیھم حاصبًا) اور ان سب کو سنگریزوں کی اس بارش میں دفن کر دیا۔ " سوائے لوطؑ کے

خاندان کے کہ ہم نے ان کو سحر کے وقت اس سرزمین بلا سے نجات دی" (الّا اٰل لوط نجّینا هم بسحر)۔

"حاصب" اس تیز آندھی کے معنوں میں ہے کہ جو "حصباء" ریت اور سنگریزوں کو اُڑائے۔

قرآن کی دوسری آیتوں میں جہاں قوم لُوط پر نازل ہونے والے عذاب کا ذکر ہوتا ہے، اس زلزلے کے علاوہ کہ جس نے ان کے شہروں کو زیر وزبر کرکے رکھ دیا تھا، پتھروں کی بارش کا بھی تذکرہ ہوتا ہے۔ چنانچہ سُورہ ھود کی آیت ۸۲ میں ہمیں ملتا ہے۔ فلما جاء امرنا جعلنا عالیها سافلها و امطرنا علیها حجارة من سجیل منضود ۔ "جس وقت ہمارا فرمان آگیا تو ہم نے اس شہر کو زیر وزبر کر دیا اور اس پر سخت اور پتھریلی مٹی کے پتھروں کی بارش کی"۔

کیا یہ دو قسم کے عذاب تھے؟ ایک تو تیز آندھی کہ جو اپنے ساتھ سنگریزوں اور ریگ بیابان کو اُڑاتی تھی اور ان کی سرکوبی کرتی تھی، دوسرے آسمانی پتھروں کی بارش؟ یا یہ کہ دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔

بعض اوقات بڑی بڑی آندھیاں بیابان کے گرد و غبار، سنگریزوں اور خاک کے تودوں کو اُٹھا کر آسمان کی طرف لے جاتی ہیں اور جس وقت طوفان کا دباؤ کم ہوتا ہے تو ایک ہی مرتبہ ان چیزوں کو کسی دوسری جگہ پھینک دیتی ہیں۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ یہاں حکم خدا سے گرد آلود آندھی اس بات پر مامور ہو کہ بیابان کے سنگریزوں اور خاک کے تودوں کو فضائے آسمانی کی طرف اُٹھا کر لے جائے اور تباہ و ویران کر دینے والے زلزلے کے بعد انہیں قوم لوطؑ کے شہروں پر پھینک دے اور اس کے کج بنیوں کو ان کے نیچے دفن کر دے اس حد تک کہ ان کے شہروں کے ویرانے بھی صفحۂ زمین سے مٹ جائیں تاکہ یہ صُورتِ حال ہمیشہ کے لیے دوسرے لوگوں کے واسطے درسِ عبرت بن جائے۔[1]

اُوپر والی آیت ضمناً یہ بھی بتاتی ہے کہ حضرت لُوطؑ کے خاندان کی نجات صبح کے وقت ہوئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس ستم شعار قوم پر نازل ہونے والے عذاب کا وعدہ بھی صبح کے وقت کا تھا۔ اس لیے یہ خانوادہ، جو صاحبِ ایمان تھا، آخرِ شب میں (سوائے لوط کی بیوی کے کہ جس نے اپنا راستہ لوطؑ سے علیحدہ اختیار کیا تھا) شہر سے باہر چلا گیا۔ ان کے جانے کے بعد تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ پہلے زلزلہ آیا، اس کے بعد پتھروں کی بارش شروع ہوئی جیسا کہ سُورۂ ھُود کی آیت ۸۱ میں آیا ہے۔ فاسر باهلك بقطع من اللیل ولا یلتفت منكم احد الّا امرأتك انه مصیبها ما اصابهم ان موعدهم الصبح الیس الصبح بقریب ۔ "رات کے ایک حصّہ میں اپنے گھر والوں کو لے کر روانہ ہو جاؤ اور تم میں سے کوئی بھی پیچھے مُڑ کر نہ دیکھے سوائے تمہاری بیوی کے کہ وہ بھی اسی بلا میں گرفتار ہوگی جس میں سب مُبتلا ہوں گے۔ ان کی وعدہ گاہ صبح ہے۔ کیا صبح نزدیک نہیں ہے؟"

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض مفسّرین نے اربابِ لُغت کی پیروی کرتے ہوئے سحر کے معنی بین الطلوعین کے لیے ہیں یہ معنی اُوپر والی آیت کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔[2]

بعد والی آیت میں تاکید کے لیے ارشاد ہوا ہے۔ "خاندانِ لُوطؑ کی نجات ہماری طرف سے ایک نعمت تھی۔ جی ہاں! اسی طرح

---

[1] اس سلسلہ میں دوسرے مباحث جلد ۹ تفسیر نمونہ سُورۂ ھُود کی آیت ۸۲ کے ذیل میں بیان ہو چکے ہیں۔

[2] راغب مفردات میں کہتا ہے: (السحر اختلاط ظلام اٰخر اللیل بضیاء النهار) آخر شب کی تاریکی کا دن کی روشنی کے ساتھ مل جانا سحر کہلاتا ہے۔

اس شخص کو کہ جو شکر گزاری کرے ہم اجر دیتے ہیں۔" (نعمۃ من عندنا کذالك نجزی من شکر)۔[1]

بعد والی آیت میں یہ حقیقت پیش کی گئی ہے کہ لوطؑ نے پہلے سے ان پر اتمام حجت کر دیا تھا اور انہیں عذاب الٰہی سے آگاہ کیا تھا لیکن انہوں نے خدا کی طرف سے کی جانے والی تنبیہ میں شک کیا اور وہ لڑنے جھگڑنے پر آمادہ رہے۔ (ولقد انذرھم بطشتنا فتماروا بالنذر)۔ "بطش" بروزن "فرش" کسی چیز کو طاقت کے ساتھ پکڑنے کے معنی ہیں اور چونکہ سزا دیتے وقت پہلے مجرم کو مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں لہٰذا یہ لفظ سزا کے معنی میں بھی آتا ہے۔ "تماروا" کا مادّہ "تماری" ہے۔ اس کے معنی شک کرنے کے اور حق کے مقابلے میں جھگڑنے والی گفتگو کے ہیں۔

اُنہوں نے درحقیقت ایک دوسرے کی مدد کی تھی اور مختلف طریقوں سے عام لوگوں کے ذہنوں میں شبہات پیدا کیے تھے تاکہ اس عظیم پیغمبر کی طرف سے جو تنبیہ کی جا رہی تھی اس کے اثرات کو زائل کر دیں۔ اُنہوں نے لوگوں کے دلوں میں اعتقادات سے متعلق شبہات پیدا کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بدکاری و بے شرمی میں اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ جس وقت عذاب پر مامور فرشتے خوبصورت نوجوانوں کی صورت میں مہمانوں کی حیثیت سے حضرت لوطؑ کے گھر میں داخل ہوئے تو یہ بے شرم گروہ ان کے پاس آیا اور جیسا کہ بعد والی آیت کہتی ہے: "اُنہوں نے لوطؑ سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے مہمان اُن کی تحویل میں دے دیں۔" (ولقد راودوہ عن ضیفہ)۔ حضرت لوطؑ اس بات پر بے حد پریشان ہوئے اور ان لوگوں سے اصرار کیا کہ وہ ان کی اتنی بے عزتی نہ کریں یہاں تک کہ سورہ حجر کی آیت ۷۱ کے مطابق ان سے وعدہ کیا کہ (ان بداعمالیوں سے توبہ کی صورت میں) اپنی لڑکیوں کی شادی ان سے کر دیں گے یہ چیز اس مظلوم پیغمبر کی انتہائی مظلومیت کو ظاہر کرتی ہے کہ جو اس بے شرم اور بے ایمان قوم کی طرف سے ان کے لیے روا رکھی گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس حملہ کرنے والے گروہ نے اپنی پہلی سزا پا لی جیسا کہ خدا اسی آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "ہم نے ان کی آنکھوں کو اندھا ہی نہیں کیا بلکہ غائب کر دیا اور ان سے کہا کہ میرے عذاب اور میری تخویف کا مزہ چکھو۔" (فطمسنا اعینھم فذوقوا عذابی ونذر)۔

جی ہاں یہ وہ مقام تھا کہ قادرِ مطلق نے اپنی عدالت کا کرشمہ دکھایا اور بعض مفسرین کے بقول جبرئیل کو حکم دیا کہ اپنے شہپران سرکشوں کی آنکھوں پر ماریں جس کے نتیجے میں وہ فوراً نابینا ہو گئے یہاں تک کہ ان کی آنکھیں بالکل غائب ہو گئیں۔

اگرچہ آیت میں گفتگو اس مفہوم کو واضح نہیں کرتی کہ وہ کون لوگ تھے کہ جو فرشتوں کے پیچھے پیچھے آئے تھے لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ پوری قوم لوطؑ نہیں آئی تھی۔ وہ ایسے اوباش لوگ تھے جو بدکاری میں سب سے آگے تھے۔ اُنہوں نے اس کام میں پیش قدمی کی اور اس طرح ان کی سرگزشت دوسرے لوگوں کے لیے درسِ عبرت بنی کیونکہ وہ اسی حالتِ زار میں اپنے گروہ کے پاس لوٹ کر آئے لیکن ان میں کوئی ایسا فرد موجود نہیں تھا کہ جو اس ابتدائی عذاب سے عبرت حاصل کرنے کے لیے آمادہ ہوتا۔

یہ جو کہتے ہیں کہ خدا نے ان پر نازل ہونے والے عذاب کو صبح تک روکے رکھا اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ حادثہ ایک روز پہلے واقع ہوا اور اس طرح انہیں مہلت دی گئی کہ وہ ایک رات اور اپنے حالات کے بارے میں غور و فکر کر لیں اور ان بدبخت اندھے ہونے والے افراد کی شکلوں پر عذابِ الٰہی کا نمونہ دیکھیں۔ ممکن ہے کہ اُنہیں ہوش آ جائے اور وہ توبہ کر لیں لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔

---

[1] نعمۃ ایک فعل مقدر کا کہ جو اس کی جنس سے ہے "مفعول بہ" ہے یا "نجینا" کے فعل کا کہ جو پہلے والی آیت میں آیا ہے مفعول لہ ہے۔

ایک روایت کے مطابق خود ان نابیناؤں نے بھی کوئی عبرت حاصل نہیں کی۔ وہ جس وقت دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے اپنے گھروں کی طرف لوٹے تو انہوں نے قسم کھائی کہ کل صبح وہ خاندان لوطؑ کا ایک فرد بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔[1]

آخر کار انتہائی عذاب ان پر نازل ہو گیا۔ ایک ایسا تباہ کن زلزلہ آیا کہ جس نے سورج کی پہلی شعاع کے ظاہر ہونے کے ساتھ ہی ان کی زمین کو متزلزل کر کے رکھ دیا جس کے نتیجے میں ان کے شہر منہدم ہو کر رہ گئے، جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور وہ مٹی کے نیچے دَب گئے۔ ان کے سروں پر پتھروں کی شدید بارش ہوئی یہاں تک کہ ان کے ویرانوں کے نشانات بھی باقی نہ رہے۔ جیساکہ بعد والی آیت میں بڑے اختصار کے ساتھ اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "آخر کار صبح کے وقت پائیدار اور واقعی عذاب ان پر نازل ہوا" (ولقد صبحهم بكرة عذاب مستقر)۔ جی ہاں مختصر سے لحات میں یہ سب چیزیں ختم ہو گئیں اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ "بكرة" (دن کا آغاز) کا لفظ اس لیے آیا ہے کہ "صبحهم" بہت وسیع معانی رکھتا ہے۔ یہ صبح کے تمام معانی کا احاطہ کرتا ہے جب کہ مفہومِ کلام صبح کی بالکل ابتداء سے متعلق تھا۔ یہ واقعہ طلوعِ فجر کی بالکل ابتداء میں ہوا تھا یا طلوعِ آفتاب کے آغاز میں صحیح طور پر معلوم نہیں ہے لیکن "بكرة" کا مفہوم طلوعِ آفتاب کے آغاز سے تعلق رکھتا ہے۔ لفظ "مستقر" ثابت و برقرار کے معنی میں ہے اور یہاں ہو سکتا ہے کہ اس طرف اشارہ ہو کہ یہ عذاب استقدر سر کچلنے والا، قوی اور طاقتور تھا کہ دُنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

بعض مفسرین نے ان معانی کی نشان دہی بھی کی ہے کہ چونکہ دُنیاوی عذاب برزخ کے عذاب سے متصل ہو چکا تھا لہٰذا "مستقر" کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد پروردگارِ عالم فرماتا ہے اور یہ دوبارہ ان سے کہا گیا ہے: "اب میرے عذاب اور میری تخویف کا مزہ چکھو" (فذوقوا عذابي ونذر)۔ تاکہ پھر کبھی پیغمبروں کی طرف سے ہوئی تنبیہ کو شک کی نظر سے نہ دیکھو۔ یہ جملہ اس واقعہ میں دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ لیکن یہ بات معلوم ہے کہ پہلا جملہ تو اس ابتدائی عذاب کی طرف اشارہ ہے جس کے نتیجے میں وہ لوگ نابینا ہو گئے تھے جنہوں نے لوطؑ کے گھر پر ہجوم کیا تھا۔ دوسرا جملہ عذابِ واقعی و اصلی یعنی ویران کرنے والے زلزلے اور پتھروں کی بارش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ آخر میں زیر بحث آیات میں سے سب سے آخری آیت میں درج ذیل پُرمعنی اور ہوش میں لانے والے جملے کی چوتھی مرتبہ تکرار ہوئی ہے: "ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے آسان کیا ہے تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟" (ولقد يسرنا القرآن للذكر فهل من مدكر)۔ قومِ لوطؑ نے کوئی نصیحت حاصل نہیں کی، نہ تنبیہ سے نہ ابتدائی عذاب سے۔ کیا ایسے دوسرے لوگ کہ جو اس قسم کے گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں ان آیاتِ قرآنی کی سماعت کے بعد اپنے ہوش میں آئیں گے اور گناہوں سے توبہ کریں گے؟

---

[1] تفسیر "نور الثقلین" ج ۵ ص ۱۸۵

۴۱۔ وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۚ
۴۲۔ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ○
۴۳۔ اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِى الزُّبُرِ ۚ
۴۴۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ○
۴۵۔ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ○
۴۶۔ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ○

ترجمہ

۴۱۔ تخویف اور تنبیہ آل فرعون کے لیے آئیں۔
۴۲۔ لیکن ان سب نے ہماری آیات کی تکذیب کی، ہم نے ان کی گرفت کی اور ان پر عذاب نازل کیا۔
۴۳۔ کیا تمہارے کفار ان سے بہتر ہیں؟ یا تمہارے لیے کُتب آسمانی میں امان نامہ نازل ہوا ہے؟
۴۴۔ یا یہ کہ وُہ کہتے ہیں ہم ایک ایسی جماعت ہیں جو متحد قوی اور کامیاب ہے۔
۴۵۔ لیکن وہ جان لیں کہ ان کی جماعت عنقریب شکست کھا جائے گی اور وہ فرار کی راہ اختیار کرلیں گے۔

۴۶۔ (اس کے علاوہ) قیامت ان کی وعدہ گاہ ہے اور قیامت کا عذاب زیادہ ہولناک اور تلخ ہے۔

تفسیر

کیا تم گزشتہ اقوام سے افضل و برتر ہو؟

اس سلسلۂ کلام میں پانچویں اور آخری جس قوم کی طرف اشارہ ہوتا ہے وہ قوم فرعون ہے لیکن چونکہ اس قوم کی سرگزشت قرآن کی مختلف سورتوں میں تفصیلی طور پر آئی ہے لہذا یہاں صرف ایک مختصر لیکن جچا تُلا اشارہ ان کی عبرت انگیز داستان کی طرف ہوا ہے۔ پروردگار عالم ارشاد فرماتا ہے: "ہماری تنبیہیں یکے بعد دیگرے آل فرعون کی طرف آئیں۔" (ولقد جاء اٰل فرعون النذر)۔ آل فرعون سے مُراد صرف فرعون کا خاندان اور اس سے وابستہ افراد نہیں ہیں بلکہ یہ لفظ ان کے تمام پیروکاروں پر حاوی ہے۔ لفظ "آل" عموماً اہل بیت اور خاندان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن بعض اوقات، جیسا کہ ہم نے کہا ہے، ایک وسیع معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرینۂ کلام بتاتا ہے کہ یہاں یہ لفظ اسی وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے "نذر" (بروزن کتب) "نذیر" کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ڈرانے والا۔ یہ ڈرانے والا خواہ کوئی انسان ہو یا حادثہ کہ جو انسانوں کو خبردار کرے، انہیں ان کے انجام کار سے ڈرائے اور بچنے کی تلقین کرے۔ پہلی صورت میں ممکن ہے کہ اُوپر والی آیت کا اشارہ مُوسیٰؑ اور ہارونؑ کی طرف ہو۔ دوسری صورت میں ممکن ہے کہ حضرت مُوسیٰؑ کے نو معجزوں کی طرف اشارہ ہو۔ بعد والی آیت بتاتی ہے کہ یہاں دوسرے معنی مناسب ہیں۔[1]

خدا کے ان دو عظیم پیغمبروں کے مقابلے میں اور ان کی تہدید و تنبیہ کے مقابلے میں آل فرعون کا جو ردِّ عمل ہے، اس پر سے پردہ اُٹھاتے ہوئے بعد والی آیت میں پروردگار عالم فرماتا ہے:

"اُنہوں نے ہماری سب آیات کی تکذیب کی۔" (کذبوا باٰیاتنا کلها)۔ جی ہاں ان خُود پسند مغرور اور ظالم و جابر لوگوں نے بلا استثناء خدا کی تمام آیتوں کی تکذیب کی۔ ان کو جھُوٹ، سحر یا اتفاقی حوادث بتایا۔

لفظ "آیات" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ معجزات پر بھی حاوی ہے لیکن سُورہ اسرا کی آیت ۱۰۱ کے قرینہ سے ' ولقد اٰتینا موسٰی تسع اٰیات بیّنات ۔ " ہم نے مُوسیٰ کو نو واضح معجزات عطا کیے"، معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اِنہی نو معجزات کی طرف اشارہ ہے۔[2]

---

[1] توجہ کرنی چاہیئے کہ "نذر" "نذیر" کی جمع بھی ہے اور مصدر یا اسم مصدر کے معنی بھی رکھتا ہے اور چونکہ مصدر کا صفت کی حیثیت سے بھی اطلاق ہوتا ہے لہذا دونوں ایک ہی مفہوم کی طرف پلٹ سکتے ہیں۔

[2] "موسیٰؑ کے نو معجزات" قرآن کی مختلف آیتوں پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتے ہیں۔ (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

اگر انسان حقیقت کا متلاشی ہو تو ان معجزوں میں سے کسی ایک کا پہلے سے خوف محسوس کرتے ہوئے دیکھنا اور اس کے بعد خدا کے پیغمبر کی دُعا کے وسیلے سے مصیبت کا برطرف ہو جانا اس کے لیے کافی ہے لیکن جس وقت انسان بالکل ہی ہٹ دھرم بن جائے تو پھر آسمان و زمین سر سے پا تک آیت خدا بن جائیں تو بھی مؤثر نہیں ہو سکتے۔ صرف عذاب الٰہی کو آکر ایسے پُرغرور دماغوں کو کچلنا چاہیئے۔ چنانچہ زیر بحث آیت کے ذیل میں ہمیں ملتا ہے کہ " ہم نے ان کی گرفت کی اور انہیں سزا دی۔ گرفت اس کی کہ جو کبھی مغلوب نہیں ہوتا اور مقتدر و توانا ہے " (فاخذناهم اخذ عزيز مقتدر) ." اخذ " پکڑنے اور گرفت کرنے کے معنیٰ میں ہے۔ چونکہ مُجرم کو سزا دینے کے لیے پہلے اُسے اپنے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں لہذا یہ لفظ سزا و عذاب کے کنائے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جو مفہوم اس واقعہ کے ذیل میں آیا ہے وہ تمام سرگزشتوں میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ وہ اس وجہ سے کہ فرعونی اپنی طاقت اور قوت پر سب سے زیادہ فخر و مباہات کرتے تھے اور ان کی اس قوت و طاقت کی ہر جگہ شہرت تھی۔ پروردگار عالم فرماتا ہے کہ ہم نے ان کی گرفت کی، اور گرفت بھی خُوب مضبوط، تاکہ سب پر واضح ہو جائے کہ یہ عارضی اور مختصر سی طاقت خُدا کی عزّت و قُدرت کے مقابلہ میں بالکل کھوکھلی ہے اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ باعث تعجب یہ ہے کہ وہی دریائے نیل جو ان کی طاقت و ثروت اور آبادی و تہذیب کا سرچشمہ تھا، ان کی بربادی پر مامور ہُوا۔ اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ نہایت معمولی موجودات ٹڈی دل، جوئیں اور مینڈک ان پر مسلط ہوئے اور انہوں نے انہیں اتنا تنگ کیا کہ لاچار کر کے رکھ دیا۔ گزشتہ قوموں کے واقعات اور سرکش و مجرم اُمتوں پر نازل ہونے والے عذاب کو بیان کرنے کے بعد اس سے اگلی آیت میں پروردگار عالم فرماتا ہے: " کیا تمہارے کفّار گزشتہ کافروں سے بہتر ہیں یا تمہارے لیے آسمانی کتابوں میں امان نامہ نازل ہو چکا ہے " (أكفاركم خير من اولٰئكم ام لكم براءة في الزبر).[1]

قوم فرعون و نوح اور لوط و ثمود اور تمہارے درمیان فرق کیا ہے۔ اگر وہ کفر، سرکشی، ظلم اور گناہ کی وجہ سے طوفانوں، زلزلوں اور صاعقوں میں گرفتار ہوئے تو پھر کونسی دلیل ہے جس کی بناء پر تم ایسے مصائب کا شکار نہیں ہو سکتے۔ کیا تم ان سے بہتر ہو؟ یا پھر یہ کہ تمہارا طغیان اور عناد و کفر ان کے طغیان و عناد اور کُفر سے کمتر ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے تو پھر کس طرح خُود کو عذاب الٰہی سے محفوظ سمجھتے ہو مگر اس صورت میں کہ امان نامہ تمہارے لیے آسمانی کُتب میں نازل ہوا ہو۔ یقیناً یہ دعویٰ جھُوٹا ہے اور اس پر تم کسی قسم کی دلیل نہیں رکھتے۔ یا یہ کہ وہ کہتے ہیں: " کہ ہم متحد، متفق اور طاقتور جماعت ہیں اور ہم اپنے مخالفوں سے انتقام لیں گے اور ان پر کامیابی حاصل کریں گے۔" (ام يقولون نحن جميع منتصر).[2]

(حاشیہ سابقہ صفحہ)

(۱) عصا کا عظیم اژدھے میں تبدیل ہونا۔ (طٰہٰ۔ ۲۰) (۲) " ید بیضاء" حضرت موسیٰ کے ہاتھ کا مصدر نور کی طرح چمکنا۔ (طٰہٰ۔ ۲۲) (۳) سرکوبی کرنے والا طوفان۔ (اعراف۔ ۱۳۳) (۴، ۵، ۶، ۷) ٹڈی دل جو زراعتوں پر مسلط ہوئے اور جوئیں (ایک قسم کی نباتی مصیبت) مینڈک جنہوں نے دریائے نیل سے نکل کر مختصر سی مدت میں ان کی سطح زندگی کو ڈھانک لیا اور "خُون" دریائے نیل نے خُون کا رنگ اختیار کیا۔ (اعراف۔ ۱۳۳) ۸، ۹ خشک سالی اور پھلوں کی کمی (اعراف۔ ۱۳۰) جن میں سے ہر ایک کی تفصیل متعلقہ آیات کے ذیل میں دی گئی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)

[1] " اکفارکم " میں ضمیر ظاہراً (ام لکم براءۃ فی الزبر) کے قرینے سے کفارِ عرب کی طرف لوٹتی ہے۔

[2] باوجودیکہ نحن جمع کی ضمیر ہے اس کی خبر " جمیع " مفرد کی شکل میں آئی ہے اور اسی طرح " منتصر " جو کہ خبر کے بعد خبر یا جمیع کی صفت ہے اور یہ اس بناء پر ہے کہ " جمیع " اگرچہ لفظاً مفرد ہے لیکن معنیٰ کے لحاظ سے جمع ہے۔

"جمع" "مجموع" کے معنوں میں ہے۔ یہاں اس سے مُراد ایسی جماعت ہے کہ جن کا کوئی مطلوبہ مقصد ہو اور وہ عمل کی صلاحیت رکھتی ہو۔ "منتصر" کا مفہوم انہی معانی کی تاکید کے لیے ہے کیونکہ اس کا مادّہ "انتصار" ہے جس کے معنی انتقام لینے کے اور کامیاب ہونے کے ہیں۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیت خطاب کی شکل میں تھی لیکن زیرِ بحث آیت اور آگے آنے والی آیات غائب کی صُورت میں کفار سے گفتگو کرتی ہیں اور یہ ان کی ایک قسم کی تحقیر ہے یعنی وہ اس قابل نہیں ہیں کہ اس سے زیادہ خطابِ الٰہی کے مستحق ہوں۔ بہرحال اگر وہ اس قسم کی قدرت کا دعویٰ کریں تو وہ بھی بے بُنیاد ہے۔ وہ اس لیے کہ آلِ فرعون اور قوم عاد و ثمود اور انہی جیسے اور گروہ، جو ان سے زیادہ قوی تھے، عذابِ الٰہی کے عظیم طوفان کے مقابلے میں پرِکاہ کی طرح کمترین مقاومت بھی اپنی طرف سے نہیں دکھا سکے چہ جائیکہ یہ چھوٹا سا گروہ کہ جس کے پاس کچھ بھی نہیں۔

اِس کے بعد ایک قاطع اور دو ٹوک پیشین گوئی کے عنوان سے ان کی باتوں کو ردّ کرتے ہوئے پروردگارِ عالم مزید فرماتا ہے:

" وہ جان لیں کہ عنقریب ان کی جماعت شکست کھا کر بھاگ کھڑی ہوگی۔" (سیھزم الجمع و یولون الدبر) [1]

جاذبِ توجہ یہ امر ہے کہ "سیھزم" کا مادہ "ھزم" بروزن "جزم" ہے۔ اِس کے معنی ہیں کسی خشک جسم کو اِتنا دبانا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ یہاں اسی مناسبت سے لشکر کے تتر بتر اور درہم و برہم ہونے کے معنی میں اِستعمال ہوا ہے۔ یہ تعبیر ممکن ہے اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کہ وہ بظاہر متحد و مربوط ہیں لیکن چونکہ ایسے موجودات کی طرح ہیں جو خشک ہوتے ہیں، لہٰذا وہ قوی دباؤ کے مقابلے میں درہم و برہم ہو جائیں گے۔ برخلاف مومنین کے کہ وہ اپنے اندر ایسی قوت رکھتے ہیں کہ جس میں مرکزیت بھی ہو۔ "دبر" کے معنی پشت کے ہیں یہ "قُبل" کی ضد ہے جس کے معنی اگلے حصّہ کے ہیں۔ یہ لفظ یہاں مکمل طور پر میدانِ جنگ میں پُشت دکھانے کے مفہوم میں ہے۔ یہ پیشین گوئی میدانِ بدر میں اور دوسری جنگوں میں حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی اور کفار کا مضبوط اور طاقتور گروہ میدانِ جنگ سے ہزیمت خوردہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ زیرِ بحث موضوع کے متعلق آخری آیت میں پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "صرف دُنیا ہی میں شکست و ناکامی ان کا حصّہ نہیں ہے بلکہ قیامت ان کی وعدہ گاہ ہے اور روزِ محشر کی سزائیں زیادہ سخت اور ہولناک ہیں۔" (بل الساعة موعدھم والساعة ادھٰی وامر)۔ اِس اعتبار سے انہیں اس دنیا میں بھی شکست کی تلخی کا مزہ چکھنے کے لیے تیار رہنا چاہیئے اور آخرت میں ان کے لیے زیادہ تلخ اور وحشت ناک شکست ہے۔ "ادھٰی" کا مادّہ "دھو" اور "دھاء" ہے اس کے معنی ایسی بڑی مصیبت اور عظیم حادثہ کے ہیں کہ جس سے چھٹکارہ ممکن نہ ہو۔ یہ لفظ کبھی انتہائی ہُشیاری کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن زیرِ بحث آیت میں اس کے پہلے معنی ہیں۔ جی ہاں! وہ قیامت میں ایسی صُورتِ حال سے دوچار ہوں گے کہ ان کے لیے کوئی راہ فرار نہیں ہوگی۔

---

[1] اگرچہ مناسب ہے کہ "یولون الادبار" کہا جائے۔ اس کی جگہ "یولون الدبر" کہا گیا ہے کیونکہ یہ لفظ جنس کے معنی رکھتا ہے کہ جو جمع کے حکم میں ہے۔

ایک نکتہ

ایک واضح اور معجزہ کی کیفیت رکھنے والی پیشین گوئی

اِس میں شک نہیں کہ مکّہ میں جس وقت یہ آیات نازل ہوئیں تو مسلمان بالکل اقلیت میں تھے اور دشمن انتہائی طاقتور تھا مُسلمانوں کی ان کے مقابلے میں جلدی کامیابی کی پیشین گوئی ہرگز قابلِ اعتبار نہ تھی لیکن تھوڑی سی مُدّت کے بعد مُسلمانوں نے ہجرت کی اور اتنی طاقت جمع کرلی کہ میدانِ بدر میں دشمن کے ساتھ اپنے پہلے ٹکراؤ میں ایک خوفناک ضرب لگائی۔ اس صُورتِ حال کی کفّار کو قطعاً توقع نہیں تھی۔ پھر جنگِ بدر کے واقعہ کو چند سال بھی نہیں گزرے تھے کہ نہ صرف کفّارِ مکّہ بلکہ تمام جزیرۃ العرب مسلمانوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرچکا تھا۔ تو کیا مُستقبل کے بارے میں غیب سے تعلق رکھنے والی خبر بالکل واضح طور پر ایک معجزہ نہیں ہے؟ ہمیں معلوم ہے کہ اعجازِ قرآن کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کی خبریں غیبت پر مشتمل ہوتی ہیں جس کا ایک نمونہ زیرِ بحث آیت میں ہے۔

۴۷۔ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِىْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ۝

۴۸۔ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِى النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ؕ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ۝

۴۹۔ اِنَّا كُلَّ شَىْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝

۵۰۔ وَمَاۤ اَمْرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ۝

۵۱۔ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَاۤ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝

۵۲۔ وَكُلُّ شَىْءٍ فَعَلُوْهُ فِى الزُّبُرِ ۝

۵۳۔ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝

۵۴۔ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِىْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ۝

۵۵۔ فِىْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝

ترجمہ

۴۷۔ مجرمین گمراہی اور آگ کے شعلوں میں ہیں۔

۴۸۔ جس دن وہ جہنّم کی آگ میں مُنہ کے بَل گرائے جائیں گے (تو ان سے کہا جائے گا) جہنّم کی آگ کا مزہ چکھو۔

۴۹۔ ہم نے ہر چیز کو ایک مقدار میں پیدا کیا ہے۔

۵۰۔ اور ہمارا فرمان ایک امر سے زیادہ نہیں ہے، ایک چشم زدن کی مانند۔

۵۱۔ ہم نے ان لوگوں کو جو تمہارے مانند تھے ہلاک کیا۔ کیا کوئی ہے جو نصیحت پکڑے؟

۵۲۔ اور جو کام انہوں نے کیا ان کے نامہ اعمال میں تحریر ہے۔

۵۳۔ اور ہر چھوٹا بڑا کام لکھا جاتا ہے۔

۵۴۔ پرہیزگار جنّت کے باغات اور نہروں کے پاس جگہ رکھتے ہیں

۵۵۔ صِدق کی جگہ خداوند مالک و مقتدر کے پاس۔

تفسیر

مقامِ صِدق میں خُداوند مقتدر کے پاس

اِن آیتوں میں قیامت کے دن مُشرکین اور مُجرموں کی جو کیفیّت ہوگی اور جس کی بحث گزشتہ آیتوں میں تھی اسی کے بیان کو جاری رکھا گیا ہے۔ گزشتہ آیتوں میں سے آخری آیت نے اس حقیقت کو پیش کیا تھا کہ قیامت کا دن ان کی وعدہ گاہ ہے اور وہ دن مصیبت کا دن ہے اور تلخی لیے ہوئے ہے، ایسی تلخی کہ جو دُنیا کی مصیبتوں اور شکستوں سے زیادہ تلخ ہوگی. زیرِ بحث آیات میں سے پہلی آیت میں اس امر کی علّت کو پیش کرتے ہوئے خدا فرماتا ہے :

"مُجرمین گمراہی اور آگ کے شعلوں میں ہیں۔" (ان المجرمین فی ضلال و سعر)[1]

"قیامت کے دن وہ جہنم کی آگ میں اپنے منہ کے بل کھینچے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ دوزخ کی آگ کا مزہ چکھو۔ وہ دوزخ جس کا تم ہمیشہ انکار کرتے تھے اور اسے محض جھُوٹ تصوّر کرتے تھے۔" (یوم یسحبون فی النار علیٰ وجوھھم ذوقوا مس سقر)۔ "سقر" بروزن "مسفر" جسم کے رنگ کے متغیّر ہونے اور دھوپ کی شدّت سے یا ایسی ہی کسی دوسری

[1] "سعر"، جیسا کہ ہم نے اس سورہ کی آیت ۲۴ میں اشارہ کیا ہے دو معنی رکھتا ہے پہلا یہ کہ یہ جمع ہے "سعیر" کی جس کے معنی جلتی ہوئی آگ کے ہیں۔ دوسرا یہ کہ یہ جنون ہیجان اور اشتعال کے معنوں میں ہے کہ جو فکری اعتدال کے فقدان کے وقت ہوتا ہے۔ زیرِ بحث آیت میں ممکن ہے پہلے معنی میں ہو یا پھر دوسرے معنوں میں۔ اگر دوسرے معنوں میں ہو تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا۔ "وہ کہتے تھے کہ اگر ہم اپنے جیسے انسان کی پیروی کریں تو ہم گمراہ ہیں اور دیوانے ہیں"۔ قرآن کہتا ہے کہ قیامت کے دن سمجھ لیں گے کہ وہ انکار اور جنون کی وجہ سے گمراہی میں تھے۔

چیز سے تکلیف اُٹھانے کے معنی میں ہے۔ چونکہ جہنم تکلیف و آزار کا ایک ایسا ہی شدید تنوع رکھتا ہے اس لیے اس کا نام سقر ہے۔
اور " مس " سے مُراد چھُونا ہے۔ اسی بنا پر دوزخیوں سے کہا جائے گا اس جلانے والی آنچ کا مزہ چکھو جو جہنم کی آگ کے چھُونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اسے چکھو اور یہ نہ کہو کہ یہ چیزیں جھُوٹ، خرافات اور افسانے ہیں۔

بعض مفسّرین کا نظریہ یہ ہے کہ " سقر " تمام دوزخ کا نام نہیں ہے بلکہ دوزخ کا ایک خاص حصّہ ہے جس میں حد سے زیادہ تپش ہے چنانچہ ایک روایت میں امام جعفر صادقؑ سے نقل ہوا ہے کہ " سقر " ایک درّہ ہے اور یہ متکبّر لوگوں کے لیے ہے۔ یہ درّہ جس وقت سانس لیتا ہے تو جہنم کو جلا دیتا ہے۔[1]

چونکہ یہ ہو سکتا تھا کہ یہ خیال ہو کہ یہ عذاب اِن گناہوں سے متناسب نہیں ہے، اس لیے بعد والی آیت میں مزید فرماتا ہے کہ " ہم نے ہر چیز کو مقدار اور اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے "۔ (انّا کل شیءٍ خلقناہ بقدر)۔ جی ہاں! ان کے اس دنیا کے دردناک عذاب کا بھی حساب کتاب ہے اور ان کو آخرت میں پہنچنے والی سزائیں ہی نہیں بلکہ ہر چیز کو خدا نے حساب و کتاب کے ماتحت پیدا کیا ہے۔ زمین و آسمان، زندہ و بے جان وجود، انسانی جسم کے اعضا اور زندگی کے وسائل ہر ایک چیز حساب کتاب کے ماتحت اور ضروری مقدار کے مطابق ہے۔ اس عالم کی کوئی چیز حساب کتاب کے بغیر نہیں ہے اس لیے کہ خالقِ حکیم کی پیدا کردہ ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے: " نہ صرف ہمارے اعمال حکمت کی رُو سے ہیں بلکہ انتہائی قدرت و قاطعیت کے ساتھ بھی ہیں کیونکہ ہمارا فرمان ایک اَمر سے زیادہ نہیں ہے اور وہ اتنی تیزی کے ساتھ تکمیل پاتا ہے جیسے پلک کا ایک مرتبہ جھپکنا "۔ (وما امرنا الّا واحدۃ کلمح بالبصر)۔ جی ہاں! جس چیز کے بارے میں ہم ارادہ کریں تو ہم کہتے ہیں " کن " ہو جا تو وہ بلا تاخیر ہو جاتی ہے۔ (حتیٰ کہ کلمہ کن کی اصطلاح بھی محض افہام کے لیے ہے ورنہ خدا کا ارادہ، مشیّت اور اس کی مُراد کا تحقق یہ سب ایک ہی چیز ہیں) اس بنا پر جس دن ہم قیامت کے برپا ہونے کا فرمان صادر کریں گے تو چشم زدن میں ہر چیز قیامت کی گرفت میں ہوگی اور جسموں کے ڈھانچوں میں نئی زندگی پھُونک دی جائے گی۔ اس طرح جس روز ہم ارادہ کریں کہ مجرموں کو آسمانی بجلی کی چیخ یا زمین کے زلزلوں، طوفانوں اور تیز آندھیوں سے معذب کریں یا ان پر عذاب نازل کرنے کا ارادہ رکھیں گے تو اس کے لیے ایک حکم سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب چیزیں گنہگاروں کے لیے تنبیہ کی حیثیت رکھتی ہیں تاکہ وہ جان لیں کہ خدا حکیم ہونے کے ساتھ ساتھ قطعی اور دو ٹوک فیصلے کرتا ہے اور وہ قاطعیت کے ساتھ حکیم بھی ہے۔ لہٰذا اس کے فرمان کی مخالفت سے پرہیز کریں۔ بعد والی آیت میں دوبارہ کفّار و مجرمین کو مخاطب کرتے ہوئے اور گزشتہ اقوام کے حالات کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتے ہوئے پروردگارِ عالم فرماتا ہے: " ہم نے گزشتہ زمانے میں کچھ افراد کو جو تمہارے ہی جیسے تھے، ہلاک کیا۔ کیا کوئی ہے کہ جو نصیحت حاصل کرے؟ (ولقد اھلکنا اشیاعکم فھل من مدکر)۔

" اشیاع " جمع ہے شیعہ کی ایسے لوگوں کے معنوں میں کہ جو کسی فرد کی طرف سے چہار جانب جائیں اور اس فرد سے متعلق امور کی نشر و اشاعت کریں اور اس کو تقویت پہنچائیں۔ اگر شیعہ پیرو کار کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے۔ یقیناً گزشتہ اقوام، مشرکینِ مکّہ کی پیروکار نہیں تھیں بلکہ معاملہ بالکل اس کے برعکس تھا لیکن چونکہ کسی فرد کے طرفدار اس کے شیعہ ہوتے ہیں، اس لیے یہ لفظ مانند اور مثل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ چیز بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیئے کہ کفّارِ مکّہ کا یہ گروہ گزشتہ لوگوں کے طرزِ عمل سے بھی قوت حاصل کرتا تھا اور ان

[1] تفسیر صافی در ذیل آیات زیر بحث

کے نظریات سے استفادہ کرتا تھا۔ اسی بنا پر گزشتہ اقوام پر "اشیاع" کا اطلاق ہوا ہے۔

بہر حال یہ آیت دوبارہ اس حقیقت کی تاکید کرتی ہے کہ جب تمہارے اعمال، رفتار و گفتار اور عقائد ان کے عقائد وغیرہ مشترک ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ تمہارا انجام ان کے انجام سے مختلف ہو۔ بیدار ہو جاؤ اور نصیحت حاصل کرو۔ اس کے بعد اس بُنیادی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ گزشتہ اقوام کی موت کے ساتھ ان کے اعمال کالعدم نہیں ہو گئے بلکہ "جو کام انہوں نے انجام دیے ہیں وہ ان کے نامہ اعمال میں مندرج ہیں"۔ (وکل شیءٍ فعلوہ فی الزبر)۔ اسی طرح تمہارے اعمال بھی مندرج و منضبط ہیں اور روز حساب کے لیے محفوظ ہیں "زبر" جمع ہے "زبور" کی جو کتاب کے معنی میں ہے۔ یہاں انسانوں کے نامۂ اعمال کے معنوں میں ہے۔ بعض نے اس احتمال کی تائید بھی کی ہے کہ اس سے مُراد "لوح محفوظ" ہے۔ لیکن یہ معنی جمع کے معنی کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے۔ اس کے بعد تاکید مزید کے لیے خدا فرماتا ہے: "اور ہر چھوٹا بڑا کام بلا استثنا لکھا جائے گا۔ (وکل صغیر وکبیر مستطر)۔ اس بنا پر اس روز جو اعمال کا حساب و کتاب ہوگا، وہ ایک جامع اور مکمل حساب ہوگا چنانچہ جس وقت مجرموں کا نامۂ اعمال ان کے ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ فریاد کریں گے کہ "وائے ہو ہم پر یہ کیسی کتاب ہے کہ کوئی چھوٹا بڑا عمل ایسا نہیں جو اس میں درج نہ ہو"۔ ویقولون یاویلتنامال ھٰذاالکتاب لایغادرصغیرۃ ولاکبیرۃ الّا احصاھا۔ (سورہ کہف۔ آیت ۴۹)۔ "مستطر" کا مادہ سطر ہے اس کے معنی صف کے ہیں۔ وہ خواہ انسان ہوں کہ ایک صف میں کھڑے ہوں یا درخت ہوں جو ایک صف میں ایستادہ ہوں یا الفاظ ہوں کہ جو صفحہ کاغذ پر ایک ہی صف میں تحریر ہوں۔ چونکہ یہ زیادہ تر آخری معنوں میں استعمال ہوتا ہے لہٰذا یہی مفہوم عام طور پر اس سے ذہن میں آتا ہے بہر حال یہ ایک دوسری تنبیہ ہے گنہگار، غافل اور بے خبر لوگوں کے لیے۔

قرآن مجید کی سُنّت یہ ہے کہ اس کے بیانات میں اچھے بُرے اور نیک و بد افراد ایک دوسرے کے موازنہ اور تقابل سے متعارف ہوتے ہیں اور موازنہ و تقابل کی صُورت میں دونوں کا فرق بھی واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔ یہاں بھی کافر مُجرموں کے احوال کے تذکرے کے بعد پرہیزگاروں کے مسرّت بخش اور رُوح پرور احوال کی طرف ایک مختصر سا اشارہ کرتے ہوئے پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "پرہیزگار جنّت کے باغوں میں نہروں کے قریب وسیع فضا اور خدا کے واضح فیض (کے مقام پر) جگہ رکھتے ہیں"۔ (ان المتقین فی جنّات ونھر) "نھر" بر وزن "قصر" اور "نھر" بر وزن "قھر" دونوں بہت سے پانی کے بہنے کے معنی میں ہے۔ اور اسی مناسبت سے کبھی وسیع فضا، فیض عظیم یا پھیلی ہوئی روشنی کے لیے "نھر" بر وزن "قصر" کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ زیر بحث آیت میں (آئندہ آنے والی حدیث سے قطع نظر) ممکن ہے اسی اصلی معنی کے مطابق پانی کی نہر یا دریا ہو۔ اس کا مفرد ہونا کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا کیونکہ وہ جنس و جمع کے معنی رکھتا ہے۔ اسی لیے "جنّات" جو "جنّت" کی جمع ہے، اس کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فیض الٰہی کی وسعت جنّت کی وسیع روشنی اور اس کی وسیع فضا کی طرف اشارہ ہو یا دونوں معانی کی طرف اشارہ ہو لیکن اس حدیث میں جو دُرِ منثور میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے ہم دیکھتے ہیں کہ (النھر الفضاء واسعۃ لیس بنھر جار) "نھر" کے معنی وسیع فضا کے ہیں، جاری نہر کے نہیں[1]

زیر بحث آیات کی آخری آیت نے کہ جو سُورۂ قمر کی بھی آخری آیت ہے مُتقین کی رہائش گاہ کی مزید وضاحت کی ہے۔ پروردگار عالم فرماتا ہے: "وہ جائے صدق و حق اور راستی میں مالک و قادر خدا کے ہاں قرار و مقام رکھتے ہیں"۔ (فی مقعد صدق عند ملیك

[1] تفسیر "درالمنثور" ج ۶، ص ۱۳۹

مقتدر) ۔ اس آیت میں پرہیزگاروں کی رہائش گاہ کی کیسی پرکشش اور جاذبِ توجہ توصیف ہے ۔ اس میں دو خصوصیتیں ہیں جن میں تمام امتیازات جمع ہیں ۔ پہلی تو یہ کہ وہ صدق کی جگہ ہے ۔ وہاں کسی قسم کی بے ہودگی یا باطل کا کوئی گزر نہیں ہے ۔ وہ سراسر حق ہے بہشت کے بارے میں خدا کے سارے وعدے حقیقت کا رُوپ دھار لیں گے اور ان کی سچائی بالکل واضح اور آشکار ہوگی ۔ دوسری خصوصیت یہ کہ وہ خدا کے قُرب و جوار میں ہے ۔ وہی چیز کہ جو "عند" سے ظاہر ہوئی ہے ۔ یہ قربِ معنوی کی انتہا کی طرف اشارہ ہے ۔ قربِ جسمانی کی طرف نہیں ۔ اور پھر خدا کی نسبت کہ جو مالک بھی ہے اور قادر بھی ہر قسم کی نعمت و موہبت اس کے قبضہ میں ہے اور اس کی حکومت و ملوکیت کے زیرِ فرمان ہے ۔ اس بنا پر وہ ان مہمانانِ گرامی کی پذیرائی میں کوئی کمی نہیں کرے گا ۔ وہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے ان کے لیے کیا کیا نعمتیں فراہم کی ہیں ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان دو آیتوں میں کہ جہاں جنت کی نعمتوں اور جزاؤں کے بارے میں گفتگو ہے ان میں پہلے تذکرہ وسیع باغات اور جاری نہروں کا ہے ۔ یہ مادّی نعمتیں ہیں ۔ پھر ان کے عظیم معنوی اجر کا ذکر ہے یعنی خُدائے مالک و قادر کی بارگاہ میں حضوری کا تذکرہ ۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ انسان کو حقائق کی طرف رفتہ رفتہ مائل کرے ، اس کی رُوح کو پرواز کرائے اور عشق و نشاط میں مستغرق کرے ۔ "مليك مقتدر" اور "مقعد صدق" ایسے الفاظ ہیں کہ جو اللہ کے حضور اور اس کے قُربِ معنوی کے دوام و بقا پر دلالت کرتے ہیں ۔

چند ایک نکات

۱ ۔ اس جہان کی تمام چیزیں حساب و کتاب کی تابع ہیں

(انّا كلّ شیء خلقناه بقدر) کا جُملہ اختصار کے باوجود عالمِ تخلیق کی ایک اہم حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے ایسی حقیقت کہ جو پورے عالمِ امکان پر حکمران ہے اور وہ ساری کائنات میں ہر چیز کی مقدار کا نہایت باریک بینی کے ساتھ تعین ہے ۔ انسان کا علم جس قدر ترقی کر رہا ہے ، وہ باریک بینی پر مبنی اس دقیق تعینِ مقدار سے زیادہ طور پر باخبر ہوتا جا رہا ہے ۔ تعینِ مقدار کے سلسلہ میں یہ دقتِ نظر نہ صرف زمینی موجودات میں کارفرما ہے بلکہ آسمان کے عظیم کُرّوں میں بھی جاری و ساری ہے ۔ مثال کے طور پر ہم سُنتے ہیں کہ الیکٹرانکی دماغوں کی مدد سے سینکڑوں مخصوص ماہرینِ فن نہایت دقیق علمی حساب لگا کر اس اَمر پر قادر ہوئے ہیں کہ کُرّہ قمر کے اس علاقہ میں اُتریں کہ جہاں وہ چاہتے ہیں ۔ حالانکہ جن چند دنوں میں خلائی جہاز زمین اور چاند کا درمیانی فاصلہ طے کرنے میں مصروف ہوتا ہے تو تمام صورتِ حال اُلٹ پلٹ ہو جاتی ہے ۔ چاند اپنے گرد بھی گھوم رہا ہے اور زمین کے گرد بھی گردش کر رہا ہے اس طرح اس کی جگہ مکمل طور پر بدل جاتی ہے ۔ حتیٰ کہ خلائی جہاز کے ایک مصروف لمحے ہی کے دوران زمین اپنے گرد بھی گردش کرتی ہوئی ہوتی ہے اور سُورج کے گرد بھی گردش میں مصروف ہوتی ہے لیکن چونکہ یہ مختلف قسم کی گردشیں ایسے حساب کے مطابق ہیں کہ جو بہت باریک بینی پر مبنی ہے اور ان میں ذرّہ برابر فرق واقع نہیں ہوتا ۔ اَب فضانورد اس قابل ہو چکے ہیں کہ نہایت پیچیدہ حساب کے باوجود وہ اپنے پسندیدہ خطّے میں جا اُتریں ۔ علمِ نجوم کے ماہر اس قابل ہو گئے ہیں کہ دسیوں سال پہلے مکمل یا نامکمل چاند گہن اور سُورج گہن کے متعلق زمین کے مختلف

حصّوں کے حوالہ سے صحیح طور پر پیشین گوئی کر سکیں۔ یہ تمام باتیں اس وسیع دنیا میں حساب کی انتہائی باریک بینی پر دلالت کرتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جانداروں میں، مثال کے طور پر ننھی منی چیونٹیوں میں، ان کے مختلف قسم کے جسموں، رگوں اور پٹھوں کے بارے میں یہ حساب انسان کو حیران کر دینے کے قابل ہے۔ جس وقت ہم زیادہ چھوٹے موجودات مثلاً مائیکروب، وائرس اور امیبا تک پہنچتے ہیں تو حساب کی عمدگی اور صحت اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں ملی میٹر کا ہزارواں حصّہ بلکہ اس سے چھوٹا حصّہ بھی مکمل طور پر حساب کے ماتحت ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اگر ہم ایٹم کے دائرہ میں داخل ہوں تو پھر ان تمام اندازہ لگانے والے پیمانوں کو خیر باد کہنا پڑتا ہے۔ اَب حساب کے موضوعات اتنے چھوٹے ہو جاتے ہیں کہ کسی انسان کے دائرہ فکر میں نہیں آتے۔ یہ تخمینے صرف مقداروں کے بارے میں نہیں ہیں، ترکیبی کیفیتیں بھی اندازہ لگانے کے ان پیمانوں کی گرفت میں آجاتی ہیں۔ وہ نظام، کہ جو رُوحِ انسانی کے تقاضوں اور رجحانات و میلانات پر حاکم ہے، اس کا بھی حساب لگایا جا سکتا ہے حتیٰ کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی خواہشات کا وہ سلسلہ کہ جس میں ذراسی بھی برہمی واقع ہو جائے تو اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی درہم و برہم ہو جائے اس کو ناپنے کے بھی دقیق پیمانے موجود ہیں۔ عالم طبعی میں ایسی موجودات ہیں کہ جو ایک دوسرے کے لیے مصیبت کا باعث بھی ہیں اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں بھی ڈٹی ہوئی ہیں۔

شکاری پرندے چھوٹے پرندوں کے گوشت سے غذا حاصل کرتے ہیں اور حد سے تجاوز نہیں کرتے کہ تمام موجود ذخیرۂ غذا کیلئے نقصان دہ ثابت ہوں۔ نتیجتہً ان کی عمر طویل ہوتی ہے۔ یہ شکاری پرندے بہت کم انڈے دیتے ہیں۔ ان کے بچّوں کی تعداد بھی کم ہوتی ہے یہ صرف خاص حالات میں تنہا زندگی گزارتے ہیں۔ اگر اس طویل عمر کے ساتھ ان کے بچّے بھی زیادہ ہوتے تو دُنیا سے تمام چھوٹے پرندوں کی نسلیں ختم ہو کر رہ جاتیں۔ عالم حیوانات و نباتات میں اس موضوع کا دامن بہت وسیع ہے جس کا مطالعہ انسان کو (انّا کل شیءٍ خلقناہ بقدر) کی گہرائی اور اس کے عمق سے زیادہ رُوشناس کراتا ہے۔

۲۔ تقدیرِ الٰہی اور اس کے ارادہ کی آزادی

ہو سکتا ہے کہ زیر بحث آیت اور اس سے مشابہت رکھنے والی آیتوں سے یہ غلط تاثر پیدا ہو جائے کہ اگر ہر چیز کو خدا نے اندازے، مقدار اور حساب کے ساتھ پیدا کیا ہے تو پھر ہمارے افعال و اعمال بھی اس کی مخلوق ہیں؛ لہٰذا ہم کسی طرح کا کوئی اختیار نہیں رکھتے لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ اگرچہ ہمارے افعال و اعمال مشیت و تقدیر الٰہی کے مطابق ہیں اور اس کی قدرت اور ارادہ کے احاطہ سے ہرگز خارج نہیں ہیں لیکن اس نے یہ بات مقدر کر دی ہے کہ اپنے اعمال میں ہم مختار ہیں اور اسی بنا پر وہ ہمارے بارے میں ذمّہ داری و جوابدھی کا قائل ہے۔ اگر ہم اپنے افعال میں بالکل بے اختیار ہوتے تو تکلیف شرعی اور ذمّہ دارانہ جوابدھی کا کوئی مفہوم ہی باقی نہ رہتا۔ ہمارا اپنے اعمال کے سلسلہ میں کوئی اختیار نہ رکھنا تقدیر الٰہی کے خلاف ہے۔

جبریوں کی افراط کے مقابلہ میں، اس کے برعکس، ایک گروہ تفریط اور تیز روی کا شکار ہے۔ وہ "قدری" یا "مفوضہ" کہلاتے ہیں وہ بالکل وضاحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال ہمارے اختیار میں ہیں اور خدا کو ہمارے کاموں میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اس طرح انہوں نے الٰہی حاکمیت کی حدُود کو محدُود کر دیا ہے، خود کو مُستقل سمجھا ہے اور شرک کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ توحید و عدل کی دونوں اصلوں کے درمیان جو نقطہ ہے اس کو سمجھنے کے لیے خاصی بصیرت درکار ہے۔ اگر ہم توحید کا مفہوم یہ لیں کہ ہر ایک شے حتیٰ کہ ہمارے اعمال کا خالق بھی خدا ہے اور ہمیں اپنے اعمال کے سلسلہ میں کوئی اختیار حاصل نہیں ہے تو اس طرح ہم عدلِ الٰہی کے منکر ہو جائیں گے۔ کیونکہ ایسی صورت میں خدا نے گنہگاروں کو بے اختیار رکھ کر مجبورِ محض کر دیا ہے پھر اس پر طرہ یہ کہ انہیں سزا بھی دے گا۔ اس کے برعکس اگر ہم عدل کے معنی یہ سمجھیں کہ خدا ہمارے اعمال میں بالکل مداخلت نہیں کرتا تو ہم نے اس کو اس کی حکومت سے خارج کر دیا اور اس طرح ہم شرک کے گڑھے میں جا گرے۔

" امر بین الامرین " ایک درمیانی خط ہے اور وہ صراطِ مستقیم بھی ہے اور عقیدہ صحیح بھی۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم یہ عقیدہ رکھیں کہ ہم صاحب اختیار ہیں لیکن ہمارا یہ صاحب اختیار ہونا بھی خدا کے ارادے سے ہے۔ جس وقت چاہے وہ ہمارے اختیار کو سلب کر سکتا ہے۔ یہ مکتبِ فکرِ اہل بیت علیہم السّلام ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ زیر بحث آیات کے ذیل میں متعدد روایات مذکورہ بالا دونوں فرقوں کے بارے میں بصورتِ مذمت کتب اہلِ سُنّت و شیعہ میں وارد ہوئی ہیں۔ منجملہ اِن حدیثوں کے ایک حدیث یہ بھی ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ نے فرمایا:

(صنفان من امتی لیس لھم فی الاسلام نصیب المرجئة والقدریة انزلت فیھم ایة فی کتاب الله ان المجرمین فی ضلال وسعر.....)

" میری اُمّت کے دو گروہ ایسے ہیں کہ جن کا اسلام میں کوئی حصّہ نہیں ہے " جبری " اور " قدری " اور ان کے بارے میں (ان المجرمین فی ضلال وسعر) " گنہگار اور مُجرم گمراہی، جنون اور آگ کے شعلوں میں ہیں " نازل ہوئی ہے[1]

" مرجئہ " کا مادّہ " ارجاء " ہے اس کے معنی تاخیر میں ڈالنے کے ہیں۔ یہ ایک اصطلاح ہے جو جبریوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس لیے کہ وہ اوامرِ الٰہی کی پرواہ نہیں کرتے اور معصیّت کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ اس گمان میں ہیں کہ وہ مجبور ہیں یا یہ کہ وہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ گناہانِ کبیرہ کے مرتکب افراد کے انجام کا معاملہ واضح نہیں ہے۔ وہ اسے قیامت پر چھوڑتے ہیں[2]

امام باقرؑ کی ایک حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ (نزلت ھذہ فی القدریة ذوقوا مس سقر انّا کل شئ خلقناه بقدر) یہ آیات قدریوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ قیامت میں ان سے کہا جائے گا " جہنم کی آگ کا مزہ چکھو"۔ ہم نے ہر چیز کو حساب اور اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے[3]

(یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اندازہ اور حساب سے مُراد یہ ہے کہ ہر گناہ کے لیے ہم نے معیّن سزا قرار دی ہے۔ یہ آیت کی ایک اور تفسیر ہے یا یہ کہ تم جو تقدیرِ الٰہی کے منکر تھے اور ہر چیز پر خُود کو قادر سمجھتے تھے اور خُدا کو اپنے اعمال کی قلمرو سے خارج سمجھتے تھے تو اب تم

---

[1] تفسیر رُوح المعانی میں یہ حدیث بخاری، ترمذی ابنِ ماجہ، ابن عدی اور ابنِ مردویہ سے ابنِ عباس سے نقل ہوئی ہے ج ۲۷۔ ص ۸۱۔ اس کی نظیر حدیث قرطبی نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے۔ ج ۹، ص ۶۳۱۸

[2] " مجمع البحرین " مادہ " رجا "

[3] نور الثقلین " ج ۵ ص ۱۸۶

خدا کی قدرت کو دیکھو اور اپنے انحراف کے عذاب کا مزہ چکھو)۔

۳۔ خدا کا فرمان صرف ایک ہی کلمہ ہے

ہم جانتے ہیں کہ "علّتِ تامہ" اور "معلول" کے درمیان کسی قسم کا زمانی فاصلہ نہیں ہے۔ اس لیے فلاسفہ کی اصطلاح میں علّت کے معلول پر تقدم کو "تقدمِ رتبی" سمجھتے ہیں اور خدا کے ارادے کے بارے میں ایجاد و خلقت کے امر کی نسبت کہ جو علّتِ تامہ کا واضح ترین مصداق ہے، یا "علتِ تامہ منحصر بہ فرد" کا مصداق ہے، یہ معنی زیادہ واضح ہیں۔ اس لیے اگر آیہ (وما امرنا الّا واحدة) "ہمارا امر ایک کلمہ سے زیادہ نہیں ہے" کی لفظ "کن" سے تفسیر کی ہے تو یہ تنگی بیان کی وجہ سے ہے کیونکہ لفظ "کن" بھی مرکب ہے کاف و نون کا، اور وہ ایک زمانہ کا محتاج ہے۔ یہاں تک کہ "فیکون" میں "فا" جو عام طور پر ایک قسم کے زمانے کو بیان کرتا ہے، وہ بھی بیان کی تنگی کی بنا پر ہے۔ پھر (کلمح بالبصر[1]) (چشم زدن) کی تشبیہ، سورہ نحل کی آیت ۷۷ میں پروردگارِ عالم جس وقت امرِالٰہی کی قیامت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور اس کو لمح بصر کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے تو مزید کہتا ہے کہ (او هو اقرب) "چشم زدن سے بھی زیادہ قریب ہے"۔ بہرحال زمانہ کے بارے میں یہ گفتگو ہماری روز مرہ کی تعبیر کے مطابق ہے اور اس وجہ سے ہے کہ قرآن ہم سے ہماری زبان میں بات کرتا ہے ورنہ خدا اور اس کے اوامر زمانہ سے مافوق ہیں۔ ضمنی طور پر "واحدة" کی تعبیر ہو سکتا ہے کہ اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ ایک ہی فرمان کافی ہے اور اس میں تکرار کی ضرورت نہیں ہے، یا پھر اس طرف اشارہ ہے کہ اُس کا فرمان چھوٹے بڑے، صغیر و کبیر حتیٰ کہ تمام پھیلے ہوئے آسمانوں کی خلقت تک میں ذرہ برابر فرق نہیں کرتا۔ بنیادی طور پر چھوٹا بڑا اور مشکل و آسان ہماری محدود فکر اور ناچیز قوت کے پیمانوں میں سے ہے۔ جہاں قدرتِ لامتناہی کے بارے میں گفتگو ہو یہ مفاہیم مکمل طور پر ختم ہو جاتے ہیں اور سب ایک ہی رنگ اور ایک ہی شکل کے نظر آتے ہیں۔ غور کیجئے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اگر اُوپر والے جملے کا مفہوم یہ ہے کہ تمام چیزیں آناً فاناً وجود میں آتی ہیں تو یہ امر حوادثِ عالم کے تدریجی ہونے کے مشاہدہ کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کا فرمان ہر جگہ ایک ہی کلمہ ہے جو چشم زدن سے بھی زیادہ سریع ہے۔ لیکن فرمان کے مضمون اور موضوع میں فرق ہوتا ہے۔ اگر جنین (وہ بچّہ جو شکمِ مادر میں ہوتا ہے) کو اس نے حکم دیا ہے کہ نو ماہ کے اندر اپنے دَور کی تکمیل کرے تو ایک لمحہ زیادہ یا کم نہیں ہوگا۔ اس کا فوراً ہونا اس طرح ہے کہ ٹھیک اس مدّت میں اس کی تکمیل ہو اور اگر کرۂ زمین کو حکم دیا ہے کہ چوبیس گھنٹے کے درمیان ایک مرتبہ اپنے گرد گردش کرے تو بھی اس کا فرمان تخلّف ناپذیر ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کے فرمان کے اثرانداز ہونے کے لیے کسی قسم کے زمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ فرمان کا مضمون و موضوع ہے کہ جو عالمِ مادّی کے تدریجی ہونے کی وجہ سے اور خاصیتِ طبیعت و حرکت کی سُنّت کی طرف توجہ کرتے ہوئے اپنے لیے زمانہ کو قبول کرتا ہے۔

۴۔ سُورہ قمر کا آغاز و اختتام

قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ سُورہ قمر وحشت و اضطراب اور قُربِ قیامت کی تنبیہ کے ساتھ شروع ہوا ہے اور وہ سکون و آرامِ مطلق

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہ جو سچے مومنین کے لیے ملیک مقتدر کے پاس مقام صدق میں ہے، اس کو بیان کرتے ہوئے اختتام پذیر ہو رہا ہے۔ تربیت کا مرحلہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ جو وحشت و اضطراب سے شروع ہوتا ہے اور مکمل آرام و سکون پر ختم ہوتا ہے۔ وہ افکارِ پریشاں کو جمع کرنے کے بعد سرکش خواہشات کو رام کرتا ہے۔ انسان کے اندرونی خوف و اضطراب سے گمراہی و فنا کے عوامل کو دُور کرتا ہے اور اسے پروردگارِ عالم کے جوارِ اَبدیت اور اس کی بارگاہِ رحمت و قُرب کے سکون و اطمینان سے ہم آغوشی کا شرف بخشتا ہے۔

حقیقی طور پر اس طرف توجہ کرنے سے کہ پروردگارِ عالم ہستی میں غیر متنازع فیہ مالک اور مختارِ کُل حاکم ہے اور اس پر توجہ کرنے سے کہ وہ صاحبِ اقتدار ہے اور اس کی قُدرت ہر چیز میں نافع ہے، انسان کو بے مثل و بے نظیر سکون و اطمینان قلب میسّر آتا ہے۔

بعض مفسّرین نے نقل کیا ہے کہ یہ دو مقدّس نام "ملیک و مقتدر" اجابت دعا کے سلسلہ میں بہت گہری اور شدید تاثیر رکھتے ہیں۔ اس موضوع سے متعلق ایک راوی نقل کرتا ہے کہ مَیں اس گمان کے ساتھ مسجد میں وارد ہُوا کہ صبح ہو گئی ہے لیکن درحقیقت ابھی رات کا ایک حصّہ باقی تھا۔ میرے علاوہ مسجد میں کوئی اور نہیں تھا۔ میں بالکل تنہا تھا۔ اچانک میں نے اپنے پیچھے ایک حرکت محسوس کی جس سے مَیں ڈر گیا۔ مَیں نے دیکھا کہ کوئی اجنبی پُکار رہا ہے۔ "اے وہ شخص کہ جس کا دل خوف سے لبریز ہے تو ڈر مت اور کہہ: اللّٰھو انك مليك مقتدر ماتشاء من امر يكون اس کے بعد تو جو چاہتا ہے اس کے لیے دُعا کر"۔ وہ شخص کہتا ہے کہ مَیں نے یہ مختصر سی دُعا پڑھی پھر کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس کا خدا سے مَیں نے سوال کیا ہو اور وہ پوری نہ ہوئی ہو۔[2]

خداوندا! تو ملیک و مقتدر ہے ہمیں اس طرح کی توفیق عطا فرما کہ ہم ایمان و عمل اور تقوٰے کے سائے میں مقام صدق میں تیرے جوارِ رحمت کے زیرِ سایہ قیام پذیر ہوں۔

پروردگارا! ہم ایمان رکھتے ہیں کہ قیامت کا دن گنہگاروں کے لیے وحشت ناک تلخ اور ناگوار ہے۔ اس دن ہماری اُمید صرف تیرے لُطف و کرم سے وابستہ ہے۔

بارالٰہا! ہمیں بیدار رُوح اور ہوشیار عقل مرحمت فرما تاکہ ہم گزشتہ لوگوں کے حالات سے درسِ عبرت حاصل کریں اور اس راستے پر نہ چلیں جس پر چل کر وہ ہلاک ہوئے۔

سُورۂ قمر کا اختتام ۷، ربیع الثانی ۱۴۰۶ ھ ق

۱۳۶۴/۹/۲۹ ش

اِختتام ترجمہ

۲، شوال ۱۴۰۷ھ

قم بر مکانِ حقیر

حاشیہ گذشتہ صفحہ

---

[1] "لمح" (بروزن مسح) اصل میں بجلی کے کوندنے کے معنی میں ہے، اس کے علاوہ یہ تیز نگاہ ڈالنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

[2] رُوح المعانی، ج ۲۷، صفحہ ۸۳

سُورَۂ الرحمٰن

- یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔
- اس کی ۷۸ آیتیں ہیں۔

۷ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ
۱۳۶۴/۹/۲۹ ش

سُورۂ الرحمٰن کا مضمُون

یہ سُورہ کُلّی طور پر خدا کی ان مختلف مادّی و معنوی نعمتوں کو بیان کرتا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے ارزانی فرمائی ہیں اور انہیں ان میں محصُور کیا ہے۔ اِن نعمتوں کا بیان اس انداز میں ہے کہ اس سُورہ کا نام " سُورہ رحمت " یا " سورہ نعمت" رکھا جاسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ سورہ " الرحمٰن " سے شروع ہوا کہ جو خدا کا اسم مبارک ہے اور اس کی رحمتِ واسعہ کو بیان کرتا ہے اور ختم ہوا خُدائے ذوالجلال کے اجلال واکرام پر۔ فبای آلاء ربکما تکذبان کا جملہ جس کے ذریعے خدانے اپنی نعمتوں کا اپنے بندوں سے اقرار لیا ہے اکتیس مرتبہ اس سُورہ میں آیا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ سارا سُورہ خداوند منّان کی مختلف نعمتوں کا باہم پیوستہ ایک ہی حصّہ ہے لیکن دوسرے لحاظ سے اس کے مضامین کو چند حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا حصّہ : جو سُورہ کا مقدمہ اور آغاز ہے۔ یہ خدا کی عظیم نعمتوں، خلقت، تعلیم و تربیّت ، حساب و میزان، انسان کے رفاہی وسائل و ذرائع اور اس کی جسمانی و رُوحانی غذاؤں کی گفتگو کرتا ہے۔

دُوسرا حصّہ : جن و انس کی خلقت کی کیفیّت کے مسئلہ کی ایک وضاحت ہے۔

تیسرا حصّہ : زمین و آسمان میں جو خُدا کی آیات اور نشانیاں ہیں ان کو بیان کرتا ہے۔

چوتھا حصّہ : یہاں دُنیاوی نعمتوں سے آگے بڑھ کر دوسرے جہان کی نعمتوں کے بارے میں گفتگو ہے۔ اس میں دقّتِ نظر اور شیرینیٔ گفتار کے ساتھ جنّت کی نعمتوں کی تمام جزئیات، عام اس سے کہ وہ باغات ہوں یا چشمے، پھل ہوں یا خُوبصورت و باوفا ازواج یا انواع و اقسام کے لباس، ان سب کی وضاحت کی ہے۔

اِس سُورہ کے پانچویں اور آخری حصّہ میں مجرمین کے انجام کی طرف ایک مختصر اشارہ ہے اور ان کی دردناک سزا کا ذکر ہے چونکہ اِس سورہ کی اساس و بُنیاد رحمتِ الٰہی کا بیان ہے اس لیے اس آخری حصّہ کی وضاحت نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس جنّت کی نعمتوں کی تفصیل و تشریح اتنی وسعت کے ساتھ ہے کہ اس نے مومنین کے دلوں کو سرور و مسرّت سے ہمکنار کر دیا ہے اور غم و اندوہ کے غبار کو انکے دلوں سے دھو ڈالا ہے اور کشتِ دل میں نہالِ شوق کی تخم ریزی کی ہے (فبایّ آلاء ربکما تکذبان) کی تکرار نے جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہے اس سُورہ کو جاذبِ نظر اور خوبصورت آہنگ بخشا ہے۔ جب اس آہنگ کو اس کے خوبصُورت مضامین کے ساتھ ملا دیا جائے تو حیران کُن کشش محسوس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت کوئی تعجّب محسوس نہیں ہوتا جب پیغمبرِ اسلامؐ سے منقول ایک حدیث نظر کے سامنے آتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا

(لکل شیء عروس و عروس القرآن سُورة الرحمٰن جل ذکرہ)

"ہر ایک کے لیے عروس ہے اور عروس القرآن سُورہ الرحمٰن ہے"۔ [1]

قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ لفظ عروس اگرچہ فارسی زبان میں صرف عورت کے لیے ہی بولا جاتا ہے لیکن لغت عرب میں عورت مرد دونوں کے لیے، جب تک وہ مراسمِ عروسی میں رہیں، ان پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ [2]

اور چونکہ عورت و مرد اس قسم کے مراسم میں بہترین حالات اور کامل ترین احترامات کے عالم میں ہوتے ہیں اس لیے یہ لفظ بہت ہی خوبصورت، محترم اور گرامی قدر موجودات کے لیے بولا جاتا ہے۔

اس سُورہ کے لیے "الرحمٰن" کا نام اس قدر موزوں اور مناسب ہے کہ جس کی لفظوں کے ذریعے وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ـــــ

[1] "مجمع البیان" آغاز "سُورہ رحمٰن" یہ حدیث "دُرالمنثور" ج ٦ ص ۱۴۰ پر مندرج ہے۔

[2] "لسان العرب" (مجمع البحرین و صحاح اللغات و ۔۔۔۔۔)

سُورۃ الرحمٰن کی تلاوت کی فضیلت

چونکہ یہ سُورہ نعمتوں کی شکرگزاری کے احساس کو انسانوں میں نہایت عمدہ انداز میں بیدار کرتا ہے اور دنیا و آخرت کے مادّی و معنوی مواہب کے بیان سے انسان کے شوقِ بندگی و اطاعت میں اضافہ کرتا ہے اس لیے اس کی تلاوت کی فضیلتیں بھی بہت زیادہ بیان ہوئی ہیں۔ تلاوت وہ کہ جو انسانی رُوح کی گہرائیوں میں نفوذ کرے اور احساسِ حقائق کے لیے تحریک کی باعث ہو نہ کہ صرف زبان تک محدود رہے۔

رسُولِ خُداؐ کی ایک حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ: (من قرأ سورۃ الرحمٰن رحم اللہ ضعفہ وادی شکر ما انعم اللہ علیہ) "جو شخص سورہ رحمٰن کو پڑھے تو خدا نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے سلسلہ میں اس کی کمزوری پر رحم کرے گا اور نعمتوں کی شکرگزاری کا حق، کہ جو اسے عطا کی گئی ہیں، خود ادا کرے گا"۔[1]

ایک اور حدیث میں جو ثواب الاعمال کے بارے میں ہے امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ: "سُورۃ الرحمٰن کی تلاوت اور اس کے ساتھ قیام کو ہرگز نہ چھوڑنا کیونکہ یہ سُورہ منافقین کے دل میں ہرگز استقرار نہیں پاتا اور خُدا اس سورہ کو قیامت کے دن ایک انسان کی شکل عطا کرے گا جو بہت ہی خوبصورت ہو گا اور جس میں سے بہت ہی عمدہ خوشبو آتی ہوگی۔ پھر وہ ایسی جگہ قیام کرے گا کہ جو خداوندِ متعال سے بہ اعتبارِ معنی بہت زیادہ قریب ہوگی تو خدا اس سورہ سے پوچھے گا کہ دُنیاوی زندگی میں کونسا شخص تیرے مضامین کے ساتھ قیام پذیر ہوتا تھا اور ہمیشہ تیری تلاوت کرتا تھا۔ وہ سُورہ جواب میں کہے گا کہ پروردگار وہ فلاں فلاں اشخاص ہیں۔ اس وقت ان افراد کے چہرے چمکنے لگیں گے۔ اب خُدا ان لوگوں سے مخاطب ہوکر کہے گا کہ تم جس جس کے لیے چاہتے ہو بخشش کی سفارش کرو۔ وہ جتنی آرزو اپنے دل میں رکھتے ہوں گے اپنے لوگوں کی بخشش کی سفارش کریں گے اور ہر وہ شخص جس کی بخشش کی وہ سفارش کریں گے اس سے کہا جائے گا کہ جنّت میں داخل ہو جا اور جہاں چاہتا ہے سکونت اختیار کرلے"۔[2]

ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ نے فرمایا ہے: (من قرأ سورۃ الرحمٰن فقال عند کل "فبای اٰلاء ربکما تکذبان" لا بشیء من اٰلائك رب اکذب فان قرأها لیلاً ثم مات مات شهیداً وان قرأها نهاراً فمات مات شهیداً)

جو شخص سُورۃ "الرحمٰن" کی تلاوت کرے، جب وہ آیت فبای اٰلاء ربکما تکذبان پڑھے تو کہے لا بشیء من اٰلائك رب اکذب یعنی "خداوندا! میں تیری کسی نعمت کا انکار نہیں کرتا"۔ اگر وُہ رات کو تلاوت کرے اور اسی شب انتقال کر جائے تو وہ شہید قرار پائے گا اسی طرح اگر دن کو تلاوت کی ہو اور وہ اسی دن انتقال کر جائے تو بھی شہید قرار پائے گا۔

---

[1] نور الثقلین، ج ۵، ص ۱۸۷

[2]،[3] بحار الانوار ج ۹۲، ص ۳۰۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ اَلرَّحْمٰنُ ۙ

۲۔ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ

۳۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ

۴۔ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ○

۵۔ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۙ

۶۔ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ○

ترجمہ :

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ خداوند رحمٰن نے

۲۔ قرآن کی تعلیم دی

۳۔ اِنسان کو خلق کیا

۴۔ اور اُسے بیان کی تعلیم دی

۵۔ سُورج اور چاند منظّم حساب کے تحت گردش کرتے ہیں ۔

۶۔ اور ستارے اور درخت اسے سجدہ کرتے ہیں ۔

تفسیر

خُدا کی نعمتوں کا آغاز

چونکہ یہ سُورہ خدائے عظیم کی عطا کی ہوئی نعمتوں کو بیان کرتا ہے اس لیے رحمٰن کے اس مقدس نام سے شروع ہوتا ہے کہ جو اس کی رحمتِ واسعہ کی رمز ہے ۔ اگر اس میں رحمانیت کی صفت نہ ہوتی تو بلا امتیاز دوست و دشمن وہ اس قسم کا خوانِ نعمت نہ بچھاتا۔ اسی لیے فرماتا ہے : " خداوند رحمٰن نے " (الرحمٰن)[1] " قرآن کی تعلیم دی " (علّم القراٰن)۔

پروردگارِ عالم اس طرح سب سے پہلے اپنی اہم ترین نعمت یعنی تعلیم قرآن کو بیان کرتا ہے ۔ یہ بہت ہی پُر کشش اور پُر معنی تعبیر ہے ۔ اگر ہم صحیح فکر سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہو جائے کہ قرآن مجید تمام نعمتوں کا سرچشمہ بھی ہے اور ہر نعمت تک پہنچنے کا ذریعہ بھی ۔ ہم اس کے ذریعہ مادی اور معنوی نعمتوں سے استفادہ کر سکتے ہیں ۔ وہ چیز جو بہت زیادہ قابلِ توجہ ہے ، یہ ہے کہ پروردگارِ عالم تعلیم قرآن کی نعمت کے بیان کو " خلقتِ انسان " اور " تعلیم بیان " ان دونوں سے پہلے بیان فرماتا ہے ۔ حالانکہ ترتیب طبیعی کے لحاظ سے پہلے " خلقتِ انسان " کا پھر تعلیم بیان کا اور پھر " تعلیم قرآن " کی نعمت کا ذکر ہونا چاہیئے تھا لیکن عظمتِ قرآن کا یہ تقاضا تھا کہ ترتیب طبیعی کے برخلاف سب سے پہلے تعلیم قرآن کو موضوعِ گفتگو بنائے ۔ یہ آیت مشرکینِ عرب کے جواب کے طور پر ہے ۔ جب پیغمبر اسلام نے مُشرکین سے کہا کہ خدائے رحمٰن کو سجدہ کریں تو انہوں نے یہ بہانہ بنایا کہ : (وما الرحمٰن) " رحمٰن کیا ہے " (فرقان ۔ ۶۰)۔ قرآن کہتا ہے : " خداوند رحمٰن وہ ہے جس نے قرآن کی تعلیم دی ، انسان کو پیدا کیا اور پھر اُسے بیان کی تعلیم دی "۔ بہرکیف رحمٰن کا نام پروردگارِ عالم کے تمام ناموں کے مقابلہ میں " اللہ " کے بعد سب سے زیادہ مفہوم کا حامل ہے ۔

ہمیں معلوم ہے کہ خدا دو قسم کی رحمتوں کا مالک ہے ۔ ایک " رحمتِ عام "، دوسری " رحمتِ خاص "۔ رحمٰن کا نام اُس کی اُس رحمتِ عام کی طرف اشارہ ہے کہ جو اہلِ ایمان و اطاعت کے حال پر ہے اور صرف ان کے لیے مخصوص ہے ۔ اس وجہ سے رحمٰن کے نام کا اطلاق کبھی غیر خدا پر نہیں ہوتا سوائے اس صُورت کے کہ وہ لفظ عبد کے ساتھ ہو ۔ لیکن رحیم کی صفت دُوسروں کے لیے بھی بولی جاتی ہے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی بھی رحمتِ عامہ کا مالک نہیں ہے ۔ جہاں تک رحمتِ خاص کا تعلق ہے تو وہ کمزور شکل ہی میں سہی لیکن انسانوں اور دوسرے موجودات میں پائی جاتی ہے ۔ امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث ہے کہ (الرحمٰن اسم خاص بصفة عامة والرحیم اسم عام بصفة خاصة) " رحمٰن ایک خاص اسم ہے جو صفتِ عمومیت رکھتا ہے یعنی ایسا نام ہے کہ خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن اس کی رحمت سب کے شامل حال ہے "۔

---

[1] " الرحمٰن " مبتدا ہے اور " علّم القراٰن " اس کی خبر ہے اور " خلق الانسان " خبر کے بعد خبر ہے ۔ اس جملے کی ترکیب میں اور احتمالات کی نشان دہی بھی کی گئی ہے لیکن چونکہ قابلِ توجہ نہیں تھے لہٰذا ان کے ذکر سے پہلوتہی کی گئی ہے ۔

"رحیم" ایک عام اسم ہے لیکن خاص صفت کے ساتھ۔ یہ ایک ایسی صفت ہے کہ جو خدا اور غیر خدا دونوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جیسا کہ قرآن مجید نے پیغمبر اسلام کو "رؤف رحیم" کہا ہے۔ (سورہ توبہ ـ ۱۲۸) لیکن یہ رحمت مخصوص و معین ہے۔

یہ سوال کہ خدا نے قرآن کی تعلیم کسے دی، مفسرین نے اس کی مختلف قسم کی تفسیریں کی ہیں۔ کبھی جبرئیل اور دوسرے فرشتوں کو اس کا مصداق ٹھہرایا ہے کبھی پیغمبر اسلام کی ذات والاصفات کو کبھی تمام انسانوں کو حتیٰ کہ جنات کو بھی چونکہ یہ سورہ جنّ و انس پر ہونے والی خدا کی نعمتوں کو بیان کرتا ہے اس لیے اکتیس مرتبہ ان نعمتوں کے مباحث پیش کرنے کے بعد جنّ و انس سے سوال کرتا ہے کہ: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے"۔ سب سے مناسب یہی تفسیر ہے کہ خدا نے اپنے عظیم پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے جنّ و انس کو قرآن کی تعلیم دی[1]

قرآن کی بے مثال نعمت کے تذکرے کے بعد اہم ترین نعمت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "انسان کو پیدا کیا" (خلق الانسان)۔ یہاں انسان سے مراد نوعِ انسان ہے نہ کہ حضرت آدمؑ کیونکہ چند آیتوں کے بعد ان کے بارے میں علیحدہ گفتگو کرتا ہے۔ اس سے مراد پیغمبرؐ اسلام بھی نہیں ہیں اگرچہ آنحضرتؐ اس کے بہترین اور عمدہ ترین مصداق ہیں۔ دوسری نعمت جو نعمتِ بیان ہے اور جس کا تذکرہ اس کے بعد ہے، وہ بھی اس امر کی شاہد ہے کہ "الانسان" سے مراد عالمِ نوعِ انسانی ہے۔ باقی دوسری تفسیریں صحیح نظر نہیں آتیں۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ انسان ایک عجیب مجموعۂ عالمِ ہستی بھی ہے اور خلاصۂ موجودات بھی۔ ایسا عالمِ اصغر کہ جس میں عالمِ اکبر موجود ہے۔ اس کی خلقت ایک بے نظیر و بے مثل نعمت ہے۔ اس لیے کہ اس کے وجود کا ہر جز بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اگرچہ اپنے وجود کے آغاز میں وہ ایک بے قیمت نطفہ ہے یا زیادہ صحیح لفظوں میں ایک حقیر سا وجود ہے کہ جو اس نطفہ میں تیرتا ہے لیکن پروردگارِ عالم کی ربوبیت کے سائے میں وہ اپنی تکمیل کے مراحل اس طرح طے کرتا ہے کہ عالمِ خلقت کے شریف ترین مقام پر ارتقا پذیر ہو جاتا ہے۔ "قرآن" کے بعد "انسان" کے نام کا ذکر بھی قابلِ غور ہے کیونکہ قرآن تدوینی صورت میں اسرارِ ہستی کا مجموعہ ہے اور انسان تکوینی صورت میں ان اسرار کا خلاصہ ہے اور ان میں سے ہر ایک اس وسیع و عظیم عالم کا ایک نسخہ "کتاب" ہے۔ بعد والی آیت خلقتِ انسان کی نعمت کے بعد ایک اہم ترین نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتی ہے: "خدا نے اسے بیان کی تعلیم دی" (علمہ البیان)۔

بیان لغوی مفہوم کے اعتبار سے ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور یہ ہر اس چیز کے لیے بولا جا سکتا ہے جو دوسری چیز کی مبیّن اور واضح و آشکار کرنے والی ہو۔ اس بنا پر نہ صرف نطق اور سخن کے معنوں میں ہے بلکہ اس سے مراد کتابت، تحریر اور انواع و اقسام کے عقلی و منطقی استدلال بھی ہیں جو مختلف اور پیچیدہ مسائل کے واضح کرنے والے ہیں۔ وہ سب کے سب بیان کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اگرچہ معانی کے اس مجموعہ کی طرف اشارہ کرنے والی چیز وہی بات کرنا ہے۔ ہم کو عادت ہے کہ ہم بات کرنے کو ایک سادہ سی بات سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بات کرنا انسانی اعمال میں سے ایک پیچیدہ ترین اور خوب ترین عمل ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی کام بھی ایسی پیچیدگی اور ذہانت پر مبنی نہیں ہے جتنا کہ بات کرنا۔ اور وہ اس لیے کہ ایک طرف مختلف قسم کی آوازیں نکالنے کے لیے آواز سے تعلق رکھنے

---

[1] یہ کہ علم کا پہلا مفعول محذوف ہے یا دوسرا مفعول، مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے۔ مناسب یہی ہے کہ پہلا مفعول حذف ہوا ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے (علم الانس والجن القرآن)۔ بعض مفسرین نے جو یہ احتمال تجویز کیا ہے کہ علم کا ایک سے زیادہ مفعول نہیں ہے اور علامت قرار دینے کے معنی میں ہے، یہ مفہوم بہت بعید ہے۔

والے کل پُرزے ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ پھیپھڑے، ہوا کو اپنے اندر جمع کرکے اس کو بتدریج نرخرہ سے باہر بھیجتے ہیں اور آواز سے تعلق رکھنے والے تاروں میں آواز پیدا کر دیتے ہیں حالانکہ آوازیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ ان میں سے کوئی رضامندی کی نشانی ہوتی ہے تو کوئی غیظ و غضب کی، کوئی عام گفتگو کی، کوئی مدد طلب کرنے کی کوئی محبت کی علامت ہوتی ہے کوئی عداوت کی۔ پھیپھڑے اِن آوازوں کو وجود میں لاتے ہیں۔ اس کے بعد آواز، زبان، ہونٹ، دانتوں اور فضائے ذہن کی مدد سے حروف و الفاظ کو نہایت تیزی کے ساتھ وجود میں لاتی ہے۔ بالفاظ دیگر وہ طویل اور ایک طرح کی آواز جو نرخرہ سے باہر آتی ہے اس کی مختلف طریقوں سے قطع و برید ہوتی ہے جس سے حروف تشکیل پاتے ہیں۔

دُوسری طرف لغتوں کی تشکیل کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ انسان فکری ترقی کے زیرِ اثر اپنی مادّی و معنوی ضرورتوں کے ماتحت مختلف قسم کی زبانیں بناتا ہے۔ اس کی اس زبان سازی کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ دُنیا میں موجود زبانوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ صحیح طور پر ان کو شمار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ نئی نئی زبانیں اور لُغتیں بتدریج تشکیل پاتی رہتی ہیں۔ بعض محققین کے نزدیک دنیا میں رائج زبانوں کی تعداد تین ہزار کے قریب ہے اور بعض کے نزدیک زبانوں کی یہ تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔[1]

محسُوس یہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کا مقصد یہ تھا کہ وہ صرف بُنیادی اور اصولی زبانوں کو شمار کریں ورنہ اگر مقامی بولیوں پر بھی نظر کی جائے تو زبانوں کی تعداد کہیں زیادہ نظر آتی ہے۔ بعض اوقات قریب قریب واقع دو دیہات کے باشندے دو مختلف مقامی بولیوں میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں۔

سوم عقل و فکر کے مطابق احساسات کے بیان اور استدلال و جملہ سازی کی تنظیم کا وہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ جو بیان اور نطق کی رُوح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گفتگو انسان سے وابستہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مختلف قسم کے جانور اپنی ضرورتوں کو سمجھانے کے لیے مختلف قسم کی آوازیں نکالتے ہیں لیکن ان آوازوں کی تعداد بہت ہی کم اور غیر واضح ہے۔ جب کہ غیر محدود اور وسیع شکل کا جو بیان ہے وہ انسان ہی کے اختیار میں ہے۔ کیونکہ خدا نے گفتگو کرنے کی قدرت زیادہ تر اسی کو بخشی ہے۔ اس سے آگے بڑھیں تو یہ نظر آتا ہے کہ اگر ہم بیان کے نقوش اور اس کے اثرات، انسانی زندگی کے بتدریج ارتقاء اور تمدنوں کی تخلیق کو پیشِ نظر رکھیں تو ہم اس بات کا یقین حاصل کر لیں گے کہ اگر بیان کی نعمت نہ ہوتی تو انسان اپنے علوم و تجربات کو آسانی کے ساتھ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل نہ کر سکتا اور وہ علم و دانش، تمدن اور اخلاق کی ترقی کا باعث نہ بنتا۔ اگر کبھی یہ نعمت انسان سے سلب کر لی جائے تو انسانی معاشرہ بڑی تیزی کے ساتھ تنزل کا شکار ہو جائے۔

اگر بیان کو اس کے وسیع معانی میں لیا جائے کہ جو تحریر و کتابت، انواع و اقسام کے ہُنر اور فنون پر حاوی ہے تو انسانی زندگی میں اس کے اثرات نہایت اہم انداز میں واضح ہوں گے۔ یہ وہ منزل ہے کہ جہاں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ سُورۂ الرحمٰن میں جو پروردگارِ عالم کی نعمتوں کے حوالوں کا مجموعہ ہے، نعمتِ خلقتِ انسان کے بعد تعلیم بیان کی گفتگو کیوں ہوئی ہے۔

اِس کے بعد پروردگارِ عالم نے اپنی نعمتوں میں سے چوتھی نعمت کو موضوعِ گفتگو بنا کر فرمایا ہے: "چاند اور سُورج ایک منظم حساب کے ماتحت گردش کرتے ہیں" (الشمس والقمر بحسبان)۔[2]

---

[1] "دائرۃ المعارف" فرید وجدی جلد ۸ ص ۳۶۴ مادہ "لغت"

[2] "حسبان" بروزن "غفران" مصدر ہے جو حساب اور نظم و ترتیب کے معنی میں ہے اور آیت میں کچھ محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے (الشمس والقمر تجریان بحسبان) سُورج اور چاند کا سفر حساب کے ساتھ جاری ہے۔

خود سورج کا وجود انسان کے لیے عظیم ترین نعمت ہے اور وہ اس لیے کہ اس سے حرارت اور نور حاصل کیے بغیر نظامِ شمسی میں زندہ رہنا غیر ممکن ہے۔ اس سے قبل ہم عرض کر چکے ہیں کہ کرۂ خاکی میں جو بھی جنبش و حرکت صورت پذیر ہے اس کا اصل سرچشمہ سورج کی حرارت اور اس کی روشنی ہے۔ گھاس کا اُگنا، بڑھنا، غذائی ذخیرے، بارشیں، ہواؤں کا چلنا یہ سب اسی نعمت کی برکت کی وجہ سے ہے۔ چاند بھی حیاتِ انسانی کے سلسلہ میں اپنا فرض ادا کرتا ہے۔ علاوہ اس کے کہ چاند انسان کی تاریک راتوں کا چراغ ہے وہ قوّتِ جاذبہ کہ جو سمندروں کے مدّ و جزر کا سرچشمہ ہے سمندر سے متعلق زندگی کے باقی رہنے کا ایک بڑا سبب ہے اور بہت سے ساحلوں کو سیراب کرنے کا باعث ہے کہ دریا جن کی مجاورت میں سمندر میں گر جاتے ہیں۔

اس سب پر مستزاد یہ کہ یہ طے شدہ ہے کہ چاند اور سورج کی حرکت کا نظام (بالفاظِ دیگر چاند کی گردش زمین کے گرد اور زمین کی گردش سورج کے گرد) رات اور دن، مہینے اور سال اور مختلف موسموں کی مرتب و منظم تخلیق کا باعث ہے اور انسانوں کی زندگی، ان کے صنعتی، زرعی اور تجارتی امور کے لیے پروگرام بنانے کے نظم و ضبط کا سبب ہے۔ اگر یہ منظم سفر نہ ہوتا تو انسانی زندگی کا نظام ہرگز تشکیل نہ پاتا۔

نہ صرف یہ کہ ان آسمانی کُروں کی حرکت بہت دقیق نظام رکھتی ہے بلکہ ان کے اجسام اور قوّتِ جاذبہ، زمین سے ان کا فاصلہ اور آپس میں ایک دوسرے سے فاصلہ یہ سب از رُوئے حساب ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ چیزیں ایک دوسرے سے متصادم ہو جائیں تو نظامِ شمسی میں عظیم انقلابات برپا ہو جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی بھی درہم برہم ہو جائے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ جس وقت اس نظام کے اجزا کُرۂ خورشید سے جُدا ہوئے تو بہت ہی بکھرے ہوئے اور غیر مرتب نظر آتے تھے۔ آخرکار ان کی موجودہ ترتیب صورت پذیر ہوئی۔ اس سلسلہ میں امورِ طبیعی کے ایک ماہر کا کہنا ہے کہ: ہمارا نظامِ شمسی بظاہر ایک ایسے مخلوط درہم و برہم مواد سے وجود میں آیا ہے کہ جو سورج سے بارہ ہزار درجہ کی حرارت لیے ہوئے جُدا ہوا اور ناقابلِ تصور تیزی کے ساتھ فضائے لامحدود میں بکھر گیا۔ لیکن اس ظاہری بے ترتیبی اور فضائی انقلاب سے اس قسم کی دقیق ترتیبِ عالم وجود میں آئی ہے کہ ہم آج آئندہ حادثات کے منٹ اور سیکنڈ کے بارے میں پیشین گوئی کر سکتے ہیں۔ اس نظام و ترتیب کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے اوضاعِ فلکی ہزار ملین سال گزر جانے کے باوجود اسی حالت پر باقی ہیں[1]۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ سورج اگرچہ نظامِ شمسی کے وسط میں بظاہر بغیر کسی حرکت کے قائم ہے لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ وہ بھی اپنے تمام چاند ستاروں کے ہمراہ اسی کہکشاں کے اندر جس سے وہ تعلق رکھتا ہے معین نقطہ کی طرف حرکت کر رہا ہے اور اس کی یہ حرکت بھی ایک معین تیزی و تنظیم رکھتی ہے۔

پانچویں عظیم نعمت کے سلسلہ میں پروردگارِ عالم آسمان سے زمین کی طرف رُخ کر کے فرماتا ہے: "گھاس اور درخت اس کے لیے سجدہ کرتے ہیں"۔ (والنجم والشجر یسجدان)۔ نجم کبھی تو ستارہ کے معنی میں آتا ہے اور کبھی ایسی گھاس کے معنی میں آتا ہے جس کا کوئی تنا نہ ہو اور یہاں شجر کے قرینہ سے دوسرے معنی ہی مراد ہیں یعنی وہ گھاس جو تنے کے بغیر ہو[2]۔

---

[1] "راز آفرینش انسان" ص ۲۸۔

[2] راغب مفردات میں کہتا ہے کہ النجم ما لا ساق لہ من النبات۔ جس نبات کا تنا نہ ہو وہ نجم ہے۔

اصولی طور پر یہ لفظ طلوع کے معنی میں ہے اور گھاس کو اگر " نجم " کہا گیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ زمین سے سر نکالتی ہے اور ستارے کو نجم کہا جاتا ہے تو وہ بھی اسی بنا پر کہ وہ طلوع ہوتا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ انسانوں کا تمام موادِ غذائی اس امتیاز کے ساتھ نباتات سے لیا گیا ہے کہ بعض کو تو انسان براہِ راست اپنے مصرف میں لاتا ہے اور بعض نباتات ایسے جانوروں کی غذا بنتے ہیں جو انسانوں کے غذائی مواد کا جُز ہیں۔ یہ معنی دریائی جانوروں کے سلسلہ میں بھی صحیح طور پر منطبق ہوتے ہیں کیونکہ وہ بھی بہت سے ایسے چھوٹے نباتات سے غذا حاصل کرتے ہیں جو کروڑوں کی تعداد میں سمندر کے گوشہ و کنار میں سُورج کی روشنی کے پَرتو میں اُگتے ہیں اور سمندروں کی موجوں کے درمیان چلتے پھرتے ہیں۔ اس طرح نجم مختلف قسم کے چھوٹے اور رینگنے والے نباتات وغیرہ (مثلاً کدو اور کھیرے کے بوٹے) کو کہتے ہیں اور شجر مختلف قسم کے تنہ دار نباتات کو کہتے ہیں جیسے غلّے اور میوہ دار درخت وغیرہ۔

اور (یسجدان) " یہ دونوں سجدہ کرتے ہیں " کا مفہوم قوانینِ آفرینش کے مقابلہ میں انسانوں کی منفعت کے لیے ان دونوں کا بغیر کسی قید و شرط کے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ یہ وہ راستہ ہے کہ جو خدا نے ان کے لیے مقرر کیا ہے اور یہ اس پر بلا چون و چرا مصروفِ سفر ہیں ضمنی طور پر یہ ان کے سرِ وحدت کی طرف بھی اشارہ ہے اور وہ اس طرح کہ نبات کے ہر پتّے اور ہر دانہ پر پروردگارِ عالم کی عظمت اور اس کے علم کی عجیب و غریب نشانیاں موجود ہیں اور ہر ورق معرفت پروردگار کا دفتر بے پایاں ہے۔[۱]

مفسّرین کی طرف سے یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ اُوپر والی آیت میں " النجم " سے مراد آسمان کے ستارے ہیں لیکن جو کچھ ہم نے اُوپر کہا ہے آیت میں موجود قرائن کی بنا پر زیادہ مناسب ہے۔

ایک نکتہ

چند روایات پر ایک نظر

مذکورہ بالا آیات کے ذیل میں اسلامی سرچشموں میں ایسی روایات موجود ہیں جو تفسیر کُلی کی حیثیت سے روشن ہونے کے مصداق ہیں اور ہر ایک تفسیر آیات کے ایک حصّہ کو واضح کرتی ہے۔ امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث ہے کہ آپ نے (علمه البیان) کی تفسیر کے سلسلہ میں فرمایا: (البیان الاسم الاعظم الذی به علم کل شیء) " بیان وہی اسمِ اعظم ہے کہ جس کے ذریعے تمام چیزوں کا علم حاصل ہوتا ہے "۔[۲]

اسمِ اعظم اور اس کی تفسیر کے بارے میں جلد ۴ پر (سُورہ اعراف کی آیت ۱۸۰ کے ذیل میں) ہم نے بحث کی ہے۔ ایک اور حدیث میں امام علی ابن موسیٰ رضاؑ سے مروی ہے کہ: (الرحمٰن علم القرآن) سے مُراد یہ ہے کہ خدا نے پیغمبر کو قرآن کی تعلیم دی اور خلق الانسان سے مُراد امیر المومنینؑ کی تخلیق ہے اور (علمه البیان) ان تمام امور کا بیان ہے کہ جن کے لوگ محتاج ہیں۔ یہ امر واضح ہے کہ مذکورہ روایتیں ان آیتوں کے مفہوم کی عمومیت کو محدود نہیں کرتیں بلکہ ان کے واضح مفہوم کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔

---

[۱] عالمِ ہستی کے مختلف موجودات کے سجدے کے بارے میں ہم تفصیل کے ساتھ جلد ۷ (سُورہ حج کی آیت ۱۸ کے ذیل میں) بحث کر چکے ہیں۔ اس طرح جلد ۶ (سُورہ اسرا کی آیت ۴۴ کے ذیل میں) ہم مفصل بحث کر چکے ہیں۔

[۲] تفسیر " مجمع البیان " جلد ۹ ص ۱۹۷

۷۔ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۙ
۸۔ اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ ۝
۹۔ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝
۱۰۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۙ
۱۱۔ فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ۖ
۱۲۔ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ۚ
۱۳۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

ترجمہ

۷۔ اور آسمان کو بلند کیا اور (اس میں) میزان و قانون رکھا۔
۸۔ تاکہ تم میزان میں زیادتی نہ کرو۔
۹۔ وزن کو عدل کی بُنیاد پر قائم کرو اور میزان کو کم نہ رکھو۔
۱۰۔ اور زمین کو اس کے لوگوں کے لیے پیدا کیا
۱۱۔ جس میں پھل اور شگوفوں سے پُر درخت ہیں۔
۱۲۔ اور ایسے دانے کہ جن میں تنے اور پتے ہیں جو کاہ اور خوشبودار گھاس کی شکل میں نکلتے ہیں۔

۱۳۔ اے گروہ جنّ وانس! تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر

آسمان کو بلند کیا اور ہر چیز کے لیے میزان قرار دی

یہ آیتیں گزشتہ بیان شدہ آیتوں کے ذکر کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ان آیتوں میں پروردگارِ عالم پانچ ایسی عظیم نعمتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اہم ترین ہیں۔ یہاں پہلی آیت میں چھٹی نعمت کی طرف، کہ جو خلقتِ آسمان ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا نے آسمان کو بلند کیا" (والسماء رفعھا)۔ آسمان سے اس آیت میں مراد چاہے اس کی اُوپر والی جہت ہو چاہے ستارے یا زمین کی فضا (وہ عظیم فضائی کھال کہ جس نے اس کُرہ زمین کے اطراف کو گھیر رکھا ہے اور عالمی شعاؤں اور آسمانی پتھروں کے مقابلے میں سپر کی طرح اس کی حفاظت کرتی ہے۔ نیز سُورج کی گرمی اور سمندر سے اُٹھنے والی رطوبت کو بادلوں کی تشکیل اور بارش کے نزول کے لیے اپنے اندر محفوظ رکھتی ہے) کچھ بھی ہو وہ اللہ کی ایک عظیم نعمت ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان کے لیے زندگی گزارنا یا ناقص ہے یا محال ہے۔

جی ہاں! نور و روشنی جو گرمی، ہدایت، حیات اور حرکت کا سبب ہیں آسمان کی طرف سے آئے ہیں۔ بارش آسمان کی طرف سے آئی ہے۔ نزولِ وحی بھی آسمان کی طرف سے ہے (اس صُورت میں آسمان مادی اور معنوی اعتبار سے ایک مفہوم رکھتا ہے)۔ ان سب چیزوں سے قطع نظر بلند شدہ آسمان اپنے تمام معانی و مفاہیم کے ساتھ خدا کی ایک عظیم نشانی ہے اور اس کی معرفت کے راستے میں انسان کی بہترین مدد کرتی ہے۔ جس وقت اربابِ دانش اس میں غور کرتے ہیں تو بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں: ربنا ما خلقت ھٰذا باطلاً
"پروردگار تُو نے اس عظیم کارخانہ کو بیکار پیدا نہیں کیا۔" (آلِ عمران - ۱۹۱)

اس کے بعد پروردگارِ عالم ساتویں نعمت کا حوالہ دے کر فرماتا ہے: "خُدا نے میزان قرار دی" (ووضع المیزان)۔ میزان ہر قسم کی ناپ تول کے پیمانے کو کہتے ہیں۔ باطل سے حق کا تقابل، ظلم و ستم سے عدالت کا تقابل، قیمتوں کا تعین اور مختلف اجتماعی مرحلوں میں حقوقِ انسانی کا تعین، یہ سب چیزیں میزان ہیں۔ میزان قانونِ تکوینی اور دستورِ تشریعی کے معنی بھی رکھتا ہے۔ اس لیے کہ یہ سب وسیلۂ تقابل و توازن ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ لغت کے اعتبار سے میزان ترازو کو کہتے ہیں جو اجسام کے وزن کو معلوم کرنے کا ذریعہ ہے، لیکن یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ جس میزان کی طرف اس آیت میں خلقتِ آسمان کے ذکر کے بعد اشارہ ہوا ہے وہ ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ جو ناپ تول کے ہر ذریعہ اور تمام تشریعی و تکوینی قوانین کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اس سے نہ صرف اجناس کے وزن کو معین کرنے والا پیمانہ مراد ہے بلکہ اصولی طور پر آسمان کا بلند ہونا اور وہ دقیق نظم و ضبط کہ جو کروڑوں آسمانی کُرّوں پر حاکم ہے، وہ سب کچھ مُراد ہے۔ اس لیے کہ یہ سب طے شدہ میزان و قوانین کے بغیر وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ بعض عبارتوں میں میزان، قرآن، عدل، شریعت، یا ترازو کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو حقیقت میں ان میں سے ہر ایک اس مکمل اور وسیع مفہوم کا ایک صحیح مصداق ہے۔

پروردگارِ عالم بعد والی آیت میں اس موضوع سے ایک پُرکشش اور عُمدہ نتیجہ نکالتے ہوئے فرماتا ہے: (الّا تطغوا فی المیزان)

عالم ہستی میں میزان کے قرار دینے کا مقصد یہ ہے کہ تم بھی میزان کی رعایت کرو اور اس میں سرکشی نہ کرو۔ تم بھی اس عظیم عالم کا ایک حصّہ ہو اور اس وسیع جہان میں تم ایک بے جوڑ ٹکڑے کی طرح ہرگز زندگی نہیں گزار سکتے۔ تمام عالم کا ایک میزان و حساب ہے۔ تمہارا بھی ایک میزان و حساب ہونا چاہیئے۔

اگر اس عالم عظیم سے میزان و قانون کو ختم کر دیا جائے تو یہ تمام کا تمام فنا ہو جائے اور اگر تم بھی نظم و میزان سے بے بہرہ ہو جاؤ تو تم بھی منزلِ فنا کے راہی بن جاؤ گے۔ کتنی پُرکشش اور عُمدہ تعبیر ہے جو کل عالم ہستی سے انسان کی طرف مُنتقل ہو رہی ہے اور عالم کبیر پر حکم چلانے والے قانون کو عالم صغیر یعنی انسانی زندگی پر جو حاکم ہیں اُن قوانین سے ہم آہنگ کر رہی ہے۔ یہ ہے حقیقتِ توحید کہ تمام عالم پر حکومت کرنے والے اصول ایک ہی جیسے ہیں۔ دوبارہ مسئلہ عدالت اور وزن پر زور دیتے ہوئے فرماتا ہے: "تم وزن کو عدالت کی بنیاد پر قائم کرو اور میزان میں کسی قسم کی کمی نہ رکھو" (واقیموا الوزن بالقسط ولا تخسروا المیزان)۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ ان تین آیتوں میں تین مرتبہ میزان کا ذکر ہوا ہے حالانکہ دوسرے اور تیسرے مرحلہ میں ضمیر سے کام چلایا جا سکتا تھا۔ اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ "میزان" ان تین آیتوں میں الگ الگ معنی لیے ہوئے ہے۔ محض ضمیر کے حوالے سے صحیح معنی واضح نہیں ہو سکتے تھے نیز آیتوں کا تناسب بھی اسی امر کو قبول کرتا ہے، کیونکہ پہلے مرحلہ میں گفتگو ایسی میزان اور ایسے معیار و قوانین سے ہے جو خدا نے سارے عالم ہستی میں قرار دیے ہیں۔

دُوسرے مرحلہ میں گفتگو انسانوں کے انفرادی و اجتماعی تمام موازینِ حیات میں طغیان و سرکشی نہ کرنے کی ہے جو فطرۃً زیادہ محدود دائرہ رکھتے ہیں۔ تیسرے مرحلہ میں وزن کے خاص معنی پر زور دیتے ہوئے حُکم نافذ کرتا ہے کہ چیزوں کی ناپ تول اور وزن کرتے وقت کسی قسم کی کمی نہ کرو اور کوئی کسر باقی نہ چھوڑو۔ ظاہر ہے کہ یہ مرحلہ محدود ہے۔ اس طرح تینوں آیتوں میں میزان اور ناپ تول کے مسئلہ میں ایک نہایت پُرکشش اور خوبصورت سلسلۂ مراتب استعمال ہوا ہے کہ جو بڑے دائرہ سے چھوٹے دائرہ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔[1]

اِنسانی زندگی میں میزان کی اہمیت اپنے تمام معانی کے اعتبار سے اس طرح ہے کہ محدود ترین مصداق یعنی ترازو چیزوں کے تبادلے کے سلسلہ میں اگر ایک دن کے لیے درمیان سے ہٹا دیں تو ہم جھگڑوں اور قضیوں کے کتنے دردِ سر میں مُبتلا ہو جائیں گے۔ اس اعتبار سے اس لفظ میزان کے جو لامحدود مفاہیم ہیں، اگر وہ اپنی جگہ باقی نہ رہیں تو ہمیں لامحدود پریشانیاں لاحق ہو جائیں۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اِس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض روایات میں میزان سے مُراد وجودِ امام لیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امام کا وجودِ مُبارک حق و باطل کے تقابل و تعین اور تشخیصِ حقائق کا معیار ہے اور ہدایت کے لیے ایک مؤثر عامل ہے۔[2]

اِسی طرح میزان سے مُراد اگر قرآن لیا جائے تو وہ بھی انہی معانی کی طرف اشارہ ہے۔ بہرحال اس طرف توجہ دیتے ہوئے کہ یہ تمام آیتیں اللہ کی نعمتوں کے ذکر سے متعلق ہیں، یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ میزان کا وجُود، خواہ سارے نظامِ عالم میں ہو، خواہ انسانی معاشرہ کے اجتماعی روابط میں اور خواہ وہ معاملات تجارت میں ہو یہ سب خدا کی عظیم نعمتوں میں سے ہے۔

اس کے بعد پروردگارِ عالم آسمان سے ہٹ کر زمین کو موضوع بناتا ہے اور فرماتا ہے: "خدا نے زمین کو انسانی زندگی کے لیے پیدا کیا ہے"

---

[1] "فخر رازی" اپنی تفسیر میں کہتا ہے کہ میزان پہلی آیت میں اسم آلہ ہے۔ (ناپ تول کے پیمانوں کے معنی میں) اور دوسری آیت میں مصدری معنی رکھتا ہے (وزن کرنا) اور تیسری آیت میں مفعولی معنی رکھتا ہے اور جنس موزون کے معنی میں ہے۔

[2] یہ حدیث تفسیر "علی بن ابراہیم" میں امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے مروی ہے اور یہ حدیث مفصل ہے ہم نے اس کے صرف ایک حصّہ کے مضمون کو نقل کیا ہے تفسیر علی بن ابراہیم جلد ۲ ص ۳۴۳

(والارض وضعھا للانام)۔ "انام" کی بعض مفسرین نے انسانوں کے معنی میں اور بعض نے جنّ و انس کے معنی میں اور بعض نے ہر ذی رُوح کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ البتہ اربابِ لُغت اور مفسرین کی ایک جماعت اسے خلقِ مطلق کے معنی میں لیتی ہے لیکن سورہ میں موجود قرائن اور جنّ و انس سے مخاطبت دونوں یہ بتاتے ہیں کہ اس سے یہاں مُراد جنّ و انس ہی ہیں

جی ہاں! یہ کُرۂ خاکی کہ جسے اس آیت میں ایک عظیم نعمتِ الٰہی قرار دیا گیا ہے اور دُوسری آیتوں میں اسے "مھاد" یعنی گہوارے کے طور پر یاد کیا گیا ہے وہ ایک اطمینان بخش اور آرام دہ مقام ہے۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ عام حالات میں اس کی اہمیت کو محسوس نہیں کرسکتے لیکن جب ایک چھوٹا سا زلزلہ زمین کی ہر چیز کو ہلا کر رکھ دیتا ہے یا ایک آتش فشاں کسی شہر کو عذاب کے مواد، دُھویں اور آگ کے نیچے دفن کر دیتا ہے تو پھر ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ یہ ساکن و آرام دہ زمین اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ خصوصاً جب ہم اس چیز پر غور کریں کہ جو ماہرین نے زمین کی اپنے گرد چکر لگانے والی حرکت کی تیزی کے طور پر تجویز کی ہے اور سُورج کے گرد اس کی حرکت بتاتی ہے تو نہ صرف اس سریع اور لرزہ براندام کرنے والی حرکت بلکہ انواع و اقسام کی حرکتوں کے باوجود اس کے سکون و آرام کی اہمیّت ہم پر زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔[1]

زمین کے بارے میں "وضع" کا لفظ ہے اور آسمان کے بارے میں "رفع" استعمال ہوا ہے۔ اس تقابل میں جو لطافت ہے اس کے علاوہ اس میں ایک معنی خیز اشارہ ہے اور وہ زمین اور اس کے ان ذرائع کی طرف ہے کہ جو انسان کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں جیسا کہ سُورہ "ملک" کی آیت ۱۵ میں ہمیں ملتا ہے۔ ھو الّذی جعل لکم الارض ذلولًا فامشوا فی مناکبھا وکلوا من رزقہ "وہ وہی ہے کہ جس نے زمین کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے اس کے مختلف راستوں پر چلو پھرو اور جو رزقِ الٰہی کے طور پر اس میں پیدا ہوا ہے اُس سے فائدہ اُٹھاؤ۔ اس طرح پروردگار اس سلسلہ کی آٹھویں نعمت کو معیّن فرماتا ہے۔ اس کے بعد کی آیت میں نویں اور دسویں ان نعمتوں کی طرف جو انسان کے موادِ غذائی کے ایک حصّہ کو تشکیل دیتی ہیں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "زمین میں پھل اور شگوفوں سے پُر نخلستان ہیں"۔ (فیھا فاکھۃ والنخل ذات الاکمام)۔ "فاکھۃ" ہر قسم کے پھل کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ راغب نے "مفردات" میں کہا ہے، اور یہ جو بعض نے اسے خرما اور رطب کے علاوہ تمام پھلوں کے معنی میں لیا ہے اس کی سوائے اس کے کوئی دلیل نہیں ہے کہ "نخل" علیحدہ شکل میں آیت میں موجود ہے جب کہ ممکن ہے کہ یہ تکرار ہو اور اس اہمیّت کی بنا پر ہو کہ جو کھجور کو حاصل ہے۔ "سورہ نحل" کی آیت ۱۱ اور سُورہ مریم کی آیت ۲۵ کے ذیل میں ہم نے ایک تفصیلی بحث خرما کے موادِ غذائی کے حیات بخش فوائد کے بارے میں کی ہے۔[2]

"اکمام" جمع "کم" (بروزن جنّ) کی ہے۔ یہ اس غلاف کو کہتے ہیں جو پھل کو چھپاتا ہے اور "کم" (بروزن قم) اس آستین کے معنی میں ہے جو ہاتھ کو چھپاتی ہے اور "کمہ" (بروزن قبہ) شب کلاہ ہے (رات کو پہننے والی ٹوپی) جو سر کو ڈھانپتی ہے۔[3]

---

[1] ماہرین نے زمین کی سرعتِ حرکت سُورج کے گرد (حرکت انتقالی) ایک منٹ میں ۳۵ کلو میٹر بیان کی ہے اور اس کی اپنے محور کے گرد تیزی کی رفتار ایک گھنٹے میں ۱۶۰۰ کلو میٹر (استوائی منطقوں میں) بتلائی ہے۔

[2] تفسیر نمونہ کی جلد ۷ ص ۲۵۴ سے آگے اور اسی طرح جلد ۶ ص ۲۵۲ سے آگے رجوع فرمائیں۔

[3] اس سلسلہ میں جلد ۲۰ میں ہم نے تفصیل بیان کی ہے (سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۴۷ کے ذیل میں)۔

کھجور کے درخت کے بارے میں اس صفت کا انتخاب کہ شروع میں وہ غلاف میں پنہاں ہوتا ہے، اس کے بعد غلاف کو چیر کر خوشہ نخل کو ایک پُرکشش انداز میں باہر نکالتا ہے، ممکن ہے کہ اس کی حیران کر دینے والی خوبصورتی کی بنا پر ہو یا ان منفعتوں کے باعث ہو کہ جو اس غلاف میں پوشیدہ ہیں اور جو اس مخصوص مادہ کے نچوڑ کا حامل ہے۔ یہ غذا کے طور پر بھی کام آتا ہے اور دوا کے طور پر بھی۔ ان سب سے قطع نظر یہ غلاف شکم مادر کی طرح ہے جو کھجور کے بچّوں کو ایک مُدت تک اپنے اندر پرورش کرتا ہے۔ اور آفات سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور جس وقت وہ ہوا اور روشنی کے مقابلہ کے قابل ہو جاتے ہیں تو پھر غلاف ایک طرف ہٹ جاتا ہے۔ ان سب کے علاوہ اس درخت کی ایک خاص وضع اور کیفیت ہے کہ پہلے یہ غلاف میں ہوتا ہے پھر خوشہ کی شکل میں باہر آتا ہے۔ یہ کیفیت اس پھل کے توڑنے اور چُننے کو آسان کر دیتی ہے اور اگر اس طرح ہوتا کہ کھجور کے درخت کے طویل القامت ہونے کے باوجود اس کے پھل سیب کے درخت کے پھلوں کی طرح مختلف اطراف میں بکھرے ہوئے ہوتے تو ان کا توڑنا اور چُننا بہت مُشکل ہو جاتا۔

آخر میں اپنی گیارہویں اور بارہویں نعمت کے بارے میں یُوں گفتگو فرماتا ہے: "اور زمین میں دانے ہیں، ڈنٹھل اور پتّوں کے ہمراہ جو کاہ کی شکل میں نکلتے ہیں اور اسی طرح خوشبودار گیاہ و نباتات"۔ (والحب ذوالعصف والریحان) ۔ غذائی دانے انسانوں کی خوراک ہیں اور ان کے خشک و تر پتّے ان حیوانوں کی خوراک ہیں کہ جو انسان کی خدمت پر مامور ہیں ۔ جن کے دُودھ، گوشت، کھال اور اُون سے انسان فائدہ اُٹھاتا ہے۔ تو اس طرح کوئی چیز بھی بیکار اور پھینک دینے کے قابل نہیں ہے۔ دوسری طرف خوشبو، گیاہ اور پھولوں کو بھی زمین سے پیدا کیا ہے کہ جو مشامِ جاں کو مُعطّر کرتے ہیں اور رُوح کو سکون و نشاط و آرام و سرخوشی عطا کرتے ہیں اور اس طرح اس نے انسان پر اپنی نعمتیں تمام کی ہیں۔ "حب" ہر قسم کے دانہ کو کہتے ہیں اور "عصف" (بروزن اسپ) پتّوں اور گھاس کے ان اجزا کے معنی میں ہے کہ جو گھاس سے الگ ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ہواؤں کی وجہ سے ہر طرف بکھر جاتے ہیں۔ "حب" کٹی ہوئی گھاس کو بھی کہتے ہیں "ریحان" کے بہت سے معنی ہیں۔ اس کے ایک معنی خوشبودار گھاس اور نباتات کے بھی ہیں۔ ہر قسم کی روزی کو بھی ریحان کہتے ہیں لیکن اس جگہ پہلے معنی ہی مناسب ہیں۔ اِن مادی اور معنوی مختلف قسم کی نعمتوں کے ذکر کے بعد آخری آیت میں جنّ و انس کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے"۔ (فبای اٰلاء ربکما تکذبان) ۔ وہ نعمتیں جن میں سے ہر ایک دوسری سے گرانبہا اور قیمتی ہے اور وہ نعمتیں کہ جنہوں نے تمہاری ساری زندگی کا احاطہ کر رکھا ہے۔ ان میں سے ہر ایک تمہارے پروردگار کی قدرت و لطف و کرم اور مہربانی کی نشانی ہے۔ کس طرح ممکن ہے کہ تم اس کی تکذیب کرو۔ یہ استفہام، استفہامِ تقریری ہے جسے اقرار لینے کے وقت زبان پر لاتے ہیں۔ ایک روایت، جسے سُورہ کی ابتداء میں ہم نے پیش کیا ہے، اس میں حکم دیا گیا ہے کہ اس جملہ کے بعد ہم عرض کریں "پروردگار ہم تیری نعمتوں میں سے کسی کی تکذیب نہیں کرتے"۔ (لا بشیء من اٰلائك رب اكذب)

گزشتہ آیتوں میں گفتگو اگرچہ انسانوں کے بارے میں ہوئی تھی اور گروہِ جنّ کے بارے میں بالکل نہیں تھی لیکن بعد والی آیت بتاتی ہے کہ "کما" کی ضمیر میں یہ دونوں گروہ مخاطب ہیں۔ بہرحال خدا اس جملے کے ساتھ جنّ و انس دونوں گروہوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ان مسائل کے بارے میں غور کریں اور اس کے بعد بغیر اس کے کہ کسی دوسرے کی تعلیم کی ضرورت ہو اپنی عقل سے یہ سوال کریں کہ کیا خدا کی ان نعمتوں میں سے کوئی نعمت قابلِ انکار ہے؛ اور اگر نہیں ہے تو پھر اپنے ولیِ نعمت کو وہ کیوں نہ پہچانیں اور شکرِ منعمِ حقیقی کو کیوں نہ اس کی معرفت کا وسیلہ قرار دیں اور اس کے آستانِ اقدس پر سرِ تسلیم کیوں نہ خم کریں۔

"ایّ" کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ ان نعمتوں میں سے ہر ایک پروردگار کے مقام ربوبیت کی اور اس کے لُطف و کرم کی دلیل ہے چہ جائیکہ ان کا مجموعہ ۔

چند نکات

۱۔ نعمتوں کی شناخت خُدا کی معرفت کا زینہ ہے

مذکورہ بالا نعمتوں (قرآن، خلقتِ انسان، تعلیمِ بیان، زمانہ کا منظم حساب، مختلف درخت اور گھاس کی پیدائش، آسمان کی تخلیق، قوانین کی حاکمیت، زمین کی خلقت اس کی خصوصیات کے ساتھ، پھلوں کی تخلیق، کھجور کی خلقت، حیوانات کی خلقت، خوشبودار گھاس اور پھُولوں کی تخلیق) کے بارے میں تھوڑا سا غور و خوض، ان جزئیات، خصوصیات اور اسرار کے ساتھ کہ جو ان میں سے ہر ایک میں چھُپے ہوئے ہیں، اس بات کے لیے کافی ہے کہ وہ انسان میں احساسِ شکر گزاری پیدا کرے اور انہیں نعمتوں کے سرچشمے کی معرفت کرائے ۔

اس بنا پر خداوند متعال اپنے بندوں سے ان نعمتوں کے بیان کے بعد، ایک ایک لُطف و کرم کا اقرار لیتا ہے اور اس جملے کی آنے والی آیتوں میں بھی دوسری نعمتوں کے ذکر کے بعد تکرار کرتا ہے۔ اس جملے کو اس نے ۳۱ بار دُہرایا ہے۔ یہ تکرار فصاحت کو مجروح نہیں کرتی بلکہ خُود فصاحت کا ایک انداز ہے۔ یہ بالکل اسی طرح سے ہے جیسے کوئی باپ اپنے فرائض سے غافل بیٹے کو مخاطب کر کے کہے : کیا تُو بھُول گیا ہے کہ تُو ایک چھوٹا سا کمزور بچّہ تھا۔ تیری پرورش کے لیے میں نے کیسے کیسے خُون جگر پیئے ہیں۔ کیا تُو بھُول گیا ہے کہ جب تُو بیمار تھا تو مَیں نے بہترین ڈاکٹر اور حکیم تیرے علاج کے لیے مہیا کیے اور تیرے علاج کے لیے مَیں نے کونسی زحمتیں نہیں اُٹھائیں۔ کیا تُو بھُول گیا ہے کہ جب تُو نے منزل شباب میں قدم رکھا اور تجھے بیوی کی ضرورت ہوئی تو تیرے لیے مَیں نے پاک و پاکیزہ بیوی منتخب کی۔ کیا تُو بھُول گیا ہے کہ جب تو مکان، زندگی اور سائل زندگی کی احتیاج رکھتا تھا تو مَیں نے یہ تمام چیزیں تیرے لیے فراہم کیں۔ تو پھر یہ سرکشی و نافرمانی، بے مروّتی و بے وفائی کس لیے ہے۔"

خداوند منان بھی اپنی انواع و اقسام کی نعمتیں اپنے ان غفلت شعار بندوں کو یاد دلاتا ہے اور ان نعمتوں کے ہر حصّہ کے ذکر کے بعد ان سے سوال کرتا ہے کہ " ان میں سے کن کن نعمتوں کا تم انکار کرتے ہو"۔ پس یہ نافرمانی اور سرکشی کس بنا پر ہے جب کہ میری اطاعت بھی خُود تمہارے تدریجی ارتقا اور ترقی کی ضمانت ہے اور تمہارے پروردگار کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

۲۔ زندگی میں نظم و حساب کا مسئلہ

ہمارے جسم میں بیس سے زیادہ دھاتیں اور دھاتوں سے مشابہت رکھنے والی چیزیں استعمال ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک معیّن کیفیت و مقدار میں ہے اور جس وقت ان کی معیّن و مقررہ مقدار و کیفیت میں تھوڑی سی بھی تبدیلی واقع ہو تو ہماری سلامتی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ مثلاً گرمی کے موسم میں جب انسان کو زیادہ پسینہ آتا ہے تو وہ گرمی کی شدّت کا شکار ہو جاتا ہے اور بغیر اس کے کہ کوئی اور بیماری اسے لاحق ہو یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ اس کی موت واقع ہو جائے۔ حالانکہ اس بیماری کا سبب اور اس کی علّت ایک بہت ہی آسان اور سادہ مسئلہ ہے یعنی پانی اور خُون کے نمک کی کمی۔ اور اس کا علاج زیادہ پانی پینے اور نمک کھانے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اسے ہمارے بدن کی عمارت میں

نظم و حساب کا ایک سادہ سا نمونہ سمجھیئے۔ بعض اوقات مخلوقات کے ڈھانچے کے بارے میں جو نتائج اخذ کیے جاتے ہیں وہ بہت ہی عجیب و پُر لطف ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر سیل یا ایٹم جو اس قدر مختصر ہیں کہ ان کا ہزارواں حصہ اور کبھی ایک ملین ملی میٹر یا ملی گرام ہی اس کا سب کچھ ہوتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ ماہرین مجبور ہیں کہ ان کے دقیق اور باریک حسابات کے سلسلہ میں الیکٹرانکی دماغوں سے استفادہ کریں۔ یہ تو نظامِ تکوین میں ہے۔ اجتماعی حالات میں بھی قانونِ عدالت سے انحراف بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ پُوری قوم کو ہلاکت کی راہ پر ڈال دیتا ہے۔ قرآن مجید نے چودہ سو سال پہلے ان مفاہیم کے حوالے سے جو مندرجہ بالا آیات میں ہم تک پہنچے ہیں' اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے اور (والسّماء رفعها ووضع الميزان الّا تطغوا فی المیزان) کے جملوں میں اس نے کہنے کی تمام باتیں کہہ ڈالی ہیں اور شرعی قوانین کی نافرمانی اور ان سے انحراف و رُوگردانی کو احکامِ تکوینی سے سرکشی کے برابر قرار دیا ہے کہ جو آسمانوں پر حاکم ہیں قرآن ان آیتوں میں جہانِ ہستی اور عالمِ انسانیت کی ایک قابلِ توجہ اور عمدہ تصویر پیش کرتا ہے وہاں یہ بھی بتاتا ہے کہ یہی جہان نہیں دُوسرا جہان بھی یوم الحساب ہے اور موازین کے نصب ہونے کا دن ہے بلکہ وہاں کا حساب اور اس کی میزان تو یہاں کے حساب اور میزان سے کہیں زیادہ باریک ہے۔ اسی بنا پر اسلامی روایات میں ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس سے قبل کہ ہم سے حساب لیا جائے ہم خُود اپنا حساب کریں اور اس سے پہلے کہ ہمارا وزن کیا جائے ہم اپنا وزن کرلیں۔ (حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا ووزنوا قبل ان توزنوا)۔

۱۴۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۙ

۱۵۔ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۚ

۱۶۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝

۱۷۔ رَبُّ الْمَشْرِقَیْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَیْنِ ۚ

۱۸۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝

ترجمہ

۱۴۔ انسانوں کو ٹھیکری جیسے خشک شُدہ گارے سے پیدا کیا۔

۱۵۔ اور جنّوں کو آگ کے ملے جُلے متحرک شُعلے سے پیدا کیا۔

۱۶۔ تو تم اپنے پروردگار کی کِس کِس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

۱۷۔ وُہ دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا پروردگار ہے۔

۱۸۔ تو تم اپنے پروردگار کی کِس کِس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر

انسان کی خلقت ٹھیکری جیسی خاک سے ہُوئی ہے

خدا نے گزشتہ نعمتوں کے ذکر کے بعد جن میں انسان کی خلقت بھی تھی اور جسے سر بستہ شکل میں پیش کیا گیا تھا، زیرِ بحث آیات میں پہلے انسان اور جن کی خلقت کے بارے میں تشریح کی ہے۔ تشریح بھی ایسی کہ جو اس کی قُدرتِ کاملہ کی نشان دہی بھی ہے اور سب کے لیے درسِ عبرت بھی۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے: (انسان کو ٹھیکری جیسے خشک شُدہ گارے سے پیدا کیا)

(خلق الانسان من صلصال کالفخار)۔

• "صلصال" اصل میں (خشک جسم میں آواز کے آنے جانے) کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد اس خشک ہو جانے والی مٹی کی طرف اگر اشارہ کریں اور وہ آواز دے تو اُسے صلصال کہا جاتا ہے۔ برتن میں بچے ہوئے پانی کو بھی "صلصلہ" کہتے ہیں کیونکہ وہ اِدھر اُدھر حرکت دینے سے صدا دیتا ہے۔ بعض مفسرین کا یہ قول ہے کہ "صلصال" کے معنی بدبُودار کیچڑ (لجن) کے ہیں لیکن پہلے معنی زیادہ مشہور ہیں۔ "فخار" کا مادّہ "فخر" ہے اس کے معنی اس شخص کے ہیں جو بہت زیادہ فخر کرتا ہو اور چونکہ اس قسم کے افراد اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں اور باتیں زیادہ بناتے ہیں اس لیے یہ لفظ کوزہ اور ہر اس قسم کی ٹھیکری کے لیے کہ جس میں سے زیادہ آواز نکلتی ہے، بولا جاتا ہے[1]

قرآن میں درج مختلف آیتوں اور ان مفاہیم سے جو انسان کی ابتدائے آفرینش کے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں یہ اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ انسان شروع میں خاک تھا (سورہ حج - ۵) پھر اس کی پانی کے ساتھ آمیزش ہوئی اور یہ کیچڑ کی شکل اختیار کر گیا۔ (انعام - ۲) اور پھر "لجن" بدبُودار کیچڑ ہو گیا۔ (حجر - ۲۸) اس کے بعد چپک جانے کی صورت اختیار کی (صافات - ۱۱) پھر منجمد شے کی شکل اختیار کی اور "صلصال کالفخار" بن گیا (آیہ زیر بحث)۔ ان مرحلوں نے بعد زمانے کے تقاضوں کے مطابق کس قدر طول کھینچا اور انسان نے ہر مرحلہ میں کس قدر توقف کیا اور یہ منتقل ہونے والے حالات کن اسباب و عوامل کے نتیجے میں وجود میں آئے، یہ ایسے مطالب ہیں کہ جو ہمارے علم و دانش سے پوشیدہ ہیں اس کو صرف خدا ہی جانتا ہے اور بس۔ جو کچھ مُسلّم ہے وہ یہ ہے کہ یہ مذکورہ مفاہیم ایک ایسی حقیقت کو بیان کرتے ہیں جو انسان کے ترتیبی مسائل کے ساتھ نہایت اہم تعلق رکھتی ہے اور وہ یہ کہ انسان کا اولین مادّہ بہت ہی بے قیمت و کم مقدار تھا اور یہ زمین کی حقیر ترین شے سے تھا لیکن خدا نے اس قسم کے بے قیمت مادہ سے ایسی بیش بہا مخلوق پیدا کی کہ جو گلستانِ آفرینش کا گُل سرسبد بن گیا۔

اِن تعبیرات و مفاہیم سے ضمنی طور پر اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان کی حقیقی قدر و قیمت کو وہی "رُوحِ الٰہی" اور "نغمۂ ربّانی" کہ جو قرآن کی دوسری آیتوں (مثلاً سورہ حجر کی آیہ ۲۵) میں آیا ہے، تشکیل دیتا ہے تاکہ انسان اس حقیقت کو پہچاننے کے بعد اپنی راہ ارتقاء کو اچھی طرح پالے اور یہ سمجھ لے کہ کس راستے پر چل کر اسے سفرِ حیات طے کرنا ہے تاکہ وہ بزمِ ہستی میں اپنی حقیقی قدر و قیمت کو حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔ اس کے بعد پروردگارِ عالم جنّات کی خلقت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور جنّوں کو آگ کے مخلوط اور متحرک شعلوں سے پیدا کیا" (وخلق الجان من مارج من نار)۔ "مارج" اصل میں "مرج" (بروزن مرض) سے بنا ہے جس کے معنی اختلاط و آمیزش کے ہیں۔ یہاں اس سے مُراد آگ کے مختلف شعلوں کا اختلاط و امتزاج ہے۔ آگ جس وقت شعلہ فشاں ہوتی ہے تو کبھی سُرخ ہوتی ہے کبھی زرد اور کبھی آبی، کبھی سفید۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس "مرج" میں تحرک کے معنی بھی ہیں (امرجت الدابۃ) "میں نے جانور کو چراگاہ میں چھوڑ دیا" کیونکہ "مرج" کے ایک معنی چراگاہ کے بھی ہیں۔ پھر ہمارے لیے یہ بات واضح نہیں ہے کہ "جن" کی خلقت اس رنگ برنگی آگ سے کس طرح ہوئی جب کہ اس کی دوسری خصوصیتیں "صبح صادق" یعنی قرآن مجید اور وحی الٰہی کے حوالے سے ہم پر ثابت ہوئیں مجہولات کے مقابلے میں ہماری معلومات کا محدود ہونا ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ان حقائق کا، اس کے بعد کہ وہ وحی الٰہی سے ثابت ہو جائیں، انکار کریں یا انہیں نظر انداز کریں۔ خواہ ہمارا علم ان تک رسائی حاصل کرے یا نہ کرے (انشاء اللہ جن کی خلقت اور اس کی

[1] مفردات راغب۔

خصوصیتوں کے بارے میں مزید تشریح سورۂ جنّ کی تفسیر میں درج کی جائے گی)۔ بہر حال زیادہ تر مخلوق جس سے ہمارا سروکار ہے وہ پانی، مٹی، ہوا اور آگ ہے۔ ہم انہیں چاہے قدماء کی طرح عنصر اور بسیط سمجھیں یا موجودہ ماہرین کے نقطۂ نظر کے اعتبار سے مختلف الاجسام اجزا سے مرکب خیال کریں لیکن ہر صورت میں انسان کی خلقت کا مبداء مٹی اور پانی ہے جب کہ "جنّ" کا مبداء خلقت ہوا اور آگ ہے مبداء آفرینش کی یہ دورنگی ان دونوں مخلوقوں کے درمیان بہت سے اختلافات کا سرچشمہ ہے۔

پھر ان نعمتوں کے بعد کہ جو خلقتِ انسان کی ابتداء میں تھیں اس جملہ کی تکرار ہے کہ: "پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرتے ہو"۔ (فبای آلاء ربکما تکذبان)۔ اس کے بعد والی آیت میں ایک اور نعمت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے "وہ دو مشرقوں اور دو مغربوں کا پروردگار ہے"۔ (رب المشرقین و رب المغربین)۔ یہ درست ہے کہ سورج سال کے ہر روز ایک نقطہ سے طلوع ہو کر دوسرے نقطہ پر غروب ہوتا ہے اور اس ترتیب کے اعتبار سے ایک مشرق اور ایک مغرب ہی بنتی ہے لیکن سورج کے حوالے سے زمین کے شمالی جھکاؤ اور جنوبی جھکاؤ کی حدِ اکثر کی طرف توجہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ فی الحقیقت دو مشرق ہیں اور دو مغرب اور باقی ان دونوں کے درمیان کا حصہ ہے۔[1]

یہ نظام کہ جو حقیقت میں چار قسم کے بہت بابرکت موسموں کی خلقت کا سرچشمہ ہے، حقیقت میں ان آیتوں کی تکمیل و تائید ہے کہ جو پہلے آچکی ہیں۔ اس مقام پر کہ جہاں چاند اور سورج کی گردش کے متعلق گفتگو ہے اسی طرح آسمانوں کی خلقت میں میزان کے وجود کی بات ہے مجموعی اعتبار سے وہ آیتیں زمین، چاند اور سورج کی خلقت اور حرکت کے دقیق نظاموں کے بیان پر مشتمل ہیں۔ ان میں ان نعمتوں اور برکتوں کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جو ان وسائل سے انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ بعض مفسرین نے یہاں دو مشرقوں اور دو مغربوں کی تفسیر سورج کے طلوع و غروب اور چاند کے طلوع و غروب کے اعتبار سے کی ہے اور اسے گزشتہ آیت (الشمس والقمر بحسبان) کے مطابق سمجھے ہیں لیکن پہلے معنی زیادہ مناسب نظر آتے ہیں۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ بعض اسلامی روایات میں بھی ان کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ منجملہ دیگر حدیثوں کے امیرالمومنین حضرت علیؑ کی ایک حدیث ہماری نظر کے سامنے آتی ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

> "ان مشرق الشتاء علی حدہ و مشرق الصیف علی حدہ اما تعرف ذالک من قرب الشمس و بعدھا"۔
>
> سردیوں کے آغاز کا مشرق اور ہے اور گرمیوں کے آغاز کا مشرق اور ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ سورج ان دو موسموں میں قریب و دور ہوتا ہے (گرمیوں کے موسم میں آسمان پر سورج کے اوپر آنے اور سردیوں کے موسم میں اس کے نیچے چلے جانے کی طرف اشارہ ہے)۔[2]

---

[1] اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ چونکہ زمین کا محور اس کی سطح مدار کی بہ نسبت جھکا ہوا ہے اور تقریباً ۲۳ درجہ کا زاویہ بناتا ہے اور زمین اس حالت میں سورج کے گرد گردش کرتی ہے لہذا سورج کا طلوع و غروب ہمیشہ متغیر نظر آتا ہے اور ۲۳ درجہ تم اعظم شمالی سے (گرمیوں کے شروع میں) ۲۳ درجہ تم اعظم جنوبی (سردیوں کے شروع میں) تک متغیر رہتا ہے کہ جس کے پہلے مدار کو مدار راس السرطان اور دوسرے مدار کو مدار راس الجدی کہتے ہیں۔ یہ ہیں سورج کے دو مشرق اور دو مغرب۔ باقی جتنے مدار ہیں وہ ان دونوں مداروں کے درمیان ہیں۔

[2] تفسیر "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۱۹۰

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے یہ نکتہ اچھی طرح واضح ہوگیا ہے کہ بعض آیات قرآنی میں یہ کیوں آیا ہے۔ "فلا اُقسم برب المشارق والمغارب" مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی قسم (معارج ۔ ۴۰) کیونکہ اس میں پورے سال کے تمام مشرقوں اور مغربوں کی طرف اشارہ ہے، جب کہ زیر بحث آیت میں صرف اس کی انتہائی قوس صعودی و نزولی کی طرف اشارہ ہے۔ بہرحال اس نعمت کے ذکر کے بعد پھر اس نے جن و انس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کروگے" (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔

۱۹۔ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۙ

۲۰۔ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۚ

۲۱۔ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

۲۲۔ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۚ

۲۳۔ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

۲۴۔ وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ۚ

۲۵۔ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۧ

ترجمہ

۱۹۔ دو مختلف دریاؤں کو ایک دوسرے کے قریب قرار دیا در آنحالیکہ وہ ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔

۲۰۔ لیکن دونوں کے درمیان ایک برزخ ہے کہ وہ ایک دوسرے پر غلبہ نہیں کرتے۔

۲۱۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کروگے؟

۲۲۔ ان دونوں میں سے لولو اور مرجان نکلتے ہیں۔

۲۳۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

۲۴۔ اور اس کے لیے بنی ہوئی کشتیاں ہیں کہ جو پہاڑ کی طرح سمندر میں چلتی ہیں۔

۲۵۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے ؟

تفسیر

سمندر اپنے گراں بہا ذخائر کے ساتھ

پروردگارِ عالم اپنی نعمتوں کے تذکرے کی تشریح کو جاری رکھتے ہوئے سمندروں کی بات کرتا ہے لیکن سب سمندروں کی نہیں بلکہ چند سمندروں کی ایک کیفیتِ خاص کی بات کہ جو ایک عجیب سی چیز ہے اور خُدا کی لامحدُود قدرت کی نشانی بھی ہے اور بعض مفید انسانیت چیزوں کے ظاہر ہونے کا وسیلہ بھی فرماتا ہے : " دو مختلف سمندروں کو ایک دوسرے کے پاس قرار دیا کہ جو ایک دوسرے سے مِل رہے ہیں " (مرج البحرین یلتقیان)۔" لیکن ان دونوں کے درمیان ایک دیوار ہے کہ جو ایک دُوسرے پر غلبہ کی راہ میں رکاوٹ ہے۔" (بینھما برزخ لا یبغیان)۔ " مرج " (بروزن فلج) کا مادّہ خَلط مَلط کرنے یا بھیجنے اور چھوڑنے کے معنی میں ہے اور یہاں "بینھما برزخ لا یبغیان" کے جُملے کے قرینے سے بھیجنے اور ایک دوسرے کے ساتھ قرار دینے کے معنی میں ہے۔ ان دو سمندروں سے مُراد، سُورۂ فرقان کی آیت ۵۳ کی گواہی کے مطابق، میٹھے اور کھاری پانی والے دو سمندر ہیں، جہاں پروردگارِ عالم فرماتا ہے :" وھوالذی مرج البحرین ھٰذا عذب فرات وھٰذا ملح اجاج وجعل بینھما برزخًا وحجرًا محجورًا " وہ وہی ہے کہ جس نے دو سمندر ایک دوسرے کے پاس قرار دیئے جن میں سے ایک کا پانی میٹھا ہے اور دوسرے کا کھاری۔ اُس نے اِن دونوں کے درمیان ایک برزخ قرار دیا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے سے مِل نہ جائیں۔ باقی رہا یہ کہ یہ دو سمندر میٹھے اور کھاری کہاں ہیں جو ایک دوسرے پر غلبہ نہیں کرتے اور یہ برزخ جو ان دونوں کے درمیان قرار پایا ہے وہ کیا ہے اس کے بارے میں مفسّرین کے درمیان بہت کچھ اختلافات ہیں۔ بعض افراد ایسے مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس زمانہ میں سمندروں کی کیفیت سے اچھی طرح واقف نہیں تھے۔ منجملہ اس کے ان مفسّرین نے کہا ہے کہ ان دو سمندروں سے مُراد بحرِ فارس و بحرِ روم ہیں۔ حالانکہ اَب اِس زمانے میں ہم خُوب جانتے ہیں کہ ان دونوں سمندروں کا پانی کھاری ہے اور پھر ان کے درمیان کوئی برزخ بھی نہیں ہے۔ یا پھر انہوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد آسمان کا سمندر اور زمین کا سمندر ہے جس میں سے پہلا شیریں اور دُوسرا تلخ ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آسمان میں کوئی سمندر نہیں ہے۔ سوائے ان بادلوں اور بخارات کے جو زمین کے سمندروں سے اُٹھتے ہیں۔ یا پھر انہوں نے کہا ہے کہ شیریں سمندر سے مُراد وُہ پانی ہے جو زیرِ زمین ہے اور وہ سمندر کے پانی سے مِل جاتا ہے اور ان دونوں کے درمیان جو خزانوں کی دیواریں ہیں وہ ان کا برزخ ہے۔ حالانکہ اَب ہر کوئی جانتا ہے کہ زیرِ زمین سمندر کی شکل میں کوئی چیز بہت ہی کم پائی جاتی ہے البتہ پانی کے قطرات، مرطوب مٹی اور ریت کے ذرّوں کے درمیان ضرور پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جس وقت کسی جگہ کنواں کھودتے ہیں تو یہ قطرے رفتہ رفتہ جمع ہو جاتی ہیں اور اس طرح پانی نکل آتا ہے۔ علاوہ ازیں لوٗلوٗ و مرجان کہ جن کی طرف بعد کی آیات میں اشارہ ہوا ہے، زیرِ زمین پانیوں سے حاصل نہیں ہوتے۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دو دریاؤں سے کیا مُراد ہے ؟

پہلے ہم سُورہ فرقان میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ آبِ شیریں کے بڑے دریا اور نہریں جس وقت سمندروں میں گرتے ہیں تو عام طور پر ساحل کے قریب آبِ شیریں کا سمندر تشکیل پاتا ہے اور وہ آبِ تلخ کو پرے دھکیل دیتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ دو میٹھے اور کھاری سمندر پتلے گاڑھے ہونے کی بنا پر ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ ہوائی جہاز کے سفر کے دوران ایسے علاقوں میں کہ جہاں یہ دریا سمندر میں گرتے ہیں ایسے میٹھے اور کھاری سمندروں کا منظر، جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں اور اس کے باوجود ایک دُوسرے سے جُدا ہیں، بلندی سے صاف طور پر نظر آتا ہے۔ جس وقت ان پانیوں کے کنارے ایک دوسرے سے مخلوط ہوتے ہیں تو تازہ میٹھا پانی ان کی جگہ لے لیتا ہے اور اس طرح ان دو الگ رہنے والے سمندروں کو ہمیشہ دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ سمندر میں مدّ و جزر کے موقع پر جب کہ سمندر کا نیچے کا پانی اُوپر آجاتا ہے تو میٹھا پانی دھکیل دیا جاتا ہے بغیر اس کے کہ کھاری پانی اس میں مخلوط ہو (مگر خشک سالی اور پانی کی کمی کے موقع پر) اور وہ خشکی کے کافی حصّہ کو ڈھانپ لیتا ہے۔ اس لیے ساحل کے قریب رہنے والے لوگ ان علاقوں میں میٹھے پانی کو کنٹرول میں رکھ کر ساحلی علاقوں میں بہت سی نہریں بنالیتے ہیں جن کے ذریعے بہت سی زمینوں کو سیراب کرتے ہیں۔ یہ نہریں کہ جو ساحلی مدّ و جزر کی برکت اور ان نہروں کے پانی پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں، چوبیس گھنٹے میں دو مرتبہ میٹھے پانی سے خالی ہو کر لبریز ہوتی ہیں اور ان علاقوں کی سیرابی کا بہت ہی مؤثر ذریعہ ہیں۔

ان دو سمندروں کے بارے میں بعض علماء کی طرف سے ایک بہت ہی پُرکشش تفسیر بیان کی گئی ہے۔ ان کے نزدیک اس بات کا احتمال ہے کہ اس سے مراد "گلف سٹریم" کا بہاؤ ہو۔ ہم اس کی تفصیل انشاء اللہ انہی آیتوں کے ذیل میں بیان ہونے والے نکات کی بحث میں پیش کریں گے۔

پروردگارِ عالم ایک مرتبہ پھر اپنے بندوں کو مخاطب کر کے ان نعمتوں کے حوالے سے ان سے سوال کرتا ہے اور فرماتا ہے:

"تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے"۔ (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔ پھر اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "ان دونوں سمندروں سے لؤلؤ و مرجان نکلتے ہیں"۔ (یخرج منهما اللؤلؤ والمرجان)۔ "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے"۔ (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔ لؤلؤ و مرجان پُرکشش زینت کے دو وسیلے ہیں۔ از رُوئے طب ان دونوں سے بیماریوں کے علاج کے سلسلہ میں بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ضمنی طور پر یہ بھی ایک بات ہے کہ وہ اچھے اسبابِ زندگی اور مالِ تجارت ہیں جن سے بہت سا منافع حاصل ہوتا ہے۔ انہی اسباب کی بنا پر گزشتہ آیتوں میں دو نعمتوں کی حیثیت سے ان کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

رہا لؤلؤ کہ جسے فارسی میں مروارید کہتے ہیں، وہ صاف و شفاف قیمتی موتی ہوتا ہے کہ جو دریا کی تہہ اور سمندروں کی گہرائی میں بطنِ صدف میں پرورش پاتا ہے۔ وہ جتنا موٹا ہو اتنا ہی زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ طب میں اسے مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ قدیم اطبا اس سے اعصاب کی تقویت، خفقان، خوف و وحشت، جگر کی قوت، منہ کی بدبُو، گردہ مثانہ کی پتھری اور یرقان کے لیے دوائیں تیار کرتے تھے حتیٰ کہ آنکھ کی بیماریوں میں بھی اس سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔[1]

"مرجان" کی تفسیر بعض مفسرین نے یہ کی ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے لؤلؤ ہوتے ہیں لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ "مرجان" درخت کی چھوٹی چھوٹی ٹہنیوں کی مانند ایک زندہ وجود ہوتا ہے جو سمندروں کی گہرائی میں درخت کی طرح اُگتا ہے۔ ماہرین ایک عرصہ تک اسے ایک قسم

---

[1] "تحفہ حکیم مومن" اور دائرۃ المعارف دہ خدا و دیگر منابع۔

کی گھاس سمجھتے رہے لیکن بعد میں واضح ہوا کہ وہ ایک قسم کا جانور ہے۔ اگرچہ وہ سمندروں کے جھاگ کے پتھروں سے چپک جاتا ہے اور بعض اوقات وسیع جگہ کو گھیر لیتا ہے، بتدریج بڑھتا رہتا ہے اور جزیروں کی تشکیل کا باعث بنتا ہے جو جزائر مرجان کہلاتے ہیں۔

"مرجان" عام طور پر ٹھہرے ہوئے پانی میں نشو و نما پاتا ہے۔ جو اس کے شکاری ہیں وہ اسے دریائے احمر کے ساحلوں اور میڈیٹرینین اور بعض دوسرے علاقوں میں اس کا شکار کرتے ہیں۔ وہ مرجان جو زیب و زینت کے کام آتا ہے، سُرخ رنگ کا ہوتا ہے وُہ جتنا زیادہ سُرخ ہو اتنا ہی زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ شاعر جو اس کو تشبیہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں وہ اس کی سُرخی ہی کی بنا پر ہے۔ اس کی سب سے خراب قسم مرجان سفید ہے۔ یہ بہت زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ ایک مرجان سیاہ بھی ہوتا ہے۔

مرجان زیب و زینت کے علاوہ دوا کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ طبیبوں نے اس کے بہت سے خواص بیان کیے ہیں۔ منجملہ ان کے اس سے دوائیں تیار کی جاتی ہیں جو دل کو تقویت دینے، سانپ کے زہر کی تاثیر کو دُور کرنے، اعصاب کو قوت بخشنے، اسہال کو ٹھیک کرنے اور رحم سے بہنے والے خون کو بند کرنے میں مفید ثابت ہوتی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مرگی کی بیماری کے لیے بھی مفید ہوتا ہے۔[1]

اس نکتہ کا بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض مفسّرین کے قول کے مطابق یہ لؤلؤ و مرجان صرف کھاری پانی میں پرورش پاتے ہیں لہذا وہ آیہ (یخرج منهما اللؤلؤ والمرجان) کی تفسیر میں، کہ ان دونوں میں سے لولؤ و مرجان نکلتے ہیں، اُلجھ گئے ہیں۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ ان دو میں سے مُراد صرف ایک ہے (سُورہ زخرف کی آیت ۔۳۱) لیکن ہمارے پاس ان معانی کے ثبوت کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ بعض مفسّرین نے تو یہ کہا ہے کہ لولؤ و مرجان میٹھے اور کھاری دونوں پانیوں میں پائے جاتے ہیں۔

نعمتوں کی بحث کے اس حصّہ کو جاری رکھتے ہوئے کشتیوں کی طرف، کہ جو گزشتہ زمانے میں بھی اور زمانۂ حال میں بھی انسانوں کے لیے حمل و نقل کے وسائل میں سب سے اہم ذریعہ ہیں، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور خدا ہی کے لیے ہیں وہ کشتیاں جو سمندر میں چلتی ہیں اور پہاڑ معلوم ہوتی ہیں"۔ (وله الجوار المنشئات فی البحر کالاعلام)۔ "جوار" جمع ہے "جاریہ" کی، وہ صفت ہے "سفن" کی جس کے معنی ہیں: کشتیاں۔ اختصار کی وجہ سے اس لفظ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ جو چیز زیادہ قابلِ توجہ ہے وہ کشتیاں نہیں بلکہ ان کا پانی میں چلنا ہے۔ اس وجہ سے صرف اس صفت پر انحصار کیا گیا ہے (غور فرمائیے)۔ کنیز کو "جاریہ" کہتے ہیں وہ بھی اس کے چلنے پھرنے اور خدمات بجا لانے کے لیے جدوجہد کی بنا پر ہے اور اگر جوان لڑکی کو جاریہ کہا جاتا ہے تو وہ اس کے وجود میں نشاطِ جوانی کے تحرک کی بنا پر ہے۔ "منشآت" جمع ہے "منشا" کی جو اسم مفعول ہے اس کے معنی "ایجاد" کے ہیں۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ عین اس وقت کہ جب منشآت کی تعبیر کے سلسلہ میں انسان کے ہاتھ سے کشتی بنائے جانے کی بات کر رہا ہے تو فرماتا ہے: (وله) "خدا کے لیے ہے"۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ کشتی کے ایجاد کرنے والے اور بنانے والے خدا کی عطا کی ہوئی ان مختلف خصوصیتوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں جو کشتی سے استفادہ کے لیے ضروری ہیں۔ اس طرح وہ دریاؤں اور سمندروں کے سیّال ہونے کی خاصیت سے اور ہواؤں کے چلنے کی قوت سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ خدا ہی ہے جس نے ان چیزوں میں سمندر میں اور ہوا میں یہ خواص و آثار ودیعت کیے ہیں۔ اسی لیے ایک دوسرے مقام پر قرآن میں لفظ "تسخیر" آیا ہے: (وسخر لکم

[1] دائرۃ المعارف فرید وجدی اور دوسری کتب۔

الفلك لتجری فی البحر بامرہ) " خدا نے کشتی کو تمہارا فرماں بردار بنایا کہ جو اس کے حکم سے دریا میں چلتی ہے (ابراہیم-۳۲)۔
بعض مفسرین نے " منشآ " کو " انشاء کے مادّہ سے بلند کرنے کے معنی میں تفسیر کی ہے اور وُہ اس سے بادبانی کشتی مُراد لیتے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ بادبانوں کے بلند کرنے سے اور انہیں ہوا کے راستے میں نصب کرنے سے لوگ کشتیوں کے چلانے کا کام لیتے تھے۔ " اعلام " جمع "علم" (بروزن قلم) کے معنی پہاڑ ہیں۔ اگرچہ اصل میں اس کے معنی علامت کے ہیں جو کسی چیز کی نشان دہی کرتی ہے۔ چونکہ پہاڑ دُور سے نمایاں ہوتے ہیں، لہٰذا انہیں عَلَم سے تعبیر کیا گیا ہے جس طرح جھنڈے کو بھی عَلَم کہتے ہیں۔
اس طرح قرآن نے بڑی بڑی کشتیوں پر کہ جو سمندروں وغیرہ میں چلتی ہیں، انحصار کیا ہے۔ بعض لوگ ایسا خیال کرتے ہیں لیکن بڑی کشتیاں اور اسٹیمر وغیرہ زمانۂ حال کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہیں۔ یونانیوں کی جنگ کی داستانوں میں ہمیں ملتا ہے کہ وہ نہایت عظیم اور بڑی کشتیوں سے کام لیتے تھے۔ دوبارہ اسی پُرمعنی سوال کی تکرار کرتے ہوئے فرماتا ہے : " تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے "۔
(فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔

چند نکات

۱۔ سمندر خُدا کی نعمتوں کے مرکز :

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے آیتوں کے اس حصہ میں سمندر اور انسانی زندگی میں اس کی اہمیت پر گفتگو ہوئی ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ سمندر زمین کے تین چوتھائی حصہ کا احاطہ کیے ہوئے اور وہ اسباب غذا، دواؤں اور سامان زینت کے لیے منبع عظیم ہے۔ انسانوں اور ان کے مال و متاع کے لیے حمل و نقل کے سلسلہ میں اہم وسیلہ ہے۔ اور سب سے زیادہ اہم بارش کا برسنا، ہواؤں کا اعتدال یہاں تک کہ ہواؤں کا چلنا یہ سب سمندروں کی برکتوں میں سے ہے۔ اگر سمندروں کی سطح جیسی اَب ہے اس سے کچھ کم یا زیادہ ہوتی یا کرۂ زمین خشکی کی طرف مائل ہوتا یا زیادہ مرطوب ہوتا تو زندگی کے باقی رہنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اس لیے قرآن بارہا مختلف تعبیروں کے ذریعے انسانوں کی اس طرف توجہ مبذول کراتا ہے اور انہیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ کبھی کہتا ہے : " خدا نے سمندر کو تمہارے لیے مسخر کیا "۔ (سخر لکم البحر) (جاثیہ - ۱۲) کبھی کہتا ہے : "کشتیوں کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے "۔ (سخر لکم الفلك) (ابراہیم) کبھی کہتا ہے : " جو کچھ زمین میں ہے اسے تمہارے لیے مسخر کیا ہے "۔ (سخر لکم ما فی الارض) (حج - ۶۵) ان سب سے قطع نظر سمندر عجائبات عالم میں سے ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی خوردبین سے نظر آنے والی گھاس اور دُنیا کے بہت بڑے بڑے درخت سمندروں میں اُگتے ہیں۔ اسی طرح چھوٹے سے چھوٹا جانور اور عظیم ترین، دیو قامت حیوانات سمندروں میں زندگی بسر کرتے ہیں سمندروں کی گہرائی میں زندگی گزارنا جہاں نہ روشنی ہے نہ غذا اس قدر تعجب خیز و حیرت انگیز ہے کہ انسان اس کے مطالعہ سے سیر نہیں ہوتا۔
اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہاں جانور خود اپنے اندر سے روشنی نکالتے ہیں اور جو چیزیں ان کو غذا کے لیے درکار ہوتی ہیں وہ پانی کی سطح پر تیار ہوتی ہیں اور تہ نشیں ہو جاتی ہیں۔ ان کے جسم اس قدر مضبوط و مستحکم ہوتے ہیں اور اندرونی دباؤ کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ پانی کے اس عظیم دباؤ کے مقابلے میں اگر انسان کو عام حالات میں وہاں رکھا جائے تو اس کی ہڈیاں آٹے میں تبدیل

ہو جائیں، وہ زندگی گزارتے ہیں۔

۲۔ گلف سٹریم، بڑے بڑے سمندری دریا اور نہریں

آپ کو یہ سُن کر تعجب ہو گا کہ دُنیا کے سمندروں میں بہت بڑے بڑے دریا جاری ہیں، جن میں سب سے زیادہ قوت دار "گلف سٹریم" ہے یہ عظیم دریا مرکزی امریکہ کے ساحلوں سے شروع ہوتا ہے اور سارے "بحر اطلس" کو عبور کر کے شمالی یورپ کے ساحل تک جا پہنچتا ہے۔ وہ پانی کہ جو خط استوا کے قریبی علاقوں سے چلتے ہیں وہ گرم ہیں یہاں تک کہ ان کا رنگ کبھی کبھی ہمراہ چلنے والے پانیوں سے مختلف ہوتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس عظیم سمندری دریا "گلف سٹریم" کا عرض تقریباً ۱۵۰ کلومیٹر اور اس کی گہرائی کئی سو میٹر ہے۔ اس کی تیزی و روانی بعض علاقوں میں اتنی ہے کہ وہ ایک دن میں ۱۶۰ کلومیٹر کی راہ طے کرتا ہے۔ ان پانیوں کے درجہ حرارت کا فرق، ہمراہ بہنے والے پانیوں سے دس سے لے کر ۱۵ درجہ تک ہے۔ اسی لیے اس کے مغربی کنارے کو ٹھنڈی دیوار کہتے ہیں۔ "گلف اسٹریم" سے گرم ہوائیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ اپنی حرارت کی اچھی خاصی مقدار براعظم یورپ کے شمالی ملکوں تک لے جاتی ہیں اس طرح یہ "گلف اسٹریم" ان ملکوں کی ہوا کو بہت ہی خوشگوار بنا دیتا ہے۔ اگر پانی کا یہ بہاؤ نہ ہوتا تو ان ملکوں میں زندگی بسر کرنا بہت ہی دُشوار اور قوت شکن ہوتا۔ ہم پھر دُہراتے ہیں کہ "گلف اسٹریم" ان دریاؤں میں سے ایک ہے اور دنیا کے پانچ براعظموں کے پانیوں میں ایسے دریاؤں کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ان دریاؤں کا سب سے بڑا عامل اور سبب زمین کے منطقہ استوائی اور منطقہ قطبی کی حرارت کا فرق ہے کہ جو سمندروں کے اس پانی میں تحریک پیدا کرتا ہے۔

اس موضوع کا ادراک ایک معمولی تجربہ سے کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہمارے پاس پانی کا ایک بہت بڑا برتن ہو۔ اس کے ایک طرف ہم برف کا ایک ٹکڑا رکھ دیں اور دوسری طرف گرم لوہے کا ٹکڑا رکھیں اور سطح آب پر تھوڑی سی کٹی ہوئی گھاس ڈال دیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس پانی کی سطح میں ایک تحرک پیدا ہو جائے گا اور پانی آہستہ آہستہ گرم جگہ کی طرف سے ٹھنڈی جگہ کی طرف چلنا شروع کر دے گا۔ بعینہٖ یہی صُورتِ حال دنیا کے تمام پانیوں میں موجود ہے اور وہ ان سمندری دریاؤں کے پیدا ہونے کا سرچشمہ ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ عظیم سمندری دریا اپنے اطراف کے پانی میں بہت کم آمیزش کرتے ہیں اور ہزاروں کلومیٹر کے راستے کو اسی طرح طے کرتے ہیں اور (مرج البحرین یلتقیان بینھما برزخ لایبغیان) کے مصداق بنتے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ساتھ ساتھ چلنے والے ان گرم اور ٹھنڈے پانیوں کے بالمقابل ہونے کی جگہ پر ایک ایسی چیز پیدا ہوتی ہے جو انسان کے لیے بہت ہی مفید ہے۔ کیونکہ ان گرم و سرد پانیوں کے ٹکراؤ کے مقام پر خورد بین سے نظر آنے والے ان جانوروں کے لیے ایک ایسی بے حسی اور موت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ پانی میں مُعلق ہو جاتے ہیں۔ اس طرح بے شمار غذائی ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے اور یہاں مچھلیوں کے بڑے بڑے جھگھٹے ہو کر اس کو کھاتے ہیں۔ اسی لیے کُرۂ زمین پر یہ علاقہ مچھلی کے شکار کی بہترین جگہ ہے۔[1]

چنانچہ مذکورہ بالا آیتوں کی ایک تفسیر یہ بھی ہے اور یہ دُوسری تفسیروں سے متصادم بھی نہیں ہے۔ ان سب کا باہم مل جانا ممکن ہے۔

---

[1] دائرۃ المعارف "فرہنگ نامہ" ج ۱۲ ص ۱۲۲۸ و نشریہ "بندر و دریا" شمارہ ۴ ص ۱۰۰ اور دوسرے منابع۔

۴۔ بطونِ آیات میں سے ایک تفسیر

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السّلام سے مروی ہے کہ آپ نے مرج البحرین یلتقیان... کی تفسیر میں فرمایا :

علی و فاطمه بحران عمیقان ، لایبغی احدهما علی صاحبه یخرج
منهما اللؤلؤ والمرجان ، قال : الحسن والحسین :

علیؑ و فاطمہؑ دو عمیق سمندر ہیں کہ جن میں سے کوئی ایک دوسرے پر تجاوز نہیں کرتا اور
ان دو دریاؤں سے لؤلؤ و مرجان یعنی حسنؑ و حسینؑ برآمد ہوئے ہیں[1]

تفسیر دُرمنثور میں یہی معنی بعض اصحاب پیغمبر کی زبانی بیان ہوئے ہیں[2]

مرحوم "طبرسی" نے بھی " مجمع البیان " میں اسی چیز کو مختصر سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ قرآن مجید کے کئی بطون ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ایک ہی آیت متعدد معانی رکھتی ہو۔ اور جو کچھ اس حدیث میں آیا ہے بطونِ قرآن میں سے ہے کہ جو اس کے ظاہری معنی سے متصادم نہیں ہوتا۔

---

[1] تفسیر قمی جلد ۲ ص ۳۴۴ ۔

[2] دُرالمنثور ج ۶ ص ۱۴۲ ۔

۲۶۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۚ
۲۷۔ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۚ
۲۸۔ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○
۲۹۔ يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۚ
۳۰۔ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○

ترجمہ

۲۶۔ وُہ تمام لوگ کہ جو اس زمین پر ہیں فنا ہو جائیں گے۔
۲۷۔ اور صرف تیرے پروردگار کی ذات ذوالجلال والاکرام باقی رہ جائے گی۔
۲۸۔ پس تم اپنے پروردگار کی کِس کِس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟
۲۹۔ تمام وُہ لوگ جو آسمان اور زمین میں ہیں اس سے سوال کرتے ہیں اور وہ ہر روز ایک نئی شان میں جلوہ گر ہوتا ہے۔
۳۰۔ پس تم اپنے پروردگار کی کِس کِس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر

ہم سب فانی ہیں اور بقا صرف تیرے لیے ہے :

اپنی نعمت کو جاری رکھتے ہوئے ان آیتوں میں مزید فرماتا ہے : " تمام وہ لوگ کہ جو زمین پر زندگی بسر کر رہے ہیں فنا ہو جائیں گے" (کل من علیھا فان)۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسئلہ فنا اللہ کی نعمتوں میں کس طرح شمار ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس اعتبار سے ہو کہ اس فنا سے مُراد فنائے مطلق نہیں ہے بلکہ یہ عالم بقا کے لیے ایک دریچے کا کام دیتی ہے۔ یہ ایک ایسا دالان اور گزرگاہ ہے کہ جس کو عبور کرنا سرائے تک پہنچنے کے لیے ضروری و لابدی ہے۔ دُنیا اپنی تمام نعمتوں کے باوجود مومن کے لیے زندان ہے اور اس دُنیا سے جانا تنگ و تاریک زندان سے نکلنے کے مترادف ہے۔

یا پھر فنا کا ذکر اس نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے کہ گزشتہ نعمتوں کا بیان، ممکن ہے ایک گروہ کے لیے اکل و شرب کی چیزوں، لؤلؤ و مرجان اور سواریوں میں مستغرق ہونے کا باعث بن جائے۔ لہٰذا یاد دلاتا ہے کہ یہ دنیا فانی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان چیزوں میں دل لگا بیٹھو اور اپنے رب کی راہ میں ان سے کوئی فائدہ نہ اُٹھاؤ۔ یہ یاد دلانا بھی بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ "علیھا" کی ضمیر زمین کی طرف لوٹتی ہے جس کی طرف گزشتہ آیتوں میں بھی اشارہ ہوا ہے۔ علاوہ ازیں قرائن سے بھی واضح ہے۔ " من علیھا " سے مُراد (وہ لوگ کہ جو زمین پر ہیں) جنّ و انس ہیں۔ اگرچہ بعض مفسّرین نے اس احتمال کو تقویت دی ہے کہ یہ حیوانات اور دوسری چلنے والی مخلوق کے لیے بھی استعمال ہوا ہے لیکن " من " کے لفظ کے پیشِ نظر کہ جو ہمیشہ ذوی العقول کے لیے استعمال ہوا ہے پہلی تفسیر ہی مناسب ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ فنا کا مسئلہ جنّ و اِنس تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ قرآن کی تصریح کے مطابق تمام اہلِ آسمان و زمین بلکہ تمام موجوداتِ عالم فنا ہو جائیں گے۔ (کل شیء ھالك الّا وجھہ) (قصص - ۸۸) لیکن چونکہ گفتگو ساکنانِ زمین سے تھی لہٰذا صرف انہی کو پیش کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد والی آیت میں مزید فرماتا ہے : " صرف تیرے پروردگار کی ذات ذوالجلال والاکرام باقی رہ جائے گی (ویبقٰی وجہ ربّك ذوالجلال والاکرام)۔ لغت کے اعتبار سے وجہ کے معنی چہرے کے ہیں۔ کسی شخص سے جب ہمارا آمنا سامنا ہو اور ہم اس سے ملاقات کریں تو ہم اس کے رُوبرو ہوتے ہیں لیکن جب یہ لفظ خدا کے لیے استعمال ہو تو پھر مراد اس کی ذات پاک ہی ہوتی ہے۔ مفسّرین نے " وجہ ربّك " کو یہاں پروردگار کی صفات کے معنی میں لیا ہے کہ جن کی وجہ سے انسان پر برکتیں اور نعمتیں نازل ہوتی ہیں۔ مثلاً : علم ، قدرت ، رحمت اور مغفرت۔ یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ اس سے مُراد وہ اعمال ہیں جو خدا کے لیے انجام دیے جاتے ہیں۔ تو اس بنا پر سب فنا ہو جائیں گے لیکن وہ اکیلی چیز یعنی وہ اعمال باقی رہ جائیں گے کہ جو خلوصِ نیّت سے اس کی رضا کے لیے انجام دیے گئے ہیں۔ لیکن پہلے معنی سب سے زیادہ مناسب ہیں۔ باقی رہا ذوالجلال والاکرام کہ جو "وجھہ" کی صفت ہے، اس سے خدا کی صفاتِ جلال و جمال کی طرف اشارہ ہے۔ " ذوالجلال " ایسی صفات کی خبر دیتا ہے کہ جن سے خدا اجل و برتر ہے (صفاتِ سلبیہ) اور " اکرام " ایسی صفتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو کسی چیز کے حُسن اور قدر و قیمت کو واضح کرتی ہیں اور وہ خدا کی صفاتِ ثبوتیہ ہیں، مثلاً اس کا علم ، قدرت اور حیات۔ تو اس بنا پر اس مجموعہ کے معنی یہ ہوں گے کہ صرف خدا

کی وہ ذات پاک، کہ جو صفاتِ ثبوتیہ سے متصف اور صفاتِ سلبیہ سے مبرّا و منزّہ ہے، اس عالم میں برقرار رہے گی۔

بعض مفسّرین خدا کے صاحب اکرام ہونے کو صاحب الطاف و نعمات ہونے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ جن کے ذریعہ وہ اپنے اولیاء کا اکرام کرتا ہے اور انہیں گرامی قدر بناتا ہے۔ مذکورہ بالا آیتوں میں ان سب معانی کا جمع ہونا ممکن ہے۔ ایک حدیث میں منقول ہے کہ ایک شخص بارگاہِ پیغمبر میں نماز میں مصروف تھا۔ اس کے بعد اس نے اس طرح دُعا کی: اللّٰھم انی اسئلك بان لك الحمد لا الٰہ الّا انت المنان بدیع السماوات والارض ذوالجلال والاکرام یا حیّ یا قیوم پیغمبر نے اپنے اصحاب و انصار سے کہا: جانتے ہو اس نے خُدا کو کس نام سے پُکارا ہے؟ انہوں نے کہا: خدا اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہتر جانتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: والذی نفسی بیدہ لقد دعا اللہ باسمہ الاعظم الذی اذا دعی بہ اجاب واذا سئل بہ اعطی۔" قسم ہے اس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس نے خدا کو اس کے اسم اعظم کے حوالے سے پکارا ہے جس وقت کوئی خدا کو اس نام سے پُکارے تو وہ اس کی دُعا قبول کرتا ہے اور جب اس کے ذریعے سے سوال کرے تو وہ عطا فرماتا ہے۔[1]

پروردگارِ عالم پھر ایک مرتبہ اپنی مخلوق کو مخاطب کر کے فرماتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کی تکذیب کروگے"۔ (فبای اٰلاءِ ربکما تکذبان)۔ اس سے بعد والی آیت کا نفس مضمون قبل کی آیتوں کا نتیجہ ہے کیونکہ وہ فرماتا ہے: "وہ تمام کہ جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں اپنی حاجتیں اسی سے طلب کرتے ہیں اور اسی سے سوال کرتے ہیں"۔ (یسئلہ من فی السماوات والارض)۔ ایسا کیوں نہ ہو حالانکہ وہ سب فنا ہونے والے ہیں اور خدا باقی ہے۔ یہ نہیں کہ اس جہاں کے اختتام پر ساری کائنات سوائے پروردگار کی پاک ذات کے راہِ فنا طے کرے گی بلکہ اِس وقت بھی اُس کے مقابلے میں فانی ہیں اور ان کی بقا اس کی بقا اور مشیت سے وابستہ ہے اگر ایک ایک لمحے کے لیے وہ اپنا لُطف و کرم کائنات سے اُٹھالے " تو سب فنا ہو جائیں"۔ اِن حالات میں اس کے علاوہ کوئی ہے کہ جس سے اہلِ زمین اور اہلِ آسمان سوال کریں۔ " یسئلہ " کی تعبیر فعل مضارع کی شکل میں اِس بات کی دلیل ہے کہ یہ سوال اور تقاضا دائمی ہے۔ سب کے سب زبانِ حال سے اس مبدأ فیاض سے ہمیشہ فیض کے طالب ہیں، زندگی چاہتے ہیں اور اپنی ضرورتوں کا سوال کرتے ہیں اور یہ ممکن الوجود کی ذات کا اقتضا ہے کہ نہ صرف حدوث میں بلکہ اپنی بقا میں بھی وہ واجب الوجود کے ساتھ وابستہ ہے اس کے بعد مزید کہتا ہے: " خدا ہر روز ایک نئی شان اور نئے کام میں ہے "۔ (کل یوم ھو فی شأن)۔ جی ہاں اس کی تخلیق دائم و مستمر ہے۔ اور سوال کرنے والوں اور صاحبانِ حاجات کو جواب دینا بھی اسی طرح ہے اور وہ ہر روز ایک نئی طرح ڈالتا ہے۔ ایک دن کچھ قوموں کو طاقت و قدرت عطا کرتا ہے، دوسرے دن انہیں زوال کا شکار بنا دیتا ہے، ایک روز صحت و سلامتی و جوانی عطا فرماتا ہے دوسرے دن ضعف و ناتوانی، ایک دن دل سے غم و اندوہ دُور کرتا ہے، دوسرے دن غم و اندوہ کا سبب پیدا کر دیتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ ہر روز حکمت و نظام احسن کے مطابق کوئی نئی مخلوق، نیا موجود اور نیا حادثہ وجود میں لاتا ہے۔ اس حقیقت کی طرف اگر توجہ کی جائے تو وہ ہم پر یہ واضح کر دینے کے لیے کافی ہے کہ ایک تو ہماری حاجتیں دائمی طور پر اس کی ذاتِ پاک سے وابستہ ہیں۔ دوسرے اس طرح ہمارے دل مایوسی کا شکار ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ یہ توجہ ہماری غفلت اور غرور کو ختم کرتی ہے جی ہاں اس کی ہر روز ایک نئی شان ہے اور وہ ایک نئے کام میں مصروف ہے۔ اگرچہ مفسّرین میں سے ہر ایک نے ان وسیع معانی کے کسی ایک گوشہ کو آیت کی تفسیر

[1] تفسیر رُوح المعانی جلد ۲۷ ص ۹۵

کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ بعض نے صرف گناہوں کی بخشش، غم و اندوہ کو دُور کرنے اور اقوام کی بلندی و زوال کو عنوان بنایا ہے۔
بعض نے صرف مسئلہ آفرینش، رزق، زندگی، موت اور عزت و ذلت کو، بعض نے صرف انسانوں کی خلقت اور موت کو عنوان کلام بنایا ہے
اور کہا ہے کہ خدا کے پاس ہر روز تین لشکر ہیں۔ ایک لشکر باپوں کے صلبوں سے ماؤں کے رحموں کی طرف کوچ کرتا ہے، دُوسرا لشکر ماؤں
کے رحموں سے اس دُنیا میں قدم رکھتا ہے اور تیسرا لشکر دُنیا سے قبر کی طرف جاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے آیت ایک وسیع
مفہوم رکھتی ہے کہ اس دنیا کی ہر نئی تخلیق پیدائش اور انقلاب اپنے اندر تحول لیے ہوئے ہے۔ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے
ایک روایت منقول ہے کہ آپ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا: الحمد للہ الذی لا یموت ولا تنقضی عجائبہ لانہ کل یوم
ھو فی شأن من احداث بدیع لم یکن ۔ " حمد و ستائش مخصوص ہے اس خدا کے لیے کہ جو ہرگز نہیں مرتا، اس کے عجائبات
خلقت ختم نہیں ہوتے کیونکہ اس کی ہر روز ایک نئی شان ہوتی ہے اور وہ ایک نیا موضوع پیدا کرتا ہے کہ جو پہلے ہرگز نہیں تھا[1]

ایک اور حدیث ہے جو رسولِ خدا سے منقول ہے: آپؐ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: من شأنہ ان یغفر ذنبا
ویفرج کربا و یرفع قوما و یضع اٰخرین ۔ " اس کے کاموں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ گناہ کو بخشتا ہے، رنج و
تکلیف کو برطرف کرتا ہے، ایک گروہ کو بلند کرتا ہے اور دُوسرے کو گرا دیتا ہے[2]

یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہاں " یوم " اس دن کے معنوں میں نہیں ہے جو رات کے مقابلہ میں ہے بلکہ ایک طولانی دَور پر
حاوی ہے اور ساعات و لمحات پر بھی۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کی ہر زمانے میں ایک نئی شان ہے اور وہ ایک نیا کام کرتا ہے
بعض مفسرین نے اس آیت کے لیے ایک شانِ نزول بھی بیان کی ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے قول کی تردید کے لیے نازل ہوئی ہے۔ یہودیوں
کا نظریہ یہ ہے کہ خدا ہفتہ کو کوئی کام نہیں کرتا۔ اس روز وہ تعطیل کرتا ہے۔ کوئی حکم اور فرمان جاری نہیں کرتا[3]

قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ اس کی تخلیق اور تدبیر امور کا پروگرام ایک لمحے کے لیے بھی تعطیل کا متحمل نہیں ہوتا۔ پروردگارِ عالم پھر اس نعمت
مستقل اور تمام مخلوقات آسمان و زمین کی حاجتوں کی جواب دہی کے بعد فرماتا ہے: " تم خدا کی کس کس نعمت کی تکذیب کرتے ہو۔"
(فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔

چند نکات

۱۔ فنا کی کیا حقیقت ہے؟

ہم نے مندرجہ بالا آیتوں میں پڑھا ہے کہ خدا کے علاوہ سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ یہ فنائے مطلق کے معانی میں نہیں ہے۔
یہ نہیں ہے کہ رُوحِ انسانی بھی نابود ہو جائے گی یا انسان کے جسم سے حاصل ہونے والی مٹی بھی ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ قرآن کی آیتیں

[1] اصول کافی مطابق نقل تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۹۳
[2] مجمع البیان در ذیل آیات زیر بحث۔ یہ حدیث رُوح المعانی میں بھی صحیح بخاری سے نقل ہوئی ہے۔
[3] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۰۲

قیامت کے دن تک کے لیے عالم برزخ کی تصریح کرتی ہیں[1]

دوسری جانب وہ بارہا کہتا ہے: مُردے قیامت میں قبروں سے اُٹھیں گے[2]

بوسیدہ ہڈیاں خدا کے حکم سے اپنے جسم پر لباس حیات پہنیں گی[3]

یہ سب چیزیں اس امر کی گواہی دیتی ہیں کہ اس آیت میں اور اس سے مشابہت رکھنے والی آیتوں میں فنا نظام جسم وجاں کے درہم برہم ہونے، رشتوں کے قطع ہونے اور عالم خلقت کے نظم و ترتیب کے درہم برہم ہو کر ایک نئے عالم کی جگہ لینے کے معنوں میں ہے۔

۲۔ وہ ہر روز ایک نئی چیز کی تخلیق کرتا ہے

ہم کہہ چکے ہیں کہ (کل یوم ھو فی شأن) والی آیت اُمید آفریں بھی ہے اور غرور شکن بھی نیز یہ استمرار آفرینش و دوام خلقت کی نشانی بھی ہے اسی وجہ سے بعض اوقات پیشوایانِ اسلام افراد بشر کو اُمید دلانے کے لیے خصوصیت کے ساتھ اس آیت پر انحصار کرتے ہیں جیسا کہ حضرت ابوذر کی "ربذہ" کی طرف جلاوطنی کے واقعہ میں ہمیں ملتا ہے کہ حضرت علیؑ نے بہت ہی گہرے اور پُر از معانی جملوں کے ساتھ حضرت ابوذر کی مشایعت کے موقع پر ان کی دلداری کی اور انہیں تسلی دی۔ اس کے بعد امام حسنؑ فرزند رشید امیرالمومنین نے حضرت ابوذر کو چچا کہہ کر کچھ جملے فرمائے۔ اس کے بعد شہیدوں کے سالار حضرت امام حسین علیہ السلام نے لب کشائی کی اور فرمایا: یا عماہ ان اللہ تعالیٰ قادر ان یغیر ما قد تری اللہ کل یوم ھو فی شأن وقد منعك القوم دنیا ھم ومنعتھم دینك .... فاسئل اللہ الصبر والنصر۔ چچا جان! خداوند متعال قادر ہے کہ ان حالات کو بدل دے اس کی ہر روز ایک نئی شان ہے۔ انہوں نے آپ کو اپنی دنیا میں مزاحم دیکھا اور آپ کو روک دیا۔ آپ نے انہیں اپنے دین میں مداخلت کرتے ہوئے دیکھا اور اس سے انہیں روکا۔ خدا سے نصرت اور صبر و شکیبائی کی دُعا کیجئے[4]

ہمیں تاریخ میں ملتا ہے کہ امام حسینؑ جس وقت کربلا کی طرف آ رہے تھے تو جب آپ صفاح نامی منزل پر پہنچے تو فرزدق نامی شاعر نے آپؑ سے ملاقات کی امامؑ نے فرمایا: بیّن لی خبر الناس من خلفك۔ "مجھے بتاؤ کہ لوگوں کو تم نے کس حال میں چھوڑا ہے" (عراق کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے)۔ فرزدق نے عرض کیا: (الخبیر سئلت قلوب الناس معك و سیوفھم مع بنی امیہ والقضاء ینزل من السماء واللہ یفعل ما یشاء)۔ "آپؑ نے ایک آگاہ شخص سے سوال کیا ہے لوگوں کے دل تو آپ کے ساتھ ہیں لیکن ان کی تلواریں بنی اُمیّہ کے ساتھ ہیں۔ البتہ فرمانِ الٰہی آسمان سے نازل ہوتا ہے اور خدا، جو اس کی مصلحت ہوتی ہے اور ارادہ کرتا ہے، اسے انجام دیتا ہے۔" اس پر امام حسینؑ نے فرمایا:

---

[1] (مومنون - ۱۰۰)

[2] (یٰسین - ۵۱)

[3] (یٰسین - ۷۹)

[4] الغدیر جلد ۸، صفحہ ۳۰۱۔

(صدقت اللہ الامر یفعل ما یشاء وکل یوم ربنا فی شأن)
" تُو نے سچ کہا ۔ خُدا جو کچھ چاہتا ہے انجام دیتا ہے اور ہمارے پروردگار کی ہر روز نئی شان ہے اور اس کا نیا کام ہے ۔" [1]

یہ سب باتیں بتاتی ہیں کہ یہ آیت مومنین کے لیے حوصلہ افزا آیت ہے ۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک امیر نے اپنے وزیر سے اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں سوال کیا لیکن اس نے بے خبری کا اظہار کیا اور دوسرے دن تک مہلت مانگی ۔ وزیر جس وقت مایوسی کی حالت میں اپنے گھر پہنچا تو اُس کے ایک غلام نے جو صاحبِ معرفت تھا پوچھا : کیا بات ہے ؟ وزیر نے سارا ماجرا بیان کیا ۔ اس نے کہا آپ امیر کے پاس جائیں اگر وہ اجازت دے تو میں اس کی تفسیر اُس کے سامنے پیش کروں گا ۔ بہر حال امیر نے اس غلام کو طلب کیا اور اس سے سوال کیا تو اس نے جواب میں کہا : " اے امیر شأنہ یولج الّیل فی النھار و یولج النھار فی الّیل و یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی ولیشفی سقیماً و یسقم سلیماً و یبتلی معافاً و یعافی مبتلی ویعز ذلیلاً و یذل عزیزاً و یفقر غنیاً و یغنی فقیراً ۔ " خدا کی شان یہ ہے کہ دن اور رات کو ایک دوسرے کے بعد لاتا اور لے جاتا ہے ، مُردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مُردہ کو نکالتا ہے ، بیمار کو شفا دیتا ہے ، صحیح سالم کو بیمار کرتا ہے تندرست کو مبتلا کرتا ہے ، مبتلا کو عافیت بخشتا ہے ، ذلیل کو عزت دیتا ہے ، عزت دار کو ذلیل کرتا ہے ، دولت مند کو فقیر بناتا ہے اور فقیر کو دولت مند بناتا ہے ۔" امیر نے کہا : فرجت عنی فرج اللہ عنك " تُو نے میری مشکل حل کی خدا تیری مشکل حل کرے گا ۔" اس کے بعد اس غلام کو انعام و اکرام سے نوازا ۔ [2]

۳۔ حرکتِ جوہری :

" حرکتِ جوہری " کے بعض طرفداروں نے قرآن کی چند آیتوں سے استدلال کیا ہے ، یا کم از کم اُسے اپنے مقصود کی طرف اشارہ سمجھا ہے ۔ منجملہ دیگر آیتوں کے ایک یہ آیت بھی ہے ۔ (کل یوم ھو فی شأن) اس کی وضاحت یہ ہے :۔ قدیم فلسفیوں کا نظریہ یہ تھا کہ حرکت صرف چار عرضی مقولوں میں ممکن ہے (مقولہ این ، کم ، کیف اور وضع) زیادہ آسان اور سادہ مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ ایک جسم ، مکان کے لحاظ سے ، تغیّر کرے یا اس طرح اس کی نشوونما ہو کہ اس جسم کی مقدار میں اضافہ ہو جائے یا اس کے رنگ و بُو اور ذائقہ میں تبدیلی پیدا ہو جائے (مثل ایک سیب کے جو درخت پر لگا ہوا ہے) ۔ یا اپنی جگہ پر اپنے گرد گردش کرے (زمین کی حرکتِ وضعی کی طرح) ۔ لیکن ان کا نظریہ یہ تھا کہ جسم کا جوہر اور اس کی ذات میں حرکت کا کوئی امکان نہیں ہے ۔ کیونکہ حرکت میں ذاتِ متحرک کو ثابت و برقرار ہونا چاہیئے ۔ اس کے محض عوارض دگرگوں ہوں ۔ بصورتِ دیگر حرکت کا کوئی مفہوم نہ ہو گا ۔ لیکن فلاسفہ متاخرین نے اس نظریہ کو ردّ کیا ہے اور وہ حرکتِ جوہری کے معترف ہیں ۔ انہوں نے کہا ہے کہ حرکت کی اساس اور بُنیاد خود جوہر میں ہے جس کے آثار عوارض میں ظاہر ہوتے ہیں ۔ پہلا شخص جس نے اس نظریہ کو معقول شکل میں پیش کیا ۔" ملا صدرائے شیرازی " تھا اس نے

---

[1] کامل ابنِ اثیر جلد ۴ ص ۴۰

[2] تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۶۳۳۷

کہا کہ تمام ذراتِ کائنات اور دُنیا مادۂ حرکت کا ایک مجموعہ ہے۔ دُوسرے لفظوں میں اجسام کا مادہ ایک سیال وجود ہے جس کی ذات ہمیشہ متغیر ہوتی رہتی ہے اور اس کا ہر لمحے ایک نیا وجود ہے جو قبل کے لمحے سے مختلف ہے۔ لیکن چونکہ یہ تبدیلیاں ایک دوسرے سے متصل ہوتی ہیں اس لیے ایک ہی شے شمار کی جاتی ہیں۔ اس نظریہ کی بنا پر ہم ہر روز ایک نیا وجود ہیں لیکن یہ وجود متصل و مستمر ہیں اور ایک ہی صُورت رکھتے ہیں۔ دُوسرے لفظوں میں مادّہ چار جہتیں رکھتا ہے۔ طول، عرض، عمق اور بُعد۔ یہ بُعد وہ ہے جسے زمان کا نام دیتے ہیں اور یہ زمان جوہری حرکت کے علاوہ دوسری اور کوئی چیز نہیں ہے۔ غور کیجیے۔

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حرکتِ جوہری ایٹموں کی اندرونی حرکت کے مسئلہ سے ارتباط نہیں رکھتی۔ کیونکہ وہ حرکت مکان میں ہے اور عرضی حرکت ہے۔ حرکتِ جوہری ایک زیادہ عمیق اور گہرا مفہوم رکھتی ہے کہ جو جسم کی ذات اور اس کی انفرادیت پر حاوی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہاں متحرک عینِ حرکت ہو جاتا ہے اور چیزیں خود اپنے داخل ہونے کی جگہ بن جاتی ہیں۔ غور کیجیے۔

ان کے پاس اس مقصد کے اثبات کے لیے مختلف دلائل ہیں جن کی تشریح کی یہاں گنجائش نہیں لیکن یہ امر معیوب نہیں ہے کہ ہم یہاں اس فلسفیانہ عقیدہ کے نتیجے کی طرف اشارہ کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم خدا شناسی کے مسئلہ کا ہر گزشتہ لمحے سے زیادہ واضح طور پر ادراک کریں کیونکہ خلقت اور آفرنیش صرف دنیا کے آغاز ہی میں نہیں تھی بلکہ ہر ساعت اور ہر لمحے اس کا آغاز ہے اور خدا ہمیشہ نئی خلقت و آفرنیش میں مصروف ہے اور ہم ہر وقت اس سے وابستہ اور اس کے فیضِ ذات سے مستفیض ہیں۔ انہوں نے: (کل یوم ھو فی شأن) کی تفسیر انہی معانی میں کی ہے البتہ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ یہ تفسیر بھی آیت کے وسیع مفہوم کا ایک جز ہو۔

۳۱۔ سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ۚ

۳۲۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○

۳۳۔ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۚ

۳۴۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○

۳۵۔ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ۚ

۳۶۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○

ترجمہ

۳۱۔ اے گروہ جن و انس عنقریب ہم تمہارا احتساب کریں گے۔

۳۲۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

۳۳۔ اگر تم سے ہو سکے تو زمین و آسمان کی سرحدوں سے نکل جاؤ مگر تم ہرگز قدرت نہیں رکھتے مگر سوائے (خدائی) قوت کے ساتھ۔

۳۴۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

۳۵۔ وہ دھویں سے خالی آگ کے اور متراکم دھویں والی آگ کے شعلے تمہاری طرف بھیجے گا اور تم کسی سے مدد طلب نہیں کر سکو گے۔

۳۶۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر

اگر قدرت رکھتے ہو تو آسمانوں کی سرحدوں سے آگے نکل جاؤ

جو نعمتیں اب تک اس سورہ میں پیش کی گئی ہیں وہ اسی دنیا سے تعلق رکھتی تھیں لیکن زیرِ بحث آیتوں میں قیامت کے حساب کتاب اور معاد کی بعض دوسری ضرورتوں کے بارے میں گفتگو ہے جو مجرموں کے لیے تہدید ہے اور مومنین کے لیے نہ صرف تربیت، آگاہی اور بیداری کا وسیلہ ہے بلکہ تشویق و حوصلہ افزائی کا ذریعہ بھی ہے۔ اسی بنا پر یہ نعمت شمار ہوتی ہے۔ اس لیے ہر ایک کے بیان کے بعد، اسی سوال کی کہ جو نعمتوں کے بارے میں ہے، پروردگارِ عالم تکرار کرتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

"اے جنّ و انس ہم عنقریب تمہارا حساب کریں گے"۔ (سنفرغ لکم ایه الثقلان)[1، 2]

جی ہاں! اس دن خداوندِ قادر جنّ و انس کے تمام اعمال، گفتار اور نیتوں کا نہایت باریک بینی سے حساب کرے گا اور ان کے لیے مناسب جزا و سزا تجویز کرے گا۔ خدا جس وقت کسی چیز میں مصروف ہو تو دوسری چیزوں سے غافل نہیں ہوتا اور ہر آن واحد میں تمام کائنات پر علمی احاطہ رکھتا ہے اور کبھی بھی کوئی چیز اسے دوسری چیز سے غافل نہیں کرتی۔ (لا یشغله شأن عن شأن) لیکن اس کے باوجود "سنفرغ" کے الفاظ جاذبِ توجہ ہیں کیونکہ گفتگو کی یہ صورتِ حال وہاں استعمال کی جاتی ہے جہاں ایک شخص اپنے تمام کام چھوڑ دیتا ہے تاکہ پوری تن دہی اور ہوش و حواس سے اس کام کو انجام دے۔ لیکن یہ چیز صرف مخلوقات کے بارے میں ہے۔ کیونکہ وہ اپنی محدودیت کی بنا پر جب ایک چیز کی طرف متوجہ ہوتی ہیں تو دوسری چیز سے غافل ہو جاتی ہیں۔ خدا کے بارے میں اس تعبیر کا استعمال حساب و کتاب کی تحقیق و تفتیش کے معاملہ میں تاکید کے علاوہ کچھ اور معانی نہیں رکھتا۔ ذرہ برابر کوئی شے اس کے قلم

---

[1] توجہ کرنی چاہیئے کہ قرآن مجید کے قدیم رسم الخط میں چند موارد میں "ایتها" ایه کی صورت میں لکھا ہوا ہے کہ جو زیرِ بحث آیت اور دو دوسری (سورہ نور کی آیت ۳۱ اور زخرف کی آیت ۴۹) آیتوں میں ہے جب کہ دوسری آیتوں میں ایها کا رسم الخط آخری کشیدہ الف کے ساتھ تحریر ہوا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ قدیم رسم الخط کے ضابطہ اور بنیاد پر تھا۔

[2] باوجودیکہ "الثقلان" تثنیہ ہے لیکن لکم میں ضمیر جمع کی آئی ہے اس بنا پر کہ دو گروہوں کی طرف اشارہ ہے۔

اِنصاف کی زد سے نہیں بچے گی۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ خداوند بزرگ وعظیم اپنے حقیر بندوں کا حساب وکتاب اپنے ذمّہ لے اور کس قدر وحشت ناک اور ہولناک ہے اس قسم کی جانچ پڑتال اور محاسبہ۔

"ثقلان" کا مادّہ "ثقل" (بروزن کبر) ہے جس کے معنی بارسنگین کے ہیں۔ یہ وزن کے معنی میں بھی آتا ہے باقی رہا "ثقل" (بروزن خبر) عام طور پر یہ لفظ مال و متاع اور مسافر کے سامان کے لیے بولا جاتا ہے۔ جنّ و انس کے گروہ پر اس کا اطلاق ان کی معنوی سنگینی کی بنا پر ہے۔ کیونکہ خدا نے انہیں عقل و شعور اور علم و آگہی کے لحاظ سے مخصوص وزن اور قدر عطا کی ہے۔ جسمانی طور پر بھی مجموعی حیثیت سے قابلِ ملاحظہ سنگینی کے حامل ہیں۔ اسی لیے سورہ "زلزال" کی آیت ۲ میں ہم دیکھتے ہیں۔ واخرجت الارض اثقالها ۔ جس کے ایک معنی قیامت کے دن انسانوں کا قبروں سے خروج ہے۔ لیکن بہرحال زیر بحث آیت کا یہ مفہوم زیادہ تر جنبۂ معنوی رکھتا ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ گروہ جن کے بارے میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوئی خاص وزنی جسم نہیں رکھتے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان دو گروہوں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس بنا پر ہے کہ وہ عُمدہ گروہ جو تکلیف شرعی سے مکلف ہیں یہی وہ دونوں ہیں۔ اس مفہوم کو بیان کرنے کے بعد دوبارہ اس سوال کی تکرار کرتا ہے! "تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے"۔ (فبای آلاء ربکما تکذبان)۔

گزشتہ آیت کہ جو خدا کی طرف سے کیے جانے والے احتساب کے مسئلہ کو پیش کرتی ہے اس کے بعد پروردگارِ عالم ایک مرتبہ جنّ و اِنس کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: "تم چاہو کہ خدا کی طرف سے دی جانے والی سزا سے بچ سکو تو اگر ایسی قوت رکھتے ہو تو آسمان اور زمین کی سرحدوں سے نکل جاؤ اور خدا کے احاطۂ قدرت سے باہر ہو جاؤ لیکن تم اس کام پر ہرگز قادر نہیں ہو سوائے اس کے کہ خدائی قوت و طاقت تمہیں حاصل ہو اور یہ خدائی قوت تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔ (یا معشر الجنّ والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السماوات والارض فانفذوا لا تنفذون الا بسلطان)۔ اس طرح تم ہرگز خدا کی عدالت، اِنصاف اور اس کے حکم سے صادر شدہ سزاؤں سے فرار کی قدرت و توانائی نہیں رکھتے۔ جہاں کہیں جاؤ گے خدا کا ملک ملے گا اور جہاں کہیں رہو گے وہ اس کی حکومت کا مقام ہے۔ جی ہاں یہ ضعیف و ناتواں مخلوق قدرت خدا کے میدان سے بھاگ کر کہاں جا سکتی ہے۔ حضرت امیرالمومنین علیؑ دعائے کمیل میں فرماتے ہیں: ولا یمکن الفرار من حکومتك ۔ "معشر" "عشر" سے لیا گیا ہے جس کے معنی "دس" ہیں۔ چونکہ دس کا عدد ایک کامل عدد ہے اس لیے لفظ "معشر" ایک مکمل جمعیت کے لیے بولا جاتا ہے کہ جو مختلف صنفوں اور گروہوں سے تشکیل پاتے۔ "اقطار" "قطر" کی جمع ہے۔ یہ کسی چیز کے اطراف کے معنی میں ہے "تنفذوا" کا مادہ "نفوذ" ہے جس کے معنی کسی چیز کو ٹکڑے کرنے کے بعد اس کو عبور کر جانے کے ہیں اور "من اقطار" کے الفاظ اس طرف اشارہ ہیں کہ آسمانوں کے اطراف و جوانب کو چیر کر ان سے نکل جاؤ اور ان کے باہر سفر کرو۔ ضمنی طور پر یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ "جنّ" کو جو مقدم کیا گیا ہے ہو سکتا ہو کہ وہ اس بنا پر ہو کہ وہ آسمانوں کی سیر پر زیادہ آمادہ رہتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیت، قیامت کے ساتھ مرلوط ہے یا دنیا سے، مفسّرین کا اس میں اختلاف ہے۔ چونکہ اس کے قبل و بعد کی آیتیں دارِ آخرت کی روداد سے متعلق ہیں لہٰذا محسوس ہوتا ہے کہ یہ آیت بھی قیامت میں عدالتِ الٰہی کے چنگل سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے متعلق ہے۔ لیکن "لا تنفذون الا بسلطان" "تم نہیں گزر سکتے مگر قوت کے ساتھ" کو نظر میں رکھ کر بعض مفسّرین

اسے انسانی ہوائی سفروں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ قرآن نے علمی وصنعتی تسلط کو اس کی شرط قرار دیا ہے۔ یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ قیامت کی طرف بھی نظر ہے اور دُنیا کی طرف بھی یعنی تم نہ یہاں قدرت رکھتے ہو کہ قدرتِ الٰہی کے بغیر اطرافِ آسمان میں نفوذ کر جاؤ اور نہ آخرت میں۔ البتہ دنیا میں محدود وسیلہ اور ذریعہ تمہارے اختیار میں ہے لیکن وہاں تو کوئی بھی ذریعہ یا وسیلہ نہ ہوگا۔ بعض مفسرین نے اس کی ایک چوتھی تفسیر بھی کی ہے کہ آسمان کے اطراف میں نفوذ سے مراد فکری وعلمی نفوذ ہے کہ جو استدلال کی قوت کی وجہ سے انسان کے لیے ممکن ہے۔ لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ بعض اخبار وروایات اس کی تائید بھی کرتے ہیں جو منابع اسلامی میں مندرج ہیں۔ منجملہ دیگر حدیثوں کے ایک حدیث امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن خدا تمام بندوں کو ایک ہی مقام پر جمع کرے گا اور آسمانِ اوّل کے فرشتوں کو حکم دے گا کہ نیچے اُتر آؤ۔ وہ فرشتے جو رُوئے زمین پر بسنے والے جنّ و انس سے تعداد میں دوگنے ہیں نیچے اُتر آئیں گے۔ اس کے بعد دوسرے آسمان کے فرشتے بھی کہ جو اتنی ہی تعداد میں ہیں نیچے اُتر آئیں گے۔ اس طرح سات کے سات آسمانوں کے فرشتے اُتر آئیں گے اور سات پردوں کی مانند جنّ و انس کا چاروں طرف سے احاطہ کرلیں گے۔ یہ وہ مقام ہے کہ منادی ندا دے گا کہ اے جنّ و انس کی جمعیت اگر ہوسکتا ہو تو آسمانوں اور زمین کے اطراف سے نکل جاؤ۔ تم قدرتِ الٰہی کے بغیر ہرگز نہیں نکل سکتے۔ اور تم یہاں دیکھ رہے ہو کہ ان اطراف کو فرشتوں کے سات عظیم گروہوں نے گھیر رکھا ہے۔ (اب عدالت کے شکنجے سے نکلنے کی کوئی صُورت نہیں ہے)۔[۱]

مختلف تفسیروں کے معانی کا اجتماع بھی ممکن ہے۔ یہاں پھر دونوں گروہوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے"۔ (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔ یہ ٹھیک ہے کہ مذکورہ بالا تہدید بظاہر سزا و عذابِ الٰہی کے سلسلہ کی بات ہے لیکن چونکہ اس کا ذکر تمام انسانوں کے لیے تنبیہ ہے اور اصلاح و تربیت کا سبب ہے، لہٰذا قدرتی طور پر نعمت ہے۔ بُنیادی طور پر حساب و کتاب کا وجود کسی بھی نظام میں ایک نعمت ہی ہے کیونکہ اس کی بنا پر سب کا حساب کتاب ہوگا۔

اس کے بعد والی آیت جنّ و انس کے عدالتِ الٰہی کے شکنجے سے فرار کے سلسلہ میں اور ان کے عدمِ اختیار کے بارے میں، جو کچھ قبل کی آیت میں آیا تھا، اس کی تاکید کرتے ہوئے مزید کہتی ہے: "بغیر دُھویں کی آگ اور بہت سا تہہ بہ تہہ دُھواں تمہاری طرف بھیجے گا"۔ (اور اس طرح سے تمہیں ہر طرف سے گھیر لے گا کہ کوئی راہ فرار نہیں ہوگی)۔ اس وقت تم کسی سے مدد طلب نہیں کرسکو گے۔ (یرسل علیکما شواظ من نار ونحاس فلا تنتصران)۔ ایک طرف تمہارا فرشتوں نے احاطہ کر رکھا ہے اور دُوسری طرف آگ کے گرم اور جلانے والے شعلوں اور تیرہ اور تار دَم گھوٹنے والے دھویں نے اطرافِ محشر کو گھیرا ہُوا ہے اور بھاگنے کے لیے کوئی راہ نہیں ہے۔ "شواظ" "راغب کی مفردات" اور "ابن منظور" کی "لسان العرب" اور دُوسرے مفسرین کے مطابق بغیر دُھویں والی آگ کے شعلوں کے معنی میں ہے اور بعض نے آگ کے ان شعلوں کو اس کے معنی بتایا ہے کہ جو بظاہر خود آگ سے الگ ہو جائیں گے اور سبز رنگ کے ہوں گے۔ بہرکیف اس تعبیر میں آگ کی شدّتِ حرارت کی طرف اشارہ ہے۔

"نحاس" کے معنی دُھواں ہے۔ (سُرخ شعلوں اور دُھویں سے پُر آگ)۔ کہ جو تانبے کا رنگ اختیار کرے گی۔

---

[۱] تفسیر صافی ص ۵۱۷، تفسیر مجمع البیان ج ۹ ص ۲۰۵

بعض نے اس کے معنی یہ لکھے ہیں کہ وہ پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگی۔ یہ معنی بظاہر زیرِ بحث آیت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے کیونکہ گفتگو ایسے موجود کے بارے میں ہے کہ جو قیامت میں انسان کا احاطہ کیے ہوئے ہو اور اسے عدالتِ الٰہی سے فرار سے روکے۔

قیامت کی عدالتِ انصاف کتنی عجیب ہے۔ اس وقت انسان جلانے والی آگ اور دم گھونٹنے والے دھوئیں اور منجانب اللہ مامور فرشتوں کے حِصار میں ہوگا اور اس کے لیے اس عدالت کے حکم کے ماننے کے علاوہ کوئی جادۂ گریز نہیں ہوگا۔
پھر ایک مرتبہ فرماتا ہے: اے گروہِ جنّ و انس تم اپنے پروردگار کی کِس کِس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔
یہاں بھی اِن آیات کو مبنی بر نعمت کہنا اسی استدلال کی بنا پر ہے جو اُوپر گزر چکا ہے۔

۳۷۔ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۚ

۳۸۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

۳۹۔ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۚ

۴۰۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

۴۱۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ
وَالْاَقْدَامِ ۚ

۴۲۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

۴۳۔ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۘ

۴۴۔ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ۚ

۴۵۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۧ

ترجمہ

۳۷۔ جس وقت آسمان پھٹ جائے گا اور پگھلے ہوئے روغن کی طرح گلگوں ہو جائے گا (تو ہولناک حوادث واقع ہوں گے جس کے تحمل کی تم میں تاب نہیں ہوگی)۔

۳۸۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

۳۹۔ اس دن جنّ و انس میں سے کسی سے اس کے گناہوں کے بارے میں سوال نہیں ہوگا۔

۴۰۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۴۱۔ بلکہ مُجرمین اپنے چہروں سے پہچانے جائیں گے۔ اس وقت ان کے سر کے اگلے بال اور پاؤں پکڑ لیے جائیں گے (اور وہ دوزخ میں پھینک دیے جائیں گے)۔

۴۲۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۴۳۔ یہ وہی دوزخ ہے کہ مُجرم جس کا انکار کرتے تھے۔

۴۴۔ آج دوزخ اور اس جلانے والے پانی کے درمیان وہ آمد و رفت رکھتے ہیں۔

۴۵۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

تفسیر

گنہگار اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے

گزشتہ آیتوں کے تتبع میں کہ جو قیامت کے بعض حوادث کو بیان کرتی تھیں یہ آیتیں بھی اسی طرح اس بحث کو جاری رکھتے ہوئے قیامت کے منظر کی کچھ خصوصیات اور حساب و کتاب کی کیفیت اور عذاب و سزا کے بیان پر مبنی ہیں۔ پروردگارِ عالم پہلے فرماتا ہے: "جس وقت کہ آسمان شگافتہ ہوکر پگھلے ہوئے روغن کی طرح گلگون ہو جائے تو ہولناک حوادث واقع ہوں گے جن کے تحمل کی کسی میں طاقت نہیں ہوگی": (فاذا انشقت السّماء فکانت وردة کالدهان)[1]

قیامت سے تعلق رکھنے والی تمام آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دن دنیا کا موجودہ نظام کُلی طور پر درہم و برہم ہو جائے گا اور دنیا میں بہت ہی ہولناک حوادث رُونما ہوں گے۔ ستارے، سیارے، زمین آسمان سب تلپٹ ہو جائیں گے اور وہ مسائل کہ جن کا تصور آج ہمارے لیے مشکل ہے، درپیش ہوں گے۔ منجملہ ان مسائل کے کہ جو مذکورہ بالا آیات میں آئے ہیں یہ ہے کہ آسمانی کُرّے

[1] یہ کہ " اذا " اس جملہ میں شرطیہ ہے یا فجائیہ یا ظرفیہ کئی ایک احتمال ہیں لیکن بہتر وہی پہلا احتمال ہے اور شرط کی جزا محذوف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تقدیرِ عبارت اس طرح ہو فاذا انشقت السّماء فکانت وردة کالدهان کان اهوال لا یطیقها البیان " جب آسمان پھٹ کر پگھلے ہوئے تیل کی طرح ہوگا تو ایسے خوفناک منظر ہوں گے کہ جو بیان نہیں ہو سکتے۔

شق ہو جائیں گے اور سُرخ رنگ کے روغن کی طرح پگھلی ہوئی شکل اختیار کر لیں گے۔ "وردۃ" اور "ورد" کے معنی پھول ہیں اور چونکہ پھول عام طور پر سُرخ رنگ کے ہوتے ہیں لہذا یہاں سُرخ رنگ پر دلالت کرتا ہے۔ یہ لفظ سُرخ گھوڑوں کے لیے بھی آیا ہے اور اس بنا پر کہ اس قسم کے گھوڑے مختلف موسموں میں اپنا رنگ بدل لیتے ہیں، فصل بہار میں وہ زردی مائل ہو جاتے ہیں اور سردی کے موسم میں سُرخ رنگ کے اور زیادہ سردی پڑے تو سیاہ رنگ کے ہو جاتے ہیں۔ لہذا وہ تبدیلیاں جو قیامت کے دن آسمان میں واقع ہوں گی، ان سے تشبیہ دی گئی ہے کہ کبھی آسمان آگ کے شعلوں کی طرح سُرخ و سوزاں کبھی زرد کبھی دھوئیں سے آلودہ سیاہ ہوگا۔ "دھان" (بروزن کتاب) پگھلے ہوئے روغن کو کہتے ہیں۔ کبھی اس تلچھٹ کے لیے آتا ہے جو روغن میں تہ نشیں ہوتی ہے اور عام طور پر اس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تشبیہ اس وجہ سے ہو کہ آسمان کا رنگ پگھلے ہوئے روغن کی شکل میں سُرخ نکل آئے گا یا پھر اس سے آسمانی کُرّوں کے پگھل جانے کی طرف اشارہ ہے یا اس کے مختلف رنگوں کی طرف۔ بعض مفسرین نے "دھان" کی سُرخ رنگ کے چمڑے سے بھی تفسیر کی ہے۔ بہرصورت یہ تمام تشبیہات اس ہولناک منظر کا صرف ایک ہیولا پیش کرسکتی ہیں کیونکہ وہ صورت حال دُنیا کے کسی واقعہ سے حقیقی مشابہت نہیں رکھتی اور وہ ایسے منظر ہیں کہ جب تک کوئی انہیں دیکھ نہ لے سمجھ نہیں سکتا۔ چونکہ میدانِ قیامت میں یا اس سے پہلے ان ہولناک حوادث کے وقوع کی خبر دینا مجرمین و مومنین کے لیے تنبیہ ہے، لہٰذا الطافِ الٰہی میں سے ایک لُطف ہے۔ اسی بنا پر سابقہ جملے کی تکرار ہوتی ہے اور پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے": (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔ اس سے بعد کی آیت میں قیامت کے حوادثِ تکوینی کی وجہ سے اس روز گنہگار انسان کی جو حالت ہوگی اس کو پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: اس دن جنّ و انس میں سے کسی شخص سے بھی اس کے گناہ کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔ (فیومئذ لا یسئل عن ذنبہ انس ولا جان)۔

سوال کیوں نہیں ہوگا؟ اس لیے کہ ہر چیز اس دن واضح اور آشکار ہوگی۔ وہ یوم البروز ہے۔ ہر انسان کے اعمال اس کے چہرے سے ظاہر ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی یہ سوچے کہ یہ آیت ان آیتوں سے متصادم ہے جو قیامت میں بندوں کے سوال کے مسئلہ پر تاکید کرتی ہیں مثلاً سورہ صافات کی آیت ۲۴۔ (وقفوھم انھم مسئولون) انہیں روکو تاکہ ان سے سوال کیا جاسکے؛ اور سورہ حجر کی آیت ۹۲، ۹۳۔ (فو ربك لنسئلنھم اجمعین عما کانوا یعملون) "تیرے پروردگار کی قسم ان سب سے سوال کریں گے۔ ان کاموں کے متعلق کہ جنھیں وہ انجام دیتے تھے"۔ لیکن ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے یہ مشکل حل ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ قیامت ایک بہت طویل دن ہے اور انسان کو متعدد مواقف اور گزرگاہوں میں سے گزرنا ہے اور ہر منظر و موقف میں ایک مُدت تک ٹھہرنا ہے۔ بعض روایات کے مطابق پچاس مواقف ہیں۔ ان میں سے بعض موقفوں میں بالکل سوال نہیں ہوگا بلکہ رخسار کا رنگ اندرونی کیفیت کا پتہ دے گا، جیسا کہ اس سے بعد والی آیت میں آئے گا۔ بعض مواقف میں انسان کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور اس کے اعضائے بدن شہادت دینے کے لیے مستعد ہو جائیں گے۔[1]

اور بعض مواقف میں انسانوں سے نہایت باریک بینی کے ساتھ سوال ہوں گے۔[2]

---

[1] سورہ یٰسین ۔ ۶۵

[2] مثلاً آیت زیر بحث اور دو وہ آیتیں جن کی طرف ہم نے اُوپر اشارہ کیا ہے۔

بعض دُوسرے مواقف میں انسان اپنے دفاع کے لیے لڑائی جھگڑا کرنے لگیں گے۔[۱]

خلاصہ یہ کہ ہر منظر کے کچھ تقاضے ہیں اور ہر منظر دُوسرے منظر سے زیادہ خوفناک ہے۔ پھر اس کے تتبع میں سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے : " تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کروگے"۔ (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔ جی ہاں اس دن سوال نہیں کیا جائے گا بلکہ مجرم اپنی علامتوں سے پہچانے جائیں گے۔ (یعرف المجرمون بسیماھم)۔[۲]

ایک گروہ ایسا ہوگا کہ جن کے چہرے نورانی اور درخشاں ہوں گے جو ان کے ایمان و عملِ صالح پر دلالت کرتے ہوں گے۔

دُوسرا گروہ سیاہ، تاریک اور قبیح چہروں والا ہوگا جو ان کے کُفر اور گناہ کی علامتیں ہیں جیسا کہ سورہ " عبس" کی آیت ۳۸ تا ۴۲ میں ہمیں ملتا ہے۔ (وجوہ یومئذ مسفرۃ ضاحکۃ مستبشرۃ ووجوہ یومئذ علیھا غبرۃ ترھقھا قترۃ) اس دن نورانی اور درخشاں چہرے بھی ہوں گے اور تاریک چہرے بھی کہ جنہیں خاص قسم کی سیاہی نے گھیر رکھا ہوگا۔ اس کے بعد فرماتا ہے : " اس کے بعد سر کے آگے کے بال اور پاؤں پکڑے جائیں گے اور انہیں دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

(فیؤخذ بالنواصی والاقدام)۔ " نواصی" " ناصیہ" کی جمع ہے جیسا کہ " راغب مفردات میں کہتا ہے کہ ناصیہ اصل میں سَر کے آگے کے بالوں کے معنی میں ہے۔ اس کا مادّہ " نصأ" (بروزن نصر) ہے جس کے معنی اتصال و پیوستگی کے ہیں اور " اخذ بہ ناصیہ" سَر کے اگلے بالوں کے پکڑنے کے معنی میں ہے اور کبھی کسی چیز پر مکمّل قبضہ کے کنایہ کے طور پر بھی آتا ہے۔ " اقدام" جمع ہے "قدم" کی جس کے معنی پاؤں ہے۔ مُجرموں کے سروں کے اگلے بالوں اور ان کے پاؤں کا پکڑنا ہو سکتا ہے کہ حقیقی معانی کے اعتبار سے ہو کہ مامورین من اللہ ان دو چیزوں کو پکڑ کر زمین سے اُٹھا کر نہایت ذلّت و خواری کے ساتھ دوزخ میں پھینک دیں گے۔ یا یہ مجرمین کے انتہائی ضعف و ناتوانی کے ساتھ مامورین من اللہ کی گرفت میں آنے کا کنایہ ہے کیونکہ وہ مجرمین کے اس گروہ کو انتہائی ذلّت سے جہنّم کی طرف لے جائیں گے اور وہ منظر کیا ہی دردناک اور وحشت ناک ہوگا۔

چونکہ معاد کے سلسلہ میں ان چیزوں کا یاد دلانا تنبیہہ ہونے کی وجہ سے سب کے لیے ایک نوازش ہے، لہٰذا سب کو مخاطب کرکے مزید کہتا ہے : " تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کروگے"۔ (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔ اس کے بعد کی آیت میں فرماتا ہے : " یہ وہی دوزخ ہے کہ جس کا مجرم ہمیشہ انکار کرتے ہیں"۔ (ھٰذہ جھنم التی یکذب بھا المجرمون)۔ چونکہ مخاطب محشر میں موجود ہوں گے اور قیامت میں ان سے یہ بات کہی جائے گی' یا مخاطب ذات پیغمبر ہے اور دُنیا میں اس سے کہا گیا ہے اس لیے مفسّرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں۔ لیکن آیت میں کچھ ایسے قرائن موجود ہیں جو دوسرے معانی کو تقویت دیتے ہیں کیونکہ فعل مضارع " یکذب" کا استعمال اور جملہ غائب کا مجرموں کے عنوان سے استفادہ اس چیز پر دلالت کرتا ہے کہ خُدا اپنے پیغمبرؐ سے کہتا ہے کہ یہ اوصاف اس دوزخ کے ہیں جس کا مجرمین ہمیشہ انکار کرتے ہیں۔ یا پھر یہ کہ مخاطب تمام جنّ و انس ہیں کہ جنہیں تنبیہہ کرتا ہے کہ وہ جہنم جس کا مجرم انکار کرتے ہیں، اس قسم کے اوصاف کا حامل ہے کہ جنھیں تم سُن رہے ہو۔ لہٰذا خبردار

---

[۱] نحل - ۱۱۱

[۲] " سیما" اصل میں علامت و نشانی کے معنی میں ہے اور ہر قسم کی علامت کہ جو ان کے چہرے یا بدن کے دوسرے حصّہ میں ہو اس پر حاوی ہے لیکن چونکہ عام طور پر خوشحالی و بدحالی کی علامتیں چہرہ ہی پر نمایاں ہوتی ہیں لہٰذا اس لفظ کے بیان سے چہرہ ہی سامنے آتا ہے

رہو۔ تمہارا انجام تمہیں وہاں تک نہ لے جائے۔ دوبارہ جہنم کی تصریح اور اس کے دردناک عذاب کے سلسلہ میں مزید کہتا ہے:

"مجرم دوزخ اور جلانے والے پانی کے درمیان آمدورفت رکھتے ہیں"۔ (یطوفون بینھا و بین حمیمٍ اٰن)۔ "اٰن" اور "اٰنی" یہاں اس پانی کے معنوں میں ہے کہ جو کھولتا ہوا ہو اور اصل میں "انا" (بروزن رضا) کے مادہ سے وقت کے معنی دیتا ہے کیونکہ جلانے والا پانی اپنی آخری حد کو پہنچ چکا ہے۔ تو اس طرح ایک طرف تو جہنم کے جلانے والے شعلوں کے درمیان چلیں گے اور پیاسے ہوں گے اور پانی کی تمنا کریں گے دوسری طرف انہیں کھولتا ہوا پانی دیا جائے گا۔ (یا ان پر پھینکا جائے گا)۔ اور یہ دردناک سزا و عذاب ہے۔

بعض آیاتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ "حمیم" نامی جلانے والا چشمہ جہنم کے قریب ہے کہ پہلے دوزخیوں کو ان میں لے جائیں گے اور پھر انہیں جہنم کی آگ میں پھینکیں گے۔ (یسحبون فی الحمیم ثم فی النار یسجرون) (مؤمن ۷۱،۷۲) (یطوفون بینھا و بین حمیم اٰن) کی تعبیر زیر بحث آیت میں انہی معنوں سے مناسبت رکھتی ہے۔ پھر اس شدید خطرے سے بیدار کرنے کی حالت کو اور اس تنبیہ کو جو بجائے خود ایک لطفِ پروردگار ہے، بیان کر کے کہتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے"۔ (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔

۴۶۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۚ

۴۷۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۙ

۴۸۔ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ۚ

۴۹۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۞

۵۰۔ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ ۚ

۵۱۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۞

۵۲۔ فِیْهِمَا مِنْ کُلِّ فَاکِهَةٍ زَوْجٰنِ ۚ

۵۳۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۞

۵۴۔ مُتَّکِـِٕیْنَ عَلٰی فُرُشٍۢ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ
وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ ۚ

۵۵۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۞

ترجمہ

۴۶۔ اور اس شخص کے لیے کہ جو اپنے پروردگار سے ڈرے جنّت کے دو باغ ہیں

۴۷۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۴۸۔ وہ جنت کے ان دو باغوں میں انواع و اقسام کی نعمتیں اور طراوت رکھنے والے درخت رکھتے ہیں ۔

۴۹۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۵۰۔ ان میں مسلسل دو چشمے جاری ہیں ۔

۵۱۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۵۲۔ ان دونوں باغوں میں ہر پھل کی دو دو قسمیں موجود ہیں ۔

۵۳۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۵۴۔ یہ اس حالت میں ہے کہ وہ ایسے فرشوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں کہ جن کے استر ریشم کے ہیں اور ان دونوں باغوں کے پکے ہوئے پھل ان کی دسترس میں ہیں ۔

۵۵۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

تفسیر

یہ دونوں جنتین خائفین کے انتظار میں ہیں

ان آیتوں میں دوزخیوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر پروردگار عالم نے جنتیوں کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ اس طرح اللہ نے جنت کی دلپذیر اور شوق انگیز نعمتوں کا شمار کرایا ہے تاکہ ان نعمتوں کا دوزخیوں پر نازل ہونے والے عذابوں اور سزاؤں سے موازنہ کر کے دونوں میں سے ہر ایک کی اہمیت کو واضح کرے۔ وہ فرماتا ہے : " اس شخص کے لیے کہ جو اپنے پروردگار کے مرتبہ سے خائف ہے جنت کے دو باغ ہیں " (ولمن خاف مقام ربه جنّتان)۔ " مقام پروردگار سے خوف " اس سے مراد قیامت کے مختلف موقفوں میں قیام کا خوف ، حساب کی غرض سے بارگاہ الٰہی میں حاضر ہونے کا خوف یا خدا کے اس علم اور دائمی نگہبانی کا خوف ہے جو وہ تمام انسانوں کے بارے میں رکھتا ہے[1]۔

(حاشیہ[1] اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

دوسری تفسیر اس بات سے مناسبت رکھتی ہے جو سورہ "رعد" کی آیت ۳۳ میں آئی ہے جہاں خدا فرماتا ہے (افمن ھو قائم علیٰ کل نفس بما کسبت) "کیا وہ جو سب کے سرہانے موجود ہے اور سب کے اعمال کا نگہبان و نگران ہے، اس شخص کی مانند ہے جو یہ صفتیں نہیں رکھتا"۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: من علم ان اللّٰہ یراہ ویسمع مایقول ویعلم مایعملہ من خیر او شر فیحجزہ ذالک عن القبیح من الاعمال فذالک الذی خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوی "جو شخص جانتا ہے کہ خدا اس کو دیکھتا ہے اور جو کچھ یہ کہتا ہے وہ سنتا ہے اور خیر و شر میں سے جو کچھ یہ انجام دیتا ہے اُسے وہ جانتا ہے اور یہ توجہ اس انسان کو اعمالِ قبیح سے روکتی ہے تو یہی وہ شخص ہے جو اپنے رب کے مقام سے خائف ہے اور اس نے اپنے آپ کو ہوائے نفس سے باز رکھا ہے"[1]

ایک تیسری تفسیر اور بھی ہے اور وہ یہ کہ یہاں مراد صرف خدا کا خوف ہے نہ جہنم کی آگ کا نہ نعماتِ جنت کے لالچ کی وجہ سے کوئی خوف ہے بلکہ صرف مقامِ پروردگار اور اس کے جلال کا خوف ہے۔

ایک چوتھی تفسیر بھی ہے کہ "مقامِ پروردگار" سے مراد عدالتِ الٰہی کا مقام ہے کیونکہ اس کی ذاتِ مقدس خوف کا باعث نہیں ہے بلکہ خوف اگر ہے تو اس کی عدالت سے ہے اور عدالت سے خوف کی بازگشت بھی خود انسان کے اپنے اعمال کی طرف ہے کیونکہ جس کا حساب پاک ہے اُسے محاسبہ سے کیا باک ہے۔ مجرم جس وقت عدالت یا زندان کے پاس سے گزرتے ہیں تو ڈرتے ہیں لیکن بے گناہ لوگوں کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہاں عدالت ہے یا کوئی اور جگہ۔ پروردگار سے خائف ہونے کے مختلف سرچشمے ہیں۔ کبھی تو اپنے ناپاک اعمال اور غلط افکار کی وجہ سے خوفِ خدا لاحق ہوتا ہے اور کبھی مقربین بارگاہِ الٰہی کے لیے اِن کے قُرب کی بنا پر، کبھی چھوٹا سا ترکِ اَولیٰ اور معمولی سی غفلت بھی خوفِ خُدا کا سبب بن جاتی ہے۔ کبھی ان سب سے ہٹ کر جب اس کی لامحدود ذات اور لامتناہی عظمت کا تصور کرتے ہیں تو اس کے مقابلے میں اپنی حقارت کا احساس کرنے سے خوف طاری ہو جاتا ہے۔ یہ وہ خوف ہے جو پروردگار کی انتہائی معرفت کے وقت حاصل ہوتا ہے اور اس کی بارگاہ کے مخصوص عارف اور مخلص فرد کو لاحق ہوتا ہے۔ یہ چاروں تفسیریں آپس میں تضاد نہیں رکھتیں اور یہ ممکن ہے کہ مفہوم آیت میں ان سب کا اجتماع ہو۔ باقی رہیں دو جنتیں (بہشت کے دو باغ) تو ہو سکتا ہے کہ پہلی بہشت مادی و جسمانی ہو اور دوسری بہشت معنوی و رُوحانی ہو جیسا کہ سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۵ میں آیا ہے: للذین اتقوا عند ربھم جنات تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا وازواج مطھرۃ ورضوان من اللّٰہ۔ اس آیت میں جسمانی جنت کے علاوہ، کہ جس کے درختوں کے نیچے سے نہریں گزرتی ہیں اور اس میں پاکیزہ بیویاں ہیں، معنوی بہشت کہ جو خوشنودیِ خدا ہے اس کا بھی بیان ہے۔ یا یہ کہ پہلی جنت انہیں ان کے نیک اعمال کے صلہ میں دی جائے گی اور دوسری بہشت

[illegible] پہلی صورت میں لفظ "مقام" اسم مکان ہے اور دوسری صورت میں مصدر [illegible] (حاشیہ صفحہ [illegible])

[1] [illegible] اصولِ کافی، مطابق نقل "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۱۹۱۔ [illegible] حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام نے یہ گفتگو سورۂ نازعات کی آیت ۴۰ (واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوی) کی تفسیر میں فرمائی اگرچہ دونوں آیات کا مفہوم ایک ہی ہے۔

بطور تفضل عطا کی جائے گی۔ جیسا کہ سورہ نور کی آیت ۳۸ میں آیا ہے: لیجزیھم اللہ احسن ما عملوا ویزیدھم من فضلہ) مقصد یہ ہے کہ خدا ان کو ان کے بہترین اعمال کا اجر دے گا اور اپنے فضل کا اس پر اضافہ کرے گا۔ یا یہ کہ ایک جنّت اطاعت کی بنا پر اور دوسری معصیت کے ترک کرنے کی بنا پر ہے۔ یا ایک ایمان وعقیدہ کی وجہ سے ہے اور دوسری اعمالِ صالح اور اسی قسم کے دوسرے امور کے صلہ میں ہے۔ یا یہ کہ چونکہ مخاطب جنّ و انس ہیں تو ان دونوں جنّتوں میں سے ہر ایک الگ گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اِن تفاسیر میں سے کسی کے حق میں بھی کوئی خاص دلیل نہیں ہے جب کہ یہ ممکن ہے کہ آیت سے یہ سب کی سب تفسیریں مراد ہوں۔ وہ چیز جو طے شدہ اور یقینی ہے کہ خدا جنّت کے کئی باغات اپنے صالح بندوں کے اختیار میں دے گا جن میں ان کی آمد و رفت ہوگی اور دوزخی آگ اور جلانے والے پانی کے درمیان مقیم ہوں گے۔ یہ تھے جنّت کے دو باغ۔ پھر اس عظیم نعمت کے بعد سب کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے"۔ (فبایّ آلاء ربکما تکذبان)۔

اس کے بعد ان دونوں بہشتوں کی تعریف و توصیف میں مزید ارشاد فرماتا ہے: وہ انواع و اقسام کی نعمتوں اور طراوت رکھنے والے شاخ دار درختوں کی حامل ہیں۔ (ذواتا افنان)۔ "ذواتا" "ذات" کا تثنیہ ہے جس کے معنی صاحب و حامل کے ہیں۔[1]

"افنان" جمع ہے "فنن" (بروزن قلم) کی۔ یہ تر و تازہ شاخوں اور ٹہنیوں کے معنی میں ہے جن میں خوب پتّے لگے ہوئے ہوں۔ یہ لفظ بعض اوقات "نوع" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور زیر بحث آیت میں اس بات کا امکان ہے کہ دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہو۔ پہلی صورت میں جنّت کے درختوں کی طراوت رکھنے والی تر و تازہ شاخوں کی طرف اشارہ ہو برخلاف دنیا کے درختوں کی شاخوں کے کہ جو پرانی اور نئی دونوں قسم کی شاخوں کے حامل ہوتے ہیں۔ دوسری صورت میں بہشت کی نعمتوں کے تنوع اور اس کی مختلف نعمتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ان دونوں معانی کے اختیار کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ جنّت کے درخت اس قسم کے ہیں کہ ایک ہی درخت کی بہت سی شاخیں ہیں اور ہر شاخ پر مختلف قسم کے پھل ہیں۔ اس نعمت کے بیان کے بعد پھر اسی سوال کی تکرار ہے کہ "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے"۔ (فبایّ آلاء ربکما تکذبان)۔

چونکہ ایک سبز، پُرمسرت اور طراوت رکھنے والے باغ میں درختوں کے علاوہ پانی کے چشمے بھی جاری ہونے چاہئیں لہٰذا بعد والی آیت میں کہتا ہے: "ان دو بہشتوں میں دو چشمے ہیں کہ جو ہمیشہ جاری رہتے ہیں"۔ (فیھما عینان تجریان)۔ پھر اس نعمت کے مقابلے میں وہی سوال کرتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے"۔ (فبایّ آلاء ربکما تکذبان)۔ اگرچہ مذکورہ بالا آیت میں ان دونوں چشموں کی کیفیت کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہے صرف اس کے متعلق "نکرہ" کے عنوان کے ماتحت ایک تعبیر نظر آتی ہے کہ جو اس قسم کے مواقع پر عظمت و اہمیت کی دلیل ہے لیکن بعض مفسرین نے ان دو چشموں کو "سلسبیل" اور "تسنیم" نام کے دو چشمے جو بالترتیب سورہ "دھر" کی آیت ۱۸ اور "مطففین" کی آیت ۲۷ میں بیان کیے گئے ہیں، بطور تفسیر پیش کیے ہیں کبھی کہا ہے کہ ان دونوں چشموں میں سے ایک شراب طہور اور دوسرا عسل مصفّیٰ کا ہے۔ ان دونوں کا ذکر سورہ "محمد" کی آیت ۱۵ میں ہے۔

---

[1] بعض مفسرین کے نظریہ کے مطابق ذات کی اصل جو کہ مفرد مؤنث ہے "ذوات" تھی کہ جس کی واؤ تخفیف کی وجہ سے حذف ہوگئی اور "ذات" کی شکل میں رہ گئی۔ چونکہ تثنیہ الفاظ کو ان کی اصل کی طرف پلٹا دیتا ہے تو یہاں ذواتان ہوگیا ہے اور اضافت کی وجہ سے اس کا نون حذف ہوگیا ہے۔ مجمع البحرین میں آیا ہے کہ "ذو" بروزن صدا تھی تو اس بنا پر تعجب کی بات نہیں کہ اس کی مؤنث ذوات ہو۔

اور اگر ہم "جنتان" کی تفسیر گزشتہ آیتوں میں موجود معنوی اور مادی جنتوں کے اعتبار سے کریں تو قدرتاً یہ دونوں چشمے بھی ایک معنوی (چشمۂ معرفت) اور دوسرا مادی چشمہ (آب زلال، دُودھ، شراب طہور یا شہد کا) ہوگا۔ لیکن ان تفسیروں کے لیے ہمارے پاس کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہے۔ اس کے بعد کی آیت میں جب گفتگو بہشتی باغوں کے پھلوں میووں تک پہنچ جاتی ہے تو فرماتا ہے: "ان میں ہر ایک پھل کی دو قسمیں موجود ہیں" (فیھما من کل فاکھة زوجان)۔ ایک وہ قسم جس کا نمونہ دنیا میں انہوں نے دیکھا ہے اور دوسری وہ قسم جس کی مثل و نظیر اس دنیا میں ہرگز نہیں دیکھی۔ بعض مفسرین دو قسم کی تفسیر گرمی اور سردی کے پھلوں، خشک و تر یا چھوٹے بڑے پھلوں کے اعتبار سے کرتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کے پاس بھی کوئی واضح دلیل نہیں ہے۔ اتنی بات طے شدہ ہے کہ جنّت کے پھل مکمل طور پر متنوع اور گوناں گوں ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ پُرکشش اور عُمدہ ہے۔ اس کے بعد، پروردگارِ عالم پھر فرماتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کروگے" (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔

گزشتہ آیتوں میں جنّت کے ان دونوں باغوں کی خصوصیات کے تین حصّے بیان ہوئے ہیں۔ اب ہم اس کی چوتھی خصوصیت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "یہ اس حالت میں ہیں کہ جنّتی فرش پر بیٹھے ہیں اور تکیے لگائے ہوئے ہیں کہ جن کے استر ریشم اور استبرق کے ہیں"۔ (متکئین علیٰ فرش بطائنھا من استبرق)[1]

عام طور پر انسان تکیہ اس وقت لگاتا ہے کہ جب انتہائی آرام دہ اور امن کے ماحول میں ہو۔ یہ تعبیر بہشتیوں کی رُوح کی مکمل تسکین و آرام کی نشان دہی کرتی ہے۔ "فرش" (بروزن شتر) جمع اس کی "فراش" ہے جس کے معنی ہیں ایسے فرش جو بچھائے جاتے ہیں۔ "بطائن" جمع ہے "بطانہ" کی جس کے معنی استر کے ہیں اور استبرق موٹے اور ضخیم ریشم کے معنوں میں ہے۔ قابلِ توجہ اور پُرکشش بات یہ ہے کہ یہاں بہت قیمتی پارچہ جس کا دنیا میں تصوّر ہوسکتا ہے اس کا اُن فرشوں کے استر کے طور پر ذکر ہوا ہے، جو اس طرف اشارہ ہے کہ اس کا اُوپر والا حصّہ ایسی چیز ہے کہ جس کی لطافت وزیبائی اور جاذبیت تعریف و توصیف سے ماورا ہے۔ کیونکہ عام طور پر دنیا میں استر کو، اس وجہ سے کہ وہ دِکھائی نہیں دیتا، کم قیمت جنس سے تیار کرتے ہیں تو اس طرح اِس جہاں کی کم قیمت اجناس کی جگہ اُس جہان میں نہایت قیمتی جنس مستعمل ہے۔ تو اب سوچنا چاہیئے کہ اس جہاں کی بیش قیمت چیزیں کیسی ہوں گی۔

یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ پروردگارِ عالم کی ان نعمتوں میں سے کہ جو دوسرے جہان سے متعلق ہیں کوئی نعمت ایسی نہیں کہ جو الفاظ میں بیان ہوسکے یا یہ کہ ہم ان کے تصوّر کی طاقت رکھتے ہوں۔ ہمارے ذہنوں پر صرف ایک تصوّراتی پیکر دُور ہی سے متجلّی ہوتا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی ہمیں ملتا ہے کہ جنّتی "ارائک" یعنی سائبان والے تخت اور بغیر سائبان کے تخت پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے لیکن یہاں فرماتا ہے: کہ فرش پر تکیہ لگائے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ لذاتِ بہشتی کے تنوع کی بنا پر ہو کہ کبھی تخت پر اور کبھی فرش پر تکیہ لگا کر بیٹھیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان بیش قیمت فرشوں کو ان تختوں پر بچھا دیں۔ یا پھر اس سے زیادہ معاملات کی طرف اشارہ ہو جن کا ادراک اس دنیا میں رہنے والوں کے لیے ممکن نہیں ہے۔ آخر میں پانچویں نعمت کے سلسلہ میں اسی بہشتی باغ کی نعمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ان دونوں بہشتوں کے پکتے ہوئے پھل ان کی دسترس میں ہوں گے (وجنا الجنّتین دان)۔ جی ہاں وہ زحمت و تکلیف کہ جو عام طور پر دنیا کے پھلوں کے حاصل کرنے میں ہوتی ہے وہاں کسی بھی طرح نہیں ہے۔

---

[1] "متکئین" حال ہے ان بہشتیوں کا گزشتہ آیتوں میں جنہیں (ولمن خاف مقام ربّہ جنّتان) کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

"جنی" (بروزن بقا) اس پھل کو کہتے ہیں کہ جس کو توڑنے کا وقت آن پہنچا ہو اور "دان" اصل میں "دانی" ہے اس کے معنی نزدیک کے ہیں۔ پھر سب کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے" (فبایّ آلاء ربکما تکذبان)۔

۵۶۔ فِيهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ۚ

۵۷۔ فَبِأَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۚ

۵۸۔ كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ ۚ

۵۹۔ فَبِأَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

۶۰۔ هَلْ جَزَآءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ ۚ

۶۱۔ فَبِأَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

ترجمہ

۵۶۔ جنّت کے باغوں میں ایسی خواتین ہیں کہ جو سوائے اپنے شوہروں کے کسی سے محبّت نہیں رکھتیں اور اس سے پہلے کسی جنّ و انس نے اُنہیں مَس نہیں کیا۔

۵۷۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۵۸۔ وہ یاقوت و مرجان کی مانند ہیں ۔

۵۹۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۶۰۔ کیا نیکی کا بدلہ نیکی کے علاوہ کچھ اور ہے ؟

۶۱۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

تفسیر

پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "بہشت کے محلوں میں ایسی عورتیں ہیں کہ جنہوں نے اپنے شوہروں کے علاوہ کبھی کسی دوسرے مرد کی طرف نہیں دیکھا اور ان کے علاوہ کبھی کسی دوسرے فرد سے محبت نہیں کی"۔ (فیھن قاصرات الطرف)[1]

"اور کسی جن یا انسان نے اس سے پہلے ان سے ملاقات نہیں کی"۔ (لم یطمثھن انس قبلھم ولا جان)[2]

اس وجہ سے وہ دوشیزہ ہیں۔ کسی نے ان کو ہاتھ نہیں لگایا یا وہ ہر لحاظ سے پاک و پاکیزہ ہیں۔ حضرت ابوذرؓ سے منقول ہے کہ جنت والی بیوی اپنے شوہر سے کہے گی کہ مجھے پروردگار کی عزت کی قسم ہے کہ میں جنت میں تجھ سے بہتر کوئی چیز نہیں پاتی۔ حمد و سپاس مخصوص ہے، اس خدا کے لیے جس نے مجھے تیری بیوی اور تجھ کو میرا شوہر قرار دیا۔[3]

"طرف" (بروزن حرف) کے معنی پلک کے ہیں۔ چونکہ دیکھنے کے وقت پلکیں حرکت کرتی ہیں، لہٰذا یہ کنایہ ہیں دیکھنے کا۔ اس بنا پر "قاصرات الطرف" کے الفاظ ایسی عورتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جن کی نگاہ کوتاہ ہے یعنی وہ صرف اپنے شوہروں سے ہی لگاؤ رکھتی ہیں۔ اور یہ ایک بیوی کا عظیم ترین امتیاز ہے کہ وہ اپنے شوہر کے سوا کسی دوسرے کا تصوّر بھی نہ کرے اور کسی سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ پروردگارِ عالم اس نعمت بہشتی کے بعد پھر فرماتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے"۔ (فبایّ اٰلاء ربکما تکذبان)۔ اس کے بعد ان بہشتی عورتوں کی اور تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ یاقوت و مرجان کی طرح ہیں" (کانّھن الیاقوت والمرجان)۔ سرخی صفائی اور آب و تاب میں یاقوت اور خوبروئی و سفیدی میں مرجان اس وقت کہ جب یہ دونوں رنگ، سفید اور صاف سُرخ، آپس میں ملتے ہیں تو ایک نہایت خوبصورت رنگ بنتا ہے۔ "یاقوت" ایک معدنی پتھر ہے جو عام طور پر سُرخ رنگ کا ہوتا ہے اور مرجان ایک دریائی جانور ہے کہ جو درخت کی شاخ سے مشابہ ہوتا ہے جو کبھی سفید کبھی تیز سُرخ یا مختلف رنگوں کا ہوتا ہے۔

---

[1] "فیھن" میں جمع کی ضمیر ممکن ہے قصورِ بہشتی کی طرف لوٹے یا ان دو جنتوں کے مختلف باغات کی طرف یا ان کی نعمتوں کی طرف۔

[2] "لم یطمثھن" کا مادّہ "طمث" ہے جس کے معنی ماہواری کا خون ہے۔ یہ زوالِ بکارت کے معنوں میں بھی آیا ہے اور یہاں اس طرف اشارہ ہے کہ جنت کی باکرہ عورتیں ہرگز شوہر نہیں رکھتیں۔

[3] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۰۸

یہاں بظاہر مراد اس کی سفید قسم سے ہے[1]۔

بارِ دگر جنّت کی اس نعمت کے بیان کے بعد فرماتا ہے : " تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے "۔ (فبای الاء ربکما تکذبان)۔ اس بحث کے آخر میں فرماتا ہے : " کیا نیکی کی جزا نیکی کے علاوہ اور کوئی چیز ہوسکتی ہے " ؟ (ھل جزاء الاحسان الا الاحسان)[2]۔

وہ افراد کہ جنہوں نے دُنیا میں نیک کام کیے ہیں کیا خُدا کی طرف سے اُن کے لیے عُمدہ جزا کے علاوہ کسی اور شے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ اسلامی روایات میں یا مفسّرین کی تفسیروں میں احسان سے مراد توحید ہے یا توحید و معرفت ہے یا اسلام۔ لیکن یہ امر واضح ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ کوئی سی بھی نیکی جو عقیدہ ، گفتار اور عمل میں ہو یہ اس کے مفہوم پر حاوی ہے۔

امام جعفر صادق ؑ کی ایک حدیث میں ہے :

"آیة فی کتاب الله مجلة، قلت وماھی ؟ قال قول الله عزوجل :
"ھل جزاء الاحسان الا الاحسان" جرت فی الکافر والمؤمن ، والبر والفاجر، ومن
صنع الیه معروف فعلیه ان یکافئ به ولیس المکافاة ان تصنع کما صنع حتیٰ تربیٰ
فان صنعت کما صنع کان له الفضل بالابتداء"۔

قرآن میں ایک آیت ہے کہ جو عمومیت کامل رکھتی ہے۔ راوی نے عرض کیا کہ وہ کونسی آیت ہے فرمایا : خداوند تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ (ھل جزاء الاحسان الا الاحسان) کہ جو کافر و مومن اور نیک و بد کے بارے میں ہے۔ (کہ نیکی کا جواب نیکی سے دینا چاہیئے) جس شخص کے ساتھ نیکی کی جائے اسے نیکی سے بدلہ ادا کرنا چاہیئے اور بدلہ یہ نہیں ہے کہ اس کی نیکی کی مقدار کے برابر نیکی کی جائے بلکہ اس سے زیادہ نیکی کرنی چاہیئے۔ اگر نیکی کی اتنی ہی مقدار ہوگی تو اس کی نیکی افضل و برتر ہوگی کیونکہ اس نے ابتدا کی ہے[3]۔

اسی وجہ سے بندہ کے نیک اعمال کے بدلہ میں خدا کی طرف سے جو سلوک ہوگا وہ زیادہ بہتر ہوگا۔ یہ اس استدلال کی بنا پر ہے کہ جو امام نے مندرجہ بالا حدیث میں ارشاد فرمایا ہے : " راغب " " مفردات " میں کہتا ہے " احسان " ایک ایسی شے ہے جو انصاف سے بہتر ہے کیونکہ انصاف یہ ہے کہ انسان ، جو کچھ اس کے ذمّہ واجب ہے ، اسے ادا کردے اور جو اس کا دوسرے پر ہے وہ لے لے۔ لیکن احسان یہ ہے کہ انسان اس سے زیادہ کہ جس کا وہ ذمّہ دار ہے عطا کرے اور جتنا اس کا حق ہے اس سے کم لے۔

پروردگار عالم پھر اپنے بندوں کو مخاطب کرکے فرماتا ہے : " تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کروگے "۔ (فبای الاء ربکما

---

[1] مرجان کے بارے میں اس سورہ کے اوائل میں آیت ۲۲ کے ذیل میں ہم نے تشریح کی ہے۔

[2] " ھل " اس آیت میں استفہام انکاری کے طور پر ہے۔ حقیقت میں یہ آیت ان گزشتہ آیتوں کی دلیل ہے کہ جن میں جنّت کی چھ نعمتوں کا ذکر تھا۔

[3] تفسیر عیاشی مطابق نقل " نورالثقلین " ج ۵ ص ۱۹۹ اور تفسیر " مجمع البیان " جلد ۹ ص ۲۰۸

تکذبان)۔ وہ اس لیے کہ یہ قانون کہ "احسان کا بدلہ احسان ہے" بجائے خود ایک عظیم نعمت ہے جو خداوند عظیم کی طرف سے ہے وہ یہ بتاتا ہے کہ اپنے نیک بندوں سے جو سلوک ہوگا وہ اس کے اپنے کرم کی بنا پر ہوگا نہ کہ ان کے اعمال کے مطابق۔ اب اگر وہ اطاعت کرتے ہیں اور نیک عمل بجالاتے ہیں تو وہ بھی اس کی دی ہوئی توفیق کی نعمت کی بنا پر ہے۔ خدا کی برکتیں بندوں ہی کی طرف لوٹتی ہیں۔

ایک نکتہ

نیکی نیکی کی جزا ہے

جو کچھ ہم نے مندرجہ بالا آیت میں پڑھا: (ھل جزاء الاحسان الا الاحسان) قرآنی منطق کی رُو سے ایک عمومی قانون ہے کہ جو خدا، مخلوق اور تمام بندگانِ خدا پر حاوی ہے۔ اس قانون کی عمومیت تمام مسلمانوں کو یہ درس دیتی ہے کہ جس شخص کے ساتھ جو نیکی ہو وہ اس کے بدلہ میں ضرور نیکی کرے اور امام جعفر صادقؑ کے ارشاد کے مطابق اس کا بدلہ یہ نہیں ہے کہ ویسی ہی نیکی کی جائے بلکہ اس سے بہتر و برتر نیکی بروئے کار لائی جائے ورنہ جس نے احسان کرنے میں پہل کی ہے اس کی برتری اپنی جگہ مسلّم ہے۔ بارگاہِ خداوندی میں ہمارے اعمال کا مسئلہ ایک اور رُخ اختیار کر لیتا ہے کیونکہ خدا خود ایسا کریم ہے کہ جس کی رحمت کی موجوں نے تمام عالمِ امکان کا احاطہ کر رکھا ہے اور اس کا انعام و اکرام وہ ہے جو اس کی ذات کو زیب دیتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ بندوں کے اعمال کے برابر ہو۔ اس وجہ سے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ تاریخ اُمم میں ہمیں متعدد بار ایسا ملتا ہے کہ پُرخلوص افراد کو چھوٹا سا کام انجام دینے کے نتیجے میں بڑے انعامات سے نوازا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ بعض مفسّرین نے تحریر کیا ہے کہ ایک مسلمان نے ایک کافر بڑھیا کو دیکھا جو پرندوں کے لیے سردی کے موسم میں دانے ڈال رہی تھی۔ تو اُس مسلمان نے بڑھیا سے کہا کہ تجھ جیسی فرد کا یہ عمل بارگاہِ خداوندی میں قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس بُڑھیا نے کہا: "میں یہ عمل ضرور کروں گی چاہے قابلِ قبول ہو یا نہ ہو"۔ بات آئی گئی ہوئی۔ ایک مدّت کے بعد اسی مسلمان کو اس بُڑھیا نے حرم کعبہ میں دیکھا اور کہا کہ اے بندۂ خدا پرندوں کے لیے مٹھی بھر دانے ڈالنے کی برکت نے مجھے نعمتِ اسلام سے نوازا ہے[1]۔

---

[1] "رُوح البیان" جلد ۹ ص ۳۱۰

۶۲۔ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ۚ
۶۳۔ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۙ
۶۴۔ مُدْهَاۗمَّتٰنِ ۚ
۶۵۔ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۚ
۶۶۔ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ۚ
۶۷۔ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ
۶۸۔ فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ۚ
۶۹۔ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۚ

ترجمہ

۶۲۔ اور ان سے بہت نیچے دو اور بہشت ہیں۔
۶۳۔ تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟
۶۴۔ دونوں مکمّل طور پر پُرمسرّت و سرسبز ہیں۔
۶۵۔ تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟
۶۶۔ ان میں دو چشمے جوش کی حالت میں ہیں۔

۶۷۔ تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۶۸ ۔ ان میں پھل کثرت سے ہیں اور کھجور اور انار کے درخت ہیں ۔

۶۹ ۔ تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

تفسیر

دو اور جنّتیں اپنے حیران کُن اوصاف کے ساتھ

گزشتہ بحث کو جاری رکھتے ہوئے جس میں خوفِ خدا رکھنے والوں کو نصیب ہونے والی عالی قدر بہشتوں کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا پروردگارِ عالم اِن آیتوں میں دو اور جنتوں کی بات کرتا ہے جو پست درجہ میں ہیں اور قدرتاً ایسے افراد کے لیے ہیں کہ جو ایمان اور خوفِ الٰہی کی بہت نچلی سطح پر فائز ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں ایمان اور عملِ صالح کے اعتبار سے مختلف مراتب آتے ہیں۔ پہلے فرماتا ہے : " اور ان سے نیچے دو اور بہشت ہیں " (ومن دونهما جنّتان)۔ مفسّرین نے اس جملے کی دو تفسیریں کی ہیں ایک تو وہی جو ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ من دونهما کے الفاظ یعنی ان دو جنّتوں کے علاوہ دو اور جنّتیں ان مومنین کے لیے ہیں جو نئی نئی اشیا کے اشتیاق میں بہشت کے ان باغات میں سیر کر رہے ہیں۔ انسان کی طبیعت اور اس کا مزاج نئی نئی اشیاء میں دلچسپی کا عادی ہے اور اس سے اس کو لُطف حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اِن آیتوں کے لب و لہجہ سے اور ان روایتوں کی رُو سے جو اس تفسیر میں وارد ہوئی ہیں پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی ایک حدیث ہے کہ آپؐ نے اس آیت کی تفہیم کے بارے میں فرمایا : " جنتان من فضة وأٓنيتهما وما فيهما وجنتان من ذهب أٓنيتهما وما فيهما "

" دو جنّتیں جن کی عمارت اور جو اشیأ ان میں ہیں وہ سب چاندی کی ہیں اور دو جنّتیں ایسی ہیں کہ جن کی عمارت اور جو کچھ ان میں ہے وہ سب سونے کا ہے"۔

سونے اور چاندی کی تعبیر ممکن ہے کہ ان دونوں نعمتوں کے فرق کی طرف اشارہ ہو[1]

ایک اور حدیث جو امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے اس میں ہمیں ملتا ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

(لا تقولن الجنة واحدة، ان الله يقول " ومن دونهما جنتان" ولا تقولن درجة واحدة ان الله يقول " درجات بعضها فوق بعض" انما تفاضل القوم بالاعمال)

" یہ نہ کہو کہ ایک جنّت ہے کیونکہ خدا کہتا ہے : " ان دو جنّتوں کے علاوہ دو اور جنّتیں ہیں"۔

---

[1] " مجمع البیان" آیات زیر بحث کے ذیل میں ۔

اور یہ بھی نہ کہہ کہ ایک درجہ ہے کیونکہ خدا فرماتا ہے :

"کئی درجات ہیں جن میں سے بعض بعض سے بہتر ہیں" اور یہ فرق اعمال کی بُنیاد پر ہے۔[1]

اِسی وجہ سے پیغمبرِ اسلامؐ کی ایک حدیث میں ہے :

جنتان من ذھب للمقربین وجنتان من ورق لاصحاب الیمین ۔

" دو سونے کی جنتیں ہیں کہ جو مقربین بارگاہ کے لیے ہیں اور دو جنتیں چاندی کی ہیں کہ جو اصحاب الیمین کے لیے ہیں "۔[2]

اس کے بعد پھر فرماتا ہے : " تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کروگے"۔ (فبایّ اٰلاء ربکما تکذبان)۔ اس کے بعد ان دونوں جنتوں کی وہ پانچ خصوصیتیں کہ جن میں سے کچھ اس کے ساتھ مشابہت رکھتی ہیں جو سابقہ دو جنتوں کے بارے میں بتائی گئیں اور کچھ اُن سے مختلف ہیں اور ان کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔" وُہ دونوں پُرمسرت و سرسبز ہیں"۔(مدھامتان)۔ مدھامتان کا مادہ " ادھیمام" ہے اور " دھمہ" (بروزن تہمہ) کی جڑ سے سیاہی اور رات کی تاریکی کے معنوں میں ہے۔ خوش رنگ سبز پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور چونکہ اس قسم کا رنگ گھاس اور درختوں کی انتہائی شادابی کی علامت ہوتا ہے لہذا یہ تعبیر ان دونوں جنتوں کی انتہائی سرسبزی و شادابی کو بھی واضح کرتی ہے۔ اِس مقام پر پھر اضافہ کرتا ہے۔" تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کروگے"۔ (فبایّ اٰلاء ربکما تکذبان)۔

اس کے بعد والی آیت میں ایک اور صفت پیش کرتے ہوئے کہتا ہے : " ان دونوں جنتوں میں دو چشمے ہیں جو جوش مار رہے ہیں" (فیھما عینان نضاختان)۔ " نضاختان " کا مادّہ "نضخ " ہے جس کے معنی پانی کے اُبل کر نکلنے کے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر جن و انس سے استفہام انکاری کی صورت میں پوچھتا ہے" تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے"۔ (فبایّ اٰلاء ربکما تکذبان)۔

اس کے بعد کی آیت ان دونوں جنتوں کے پھلوں کے بارے میں کہتی ہے :" اُن میں پھل کثرت سے ہیں اور خرما اور انگور کے درخت ہیں (فیھما فاکھۃ ونخل ورمان)۔ اس میں شک نہیں کہ " فاکھۃ " کا ایک وسیع مفہوم ہے اور اس سے تمام قسم کے پھل مُراد ہوتے ہیں لیکن کھجور اور انار کی اہمیت اس کا سبب بنی ہے کہ ان دو پھلوں کا بطور خاص ذکر کیا جائے۔ اور یہ جو بعض مفسرین نے خیال کیا ہے کہ مذکورہ دونوں پھل " فاکھۃ "کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں، یہ غلط ہے۔ کیونکہ علمائے لغت نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔

اصولاً " عام " پر" خاص " کا عطف ایسے مواقع پر جب کوئی خاص امتیاز نہ رکھتا ہو معمول میں داخل ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۹۸ میں ہے (من کان عدواً للّٰہ وملائکتہ ورسلہ وجبریل ومیکال فان اللّٰہ عدو للکافرین) " جو شخص خدا اس کے ملائکہ اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں اور جبرئیل و میکائیل کا دُشمن ہو (اور کافر ہو) تو خدا کافروں کا دشمن ہے"۔ یہاں جبرئیل و میکائیل کو جو خدا کے عظیم فرشتوں میں سے دو فرشتے ہیں ملائکہ کے بیان کے بعد، بطور عام مورد توجہ قرار پائے ہیں۔ پھر اس سوال کی تکرار کرتے ہوئے فرماتا ہے :

" تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کروگے"۔ (فبایّ اٰلاء ربکما تکذبان)۔

---

[1] "مجمع البیان"۔ آیات زیر بحث کے ذیل میں۔

[2] "در المنثور" جلد ۶ ص ۱۴۶ جیسا کہ ہم نے کہا کہ سونے اور چاندی کی تعبیر ہو سکتا ہے کہ ان دونوں جنتوں کے مرتبہ کے فرق کی طرف اشارہ ہو۔

ایک نکتہ

پھلوں کی قدر و قیمت

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیتوں میں جنّت کی غذاؤں کے سلسلہ میں صرف پھلوں پر انحصار کیا گیا ہے اور تمام پھلوں میں سے خرما اور انار کا نام لیا گیا ہے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ کھجور کے درخت کو نخل کہا گیا ہے لیکن انار کے بارے میں خود پھل کا نام لیا ہے۔ یقیناً ہر ایک میں کوئی نکتہ پوشیدہ ہے۔ جنّت کی غذاؤں کے سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ پھلوں کا ذکر اس اہمیت کی بنا پر ہے کہ جو غذائیت کے سلسلہ میں پھلوں کو حاصل ہے۔ یہاں تک کہ انسانوں کو پھل کھانے والی مخلوق کہا جاتا ہے۔ پھلوں کا نقش اور ان کا اثر انسان کی خوشی اور شادابی کے سلسلہ میں نہ صرف علمی نقطہ نظر سے بلکہ عام تجربات کی رُو سے بھی نمایاں ہے۔ باقی رہا کھجور کے درخت کا ذکر، اس کے پھل کی بجائے، تو ممکن ہے یہ اس لحاظ سے ہو کہ کھجور کا درخت اپنے پھل کے علاوہ بھی کئی حیثیتوں سے فائدہ مند ہے، جب کہ انار کا درخت ایسا نہیں ہے۔ کھجور کے پتوں سے مختلف قسم کا سامان تیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً فرش، ٹوپی، حمل و نقل کے مختلف ذرائع حتیٰ کہ اس سے سونے کے لیے چارپائی بھی بنائی جاتی ہے۔ اس کے چھلکوں سے مختلف فائدے اُٹھائے جاتے ہیں۔ اس کے بعض اجزاء بطور دوا کام آتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے تنوں سے بعض مکانوں کے ستون کا کام لیا جاتا ہے۔ یا پھر انہیں کسی چھوٹی نہر کو عبور کرنے کے لیے پل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اَب رہی یہ بات کہ جنّت کے پھلوں میں سے صرف دو کا ذکر کیوں ہوا تو یہ ان دونوں کے تنوع کی وجہ سے ہے۔ ان میں سے ایک، عام طور پر، گرم علاقوں میں اُگتا ہے دُوسرا سرد علاقوں میں۔ ایک میں قند و شکر کا مادّہ ہے دوسرے میں تیزابی۔ ایک مزاج و طبیعت کے اعتبار سے گرم ہے، دوسرا سرد۔ ایک غذا ہے اور دوسرا پیاس کو دُور کرتا ہے۔ کھجور میں موجود موادِ حیاتی اور اس کے کئی وٹامن کہ جو موجودہ زمانے میں معلوم ہوئے ہیں، ان کے بارے میں یہ معلومات حاصل ہوئی ہیں کہ کھجور میں تیرہ سے زیادہ حیاتیاتی مادّہ اور پانچ قسم کے وٹامنز ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے اور دوسرے خواص ہیں جن کے بارے میں ہم سورۂ مریم کی آیت ۲۵ کے ذیل میں ایک قوّت بخش غذا کے عنوان کے تحت گفتگو کر چکے ہیں[۱]

باقی رہا انار تو وہ بعض اسلامی روایات میں "سید الفاکھۃ" یعنی بہترین پھل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے[۲]

وہ ماہرین جو غذا شناسی میں امتیازِ خاص رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں بہت سی باتیں کہی ہیں۔ منجملہ دوسری خصوصیات کے اُنھوں نے کھجور میں خُون صاف کرنے کی صلاحیت کا انکشاف کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس میں وٹامن (ث) کی کافی مقدار ہوتی ہے۔ انار کے بارے میں بھی بہت سے فوائد کتابوں میں ملتے ہیں۔ یہ معدہ کو تقویت دیتا ہے، پُرانے زخم کو اچھا کرتا ہے، یرقان اور صفرا کے بخار کو دُور کرتا، دفع خارش کے لیے مفید ہے، نظر کو تقویت دیتا ہے، مسُوڑھوں کے لیے قوّت بخش ہے اور اسہال کو ختم کرتا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث ہے:

---

[۱] "تفسیر نمونہ" جلد ۷ ص ۲۵۲

[۲] یہ تعبیر ایک حدیث میں پیغمبرؐ اسلام سے منقول ہے "بحار الانوار" جلد ۶۶ - ص ۱۶۳

اطعموا صبیانکم الرمان فانه اسرع لشبابهم۔

اپنے بچوں کو انار کھلاؤ یہ ان کو جلد جوان کرتا ہے[1]

ایک اور حدیث میں ہے : (فانه اسرع لالسنتهم)۔ انار کھانے سے بچے زیادہ جلدی بولنے لگتے ہیں[2]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا :

ما علی وجه الارض ثمرة کانت احب الی رسول الله من الرمان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو انار سے زیادہ رُوئے زمین کا کوئی پھل پسند نہیں تھا۔[3]

۱۔ "بحار الانوار" جلد ۶۶ ص ۱۶۴

۲۔ "بحار الانوار" جلد ۶۶ ص ۱۶۵۔

۳۔ کافی جلد ۶ ص ۳۵۲

۷۰۔ فِيهِنَّ خَيْرَٰتٌ حِسَانٌ ۚ
۷۱۔ فَبِأَىِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۚ
۷۲۔ حُورٌ مَّقْصُورَٰتٌ فِى ٱلْخِيَامِ ۚ
۷۳۔ فَبِأَىِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۚ
۷۴۔ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ۚ
۷۵۔ فَبِأَىِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۚ
۷۶۔ مُتَّكِـِٔينَ عَلَىٰ رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَعَبْقَرِىٍّ حِسَانٍ ۚ
۷۷۔ فَبِأَىِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ
۷۸۔ تَبَٰرَكَ ٱسْمُ رَبِّكَ ذِى ٱلْجَلَٰلِ وَٱلْإِكْرَامِ ۚ

ترجمہ

۷۰۔ ان بہشت کے باغوں میں اچھے اخلاق والی خوبصورت عورتیں ہیں۔

۷۱۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کی تکذیب کروگے ؟

۷۲۔ ایسی حوریں کہ جو جنّت کے مستور خیموں میں ہیں۔

۷۳۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۷۴۔ ایسی عورتیں کہ جن سے کبھی پہلے کسی اِنسان یا جنّ نے ملاقات نہیں کی۔

۷۵۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا اِنکار کروگے ؟

۷۶۔ یہ اس حالت میں ہے کہ جنّتی لوگ تختوں پر تکیے لگائے ہوئے ہیں جن پر بہترین اور خوبصُورت ترین سبز رنگ کے فرش بچھائے گئے۔

۷۷۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤگے ؟

۷۸۔ بابرکت اور زوال ناآشنا ہے تیرے صاحبِ جلال و جمال پروردگار کا نام۔

تفسیر

جنّت کی بیویوں کا دُوسری مرتبہ تذکرہ

اِن دونوں جنّتوں کی نعمتوں کی تشریح کو جاری رکھتے ہوئے کہ جن کا ذکر سابقہ آیتوں میں ہوا ہے ان آیتوں میں بھی ان نعمتوں کے ایک اور حصّہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: " ان دونوں جنّتوں میں بھی عورتیں ہیں جو اچھے اخلاق والی اور خوبصورت ہیں"۔ (فیھن خیرات حسان) [1]

ایسی عورتیں کہ جن میں حُسنِ سیرت اور حُسنِ صورت دونوں ہیں۔ اس لیے کہ " خیر " عام طور پر اچھی صفات اور معنوی خوبصورتی کے لیے استعمال ہوتا ہے اور حُسن زیادہ تر خوبصورتی یعنی جمالِ ظاہر کے لیے آتا ہے۔ ان روایتوں میں کہ جو اس آیت کی تفسیر میں آئی ہیں، جنت کی بیویوں کی بہت سی خُوبیاں گنوائی گئی ہیں، جو دُنیا کی عالی صفت عورتوں کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے تاکہ وہ تمام عورتوں کے لیے نمونہ بنیں، منجملہ دیگر خوبیوں کے ایک خُوبی یہ ہے کہ وہ خوش بیان ہیں۔ ان میں پاکیزگی ہے۔ وہ تکلیف نہیں پہنچاتیں، غیروں کی طرف نہیں دیکھتیں وغیرہ وغیرہ۔ خلاصۂ کلام یہ کہ ان میں جمال و کمال کی وہ تمام خُوبیاں موجود ہیں جو ایک عُمدہ بیوی میں ہونی چاہئیں۔ اور جو خُوبیاں تمام عورتوں میں ہوں وہ ان میں سے ہر ایک میں ہیں۔ اسی بنا پر قرآن مجید مختصر اور پُرمعنی الفاظ میں انہیں "خیرات حسان" قرار دیتا ہے۔ [2]

---

[1] " فیھن " کی ضمیر جمع مؤنث ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ان چاروں جنّتوں کی طرف پلٹ رہی ہو کہ جن کا گزشتہ آیتوں میں تذکرہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخری دو جنّتوں کی طرف مختلف قسم کے محل اور باغات کی بنا پر لوٹے اور یہ تفسیر زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس نے ان کے معاملے کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا ہے۔

[2] "خیرات" کے بارے میں بعض نے کہا ہے کہ "خیّرہ" (بروزن سیّدہ) کی جمع ہے جسے تخفیف کی بنا پر "خیرات" پڑھا گیا ہے۔ بعض مفسّرین اسے "خیرہ" (بروزن خیرہ) کی جمع سمجھتے ہیں۔ بہرحال وہ وصفی معنی رکھتا ہے نہ کہ افعل التفضیل کے معنی [illegible]

اس نعمت کے تذکرہ کے بعد پھر اعادہ کرتا ہے : " تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ (فبایّ اٰلاءِ ربکما تکذبان)۔
اس کے بعد بہشت کی ان عورتوں کی تعریف و توصیف کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے : " وہ ایسی حُوریں ہیں جو جنّت کے خیموں ہیں مستور ہیں"۔ (حور مقصورات فی الخیام)۔ حُور جمع ہے " حوراء " اور احور کی۔ اس کے معنی ہیں ایسی عورت جس کی آنکھ سیاہ ہو اور اس کا سفید صاف و شفاف رنگ ہو۔ یہ لفظ بعض اوقات ان عورتوں کے لیے بھی بولا گیا ہے جن کا چہرہ بالکل گورا ہو۔" مقصورات" کی تعبیر اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ وہ صرف اپنے شوہروں سے تعلق رکھتی ہیں اور دوسروں سے بالکل پوشیدہ ہیں۔ " خیام" خیمہ کی جمع ہے لیکن جیسا کہ مسلم روایات میں مندرج ہے جنّت کے خیمے دنیا کے خیموں سے مشابہت نہیں رکھتے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ بعض مفسّرین اور اربابِ لُغت کے نزدیک خیمہ صرف وہ نہیں ہے جو کپڑے سے بنا ہوا ہے جیسا کہ ہم لوگوں میں مشہور ہے، بلکہ لکڑی سے بنے ہوئے گھروں کو بھی خیمہ کہتے ہیں۔ ہر مدوّر گھر کو خیمہ کہا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ خیمہ ہر اس گھر کو کہتے ہیں جو اینٹ پتھر وغیرہ سے' نہ بنا ہو۔[1]

پھر اس پُر معنی سوال کی تکرار کرتے ہوئے کہتا ہے :" تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ (فبایّ اٰلاءِ ربکما تکذبان)۔

اِس کے بعد کی آیت میں جنّت کی حُوروں کی تعریف کا ایک اور پہلو ہے۔ (لم یطمثهن انس قبلهم ولا جان)[2]۔

البتہ جیسا کہ قرآن کی دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے وہ عورتیں اور مرد جن کی اس دنیا میں شادی ہوئی ہے اگر دونوں صاحبانِ ایمان اور جنّتی ہوئے تو وہاں ایک دوسرے سے ملحق ہوں گے اور ایک دوسرے کے ساتھ بہترین حالت اور کیفیت میں زندگی بسر کریں گے[3]۔

روایات سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ ان عورتوں کا مرتبہ جنّت کی حُوروں سے زیادہ ہوگا[4]۔ اِن اعمالِ صالح اور عبادتوں کی بنا پر جو دنیا میں انہوں نے انجام دیے ہیں۔ اس کے بعد پھر فرماتا ہے :۔ " تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے"۔ (فبایّ اٰلاءِ ربکما تکذبان)۔

جنّت کی عورتوں کی آخری توصیف جو ان آیتوں میں ہے وہ یہ ہے کہ :" اس بہشت کے رہنے والے اس حالت میں ہیں کہ تخت اور پلنگ پر تکیے لگائے ہوئے ہیں جن پر سبز رنگ کے پارچوں کا بہترین فرش بچھایا گیا ہے"۔ (متکئین علی رفرف خضر و عبقری حسان)۔" رفرف " دراصل درختوں کے بڑے اور چوڑے پتّوں کے معنی میں ہے اور اس کے بعد رنگ برنگ کے ان خوبصورت پارچوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو باغات کے منظر سے مشابہت رکھتے ہیں[5]۔

عبقری اصل میں ہر بے نظیر شے کے لیے ہے یا ایسی چیز جس کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔ اسی لیے ایسے علما اور دانشوروں کو جو

---

[1] " لسان العرب "، " مجمع البحرین " اور " المنجد "۔

[2] " طمث " کے معنی کے سلسلہ میں اسی سورہ کی آیت ۵۶ کے ذیل میں کافی وضاحت ہو چکی ہے۔

[3] (رعد ۲۳۔ مومن ۸)۔

[4] " دُرالمنثور " ص ۵۱

[5] بعض مفسّرین نے یہاں نوشیرواں کے نگارستان کے مشہور فرش کا بطور مثال تذکرہ کیا ہے۔ وہی فرش تھا کہ جو حد سے زیادہ بیش قیمت تھا اور ایک باغ کے منظر کو پیش کرتا تھا۔

نادرالوجود ہوں " عباقرۃ"، کہتے ہیں۔ بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ لفظِ عبقر ابتدا میں ایک نام تھا جسے عربوں نے پریوں کے شہر کے لیے منتخب کیا تھا اور چونکہ یہ شہر ایسا تھا جسے کسی نے دیکھا نہ تھا اور اپنے ساتھ ایک نُدرت کا تصور رکھتا تھا لہٰذا وہ ہر بے مثل چیز کو اس سے منسوب کرتے ہیں اور عبقری کہتے ہیں۔ بعض کا یہ قول ہے کہ عبقر ایک شہر ہے جس میں ریشم کے بہترین پارچے تیار کیے جاتے ہیں[1]

بہرحال اس کی اصل عملی طور پر متروک ہو چکی ہے اور عبقری ایک مستقل لفظ کی شکل میں نادرالوجود یا عزیزالوجود کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ مفرد ہے کبھی کبھی جمع کے معنوں میں بھی آتا ہے (مثلاً زیرِ بحث آیت) "حسان" جمع "حسن" (بروزن چمن) کے معنی اچھے اور خوبصورت کے ہیں۔ بہرحال یہ سب تعبیریں اس چیز کو بیان کرتی ہیں کہ جنّت کی تمام چیزیں ممتاز ہیں۔ اس کے پھل کھانے محل اور فرش، قصّہ مختصر یہ کہ اس کی ہر شے اپنی نوع کے اعتبار سے بے مثل و بے نظیر ہے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ الفاظ بھی ان بے نظیر مفاہیم کو اپنے اندر نہیں سمیٹ سکتے۔ یہ ہمارے ذہن میں ان کا ایک ہلکا سا نقشہ بناتے ہیں۔ اس کے بعد آخری مرتبہ اور اکتیسویں مرتبہ جن و انس کے تمام افراد سے سوال کرتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے"۔ (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔

تم معنوی نعمتوں کے منکر ہو یا مادّی نعمتوں کے؟ اس جہان کی نعمتوں کے منکر ہو یا جنّتوں کی نعمتوں کے منکر ہو؟ وہ نعمتیں کہ جنہوں نے تمہارے وجود کا احاطہ کر رکھا ہے اور تم ان میں مستغرق ہو اور کبھی غرور و غفلت کی بنا پر ان سب کو فراموش کر دیتے ہو اور ان سب نعمتوں کو بخشنے والے اور آئندہ جس کی نعمتوں کے منتظر ہو تم اس کی کون سی نعمتوں کا انکار کرتے ہو۔ اس سورہ کی آخری آیت میں فرماتا ہے: "بابرکت اور زوال ناپذیر ہے تیرے پروردگار کا نام کہ جو صاحبِ جلال و اکرام ہے"۔ (تبارك اسم ربك ذی الجلال والاکرام)۔ "تبارك" "برک" (بروزن درک) کی اصل سے ہے اور اُونٹ کے سینے کے معنی میں ہے۔ اُونٹ جب کسی جگہ بیٹھ جاتے ہیں تو اپنا سینہ زمین کے ساتھ چمٹا لیتے ہیں اِس بنا پر یہ لفظ ثابت قدم رہنے اور پائیدار ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ نیز زوال ناآشنا ہونے کی صُورت میں چونکہ سرمائے سے بہت فوائد حاصل ہوتے ہیں، اس لیے مفید چیز کو مبارک کہا جاتا ہے اور ان معانی کی سب سے زیادہ مستحق جو ذات ہے وہ خدائے پاک ہے جو تمام برکتوں کا سرچشمہ ہے۔ اِس سورہ میں چونکہ پروردگارِ عالم کی انواع و اقسام کی نعمتوں کا ذکر ہے ایسی نعمتیں جو زمین و آسمان میں نوعِ بشر کی خلقت اور دُنیا و آخرت سے تعلق رکھتی ہیں اور پروردگارِ عالم کے بابرکت وجود سے ان کا فیضان جاری ہے لہٰذا مناسب ترین تعبیر وہی ہے کہ جو اس آیت میں آئی ہے کیونکہ اسم سے یہاں مراد پروردگارِ عالم کے اوصاف ہیں؛ بالخصوص صفتِ رحمانیت کہ جو ان تمام برکتوں کا منشا ہے۔ بالفاظِ دیگر خدا کے افعال کا سرچشمہ اس کی صفات ہیں۔ اگر عالمِ ہستی کو اس نے ایک نظام کے تحت پیدا کیا ہے اور ہر چیز میں ایک میزان رکھی ہے تو یہ اس کی حکمت کا ایک تقاضا ہے، اور اگر قانونِ عدالت کو ہر چیز میں جاری و ساری کیا تو یہ اس کے علم و عدل کا تقاضا ہے، اور اگر وہ مجرموں کو مختلف قسم کی سزائیں دیتا ہے اور ان پر عذاب نازل کرتا ہے تو اس کے منتقم ہونے کا یہی اقتضا ہے، اور اگر صالحین کو اس دنیا میں اور دوسری دُنیا میں انواع و اقسام کی معنوی اور مادّی نعمتوں سے بہرہ ور فرماتا ہے تو یہ اس کے فضل و کرم اور رحمتِ واسعہ کا ایک تقاضا ہے۔ اس بنا پر اس کا اسم اس کی صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کی صفات عینِ ذات ہیں۔ ذی الجلال والاکرام کے الفاظ اس کی تمام صفات جلال و جمال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ (ذی الجلال سے صفاتِ سلبیہ کی طرف اور ذی الاکرام

[1] تفسیر "ابوالفتوح رازی" زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

سے صفاتِ ثبوتیہ کی طرف اشارہ ہے)۔ پُرکشش بات یہ ہے کہ یہ سُورہ خدا کے نام یعنی لفظ رحمٰن سے شروع ہوا ہے اور ذی الجلال والاکرام پرختم ہو رہا ہے اور یہ دونوں (آغاز و انجام) سُورہ کے تمام مضامین کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

چند نکات

۱۔ اس سُورہ کی آیت ۲۷ میں دنیا کی مختلف مادّی اور معنوی نعمتوں کے ذکر کے بعد فرماتا ہے : (ویبقٰی وجہ ربّك ذوالجلالِ والاکرام) اور سُورہ کے آخر میں انواع و اقسام کی بہشتی نعمتوں کے بعد فرماتا ہے : (تبارك اسم ربّك ذی الجلال والاکرام) یہ دونوں جُملے اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ تمام خطوط اس کی ذاتِ پاک پر جاکر ختم ہوتے ہیں اور جو کچھ ہے اس کی ہی طرف سے ہے۔ دُنیا بھی اسی کی طرف سے ہے اور عقبیٰ بھی اسی کی طرف سے ہے اور اس کے حلال و حرام نے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے۔

۲۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے کہ ایک شخص آپ کے سامنے دُعا کر رہا تھا اور کہتا تھا یاذا الجلال والاکرام " وہ خدا جو صاحب جلال واکرام ہے "۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : (قد استجیب لك فاسئل) اب جب کہ خدا کو تُو نے اس نام سے پُکارا ہے تو تیری دُعا مستجاب ہے جو کچھ چاہتا ہے اس سے سوال کر۔[۱]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرد کو دیکھا کہ نماز میں مشغول ہے اس نے رکوع و سجود و تشہد کے بعد دُعا میں اس طرح کہا : اللّٰھم انی اسئلك بان لك الحمد لا الٰہ الا انت وحدك لاشریك لك المنان بدیع السّماوات والارض یا ذاالجلال والاکرام یاحیّ یا قیوم انی اسئلك .....

تو پیغمبرِ اسلامؐ نے فرمایا : لقد دعا اللہ باسمہ العظیم الذی اذا دعی بہ اجاب واذا سئل بہ اعطی " اس شخص نے خدا کو اس کا عظیم نام لے کر پکارا ہے۔ جب اس نام سے اس کو پکارا جائے اور دعا کی جائے تو وہ قبول کرتا ہے۔ اور اگر اس کے ذریعے وہ سوال کریں تو عطا کرتا ہے "۔[۲]

۳۔ ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ آپ نے آیہ تبارك اسم ربّك ذی الجلال والاکرام کی تفسیر میں فرمایا : نحن جلال اللہ وکرامتہ التی اکرم اللہ العباد بطاعتنا ۔ ہم اللہ کا جلال اور اس کی کرامت ہیں کہ جس نے بندوں کو ہماری اطاعت کی عزت بخشی ہے۔[۳]

یہ امر واضح رہے کہ اہلبیتِ پیغمبرِ خداؐ کے علاوہ کسی اور کی طرف رہنمائی نہیں فرماتے تھے اور سوائے اس کی اطاعت کے کسی اور چیز کی طرف نہیں بلاتے تھے وہ ہادیانِ راہ ہیں اور زندگی کے اس متلاطم سمندر میں نجات کی کشتیاں ہیں۔ اس بنا پر خدا کے جلال و اکرام کا ایک مصداق شمار ہوتے ہیں کیونکہ خدا اپنے اولیاء کے ذریعے بندوں کو نعمتِ ہدایت عطا فرماتا ہے۔

۴۔ بعض علماء نے نقل کیا ہے کہ قرآن مجید کا پہلا حصہ جو مکہ میں قریش کے سامنے پڑھا گیا ہے وہ اسی سورہ رحمٰن کی ابتدائی آیات

---

[۱] تفسیر " درالمنثور " جلد ۶ ص ۱۵۳

[۲] تفسیر درالمنثور ج ۶ ص ۱۵۳

[۳] تفسیر برھان ج ۴ ص ۲۷۲

تھیں۔ عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ جمع ہوئے اور کہا کہ ابھی تک قریش نے قرآن کا کوئی حصّہ نہیں سُنا تو ہم میں سے کون شخص ہے کہ جو ان کے سامنے کُھلم کُھلا قرآن پڑھے میں نے کہا کہ وہ شخص میں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں خوف ہے کہ وہ تجھے ایذا پہنچائیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ کوئی ایسا شخص یہ کام اپنے ذمّہ لے کہ جس کا قبیلہ طاقتور ہو کہ جو اس کا دفاع کر سکے۔ میں نے کہا کہ مجھے میری حالت پر چھوڑ دیں خدا میرا دفاع کرے گا اور مجھے بچائے گا۔

دوسرے دن ابن مسعودؓ دوپہر کے وقت مقامِ ابراہیم کے پاس کھڑے ہوئے۔ اُس وقت وہاں قریش اپنی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے بلند آواز میں کہنا شروع کیا: بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم الرحمٰن علم القرآن ۔۔۔۔ وہ اسی طرح پڑھتے رہے قریش خاموشی سے سُنتے رہے۔ اس کے بعد کہنے لگے یہ فضول شخص کیا کہتا ہے تو اُن میں سے بعض نے کہا کہ یہ ان باتوں کے کچھ حصّے بیان کر رہا ہے جو محمّد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لایا ہے۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور ابن مسعودؓ کے مُنہ پر تھپیڑ مارنے لگے لیکن ابن مسعودؓ نے اس سُورہ کی تلاوت اسی طرح جاری رکھی اور اُسے اتنا پڑھا جتنا کہ خدا نے چاہا۔ اس کے بعد ابن مسعودؓ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف لَوٹ آئے۔ ان کے چہرہ پر زخموں کے نشان نمایاں تھے۔ یہ دیکھ کر اُنہوں نے کہا کہ ہمیں تو اس چیز کا تیرے بارے میں پہلے ہی سے خوف تھا۔ ابن مسعودؓ نے کہا: مجھے معلوم نہ تھا کہ دُشمنانِ خدا اتنے گھٹیا نکلیں گے۔ اگر تم لوگ کہو تو میں کل بھی اس کام کو جاری رکھوں۔ اَب مجھے کسی قسم کا خوف لاحق نہیں ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ نہیں اتنا ہی کافی ہے جو ان کی مرضی کے بغیر تو نے ان کے سامنے پڑھا[1]

اِسی بنا پر ابن مسعودؓ پہلے شخص شمار کیے جاتے ہیں جنہوں نے مشرکین مکّہ کے سامنے کُھلم کُھلا قرآن پڑھا[2]

خداوندا! تُو ذوالجلال والاکرام ہے۔ تجھے تیرے جلال واکرام کی قسم ہمیں بہشت کی نعمتوں سے محروم نہ رکھیو۔ پروردگارا! تیری رحمت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اگرچہ ہم نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جو تیری رحمت کے شایانِ شان ہو پھر بھی تو ہمارے ساتھ وہ سلوک کر جو تیرے مقامِ رحمت کے شایانِ شان ہے۔

بارالٰہا! ہم تیری کسی نعمت کی کبھی تکذیب نہیں کرتے اور اپنے آپ کو تیرے احسان میں ہمیشہ محصور و مستغرق جانتے ہیں۔ ہمیں ان نعمتوں سے ہمیشہ بہرہ ور فرما۔ آمین یا ربّ العالمین!

۸ / ج ۱ / ۱۴۰۶ ہجری قمری
۲۹ / ۱۰ / ۱۳۶۴ شمسی

ترجمہ کا اختتام
۱۰ شوال ۱۴۰۷ھ ، ۷ جون ۱۹۸۷ء
قم برمکان حقیر محل سلطان محمد شریف
کوئے جمشیدی بلاک "

---

[1] سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ ص ۳۳۶

[2] اسدالغابہ جلد ۳ ص ۲۵۷

سُورَہ وَاقِعَہ

* یہ سُورہ مکہ میں نازل ہُوا۔
* اس میں ۹۶ آیتیں ہیں۔

تاریخ آغاز
۸/ج ۱/ ۱۴۰۶ھ
۲۹/۱۰/ ۱۳۶۴ش

سُورہ واقعہ کے مضامین

"تاریخ القرآن" میں ابن ندیم سے منقول ہے کہ سُورہ "واقعہ" چوالیسواں سُورہ ہے جو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہوا ہے[1]

اس سے پہلے سُورہ طٰہٰ اور اس کے بعد سورہ شعرا نازل ہوا۔ یہ سُورہ جیسا کہ اس کے لب و لہجے سے واضح ہے اور مفسّرین نے بھی تصریح کی ہے، مکہ میں نازل ہوا۔ اگرچہ بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کی آیت ۸۲، ۸۱ مدینہ میں نازل ہوئی ہیں لیکن اس کے ثبوت کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اور مذکورہ بالا آیتوں میں اس دعویٰ کی کوئی علامت بھی نہیں ہے۔ سُورۂ واقعہ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے، قیامت اور اس کی خصوصیات کے مضامین پر مشتمل ہے اور یہ مسئلہ اس سُورہ کی ۹۶ آیتوں کا بنیادی موضوع ہے لیکن، ایک لحاظ سے، اس سُورہ کے مضامین کو آٹھ حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ ظہورِ قیامت کا آغاز اور اس سے ملحق سخت وحشت ناک حوادث۔
۲۔ اس دن انسانوں کی اصحاب الیمین، اصحاب الشمال اور مقربین میں تقسیم۔
۳۔ مقاماتِ مقربین کے بارے میں ایک تفصیلی بحث اور جنّت میں انواع و اقسام کے ثواب اور سزائیں۔
۴۔ پہلے گروہ یعنی اصحاب الیمین کے بارے میں تفصیلی بحث اور انواع و اقسام کی الٰہی نعمتیں۔
۵۔ مسئلہ معاد کے سلسلہ میں مختلف دلائل کا بیان، خدا کی قدرت اور انسان کی حقیر و ناچیز نطفہ سے خلقت، نباتات میں تجلی حیات، نزول بارش اور آگ کا روشن ہونا کہ یہ سب توحید کی علامتوں کے ذیل میں آتا ہے۔
۶۔ اصحاب الشمال کے بارے میں قابلِ توجہ بحث اور دوزخ میں ان کی دردناک سزائیں۔
۷۔ حالتِ احتضار کی تصویر کشی اور اس دُنیا سے دُوسری دنیا کی طرف انتقال کہ جو قیامت کے مقدمات میں سے ہے۔
۸۔ مومنین کی جزا و ثواب اور کفّار کے عذاب پر ایک اجمالی نظر۔ آخر میں سُورہ پروردگار کے عظیم نام پر ختم ہو جاتا ہے۔

---

[1] "تاریخ القرآن" ابو عبداللہ زنجانی ص ۵۹۔

اِس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت :

اِس سورہ کی تلاوت کے بارے میں اِسلامی کتابوں میں بہت سی روایات موجود ہیں۔ان حدیثوں میں سے ایک حدیث رسول اللہؐ سے منقول ہے: من قرأ سُورة الواقعة كتب ليس من الغافلين ۔ جو شخص سورہ واقعہ کی تلاوت کرے گا تو اس کے بارے میں لکھا جائے گا کہ یہ غافلین میں سے نہیں ہے۔[1]

اس سُورہ کی آیتیں اس قدر دل ہلا دینے والی اور چونکا دینے والی ہیں کہ ان کے پڑھنے کے بعد پھر انسان کے لیے غفلت کی گنجائش نہیں رہتی اسی بنا پر پیغمبرِ اسلامؐ کی ایک اور حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ جس وقت پیغمبرِ اسلامؐ سے یہ سوال ہوا کہ آپؐ کے چہرۂ مبارک پر بڑھاپے کے آثار اس قدر جلد کیوں نمایاں ہو گئے تو آپؐ نے جواب میں فرمایا: شيبتني هود ، والواقعة والمرسلات وعم يتسائلون ۔ " سُورہ ھُود ، واقعہ ، المرسلات اور عم یتسائلون نے مجھے بوڑھا کر دیا۔"[2] کیونکہ ان سُورتوں میں قیامت کے دل ہلا دینے والے واقعات ہولناک حادثوں اور مجرموں کی سزاؤں کا بیان ہے۔اس طرح گزشتہ قوموں کے لرزہ براندام کر دینے والے واقعات اور وہ مصیبتیں اور بلائیں ہیں کہ جو ان پر نازل ہوئیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک اور حدیث میں ہے کہ: من قرأ في كل ليلة جمعة الواقعة احبه الله وحببه الى الناس اجمعين ولـم يرفي الدنيا بؤساً ابداً ولا فقراً ولا فاقة ولا أفة من أفات الدنيا وكان من رفقاء امير المؤمنين ۔ " جو شخص ہر شب جمعہ سُورہ واقعہ کی تلاوت کرے تو خدا اس کو دوست رکھتا ہے اور اُسے لوگوں کا محبوب بنا دیتا ہے اور وہ دنیا میں ہرگز ناراضی اور تکلیف نہیں دیکھتا اور فقر و فاقہ و آفاتِ دُنیا میں سے کوئی آفت اس پر نہیں آئے گی اور وہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے رفقا میں شمار ہو گا۔"[3]

ایک اور حدیث میں ہے کہ عثمان ابن عفانؓ عبداللہ ابنِ مسعودؓ کی عیادت کے لیے گئے،اس بیماری میں کہ جس میں عبداللہ ابن مسعودؓ کا انتقال ہوا۔تو انہوں نے ان سے پُوچھا کہ تم کس بات پر پریشان ہو۔اُنہوں نے کہا کہ اپنے گناہوں کی وجہ سے پریشان ہوں۔انہوں نے کہا تمہارا دل کیا چاہتا ہے؟ عبداللہ ابنِ مسعودؓ نے جواب میں کہا کہ اللہ کی رحمت ۔عثمانؓ نے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں تمہارے علاج کے لیے طبیب لے آؤں ۔ وہ کہنے لگے مجھے طبیب ہی نے بیمار کیا ہے ۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ اگر تمہارا دل چاہے تو میں حکم دوں کہ تمہارا عطیہ بیت المال سے لے آئیں ۔انہوں نے کہا کہ اس کی جس وقت مجھے ضرورت تھی اس وقت تم نے وہ مجھے نہیں دیا۔ آج جب کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے تو تم مجھے دیتے ہو۔حضرت عثمانؓ کہنے لگے اگر وہ رقم تمہاری بیٹیوں کے کام آئے تو بھی کوئی حرج نہیں۔اُنہوں نے کہا کہ میری لڑکیوں کو بھی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مَیں نے انہیں نصیحت کی ہے کہ سُورہ واقعہ پڑھا کریں۔ مَیں نے رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سُنا ہے کہ :

---

[1] تفسیر " مجمع البیان " جلد ۹ ص ۲۱۲ ، تفسیر " برھان " جلد ۴ ص ۲۷۳

[2] خصال صدوق باب الاربعہ حدیث ۱۰

[3] " ثواب الاعمال " مطابق نقل " نور الثقلین " جلد ۵ ص ۲۰۳

"من قرأ سورة الواقعة کل لیلة لم تصبه فاقة ابدًا"

" جو شخص رات کو سورہ واقعہ پڑھے تو وہ کبھی بھی افلاس کا شکار نہیں ہو گا۔"[1]

اسی بنا پر سورۂ واقعہ کو ایک روایت میں سورۂ غنی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے [2]

یہ امر بخوبی واضح ہے کہ صرف زبان سے ادا کر لینے سے یہ تمام برکتیں حاصل نہیں کی جا سکتیں بلکہ ضروری ہے کہ تلاوت کے ساتھ ساتھ تفکّر ہو اور تفکّر کے ساتھ عمل بھی ہو۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۱۲

[2] رُوح المعانی جلد ۲۷ ص ۱۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ

۲۔ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۘ

۳۔ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۙ

۴۔ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۙ

۵۔ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۙ

۶۔ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ۙ

۷۔ وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ؕ

۸۔ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ۬ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ؕ

۹۔ وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۙ۬ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ؕ

۱۰۔ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۚۙ

۱۱۔ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۚ

۱۲۔ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ

۱۳۔ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝

۱۴۔ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ جس وقت قیامت کا عظیم واقعہ ہو گا۔

۲۔ تو کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکے گا۔

۳۔ ایک گروہ کو نیچے لے جائیں گے دُوسرے کو اُوپر لائیں گے۔

۴۔ یہ اس وقت ہو گا کہ جب زمین میں شدید زلزلہ آئے گا۔

۵۔ اور پہاڑ درہم و برہم ہوں گے۔

۶۔ اور غبار کی شکل میں بکھر جائیں گے۔

۷۔ اور تم تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔

۸۔ پہلا گروہ اصحاب میمنہ، اور اصحاب میمنہ کیا ہیں۔

۹۔ دُوسرا گروہ اصحاب شوم ہیں، اور اصحاب شوم کیا ہیں۔

۱۰۔ اور تیسرا گروہ وہ ہے جو سبقت کرنے والے اور پیش قدمی کرنے والے ہیں۔

۱۱۔ وہی مقرب ہیں۔

۱۲۔ جو بہشت کے پُر نعمت باغوں میں رہتے ہیں۔

۱۳۔ بہت سے گروہ پہلی اُمتوں میں سے ہیں۔

۱۴۔ اور تھوڑے سے آخری اُمت میں سے۔

تفسیر

عظیم واقعہ

قیامت سے ربط رکھنے والے مسائل قرآن مجید میں عام طور پر عظیم انقلاب برپا کرنے والے اور سرکوبی کرنے والے حادثات کے ساتھ بیان ہوتے ہیں اور یہ قرآن کی ان بہت سی سُورتوں میں نظر آتے ہیں جو قیامت کے متعلق بحث کرتی ہیں۔ اس سورۂ واقعہ میں، جس کا مرکزی خیال معاد ہے اس کی ابتدائی آیات میں یہی واضح نظر آتا ہے۔ پروردگارِ عالم آغاز ہی میں فرماتا ہے: "جس وقت قیامت کا عظیم واقعہ رُونما ہوگا" (اذا وقعت الواقعة)[1]

کوئی شخص اس کا انکار نہیں کرسکتا۔ (لیس لوقعتها كاذبة)۔ کیونکہ اس کے رُونما ہونے سے پہلے کے حوادث اس قدر شدید اور ہولناک ہوں گے کہ ان کے اثرات دنیا کے ذرہ ذرہ پر نمایاں ہوں گے۔ "واقعة" اجمالی طور پر قیامت کے برپا ہونے اور مُردوں کے قبروں سے اُٹھنے کی طرف اشارہ ہے۔ اور چونکہ اس کا واقع ہونا قطعی اور یقینی ہے اس لیے اسے واقعہ سے تعبیر کیا گیا ہے یہاں تک کہ بعض مفسّرین نے "واقعہ" کو قیامت کے ناموں میں سے ایک نام بتایا ہے۔ "كاذبة" کے لفظ کو بعض مفسّرین نے یہاں مصدری معنوں میں لیا ہے جو کہ اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت کا وقوع اس طرح ظاہر اور آشکار ہوگا کہ کسی قسم کی تکذیب اور اختلاف کی گنجائش نہیں ہوگی۔ بعض مفسّرین نے اس کی اس کے ظاہری معنوں کے ساتھ تفسیر کی ہے، اس اعتبار سے کہ یہ اسم فاعل ہے، اور کہا ہے کہ قیامت کے وقوع کے سامنے کوئی تکذیب کرنے والا موجود نہیں ہوگا۔[2]

بہرحال قیامت نہ صرف یہ کہ کائنات کی تباہی کے ساتھ لازم ہے بلکہ اس کے نتیجے میں انسان بھی درہم و برہم ہو جائیں گے۔ جیسا کہ بعد کی آیتوں میں پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "ایک گروہ کو نیچے لے جائیں گے اور دوسرے کو اُوپر لے آئیں گے (خافضة رافعة)[3]

تکبّر کرنے والے، اکڑنے والے اور صدرنشین ظالم نیچے گرا دیے جائیں گے اور کمزور مومن اور نیک افراد اوجِ افتخار پر متمکن ہوں گے۔ خواہ مخواہ بنے ہوئے عزّت دار ذلیل ہوں گے اور بلا وجہ محروم کیے گئے افراد عزیز ہوں گے۔ ایک گروہ قعرِ جہنم میں گرے گا۔ دوسرا گروہ بہشت کے اعلیٰ علیّین میں قیام پذیر ہوگا۔ اور یہ خدائی عظیم و وسیع انقلاب کی خصوصیت ہے۔ اسی لیے امام زین العابدینؑ سے منسوب ایک روایت میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا: "خافضة" خفضت والله باعداء الله

---

[1] "اذا" ظرفیت کی وجہ سے منصوب ہے اور اس کا ناصب لفظ "لیس" ہے کہ جو دوسری آیت میں آیا ہے جیسا کہ ہم کہتے ہیں۔ "یوم الجمعة لیس لی شغل" جمعہ کے دن میرا کوئی مشغلہ نہیں ہے۔ یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ اس کا ناصب "اذكر" مقدر ہو یا كان كذا وكذا کا جملہ (کشاف زیرِ بحث آیت کے ذیل میں)۔ لیکن پہلا احتمال سب سے زیادہ مناسب ہے۔

[2] ضمیر کا مؤنث ہونا اس بنا پر ہے کہ تقدیرِ عبارت میں "نفس كاذبة" یا "قضية كاذبة" ہے (ضمنی طور پر "لوقعتها" کے لام کو بعض مفسّرین نے توقیت سمجھا ہے۔)

[3] "خافضة رافعة" مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور اصل میں هي خافضة رافعة تھا۔

فی النار، "رافعة" رفعت واللہ اولیاء اللہ الی الجنة "قیامت خافضہ ہے کیونکہ خدا کی قسم وہ دشمنان خدا کو جہنم کی آگ میں گرا دے گی اور رافعہ خدا کی قسم اولیاء اللہ کو بہشت میں لے جائے گی[1]۔

اس کے بعد اسی سلسلہ میں توصیف کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے: "یہ اس وقت ہوگا کہ جس وقت زمین شدت کے ساتھ لرزنے لگے گی۔" (اذا رجت الارض رجًا)۔ یہ زلزلہ اس قدر عظیم و شدید ہوگا کہ پہاڑ ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ (وبست الجبال بسًّا)۔ "اور غبار کی شکل میں بکھر جائیں گے۔" (فکانت هباءً منبثًّا)۔ "رجت" کا مادّہ "رج" (بروزن حج) ہے جس کے معنی شدید حرکت کرنے کے ہیں اور اضطراب کو "رجرجة" کہا جاتا ہے۔ "بست" کا مادّہ "بس" ہے اور دراصل آٹے کو پانی سے نرم کرنے کے معنی میں ہے۔ "هباء" غبار کے معنی میں ہے اور "منبثا" پراگندہ اور منتشر کے معنوں میں ہے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "هباء" بہت ہی چھوٹا غبار ہے جو فضا میں معلق ہو اور عام حالات میں نظر نہ آتا ہو مگر اس وقت کہ جب سورج کی روشنی کسی سوراخ کے ذریعے اندھیرے کی جگہ داخل ہو جائے۔ اب سوچنا چاہیئے کہ وہ زلزلہ کس حد تک سنگین ہوگا جو ایسے بڑے بڑے پہاڑوں کو جو اپنے استحکام میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں اس طرح تتر بتر کر دے گا کہ وہ بکھرے ہوئے غبار میں بدل جائیں گے اور جو آواز اس عظیم دھماکے کی وجہ سے بلند ہوگی وہ اس سے بھی زیادہ وحشت ناک ہوگی۔ بہرحال قرآنی آیات میں قیامت کے قریب پہاڑوں کی وضع اور ان کی کیفیت کے بارے میں طرح طرح کی تعبیریں بیان ہوئی ہیں جو حقیقت میں پہاڑوں کے مختلف مرحلوں میں بہت بھیانک انداز میں پھٹنے کی خبر دیتی ہیں۔ پروردگار عالم کبھی فرماتا ہے: "پہاڑ حرکت میں آجائیں گے۔" (وتسیر الجبال سیرًا) (طور۔ ۱۰) اور کبھی فرماتا ہے: "پہاڑ اپنی جگہ سے اکھاڑ دیے جائیں گے۔" (واذا الجبال نسفت) (مرسلات ۱۰) اور کبھی فرماتا ہے: "انہیں اٹھا دیا جائے گا اور وہ ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔" (فدکتا دکة واحدة) (حاقہ۔ ۱۴)۔ اور کبھی فرماتا ہے: "ریت کے تہہ بہ تہہ ٹیلوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ (وکانت الجبال کثیبًا مهیلًا) (مزمل۔ ۱۴)۔ کبھی فرماتا ہے: "وہ غبار کی شکل میں پراگندہ ہو جائیں گے۔" (زیر بحث آیت) اور آخر میں فرماتا ہے "دھنکی ہوئی روئی کی طرح ایسے فضا میں بکھر جائیں گے کہ صرف ان کا رنگ نظر آئے گا۔" (وتکون الجبال کالعهن المنفوش) (قارعہ۔ ۵)

ہاں البتہ خدا کے علاوہ کوئی پورے طور پر نہیں جانتا کہ ان حادثوں کا کون سا راستہ ہے اور یہ بات ایسی نہیں ہے کہ جو ہمارے الفاظ کے سانچے میں ڈھل سکے۔ لیکن یہ تمام پرمعنی اشارے اس دھماکے کی عظمت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس عظیم واقعہ یعنی قیامت کے وقوع کے بیان کے بعد اس دن لوگوں کی جو حالت ہوگی اس کو پیش کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے قرآن انہیں تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اور پھر فرماتا ہے: "اس روز تم تین گروہ ہو جاؤ گے" (وکنتم ازواجًا ثلاثة)۔ ہمیں معلوم ہے کہ لفظ "زوج" مذکر و مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے بلکہ ان معاملات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو باہم قریب ہوں؛ چونکہ آدمیوں کی مختلف صنفیں قیامت میں ایک دوسرے کے قریب ہوں گی۔ لہٰذا ان کے لیے ازواج استعمال ہوا ہے۔ پہلے گروہ کے بارے میں فرماتا ہے: "پہلے اصحاب میمنہ ہیں، کیا ہیں اصحاب میمنہ" (فاصحاب المیمنة ما اصحاب المیمنة)[2]۔

---

[1] خصال مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵، ص ۲۰۴

[2] اپنی ترکیب کے اعتبار سے اس جملہ میں کئی احتمال ہیں جن میں سب سے مناسب یہ ہے کہ یہ کہا جائے۔ "اصحاب المیمنہ" مبتدا ہے اور "ما" استفہامیہ دوسرا مبتدا ہے اور اصحاب المیمنہ اس کی خبر ہے اور مجموعۃً یہ دونوں پہلے مبتدا کی خبر ہیں اور "فا" جملے کے آغاز میں تفسیر کے عنوان کی حیثیت سے ہے۔

اصحاب میمنہ سے مُراد وہ لوگ ہیں جن کا نامۂ اعمال ان کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اور یہ صُورتِ حال قیامت میں نیکو کار، اہلِ نجات مومنین کی نشانی ہوگی۔ چنانچہ آیاتِ قرآنی میں اس طرف بارہا اشارہ ہوا ہے۔ یا پھر یہ کہ " میمنہ " " یُمن " سے مشتق ہے جس کے معنی سعادت اور خوش بختی کے ہیں۔ اس اعتبار سے پہلا گروہ سعادت مند اور خوش قسمت افراد کا ہے۔ اس کے بعد والی آیات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جس میں دوسرے گروہ کو " اصحاب المشئمة " (شوم سے مشتق) کے نام سے منسُوب کیا گیا ہے۔ یہ آخری تفسیر ہی مناسب ہے [1]

" ما اصحاب الميمنة " " کیا کہنے اس خوش قسمت گروہ کے " یہ تعبیر اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ ان لوگوں کی خوش قسمتی کی کوئی انتہا نہیں ہے اور یہ بہترین تعریف ہے جو اس گروہ سے متعلق ہے۔ جیسا کہ ہم کہیں کہ فلاں شخص انسان ہے اور انسان بھی کیسا۔ اس کے بعد دوسرے گروہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: " اصحاب شوم اور کیا ہیں اصحابِ شوم " (واصحاب المشئمة ما اصحاب المشئمة)۔ بدبخت، بے چارہ اور بے نوا گروہ، ایسے لوگ جن کا نامۂ اعمال ان کے اُلٹے ہاتھ میں دیا جائے گا، جو ان کی بدبختی اور ان کے جرم کی بجائے خُود نشانی ہوگا۔ ما اصحاب المشئمة " کی تعبیر یہاں بھی ان کی بدبختی اور شقاوت کو ظاہر کرتی ہے۔

آخر میں تیسرے گروہ کی اس طرح تعریف کرتا ہے " اور سبقت کرنے والے سابقین "۔ (والسّابقون السابقون)۔[2]

" وہی مقرب ہیں "۔ (اولٰئك المقربون)۔ " سابقون " وہ لوگ ہیں جو نہ صرف ایمان میں پیش قدمی کرتے ہیں بلکہ اِنسانی صفاتِ اخلاق میں بھی سبقت کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کے لیے نمونہ ہیں اور مخلوق کے لیے امام و پیشوا ہیں اور اسی وجہ سے خدائے بزرگ و برتر کے مقربینِ بارگاہ ہیں۔ اس بنا پر اگر بعض مفسّرین نے ان کے سابق ہونے کو اطاعتِ خداوندی یا پنجگانہ نماز یا جہاد یا ہجرت یا توبہ سے متعلق کیا ہے تو ہر ایک نے اس وسیع مفہوم کے صرف ایک گوشہ کی طرف توجہ کی ہے ورنہ یہ لفظ دوسری نیکیوں اور برکتوں کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اور پھر اسلامی روایات میں اگر کبھی " السابقون " کا مصداق ان چار افراد کو قرار دیا گیا ہے یعنی اوّل ہابیل دوسرے مومن آلِ فرعون، تیسرے حبیب نجار کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنی اُمّت کے مقابلے میں پیش قدمی کی ہے اور چوتھے امیرالمومنین حضرت علی علیہ السّلام جو مردوں میں سب سے پہلے صاحبِ ایمان تھے۔ یہ ایک واضح اور صحیح مصداق کی نشان دہی ہے اور مصداق آیت کو محدُود کرنے کے معنی میں نہیں ہے [3]

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسُولِ خدا نے فرمایا کہ: اتدرون من السّابقون الى ظل الله يوم القيامة " کیا تم

---

[1] اگرچہ بعد والی آیت میں اصحاب المشئمة کی جگہ اصحاب الشمال آیا ہے۔

[2] اس آیت کی اور اس کے بعد والی آیت کی ترکیب کے بارے میں بہت سے احتمالات پیش کیے گئے ہیں۔ پہلا احتمال یہ ہے کہ پہلا " السابقون " مبتدا ہے اور دوسرا اس کی صفت یا تاکید ہے اور " اولٰئك المقربون " مبتدا اور خبر ہو کر مجموعہ خبر ہے۔ السابقون اوّل کی۔ بعض نے یہ احتمال بھی پیش کیا ہے کہ " السابقون السابقون " مبتدا و خبر ہیں۔ " ابوالنجم " کے مشہور شعر کی طرح جس میں وہ کہتا ہے: (انا ابوالنجم وشعری شعری) " میں ابوالنجم ہوں اور میرا شعر صرف میرا ہی شعر ہے " یہ واقعی ایک عالی تعریف و توصیف ہے۔ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ پہلے " السابقون " کے معنی ہیں ایمان میں سبقت کرنے والے اور دوسرے السابقون کے معنی ہیں جنّت کی طرف سبقت کرنے والے۔ اس صورت میں بھی یہ مبتدا و خبر ہی ہوں گے۔

[3] یہی معنی ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہیں۔ مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۱۵۔

جانتے ہو کہ قیامت میں لُطفِ پروردگار کے سایہ میں کون لوگ ہوں گے اصحاب نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا رسولؐ زیادہ آگاہ ہیں تو آپؐ نے فرمایا:

الذین اذا اعطوا الحق قبلوہ و اذا سألوہ بذلوہ وحکموا للناس کحکمھم لانفسھم ۔

" وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب انہیں حق دیا جائے تو اُسے قبول کر لیتے ہیں اور جب ان سے حق کا سوال کیا جائے تو وہ اسے مسائل تک پہنچا دیتے ہیں۔ لوگوں کے بارے میں اسی طرح حکم کرتے ہیں جس طرح اپنے بارے میں حکم کرتے ہیں[1]"

بعض روایتوں میں السابقون کا مفہوم مرسل و غیر مرسل پیغمبر بتایا گیا ہے[2]

ایک حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے اس آیت کے بارے میں رسول اللہؐ سے پوچھا تو آپؐ نے فرمایا کہ جبرئیل نے مجھ سے اس طرح کہا ہے: (ذالك علی وشیعتہ ھو السابقون الی الجنّۃ، المقربون من اللہ بکرامتہ لھم) " وہ علیؑ اور ان کے پیروکار ہیں جو بہشت کی طرف پیش قدمی کرنے والے ہیں اور وہ مقربین بارگاہِ خدا ہیں۔ اس احترام کی بنا پر جو خدا کی نظر میں ان کا ہے۔"[3]

یہ بھی درحقیقت مذکورہ بالا مفاہیم کے واضح مصداقوں کا بیان ہے، ایسا مفہوم کہ جس میں ہر ملت و اُمت کے تمام سابقین شامل ہیں۔ اس کے بعد ایک مختصر سے جملہ میں مقربین کے مقام بلند کو واضح کرتے ہوئے فرماتا ہے: " مقربین جنّت کے پُرنعمت باغات میں ہیں" (فی جنات النعیم)[4]

جنات النعیم کے مفہوم میں بہشت کی مادّی و معنوی تمام اقسام کی نعمتیں شامل ہیں۔ ضمنی طور پر یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہو کہ صرف جنّت کے باغات ہی نعمتوں کا مرکز ہیں، برخلاف باغات دنیا کے جو کبھی کبھی وسیلۂ زحمت بھی ہو جاتے ہیں۔

جیسا کہ مقربین کی آخرت کی حالت ان کی دنیا کی حالت سے مختلف ہے کیونکہ دُنیا میں ان کا مقام بلند اپنے اندر ذمہ داری اور جواب دہی کا پہلو بھی رکھتا ہے جب کہ آخرت میں صرف نعمت کا سبب ہے۔ واضح رہے کہ یہاں قرب سے مُراد " قربِ مقامی" ہے نہ کہ " قرب مکانی"۔ اس لیے کہ خدا مکان نہیں رکھتا اور وہ ہم سے ہماری نسبت زیادہ قریب ہے۔ اس کے بعد والی آیت میں گزشتہ اُمتوں اور اس اُمت کے افراد کی تقسیم کی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: " بہت سے گروہ گزشتہ اُمتوں میں سے ہیں" (ثلۃ من الاوّلین)۔ " اور ایک چھوٹا سا گروہ آخری اُمت میں سے ہے" (و قلیل من الاٰخرین)۔ " ثلۃ" جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے۔ اصل میں پشم کے مجتمع ٹکڑوں کے معنی میں ہے اور اس کے بعد جماعت یا گروہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ بعض مفسّرین نے اسے " ثل عرشہ" " اس کا تخت گر پڑا اور اس کی حکومت ختم ہو گئی" سے مشتق سمجھا ہے۔ اور وہ اسے قطعہ کے معنی میں سمجھتے ہیں یہاں مقابلہ کے قرینہ کے ماتحت (قلیل من الاٰخرین) کے ساتھ قطعۂ عظیم کے معنوں میں ہے۔ ان دونوں آیتوں کے مطابق مقربین کے

---

[1] تفسیر مراغی جلد ۲۷ ص ۱۳۴

[2] تفسیر نورالثقلین جلد ۵ ص ۲۰۶

[3] تفسیر نورالثقلین جلد ۵ ص ۲۰۹

[4] فی جنّات النعیم (جار و مجرور) ہو سکتا ہے مقربین سے متعلق ہوں یا ایک محذوف سے متعلق ہو جو حال ہے مقربین کے لیے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ کائنین فی جنات النعیم۔ یا خبر کے بعد خبر ہے۔

زیادہ گروہ گزشتہ اُمتوں میں سے ہیں اور ان میں سے صرف تھوڑے سے اُمتِ محمدیہ میں سے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہاں یہ سوال درپیش ہو کہ یہ صُورتِ حال اُمتِ اسلامیہ کی حد سے زیادہ اہمیت کے ساتھ کس طرح مطابقت رکھتی ہے جب کہ خدا انہیں بہترین اُمت کے خطاب سے نوازتے ہوئے فرماتا ہے: کنتم خیر امۃ - (آل عمران - ۱۱۰)۔ اس سوال کا جواب دو نکات کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے۔ پہلا یہ کہ مقربین سے مُراد وہی سابقین اور ایمان میں پیش قدمی کرنے والے ہیں۔ یہ طے شدہ ہے کہ اُمتِ اسلامی میں صدر اوّل میں اسلام کو قبول کرنے کی طرف پیش قدمی کرنے والے تھوڑے سے افراد تھے۔ مردوں میں سب سے پہلے حضرت علیؑ اور عورتوں میں حضرت خدیجہؑ تھیں جب کہ گزشتہ پیغمبروں کی کثرت اور ان کی اُمتوں کی تعداد اور ہر اُمت میں پیش قدمی کرنے والوں کا موجود ہونا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ تعداد میں زیادہ ہوں۔ دوسرے یہ کہ عددی کثرت کیفی کثرت کی دلیل نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس اُمت کے سابقین کی تعداد کم ہو لیکن مرتبہ و مقام کے لحاظ سے بہت ہی افضل و برتر ہو جیسا کہ خود پیغمبروں میں بھی فرق ہے۔ (تلک الرسل فضلنا بعضھم علیٰ بعض) "ہم نے بعض رسولوں کو دوسرے بعض پر فضیلت و برتری دی"۔ (بقرہ - ۲۵۳) اس نکتہ کا ذکر بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ بعض مومنین ایمان میں سبقت کرنے والوں کے زمرے میں نہ ہوں لیکن دوسری صفات و خصوصیات کے حامل ہوں جو انہیں سابقین کے ہم پلّہ قرار دیں اور اجر و جزا کے اعتبار سے وہ السابقون کے برابر ہوں۔ اس لیے بعض روایات میں امام محمد باقرؑ سے اس طرح منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

نحن السابقون السابقون و نحن الاٰخرون "ہم السابقون السابقون ہیں اور ہم اٰخرون بھی ہیں"۔[1]

ایک روایت میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ آپ نے اپنے پیروکاروں کی ایک جماعت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

(انتم السابقون الاولون والسابقون الاٰخرون والسابقون فی الدنیا الیٰ ولایتنا وفی الاٰخرۃ الی الجنۃ) "تم پہلے سابقون اور آخری سابقون ہو۔ تم دُنیا میں ہماری ولایت کی طرف سبقت کرنے والے ہو اور آخرت میں جنّت کی طرف سبقت کرنے والے"۔[2]

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بعض مفسرین اوّلین و آخرین کا مصداق اوّلینِ اُمتِ اسلام اور آخرینِ اُمتِ اسلام کو بتاتے ہیں لہٰذا اس تفسیر کے مطابق تمام مقربین اُمتِ اسلامی میں سے ہیں۔ لیکن یہ نقشہ نہ تو ظاہر آیات کے ساتھ سازگار ہے اور نہ ان روایات کے ساتھ ہی جو ان آیتوں کے ذیل میں وارد ہوئی ہیں جو گزشتہ اُمتوں کے افراد کو بھی خصوصیّت کے ساتھ سابقین و اوّلین کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں۔

---

[1] تفسیر صافی زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] تفسیر صافی زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

۱۵۔ عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ۝ۙ
۱۶۔ مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ۝
۱۷۔ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۝ۙ
۱۸۔ بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ ۙ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۝ۙ
۱۹۔ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ۝ۙ
۲۰۔ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ۝ۙ
۲۱۔ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ۝ؕ
۲۲۔ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ۝ۙ
۲۳۔ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ۝ۚ
۲۴۔ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝
۲۵۔ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ۝ۙ
۲۶۔ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ۝

ترجمہ

۱۵۔ وہ صف کشیدہ اور ایک دُوسرے سے پیوستہ پلنگوں پر بیٹھے ہیں ۔

۱۶۔ ان پر تکیہ لگائے ہوئے ایک دُوسرے کے رُو برو ہیں ۔

۱۷۔ نوجوانانِ جاودانی (شکوہ اور طراوت میں) ہمیشہ ان کے گرد پھرتے ہیں۔

۱۸۔ پیالوں کوزوں اور بہشت کی جاری نہروں کے جام لیے ہوئے ۔

۱۹۔ لیکن ایسی شراب کہ نہ جس سے دردِ سر ہوتا ہے نہ وُہ مَست ہوتے ہیں ۔

۲۰۔ اور ہر قسم کے پھل جس کی طرف وہ مائل ہوں ۔

۲۱۔ اور ہر قسم کے پرندہ کا گوشت جسے وہ چاہیں ۔

۲۲۔ اور حور العین میں سے بیویاں

۲۳۔ صدف میں پنہاں مروارید کی مانند ۔

۲۴۔ یہ سب جزا ہے ان اعمال کی جنہیں وہ انجام دیتے تھے ۔

۲۵۔ بہشت کے ان باغوں میں وہ نہ کوئی بیہودہ بات سُنیں گے اور نہ گُناہ سے آلودہ باتیں ۔

۲۶۔ تنہا وہ چیز جسے وہ سُنیں گے سلام ہی سلام ہے ۔

تفسیر

جنّت کی وہ نعمتیں جو مقربین کی منتظر ہیں

یہ آیتیں انواع و اقسام کی نعمتوں کو جو تیسرے گروہ یعنی مقربین کا نصیب ہوں گی، بیان کرتی ہیں، وہ نعمتیں جن میں سے ہر ایک

دُوسری سے زیادہ شوق انگیز و رُوح پرور ہے وہ نعمتیں جنہیں سات حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے : " وہ صف کشیدہ اور ایک دوسرے سے پیوستہ پلنگوں پر بیٹھے ہوں گے " (علیٰ سرر موضونة).
ان پر تکیہ لگائے ایک دوسرے کے رُوبرو محبت اور خوشی سے پُر۔ (متکئین علیها متقابلین) " سرر " جمع ہے "سریر"
کی جس کا مادّہ " سرور " ہے۔ اس کے معنی ایسے پلنگ اور تخت ہیں کہ جن پر صاحبانِ نعمت محفلِ مسرت میں بیٹھے ہوں گے[1]
" موضون " کا مادّہ " وضن " ہے (بروزن وزن)۔ اس کے معنی زرہ بُننے کے ہیں۔ اس کے بعد اس کا ہر اس بُنی ہوئی چیز پر اطلاق ہوا ہے جس کے تار و پُود محکم ہوں یہاں اس سے مُراد پلنگ اور تخت ہیں جو ایک دوسرے کے قریب اور آپس میں ملے ہوئے ہوں یا پھر یہ کہ یہ پلنگ ایک خاص قسم کی بافت رکھتے ہوں گے اور لولؤ و یاقوت وغیرہ سے بنے ہوئے ہوں گے جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے۔ بہرحال اِن پلنگوں کی ساخت ان کے بچھائے جانے کی جگہ اور وہ مجلس انس وہاں تشکیل پائے گی اور سرُور و شادمانی کی لہر جو اس میں موجزن ہوگی، ہر قسم کی تعریف و توصیف سے بالا ہے۔ قرآن مجید میں بارہا جنّت کے پلنگوں کی اور اہلِ بہشت کی اجتماعی محفلوں کی نہایت عُمدہ تعریف ہوئی ہے، جو بتاتی ہے کہ ان لذتوں میں سے ایک لذت یہی محافلِ اُنس و محبت ہیں۔ رہا یہ کہ وہاں موضوعِ سخن کیا ہوگا اسے کوئی نہیں بتا سکتا۔ کیا وہ اسرارِ آفرینش کے بارے میں گفتگو کریں گے اور خدا کی تخلیق کے عجائبات کو موضوعِ سخن بنائیں گے یا اصولِ معرفت اور اسمائے حُسنیٰ کے بارے میں گفتگو ہوگی۔ یا وہ حوادث جو اس دنیا میں رُونما ہوتے عنوانِ کلام ہوں گے یا وہ جانکاہ مصائب، جن کے سبب سے انہیں راحت و آسودگی ملی، یا کچھ اور ہوں گے جن کے ادراک کی ہم اِس دنیا میں طاقت نہیں رکھتے، کوئی کچھ نہیں بتا سکتا۔

اس کے بعد ان کی دُوسری نعمت کے سلسلہ میں فرماتا ہے : " ایسے نوجوان جو ہمیشہ جوانی کے بانکپن اور اس کی تازگی سے بہرہ ور رہتے ہیں ان کے گرد و پیش مصروفِ خدمت ہوں گے۔ (یطوف علیهم ولدان مخلدون) " یطوف " کا مادّہ طواف ہے ایس سے ان کی مُستقل خدمت کی طرف اشارہ ہے۔ " مخلدون " کی تعبیر اس صورت میں کہ تمام اہلِ بہشت جاودانی ہیں، ان کے نشاطِ جوانی تازگی اور خوبصورتی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ بات کہ یہ نوجوان کون ہیں، اس کے بارے میں مختلف تفسیریں ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اہلِ دُنیا کے وہ فرزند ہیں جو بلوغ سے پہلے راہیِ ملکِ عدم ہو گئے اور چونکہ انہوں نے کوئی نیکی یا بُرائی نہیں کی اس لیے اللہ کے کرم کے نتیجے میں انہیں یہ منصب ملا ہے۔ وہ اپنے اس کام میں بہت لذّت محسوس کرتے ہیں کہ وہ مقربینِ بارگاہِ الٰہی کی خدمت میں مصروف ہیں۔ یہ بات ایک حدیث میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے منقول ہے لیکن ایک تفسیر میں ملتا ہے کہ وہ مشرکین کے بچے ہیں جو بے گناہ ہونے کی بنا پر اس مرتبہ پر فائز ہوئے ہیں کیونکہ مومنین کے بچّے تو اپنے ماں باپ کے پاس ہوں گے۔ تیسری تفسیر یہ بتاتی ہے کہ وہ جنّت کے خدمت گار ہیں جنہیں خدا نے اس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ خوبصورت نوجوان شرابِ طہور سے لبریز، ایسے پیالے، کُوزے اور جام لیے ہوئے ہوں گے جو جنّت کی نہروں کے مشروبات سے بھرے ہوں گے۔ یہ اہلِ بہشت کے گرد پھریں گے اور انہیں سیراب کریں گے۔
(باکواب واباریق وکأس من معین)[2]

---

[1] مفردات راغب مادہ " سر "

[2] " اکواب " " کوب " کی جمع ہے اس کے معنی پیالہ یا دستہ دار ظرف ہے " اباریق " " ابریق " کی جمع ہے۔ " آب ریز " فارسی سے لیا گیا ہے۔ یہ ایسے برتنوں کے معنی میں ہے جن میں دستہ اور ٹونٹی ہوتی ہے۔ کأس لبریز جام کو کہا جاتا ہے " معین " کا مادہ معن " (بروزن صحن) ہے جس کے معنی جاری ہیں۔

لیکن یہ شراب ایسی نہ ہوگی جو ہوش اُڑا دے اور مست کر دے۔ جس وقت جنّت میں رہنے والے اسے پئیں گے تو انہیں نہ دردِ سر لاحق ہوگا نہ وہ مست و بے ہوش ہوں گے۔ (لا یصدعون عنها ولا ینزفون)[1]

ان پر صرف ایک ایسے رُوحانی نشہ کی کیفیت طاری ہوگی جو تعریف و توصیف سے ماوراء ہے۔ یہ ان کے وجود کو بے مثل لذت سے ہمکنار کرے گی۔

اس کے بعد بہشت میں حاصل ہونے والی مادّی نعمتوں کے چوتھے اور پانچویں حصّہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: بہشتی نوجوان ہر قسم کے وہ پھل جن کی طرف اہلِ بہشت مائل ہوں گے ان کی خدمت میں پیش کریں گے۔" (وفاكهة مما يتخيرون)[2]۔

"اور ہر قسم کے پرندے کا گوشت جسے وہ چاہیں گے"۔ (ولحم طير مما يشتهون)۔ پھل کو گوشت پر مقدم رکھنا اس وجہ سے ہے کہ غذائیت کے اعتبار سے وہ بہتر اور قیمتی ہے۔ علاوہ ازیں کھانے سے قبل پھل کھانا ایک کیفیتِ خاص رکھتا ہے۔ البتہ قرآن کی دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جنّت کے درختوں کی شاخیں مکمل طور پر اہلِ بہشت کی دسترس میں ہوں گی، اس طرح کہ وہ ہر قسم کا پھل بہ آسانی حاصل کر کے تناول کریں گے۔ یہ معنی دوسری بہشتی غذاؤں پر بھی صادق آتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ جس وقت خدمت گار یہ نعمتیں لے کر ان کے سامنے آئیں گے تو اس کا لُطف کچھ اور ہی ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں یہ بہشت میں رہنے والے افراد کا ایک قسم کا احترام ہے اور ان کی محافلِ انس کی رونق میں اضافہ کا باعث ہے۔ خُود اس دنیا کی تمام محفلوں میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ باوجودیکہ پھل اور دیگر ماکولات مہمانوں کی دسترس میں ہوتے ہیں پھر بھی میزبان خُود ان اشیاء کا تعارف کراتا ہے اور یہ ایک قسم کا احترام شمار ہوتا ہے۔ گوشت کی اقسام میں سے پرندوں کا گوشت چونکہ بہتر ہوتا ہے لہٰذا صرف اسی پر انحصار کیا گیا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ پھل کے بارے میں "یتخيرون" "انتخاب کریں گے"۔ اور گوشت کے بارے میں "یشتھون" "اشتہار رکھتے ہیں" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ بعض مفسّرین ان دونوں تعبیروں کے درمیان فرق محسوس کرتے ہیں لیکن معلوم یہی ہوتا ہے کہ دونوں ہم معنی ہیں۔ مُراد یہ ہے کہ اہلِ جنّت جس قسم کی غذا پسند کریں گے وہ ان کے خدمت گاروں کے اختیار میں دے دی جائے گی۔ اس کے بعد چھٹی نعمت یعنی پاک و پاکیزہ بیویوں کی طرف اشارہ کر کے فرماتا ہے: "اور حورالعین میں سے بیویاں رکھتے ہیں"۔ (وحور عين)[3]

"مثل صدف میں پنہاں مروارید" (كامثال اللؤلؤ المكنون)۔ حور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے "حوراء" کی جمع ہے اور "احور" اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کی آنکھ کی پُتلی مکمل طور پر سیاہ ہو اور باقی حصّہ کی سفیدی بالکل صاف و شفاف ہو اور "عین" "عیناء"

---

[1] "یصدعون" "صداع" (بروزن حباب) کے مادّہ سے ہے اس کے معنی دردِ سر کے ہیں۔ یہ لفظ اصل میں "صدع" یعنی چیرنے کے معنی میں ہے۔ انسان جب شدید درد سے دوچار ہو تو دردِ سر کی وجہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ سر پھٹ جائے گا اس لیے یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ "ینزفون" "نزف" کے مادّہ سے ہے اس کے معنی ہیں کنویں کا تمام پانی آہستہ آہستہ نکال لینا۔ یہ مستی اور عقل کی گم شدگی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

[2] "فاكهة" اور "لحم" دونوں اکواب پر معطوف ہیں اور اس طرح وہ ایسی چیزوں میں سے ہیں کہ جو (ولدان مخلدون) کے ذریعے مقربین کے لیے ہدیہ بنیں گے۔

[3] اگرچہ بعض نے یہ خیال کیا ہے کہ "حور عین" "غلمان مخلدون" پر عطف ہے اس لیے وہ بھی جنتیوں کے گرد گھومتے رہتے ہیں لیکن اس کے پیش نظر کہ یہ معنی اہلِ بہشت کی محفلوں سے مناسبت نہیں رکھتے معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیرِ عبارت اس طرح ہے (ولهم حور عين) اور ان کے لیے حور العین ہیں۔

اور " اعین " جس کی جمع ہے موٹی آنکھ کے معنی میں ہے اور چونکہ انسان کی خوبصورتی زیادہ تر اس کی آنکھوں کی وجہ سے ہوتی ہے لہٰذا اس بات پر خصوصیت کے ساتھ انحصار کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ حور کا مادّہ "حیرت" ہے یعنی وہ اتنی خوبصورت ہیں کہ جنہیں دیکھ آنکھیں حیران رہ جائیں گی [1]

مکنون کے معنی پوشیدہ کے ہیں یہاں مُراد صدف میں پوشیدہ ہونا ہے کیونکہ مروارید جب تک صدف میں ہوں انہیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا اور وہ سدا خوبصورت اور صاف و شفاف رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ وہ دوسروں کی آنکھوں سے مکمل طور پر مستور ہوں نہ انہیں کسی کا ہاتھ لگا ہے اور نہ ان پر کسی کی نظر پڑی ہے۔ ان چھ مادّی نعمتوں کے بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے: " یہ سب کچھ جزا ہے ان اچھے اعمال کی جو انہوں نے انجام دیے ہیں" (جزاءً بما کانوا یعملون)۔ تاکہ یہ تصور نہ ہو کہ یہ تمام نعمتیں اہلِ بہشت کو کسی حساب و کتاب کے بغیر دی جائیں گی، یا یہ کہ صرف ایمان وعملِ صالح کا دعویٰ کرنا ان کے حصول کے لیے کافی ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ مسلسل خالص عمل کی ضرورت ہے تاکہ خدا کی یہ مہربانیاں انسان کو نصیب ہو سکیں۔ (توجہ فرمائیے، یعملون فعل مضارع ہے اور استمرار کے معنی رکھتا ہے)۔

ساتویں اور آخری نعمت جو معنوی پہلو رکھتی ہے یہ ہے کہ وہ جنّت کے باغات میں لغو، بے ہودہ اور گناہ آلودہ باتیں نہیں سُنیں گے۔ (لا یسمعون فیہا لغوًا ولا تأثیمًا)۔ نہ وہاں جھوٹ تہمت اور افترا کا وجود ہے نہ غیبت ہے نہ تمسخر، نہ تکلیف دہ گفتگو نہ تلخ کلمات اور نہ لغو و بے ہودہ اور بے بُنیاد باتیں ہیں۔ وہاں جو کچھ ہے وہ لُطف وکرم ہے، خوبصورتی ہے، متانت و ادب اور پاکیزگی ہے۔ کیا ہی عُمدہ ہو گا وہ ماحول کہ جس میں بُری باتیں نہ ہوں۔ اگر ہم ٹھیک طرح غور کریں تو ہماری اس دُنیاوی زندگی کی زیادہ تر ناراضی و پریشانی کا سبب یہی لغو بے ہودہ تکلیف دہ اور گناہ آلود باتیں ہیں جو دلوں کو دُکھاتی ہیں اور ان پر زخم لگاتی ہیں۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: " واحد بات جو وہاں وہ سُنیں گے وہ سلام ہی سلام ہے"۔ (الّا قیلًا سلامًا سلامًا) [2]

یہ سلام خدا کی طرف سے ہے، یا فرشتوں کی طرف سے ہے، یا خود اہلِ بہشت کی طرف سے ہے، یا ایک دوسرے کے لیے، یا یہ سب صُورتیں مُراد ہیں۔ مناسب ترین تفسیر آخری تفسیر ہے۔ جیسا کہ دوسری آیاتِ قرآنی میں خدا اور اہلِ بہشت کے ایک دوسرے کو سلام کرنے کی طرف اشارہ ہوا ہے [3]

جی ہاں وہ سلام کے علاوہ اور کچھ نہیں سُنیں گے۔ خدا اور اس کے مقرب فرشتوں کا سلام و درُود اور ایک دوسرے کو خود ان کا سلام و درُود اور ان پاکیزہ محفلوں میں جو دوستی اور محبت سے معمور ہیں ان کا ماحول سلامتی سے پُر ہے اور یہی معنی ان کے پُورے

---

[1] ابوالفتوح رازی جلد ۱۱ آیہ زیرِ بحث کے ذیل میں۔

[2] "سلامًا" مفعول بہ ہے قیلًا کے لیے جو مصدر ہے قول کی طرح یعنی ان کی گفتگو وہاں سلام ہے۔ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ "سلامًا" قیلًا کے لیے صفت ہو یا مفعول بہ (یا مفعول مطلق) ہے فعل محذوف کے لیے اور تقدیرِ عبارت میں "یسلمون سلامًا" ہے لیکن پہلے معنی سب سے بہتر ہیں۔ دوسرا سلامًا تاکید کے لیے ہے۔

[3] یٰسین آیت ۵۸۔ رعد ۲۴ یونس ۱۰۔

وجُود پر حاوی ہیں ۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ اسی محور کے گرد گھومتا ہے اور ان کی عام گفتگو اور تکلّم کا نتیجہ سلام وصلح و صفا پر منتہی ہوتا ہے ۔ اصولی طور پر بہشت دارالسلام ہے اور سلامتی و امن کا گھر ہے جیسا کہ سُورہ انعام کی آیت ۱۲۷ میں ہم پڑھتے ہیں ۔
"لھم دارالسلام عند ربھم"[1]

[1] آپ کی توجہ ہونی چاہیئے کہ " اِلّا قیلًا سلامًا سلامًا " میں استثناء ، استثنائے منقطع ہے اور تاکید کا فائدہ دیتا ہے ۔

۲۷۔ وَاَصۡحٰبُ الۡيَمِيۡنِ ۙ۬ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡيَمِيۡنِ ؕ

۲۸۔ فِىۡ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ ۙ

۲۹۔ وَّطَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ ۙ

۳۰۔ وَّظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ ۙ

۳۱۔ وَّمَآءٍ مَّسۡكُوۡبٍ ۙ

۳۲۔ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيۡرَةٍ ۙ

۳۳۔ لَّا مَقۡطُوۡعَةٍ وَّلَا مَمۡنُوۡعَةٍ ۙ

۳۴۔ وَّفُرُشٍ مَّرۡفُوۡعَةٍ ؕ

۳۵۔ اِنَّاۤ اَنۡشَاۡنٰهُنَّ اِنۡشَآءً ۙ

۳۶۔ فَجَعَلۡنٰهُنَّ اَبۡكَارًا ۙ

۳۷۔ عُرُبًا اَتۡرَابًا ۙ

۳۸۔ لِّاَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ ؕ

۳۹۔ ثُلَّةٌ مِّنَ الۡاَوَّلِيۡنَ ۙ

۴۰۔ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝

ترجمہ

۲۷۔ اور اصحاب یمین، کیا ہیں اصحاب یمین؟

۲۸۔ وہ بیری کے بے خار درخت کے سائے میں مقیم ہیں۔

۲۹۔ اور پُر برگ درخت طلح کے سائے میں رہتے ہیں۔

۳۰۔ اور لمبے اور وسیع سائے میں۔

۳۱۔ اور آبشاروں کے پاس۔

۳۲۔ اور فراواں پھل۔

۳۳۔ جو کبھی مقطوع ہوتے ہیں نہ ممنوع۔

۳۴۔ اور گراں قدر ہمسران (بیوی یا شوہر)۔

۳۵۔ ہم نے انہیں نئی تخلیق عطا کی ہے۔

۳۶۔ اور ہم نے سب کو بکر قرار دیا۔

۳۷۔ ایسی بیویاں جو اپنے شوہروں سے عشق رکھتی ہیں اور خوش زبان، فصیح و بلیغ اور ہم سن ہیں۔

۳۸۔ یہ سب اصحاب یمین کے لیے ہے۔

۳۹۔ جن کا ایک گروہ پہلی اُمتوں میں سے ہے۔

۴۰۔ اور ایک گروہ آخری اُمت میں سے ہے۔

تفسیر

وہ نعمتیں جو اصحاب یمین کو حاصل ہوں گی

اِن مادّی اور معنوی نعمتوں کے بیان کے بعد (جو مقربین بارگاہِ الٰہی کو حاصل ہوں گی) بات اصحاب الیمین تک جا پہنچی ہے۔ وہ سعادت مند جماعت جن کا نامۂ اعمال امتحانات الٰہی میں کامیابی کی علامت کے طور پر ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ یہاں پروردگارِ عالم اپنی نعمتوں میں سے چھ کی طرف اشارہ کرکے فرماتا ہے : مقربین کے لیے جو نعمتیں بیان ہوئیں وہ سات تھیں، یہ چھ ہیں یعنی ایک نعمت کم ہے ۔سب سے پہلے ان کے مرتبہ کی بلندی کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: " اصحاب الیمین، کیا کہنا اصحاب الیمین کا " (واصحاب الیمین ما اصحاب الیمین)۔[1]

یہ افضل ترین تعریف ہے جو ان کی ہوئی ہے کیونکہ ایسی تعبیر ان مواقع پر ہوتی ہے جب کسی کے اوصاف بیان سے باہر ہوں۔ بہرکیف یہ تعبیر اصحاب الیمین کے بلند مرتبہ کو بیان کرتی ہے۔ اس کے بعد کی آیت اس گروہ کو حاصل ہونے والی پہلی نعمت کو اس طرح بیان کرتی ہے کہ "وہ ایسے بیر کے درخت کے نیچے جگہ پائیں گے جس میں کانٹے بالکل نہیں ہیں"۔ (فی سدر مخضود)۔[2]

حقیقت میں یہ بہترین تعریف ہے جو جنّت کے درختوں کے لیے ہمارے دُنیاوی الفاظ کے قالب میں ڈھل سکتی ہے۔ "سدر" بعض اربابِ لغت کے بقول ایک تناور درخت ہوتا ہے جس کی بلندی بعض اوقات چالیس میٹر تک پہنچ جاتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی عمر دو ہزار سال تک ہوتی ہے۔ (اس کا سایہ بہت گھنا اور پُر لطف ہوتا ہے) ۔اس درخت میں صرف ایک عیب ہے کہ اس میں کانٹے ہوتے ہیں لیکن "مخضود" کا لفظ "خضد" کے مادہ سے ہے ۔(بروزن مجد) اس کے معنی ہیں کانٹوں کا قطع کردینا۔ اس لفظ کے استعمال کے بعد جنّت کے "سدر" نامی درخت کی یہ مشکل بھی حل ہوگئی ۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جس وقت قرآن کے بعض الفاظ اصحاب پیغمبر کے لیے مشکل ہوجاتے تو وہ کہتے کہ بادیہ نشین عربوں کے سوالات کی برکت سے پروردگار ہم کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک دن ایک صحرا نشین عرب پیغمبر کی خدمت میں آیا اور عرض کیا اے خدا کے رسولؐ خدا نے قرآن میں ایک تکلیف پہنچانے والے درخت کا نام لیا ہے۔ میں نہیں سوچ سکتا تھا کہ جنّت میں اس قسم کا درخت کیسے ہوگا۔ فرمایا کونسا درخت ؟ اس نے کہا "سدر" کا کیونکہ اس میں تو کانٹے ہوتے ہیں ۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے فرمایا : کیا خدا نے نہیں فرمایا ؛ فی سدر مخضود ۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے کانٹے دُور کردیے گئے ہیں اور ہر کانٹے کی جگہ پھل لگا دیا گیا ہے اور پھل بھی ایسا کہ جس میں بہتّر قسم کا غذائی مادہ ہے جن میں سے ایک دوسرے سے مشابہت نہیں رکھتا۔[3]

دوسری نعمت یہ ہے کہ وہ "طلح متراکم" کے درختوں کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرتے ہیں (وطلح منضود)۔ "طلح" ایک ایک سبز خوش رنگ اور خوشبودار درخت ہے ۔ ایک گروہ کا قول ہے کہ وہ کیلے کا درخت ہے جس کے چوڑے سبز اور خوبصورت پتّے ہوتے ہیں

---

[1] اس جملہ کی ترکیب اس سورہ کی آیت ۸ کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

[2] جار مجرور مقدر عامل سے متعلق ہے اور مجموعۃ مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح تھی۔ (ھم فی سدر مخضود)

[3] رُوح المعانی جلد ۲۷ ص ۱۲۰۔ درالمنثور جلد ۶ ص ۱۵۶

اور اس کا پھل خوش ذائقہ اور شیریں ہوتا ہے۔ "منضود" کا مادّہ "نضد" ہے جس کے معنی تہہ بہ تہہ ہونے کے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ تعبیر اس کے پتّوں یا پھلوں کے تہہ بہ تہہ ہونے کی وجہ سے ہو یا دونوں کی وجہ سے ہو۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ درخت پھلوں سے اس طرح لدے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کا تنا اور ٹہنیاں پھلوں میں چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ، اس امر کے پیش نظر کہ، سدر کے درخت کے پتے کافی چھوٹے ہوتے ہیں اور کیلے کے پتے بڑے ہوتے ہیں ان دو درختوں کا ذکر جنّت کے تمام درختوں کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے جو ان دونوں درختوں کے درمیان قرار پاتے ہیں۔[1]

تیسری بہشت کی نعمت کو پروردگارِ عالم اس طرح بیان فرماتا ہے: "اور طویل و عریض سایہ"۔ (وظل ممدود)۔ بعض مفسرین اس سائے کو بین الطلوعین (طلوعِ فجر سے لے کر طلوعِ آفتاب تک) کی حالت سے مشابہ قرار دیتے ہیں جب سایہ ہر جگہ کا احاطہ کیے ہوئے ہوتا ہے۔ مذکورہ معانی ایک حدیث میں جو روضہ کافی میں ہے پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہوتے ہیں۔[2]

مقصودِ کلام یہ ہے کہ سُورج کی گرمی اور اس کی تپش اہلِ بہشت کو کبھی پریشان نہیں کرے گی۔ وہ ہمیشہ پسندیدہ، محبُوب، وسیع اور رُوح پرور سائے میں رہیں گے۔

چوتھے مرحلہ میں جنّت کے پانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اہلِ بہشت آبشار کی مانند پانی (جو خوبصورت اور دلربا منظر رکھتا ہے) کے پاس رہتے ہیں"۔ (وماء مسکوب)۔ "مسکوب" کا مادّہ "سکب" (بروزن کبک) ہے اس کے اصل معنی گرنے کے ہیں چونکہ آبشار کی صُورت میں پانی کا اُوپر کی طرف سے نیچے کی طرف گرنا بہترین منظر پیش کرتا ہے اور اس کے زمزمے دل کے کانوں کو نوازتے ہیں اور اس کا منظر آنکھوں کو فروغ اور روشنی بخشتا ہے۔ اس لیے یہ امر جنّت کی ایک نعمت قرار دیا گیا ہے اور چونکہ یہ درخت اور آبِ رواں ہمیشہ اپنے ہمراہ انواع و اقسام کے پھل لیے ہوئے ہوتے ہیں اس لیے پانچویں نعمت کے بیان میں مزید فرماتا ہے: "اور فراواں پھل" (وفاکھۃ کثیرۃ)۔ "جو نہ کبھی منقطع ہوتے ہیں نہ ممنوع ہوتے ہیں"۔ (لا مقطوعۃ ولا ممنوعۃ)۔ جی ہاں وہ پھل اس جہان کے پھلوں کی مانند نہیں ہیں جو صرف اپنی فصل میں آتے ہوں اور سال بھر میں صرف چند مہینے یا چند ہفتے درختوں پر لگتے ہوں اور یہ بھی نہیں کہ کانٹے ان کے حصول کی راہ میں حائل ہوں اور درخت کی بہت زیادہ بلندی، جیسے کھجور کے درخت کی بلندی، بھی ان کے حصول میں مانع نہیں ہے اور خود انسان کے وجود میں کوئی ایسا تقاضا موجود نہیں ہے کہ جو ان کے استعمال سے روکتا ہو اور پھر جنّت کا اصل میزبان خداوندِ منان ہے وہ یا اس کے مامور منتظمین نہ کسی قسم کا بُخل رکھتے ہیں نہ ان پھلوں کے استعمال کو منع کرتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے پیشِ نظر کوئی امر ایسا نہیں ہے جو ان پھلوں کے استعمال کی راہ میں رکاوٹ ہو۔ بلکہ صُورتِ حال یہ ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہر وقت موجود ہے اور اس کے حصُول کی راہ میں جو رکاوٹ ہو سکتی ہے وہ ہر وقت مفقود ہے۔

اس کے بعد ایک اور نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "وہ گراں قدر اور ہمسر بیویاں رکھتے ہیں"۔ (وفرش مرفوعۃ)۔ "فرش" جمع ہے "فراش" کی جس کے معنی ہر وہ فرش ہے جو بچھایا جاتا ہے اور اسی مناسبت سے کبھی کبھی بطور کنایہ زوج کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (خواہ مرد ہو یا عورت)۔ اسی بنا پر ایک مشہور حدیث میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے۔ الولد للفراش

---

[1] فخر رازی تفسیر کبیر میں در ذیل آیہ زیر بحث جلد ۲۹ ص ۱۶۲

[2] روضہ کافی مطابق نقل نور الثقلین ج ۵ ص ۲۱۶

وللعاھر الحجر)۔ " وہ بچّہ جو شوہر دار عورت سے پیدا ہو وہی اس کے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور اگر درمیان میں کوئی فاسق وزناکا مرد ہو تو اس کے حصّہ میں صرف پتھر ہے۔ (اور اس کے نطفہ سے فرزند کے انعقاد کا احتمال قابلِ قبول نہیں ہے)۔ بعض مفسّرین نے فرش کی تفسیر اس کے حقیقی معنی کے اعتبار سے کی ہے۔ (کنائے کے طور پر جو معنی بنتے ہیں انہوں نے ان کو نظر انداز کیا ہے)۔ اور اُنہوں نے اس کو جنّت کے بہت ہی بیش قیمت فرش کی طرف اشارہ سمجھا ہے لیکن اس صُورت میں بعد میں آنے والی آیتوں سے ارتباط ختم ہو جائے گا جن میں جنّت کی حُوروں اور بیویوں کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد جنّت کی بیویوں کی اور خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: " ہم نے انہیں نئی خلقت و آفرینش بخشی ہے۔" (انّآ انشأنٰھن انشاءً)۔ اس جُملہ سے ممکن ہے اس دنیا کی مومن بیویوں کی طرف اشارہ مقصُود ہو جنہیں خدا قیامت میں نئی خلقت عطا کرے گا اور وہ سب انتہائی شباب کے عالم میں ظاہر و باطنی جمال کے ساتھ جنّت میں داخل ہوں گی اور اگر مُراد حوریں ہوں تو خدا ان کو نئی خلقت عطا کرتے ہوئے اس طرح بنائے گا کہ ضعیفی و ناتوانی کا گرد و غبار ان کے دامنِ حیات کو ہرگز نہیں چھُو سکے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مومن بیویوں اور حُوروں دونوں کی طرف اشارہ ہو۔ " ہم نے ان سب کو باکرہ قرار دیا ہے"۔ (فجعلنٰھن ابکارًا)۔ شاید یہ صفت ان کے لیے ہمیشہ باقی رہے جیسا کہ بہت سے مفسّرین نے اس کی تصریح کی ہے نیز روایات میں بھی اس کی طرف اشارہ موجود ہے مرد سے اختلاط کے باوجود ان کی جسمانی کیفیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔[1]

ان بیویوں ہی کی خصوصیات کے بارے میں مزید فرماتا ہے: " وہ اپنے شوہروں سے محبّت رکھتی ہیں اور خوش گفتار و فصیح ہیں"۔ (عربًا) عرب کی جمع عروبة (بروزن ضرورة) ہے یہ اس عورت کے معنوں میں ہے جو اپنے مرد سے محبّت کرتی ہے اور پاکدامن ہوتی ہے۔ کیونکہ " اعراب " (بروزن اظہار) آشکار اور ظاہر کرنے کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ فصیح اور خوش گفتار ہونے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ اس بات کا امکان بھی ہے کہ آیت میں دونوں معنی موجود ہوں۔ ان کی دوسری صفت یہ ہے کہ " وہ اپنے شوہروں کی ہم سن ہیں اور ظاہری و باطنی خُوبی اور حُسن و جمال میں ایک دوسرے کے مانند ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بہتر ہے (اترابًا)۔ " اتراب " جمع ہے " ترب " کی جو " ذہن " کے وزن پر ہے اور اس کے معنی مثل و مانند کے ہیں۔ بعض مفسّرین کے خیال کے مطابق یہ معنی " ترائب " سے لیے گئے ہیں جو سینے کی ہڈیوں کے پنجرے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ سینے کی ہڈیاں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں۔ یہ مشابہت اور برابری ممکن ہے اس وجہ سے ہو کہ ان سب کا سن و سال ان کے شوہروں سے مطابقت رکھتا ہو گا تاکہ وہ ایک دوسرے کے جذبات کو مکمّل طور پر سمجھ سکیں اور ان کی آپس کی زندگی زیادہ لذّت بخش ہو جائے۔ اگرچہ بعض اوقات سن و سال کا فرق ہوتے ہوئے بھی زندگی لذّت بخش ہوتی ہے لیکن اکثر اوقات ایسا نہیں ہوتا۔ یا پھر یہ کہ وہ خوبصورتی اور ظاہری و باطنی حُسن و جمال میں ایک جیسے ہوں۔ مشہور و معروف تعبیر کے مطابق کہ " وہ سب اچھے ہیں اور ایک سے ایک بہتر ہے"۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: " یہ سب نعمتیں اصحاب الیمین کے لیے ہیں۔" (لاصحاب الیمین)۔ یہ مذکورہ چھ نعمتوں کے ان کے ساتھ مخصوص ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ مفسّرین کی طرف سے یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ یہ جملہ (انّآ انشأنٰھن انشاءً) کے جملہ کی تکمیل ہے۔[2]

---

[1] رُوح المعانی جلد ۲۷ ص ۱۲۳۔ ضمناً توجہ کرنی چاہیئے کہ اس حالت کا " فا " تفریع " کے ساتھ گزشتہ آیت پر عطف ہوا ہے۔

[2] پہلی صُورت میں اصحاب الیمین مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیرِ عبارت اس طرح ہے۔ (ھٰذہ کلھا لاصحاب الیمین) یہ سب

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اس گفتگو کے آخر میں فرماتا ہے ان میں سے ایک گروہ پہلی اُمتوں میں سے ہے۔ (ثلۃ من الاولین)۔ " اور ایک گروہ آخری اقوام میں سے ہے۔" (وثلۃ من الاٰخرین)۔ " ثلۃ " کے معنی پشم کا ایک مجتمع ٹکڑا۔ اس کے علاوہ یہ اس کثیر جماعت کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو باہم ملی جُلی ہو۔ تو اس طرح اصحاب الیمین کے عظیم گروہ میں گزشتہ اُمتوں کے افراد بھی شامل ہیں اور اس میں اُمتِ اسلامی کے بھی بہت سے افراد شامل ہیں، کیونکہ اس اُمت میں بہت سے صالحین و مومنین موجود ہیں۔ اگرچہ ملتِ اسلامی میں ایمان قبول کرنے کے سلسلہ میں سبقت کرنے والے افراد کی تعداد سابقہ اُمتوں اور ان کے انبیا کی کثرت کی وجہ سے ان کے سابقین کی تعداد کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اصحاب الیمین کے دونوں گروہ اُمتِ اسلامی میں سے ہیں۔ ایک گروہ ان کے اوّلین میں سے ہے اور ایک گروہ ان کے آخرین میں سے ہے لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح ہے۔

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) کچھ اصحاب یمین کے لیے ہے اور دُوسری صُورت میں جار و مجرور انشأناھن کے ساتھ متعلق ہیں لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

۴۱۔ وَاَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ۙ۬ مَاۤ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ؕ

۴۲۔ فِیۡ سَمُوۡمٍ وَّ حَمِیۡمٍ ۙ

۴۳۔ وَّ ظِلٍّ مِّنۡ یَّحۡمُوۡمٍ ۙ

۴۴۔ لَّا بَارِدٍ وَّ لَا کَرِیۡمٍ ۝

۴۵۔ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِکَ مُتۡرَفِیۡنَ ۚ

۴۶۔ وَکَانُوۡا یُصِرُّوۡنَ عَلَی الۡحِنۡثِ الۡعَظِیۡمِ ۚ

۴۷۔ وَکَانُوۡا یَقُوۡلُوۡنَ ۙ۬ اَئِذَا مِتۡنَا وَکُنَّا تُرَابًا وَّ
عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ۙ

۴۸۔ اَوَ اٰبَآؤُنَا الۡاَوَّلُوۡنَ ۝

۴۹۔ قُلۡ اِنَّ الۡاَوَّلِیۡنَ وَالۡاٰخِرِیۡنَ ۙ

۵۰۔ لَمَجۡمُوۡعُوۡنَ ۬ۙ اِلٰی مِیۡقَاتِ یَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ ۝

ترجمہ

۴۱۔ اور اصحاب شمال کیسے اصحاب شمال ہیں (کہ ان کا نامۂ اعمال ان کے جُرم کی بنا پر ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا)۔

۴۲۔ وہ مار ڈالنے والی ہواؤں اور جلانے والے پانیوں کے درمیان ہوں گے۔

۴۳۔ اور تہہ بہ تہہ اور آتش زا دھویں کے سائے میں۔

۴۴۔ ایسا سایہ جو نہ ٹھنڈا ہے نہ فائدہ مند۔

۴۵۔ وہ اس سے پہلے دُنیا میں مَست اور مغرور تھے۔

۴۶۔ اور بڑے بڑے گناہوں پر اصرار کرتے تھے۔

۴۷۔ اور کہتے تھے کہ ہم جس وقت مر گئے اور مٹی اور ہڈی ہو گئے تو کیا پھر قبروں سے نکالے جائیں گے؟

۴۸۔ یا ہمارے پہلے آباء و اجداد؟

۴۹۔ کہہ دے کہ اوّلین و آخرین۔

۵۰۔ سب کے سب معیّن دن کی وعدہ گاہ میں جمع ہوں گے۔

تفسیر

اصحابِ شمال کو ملنے والی سزائیں اور ان پر نازل ہونے والے دردناک عذاب

گروہ مقربین و اصحاب الیمین کو حاصل ہونے والی عظیم نعمتوں کے تذکرے کے بعد ایک تیسرے گروہ پر نازل ہونے والے دردناک عذاب کا تذکرہ کرتا ہے تاکہ تقابل کی صُورتِ حال کے موجود ہونے کی وجہ سے تینوں گروہوں کی کیفیّت اور ان کا حال واضح ہو جائے۔ فرماتا ہے، " اصحاب الشمال اور کیا ہیں اصحاب الشمال "۔ (و اصحاب الشمال ما اصحاب الشمال) وہی کہ جن کا نامہ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ گناہ گار ہیں، ستمگر ہیں اور اہلِ دوزخ ہیں۔ اور جس طرح ہم نے مقربین اور اصحاب یمین کے بارے میں کہا ہے کہ ما اصحاب الیمین کہنے کا یہ انداز بتاتا ہے کہ یہ کسی کی انتہائی اچھی یا بُری حالت کے بیان کے لیے ہے۔ مثال کے طور پر ہم کہتے ہیں کہ سعادت نے ہماری طرف رُخ کیا ہے۔ کیسی سعادت نے یا مصیبت نے ہماری طرف رُخ کیا ہے، کیسی مصیبت نے۔

اس کے بعد ان پر نازل ہونے والی تین سزاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: " وہ زہریلی ہواؤں اور جلانے والے پانی کے درمیان رکھے گئے ہیں" (فی سموم وحمیم)۔" اور شدید دُھویں اور آگ کے سایہ میں" (وظل من یحموم) ۔ جلانے والی زہریلی ہوا ایک ، جھلسا کر مارنے والا کھولتا ہوا پانی دو اور گرم اور گھونٹنے والا دُھواں تین۔ یہ تینوں چیزیں انہیں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ انہوں نے اُن کی قوت چھین لی ہے اور اگر وہ اِن تینوں مصیبتوں کے علاوہ کوئی اور مصیبت نہ بھی رکھتے ہوں تو یہی تین مصیبتیں ان کی شامتِ اعمال کیلیے کافی ہیں۔"سموم" کا مادّہ "سم" ہے جس کے معنی زہر ہیں۔ یہاں زہر سے جلانے والی ہوا مراد ہے جو انسان کے جسم کے مساموں میں داخل ہوکر اسے ہلاک کر دیتی ہے۔ (اصولی طور پر زہر کو " سم " اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ بدن کے تمام اجزا میں نفوذ کر جاتا ہے) "حمیم" گرم چیز کے معنی میں ہے اور یہاں گرم اور جلانے والے پانی کے معنی میں ہے جس کی طرف قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی اشارہ ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ حج کی آیت ۱۹ میں ہے۔ یصب من فوق رءوسھم الحمیم ۔ ان کے سروں پر گرم اور جلانے والا پانی ڈالا جائے گا۔"یحموم" بھی اسی مادّہ سے ہے اور یہاں " ظل " کی مناسبت سے گاڑھے ، سیاہ اور گرم دُھویں کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے " وہ سایہ جس میں نہ کوئی ٹھنڈک ہے نہ فائدہ" (لا بارد ولا کریم)۔

سائبان کبھی انسان کی سُورج کی تمازت سے حفاظت کرتا ہے اور کبھی ہوا اور بارش سے یا پھر اور دوسری منفعتیں لیے ہوئے ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ سائبان ان فائدوں میں سے کوئی فائدہ نہیں رکھتا ۔ " کریم " کی تعبیر "کرامت "کے مادّہ سے ہے اور فائدہ کے معنوں میں ہے اس لیے عربوں میں معمول ہے کہ جس وقت وہ چاہتے ہیں کہ کسی چیز یا شخص کو غیر مفید بتائیں تو وہ کہتے ہیں لاکرامۃ فیہ ۔ یقینی امر ہے کہ وہ سایہ جو سیاہ ہے اور گلا گھونٹنے والے دُھویں سے بنا ہے، سوائے برائی اور نقصان کے اُس سے کوئی اور توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ اگرچہ وہ عذاب جو دوزخیوں پر نازل ہوں گے ان کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن یہی تین قسمیں اس بات کے لیے کافی ہیں کہ انسان باقی کا اندازہ خُود لگالے ۔

اس کے بعد والی آیتوں میں اصحاب الشمال کی گرفتاری کے دلائل کا ان کی منحوس اور وحشت ناک داستان کے پہلے ہی تین جملوں میں خلاصہ کرتا ہے۔ پہلا یہ کہ وہ اس سے پہلے دنیا میں نعمت حاصل ہونے پر مُست اور مغرور تھے ۔ (انھم کانوا قبل ذالك مترفین)۔ " مترف " جس طرح لسان العرب میں " ترف "کے مادّہ سے (بروزن سبب) ہے اس کے معنی عیش و عشرت میں وقت گزارنے کے ہیں۔ مترف اس شخص کو کہتے ہیں جسے نعمتوں کی فراوانی نے مُست و مغرور کر دیا ہو اور نافرمانی و سرکشی پر اُبھارا ہو[1]

یہ ٹھیک ہے کہ تمام اصحاب شمال مترفین کے زمرہ میں نہیں آتے۔ لیکن اس سے قرآن کا مقصود ان کے سرکردہ افراد ہیں۔ جیسا کہ موجودہ زمانے میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی معاشروں کا فتنہ و فساد مُست و مغرور عیش پرستوں کی وجہ سے ہے جو اپنے ساتھ دوسروں کی گمراہی کا سبب بھی ہیں۔ تمام لڑائیوں، خوں ریزیوں، مختلف قسم کے جرائم، شہوتوں کے مرکز اور باغیانہ سرگرمیوں کی باگ ڈور اِنہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اسی بنا پر قرآن ہر چیز سے پہلے انہی کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ نعمت کے معانی وسیع ہیں اور یہ صرف مال و دولت تک محدود نہیں ہے بلکہ جوانی اور سلامتی عمر بھی خُدا کی نعمتوں میں سے ہیں کہ اگر غرور و غفلت کا باعث بنیں تو گناہوں کا اصلی سرچشمہ یہی ہیں۔ اور اصحاب شمال ان میں سے ہر ایک نعمت سے بہرہ ور تھے ۔

---

[1] لسان العرب جلد ۹ ص ۱۷

اس کے بعد ان کے دوسرے گناہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ بڑے بڑے گناہوں پر اصرار کرتے تھے"
(وکانوا یصرون علی الحنث العظیم)۔ "حنث" اصل میں ہر قسم کے گناہ کے معنوں میں ہے لیکن بہت سے مواقع پر یہ لفظ عہد شکنی اور قسم کی مخالفت کے معنوں میں آتا ہے اس وجہ سے یہ واضح طور پر گناہ کے معنی رکھتا ہے۔ اصحاب شمال کی بُرائی یہی نہیں ہے کہ وہ گناہ کرتے تھے بلکہ بڑے بڑے گناہوں پر اصرار کرتے تھے۔ گناہ ممکن ہے کہ اصحاب یمین سے بھی بعض اوقات سرزد ہو لیکن وہ اس پر کبھی اصرار نہیں کرتے اور جس وقت توفیقِ الٰہی شاملِ حال ہوتی ہے فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت نے یہاں "حنث العظیم" سے مراد شرک لیا ہے کیونکہ اس سے بڑا اور کوئی گناہ نہیں ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔ (ان اللہ لا یغفر ان یشرك به و یغفر ما دُون ذالك لمن یشاء) خدا ہر قسم کے گناہ کو بخش سکتا ہے لیکن وہ شرک کے گناہ کو کبھی معاف نہیں کرے گا[1]

بعض مفسرین نے اس سے اس جھوٹ مراد لیا ہے جو تمام گناہوں سے بڑا ہے اور گناہوں کی کلید ہے خصوصاً جب وہ انبیاء کی تردید اور قیامت کی تکذیب کے لیے استعمال ہوتا ہو۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ مذکورہ تمام گناہ حنثِ عظیم کے ذیل میں آتے ہیں۔

ان کا تیسرا غلط کام یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کیا ہم مرنے کے بعد جب محض ہماری ہڈیاں رہ جائیں گی اور ہم مٹی میں مل جائیں گے کیا دوبارہ قبروں سے اُٹھائے جائیں گے؟ (وکانوا یقولون ءَاذا متنا وکنا تراباً وعظاماً ءَانّا لمبعوثون)۔ اصحاب شمال کے دوسرے بہت سے گناہوں میں سے ان کا ایک بڑا گناہ یہ تھا کہ وہ قیامت کے انکار پر مُصر تھے۔ یہاں دو مطالب قابلِ توجہ ہیں
پہلا یہ کہ جس وقت گفتگو مقربین اور اصحاب یمین کے بارے میں تھی تو وہاں اُن کے اُن اعمال کی تشریح نہیں کی گئی جو اُن کے لیے باعثِ اجر و ثواب تھے (سوائے مختصر اشارہ کے جو مقربین کے بارے میں تھا)۔ لیکن جب اصحاب شمال کا ذکر آیا تو اس سلسلہ میں پروردگارِ عالم کافی تشریح سے کام لیتا ہے تاکہ اتمامِ حجت بھی ہو اور اس حقیقت کا بیان بھی ہو جائے کہ یہ سزائیں جو دی جا رہی ہیں وہ عدالتِ الٰہی کے عین مطابق ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ تین گناہ جن کا تذکرہ مذکورہ تین آیتوں میں ہوا ہے درحقیقت اصحاب شمال کی طرف سے دین کے تین اصولوں کی نفی کی طرف اشارہ ہے۔ آخری آیت میں قیامت کی تکذیب تھی اور دوسری آیت میں توحید کا انکار تھا۔ اور پہلی آیت میں جہاں مترفین کی بات ہو رہی تھی انبیا کی تکذیب کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم نے سورہ زخرف کی آیت ۲۳ میں پڑھا ہے۔ وکذالك ما ارسلنا من قبلك فی قریة من نذیر الّا قال مترفوها انّا وجدنا اٰبائنا علیٰ امة وانا علیٰ اٰثارهم مقتدون۔ اس طرح ہم نے کسی شہر اور آبادی میں تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ ان کے مترفین نے کہا کہ ہم نے اپنے آبا و اجداد کو ایک دین پر پایا ہے اور ہم ان کے آثار کے پابند ہیں۔ "تراباً وعظاماً" کی تعبیر ممکن ہے کہ اس طرف اشارہ ہو کہ ہمارے گوشت مٹی میں تبدیل ہو جائیں گے اور ہماری برہنہ ہڈیاں رہ جائیں گی تو ایسی صورت میں نئی خلقت کس طرح ممکن ہے۔ چونکہ مٹی اور نئی زندگی کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہے لہٰذا اس کا ابتدا میں ذکر ہوا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ معاد کے مناظر اس دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ کس طرح اس دنیا کے بہت سے موجودات گھاس وغیرہ پرانے ہو کر مٹی ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد پھر لباسِ حیات پہن لیتے ہیں۔ اصولی طور پر جس نے پہلی مرتبہ تخلیق کی ہے اس کے لیے اس کا اعادہ کس طرح مشکل ہے۔ بہرحال یہی کیفیت تھی جس میں وہ ہمیشہ معاد کی تکذیب کرتے تھے[2]

---

[1] نساء آیت ۴۸

[2] حرفِ استفہام کی تکرار اور ان کی تعبیر تاکید کے لیے ہے۔

انہوں نے صرف اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ اظہارِ تعجب کے لیے مزید کہتے تھے کیا ہمارے پہلے آبا و اجداد جن کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا دوبارہ زندہ ہوں گے۔ (او اٰباؤنا الاولون)[1]

وہ جن کی خاک کا ہر ذرّہ یا تو کسی گوشہ میں پڑا ہے یا کسی اور وجود کا جُز بن چکا ہے۔ لیکن جیسا کہ سُورہ یٰسین کے آخر میں تفصیل سے کہا جا چکا ہے کہ ان محکم دلائل کے مقابلے میں جو مسئلہ معاد پر دلالت کرتے ہیں یہ فقط چند فضول بہانے ہیں۔ اس کے بعد قرآن پیغمبرِ اسلام کو حکم دیتا ہے کہ ان کے جواب میں کہہ دے " نہ صرف تم اور تمہارے آبا و اجداد بلکہ تمام اوّلین و آخرین ۔۔۔۔ (قل ان الاوّلین والاٰخرین)۔ سب معیّن دن کی وعدہ گاہ میں (قیامت کے دن) جمع ہوں گے۔ (لمجموعون الیٰ میقات یوم معلوم)[2]

میقات کا مادہ وقت ہے اس کے معنی ہیں جو کسی کام یا وعدہ کے لیے معیّن ہوا ہو۔ یہاں میقات سے مُراد قیامت کا مقررہ وقت ہے جس میں تمام انسان میدانِ محشر میں اپنے حساب و کتاب کے واسطے جمع ہوں گے۔ بعض اوقات بطور کنایہ اس مکان کے لیے بھی جو کسی کام کی انجام دہی کے لیے مقرر ہوا ہو لفظ میقات استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً حج کے میقات (مواقیت) جو خاص مقامات کے نام ہیں جہاں سے حاجی احرام باندھتے ہیں۔ آیت کی مختلف تعبیروں سے ضمنی طور پر استفادہ ہوتا ہے قیامت کے بارے میں بہت سی تاکیدوں کا۔ (ان ۔ لام ۔ مجموعون اسم مفعول کی شکل میں اور یوم کی توصیف معلوم ہونے کے معنوں میں) اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ تمام لوگوں کا قبروں سے نکل کر مبعوث ہونا ایک ہی دن انجام پائے گا اور یہی معنی قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی آئے ہیں[3]

یہاں یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ جو قیامت کے برپا ہونے کو ہر اُمّت کے اعتبار سے مختلف زمانوں میں خیال کرتے ہیں وہ قرآنی آیات سے مکمل طور پر ناآشنا ہیں۔ شاید یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ قیامت کے معلوم ہونے سے مراد اس کا پروردگارِ عالم کو معلوم ہونا ہے ورنہ کوئی شخص حتیٰ کہ انبیا و مرسلین اور ملائکہ مقربین بھی اس کے برپا ہونے کے وقت سے باخبر نہیں ہیں۔

---

[1] او اٰباؤنا الاولون کا ہمزہ استفہام اور اس کی واو عاطفہ ہے جس پر ہمزہ کو مقدم رکھا جاتا ہے۔

[2] الیٰ اس جملہ میں اس لیے استعمال ہوا ہے کہ قیامت اس جہان کے آخر میں واقع ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں الیٰ لام کے معنوں میں ہو جیسا کہ بہت سی آیاتِ قرآنی میں لمیقات آیا ہے۔

[3] ھود آیت ۱۰۲ ۔ مریم ۹۵۔

۵۱۔ ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ۙ

۵۲۔ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ۙ

۵۳۔ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ۚ

۵۴۔ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ۚ

۵۵۔ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ۗ

۵۶۔ هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ۗ

ترجمہ

۵۱۔ پھر تم اے تکذیب کرنے والے گمراہ لوگو۔

۵۲۔ یقیناً زقوم کے درخت سے کھاؤ گے۔

۵۳۔ اور اپنے شکموں کو اس سے پُر کرو گے۔

۵۴۔ اور اس پر سے جلانے والا پانی پیو گے۔

۵۵۔ اور پیاس کی بیماری میں مبتلا اُونٹوں کی طرح اس میں سے پیو گے۔

۵۶۔ یہ ہے قیامت میں ان کی پذیرائی کا ذریعہ۔

تفسیر

ان گمراہ مجرموں پر نازل ہونے والے عذاب کا ایک اور حصّہ

یہ آیتیں اسی طرح اصحاب شمال پر نازل ہونے والے عذاب کے مباحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ پروردگار عالم اصحابِ شمال کو اسی انداز میں مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے : " پھر تم اے گمراہو اور تکذیب کرنے والو" (ثم انکم ایھا الضالون المکذبون) " زقوم " کے درخت میں سے کھاؤگے "۔ (لاٰکلون من شجر من زقوم)۔[1]

" اپنے شکموں کو اُس سے پُر کروگے "۔ فمالئون منھا البطون) ۔ گزشتہ آیتوں میں اصحابِ شمال کی دوزخ میں بسر ہونے والی زندگی کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی۔ یہاں ان کی غذا کے بارے میں بات ہو رہی ہے۔ اس اعتبار سے یہ اصحابِ شمال، مقربین اور اصحابِ یمین کے بالکل مقابل ہیں۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ ان آیتوں میں مخاطب وہ گمراہ ہیں جو تکذیب کرنے والے ہیں، وہ افراد جو ضلالت و گمراہی کا شکار ہونے کے علاوہ حق سے دشمنی اور اس کی خلاف ورزی کی رُوح اپنے وجود میں رکھتے ہیں اور اپنے اس غلط رویّہ کو برقرار رکھنے والے ہیں۔

" زقوم " جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں، ایک ایسی بدبودار گھاس ہے جس کا مزہ تلخ ہے۔ اس میں ایسا لیس ہوتا ہے کہ اگر وہ انسان کے بدن پر لگ جائے تو اس سے جسم پر ورم ہو جاتا ہے اور یہ کبھی دوزخیوں کی ہر قسم کی ناقابلِ نفرت غذاؤں کے لیے بولا جاتا ہے۔[2]

زقوم کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے جلد ۱۹ سورۂ صافّات کی آیت ۶۲ اور جلد ۲۱ سورہ دُخان کی آیت ۴۳ کے ذیل میں جو مندرجات ہیں ان کی طرف رجوع کیجیے۔ " فمالئون منھا البطون" کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ پہلے انہیں بہت تیز بھوک لگے گی اتنی تیز کہ وہ اس نہایت ناگوار غذا کھالیں گے تو انہیں پیاس لگے گی۔ اب وہ پئیں گے کیا ؟ تو بعد والی آیت میں قرآن بتاتا ہے۔ " تم اس ناگوار غذا کے بعد جلانے والا پانی پیوگے "۔ (فشاربون علیہ من الحمیم)۔[3]

" اس حریصانہ انداز میں پیوگے جس طرح وہ اُونٹ جو استسقا کی بیماری میں مبتلا ہوں "۔ (فشاربون شرب الھیم)۔ اس بیماری میں مبتلا ہونے والا اُونٹ بہت پیاس محسوس کرتا ہے اور بار بار پانی پیتا ہے یہاں تک کہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ جی ہاں یہ ہے بروز قیامت سرگزشت گمراہوں اور تکذیب کرنے والوں کی۔ " حمیم " حد سے زیادہ گرم اور جلانے والے پانی کے معنوں میں ہے۔ اسی بنا پر ایسے دوستوں کو جو محبت کی آگ میں جل رہے ہوں " ولی حمیم " کہتے ہیں۔ حمام بھی اسی مادّہ سے مشتق ہے۔ " ھیم " (بروزن میم) ھائم کی جمع ہے۔ (اور بعض لوگ اسے اھیم اور ھیماء کی جمع جانتے ہیں)۔ اصل میں " ھیام " (بروزن فرات) پیاس کی اس بیماری کو کہتے ہیں جو

---

[1] " من شجر " کا " من " تبعیضیہ ہے اور " من زقوم " کا " من " بیانیہ ہے۔

[2] مجمع البحرین، مفردات راغب، لسان العرب اور تفسیر رُوح المعانی۔

[3] قابلِ توجہ یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں ضمیر مؤنث (منھا) شجر من زقوم کی طرف لوٹتی ہے اور اس آیت کی ضمیر مذکور " علیہ " وہ اس وجہ سے کہ لفظ شجر دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ثمر بھی۔ مجمع البیان در ذیل آیہ زیر بحث۔

اُونٹ کو لاحق ہوتی ہے۔ یہ تعبیر عشقِ سوزاں اور عاشقانِ بے قرار کے بارے میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ بعض مفسرین ھیم کو ایسی زمین ریگزار کے معنوں میں جانتے ہیں جس پر جتنا پانی ڈالا جائے وہ سب اس میں جذب ہو جاتا ہے گویا وہ کبھی سیراب نہیں ہوتی۔ زیر بحث آیات میں سے آخری آیت میں ایک مرتبہ پھر اسی کھانے اور پانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یہ ہے قیامت میں ان کی پذیرائی کا ذریعہ"۔ (هٰذا نزلهم يوم الدّين)۔ یہ ایسی حالت میں ہے کہ جب دوسری طرف اصحابِ یمین بہت ہی لطیف و خوشگوار سایہ میں آرام و سکون سے ہیں، بہترین پھل کھاتے ہیں اور شرابِ طہور و آبِ خوشگوار پیتے ہیں اور عشقِ خدا میں مست ہیں۔ (ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا)۔ "نزل" جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے اس وسیلہ اور ذریعہ کے معنوں میں ہے جس سے مہمانِ عزیز کی پذیرائی کرتے ہیں اور بعض اوقات مہمان کے لیے سب سے پہلے لائے جانے والے کھانے اور مشروب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ دوزخی نہ تو مہمان ہیں اور نہ زقوم و حمیم پذیرائی کے ذریعے شمار ہوتے ہیں۔ یہ ان پر ایک قسم کا طنز ہے تاکہ وہ اندازہ لگالیں کہ جب ان کی پذیرائی کا یہ عالم ہے تو پھر ان کی معذّب صورتِ حال کتنی عبرت ناک ہوگی۔

۵۷۔ نَحۡنُ خَلَقۡنٰكُمۡ فَلَوۡلَا تُصَدِّقُوۡنَ ۝
۵۸۔ اَفَرَءَيۡتُمۡ مَّا تُمۡنُوۡنَ ؕ
۵۹۔ ءَاَنۡتُمۡ تَخۡلُقُوۡنَهٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡخٰلِقُوۡنَ ۝
۶۰۔ نَحۡنُ قَدَّرۡنَا بَيۡنَكُمُ الۡمَوۡتَ وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِيۡنَ ۙ
۶۱۔ عَلٰٓى اَنۡ نُّبَدِّلَ اَمۡثَالَـكُمۡ وَنُـنۡشِئَكُمۡ فِىۡ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝
۶۲۔ وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ النَّشۡاَةَ الۡاُوۡلٰى فَلَوۡلَا تَذَكَّرُوۡنَ ۝

ترجمہ

۵۷۔ ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے، تو پھر نئی آفرینش کی تصدیق کیوں نہیں کرتے؟

۵۸۔ کیا اس نطفہ سے تم آگاہ ہو جو رحم میں ڈالتے ہو؟

۵۹۔ کیا تم اسے (جنینی دور میں) پے در پے آفرینش دیتے ہو یا ہم خلق کرتے ہیں؟

۶۰۔ ہم نے تمہارے درمیان موت کو مقدر کیا ہے اور ہم پر کوئی سبقت نہیں رکھتا۔

۶۱۔ اس مقصد کے لیے کہ ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی جگہ لے آئیں اور تمہیں اس جہان میں کہ جسے تم نہیں جانتے تمہیں نئی خلقت بخشیں۔

۶۲۔ تم نے پہلے عالم کو تو مان لیا تو کس طرح نہیں سمجھتے (کہ اس کے بعد بھی ایک جہان ہے)۔

تفسیر

عقیدہ معاد پر سات دلیلیں

گزشتہ آیتوں میں قیامت کی تکذیب کرنے والوں کے ضمن میں گفتگو تھی - بنیادی طور پر اس سورہ میں مسئلہ معاد کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور ان آیتوں میں معاد سے متعلق دلیلوں کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ قرآن مجید اس اہم عقیدہ کے ثبوت میں مجموعی طور پر سات دلیلیں پیش کرتا ہے جو ایمان کی بنیادوں کو قوی کرتی ہیں اور انسان کے دل کو خدا کی طرف سے کیے گئے ان وعدوں کے بارے میں پختہ یقین دلاتی ہیں جو گزشتہ آیتوں میں اصحاب یمین اور اصحاب شمال کے بارے میں مذکور ہوئے۔ پہلے مرحلہ میں پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "ہم نے تمہیں خلق کیا ہے تو تم خلقت کی تصدیق کیوں نہیں کرتے؟" (نحن خلقناکم فلولا تصدقون[1])۔

تم قبروں سے اُٹھنے پر اور بدن کے خاک ہو جانے کے بعد معاد جسمانی پر کیوں تعجب کرتے ہو۔ کیا اس نے پہلی مرتبہ تمہیں مٹی سے پیدا نہیں کیا؟ کیا امثال و نظائر کا حکم ایک نہیں ہوتا؟ یہ استدلال حقیقت میں اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ یٰسین کی آیت ۷۸، ۷۹ میں آیا ہے جہاں قرآن ایک مشرک کے جواب میں، جس نے ایک بوسیدہ ہڈی ہاتھ میں لے رکھی تھی اور کہتا تھا کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا، کہتا ہے۔ وضرب لنا مثلاً ونسی خلقہ قال من یحی العظام وھی رمیم قل یحییھا الذی انشاھا اول مرۃ وھو بکل خلق علیم ۔" اس نے ہمارے لیے مثال پیش کی اور اپنی پہلی خلقت کو بھول گیا اور اُس نے کہا کون ان بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرے گا کہہ دے وہی جس نے انہیں ابتدا میں خلق کیا تھا وہ اپنی تمام مخلوق سے آگاہ ہے۔ پروردگارِ عالم بعد والی آیت میں دُوسری دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کیا اس نطفہ سے جسے تم رحم میں ڈالتے ہو تم باخبر ہو؟" (افرءیتم ما تمنون[2])۔ کیا جنینی مراحل کے طول میں تم اسے بار بار کی خلقت دیتے ہو یا اس کے خالق ہم ہیں" (ءانتم تخلقونہ ام نحن الخالقون)۔ کون ہے کہ جو اس بے قیمت نطفہ کو ہر روز ایک نئی شکل دیتا ہے اور خلقت کے بعد نئی خلقت سے نوازتا ہے۔ حقیقتاً یہ تدریجی تبدیلیاں جو نہایت تعجب انگیز ہیں اور جنہوں نے تمام فکر و دانش کو حیرت زدہ کر دیا ہے، کیا تمہاری طرف سے ہیں یا خدا کی طرف سے۔ کیا وہ ذات جو انہیں بار بار کی خلقتوں پر قدرت رکھتی ہے قیامت میں مُردوں کو زندہ کرنے سے قاصر ہے۔ یہ آیت حقیقت میں سُورۂ حج کی آیت ۵ سے مشابہت رکھتی ہے جہاں پروردگارِ عالم فرماتا ہے: یا ایھا الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقناکم من تراب ثم من نطفۃ ثم من علقۃ ثم من مضغۃ مخلقۃ وغیر مخلقۃ لنبین لکم

---

[1] "لولا" اصطلاح کے مطابق تحضیض اور کسی کام کی انجام دہی کی تحریک کے لیے ہے اور بعض کے قول کے مطابق اصل میں یہ لم اور لا سے مرکب تھا جو سوال اور نفی کے معنی دیتے ہیں اس کے بعد میم واؤ کے ساتھ تبدیل ہوگیا۔ یہ لفظ ایسی جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں کوئی فرد یا کچھ افراد کسی کام کے کرنے میں تساہل کریں تو ان سے کہا جاتا ہے کہ کیوں اس طرح اور اُس طرح نہیں کرتے۔

[2] "رءیتم" یہاں رویت سے علم کے معنوں میں ہے نہ کہ آنکھ سے دیکھنے کے معنوں میں۔

ونقر فی الارحام مانشاء الیٰ اجل مسمًّی ثم نخرجکم طفلًا ۔ اے لوگو! تم قیامت کے بارے میں شک رکھتے ہو تو اس نکتہ کی طرف توجہ کرو کہ ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر بستہ شدہ خون سے، پھر مضغہ سے (چبائے ہوئے گوشت کی شکل کی ایک چیز) جن میں سے بعض کی شکل و صُورت ہے اور بعض شکل و صُورت کے بغیر ہیں۔ مقصود کلام یہ ہے کہ ہم تم پر واضح کریں کہ ہم ہر چیز پہ قادر ہیں اور جن شکم مادر والے بچوں کو ہم چاہیں مدت معینّ تک شکمِ مادر میں رکھتے ہیں۔ (اور جسے چاہیں اسے ساقط کر دیتے ہیں) پھر تمہیں بچّہ کی شکل میں باہر بھیجتے ہیں۔ ان سب سے قطع نظر اگر اس چیز کو جسے موجودہ زمانے کے ماہرین نے اس بظاہر ناچیز پانی کے قطرہ کے بارے میں دریافت کیا ہے، پیشِ نظر رکھیں تو مطلب زیادہ واضح ہو جاتا ہے کیونکہ ان کا قول ہے کہ وہ چیز جو انسان کے نطفہ کی تولید کا باعث بنتی ہے وہ مرد کے نطفہ " سپرم " اور عورت کے نطفہ " اوول " کا مرکب ہے اور " اسپرم" یعنی مرد کا نطفہ بہت ہی چھوٹا خوردبین سے نظر آنے والا کیڑا ہے۔ مرد کے ایک مرتبہ کے انزال میں دو سو سے لے کر پانچ سو ملین " اسپرم " موجود ہوتے ہیں۔ (یعنی دُنیا کے کئی ممالک کی آبادی کے برابر[1] اور تعجّب کی بات یہ ہے کہ بہت ہی چھوٹا وجود عورت کے نُطفہ کے ساتھ مِل کر نشو و نما پاتا ہے اور حیرت انگیز اضافہ کے ساتھ اِنسانی بدن کے سَیل بناتا ہے اور باوجود اس کے کہ تمام سیل (CELL) ایک دوسرے سے مشابہ ہیں اور بہت جلد ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے ہیں، ان میں کا ایک گروہ انسان کے دل کی تشکیل کرتا ہے۔ دوسرا ہاتھ پاؤں کی اور ایک اور گروہ کان اور آنکھ کی۔ اور ہر ایک ٹھیک اپنی جگہ قرار پاتا ہے۔ نہ دل کے سیل گُردہ کی جگہ جاتے ہیں نہ گُردہ کے دل کی جگہ۔ کان کے لیے ظاہر ہونے والے سیل آنکھ کے لیے ظاہر ہونے والوں کی جگہ قرار نہیں پاتے اور نہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ نطفہ اپنے جنینی دَور میں کئی پُر شور جہانوں کو طے کرتا ہے حتیٰ کہ ایک بچّے کی صُورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور یہ سب خدا کی دوام رکھنے والی صفتِ خالقیت کے زیرِ سایہ ہے۔ جب کہ اس خلقت کے سلسلہ میں اِنسان کا ایک معمولی سا نقش ایک ہی لمحے میں مکمّل ہو جاتا ہے۔ (اور وہ رحم میں نطفہ ڈالنے کا لمحہ ہے اور بس۔ تو کیا یہ عقیدہ معاد پر ایک زندہ دلیل نہیں ہے کہ اس قسم کا قادرِ مُطلق مُردوں کے زندہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے[2]

اِس کے بعد تیسری دلیل کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: " ہم نے تمہارے درمیان موت کو مقدّر کیا اور کسی نے ہم پر سبقت نہیں کی (نحن قدرنا بینکم الموت وما نحن بمسبوقین)۔ جی ہاں ہم کبھی مغلوب نہیں ہوں گے۔ اور اگر موت کو ہم نے مقدر کیا ہے تو اس بنا پر نہیں کہ ہم عمرِ جاودانی نہیں دے سکتے بلکہ مقصد یہ تھا کہ تم میں سے ایک گروہ کو ہم اُٹھا لیں اور اس کی جگہ دوسرا گروہ لے آئیں اور انجامِ کار تمہیں ایسے جہان میں کہ جسے تم نہیں جانتے نئی خلقت بخشیں۔ (علیٰ ان نبدّل امثالکم وننشئکم فی ما لا تعلمون)۔ اِن دو آیتوں کی تفسیر میں اس نظریہ کے علاوہ جو ہم نے اُوپر بیان کیا ایک اور نظریہ موجود ہے اور وہ یہ کہ دوسری آیت پہلی آیت کے مقصود کا بیان نہیں ہے بلکہ اس کا جزوِ آخر ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے: " ہم ہرگز عاجز و مغلوب نہیں ہیں اس سے کہ ایک گروہ کو لے جائیں اور دوسرے گروہ کو اس کا جانشین بنا دیں[3]

---

[1] اولین دانش گاہ جلد ۱ (بحث جنین شناسی) ص ۲۴۱۔

[2] اس سلسلہ کی مزید وضاحتیں جلد ۷ سورہ حج کی آیت ۵ کے ذیل میں ہم نے جمع کر دی ہیں۔

[3] پہلی تفسیر کے مطابق " علیٰ ان نبدل " کا جار و مجرور " قدرنا " سے متعلق ہے جو گزشتہ آیت میں آیا ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق " مسبوقین " سے متعلق ہے (غور کیجیے)

"علیٰ ان نبدل امثالکم" کے جملہ کے بارے میں بھی دو تفسیریں موجود ہیں۔ایک وہی تفسیر جو ہم نے اُوپر بیان کی ہے جو مفسرین کے درمیان مشہور ہے۔اِس تفسیر کے مطابق اس آیت میں گفتگو اس دنیا میں اقوام کی تبدیلی کے بارے میں ہے۔ دوسری تفسیر کہتی ہے کہ امثال سے مراد خود انسان ہیں جو قیامت میں دوبارہ پلٹ آئیں گے اور مثل کا لفظ اس لیے آیا ہے کہ انسان اپنی تمام خصوصیات کے ہمراہ واپس نہیں آئے گا بلکہ ایک اور ہی زمانہ میں ہوگا اور جسم و رُوح کے اعتبار سے نئی خصوصیات کا حامل ہوگا۔لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ بہرحال مقصودِ کلام یہ ہے کہ موت سے قیامت پر استدلال پیش کیا جائے۔اس استدلال کی اس طرح وضاحت کی جا سکتی ہے۔

خداوند حکیم جس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور باقاعدہ ایک گروہ انتقال کرتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے، اس کا یہ عمل کوئی نہ کوئی مقصد اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر صرف دنیاوی زندگی ہی یہ مقصد ہوتی تو پھر مناسب تھا کہ انسانی زندگی جاودانی ہوتی۔ نہ اس قدر مختصر اور ہزارہا تکالیف سے لبریز کہ انسان کی آمد و رفت کی قیمت بھی نہیں رکھتی۔ اس بنا پر موت کا قانون بڑی عمدگی سے یہ گواہی دیتا ہے کہ دنیا ایک گزرگاہ ہے منزل نہیں ہے۔ ایک پل ہے نہ کہ ایک مقصد۔ اگر منزل ہوتی اور مقصد ہوتا تو پھر یہ دوام رکھتی۔ "وننشئکم فی ما لا تعلمون"۔ " تمہیں ہم پیدا کرتے ہیں ایسی صورت و شکل میں جسے تم نہیں جانتے"۔ ظاہر ہے یہ قیامت میں انسان کی خلقت کی طرف اشارہ ہے جو ممکن ہے اس دنیا کی موت و حیات کا مقصود ہو۔ یہ واضح ہے کہ چونکہ کسی شخص نے دارِ آخرت کو نہیں دیکھا لہٰذا وہ ان اصولوں اور نظاموں سے بے خبر ہے جو وہاں رائج ہیں، یہاں تک کہ وہاں کی حقیقت کا بیان ہمارے الفاظ میں بھی نہیں سما سکتا۔ ہم دُور سے اس کا ایک ہیولا دیکھتے ہیں۔

ضمنی طور پر اُوپر والی آیت اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ ہم تمہیں ایک نئے جہان میں نئی شکل و صُورت، نئے حالات اور نئی کیفیات میں پیدا کریں گے جس کی تمہیں خبر نہیں ہے۔

آخری آیت میں معاد کی چوتھی دلیل کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے: " تم نشاۃِ اُولیٰ (اس جہان) کو جان چکے ہو تو کس طرح قائل نہیں ہوتے کہ دوسرا جہان اس کے بعد ہے" (ولقد علمتم النشأۃ الاولیٰ فلولا تذکرون)۔ اس دلیل کو دو طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ پہلی یہ کہ، مثال کے طور پر، اگر ہم ایک بیابان سے گزریں اور اس میں ایسا محل دیکھیں جو بہت آراستہ و پیراستہ ہو، اس کی عمارت بہت عظمت و شکوہ ہو، وہ بہت مضبُوط ہو، اس میں نہایت عمدہ سہولتیں موجود ہوں اور وہ بہت وسیع و عریض ہو۔ بعد میں لوگ ہم سے کہیں کہ یہ عظیم عمارت اس مقصد کے لیے ہے کہ صرف ایک چھوٹا سا قافلہ چند گھنٹے اس میں آرام کر کے چلا جائے تو ہم اپنے ذہن میں یہ سوچیں گے کہ یہ کوئی حکیمانہ کام نہیں ہے، کیونکہ اس قسم کے مقصد کے لیے مناسب یہ تھا کہ چند چھوٹے چھوٹے خیمے نصب کر دیے جاتے۔ اسی طرح یہ دنیا اتنی عظمت کے ساتھ، یہ تمام کُرّے، سُورج، چاند اور انواع و اقسام کی زمین میں بسنے والی مخلوقات، یہ تمام چیزیں صرف ایک چھوٹے سے مقصد یعنی انسان کی چند روزہ زندگی کے لیے نہیں بنائی جا سکتیں۔ ورنہ اس جہان کی خلقت فضول اور لاحاصل ہوتی۔ یہ عظیم مقامات انسان جیسے صاحبِ شرف وجود کے لیے بنائے گئے ہیں تاکہ ان کو دیکھ کر وہ خدائے عظیم کی معرفت حاصل کرے۔ ایسی معرفت جو دوسری زندگی کے لیے اس کا سرمایہ ثابت ہو۔ یہ بیان حقیقت میں اس کے مشابہ ہے جو سورہ "ص" کی آیت ۲۷ میں قیامت کے بارے میں پیش کی گئی ہے: وما خلقنا السماء والارض وما بینھما باطلا ذالک ظن الذین کفروا " ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے فضول نہیں پیدا کیا۔ یہ کافروں کا گمان ہے"۔

دُوسری بات، یہ کہ معاد کے منظر تم اس دنیا کے ہر گوشہ میں اپنی آنکھ سے دیکھتے ہو۔ ہر سال نباتات کی دُنیا میں قیامت کے منظر کی تکرار ہوتی ہے۔ پروردگارِ عالم مُردہ زمینوں کو بارش کے زندگی بخش قطروں کے نزول سے زندہ کرتا ہے جیسا کہ سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۳۹ میں فرماتا ہے: ان الذی احیاھا لمحی الموتٰی ۔ " وہ جو ان مُردہ زمینوں کو زندہ کرتا ہے وہی ہے جو مُردوں کو زندہ کرے گا"۔ سُورہ حج کی آیت ۶ میں بھی ان معانی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

ایک نکتہ

ہمارے، اصولِ فقہ میں یہ مسئلہ پیش کیا جاتا ہے کہ احکام شرعی کو قیاس کے ذریعے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً ہم کہیں کہ وہ عورت جسے حیض آرہا ہو چونکہ اپنے روزے قضا کرتی ہے لہٰذا نماز بھی قضا کرنی چاہیئے (اصطلاح کے مطابق ضروری ہے کہ کُلی سے جزئی تک راہ پیدا کرنی چاہیئے نہ کہ جزئی سے دوسرے جزئی تک)۔ زیادہ تر علمائے اہلِ سُنّت قیاس کو فقہ اسلامی کے سلسلہ میں منابع تشریع میں سے ایک منبع تسلیم کرتے ہیں۔ ان علماء میں سے ایک جماعت ایسی بھی ہے کہ جو قیاس کی حجیّت کی نفی میں ہماری ہم نوا ہے۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ قیاس کے بعض طرفداروں نے مندرجہ بالا آیت (ولقد علمتم النشاۃ الاولٰی فلولا تذکرون) سے یہ چاہا ہے کہ اپنے مقصود پر استدلال کریں، اس لیے کہ خدا کہتا ہے: نشاۃ الاخری یعنی قیامت کا نشاۃ الاولٰی یعنی اس دنیا پر قیاس کرو۔ مگر یہ استدلال عجیب ہے کیونکہ اوّلاً جو کچھ اُوپر والی آیت میں آیا ہے ایک عقلی استدلال اور منطقی قیاس ہے۔ چونکہ منکرینِ معاد کہتے تھے کہ خدا کس طرح قدرت رکھتا ہے کہ بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کرے۔ قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے وہی ذاتِ والاصفات جو ابتدا میں تمہیں پیدا کرنے کی قدرت رکھتی تھی، وہی بعد میں بھی اس قسم کی قدرت رکھتی ہے۔ احکام شرعی میں قیاس ظنی ہرگز اس طرح نہیں ہے کیونکہ ہم تمام احکام کے مفاد و مصالح پر احاطہ نہیں رکھتے۔ دوسرے یہ کہ وہ جو قیاس کو ممنوع سمجھتے ہیں انہوں نے " قیاس اولویت " کا استثناء کیا ہے۔ مثلاً قرآن کہتا ہے: "ماں باپ کی نسبت معمولی سے معمولی خشونت آمیز بات بھی نہ کرو"۔ تو ہم یہ بدرجہ اولیٰ سمجھتے ہیں کہ ماں باپ کو کوئی جسمانی تکلیف نہیں پہنچانی چاہیئے۔ زیرِ بحث آیت بھی " قیاسی اولویت " کے قبیل میں سے ہے اور اس قیاس ظنی سے کوئی رابطہ نہیں رکھتی جو متنازع فیہ ہے۔ ابتدا میں کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ خدا نے کرّہ زمین اور مٹی کو پیدا کیا اور انسان کو اس مٹی سے پیدا کیا۔ آخرت کی تخلیق کے لیے کم از کم خاک تو موجود ہے۔ اس لیے قرآن مجید کی سُورہ روم کی آیت ۲۷ میں ہم پڑھتے ہیں کہ وھو الذی یبدؤا الخلق ثم یعیدہ وھو اھون علیہ ۔ وہی ہے جس نے آفرینش کا آغاز کیا اس کے بعد اسے لوٹائے گا اور یہ کام اس کے لیے بہت آسان ہے۔ اس گفتگو کو ہم ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ہے: عجبًا کل العجب للمکذب بالنشأۃ الاخری وھو یری النشاۃ الاولٰی وعجبا للمصدق بالنشاۃ الاخرۃ وھو یسعی لدار الغرور ۔ بہت ہی حیران کُن ہے اس شخص کا معاملہ جو نشاۃ الاخریٰ یعنی آخرت کا انکار کرتا ہے جب کہ نشاۃ الاُولیٰ یعنی دنیا کو وہ دیکھتا ہے اور بہت زیادہ تعجب ہے اس شخص پر جو نشاۃ اخریٰ پر ایمان رکھتا ہے لیکن اس کی ساری تگ و دَو اس دنیا کے لیے ہے۔[1]

---

[1] اس حدیث کو "رُوح البیان"، "روح المعانی"، "قرطبی" اور "مراغی" نے مختصر سے فرق کے ساتھ خبر کے عنوان کے تحت پیغمبرِ اسلامؐ کے نام کی تصریح کے بغیر بیان کیا ہے۔ لیکن اس کی تعبیرات کا انداز یہ ہے کہ یہ حدیث پیغمبرؐ ہے۔ کتاب کافی میں اس حدیث کا پہلا حصہ امام علیؑ ابن الحسینؑ سے منقول ہے۔

۶۳۔ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝

۶۴۔ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝

۶۵۔ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝

۶۶۔ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝

۶۷۔ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝

ترجمہ

۶۳۔ کیا کبھی اس کے بارے میں غور کیا ہے جو تم کاشت کرتے ہو؟

۶۴۔ کیا تم اُسے اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں؟

۶۵۔ اگر ہم چاہیں تو اس زراعت کو مٹھی بھر خشک و کوبیدہ گھاس میں اس طرح تبدیل کردیں کہ تم حیران رہ جاؤ۔

۶۶۔ (اس طرح کہ تم کہو) واقعی ہمیں خسارہ ہوا ہے۔

۶۷۔ بلکہ ہم کُلی طور پر محروم ہیں۔

تفسیر

دانوں کو اُگانے والا خدا ہے یا تم ہو؟

اِس سُورہ میں جو سات دلیلیں معاد کے بارے میں بیان ہوئی ہیں ان میں سے ہم نے اب تک چار دلیلیں پڑھی ہیں۔ زیرِ بحث آیت اور آگے آنے والی آیات میں تین اور دلیلیں پیش کی گئی ہیں جن میں سے ہر ایک انسانی زندگی میں خُدا کی قُدرتِ بے پایاں

کا نمونہ ہے۔ ان دلیلوں میں سے ایک غذا کے دانوں کی خلقت سے تعلق رکھتی ہے۔ دوسری پانی سے اور تیسری آگ سے متعلق ہے۔ انسانی زندگی کے تین بنیادی ارکان کو یہی چیزیں تو تشکیل دیتی ہیں۔ نباتات کے دانے انسانی غذا کا اہم ترین جُز شمار ہوتے ہیں۔ پانی اہم ترین مشروب ہے اور آگ غذائی مواد اور دیگر امورِ زندگی کی اصلاح کا اہم ترین وسیلہ ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے: کیا اس میں جسے تم کاشت کرتے ہو کبھی غور کیا ہے" (افرءیتم ما تحرثون)۔ "کیا تم اُسے اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں"۔ (ءَانتم تزرعونه ام نحن الزارعون)۔ جاذبِ توجہ یہ کہ پہلی آیت میں "تحرثون" ہے جس کا مادّہ "حرث" (بروزن درس) ہے جو کاشت کرنے کے معنی میں ہے (بکھیرنا اور انہیں نشوونما کے لیے آمادہ کرنا)۔ دوسری آیت میں تزرعون کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ جس کا مادّہ "زراعت" ہے جو اُگانے کے معنی میں ہے۔ واضح رہے کہ انسان کا کام صرف کاشت کرنا ہے اُسے اُگانا خدا کا کام ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلامؐ سے منقول ہے۔ لایقولن احدکم زرعت ولیقل حرثت (فان الزارع هو الله) "تم میں سے کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں نے زراعت کی بلکہ یہ کہے کہ میں نے کاشت کی کیونکہ زارعِ حقیقی خدا ہے"[1]

اس دلیل کی تشریح اس طرح ہے کہ انسان جو کام زراعت کے سلسلہ میں کرتا ہے وہ بچّے کے تولد کے سلسلہ میں جو اس کا کام ہے اس کچھ زیادہ غیر مشابہ نہیں ہے۔ یہ زمین میں صرف دانہ ڈالتا ہے پھر الگ ہو جاتا ہے۔ یہ خدا ہے جس نے دانہ کے اندر ایک بہت ہی چھوٹا سا زندہ سیل پیدا کیا ہے جو مساعد ماحول میں قرار پاتا ہے تو ابتدا میں خود دانہ میں موجود موادِ غذائی سے استفادہ کرتا ہے۔ کونپل نکالتا ہے اور جڑ کو مضبوط کرتا ہے۔ پھر عجیب و غریب تیزی کے ساتھ زمین کے موادِ غذائی سے مدد حاصل کرتا ہے اور اس گھاس میں عجیب قسم کی مشینری حرکت میں آجاتی ہے جس سے وہ ایک حشر بپا کرتا ہے، تنے شاخ اور خوشہ بناتا ہے اور کبھی تو ایک بیج میں سے کئی سو یا کئی ہزار دانے نکلتے ہیں[2]

ماہرین کہتے ہیں کہ وہ ترتیبیں جو ایک گھاس کی ساخت اور اس کے ڈھانچے میں نظر آتی ہیں، ایک ایسے عظیم صنعتی شہر کی ترتیبوں کی طرح ہیں جس میں متعدد کارخانے ہوں اور یہ ترتیبیں بہ نسبت اس صنعتی شہر کی ترتیبوں کے زیادہ تعجب انگیز اور پیچیدہ ہیں۔ کیا وہ ہستی جو اس قسم کی قدرت رکھتی ہے مُردوں کو زندہ کرنے سے عاجز ہے؟ اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ، نباتات کی نشوونما کے سلسلہ میں انسان سوائے دانوں کو زمین میں ڈالنے کے کوئی اور کام نہیں کرتا، بعد والی آیت مزید کہتی ہے: "اگر ہم چاہیں تو اس زراعت کو مٹھی بھر خشک و بیدہ گھاس میں اس طرح تبدیل کر دیں کہ تم حیران رہ جاؤ"۔ (لو نشاء لجعلناه حطامًا فظلتم تفكهون)۔ جی ہاں ہم تیز زہریلی آندھی بھیج سکتے ہیں جو اسے دانوں کے لگنے سے پہلے ہی خشک کر کے درہم برہم کر دے یا پھر کوئی اور آفت و مصیبت اس پر مسلّط کر دیں جو حاصل ہونے والے سرمایہ کو ختم کر دے۔ ٹڈی دَل کا سیلاب اس کی طرف بھیج سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک عظیم بجلی کا ایک گوشہ اس پر مسلّط کر دیں اس طرح کہ سوائے مٹھی بھر خشک روندی ہوئی گھاس کے اور کوئی چیز باقی نہ رہے اور تم اس منظر کے مشاہدہ سے حیرت و ندامت میں غرق ہو جاؤ۔

---

[1] اس حدیث کا پہلا حصّہ تفسیر مجمع البیان میں آیات زیرِ بحث کے ذیل میں آیا ہے جب کہ دوسرا حصّہ رُوح البیان میں نقل ہوا ہے۔

[2] اگرچہ عام طور پر گندم کی بالی میں کئی سو دانے بہت کم نظر آتے ہیں لیکن جیسا کہ اس تفسیر کی پہلی جلد میں مطبوعات کی صریح گواہی کے مطابق جنوبی ایران کے ایک شہر میں بعض کھیتوں میں گندم کے بوٹے بہت بلند اور پُر خوشہ دیکھے گئے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات ایک بوٹے میں چار ہزار دانے موجود تھے۔

اگر حقیقی زراع تم لوگ خود ہوتے تو کیا یہ امور ممکن تھے؟ تو پھر جان لو کہ یہ سب برکتیں کسی اور جانب سے ہیں۔ "حطام" کا مادہ "حطم" ہے جو (بروزن ختم) ہے۔ اس کے معنی کسی چیز کے ٹوٹنے کے ہیں۔ زیادہ تر خشک چیزوں، مثال کے طور پر، بوسیدہ ہڈی یا گھاس کے خشک تنکوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں مراد وہی گھاس ہے۔ یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ " حطام" سے مراد یہاں زمین کے نیچے بوسیدہ اور نہ اُگنے والا بیج ہے۔[۱]

"تفکھون" "فاکھۃ" کے مادہ سے پھل کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد " فکاھت" مزاح، خوش طبعی اور ایسی لطیفہ گوئی کے لیے استعمال ہوتا ہے جو محافل محبت کی جان ہوتی ہے۔ لیکن کبھی یہ مادہ حیرت اور تعجب کے معنوں میں بھی آیا ہے اور زیر بحث آیت میں اسی قبیل سے ہے۔ یہ احتمال بھی ہے جیسا کہ انسان کبھی غصہ کی حالت میں بھی ہنستا ہے جسے غصہ کا ہنسنا کہتے ہیں۔ وہ سخت اور بڑی مصیبت کے وقت بھی مزاح سے کام لیتا ہے۔ اس بنا پر اس سے یہاں مراد وہ مزاح اور خوش طبعی ہے جو مصیبت کے وقت ہو۔ جی ہاں تعجب کرتے ہو اور حیرت میں ڈوب کر کہتے ہو۔ "سچ مچ ہم نے نقصان اُٹھایا ہے اور ہم سرمایہ کھو بیٹھے ہیں اور ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آیا"۔ (انا لمغرمون)۔[۲،۳]

بلکہ ہم تو کلی طور پر بے چارے اور محروم ہیں"۔ (بل نحن محرومون)۔ اگر حقیقی زراع تم ہی ہوتے تو کیا اس قسم کی صورت حال ممکن تھی؟ یہ چیزیں بتاتی ہیں کہ یہ سب آوازیں اور صدائیں اُسی طرف سے ہیں اور وہی ہے جو ایک ناچیز دانہ سے کبھی سرسبز گھاس اور کبھی سینکڑوں یا ہزاروں دانے پیدا کرتا ہے۔ وہ گھاس اور وہ نباتات جن کے دانے انسانوں کی غذا ہیں اور ان کے شاخ و برگ جانوروں کی غذا ہیں اور کبھی ان کی جڑیں اور باقی اجزا انواع واقسام کی بیماریوں کی دوائیں ہیں۔

---

[۱] تفسیر ابوالفتوح رازی درذیل آیات زیر بحث۔

[۲، ۳] اس جملہ میں کچھ محذوف ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے (وتقولون انا لمغرمون)۔ "مغرمون" غرامت کے مادہ سے ہے۔ زیادہ نقصان کرنے اور وقت و سرمایہ ضائع کرنے کے معنوں میں ہے۔

۶۸۔ اَفَرَءَیۡتُمُ الۡمَآءَ الَّذِیۡ تَشۡرَبُوۡنَ ؕ

۶۹۔ ءَاَنۡتُمۡ اَنۡزَلۡتُمُوۡهُ مِنَ الۡمُزۡنِ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡزِلُوۡنَ ○

۷۰۔ لَوۡ نَشَآءُ جَعَلۡنٰهُ اُجَاجًا فَلَوۡلَا تَشۡكُرُوۡنَ ○

۷۱۔ اَفَرَءَیۡتُمُ النَّارَ الَّتِیۡ تُوۡرُوۡنَ ؕ

۷۲۔ ءَاَنۡتُمۡ اَنۡشَاۡتُمۡ شَجَرَتَهَاۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡشِـُٔوۡنَ ○

۷۳۔ نَحۡنُ جَعَلۡنٰهَا تَذۡكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلۡمُقۡوِیۡنَ ۚ ○

۷۴۔ فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الۡعَظِیۡمِ ○ ع الثلثة

ترجمہ

۶۸۔ کیا اس پانی پر غور کرتے ہو جسے تم پیتے ہو؟

۶۹۔ کیا تم اسے بادل سے نازل کرتے ہو یا ہم کرتے ہیں؟

۷۰۔ اگر ہم چاہیں تو اس خوشگوار پانی کو تلخ کر دیں تو کیوں تم شکر نہیں کرتے؟

۷۱۔ کیا اس آگ پر غور کیا ہے جسے تم روشن کرتے ہو؟

۷۲۔ کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا ہے یا ہم نے کیا ہے؟

۷۳۔ ہم نے اسے سب کے لیے یاد آوری اور مسافروں کے لیے مایۂ زندگی قرار دیا ہے۔

۷۴۔ جب ایسا ہے تو اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کر (اور اس کی پاکیزگی کو بیان کر)

تفسیر

یہ پانی اور آگ کس کی طرف سے ہیں؟

پروردگارِ عالم سُورہ واقعہ کی ان آیتوں میں معاد کی چھٹی اور ساتویں دلیل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ آیتیں اس قدرت و اختیار کو بیان کرتی ہیں جو اُسے ہر چیز پر حاصل ہے اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچاتی ہیں کہ وہ مُردوں کو زندہ کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے "کیا تم نے اس پانی پر غور کیا ہے جسے تم پیتے ہو؟" (افرءیتم الماء الذی تشربون)۔ "کیا تم اسے بادل سے نازل کرتے ہو یا ہم نازل کرتے ہیں؟" (ءَانتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون)۔ "مزن" (بروزن حزن) جیسا کہ "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے۔" واضح بادلوں" کے معنی میں ہے۔ بعض مفسّرین نے اس کے معنی برسنے والے بادل لیے ہیں۔

یہ آیتیں انسان کے وجدان میں سوالات کا ایک سلسلہ قائم کرتی ہیں اور اس سے اقرار لیتی ہیں اور درحقیقت کہتی ہیں: کیا اس پانی کے بارے میں جو تمہاری زندگی کا باعث ہے اور تم ہمیشہ اسے پیتے ہو کبھی غور کیا ہے؟ کون ہے جو سُورج کو حکم دیتا ہے کہ سطح سمندر پر چمکے؟ وہ کون ہے جو کڑوے اور نمکین پانیوں میں سے صرف خالص شیریں پانی کے اجزا کو، جو ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہیں، بخار کی شکل میں آسمان کی طرف بھیجتا ہے؟ کون ہے جو ان بخارات کو حکم دیتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اور ایک دوسرے میں سما کر پانی برسانے والے بادلوں کو تشکیل دیں؟ ہواؤں کو چلنے کا حکم کون دیتا ہے؟ بادلوں کے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے الگ کون کرتا ہے اور پھر انہیں خشک و مُردہ زمینوں کی بلندیوں پر بھیجتا ہے؟ کس نے ہوا کے اُوپر والے حصّہ کو یہ خاصیت بخشی ہے کہ سرد ہونے کے موقع پر آہستہ آہستہ بخارات کو جذب کرنے کی قوّت کھو بیٹھیں اور اس کے نتیجے میں موجود بخارات قطروں کی شکل میں نرم و ملائم صُورت میں آہستہ آہستہ زمین پر گریں؟ اگر سُورج اپنا کام چھوڑ دے، ہوائیں چلنے سے رُک جائیں، فضا کے اُوپر والے حصّے بخارات کو اصرار کر کے اپنے اندر روک لیں، آسمان زمین کے بارے میں بخیل ہو جائے اس انداز میں کہ زراعتیں اور نخلستان اپنے لب تر نہ کر سکیں تو تم سب شدّتِ تشنگی سے ہلاک ہو جاؤ گے اور تمہارے جانور، باغات اور زراعتیں سب خشک ہو جائیں گے۔ تو پھر سوچو جو قدرت رکھتا ہے کہ اس قسم کے آسان ذرائع سے اس طرح کی برکتیں تمہارے لیے فراہم کرے کیا مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا؟ یہ تو خود ایک قسم کا مردوں کو زندہ کرنا ہے۔ مردہ زمینوں کو زندہ کرنا توحید و عظمت خدا کی بھی دلیل ہے اور قیامت و معاد کی بھی۔ اور اگر ہم مندرجہ بالا آیتوں میں دیکھتے ہیں کہ صرف پینے کے پانی پر انحصار کیا گیا ہے اور اس کی تاثیر سے جانوروں اور نباتات کی زندگی کے لیے پانی کی حد سے زیادہ اہمیت کی بنا پر ہے۔ اس کے علاوہ گزشتہ آیتوں میں زراعت کے معاملہ پر گفتگو ہوئی تھی لہٰذا تکرار کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ انسانی زندگی میں پانی کی اہمیت اور اس کے اثرات، نہ صرف یہ کہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ، صنعتوں کے وجود میں آنے اور انسان کے علم و دانش کی ترقی کے باوجود، کم نہیں ہوئے بلکہ، اس کے برعکس، صنعتی انسان پانی کا زیادہ محتاج ہے۔ اسی لیے بہت سے عظیم صنعتی ادارے صرف بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے واقع ہیں اور ان کی کارکردگی انہی مقامات سے وابستہ ہے۔ آخر کار بعد والی آیت میں اس بحث کی تکمیل کے لیے مزید کہتا ہے: "اگر ہم چاہیں تو اس میٹھے اور خوشگوار پانی کو کڑوے اور نمکین پانی میں تبدیل کر دیں"۔ (لو نشاء جعلناہ اجاجًا)[1]۔

---

[1] اس جملہ میں لام حذف ہو گیا ہے اور تقدیرِ عبارت اس طرح ہے۔ (لو نشاء لجعلناہ)

" تو پھر کیوں اس عظیم نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے "۔ (فلولا تشکرون)۔ جی ہاں اگر خدا چاہتا تو پانی میں حل شدہ نمکیت کو اجازت دیتا کہ وہ پانی کے اجزا کے ساتھ بخار بنے اور اس کے ساتھ آسمان کی طرف چلی جائے اور کڑوے اور نمکین بادلوں کی شکل بنائے اور بارش کے قطرے شور و تلخ سمندر کے پانی کا ذائقہ لیے ہوئے اُوپر سے نیچے گریں۔ لیکن اس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے نمکین پانی کو یہ اجازت نہیں دی۔ نہ صرف پانی کے نمکین حصہ کو بلکہ ایذا رساں، مضرِ صحت، اور تکلیف دہ جراثیم کو بھی یہ اجازت نہیں دی کہ وہ پانی کے بخارات کے ہمراہ آسمان کی طرف بلندی پر جائیں اور بارش کے قطروں کو آلودہ کریں۔ اسی بنا پر بارش کے قطرے، جس وقت فضا آلودہ نہ ہو، زیادہ خالص پاکیزہ اور خوشگوار پانی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ " اجاج " کا مادّہ " اج " (بروزن حج) ہے۔ یہ اصل میں " اجیج " سے لیا گیا ہے جس کے معنی آگ کے بھڑکنے اور جلانے کے ہیں۔ اس پانی کو جو کڑواہٹ، نمکیت اور حرارت کی وجہ سے منہ کو جلا دے " اجاج " کہتے ہیں۔ اس گفتگو کو ہم پیغمبرِ اسلامؐ کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ ان النبی کان اذا شرب الماء قال الحمد للّٰہ الذی سقانا عذبًا فراتًا برحمتہ ولم یجعلہ ملحًا اجاجًا بذنوبنا ۔ جب پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پانی نوش فرماتے تو ارشاد فرماتے :

" حمد ہے اس خدا کے لیے جس نے اپنی رحمت سے ہمیں میٹھے اور خوشگوار پانی سے سیراب
کیا اور اسے ہمارے گناہوں کی وجہ سے نمکین اور کڑوا نہیں بنایا "۔ [1]

انجام کار ہم اسی سلسلہ آیات میں ساتویں اور آخری دلیل تک پہنچتے ہیں۔ وہ ساتویں دلیل آگ کی خلقت ہے۔ آگ جو انسانی زندگی کے آلات و اسباب میں سب سے زیادہ اہم ہے اور تمام صنعتوں میں زیادہ مؤثر ذریعہ ہے اس کو موضوع بنا کر خدا فرماتا ہے : " کیا اس آگ کے بارے میں جسے روشن کرتے ہو کبھی تم نے غور و فکر سے کام لیا ہے "۔ (افرءیتم النار التی تورون)۔ کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا ہے یا ہم نے پیدا کیا ہے "۔ (ءانتم انشأتم شجرتھا ام نحن المنشئون)۔ " تورون " کا مادّہ " وری " (بروزن نفی) ہے اس کے معنی چھپانا ہیں۔ وہ آگ جو آگ جلانے کے وسائل میں چھپی ہوئی ہے۔ اس کو چنگاری سلگا کر باہر نکالیں تو اسے " وری " اور " ایراء " کہتے ہیں۔ اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے۔ پہلی چنگاری پیدا کرنے اور آگ جلانے کے لیے موجودہ زمانہ میں ماچس اور لائٹر سے کام لیا جاتا ہے کبھی لوہے اور چقماق سے یہی کام لیتے تھے۔ انہیں ایک دوسرے سے رگڑتے تھے تو اس میں سے چنگاری نکلتی تھی لیکن حجاز کے دیہاتی دو قسم کے مخصوص درختوں سے جو صحرا میں اُگتے ہیں اور " مرخ " اور " عفار " کہلاتے ہیں ان سے وہ آگ جلانے والی لکڑیوں کے نام سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ پہلی لکڑی کو نیچے رکھ لیتے اور دوسری کو اس کے اُوپر پتھر اور چقماق کی مانند ان میں سے چنگاری نکلتی۔ اکثر مفسرین نے اس آیت کی انہی معانی میں تفسیر کی ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ وہ آگ جو اس قسم کے درختوں میں چھپی ہوئی ہے اور اس سے ماچس یا چقماق کی طرح فائدہ اُٹھایا جاتا ہے، پروردگار اسے اپنی انتہائی قدرت پر دلالت کرتا ہے کہ شجرِ اخضر (سرسبز درخت) میں آگ پیدا کی ہے حالانکہ پانی درخت کی جان ہے۔ پانی کہاں اور آگ کہاں۔ وہ ذاتِ پاک جو اس قسم کی قدرت رکھتی ہے کہ پانی اور آگ کو ایک دوسرے کے اندر محفوظ رکھے وہ مُردوں کو لباسِ حیات پہنانے سے کس طرح قاصر ہو سکتی ہے اور بروزِ قیامت انہیں کس طرح زندہ نہیں کر سکتی! معاد کے لیے اسی دلیل سے مشابہت رکھتی ہوئی دلیل سُورہ یٰسین کی آخری آیات میں بھی آئی ہے۔ (الذی جعل لکم من الشجر الاخضر نارًا فاذا انتم منہ توقدون) " وہی ذات جس نے سبز درخت سے تمہارے لیے آگ پیدا کی اور تم اس کے ذریعہ آگ

[1] تفسیر " مراغی " جلد ۲۷ ص ۱۴۸ ۔ تفسیر روح المعانی " جلد ۲۷ ص ۱۲۹

روشن کرتے ہو۔ (یٰسین ۔ ۸۰) لیکن جیسا کہ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں ہم نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ یہ قرآنی تعبیر ہو سکتا ہے ایک زیادہ لطیف دلیل یعنی قوتوں کی قیامت کی طرف اشارہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہاں گفتگو صرف ماچس اور لائٹر وغیرہ کی نہیں ہے بلکہ وہ چیزیں مُراد ہیں جو جلانے کے کام آتی ہیں یعنی لکڑیاں اور ایندھن وغیرہ جو جل کر یہ ساری طاقت اور حرارت بہم پہنچاتے ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے علمی لحاظ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ آگ جو آج ہم لکڑیوں کے جلنے کے وقت دیکھتے ہیں یہ وہ حرارت ہے جو درختوں نے طویل عرصہ کے درمیان سُورج سے حاصل کی ہے اور اپنے اندر اس کا ذخیرہ کر لیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سُورج کی پچاس سال کی چمک اور روشنی درخت کے تنے سے ختم ہو گئی ہے۔ ہم اس سے غافل ہیں کہ وہ حرارت درخت میں جمع ہے۔ جس وقت آگ کی چنگاری خشک لکڑیوں تک پہنچتی ہے اور وہ جلنے لگتی ہیں تو درخت وہ حرارت اور روشنی واپس کر دیتا ہے۔ یعنی اس طرح یہاں قیامت بپا ہو گی اور مُردہ طاقتیں از سرِ نو زندہ ہو جائیں گی اور وہ ہم سے کہیں گی وہ خدا جس نے ہماری قیامت برپا کر دی ہے وہ یہ قدرت رکھتا ہے کہ تم انسانوں کی قیامت بھی برپا کر دے۔ اس سلسلہ میں مزید وضاحت کے لیے تفصیلی بحث جلد ۱۸ کی طرف رجوع کریں۔ " تورون " جس کے معنی آگ جلانا ہیں۔ اگرچہ یہاں عام طور پر اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اس سے مراد ماچس وغیرہ سے فائدہ اُٹھانا ہے لیکن اس میں کوئی شئے مانع نہیں ہے کہ اس سے مُراد ایندھن ہو کیونکہ بہرحال اس میں آگ پوشیدہ ہوتی ہے جو ظاہر ہوتی ہے۔ یہ دونوں تفسیریں ایک دوسرے سے متصادم بھی نہیں ہیں، پہلے معنی عام لوگ سمجھتے ہیں اور دوسرے معنی جو زیادہ دقیق ہیں وہ زمانے کے گزرنے اور علم و دانش کی ترقی کے نتیجے میں ظاہر ہوتے ہیں۔ بعد والی آیت میں مذکورہ بالا مباحث کی تاکید کے لیے مزید فرماتا ہے: " ہم نے اس آگ کو جو درختوں سے خارج ہوتی ہے اوروں کے لیے یاد دہانی کا ذریعہ اور مسافروں کے لیے زندگی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ (نحن جعلناها تذكرة ومتاعاً للمقوين) ۔ سبز درختوں میں سے آگ کا ظاہر ہونا ایک طرف بے جان بدنوں میں قیامت کے دن رُوحوں کے واپس آنے کو یاد دلاتا ہے اور دوسری طرف آتشِ دوزخ کا احساس دلاتا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث : " ناركم هذه التي توقدون جزء من سبعين جزءاً من نار جهنم ۔

یہ آگ جو تم جلاتے ہو جہنم کی آگ کے ستّر اجزاء میں سے ایک جُز ہے [1]

باقی رہی تعبیر (متاعاً للمقوین) کی تو وہ اس آگ کے دنیاوی فوائد کی طرف ایک مختصر اور پُر معنی اشارہ ہے۔ کیونکہ مقوین کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ یہ مادّہ " قواء " (بروزن کتاب) سے مشتق ہے جس کے معنی خشک اور خالی بیابان کے ہیں۔ اس بنا پر مقوین ان افراد کو کہتے ہیں جو صحراؤں میں پھرتے ہیں اور چونکہ صحرا نشین افراد عام طور پر فقیر ہوتے ہیں لہٰذا یہ تعبیر بعض اوقات فقیر کے معنی میں بھی آئی ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ قوّت کے مادّہ سے طاقتور کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر لفظ مذکور ایسے الفاظ میں سے ہے جو دو متضاد معانی میں استعمال ہوتے ہیں [2]

یہ ٹھیک ہے کہ آگ اور درخت (ماچس اور ایندھن وغیرہ) سب کے لیے ذریعۂ استفادہ ہیں لیکن چونکہ مسافر سردی کو دُور کرنے اور کھانا پکانے کے لیے خصوصاً پُرانے زمانے کے سفروں میں، جو قافلوں کے ذریعے ہوتے تھے، خصوصیت سے ان چیزوں کے حاجت مند تھے لہٰذا انہی کے ذکر پر انحصار کیا گیا۔ " اقویا " طاقتوروں کا آگ سے فائدہ اُٹھانا اپنی زندگی کی وسعت یعنی سہولتوں کی بنا

[1] تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۶۳۹۲ اور تفسیر رُوح المعانی جلد ۲۷ ، ص ۱۳۱

[2] توجہ کریں کہ متاع کا لفظ ہر اس ذریعہ کے لیے بولا جاتا ہے جس سے انسان اپنی زندگی میں فائدہ اُٹھائے۔

پر واضح ہے۔ خصوصاً اگر اس بحث کو ہم موجودہ زمانے تک لے آئیں کہ کس طرح وہ حرارت جو انواع و اقسام کی آگ سے پیدا ہونے والی ہے اور وہ دنیائے صنعت کو متحرک کرتی ہے اور کارخانوں کے عظیم پہیوں کو گردش میں لاتی ہے اگر یہ حرارت، یہ شعلۂ عظیم (جو سب کا سب درختوں سے متعلق ہے یہاں تک کہ وہ آگ جو پتھر کے کوئلہ یا مٹی کے تیل کے مواد سے حاصل کی جاتی ہے، وہ بھی بلاواسطہ یا بالواسطہ درختوں ہی سے متعلق ہے) کسی دن بجھ جائے تو نہ صرف یہ کہ چراغِ تمدن گل ہو جائے بلکہ انسانوں کی زندگی کا چراغ بھی خاموش ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ آگ انسانی انکشافات میں سے ایک بہت اہم چیز ہے جب کہ اس کے تمام اثرات کا سرچشمہ خلقت و آفرینش ہی ہے اور انسان کی کاوش کا دخل اس میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ جس وقت سے آگ دریافت ہوئی ہے، بشریت نے اپنے تمدن کے ایک نئے مرحلہ میں قدم رکھا ہے۔ جی ہاں قرآن مجید نے اس ایک مختصر سے جملہ میں ان تمام حقائق کی طرف اجمالی اور سربستہ شکل میں اشارہ کیا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں پہلے تو آگ کا معنوی فائدہ پیش ہوا ہے جو یقیناً قیامت کی یاد دہانی تھا۔ اس کے بعد اس کا دنیاوی فائدہ بیان ہوا اور وہ اس لیے کہ پہلا فائدہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے بلکہ اصل و اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان تین نعمتوں (غذائی اناج، پانی اور آگ) کے ذکر کے موقع پر ایک خاص ترتیب رکھی گئی ہے جو پورے طور پر ایک طبعی ترتیب ہے۔ سب سے پہلے انسان غذا میں استعمال ہونے والے دانوں کو لیتا ہے اس کے بعد ان دانوں میں پانی ملاتا ہے پھر اُسے آگ پر رکھ کر پکاتا ہے۔ اور اس قابل بناتا ہے کہ انہیں بطور غذا استعمال کیا جائے۔ آخری زیرِ بحث آیت میں نتیجہ پیش کرتے ہوئے پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "اب جب کہ ایسا ہے تو اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کر اور اسے پاک و منزہ شمار کر"۔ (فسبّح باسم ربك العظيم)[1]

جی ہاں وہ خدا جس نے یہ سب نعمتیں پیدا کی ہیں جن میں سے ہر ایک اس کی توحید، قدرت اور عظمت پر دلالت کرتی ہے اور قیامت کا ثبوت ہے۔ وہ ہر قسم کے عیب و نقص سے مبرّہ و منزّہ ہے۔ وہ پروردگار بھی ہے، عظیم بھی ہے اور قادرِ مطلق بھی۔ اس جملہ میں اگرچہ تنہا پیغمبرِ اسلامؐ سے خطاب ہے لیکن یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ اس سے مراد تمام انسان ہیں۔

ایک نکتہ

یہاں ضروری ہے کہ مندرجہ بالا آیات سے متعلق ہم پیغمبرِ اسلامؐ اور امیر المومنین علیؑ کی چند حدیثیں پیش کریں۔

۱۔ تفسیر رُوح المعانی میں ایک حدیث حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ ایک رات نماز کے بعد سُورہ واقعہ کو پڑھتے ہوئے جب آپ (افرءيتم ما تمنون ءانتم تخلقونه ام نحن الخالقون) پر پہنچے تو آپ نے تین مرتبہ عرض کیا: (بل انت یا رب) "بلکہ تو ہی (انسان کا خالق ہے)۔ اے پروردگار"، اور جس وقت ءانتم تزرعونه ام نحن الزارعون پر آئے تو پھر تین مرتبہ عرض کیا: (بل انت یا رب) "بلکہ زراعِ حقیقی اے پروردگار تو ہی ہے)"۔ اس کے بعد جس وقت (ءانتم انزلتموه من المزن ام نحن المنزلون) پر آئے تو پھر تین مرتبہ عرض کیا۔ (بل انت یا رب)۔ "اے پروردگار تو ہی ہے۔ (جو بادلوں سے مینہ برساتا ہے")۔ اس کے بعد (ءانتم انشأتم شجرتها ام نحن المنشئون) کی تلاوت فرمائی تو پھر تین مرتبہ عرض کیا

[1] "با" "باسم ربك" میں ہو سکتا ہے تعدیہ کے لیے ہو (اس طرح سے کہ (سبح) کا فعل متعدی بمنزلہ لازم لیا گیا ہو)۔ بعض نے یہ احتمال بھی پیش کیا ہے کہ یہاں "با" استعانت کے لیے ہے یا زائدہ ہے یا ملابست کے لیے ہے لیکن پہلے معنی زیادہ مناسب ہیں۔

(بل انت یارب) " تو ہی ہے (جس نے آگ پیدا کرنے والے درختوں کو پیدا کیا)[1]
اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مناسب یہ ہے کہ انسان ان جملوں کا اقتضائے حال کے مطابق جواب دے اس طرح جیسے خدا اُس سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کے بعد اس حقیقت کو اپنی رُوح میں جاگزیں کرے اور صرف غور و فکر سے عاری بے جان تلاوت پر قناعت نہ کرے۔

۲۔ ایک دُوسری حدیث میں پیغمبرِ اسلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: لا تمنعوا عباد الله فضل الماء ولا کلاء ولا نارًا فان الله تعالیٰ جعلها متاعًا للمقوین وقوة للمستضعفین ۔ " تمہارے پاس جو فالتو پانی ہو اسے بندگانِ خدا کو استعمال کرنے سے کبھی نہ روکنا۔ اسی طرح اُس اضافی چراگاہ اور آگ کا معاملہ ہے جو تمہارے اختیار میں ہو، لوگوں کو اُس کے استعمال سے نہ روکنا، کیونکہ خدا نے انہیں مسافروں کی زندگی کا ذریعہ اور حاجت مندوں کی قوت کا سبب قرار دیا ہے[2]

۳۔ ایک اور حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ جس وقت فسبح باسم ربك العظیم کی آیت پیغمبرؐ پر نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا: اجعلوها فی رکوعکم " اسے اپنا ذکر رکوع قرار دو "۔ (اپنے رکوع میں سُبحان ربی العظیم و بحمدہ کہا کرو)[3]

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۲۷ ص ۱۳۰۔

[2] تفسیر در المنثور جلد ۶ ص ۱۶۱۔

[3] اس حدیث کو مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں ایک صحیح حدیث کے عنوان کے ماتحت درج کیا ہے (جلد ۹ ص ۲۲۴) اور یہ حدیث کتاب "من لا یحضرہ الفقیہ" میں بھی ہے۔ (مطابق تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۲۵) اور اسی طرح تفسیر در المنثور جلد ۶ ص ۱۶۸ پر بھی درج ہے۔

۷۵۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝

۷۶۔ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝

۷۷۔ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝

۷۸۔ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝

۷۹۔ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝

۸۰۔ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

۸۱۔ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝

۸۲۔ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝

ترجمہ

۷۵۔ قسم ہے ستاروں کی جگہ اور ان کے محلِ طلوع و غروب کی۔

۷۶۔ اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے۔

۷۷۔ کہ وہ قرآنِ کریم ہے۔

۷۸۔ جو ایک محفوظ و مکنون کتاب میں ہے۔

۷۹۔ سوائے پاکیزہ لوگوں کے کوئی اسے مس نہیں کر سکتا۔

۸۰۔ یہ ایسی چیز ہے جو پروردگار عالمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

۸۱۔ کیا اس بات کو (اس قرآن کو ان اوصاف کے ساتھ جو بتائے گئے ہیں) کمزور اور چھوٹا سمجھتے ہو؟

۸۲۔ اور جو رزق اس نے تمہیں دیا ہے۔ بجائے شکر کے اس کی تکذیب کرتے ہو؟

تفسیر

صرف پاکیزہ افراد حریم قرآن تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں

ان بہت سے مباحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں قیامت کے بارے میں سات دلیلوں کے ساتھ آئے ان آیات میں گفتگو قرآنِ مجید کی اہمیت کے بارے میں ہے کیونکہ مسئلہ نبوّت اور مسئلہ نزولِ قرآن مبداء و معاد کے مسائل کے بعد اہم ترین اعتقادی ارکان کو تشکیل دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں قرآن مجید توحید و معاد جیسے دو اصولوں کے پس منظر کے لیے عمیق بحث پیش کرتا ہے اور مسئلہ نبوّت و نزول قرآن کے مرتبہ کا استحکام توحید و معاد کا استحکام شمار ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ایک بڑی قسم کے ساتھ گفتگو شروع کرتے ہوئے فرماتا ہے: "قسم ہے ستاروں کی جگہ کی اور ان کے محل طلوع و غروب کی۔" (فلا اُقسم بمواقع النجوم)۔ بہت سے مفسّرین کا یہ عقیدہ ہے کہ "لا" یہاں نفی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ "زائدہ" ہے اور تاکید کے لیے ہے۔ جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات میں یہی تعبیر روزِ قیامت، نفسِ لوّامہ، مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار اور پروردگار شفق کی قسموں کے سلسلہ میں آئی ہے۔ بعض دوسرے مفسّرین "لا" کو یہاں نفی کے معنوں میں لیتے ہیں اور اس طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ موضوع قسم اس سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ اس کی قسم کھائی جائے۔ جیسا کہ روزمرّہ ہم دیکھتے ہیں کہ میں فلاں چیز کی قسم نہیں کھاتا۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے کیونکہ قرآن میں خدا کی پاک ذات کی صراحت کے ساتھ قسم کھائی گئی ہے تو کیا ستارے خدا سے بہتر و برتر ہیں کہ ان کی قسم نہ کھائی جائے۔ مفسرین نے مواقع النجوم کے بارے میں متعدد تفسیریں پیش کی ہیں۔ پہلی وہی جو ہم نے ابھی بیان کی یعنی ستاروں کی جگہ اور ان کے مدار و گزرگاہ کی قسم۔ دوسرے یہ کہ مراد ان کا محل طلوع و غروب ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے ستاروں کا قیامت میں گرنا مراد ہو۔ بعض نے اس کی صرف ستاروں کے غروب کے ساتھ تفسیر کی ہے اور بعض نے، چند روایات کی پیروی کرتے ہوئے، اسے قرآن کے مختلف حصّوں کے مختلف زمانی فاصلوں کے ساتھ نزول کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ (کیونکہ نجوم جو نجم کی جمع ہے وہ تدریجی کاموں کے بارے میں استعمال ہوتی ہے اور ان سب معانی کے درمیان منافات بھی نہیں ہے) ہوسکتا ہے کہ یہ سب معانی زیر بحث آیت کی تفسیر میں شامل ہوں۔ لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ کیونکہ ان آیات کے نزول کے وقت اکثر لوگ اس قسم کی اہمیت کو نہیں جانتے تھے لیکن اس زمانہ میں ہم پر یہ واضح ہوگیا ہے کہ آسمان کے ستاروں میں سے

ہر ایک کی ایک معین جگہ ہے اور اس کا مدار قانون جاذبہ و دافعہ کے مطابق معین و مقرر ہے اور بہت ہی دقیق حساب کے مطابق ہے اور ان میں سے ہر ایک کی سرعت رفتار ایک معین پروگرام کے مطابق طے پاتی ہے۔ جو کُرّے زیادہ دُور واقع ہیں ان کا بالکل ٹھیک حساب لگانا اگرچہ ممکن نہیں ہے لیکن نظام شمسی، جو ہم سے قریب کے ستاروں کا خاندان تشکیل دیتا ہے اس میں صحیح مطالعہ بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ اس کے مداروں کا نظام اس حد تک قطعی اور صحیح حساب ہے کہ انسان کے دماغ کو حیران کر دیتا ہے۔ جس وقت ہم اس نکتہ کی طرف توجہ کریں کہ ماہرین کی گواہی کے مطابق صرف ہماری کہکشاں میں تقریباً ایک ہزار ملین ستارے موجود ہیں اور عالم میں اس کے علاوہ اور بہت سی کہکشائیں ہیں جن میں سے ہر ایک کی ایک مخصوص سمت ہے، تو ہمیں قرآن کی اس قسم کا اندازہ ہوتا ہے۔ "اللہ والعلم الحدیث" نامی کتاب میں ہم پڑھتے ہیں کہ ماہرین علم الافلاک کا نظریہ ہے کہ یہ ستارے جو اربوں سے زیادہ تعداد میں ہیں ان میں سے بعض کو بغیر کسی مددگار آلے کے صرف اپنی آنکھ سے دیکھا جاسکتا ہے اور ان میں سے بہت زیادہ حصّہ کو سوائے ٹیلیسکوپ کی مدد کے نہیں دیکھا جاسکتا بلکہ ان ستاروں کا ایک حصّہ تو ٹیلیسکوپ کے ذریعے بھی نہیں دیکھا جاسکتا۔ صرف مخصوص قسم کے وسائل سے ان کی تصویر لی جاسکتی ہے۔ یہ سب اپنے مخصوص مدار میں تیرتے ہیں اور اس بات کا کوئی بھی احتمال نہیں ہے کہ ان میں سے ایک کسی دوسرے کے ایسے علاقہ میں، جہاں اس کی کشش کام کر رہی ہو موجود ہو یا یہ کہ یہ ستارے ایک دوسرے سے متصادم ہو جائیں۔ فی الحقیقت ان ستاروں کا ٹکراؤ ایسا ہی ہے جیسے ہم فرض کریں کہ ایک بحری جہاز جو ایک سمندر میں ہے وہ دوسرے اس جہاز سے جو دوسرے بڑے سمندر میں ہو ٹکرا جائے جب کہ دونوں جہاز ایک ہی سمت میں اور ایک ہی رفتار سے چل رہے ہوں۔ اس قسم کا احتمال اگر محال نہیں تو بعید ضرور ہے[1]

ستاروں کی کیفیت اور وضع کے سلسلہ میں ان علمی انکشافات کی طرف توجہ کرتے ہوئے مذکورہ بالا قسم کی اہمیت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے اسی بنا پر بعد والی آیت میں پروردگارِ عالم مزید فرماتا ہے: "یہ بہت ہی بڑی قسم ہے اگر تم جان لو"۔ (وانہ لقسم لو تعلمون عظیم) "لو تعلمون" (اگر تم جان لو) کے الفاظ اچھی طرح گواہی دیتے ہیں کہ انسان کا علم اور اس کی دانش اُس زمانے میں اس حقیقت کا مکمل طور پر اُدراک نہیں کر سکتے تھے اور یہ خود قرآن کا ایک علمی اعجاز شمار ہوتا ہے کہ ایسے زمانے میں جب کہ شاید ایک گروہ یہ خیال کرتا تھا کہ ستارے چاندی کی میخیں ہیں جو آسمان کی چھت میں ٹھونکی گئی ہیں۔ اس قسم کا بیان، اور وہ بھی ایسے ماحول میں جو فی الحقیقت جہالت و نادانی سے مملو تھا، ممکن نہیں تھا کہ ایک عام انسان سے صادر ہو۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ عظیم قسم کس مقصد کے لیے بیان ہوئی ہے۔ بعد والی آیت اس کے رُخ سے پردہ اُٹھاتی ہے اور کہتی ہے: "جو کچھ محمدؐ لے کر آئے ہیں وہ قرآن کریم ہے"۔ (انہ لقرآن کریم)۔ اور اس طرح ان کج فہم اور ضدی مشرکین کو جن کا ہمیشہ یہ اصرار تھا کہ یہ آیتیں ایک قسم کی کہانت ہیں، یا نعوذ باللہ جنون آمیز باتیں ہیں، یا شعراء کے اشعار کی طرح ہیں، یا پھر شیاطین کی طرف سے ہیں، یہ جواب دیتا ہے کہ یہ وحی آسمانی ہے اور ایسا کلام ہے جس کی عظمت کے آثار بالکل نمایاں ہیں اور اس کے موضوعات و مضامین اس کے مبدأ نزول کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ صورتِ حال اتنی واضح ہے کہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ قرآن کی تعریف لفظ کریم کے ساتھ (اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ کرم جب خدا سے متعلق ہو تو اس کے معنی احسان و انعام کے ہیں اور انسان سے متعلق ہو تو قابلِ تعریف اخلاق و اعمال کے حامل ہونے کے معنی میں ہے)۔ مجموعی طور پر عظیم اوصاف کی طرف اشارہ ہے[2]

---

[1] اللہ والعلم الحدیث ص ۳۳۔

[2] راغب کے مفردات میں مادہ کرم۔

اور قرآن کے فصیح و بلیغ لفظوں اور جملوں کے اعتبار سے اس کی ظاہری خوبصورتیوں اور پُرکشش موضوعات و مضامین کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یہ اس لیے کہ یہ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اور وہ ہر جمال و کمال اور خوبی و زیبائی وخوبصورتی کا مبداء و منشا ہے۔ جی ہاں قرآن جس کا کلام ہے وہ بھی کریم ہے اور خود قرآن بھی کریم ہے اور اس کو لانے والا بھی کریم ہے اور اس کے مقاصد بھی کریم ہیں۔ اس کے بعد اس آسمانی کتاب کی دوسری صفت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یہ آیات ایک مستور اور پوشیدہ کتاب میں ہیں"۔ (فی کتاب مکنون)۔ اس لوح محفوظ (علم خدا) میں جو ہر قسم کی خطا و لغزش اور تغیّر و تبدّل سے مصئون ہے۔ واضح ہے کہ وہ کتاب جس کا اس قسم کا سرچشمہ ہے اور اس کا اصلی نسخہ وہاں ہے وہ ہر قسم کی تبدیلی، خطا اور شک و شبہ سے محفوظ ہے۔ تیسری صفت کے سلسلہ میں فرماتا ہے: "اس کتاب کو پاکیزہ افراد کے علاوہ کوئی مَس نہیں کرسکتا۔ (لا یمسہ الّا المطھرون)[1]

بہت سے مفسّرین نے ان روایات کی پیروی کرتے ہوئے جو آئمہ معصومین سے منقول ہیں اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ غسل و وضو کے بغیر قرآن کی تحریر کو ہاتھ نہ لگایا جائے جب کہ دوسرا گروہ اس آیت کو ایک ایسا اشارہ سمجھتا ہے جو اُن پاک و پاکیزہ فرشتوں کی طرف ہے جو قرآن سے آگاہی رکھتے ہیں یا وہ قلب پیغمبر پر نزول وحی کا ذریعہ تھے۔ مشرکین جو کہتے تھے کہ یہ کلمات شیاطین نے آنحضرتؐ پر نازل کیے ہیں ان کے نقطۂ نظر کے مقابل بعض مفسّرین اسے اس طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے بلند حقائق و مفاہیم کا پاکیزہ افراد کے علاوہ کوئی ادراک نہیں کرسکتا۔ جیسا کہ سُورہ بقرہ کی آیت ۲ میں پڑھتے ہیں۔ (ذالک الکتاب لا ریب فیہ ھدی للمتقین) اس کتاب میں کوئی شک نہیں یہ پرہیزگاروں کے لیے سبب ہدایت ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ پاکیزگی کی کم سے کم حد، جو حقیقت جوئی کی رُوح ہے، وہ قرآن کے کمترین ادراک کے لیے لازمی ہے اور جس قدر پاکیزگی وطہارت زیادہ ہوگی موضوعات و مفاہیم قرآن کا ادراک انسان کے لیے اتنا ہی زیادہ ممکن ہوگا۔ اِن تینوں تفسیروں میں کوئی منافات نہیں ہے لہٰذا ممکن ہے مفہوم آیت میں یہ سب شامل ہوں۔

پروردگارِ عالم قرآن مجید کی چوتھی اور آخری توصیف کے سلسلہ میں فرماتا ہے: "یہ قرآن عالمین کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے"۔ (تنزیل من رب العالمین)[2]

وہ جو تمام اہلِ جہان کا مربّی و مالک ہے اُس نے اس قرآن کو انسانوں کی تربیّت کے لیے پیغمبرؐ کے پاکیزہ دل پر نازل کیا ہے اور جس طرح عالم تکوین میں وہی مالک و مربی ہے عالمِ تشریع میں بھی جو کچھ ہے اسی کی طرف سے ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "کیا اس قرآن کو ان اوصاف کے ساتھ جو بتلائے گئے ہیں کمزور اور چھوٹا شمار کرتے ہو۔ آسان ہے تو اس کی تکذیب کرتے ہو"۔ (افبھٰذا الحدیث انتم مدھنون)۔ جب کہ اس سے صدق وحقانیت کی نشانیاں اچھی طرح واضح ہوتی ہیں۔ تو چاہیے کہ تم کلام خدا کو انتہائی کاوش کے ساتھ قبول کرو اور ایک حقیقت واقعی سمجھ کر اس کے سامنے جاؤ۔ "ھٰذا الحدیث" "یہ بات" قرآن کی طرف اشارہ ہے اور "مدھنون" "دھن" کے مادّہ سے ہے جس کے معنی روغن اور تیل کے ہیں۔ چونکہ بدن کی کھال یا دوسری چیزوں کو نرم کرنے کے لیے روغن ملتے ہیں اس لیے لفظ "ادھان" نرمی سے پیش آنے کے معنی میں اِستعمال ہوتا ہے۔ کبھی سستی اور مقابلہ نہ کرنے کی کیفیت کے لیے بھی آتا ہے۔ چونکہ منافقین اور جھوٹے افراد کی عام طور پر ملائم زبان ہوتی ہے، اس بنا پر یہ لفظ کبھی کبھی تکذیب و انکار کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

---

[1] "لا یمسہ" جملہ خبریہ ہے جو نہی یا نفی کے معنی میں ہو سکتا ہے۔

[2] تنزیل یہاں مصدر ہے اسم مفعول کے معنی میں یعنی منزل کے معنی میں اور مبتدائے محذوف کی خبر ہے یا خبر کے بعد خبر ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں ان دونوں معانی کا احتمال ہے۔ اصولی طور پر انسان جس چیز کو باور کرتا ہے اسے پوری قوت اور مضبوطی سے پکڑتا ہے اور اگر مضبوطی سے نہ پکڑے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اسے باور نہیں کرتا۔ زیر بحث آیات میں سے آخری آیت میں فرماتا ہے :

"تم بجائے اس کے کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں، خصوصاً قرآن جیسی عظیم نعمت، کا شکر ادا کرو تم اس کی تکذیب کرتے ہو"۔ (وتجعلون رزقکم انکم تکذبون)[۱]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ قرآن میں سے تمہارا حصہ صرف یہ ہے کہ تم اس کی تکذیب کرتے رہو یا تم نے تکذیب کو اپنا ذریعہ معاش قرار دے لیا ہے۔[۲]

لیکن آخری دو تفسیروں میں سے پہلی تفسیر گزشتہ آیات کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے اور اس شان نزول کے ساتھ بھی زیادہ ہم آہنگ ہے جو اس آیت کے لیے بیان ہوئی ہے کیونکہ بہت سے مفسرین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ وہ ایک سفر میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ انہیں شدید پیاس لگی۔ پیغمبر اسلامؐ نے دعا فرمائی۔ نتیجتہً بارش کا نزول ہوا اور سب سیراب ہو گئے۔ اسی دوران میں پیغمبر اسلامؐ نے سنا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ فلاں ستارے کے طلوع کی وجہ سے بارش ہوئی۔ (عرب زمانۂ جاہلیت میں "انوا" کا عقیدہ رکھتے تھے اس سے ان کی مراد ایسے ستارے تھے جو مختلف فصلوں میں آسمان پر ظاہر ہوتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ان میں سے ہر ستارے کے ظہور کے ساتھ بارش ہوتی ہے اس لیے وہ کہتے تھے (مطرنا بنو فلان) "یہ بارش فلاں ستارے کے طلوع کی برکت کی وجہ سے ہے اور یہ بھی شرک و بت پرستی و ستارہ پرستی کا ایک ادنیٰ مظاہرہ تھا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے بہت کم آیتوں کی تفسیر کی ہے منجملہ ان چند آیتوں کے جن کی آپ نے تفسیر کی ہے ایک آیت یہ ہے "وتجعلون رزقکم انکم تکذبون"۔ آپ نے فرمایا کہ : "اس سے مراد یہ ہے کہ اپنی روزی کے شکر کی بجائے تم تکذیب کرتے ہو"۔[۳]

چند نکات

۱۔ قرآن مجید کی خصوصیات

ان چار اوصاف سے جو مندرجہ بالا آیتوں میں قرآن کے بارے میں بیان ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کی عظمت ایک تو اس کے موضوعات و مضامین کی وجہ سے ہے، دوسرے اس کے معانی کے عمق کی وجہ سے ہے، تیسرے اس پاکیزگی کی وجہ سے ہے کہ نیک اور پاک افراد کے سوا کوئی اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اور چوتھے اس وجہ سے کہ یہ حد سے زیادہ تربیتی پہلو لیے ہوئے ہے۔ اس لیے کہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ ان چاروں موضوعات میں سے ہر موضوع مفصل بحث کا محتاج ہے جسے ہم نے

۱۔ اس تفسیر کے مطابق یہاں شکر کا لفظ محذوف ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے۔ (وتجعلون شکر رزقکم انکم تکذبون) یا شکر کنایہ ہے شکر رزق کا۔

۲۔ ان دونوں تفسیروں کے مطابق کوئی چیز مقدر نہیں ہے۔

۳۔ اس حدیث کو طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے تفسیر درالمنثور جلد ۶، ص ۱۶۳۔ قرطبی جلد ۹ ص ۶۳۹۸۔ مراغی جلد ۲۷ ص ۱۵۲۔ اور روح المعانی جلد ۲۷ ص ۱۲۵ نے بھی مختصر سے فرق کے ساتھ زیر بحث آیات کے ذیل میں اسے نقل کیا ہے۔

۴۔ تفسیر درالمنثور جلد ۶ ص ۱۶۳۔ نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۲۷

مناسب آیات کے ذیل میں بیان کیا ہے۔

۲۔ قرآن و طہارت

مندرجہ بالا آیت میں ہم نے پڑھا ہے کہ قرآن کو پاک لوگوں کے علاوہ کوئی مَس نہیں کرتا اور ہم نے بتایا ہے کہ اس آیت کی مس ظاہری سے بھی تفسیر ہوئی ہے اور مس معنوی سے بھی اور دونوں تفسیریں آپس میں تضاد بھی نہیں رکھتیں۔ اور آیت کے مفہوم کلی میں موجود ہیں۔ پہلے حصہ میں روایاتِ اہلِ بیت میں حضرت ابوالحسن امام علی ابنِ موسٰی رضاؑ سے منقول ہے:

المصحف لا تمسه علی غیر طهر و لا جنبا و لا تمس خطه و لا تعلقه ان الله تعالیٰ یقول: لا یمسه الا المطهرون)

قرآن کو وضو کے بغیر مَس نہ کر اور جنابت کی حالت میں بھی مَس نہ کر اور اس حالت میں اس کی تحریر کو مت چھو اور اسے حمائل نہ کر کیونکہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے سوائے پاکیزہ لوگوں کے اسے کوئی مَس نہیں کرتا[1]

یہی معنی ایک اور حدیث میں امام محمد باقرؑ سے مختصر فرق کے ساتھ منقول ہیں[2]

منابع اہلِ سُنّت میں بھی آیا ہے اور مختلف طرق سے بھی نقل ہوا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا:

لا یمس القرآن الا طاهر۔

"قرآن کو پاکیزہ افراد کے علاوہ کوئی مَس نہ کرے"۔[3]

مس معنوی کے بارے میں ابن عباس کے ذریعے پیغمبر گرامیؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"انه لقرآن کریم فی کتاب مکنون" قال عند الله فی صحف مطهرة لا یمسه الا المطهرون قال المقربون۔

"یہ قرآن کریم ہے جو پوشیدہ (لوح محفوظ) کتاب میں ہے، خدا کے پاس پاکیزہ صفحات میں ہے اور سوائے پاکیزہ لوگوں کے اسے کوئی مَس نہیں کرتا، پاک لوگوں سے مراد مقربین ہیں"۔[4]

یہ مطلب ازروئے عقل بھی مدلل ہے کیونکہ قرآن مجید اگرچہ سب لوگوں کی ہدایت کے لیے ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ بہت سے ایسے لوگ تھے جو قرآن کو پیغمبرؐ کے لب ہائے مبارک سے سُنتے تھے اور اس آب زلالِ حقیقت کو سرچشمہ وحی میں دیکھتے تھے لیکن چونکہ تعصب، عناد اور ہٹ دھرمی کا شکار تھے انہوں نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا لیکن جن لوگوں نے تھوڑا سا اپنے آپ کو پاک کیا اور حق جوئی کے جذبے اور تحقیق کی رُوح کے ساتھ اس کی طرف آئے وہ ہدایت پا گئے۔ اس بنا پر جس شخص میں جس قدر انسانی پاکیزگی زیادہ

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱ ص ۲۶۹۔ حدیث ۳۔ اس حدیث کے مطابق اوپر والی آیت میں نفی نہی سے کنایہ ہے۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱ ص ۲۷۰۔ حدیث ۵۔

[3] یہ حدیث درالمنثور میں عبداللہ ابن عمر، معاذ ابن جبل اور ابنِ حزم کے واسطے سے پیغمبرؐ سے منقول ہے ج ۶ ص ۱۶۲

[4] درالمنثور ج ۶ ص ۱۶۲

ہو گی اور تقویٰ زیادہ ہو گا وہ قرآن مجید سے زیادہ عمیق مفاہیم حاصل کر سکے گا۔ لہٰذا یہ آیت اس طرح جسمانی اور رُوحانی دونوں جہتوں سے منطبق ہوتی ہے۔ بغیر کہے یہ امر واضح ہے کہ ذاتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ائمہ معصومین اور ملائکہ مقربین اس کے زیادہ واضح مصداق ہیں اور وہ حقائق قرآن کا سب سے بہتر ادراک کرتے ہیں۔

۸۳۔ فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۙ

۸۴۔ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ۙ

۸۵۔ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ۝

۸۶۔ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ۙ

۸۷۔ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

ترجمہ

۸۳۔ پس کیوں جب کہ رُوح گلے تک پہنچ جائے گی۔(اسے واپس لوٹانے کی تم توانائی نہیں رکھتے)؟

۸۴۔ اور تم اس حالت میں نظارہ کروگے۔(اور کوئی کام تمہارے ہاتھ سے نہیں ہوسکے گا)۔

۸۵۔ اور ہم اس سے زیادہ نزدیک ہیں تمہاری نسبت لیکن تم دیکھتے نہیں ہو۔

۸۶۔ اگر تمہارے اعمال کی تمہیں بالکل جزا نہ دی جائے۔

۸۷۔ تو پھر اس کو لوٹا دو اگر سچ کہتے ہو۔

تفسیر

جس وقت کہ جان گلے تک پہنچ جائے گی

منجملہ دیگر حساس لمحات کے جو انسان کو بہت زیادہ گہری فکر میں مستغرق کر دیتے ہیں احتضار یعنی انسانی زندگی کے اختتام کا لمحہ ہے۔
یہ وہ لمحہ ہے کہ جہاں معاملہ انسان کے اختیار سے باہر ہو جاتا ہے اور آس پاس کھڑے ہوئے لوگ جان کنی میں مبتلا فرد کو ناامیدی سے دیکھتے ہیں کہ یہ شمع کی طرح ہے جس کی زندگی ختم ہو چکی ہے اور آہستہ آہستہ بجھ رہی ہے۔ وہ زندگی سے رخصت ہوتا ہے۔ اس وقت اس کو کوئی نہیں بچا سکے گا۔ جی ہاں انسان کا مکمل ضعف ان حساس لمحات میں آشکار ہو جائے گا۔ نہ صرف گزشتہ زمانوں میں، بلکہ موجودہ زمانے میں بھی، علاج کی تمام سہولتوں کے باوجود، جاں کنی کے عالم کی زبوں حالی بالکل گزشتہ دور کی طرح واضح و آشکار ہے۔ قرآن مجید معاد کے مباحث کی تکمیل اور منکرین و مکذبین کی جواب دہی میں اس لمحے کی گویا تصویر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے: "پس کیوں جس وقت جان گلے میں آجائے گی تو اس کو واپس لوٹانے کی طاقت تم نہیں رکھتے۔" (فلولا اذا بلغت الحلقوم)[1]
"اور تم اس حالت میں نظارہ کرو گے اور تم سے کچھ نہیں ہو سکے گا۔" (وانتم حینئذ تنظرون)۔ یہاں مخاطب وہ لوگ ہیں جو جاں کنی میں مبتلا فرد کے متعلقین ہیں۔ ایک تو وہ اس کی خستہ حالت کو دیکھیں گے، دوسرے اپنی بے چارگی و ناتوانی کو محسوس کریں گے اور یہ بھی دیکھیں گے کہ موت و حیات خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس پر کسی کا کوئی اختیار نہیں ہے اور وہ اس سے بھی باخبر ہیں کہ ان کا اپنا انجام بھی یہی ہونا ہے۔[2]

اس کے بعد پروردگار عالم مزید فرماتا ہے: "حالانکہ تمہاری نسبت ہم اس کے زیادہ قریب ہیں اور ہمارے فرشتے جو اس کی روح قبض کرنے کے لیے آمادہ ہیں، وہ بھی تمہاری نسبت اس کے زیادہ قریب ہیں لیکن تم نہیں دیکھتے۔" (ونحن اقرب الیہ منکم و لکن لا تبصرون)۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ جاں کنی میں مبتلا شخص کی جان پر کیا گزر رہی ہے اور اس کے وجود کی گہرائی میں کیسا تلاطم برپا ہے اور وہ ہم ہی ہیں جس نے اس کی روح کے قبض کرنے کا معین وقت پر فرمان جاری کیا ہے لیکن تم تو صرف اس کے ظاہری حالات کو دیکھتے ہو اور اس گھر سے دوسرے گھر کی طرف انتقال سے اور ان طوفانوں سے جو اس وقت برپا ہیں، تم بے خبر ہو۔ اس بنا پر اس آیت سے مراد خدا کا جاں کنی میں مبتلا فرد سے قریب ہونا ہے۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس سے مراد روح قبض کرنے والے فرشتہ کا نزدیک ہونا ہے لیکن پہلی تفسیر آیت کے ظاہر سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ بہرحال نہ صرف اس موقع پر بلکہ ہر حالت میں خدا ہر شخص کی نسبت ہم سے زیادہ نزدیک ہے یہاں تک کہ وہ خود ہم سے بھی ہم سے زیادہ نزدیک ہے۔ اگرچہ ہم بے خبری کی وجہ سے اس سے دور ہیں۔

---

[1] آیت محذوف رکھتی ہے جس کا گزشتہ آیات سے استفادہ ہوتا ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ (فلولا اذا بلغت الحلقوم لا ترجعونها ولا تملکون شیئاً)۔ یہاں فعل کا مؤنث ہونا اس بنا پر ہے کہ وہ نفس کی طرف لوٹتا ہے۔

[2] یہ جو بعض مفسرین نے احتمال پیش کیا ہے کہ یہاں مخاطب جاں کنی میں مبتلا ہونے والا شخص ہے، بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ بعد والی آیت واضح کرتی ہے کہ مخاطب اس کے متعلقین اور اردگرد بیٹھنے والے افراد ہیں۔

اس حقیقت کا اظہار جاں کنی کے موقع پر دیگر تمام موقعوں کی نسبت زیادہ واضح و آشکار ہے۔ اس کے بعد مزید تاکید کے لیے اور اس حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے مزید فرماتا ہے: " اگر تمہیں تمہارے اعمال کی بالکل جزا نہ دی جائے۔ (فلولا ان کنتم غیر مدینین)" تو پھر اس کو واپس لوٹا دو اگر تم سچے ہو" (ترجعونھا ان کنتم صادقین)۔ یہ تمہارا ضعف اس بات کی دلیل ہے کہ موت و حیات کا مالک کوئی اور ہے اور جزا و سزا کسی اور کے ہاتھ میں ہے اور وہ وہی ہے کہ جو مارتا اور زندہ کرتا ہے۔" مدینین " جمع ہے " مدین " کی۔ یہ دین کے مادہ سے ہے جس کے معنی جزا ہیں۔ بعض نے اس کے معنی مربوبین بتائے ہیں یعنی اگر اب تمہارا کوئی اور نہیں ہے اور اپنے امر کے تم خود ہی مالک ہو تو اس کو واپس لوٹا دو۔ یہ خود اس امر کی دلیل ہے کہ تم کسی اور کے محکوم ہو۔

چند نکات

۱۔ جبّارین کی ناتوانی کا لمحہ

حقیقت میں ان آیات کا مقصودِ کلام یہ ہے کہ موت و حیات کے مسئلہ پر خدا کے اختیار کو بیان کیا جائے تاکہ اس سے مسئلہ معاد تک ایک پُل بنایا جا سکے۔ اس موقع پر موت اور جاں کنی کا انتخاب انسان کی مکمل ناتوانی اور اس کے ضعف کے ظہور کی وجہ سے ہے۔ باوجود اس تمام اختیار کے جس کو وہ اپنے لیے خیال کرتا ہے، یہ امر معیوب نہیں کہ بعض ایسے جبّار لوگوں کی طرف ہم توجہ کریں جن کے اوجِ قدرت و اختیار میں ان کی موت کا لمحہ آیا ہے تاکہ ان آیتوں کی گہرائی زیادہ آشکار ہو۔ مسعودی نے مروج الذہب میں مامون اور اس کی فوج کی روم سے جنگ کے بارے میں ایک داستان بیان کی ہے جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔ مامون جس وقت میدان جنگ سے لوٹ رہا تھا تو وہ "بدیدون" نامی چشمے پر پہنچا جو قشیرہ کے علاقہ میں مشہور ہے۔ آرام کرنے کی غرض سے اس نے وہاں پڑاؤ کیا۔ اس چشمے کے پانی کی صفائی، ٹھنڈک اور چمک نے اسے بہت مسرور کیا اور اس طرح وہ اس علاقہ کی شادابی، تازگی اور بشاشت سے بہت خوش ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ درختوں کو کاٹ کر چشمہ پر ایک پُل بنا دیں اور اس پر لکڑیوں اور پتوں سے ایک چھت بنا دیں۔ وہ وہاں آرام کرنے لگا اس حالت میں کہ پانی اس کے پاؤں کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ پانی اس قدر صاف و شفاف تھا کہ اس نے ایک درہم پانی کے اندر پھینکا جو پانی کی تہہ میں پہنچ گیا لیکن اس پر جو تحریر کندہ تھی وہ صاف پڑھی جا رہی تھی۔ پانی اس قدر ٹھنڈا تھا کہ کوئی اس میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ اسی اثنا میں ایک مچھلی جو خاصی بڑی تھی، تقریباً ایک ہاتھ کے برابر ہوگی، وہ ظاہر ہوئی۔ مچھلی بالکل ایک چاندی کے ٹکڑے کی طرح تھی۔ مامون نے کہا جو شخص اس کو پکڑ کر لائے گا میں اس کو تلوار انعام میں دوں گا۔ ایک خدمت گار نے پیش قدمی کی اور اس کو پکڑ لیا۔ جس وقت اس مچھلی کو وہ مامون کی خدمت میں لایا تو مچھلی نے ہلنا شروع کر دیا اور وہ خدمت گار کے ہاتھ سے نکل کر باہر گر پڑی اور ایک پتھر کے ٹکڑے کی طرح پانی میں گر گئی۔ اس کے گرنے سے تھوڑا سا پانی مامون کے گلے، سینے اور شانوں پر پڑا اور اس کا لباس خاصا بھیگ گیا۔ خدمت گار دوبارہ پانی میں اُتر گیا اور اس نے مچھلی کو پکڑ لیا اور اس کو ایک رومال میں لپیٹ کر مامون کے سامنے رکھ دیا اس حالت میں کہ وہ مچھلی حرکت کر رہی تھی۔ مامون نے کہا ابھی ابھی اسے بھون کر سُرخ کرو۔ اسی اثنا میں مامون اچانک سردی کی وجہ سے کانپنے لگا اور حالت یہ ہوئی کہ وہ دو قدم چل نہیں سکتا تھا۔ اُسے کئی لحاف اوڑھائے گئے مگر وہ پھر بھی کپکپاتا رہا۔ وہ چلّا رہا تھا سردی سردی۔ اس کے لیے آگ جلائی گئی پھر بھی اسے افاقہ نہ ہوا۔ اسی اثنا میں مچھلی سُرخ کر کے اس کے لیے لے آئے لیکن وہ اس کو چکھ بھی نہ سکا۔ جب اس کی حالت زیادہ خراب ہو گئی تو بختیشوع اور ابن ماسویہ جو دونوں شاہی طبیب تھے طلب کیے گئے اس وقت مامون

نزع کے عالم میں تھا۔ بختیشوع نے اس کا ایک ہاتھ اور ابنِ ماسویہ نے دُوسرا ہاتھ پکڑ کر اس کی نبض دیکھی جو مکمل طور پر غیر معتدل تھی اور اس کی موت کی خبر دے رہی تھی۔ اس حالت میں اُسے ایک خاص قسم کا پسینہ آ رہا تھا جو تیل کی طرح چپکنے والا تھا۔ یہ دونوں طبیب اس کی تشخیص میں منہمک تھے۔ ان دونوں نے اقرار کیا کہ انہوں نے ایسی کسی مرض کی تعلیم حاصل نہیں کی۔ بہرحال جو صورتِ حال ہے وہ اس کی موت کی خبر دیتی ہے۔ مامون کی حالت اور زیادہ خراب ہوگئی تو کہنے لگا مجھے کسی اُونچی جگہ لے چلو جہاں سے میں اپنے لشکر کو دیکھ سکوں۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔ اسے اُونچی جگہ پر لے جایا گیا۔ وہاں سے جب اس نے اپنے لشکریوں کے خیموں اور اس بہت سی آگ کو دیکھا جو لشکر نے اپنے پڑاؤ میں روشن کر رکھی تھی تو اس نے کہا: یا من لایزول ملکه ارحم من قد زال ملکه ۔ اے وہ خدا جس کی حکومت کو کبھی زوال نہیں ہے اس پر رحم کر جس کی حکومت رو بہ زوال ہے۔ اس کے بعد اُسے اُٹھا کر لائے اور بستر پر لٹا دیا گیا اور ایک شخص کو اس کے پاس بٹھایا جو اسے شہادتین کی تلقین کرے۔ چونکہ مامون کی سماعت کمزور ہو چکی تھی، اس شخص نے اپنی آواز بلند کی تو ابن ماسویہ نے کہا فریاد نہ کر اور اُونچی آواز نہ نکال خدا کی قسم وہ اس وقت خدا اور "مانی" کے درمیان فرق نہیں کر سکتا۔ اس وقت مامون نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے اتنے سُرخ ہو چکے تھے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے ہاتھ سے ابن ماسویہ کی خبر لے لیکن اس پر اُسے قدرت نہ تھی۔ بس اسی لمحہ اس کی جان نکل گئی۔[1]

ہو سکتا ہے کہ اس کی بیماری پہلے سے ہو یا بعض مؤرخین کے بقول جو شخص اُس چشمے کا پانی پیتا تھا بیمار ہو جاتا تھا۔ وہ مچھلی زہریلے اثرات رکھتی تھی۔ جو کچھ بھی تھا اُس کی حکومت و قدرت چند لمحوں میں ختم ہوگئی اور بڑے بڑے جنگ کے میدانوں کا قہرمان و سپہ سالار موت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوگیا۔ اس لمحے کسی میں قدرت نہ تھی کہ وہ اس کے لیے کوئی قدم اُٹھائے یا کم از کم اسے اس کی اصل منزل یعنی اس کے گھر تک لے جائے۔ تاریخ کے دامن میں اس قسم کی بہت سی عبرت انگیز داستانیں ہیں۔

۲۔ کیا جانکنی تدریجی امر ہے؟

جان کے گلے تک پہنچنے کی تعبیر جو گزشتہ آیات میں آئی ہے (فلولا اذا بلغت الحلقوم) وہ زندگی کے آخری لمحات کا کنایہ ہے۔ شاید اس کا منشا یہ ہے کہ زیادہ تر اعضائے بدن ہاتھ پیر وغیرہ موت کے وقت باقی اعضا سے پہلے بیکار ہو جاتے ہیں اور گلا وہ عضو ہے جو سب سے آخر میں بیکار ہوتا ہے سورہ قیامۃ کی آیت ۲۶ میں ہم پڑھتے ہیں۔ (کلا اذا بلغت التراقی) کفار کبھی ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ رُوح ان کی (ترقوه) ہنسلی کی ہڈی تک پہنچ جائے۔ (ترقوه وہ ہڈیاں ہیں جو حلق کے اطراف کو گھیرے ہوئے ہیں)۔

---

[1] مروج الذھب مطابق نقل سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۴۴

۸۸۔ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۙ

۸۹۔ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ڏ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ۝

۹۰۔ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۙ

۹۱۔ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۭ

۹۲۔ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّاۗلِّيْنَ ۙ

۹۳۔ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ۙ

۹۴۔ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ۝

۹۵۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ۚ

۹۶۔ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۧ

ترجمہ

۸۸۔ لیکن اگر وہ مقربین میں سے ہو۔

۸۹۔ تو رُوح و ریحان اور ہر نعمت بہشت میں ہے۔

۹۰۔ اور اگر اصحاب یمین میں سے ہے۔

۹۱۔ تو اس سے کہا جائے گا تجھ پر سلام ہو تیرے دوستوں کی طرف سے جو اصحاب یمین میں سے ہیں۔

۹۲۔ لیکن اگر وہ تکذیب کرنے والے گمراہوں میں سے ہو۔

۹۳۔ تو دوزخ کے جوش دیے ہوئے پانی سے اس کی تواضع ہوگی۔

۹۴۔ اس کے بعد اس کی سرنوشت یہ ہوگی کہ اس کا دوزخ میں ورُود ہوگا۔

۹۵۔ یہ وہی حق و یقین ہے۔

۹۶۔ اَب جب کہ ایسا ہے تو اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کر اور اُسے پاک شمار کر۔

تفسیر

نیکوکاروں اور بدکاروں کا انجام

یہ آیات اس سُورہ کی ابتدائی اور آخری آیات کا ایک قسم کا امتزاج ہیں۔ یہ آیتیں جب انسان موت کے آستانے پر ہو تو اس کی حالت کے تغیّر کی تصویرکشی کرتی ہیں کہ کس طرح بعض لوگ انتہائی آرام وسکون اور راحت و خوشی کے ساتھ اس دُنیا سے رُخصت ہوتے ہیں۔ اور ایک وہ گروہ ہے جو جہنم کی آگ کے دُور سے نظر آنے والے نظارے کی وجہ سے انتہائی اضطراب و وحشت کے عالم میں جان دیتے ہیں۔ پہلے فرماتا ہے: "جس شخص پر جاں کنی کا عالم طاری ہوتا ہے اگر وہ مقربین میں سے ہو (فاما ان کان من المقربین)۔ تو وہ انتہائی راحت و آرام میں ہے اُسے نعمتوں سے لبریز جنّت میں جگہ مل جائے گی۔ (فروح و ریحان وجنّة نعیم)۔

"روح" بروزن "قول" جیساکہ علمائے لغت نے کہا ہے اصل میں تنفس کے معنوں میں ہے۔ اور ریحان خوشبودار گھاس یا کسی خوشبودار چیز کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ لفظ ہر اس چیز کے لیے بولا گیا ہے جو سبب حیات و راحت ہو۔ جیساکہ "ریحان" ہر قسم کی نعمت اور فرحت بخش روزی کے لیے بولا جاتا ہے۔ اِس بنا پر روح و ریحان انسان کے آرام کے تمام وسائل اور خدائی نعمت و برکت پر محیط ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ رُوح ان تمام امور کی طرف اشارہ ہے جو انسان کو تکالیف سے رہائی بخشیں تاکہ وہ سُکھ کا سانس لے سکے۔ باقی رہا "ریحان"، تو وہ ان نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو تکالیف سے رہائی کے بعد انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ اسلامی مفسّرین نے ان ہر دو الفاظ کے لیے متعدد تفسیریں تجویز کی ہیں جو غالباً دس تفسیروں سے زیادہ ہیں۔ کبھی انہوں نے کہا ہے کہ "رُوح" کے معنی رحمت اور ریحان ہر شرافت و فضیلت کو کہتے ہیں۔ اور کبھی کہا ہے کہ "روح" جہنم کی آگ سے نجات کو اور "ریحان" جنّت میں داخلہ کو کہتے ہیں اور کبھی "روح" اس آرام و سکون کو کہتے ہیں جو قبر میں میسّر آئے۔ اور "ریحان" کے معنی وہ سکون ہے جو بہشت میں حاصل ہو۔ کبھی "رُوح" سے مراد کشف الکروب (بے آرامیوں کا برطرف ہونا) لیا ہے اور "ریحان" کی تفسیر غفران الذنوب کی ہے۔ کبھی "روح" کو (النظر الی وجہ اللہ) اور "ریحان" کو استماع کلام اللہ شمار کیا ہے اور اس قسم کی بہت سی تفسیریں کی گئی ہیں لیکن جیساکہ ہم نے

کہا ہے۔ یہ سب اس جامع مفہوم کے مصداق ہیں جن کا ذکر آیت کی تفسیر میں ہوا۔ قابل توجہ یہ ہے کہ "روح" اور "ریحان" کے ذکر کے بعد جنت نعیم کی گفتگو درمیان میں لائی گئی ہے جو ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ "روح و ریحان" موت کے وقت اور قبر و برزخ اور بہشت میں مومن کو حاصل ہوں گے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

فاما ان کان من المقربین فروح و ریحان یعنی فی قبره وجنة نعیم یعنی فی الآخرة۔

"لیکن اگر مقربین میں سے ہو تو اس کے لیے قبر میں روح و ریحان ہے اور اس کے لیے آخرت میں پُر نعمت بہشت ہے۔"[۱، ۲]

اس کے بعد پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "لیکن اگر دوسرے گروہ یعنی اصحاب یمین میں سے ہو (وہی نیک اور صالح مرد اور عورتیں جن کے نامۂ اعمال کامیابی اور قبولیت کی نشانی کے طور پر ان کے دائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے)۔ (واما ان کان من اصحاب الیمین)۔ تو اس سے کہا جائے گا تجھ کو تیرے ان دوستوں کی طرف سے سلام ہو جو اصحاب یمین میں سے ہیں۔ (فسلام لك من اصحاب الیمین)۔ اس طرح رُوح قبض کرنے والے فرشتے انتقال کے وقت اس کے دوستوں کا سلام اسے پہنچائیں گے جیسا کہ اس سورہ واقعہ کی آیت ۲۶ میں اہل بہشت کی تعریف و توصیف میں ہم نے پڑھا ہے (الا قیلاً سلاماً سلاماً) اس آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی موجود ہے، اور وہ یہ کہ یہ سلام فرشتوں کی طرف سے ہو جو اس سے کہیں گے تجھ پر سلام ہو اے وہ شخص جو اصحاب یمین میں سے ہے یعنی تیرے اعزاز و افتخار و تعریف و توصیف کے لیے یہی کافی ہے کہ تو ان کی صف میں قرار پایا ہے۔[۳]

دوسری قرآنی آیات میں بھی مومنین کو موت کے موقع پر فرشتوں کا سلام آیا ہے مثلاً سورہ نحل کی آیت ۳۲ جس میں پروردگارِ عالم فرماتا ہے: الذین تتوفاهم الملٰئکة طیبین یقولون سلام علیکم ادخلوا الجنة بما کنتم تعملون۔

"وہ لوگ کہ فرشتے جن کی رُوحوں کو قبض کرتے ہیں درآنحالیکہ وہ پاک و پاکیزہ ہیں۔ وہ ان سے کہتے ہیں تم پر سلام ہو، جنت میں داخل ہو جاؤ ان اعمال کی بنیاد پر جنہیں تم انجام دیتے تھے۔"

یہ سلام کی تعبیر بہت پُرمعنی ہے چاہے وہ سلام فرشتوں کی طرف سے ہو چاہے اصحاب یمین کی طرف سے۔ وہ سلام جو "روح و ریحان" اور ہر قسم کی سلامتی و سکون و آرام ہے اور نعمت کی نشانی ہے۔[۴]

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اصحاب الیمین (وہ لوگ جن کے نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے) کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ عام طور پر انسان اپنے اہم اور ماہرانہ کام دائیں ہاتھ سے انجام دیتا ہے لہٰذا دایاں ہاتھ مہارت، توانائی اور کامیابی کی علامت ہے۔

۱۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۲۸ حدیث ۱۰۳، ۱۰۴۔

۲۔ "روح" ہو سکتا ہے مبتدائے محذوف کی خبر ہو اور تقدیر عبارت یہ ہو: (فجزائه روح) اور یا مبتدا ہے خبر محذوف ہے اور تقدیر عبارت (فله روح) ہے اور پورا جملہ فروح .... اما کی جزا ہے اور ان شرطیہ اس جزا کے ہوتے ہوئے دوسری جزا سے مستغنی ہے (غور فرمایئے)

۳۔ اس بنا پر آیت میں دو تقدیریں ہیں۔ اس شکل میں یا یقال له سلام لك انك من اصحاب الیمین لیکن پہلی تفسیر کی بنا پر صرف ایک ہی تقدیر ہے اور وہ (یقال له)۔

۴۔ ان سلاموں کے بارے میں جو جنتیوں پر نثار ہوں گے جلد ۱۸ ص ۲۰۴ سورہ یٰسین کی آیت ۵۸ کے ذیل میں تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا :

(ھو شیعتنا و محبونا)

" اصحاب یمین ہمارے شیعہ اور ہمارے دوست ہیں " [1]

اس کے بعد ہم تیسرے گروہ کو عنوانِ کلام بناتے ہیں جنہیں سُورہ کے اوائل میں اصحاب شمال کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ پروردگار عالم فرماتا ہے : " لیکن اگر وہ تکذیب کرنے والے گمراہوں میں سے ہو " (واما ان کان من المکذبین الضالین)۔ تو اس کی دوزخ کے کھولتے ہوئے اور زہریلے پانی سے ضیافت و پذیرائی ہوگی۔ (فنزل من حمیم) [2]

اور اس کے بعد اس کی قسمت یہ ہے کہ اس کا جہنم میں ورود ہوگا " (وتصلیة جحیم)۔ جی ہاں موت کی آمد پر خدا کی طرف سے نازل ہونے والے ابتدائی عذاب وہ چکھیں گے اور قبر و برزخ میں قیامت کے عذابوں کے تلخ ذائقے ان کے حصہ میں آئیں گے اور چونکہ گفتگو محتضر کے بارے میں ہے مناسب یہ ہے کہ " فنزل حمیم " کا جملہ برزخ کے عذاب کے بارے میں ہے اور " وتصلیة جحیم " قیامت کے عذاب کی طرف اشارہ ہے۔ یہ معنی متعدد روایات میں آئمہ اہل بیت ؑ سے منقول ہیں [3]

قابل توجہ یہ ہے کہ مکذبین اور ضالین کا ذکر ایک جگہ ہوا ہے جن میں سے پہلے کا تعلق قیامت، خداوند یکتا اور نبوّت پیغمبر کی تکذیب سے ہے اور آیت میں اسی طرف اشارہ ہے اور دوسرے کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو راہِ حق سے منحرف ہوگئے ہیں۔ یہ تعبیر اس کے علاوہ کہ تاکید کے معنوں میں ہے، اس نکتہ کی طرف اشارہ بھی ہو سکتی ہے کہ گمراہوں کے درمیان ایسے مستضعف و جاہل اور قاصر افراد بھی ہیں جو حق سے عناد نہیں رکھتے، نہ ہٹ دھرمی کا شکار ہیں تو اس بات کا امکان ہے کہ ان کے حال پر اللہ کا لُطف و کرم ہو۔ لیکن ایسے تکذیب کرنے والے جو حق سے عناد رکھتے ہوں اور ہٹ دھرم ہوں اُن کا نصیب وہی ہوگا جو اُوپر بیان ہو چکا ہے۔ " حمیم " کھولتے ہوئے پانی یا گرم اور زہریلی ہواؤں کے معنی میں ہے اور تصلیہ کا مادّہ " صلی " (بروزن سعی) ہے اس کے معنی جلنا اور آگ میں داخل ہونا ہے۔ باقی متعدی رہا وہ تصلیہ جو متعدی کے معنی رکھتا ہے وہ صرف جلانے کے معنی میں آتا ہے۔ اس گفتگو کے آخر میں مزید فرماتا ہے : " یہ وہی حق و یقین ہے " (انّ ھٰذا لھو حق الیقین)۔ اَب جب کہ معاملہ اس طرح ہے تو اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کر اور اُسے منزّہ شمار کر " (فسبح باسم ربك العظیم)۔ مفسّرین کے درمیان یہ مشہور ہے کہ (حق الیقین) اضافتِ بیانیہ کے قبیل میں سے ہے۔ یعنی جو کچھ مقربین، اصحاب یمین اور تکذیب کرنے والے تین گروہوں کے بارے میں کہا گیا ہے وہ عین واقعیت و حق و یقین ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ چونکہ یقین کے کئی مدارج ہیں اس کا اعلیٰ درجہ حق الیقین ہے۔ واقعی یقین جو مکمل ہو اور ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہو [4]

---

[1] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۲۸۵

[2] نزل مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے۔ (فجزائه نزل من حمیم) یا مبتدا ہے محذوف خبر کا اور تقدیر عبارت یوں ہے (فله نزل من حمیم) ۔

[3] نورالثقلین جلد ۵ ص ۲۲۹

[4] اس تفسیر کے مطابق حق کی اضافت یقین کی طرف اختصاص و تقئید کے لیے ہے۔ بعض نے اسے موصوف کی صفت کی طرف اضافت کے قبیل میں سے سمجھا ہے اور کہا ہے کہ (الیقین الحق) وہ یقین جو حق ہے یہ ان معنوں میں ہے۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے ضمنی طور پر معلوم ہوگیا ہے کہ اس آیت میں لفظ ھٰذا تین گروہوں کے حالات کی طرف اشارہ ہے جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ بعض نے یہ احتمال تجویز کیا ہے کہ سورہ واقعہ کے سارے موضوعات و مضامین کی طرف اشارہ ہے یا سارے قرآن کی طرف اشارہ ہے لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ " فسبح " (پس تسبیح کر) کی تعبیر فا تفریع کے ساتھ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جو کچھ ان تین گروہوں کے بارے میں کہا گیا ہے وہ عین عدالت ہے۔ لہٰذا اس بنا پر اپنے خدا کو ہر قسم کے ظلم اور بے انصافی سے پاک و منزّہ شمار کر یا یہ کہ اگر تو چاہتا ہے کہ تیسرے گروہ کی حالتِ زار سے دوچار نہ ہو تو خدا کو ہر قسم کے شرک و ناانصافی سے، جو انکارِ قیامت کا لازمہ ہیں، پاک و منزّہ سمجھ۔ بہت سے مفسّرین نے آخری آیت کے ذیل میں تحریر کیا ہے کہ اس کے نزول کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اجعلوھا فی رکوعکم " اس کو اپنے رکوع میں قرار دو" (اور سبحان ربی العظیم کہو)۔ اور جس وقت سبّح اسم ربك الاعلیٰ نازل ہوا تو فرمایا: اجعلوھا فی سجودکم " اسے اپنے سجدے میں قرار دو" (سبحان ربی الاعلیٰ کہو)[1]

اسی سورہ کی آیت ۷۴ کی تفسیر میں بھی ہم نے اس روایت سے مشابہ روایتیں مفسّرین کی جانب سے نقل کی ہیں۔

ایک نکتہ

عالمِ برزخ

اُوپر والی آیات ان آیات میں سے ہیں جو عالمِ برزخ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ ہم ان آیات کی تفسیر میں کہہ چکے ہیں کہ موت کے آستانے پر پہنچ کر جب انسان دوسرے جہان کی طرف انتقال کے لیے آمادہ ہوگا تو درج ذیل حالات میں سے کسی حالت سے دوچار ہوگا۔ اسے خدا کی نعمتیں میسّر ہوں گی۔ اس کے حال پر اللہ کا لطف و کرم ہوگا۔ اعمال کی جزا ملے گی اور "روح و ریحان" سے ہمکنار ہوگا یا اسے دردناک سزائیں ملیں گی اور عذابِ الٰہی اس پر نازل ہوگا۔ آیت میں موجود قرائن یہ بتاتے ہیں کہ ان میں سے ایک حصّہ قیامت سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرے کا تعلق قبر و برزخ سے ہے اور یہ خود اس عالم کے وجود پر ایک دلیل شمار ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے منقول ہے کہ پہلی چیز جس کی مومن کو موت کے وقت بشارت دی جائے گی وہ "روح و ریحان" ہیں اور نعمتوں سے پُر جنّت ہے اور پہلی چیز جس کی مومن کو قبر میں بشارت دی جائے گی، خوشنودئ خدا کی بشارت ہوگی۔ اس سے کہا جائے گا ہم تجھے جنّت میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ خدا نے ان تمام افراد کو بخش دیا ہے جنہوں نے تیرے جنازے کی مشایعت کی ہے اور تیرے بارے میں جو انہوں نے شہادت دی ہے اللہ نے اس کی تصدیق کر دی ہے اور تیرے بارے میں ان کی دُعائے مغفرت کو مستجاب کیا ہے[2]

ایک اور حدیث میں امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ انسان جس وقت ایّامِ دنیا میں سے آخری دن اور ایّامِ آخرت میں سے پہلے دن کی منزل پر پہنچے گا تو اس کی دولت، اولاد اور اعمال اس کے سامنے مجسّم ہو کر آئیں گے۔ وہ اپنے اعمال سے کہے گا میں

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی، روح المعانی، روح البیان، قرطبی، درالمنثور اور تفسیر مراغی در ذیل آیت زیرِ بحث۔

[2] تفسیر درالمنثور جلد ۶ ص ۱۶۶۔

تمہارے معاملہ میں بالکل بے پرواہ تھا۔ اگرچہ تم مجھ پر گراں تھے۔ اَب تم میرے متعلق کیا خبر رکھتے ہو تو اس کا عمل اس سے کہے گا"میں قبر میں اور قیامت میں تیرا ہم نشین ہوں تاکہ میں اور تو دونوں حضور پروردگارِ عالم میں پیش ہوں"۔ اس کے بعد امام نے مزید فرمایا: "اگروہ خُدا کا دوست ہوگا تو اس کا عمل بہت ہی خوشبودار انسان کی شکل میں، انتہائی خوبصورتی کے عالم میں، نہایت پُرکشش لباس پہنے ہوئے آئے گا اور کہے گا تجھے سکون وآرام ونعمت وموہبت اور پرنعمت جنّت کی خوشخبری ہو۔ تیرا خیر مقدم کیا جائے گا۔ تو وہ انسان سوال کرے گا کہ تُو کون ہے۔ وہ اس کے جواب میں کہے گا: مَیں تیرا عمل صالح ہوں۔ مَیں دُنیا سے تیرے ساتھ بہشت کی طرف جاؤں گا"۔[1]

عالم برزخ کے بارے میں زیادہ تفصیل ہم سورۂ مومنون کی آیت ۱۰۰ کے ذیل میں تحریر کرچکے ہیں[2]

اے پروردگار! ہمیں مقربین، اصحاب یمین اور اپنے خالص اولیاء میں شمار کر اور موت کے وقت ہمیں رُوح وریحان اور جنّت نعیم کی نعمتوں سے سرفراز فرما۔

خداوندا! قیامت کا عذاب ایسا دردناک عذاب ہے کہ اسے برداشت کرنے کی کسی میں طاقت نہیں ہے اور تیری بے شمار رحمتیں اور عظیم موہبتیں ہیں جن کا کوئی شخص بھی اپنے عمل سے حقدار نہیں ہوگا۔ اس روز ہمارا سرمایہ صرف تیرا لُطف وکرم ہوگا۔
بارِ الٰہا! قیامتِ کبریٰ اور موت جو قیامتِ صغریٰ ہے، اس کے آنے سے پہلے ہمیں بیدار کردے تاکہ اپنے آپ کو ہم اس عظیم سفر کے لیے آمادہ کرسکیں جو ہمارے سامنے ہے۔ آمین یا ربّ العالمین۔

سُورہ "واقعہ" کا اختتام
۶/ ج ۲/ ۱۴۰۶ھ
۲۷/ ۱۱/ ۱۳۶۴ ش
اختتام ترجمہ ساڑھے پانچ بجے صبح بروز منگل
۱۹ شوال ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۶ جون ۱۹۸۷ء
بر مکان حقیر واقع قم۔ ایران

---

[1] تفسیر نورالثقلین جلد ۵ ص ۲۲۸ حدیث ۱۰۲

[2] تفسیر نمونہ جلد ۸ ص ۱۶۸ تا ص ۱۷۸ ملاحظہ فرمائیں۔

سُورَہ حَدِیدْ

* یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہُوا۔
* اِس میں ۲۹ آیتیں ہیں۔

تاریخ شروع
۸/ ج ۲/ ۱۴۰۶ ھ
۲۹/ ۱۱/ ۱۳۶۴ ش

سُورۂ حدید کے مشمولات

یہ سُورہ ان سُورتوں میں سے ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔ اس کے مدنی ہونے پر مفسرین کا اجماع ہے۔ مدنی سُورتوں کی خصوصیات کے طور پر اعتقادی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے علاوہ اس سورہ نے کئی اجتماعی، حکومتی اور عملی احکام پیش کیے ہیں جن کے نمونے انشاءاللہ ہم آیت ۱۰، ۱۱ اور ۲۵ میں دیکھیں گے۔

۱۔ اس سُورہ کی ابتدائی آیات میں توحید اور صفاتِ خدا کے بارے میں نہایت مدلّل اور دلچسپ بحث ہے۔ خدا کی تقریباً بیس ایسی صفتیں ان میں مذکور ہیں جن کا ادراک انسان کو معرفتِ خدا کی ایک بلند منزل پر فائز کرتا ہے۔

۲۔ دوسرا حصّہ قرآن سے متعلق ہے اور اس نورِ الٰہی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جو شرک کی تاریکیوں میں چمکا۔

۳۔ تیسرا حصّہ قیامت میں مومنین اور منافقین کی جو کیفیت ہوگی اس پر مشتمل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ پہلا گروہ نورِ ایمان کے سائے میں باغِ فردوس کی طرف گامزن ہو جاتا ہے اور دوسرا گروہ شرک کی ظلمتوں میں محصور رہ جاتا ہے۔ اس سورہ میں یہ دونوں مباحث ہیں۔ اس طرح سُورہ میں اسلام کے تین بُنیادی اصول توحید، نبوّت اور قیامت نہایت خُوبی سے بیان ہوئے ہیں۔

۴۔ ایک اور حصّہ میں قبولِ ایمان کی دعوت دی گئی ہے اور شرک سے دستبردار ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس حصّہ میں گزشتہ کافر قوموں میں سے ایک قوم کا احوال بھی پیش کیا گیا ہے۔

۵۔ سُورہ کا اہم حصّہ یہ ہے کہ اس میں راہِ خدا میں انفاق پر زور دیا گیا ہے، جہاد فی سبیل اللہ کی اہمیّت کو واضح کیا گیا ہے اور مالِ دنیا کے بے قدر و قیمت ہونے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۶۔ یہ مختصر سا حصّہ ہے لیکن نہایت مدلّل ہے۔ اس میں عدالتِ اجتماعی پر گفتگو ہوئی ہے جو انبیاءؑ کے مقاصد میں سے ایک مقصد ہے۔

۷۔ آخری حصّہ میں رہبانیت اور اجتماعی طور پر گوشہ نشینی اختیار کرنے کے مسئلہ پر بحث کے ساتھ اس کی مذمّت کی گئی ہے اور اسلامی نقطۂ نظر کا اس سے اختلاف واضح کیا گیا ہے۔

ان مباحث کے درمیان کچھ اور نکات بھی بڑی مناسبت کے ساتھ زیرِ بحث آئے ہیں اور آخر میں ایک خوابِ غفلت سے بیدار کرنے والا اور ہدایت بہم پہنچانے والا مجموعہ احکام تشکیل پاتا ہے۔

اس سورہ کا نام جو حدید رکھا گیا ہے وہ اس تعبیر کی بنا پر ہے جو آیہ ۲۵ میں آئی ہے۔

سُورۂ حدید کی تلاوت کی فضیلت

روایاتِ اسلامی میں اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت کے سلسلہ میں قابلِ ذکر باتیں سامنے آئی ہیں۔ تلاوت محض تلاوت نہیں بلکہ ایسی تلاوت جس میں غور و فکر اور تدبر و تفکر کا عنصر شامل ہو اور جو تحریکِ عمل کو اپنے ہمراہ لیے ہوئے ہو۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی ایک حدیث میں منقول ہے کہ (من قرأ سورة الحديد كتب من الذين اٰمنوا بالله ورسوله) "جو سورہ حدید پڑھے گا وہ ان لوگوں کے زمرہ میں شمار ہوگا جو خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان رکھتے ہیں[1]"

ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے منقول ہے کہ آپؐ سونے سے پہلے مسبّحات کی تلاوت فرماتے تھے۔ مسبّحات وہ سُورتیں ہیں جو سبّح للّٰه یا یسبّح للّٰه سے شروع ہوتی ہیں اور وہ پانچ سُورتیں ہیں۔ سُورہ حدید، حشر، صف، جمعہ اور تغابن۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے (انّ فيهنّ اٰية افضل من الف اٰية) ان میں ایک ایسی آیت ہے جو ہزار آیتوں سے افضل و برتر ہے[2]

البتہ آپ نے اس آیت کو معیّن نہیں فرمایا لیکن بعض مفسّرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس سے مراد سُورہ حشر کی آخری آیت ہے اگرچہ اس سلسلہ میں انہوں نے کوئی واضح دلیل پیش نہیں کی۔

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السّلام سے منقول ہے کہ من قرأ المسبحات كلها قبل ان ينام لم يمت حتّٰى يدرك القائم وان مات كان فى جوار رسول الله

"جو شخص مسبّحات کی تلاوت کرے تو وہ اس وقت تک دُنیا سے نہیں اُٹھے گا جب تک حضرت مہدیؑ کا ظہور نہ ہو جائے اور اگر اس سے پہلے وہ دُنیا سے اُٹھ گیا تو دوسرے جہان میں رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہمسایہ ہوگا[3]۔

---

[1] "مجمع البیان" آغاز سورہ حدید۔

[2] مجمع البیان آغاز سورہ حدید و در المنثور جلد ۶ ص ۱۷۰۔

[3] مجمع البیان آغاز سورہ حدید۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

۲۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

۳۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب خدا کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ عزیز و حکیم ہے۔

۲۔ آسمانوں اور زمین کی مالکیت (و حاکمیّت) اس کے لیے ہے وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

۳۔ اوّل و آخر اور ظاہر و باطن وہی ہے اور وہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔

تفسیر

گہری فکر رکھنے والوں کی علامات

ہم بیان کرچکے ہیں کہ یہ سورہ توحید اور صفاتِ باری تعالیٰ کے بیان سے شروع ہوا ہے۔ وہ صفتیں جو بیان ہوئی ہیں وہ تعداد میں بیس ہیں۔ یہ صفات ایسی ہیں کہ ان کی معرفت انسان کی سطحِ فکر کو بلند کرتی ہے اور وہ اپنے رب سے رُوشناس ہو جاتا ہے۔ ان صفتوں میں سے ہر ایک پروردگارِ عالم کی صفاتِ جلال و کمال کے کسی گوشہ کو لیے ہوئے ہے اور صاحبانِ فکر و نظر اس میں جس قدر غور و فکر کرتے ہیں انہیں نئے حقائق دستیاب ہوتے ہیں جیسا کہ ایک حدیث میں امام علی بن الحسین علیہ السلام سے یہ بات سُننے میں آئی ہے کہ جس وقت آپ سے لوگوں نے توحیدِ الٰہی کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

ان الله عزّ وجل علم انه يكون فى آخر الزمان اقوام متعمقون فانزل الله تعالىٰ " قل هو الله احد" والأيات من سورة الحديد، الىٰ قوله " عليم بذات الصدور"، فمن رام وراء ذالك فقد هلك ـ

" خداوند تعالیٰ جانتا تھا کہ آخری زمانے میں کچھ قومیں آئیں گی جو مسائل میں غور و فکر سے کام لیں گی لہٰذا خدا نے سُورہ قل ھو اللہ اور سُورہ حدید کی ابتدائی آیات علیم بذات الصدور تک نازل فرمائیں۔ پس جو شخص اس سے ہٹ کر کسی اور شے کا طالب ہو گا وہ ہلاک ہو جائے گا[1]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیتوں سے طالبانِ حقیقت کو خدا کی ممکن معرفت کے بیشتر حصّہ پر عبور ہو جاتا ہے۔ بہرحال اس سُورہ کی پہلی آیت خدا کی تسبیح سے شروع ہوتی ہے ارشاد ہوتا ہے: جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے وہ ہمیشہ خدا کی تسبیح کرتا ہے اور وہی ایسا قادر ہے جسے کبھی شکست نہیں ہوتی اور وہ حکیم علی الاطلاق ہے۔ سبّح لله ما فى السماوات والارض و هو العزيز الحكيم) ۔ گزشتہ سورہ تسبیح کے حکم کے ساتھ ختم ہوا ہے اور یہ سورہ تسبیح الٰہی سے شروع ہو رہا ہے اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ سورتیں جو خدا کی تسبیح سے شروع ہوتی ہیں اور جنہیں مسبحات کہتے ہیں ان میں تین مواقع ایسے ہیں کہ جہاں تسبیح کا ذکر ماضی کے صیغے سَبَّحَ سے شروع ہوا ہے۔ (حدید، حشر اور صف) اور دو مواقع ایسے ہیں کہ وہاں صیغہ مضارع استعمال ہوا ہے۔ یعنی یسبّح (جمعہ اور تغابن) تعبیر کا یہ فرق شاید اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کہ گزشتہ اور آئندہ یعنی ہمیشہ اس جہان کے موجودات اس ذاتِ اقدس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں۔ یہ تسبیح ہوتی رہی تھی، ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ تسبیح سے مراد خدا کی ذات کو ہر عیب و نقص سے پاک قرار دینا ہے[2]

---

[1] اصول کافی مطابق نقل تفسیر نورالثقلین ج ۵ ص ۲۳۱

[2] " تسبیح " "سبح "(بروزن مدح) کے مادّہ سے ہے جس کے معنی پانی اور ہوا کی تیز حرکت ہے تسبیح بھی پروردگار کی عبادت کی راہ میں حرکت سریع ہے (مفرداتِ راغب)

اور تمام موجوداتِ عالم کی یہ گواہی کہ خدا تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے یا تو اس بنا پر ہے کہ ان سب کے نظامِ حیات میں اس طرح کی حکمت و دانائی اور ایسے نظم و نسق، حساب و کتاب اور عجائب و غرائب موجود ہیں جو سب کے سب زبانِ حال سے ذکرِ پروردگار کرتے ہیں اور اس کی تسبیح و حمد و ثنا کرتے ہیں اور با آواز بلند کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار کی قدرت اور اس کا اختیار بے حد و بے پایاں ہے اسی لیے اس آیت کے آخر میں (وھو العزیز الحکیم) کا جملہ آیا ہے یا پھر یہ کہ اس عالم کے تمام ذرّات اِک طرح کے ادراک و شعور سے بہرہ ور ہیں اور وہ اپنے اپنے مقام پر زبانِ حال سے خدا کی تسبیح و حمد کرتے ہیں۔ یہ اور بات کہ اپنے علم کے محدود ہونے کی بنا پر ہم اس تسبیح سے بے خبر ہیں۔ تمام موجودات عالم کی تسبیح کے بارے میں سورۂ اسرا کی آیت ۴۴ کے ذیل میں (جلد ۶ ملاحظہ فرمائیں۔ اس نکتہ کو یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ لفظ "ما" جو (سبّح للّٰه ما فی السّماوات) میں استعمال ہوا ہے وہ وسیع معانی پر مشتمل ہے، اس سے تمام موجوداتِ عالم مراد ہیں خواہ وہ صاحبِ عقل و رُوح ہوں یا بے رُوح، یہ سب پر احاطہ رکھتا ہے۔[1]

خداوندِ عالم کی دو صفتیں یعنی عزّت اور حکمت کے بعد عالمِ ہستی میں جو اس کی مالکیت، تدبیر اور تصرف کارفرما ہے اور جو لازماً قدرت سے اس کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا کے لیے آسمانوں اور زمین کی مالکیت و حاکمیت" (له ملك السماوات والارض)۔ "وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے" (یحیی و یمیت)۔ "اور وہ ہر کام پر قدرت رکھتا ہے"۔ (وھو علیٰ کل شیءٍ قدیر)۔ عالمِ ہستی میں خدا کی مالکیت اعتباری اور تشریعی نہیں ہے بلکہ مالکیتِ حقیقی و تکوینی ہے یعنی وہ ہر چیز پر احاطہ رکھتا ہے اور سارا جہان اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اس کے ارادہ و فرمان کے ماتحت ہے۔ اسی لیے اس کے بعد زندہ کرنے، مارنے اور ہر چیز پر اختیار رکھنے کی گفتگو درمیان میں آئی ہے۔ تو اس طرح اب تک ان دو آیتوں میں خدا کی صفات میں سے چھ صفتیں بیان ہوئی ہیں۔ عزّت اور قدرت میں فرق یہ ہے کہ عزّت عام طور پر دفاع کے انتظامات کو درہم و برہم کرتی ہے اور قدرت کی توجہ اسباب کو ایجاد کرنے کی طرف ہے۔ اس بنا پر یہ دو مختلف صفتیں شمار ہوتی ہیں، اگرچہ بنیادی طور پر قوّت کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں (غور فرمائیے) زندہ کرنے اور مارنے کا مسئلہ بہت سی آیتوں میں بیان ہوا ہے اور در حقیقت یہ دونوں موضوع ایسے ہیں جن کے پیچیدہ اسرار کسی پر واضح و روشن نہیں ہیں۔ نہ کوئی شخص مکمل طور پر زندگی کی حقیقت سے باخبر ہے اور نہ موت کی حقیقت کو کوئی کَمَا حَقّہٗ جانتا ہے بلکہ جو کچھ ہم ان دونوں کے بارے میں جانتے ہیں وہ ان کے آثار ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ تمام چیزوں سے زیادہ نزدیک ہم سے ہماری زندگی ہے۔ اس کے باوجود اس کی حقیقت اور اس کے اسرار ہم سے ہی سب سے زیادہ مخفی ہیں۔ قابلِ توجہ یہ کہ یُحْیِی وَ یُمِیتُ کا جملہ مضارع کی شکل میں تمام زمانوں میں موت و حیات کے استمرار کی دلیل ہے۔ ان دونوں کا اطلاق نہ صرف انسانوں کی زندگی و موت تک محدود ہے بلکہ فرشتے اور دوسرے تمام زندہ موجودات بمع حیوانات حتّٰی کہ یہ گھاس پھونس پر بھی احاطہ رکھتے ہیں اور نہ صرف اس دنیا ہی کی زندگی بلکہ عالمِ برزخ و قیامت کی زندگی کو بھی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں۔ جی ہاں حیات و موت اپنی تمام صُورتوں کے اعتبار سے خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے۔
اس کے بعد پانچ اور صفتوں کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ اوّل ہے اور وہ آخر ہے، ظاہر ہے اور باطن ہے اور ہر چیز سے آگاہ ہے۔ (ھو الاول والاٰخر والظاھر والباطن وھو بکل شیءٍ علیم)۔ اوّل و آخر ہونے کی صفت اس کی ازلیت و ابدیت کی

---

[1] باوجودیکہ تسبیح حرف جر کے بغیر متعدی ہوتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے "سبحوہ" لیکن یہاں لام کے ساتھ آیا ہے اور یہ ممکن ہے کہ تاکید کے لیے ہو۔

بہت لطیف تعبیر ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ واجب الوجود اور لامتناہی ہے یعنی اس کی ہستی خود اپنی ذات ہی سے ہے نہ کہ خارج سے کہ اس کی کوئی ابتدا ہو اور وہ ختم ہو۔ اس بنا پر وہ ازل سے ہے اور اَبد تک رہے گا۔ وہ عالمِ ہستی کا سر آغاز ہے اور وہی ہے کہ جو عالمِ فنا کے بعد بھی ہوگا۔ اس بنا پر اول و آخر کی تعبیر کسی خاص زمانے تک محدُود نہیں ہے اور کسی معیّن مدّت تک اشارہ نہیں کرتی۔ ظاہر و باطن کی توصیف بھی تمام چیزوں کی نسبت اس کے احاطۂ وجودی کی ایک اور تعبیر ہے۔ وہ ہر چیز سے زیادہ ظاہر ہے کیونکہ اس کے آثار نے ہر جگہ کا احاطہ کر رکھا ہے۔ اور وہ ہر چیز سے زیادہ مخفی ہے کیونکہ اس کی کنہہ ذات کسی پر آشکار نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے یہاں یہ مفہوم لیا ہے۔ (الاوّل بلا ابتداء والأخر بلا انتهاء والظاهر بلا اقتراب والباطن بلا احتجاب) "وہ ایسا اول ہے کہ جس کا آغاز نہیں ہے اور ایسا آخر ہے جس کا اختتام نہیں ہے۔ باوجود قریب نہ ہونے کے ظاہر ہے اور پوشیدہ ہے باوجود ظاہر ہونے کے۔ کچھ اور مفسرین ایک تعبیر پیش کرتے ہیں۔ (الاول ببره والأخر بعفوه والظاهر باحسانه وتوفيقه اذا اطعته والباطن بستره اذا عصيته) وہ اول ہے نیکیوں میں اور آخر ہے عفو و بخشش کی بنا پر۔ اگر تو اس کی اطاعت کرے تو وہ اپنے احسان و توفیق کے ساتھ تجھ پر ظاہر ہوتا ہے اور اگر تو اس کی نافرمانی کرے تو ستر و پوشش کے ذریعے پنہاں ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ہر چیز پر احاطہ رکھتا ہے اور عالمِ ہستی کا آغاز و انجام اور ظاہر و باطن ہے۔ بعض مفسرین نے ظاہر کے معنی یہاں غالب تجویز کیے ہیں (ظہور بمعنی غلبہ) اور نہج البلاغہ کے بعض خطبوں میں ان معانی کا قرینہ نظر آتا ہے جہاں خلقتِ زمین کے بارے میں امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں :

(هو الظاهر عليها بسلطانه وعظمته وهو الباطن لها بعلمه ومعرفته)

وہ اس پر اپنے تسلط اور عظمت کی بنا پر غلبہ رکھتا ہے اور اپنے علم و معرفت کی وجہ سے
اس کے باطن میں راہ رکھتا ہے[1]

اِن دونوں تفسیروں کے اجتماع کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ بہرحال ان امور کے نتائج میں سے ایک وہی ہے جو آیت کے آخر میں آیا ہے: (وهو بكل شيء عليم) کیونکہ وہ جو آغاز سے تھا اور آخر تک باقی رہے گا اور جہان کے ظاہر و باطن میں ہے وہ یقیناً ہر چیز سے آگاہ ہے۔

ایک نکتہ

خدا کی صفات میں اضداد کا جمع ہونا

بہت سی صفات ایسی ہیں جو انسانوں میں اور دوسرے موجودات میں سے کسی ایک وجود میں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں۔ وہ صفات ایک دوسرے سے تضاد رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر میں ایک گروہ میں اوّلین شخص ہوں تو یقیناً میں آخری شخص نہیں ہو سکتا۔ اگر ظاہر ہوں تو پوشیدہ نہیں ہو سکتا اور اگر پوشیدہ ہوں تو ظاہر نہیں ہوں گا۔ یہ سب کچھ اس بنا پر ہے کہ ہمارا وجود محدُود ہے اور ہر محدُود

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۶۔

وجود اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب گفتگو صفاتِ خدا تک پہنچتی ہے تو پھر اوصاف اپنی شکل بدل لیتے ہیں۔ وہاں ظاہر و باطن آپس میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح آغاز و انجام کا ایک جگہ جمع ہونا اس کی ذات کے لا متناہی ہونے کی بنا پر کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے۔ وہ احادیث جو خود پیغمبر اسلامؐ سے ائمہ اہل بیتؑ سے مروی ہیں ان میں اس عنوان پر بہت ہی پُر کشش وضاحتیں موجود ہیں اور مذکورہ موضوعات کی تفسیر میں بہت حد تک معاون ہیں۔ منجملہ دیگر حدیثوں کے ان میں ایک حدیث ہے جو صحیح مسلم میں درج ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا :

(اللّٰھم انت الاول فلیس قبلك شیء وانت الاٰخر فلیس بعدك شیء وانت الظاھر فلیس فوقك شیء وانت الباطن فلیس دونك شیء)

"خداوندا تو ایسا اوّل ہے جس سے پہلے کوئی چیز نہیں اور ایسا آخر ہے جس کے بعد کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح تو وہ ظاہر ہے اور غالب ہے کہ تجھ سے برتر کوئی وجود نہیں۔ اسی طرح تو باطن و پنہاں ہے کہ تجھ سے ماوراء کسی چیز کا تصور نہیں ہو سکتا۔"[۱]

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

لیس لاوّلیته ابتداء ولا لازلیته انقضاء ھو الاول لم یزل والباقی بلا اجل ۔۔۔ الظاھر لا یقال مم؛ والباطن لا یقال فیم؟

اس کی اولیت کی ابتدا نہیں ہے اور اس کی ازلیت کی کوئی انتہا نہیں ہے وہ ایسا پہلا ہے جو ہمیشہ سے تھا اور ایسا باقی ہے جس کے اختتام کی کوئی مدّت معیّن نہیں ہے۔ ایسا ظاہر و آشکار ہے جس کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس چیز سے ظاہر ہوا اور ایسا پنہاں ہے کہ نہیں کہا جا سکتا کس چیز میں پوشیدہ ہے۔[۲]

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام بھی ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں :

(الحمد للّٰه الذی لم یکن فیه اول معلوم ولا اٰخر متناه ۔۔۔ فلا تدرك العقول واوھامھا ولا الفکر وخطراتھا ولا الالباب واذھانھا صفته فتقول متی؟ ولا بدء مما؟ ولا ظاھر علی ما؟ ولا باطن فیما؟)۔

"حمد ہے اس خدا کے لیے جس کی ابتدا معلوم نہیں اور نہ اس کی انتہا محدود ہے۔ عقل و فہم اور فکر و خرد کبھی اس کی صفات کا ادراک نہیں کر سکتے۔ کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ کس وقت سے اور کس سے اس کی ابتدا ہوئی اور کس چیز پر ظاہر ہوا اور کس میں پنہاں ہے۔"[۳]

۱۔ تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۶۴۰۶

۲۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۶۳ ۔

۳۔ تفسیر نور الثقلین ج ۵ ص ۲۳۶

بہ عقل نازی حکیم تا کے بہ عقل این رہ نمی شود طے
بہ کنہ ذاتش خرد برد پے اگر رسد خس بہ قعر دریا

اے حکیم و دانا و فلسفی تو اپنی عقل پر کب تک ناز کرے گا تو عقل کے ذریعے اس راہ کو طے نہیں کر سکتا۔ اس کی کنہہ ذات تک عقل جب پہنچ سکتی ہے جب خس و خاشاک سمندر کی حقیقت کو سمجھ لیں بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ

خرد بہ ذاتش نمی برد پے وگر رسد خس بہ قعر دریا

خس و خاشاک سمندر کی حقیقت کو سمجھ بھی لیں تب بھی عقل اس کی کہنہ ذات تک نہیں پہنچ سکتی۔

۴۔ هُوَالَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ
ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ۭ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ
فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ
وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ۭ وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ○
۵۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ○
۶۔ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ ۭ
وَهُوَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○

ترجمہ

۴۔ وہی ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن (چھ ادوار) میں پیدا کیا اور تخت قُدرت پر جلوہ گر ہوا (اور تدبیرِ عالم کی) جو کچھ زمین میں جذب ہو جاتا ہے وہ اسے جانتا ہے اور اسے بھی جانتا ہے جو زمین سے خارج ہوتا ہے اور جو کچھ آسمان سے نازل ہوتا ہے اور جو کچھ آسمان کی طرف صعود کرتا ہے۔ وُہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی رہو اور جسے تم انجام دیتے ہو خدا اسے دیکھتا ہے۔

۵۔ آسمانوں اور زمین کی ملکیت اسی کے لیے ہے اور ہر چیز اسی کی طرف لوٹتی ہے۔

۶۔ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ ان چیزوں کو جانتا ہے جو دلوں پر حکومت کرتی ہیں۔

تفسیر

وہ ہمیشہ قدرت پر جلوہ گر ہے

ان گیارہ اوصاف کے بعد جو گزشتہ آیتوں میں پروردگارِ عالم کی ذاتِ پاک کے بارے میں بیان ہوئے ہیں زیرِ آیتوں میں مزید اوصاف بیان ہوتے ہیں۔ پہلی زیرِ بحث آیت میں خدا کی صفات جمال و جلال میں سے پانچ صفتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ سب سے پہلے خالقیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں خلق کیا ہے"۔ (هوالذی خلق السماوات والارض فی ستة ایام)۔ چھ دن میں خلقت کا مسئلہ قرآن مجید میں سات مرتبہ بیان ہوا ہے۔ سب سے پہلے سورہ اعراف کی آیت ۵۴ میں اور آخری مرتبہ اس زیرِ بحث آیت میں (سورہ حدید کی آیت ۴)۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ ان آیات میں یوم سے مراد عام دن نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ایک دور ہے چاہے وہ دور چھوٹا ہو چاہے بڑا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ کئی ملین سال پر محیط ہو۔ اور یہ ایسی تعبیر ہے جو عربی زبان میں بھی استعمال ہوتی ہے اور دوسری زبانوں میں بھی۔ مثلاً کہتے ہیں: آج فلاں گروہ کی باری ہے کہ وہ حکومت کرے اور کل دوسروں کی باری ہوگی یعنی ان کا دور ہوگا۔ اس بات کو ہم شواہد اور مبسوط شرح کے ساتھ جلد ۶ سورہ اعراف کی آیت ۵۴ کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں[1]

البتہ خدا کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا کہ وہ سارے جہان کو ایک ہی لمحے میں خلق کر دے لیکن یہ مسلّم ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو خالقِ آفریدگار کی بہت کم عظمت، قدرت اور اس کا علم ظاہر ہوتا لیکن اگر انہیں کئی ارب سال میں مختلف ادوار اور مختلف صورتوں میں منظم اور طے شدہ پروگراموں کے ماتحت پیدا کرے تو یہ اس کی قدرت و حکمت پر زیادہ واضح و آشکار دلائل لیے ہوئے ہوگا۔ علاوہ ازیں تخلیقی عمل کا اس طرح بتدریج ہونا انسانی ترقی کی تدریجی رفتار اور مختلف مقاصد کے حصول میں عجلت نہ کرنے کے بارے میں ایک نمونۂ عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے بعد مسئلہ حکومت اور تدبیرِ عالم کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا نے عالم کو پیدا کرنے کے بعد تختِ حکومت پر استقرار کیا"۔ (ثم استوٰی علی العرش)۔ وہ زمامِ حکومت اور تدبیرِ عالم کو ہمیشہ سے اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا اور رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خدا نہ جسم ہے اور نہ عرش کے معنی تختِ سلطنت کے ہیں بلکہ یہ تعبیر خدا کی حاکمیتِ مطلقہ اور عالمِ ہستی میں اس کی تدبیر کے نفوذ کا ایک لطیف کنایہ ہے۔ لغت میں عرش اس چیز کے معنوں میں ہے جس پر چھت ہو۔ اور کبھی چھت کو بھی عرش کہا جاتا ہے اور یہ لفظ بادشاہوں کے اونچے اونچے تختوں کے

[1] تفسیر نمونہ جلد ۶ ص ۱۲۹

معنوں میں بھی آیا ہے اور قدرت و طاقت کے کنائے کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے جیسا کہ ہم فارسی میں کہتے ہیں اس کے تخت کی بنیادیں گر گئیں یا عربی میں کہتے ہیں: (فلان ثل عرشه) جو اس بات کا کنایہ ہے کہ اس کا اقتدار برباد ہو گیا[1]

بہر حال اس کے برخلاف، جو بے خبروں کے ایک گروہ نے خیال کیا ہے کہ خدا نے اس عالم کو پیدا کر کے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ زمامِ حکومت اور تدبیرِ عالم کو اپنے قبضۂ قدرت میں رکھے ہوئے ہے۔ اس جہان کے نظاموں کی بلکہ ایک ایک چیز کی اس کی ذات سے وابستگی اس طرح ہے کہ اگر ایک لمحے کے لیے ان سے نظرِ لطف ہٹا لے اور اپنے فیض و کرم کو منقطع کر لے تو " فرو ریزند قالبہا " سب کچھ تباہ و برباد ہو جائے۔ اس حقیقت کی طرف توجہ کی جائے تو پھر انسان کو یہ بلندیٔ نظر عطا ہوتی ہے کہ وہ خدا کو ہر جگہ ہر چیز کے ساتھ اور اپنی جان کے اندر دیکھے، محسوس کرے اور اس سے محبت کرے۔

اس کے بعد اپنے علم بے پایاں کی ایک اور شاخ کو بیان کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: " جو کچھ زمین میں نفوذ کرتا ہے اور جو کچھ اس سے خارج ہوتا ہے اور جو کچھ آسمان سے نازل ہوتا ہے اور جو کچھ آسمان کی طرف صعود کرتا ہے وہ اس سب سے واقف و باخبر ہے" (یعلم ما یلج فی الارض وما یخرج منها وما ینزل من السماء وما یعرج فیها)۔ اگرچہ یہ تمام اُمور هو بکل شیء علیم کے مفہوم میں داخل ہیں جو گزشتہ آیات کا ایک جُز ہے لیکن ان معانی کی تشریح و تفصیل اس سلسلہ میں انسان کو خدا کے علم کی وسعت کی طرف زیادہ توجہ دلاتی ہے۔ جی ہاں وہ اس سے آگاہ ہے جو زمین میں نفوذ کرتا ہے اور اس میں جذب ہو جاتا ہے۔ بارش کے تمام قطرات سے، سیلابوں کی موجوں سے، نباتات کے دانوں سے جو ہوا کی مدد سے یا کیڑے مکوڑوں کے ذریعہ زمین پر بکھر جاتے ہیں اور اس میں نفوذ کر جاتے ہیں، درختوں کی جڑوں سے جب وہ پانی اور غذا کی تلاش میں زمین کی گہرائیوں میں اُترتی چلی جاتی ہیں، انواع و اقسام کی ایسی کانوں اور ذخیروں سے جو کسی وقت سطح زمین پر تھے اور اس کے بعد اس میں دفن ہو گئے، گنجینوں اور دفینوں سے، مُردوں کے جسموں سے، انواع و اقسام کے کیڑے مکوڑوں سے جو زمین کے اندر گھر بناتے ہیں، جی ہاں وہ ان سب سے آگاہ ہے۔ ان گھاس کی پتیوں سے جو زمین سے سر نکالتی ہیں اور ان چشموں سے جو ظاہر ہوتے ہیں اور مٹی اور پتھر کا دل چیر کر باہر آتے ہیں، معدنوں اور گنجینوں سے، ان انسانوں سے جو اس مٹی سے بنے ہیں، ان آتش فشاں پہاڑوں سے جو زمین کے اندر سے شعلے نکالتے ہیں۔ ان گیسوں اور بخارات سے جو زمین سے اُوپر اُٹھتے ہیں، ان جاذب موجوں سے جو اس کے اندر سے اُٹھتی ہیں، خدا ان تمام سے، ان کے ایک ایک جُز اور ذرہ ذرہ سے واقف ہے۔ اسی طرح جو کچھ آسمانوں سے نازل ہوتا ہے، بارش کے قطروں سے سُورج کی حیات بخش کرنوں تک، فرشتوں کے دستوں سے لے کر وحی و کتب آسمانی کی طاقتور تحریروں تک، اس عالم کی روشنی سے لے کر شہاب ثاقب اور ان سرگرداں پتھروں اور سنگریزوں تک جو زمین میں جذب ہوتے ہیں، وہ ان سب کی حقیقتوں سے باخبر ہے۔ نیز جو کچھ آسمانوں کی طرف صعود کرتا ہے، عام اس سے کہ وہ فرشتے ہوں، انسانوں کی ارواح ہوں، بندوں کے اعمال ہوں، انواع و اقسام کی دعائیں ہوں، طرح طرح کے پرندے اور بخارات ہوں، بادل ہوں یا ان کے علاوہ دوسری چیزیں ہوں جنہیں ہم جانتے ہیں یا نہیں جانتے، وہ سب اس کی بارگاہِ علم میں آشکار و ہویدا ہیں۔ اگر اس سلسلہ میں تھوڑا سا سوچیں کہ ہر لحہ اربوں کی تعداد میں مختلف موجودات زمین کے اندر داخل ہوتے ہیں یا وہ جو آسمان کی طرف صعود کرتے ہیں اور حد و حساب سے باہر ہیں اور خدا کے علاوہ کوئی

---

[1] عرش کی حقیقت کے سلسلہ میں مزید وضاحتیں تفسیر نمونہ جلد ۴ آیت ۵۴ سورہ اعراف اور پہلی جلد سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۵ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

بھی ان کا شمار نہیں کر سکتا تو پھر ہم پروردگار کے علم کی وسعت سے آگاہ ہو سکیں گے۔ آخر میں چوتھی اور پانچویں صفت کے سلسلہ میں ایک حساس نکتہ پر انحصار کرتے فرماتا ہے: "وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں ہو" (وھو معکم اینما کنتم) "جبکہ ایسا ہے تو پھر جو کچھ تم کرتے ہو وُہ اسے جانتا ہے" (واللہ بما تعملون بصیر) وُہ کس طرح ہمارے ساتھ نہ ہو جبکہ ہم نہ صرف اپنے وجود میں بلکہ اپنی بقا کے بارے میں بھی ہر لمحے اس کے محتاج ہیں اور اس سے مدد لیتے ہیں۔ وُہ عالم ہستی کی رُوح ہے، جانِ جہاں ہے بلکہ ہر شے سے بہتر و برتر ہے۔ اس وقت جب ہم ایک ذرۂ خاک کی شکل میں ایک گوشہ میں پڑے ہوئے تھے اور پھر اس لمحے جب ہم جنین کی صُورت میں شکمِ مادر میں تھے وہ ہمارے ساتھ تھا۔ وہ ساری عمر ہمارے ساتھ رہا اور عالمِ برزخ میں بھی ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے۔ اِن حالات میں یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ہم سے بے خبر ہو۔ فی الحقیقت یہ احساس کہ وہ ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے اور نہ صرف ہم کو عظمت و شکوہ بخشتا ہے بلکہ ہمارے نفس کو اعتماد و اطمینان عطا کرتا ہے اور شجاعت و شہامت پیدا کرتا ہے اور اس کے علاوہ اسے یعنی ہمارے نفس کو شدید ذمّہ داری کا احساس دلاتا ہے کیونکہ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور نگراں ہے۔ اس کی قربت کا یہ احساس ایک عظیم درسِ اصلاحِ احوال ہے۔ جی ہاں یہ اعتقاد انسان کے لیے تقویٰ، پاکیزگی اور کامیابی کا بنیادی سبب ہے اور اس میں اُس کی (انسان کی) عظمت و بزرگی کی رمز بھی پنہاں ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ وُہ ہمیشہ ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے۔ یہ کوئی کنایہ یا مجاز نہیں ہے بلکہ ایسی حقیقت ہے جو دلپذیر، عقل انگیز اور رُوح پرور بھی ہے اور ہمارے دلوں میں رعب پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں احساسِ ذمہ داری بھی دلاتی ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلام سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

ان من افضل ایمان المرء ان یعلم ان اللہ تعالیٰ معہ حیث کان)

انسان کے ایمان کا افضل ترین درجہ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ جہاں کہیں بھی وہ ہے خدا اس کے ساتھ ہے[1]

ایک اور حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے سوال کیا: این اجدک یا رب؟ "پروردگار میں تجھے کہاں پاؤں"؟ (قال یا موسیٰ اذا قصدت الیّ فقد وصلت الیّ) فرمایا اے موسیٰ تو جیسے ہی میرا ارادہ کرے (تو سمجھ لے) کہ مجھ تک پہنچ گیا[2]

اصولی طور پر بندہ کے ساتھ خدا کی یہ معیت اس قدر پُر لطف اور دقیق ہے کہ ہر مفکر و مومن انسان اپنی پروازِ فکر اور جذبۂ ایمانی کے مطابق اس کا ادراک کرتا ہے اور اس کی گہرائی سے باخبر ہوتا ہے۔ اس کی حاکمیت و تدبیر کے بعد گفتگو سارے عالمِ ہستی پر اس کی حاکمیت تک جا پہنچتی ہے۔ فرماتا ہے: "آسمانوں اور زمین کی مالکیت اسی کے لیے ہے" (لہ ملک السّماوات والارض)۔

آخر میں مرجعیت کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور تمام کاموں کی بازگشت اسی کی طرف ہے" (والی اللہ ترجع الامور)۔ جی ہاں جب وہ ہمارا خالق و مالک اور حاکم و مدبّر ہے اور ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے تو یقیناً ہم سب کی اور ہمارے امور کی بازگشت بھی اسی کی طرف ہوگی۔ ہم اس کی منزلِ عشق کے مسافر ہیں۔ اُمید اور دوسری توانائیوں کا بوجھ اپنے کاندھے پر رکھے ہوئے منزلِ عدم سے چلے ہیں اور اقلیمِ وجود تک یہ سارا راستہ ہم نے طے کیا ہے۔ ہم اس کی طرف سے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے کیونکہ وہی ہمارا مبداء و منتہیٰ ہے۔ قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ گزشتہ تین آیتوں میں بعینہٖ یہی توصیف بیان ہوئی تھی لہ ملک السماوات

---

[1] درالمنثور جلد ۶ ص ۱۷۱۔

[2] رُوح البیان جلد ۹ ص ۳۵۱.

والارض ممکن ہے یہ تکرار اس بنا پر ہو کہ وہاں گفتگو صرف زندہ موجودات کی موت و حیات سے متعلق تھی اور یہاں بحث کا دامن زیادہ وسیع ہے اور اَب گفتگو یہ ہے کہ تمام امور کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔ پہلے ہر چیز پر خدا کے قادر ہونے کے سلسلہ میں ایک تعارفی بیان ہے کہ ہر چیز کی بازگشت اس کی طرف ہے۔ یہ دونوں امور اس بات کا لازمہ ہیں کہ زمین اور آسمان دونوں خدا کی ملکیت ہیں "الامور" کی تعبیر جو جمع کی صورت میں ہے یہ بتاتی ہے کہ نہ صرف انسان بلکہ تمام موجودات اسی کی سمت رُخ کیے ہوئے چل رہے ہیں اور یہ ایسا چلنا ہے کہ اس میں کسی مقام پر کوئی توقف نہیں ہے۔ اِس صُورتِ حال کے پیشِ نظر آیت کا مفہوم صرف اس حد تک محدود نہیں ہے کہ قیامت کے لیے انسانوں کی بازگشت اس کی طرف ہے، اگرچہ معاد کے موضوع کا تعلق خصوصیّت کے ساتھ انسان سے ہے۔

آخری زیرِ بحث آیت میں دو اور صفتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے"۔ (یولج اللیل فی النھار و یولج النھار فی اللیل)[1]

جی ہاں بتدریج ایک میں کمی کر دیتا ہے اور دوسرے میں اضافہ کر دیتا ہے۔ رات اور دن کے طول میں تغیّر کرتا ہے۔ وہ تغیّر جو سال بھر کی چار فصلوں کے ہمراہ ہے۔ ان تمام برکتوں کے ساتھ جو ان فصلوں میں انسان کے لیے چھپی ہوئی ہیں۔ اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی ہے وہ یہ کہ سُورج کے طلوع و غروب کے وقت روشنی و تاریکی کے نظام میں کبھی یک لخت تبدیلی نہیں ہوتی تاکہ انسان اور دوسرے زندہ موجودات کے لیے مختلف قسم کی مشکلات پیدا نہ ہوں۔ یہ صُورتِ احوال رفتہ رفتہ وقوع پذیر ہوتی ہے اور وہ موجودات کو آہستہ آہستہ دن کی روشنی سے رات کی تاریکی کی طرف اور رات کی تاریکی سے دن کی روشنی کی طرف منتقل کرتا ہے اور رات اور دن کی آمد کا اعلان کافی پہلے کرتا ہے تاکہ سب لوگ اس تبدیلی کے لیے خود کو آمادہ کر لیں۔ دونوں تفسیروں کو مفہومِ آیت میں جمع کرنے سے کوئی علمی قباحت لازم نہیں آتی۔ آخر میں مزید کہتا ہے: "اور وہ اس چیز سے جو دلوں پر حاکم ہے باخبر ہے"۔ (وھو علیم بذات الصدور) جس طرح سُورج کی حیات بخش کرنیں اور دن کی روشنی رات کی تاریکی کی گہرائیوں میں نفوذ کر جاتی ہے اور ہر جگہ کو روشن کر دیتی ہے، اسی طرح پروردگار کا علم بھی انسان کے دل و جان کے تمام اطراف و جوانب میں نفوذ کرتا ہے اور اس کے تمام اسرار کو واضح و روشن کر دیتا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں گفتگو یہ تھی کہ خدا ہمارے اعمال سے باخبر ہے (واللہ بما تعملون بصیر) یہاں گفتگو یہ ہے کہ وہ ہماری نیتوں، ہمارے عقائد و اعمال اور افکار سب سے باخبر ہے۔ (وھو علیم بذات الصدور)

لفظ "ذات"، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، عربی زبان میں عین و حقیقت کے معنی میں نہیں۔ یہ فلسفیوں کی ایک اصطلاح ہے۔ یہ لفظ لُغت میں کسی چیز کے "صاحب" کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر ذات الصدور ان نیتوں اور عقائد کی طرف اشارہ ہے جن کا انسانوں کے دلوں پر قبضہ ہے اور وہ ان پر حکومت کرتے ہیں۔ (غور فرمائیے) کتنا اچھا ہو اگر انسان خدا کی ان تمام صفتوں کا اپنے دل و جان کی گہرائیوں سے اقرار کرے اور اپنے اعمال، نیتوں اور عقائد سے اس کو باخبر سمجھے تو کیا اس شعور کے بعد یہ ممکن ہے کہ انسان اطاعت و بندگی کے راستے سے ہٹ کر بُرائی کی راہ اختیار کرے۔

---

[1] "یولج" مادہ "ایلاج" سے ہے اور وہ بھی "ولوج" کے مادہ سے لیا گیا ہے "ولوج" کے معنی داخل ہونے اور نفوذ کرنے کے ہیں اور "ایلاج" داخل کرنے اور نفوذ کرنے کے معنی میں ہے۔

ایک نکتہ

خدا کے اسمِ اعظم کی نشانیاں

ہم جانتے ہیں کہ فلسفیوں اور متکلمین نے خدا کی صفات کو دو حصّوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ "صفاتِ ذات" جو اس کے جلال و جمال کا بیان ہیں اور "صفاتِ فعل" جو ان افعال کو بیان کرتی ہیں جو اس کی ذاتِ مبارک سے صادر ہوں۔ ان چھ آیتوں میں جو اس سورہ کی ابتدا میں آئی ہیں، حدیث کے مطابق چاہیئے کہ انہیں گہری نظر رکھنے والوں کی آیات کا نام دیا جائے۔ صفاتِ ذات و افعال میں سے بیس صفتیں ان میں بیان ہوئی ہیں۔ خدا کے علم، اس کی قدرت، حکمت، ازلیت اور ابدیت سے لے کر تمام موجودات کے بارے میں اس کی خالقیت، تدبیر، مالکیت اور حاکمیت کا ان میں بیان ہے۔ اس کا ہر شے پر محیط ہونا اور ہر جگہ موجود ہونا بھی ان میں مذکور ہوا ہے اور وہ بھی ایسی تعبیروں کے ساتھ جو انہیں مزید گہرائی بخشتی ہیں۔ ان صفات کی طرف توجہ کرنا، ان پر ایمان رکھنا اور اپنے وجود کے اندر ان کے شعور کا ہلکا سا شعلہ روشن کرنے کی کوشش کرنا ہماری تدریجی ترقی کے لیے اور راہِ خدا میں ہمارے آگے بڑھنے کے لیے بہترین مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک حدیث میں براء ابنِ عازب سے منقول ہے وہ کہتے ہیں میں نے حضرت علیؑ کی خدمت میں عرض کیا: یا امیرالمؤمنین! اسئلك بالله ورسوله، الاخصصتنی باعظم ما خصك به رسول الله (ص) و اختصه به جبرئیل، وارسله به الرحمٰن، فقال اذا اردت ان تدعوالله باسمه الاعظم، فاقرأ من اول سورة الحدید الیٰ اٰخر ست اٰیات منها علیم بذات الصدور، واٰخر سورة الحشر یعنی اربع اٰیات، ثم ارفع یدیك فقل یا من هو هكذا اسئلك بحق هذه الاسماء ان تصلی علی محمد (ص) وان تفعل بی كذا و كذا مما ترید، فوالله الذی لا اله غیره لتنقلبن بحاجتك ان شاء الله۔" اے امیرالمومنینؑ میں خدا اور اس کے رسولؐ کا واسطہ دے کر آپ سے سوال کرتا ہوں کہ وہ سب سے عظیم چیز جس سے پیغمبرؐ نے آپ کو مخصوص کیا اور جبرئیل نے آنحضرتؐ کو مخصوص کیا اور خدا نے اسے دے کر جبرئیل کو بھیجا وہ مجھے عطا فرمایئے۔" فرمایا:

"جب تم چاہو کہ خدا کو اس کے اسمِ اعظم کے ساتھ پکارو تو سورۂ حدید کی ابتدائی چھ آیتیں علیم بذات الصدور تک پڑھ کر اسے پکارو اور اس کے بعد سورہ حشر کی آخری چار آیتیں پڑھو۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے کہو: اے وہ خدا جو ایسا ہے! میں تجھے ان اسمائے کے حق کا واسطہ دے کر پکارتا ہوں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیج [1] اور میری فلاں حاجت پوری کر دے۔ اس کے بعد جو چاہو کہو۔ قسم ہے اس خدا کی جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں انشاء اللہ تمہاری حاجت پوری ہو جائے گی۔"

ان آیات کی عظمت اور ان کے موضوعات و مضامین کی اہمیت کے لیے یہی ایک حدیث کافی ہے۔ لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ اسمِ اعظم الٰہی صرف الفاظ نہیں ہیں ان کا تخلق اور ان کا اپنانا بھی ضروری ہے۔

---

[1] تفسیر درالمنثور جلد ۶ ص ۱۷۱

۷۔ اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ
مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ
وَاَنْفَقُوْا لَھُمْ اَجْرٌ کَبِیْرٌ ۝

۸۔ وَمَا لَکُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ ۚ وَالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ
لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّکُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ
اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝

۹۔ ھُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِہٖۤ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَکُمْ
مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ بِکُمْ لَرَءُوْفٌ
رَّحِیْمٌ ۝

۱۰۔ وَمَا لَکُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلِلّٰہِ مِیْرَاثُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ
مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَۃً
مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ

الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

۱۱۔ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ
لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝

ترجمہ

۷۔ خُدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آؤ اور اس چیز میں سے جس میں اس نے تمہیں اپنا نمائندہ قرار دیا ہے انفاق کرو (کیونکہ) وہ لوگ جو تم میں سے ایمان لے آئے ہیں اور انہوں نے انفاق کیا ہے ان کے لیے اجرِ عظیم ہے۔

۸۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے ہو حالانکہ رسول تمہیں پُکارتا ہے کہ اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ اور تم سے اس نے عہد و پیمان لیا ہے۔ (فطرت و عقل کے مطابق پیمان) اگر پیمان کے لیے آمادہ ہو۔

۹۔ وہی ہے جو اپنے بندہ (محمدؐ) پر آیاتِ بیّنات نازل کرتا ہے تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر ایمان کی طرف لے جائے اور خدا تم پر مہربان و رحیم ہے۔

۱۰۔ راہِ خُدا میں انفاق کیوں نہ کرو حالانکہ آسمانوں اور زمین کی میراث سب خُدا کے لیے ہے (اور کوئی شخص کوئی چیز اپنے ساتھ نہیں لے جائے گا)۔ وہ لوگ جنہوں نے کامیابی اور فتح سے پہلے انفاق کیا ہے اور جنگ کی ہے۔ (ان لوگوں سے جنہوں نے کامیابی کے بعد انفاق کیا ہے) بہتر ہیں۔ وہ ان سے بلند مقام رکھتے ہیں جنہوں نے فتح کے بعد انفاق

کیا ہے اور جہاد کیا ہے اور خدا نے دونوں سے نیکی کا وعدہ کیا ہے اور خُدا اُس سے جو کام تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے۔

۱۱۔ کون ہے جو خُدا کو قرضِ حسنہ دے (جو اموال اُسے دیے ہیں ان میں سے انفاق کرے) تاکہ خُدا اس میں اس کے لیے اضافہ کر دے اور اس کے لیے اجرِ فراواں ہے۔

تفسیر

ایمان و انفاق نجات و خوش بختی کے لیے دو عظیم سرمائے ہیں

عالم ہستی میں خدا کی عظمت کے کچھ دلائل، اور اس کے ایسے اوصافِ جلال و جمال جو رجوع الی اللہ کا سبب بنتے ہیں، ان کے بیان کے بعد، ان آیات میں، نتیجہ اخذ کرتے ہوئے سب کو ایمان و عمل کی دعوت دیتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آؤ (امنوا باللّٰہ و رسولہ)۔ یہ دعوتِ فکر ایک عام دعوتِ فکر ہے جس میں تمام انسان شامل ہیں۔ مومنین کو زیادہ کامل الایمان اور راسخ الایمان ہونے کی طرف اور غیر مومنین کو اصل ایمان کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہ ایسی دعوتِ فکر ہے جو مدلّل ہے اور اس کے ثبوتِ توحید کے بیان پر مشتمل گزشتہ آیات میں گزر چکے ہیں۔ اس کے بعد ایمان کے ایک اہم اثر یعنی انفاق فی سبیل اللہ کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ فرمایا ہے "جس میں خدا نے تمہیں دوسروں کا جانشین قرار دیا ہے اس میں سے انفاق کرو۔" (وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ)۔ یہ دعوتِ فکر قربانی و فداکاری کا تقاضا کرتی ہے اور ان نعمتوں کے بارے میں جو انسان کے اختیار میں ہیں ایک ایسے رویّہ کو انگیخت دیتی ہے جو سخاوت پر مبنی ہو اور اس دعوتِ فکر کو اس نکتہ پر مرکوز کرتا ہے کہ یہ نہ بھولو کہ اصل میں ہر شے کا مالک خدا ہے اور یہ دولت اور یہ سرمایہ جو تمہیں عطا کیا گیا ہے، یہ امانت کے طور پر ہے اور چند روزہ ہے کیونکہ یہ اس سے پہلے دوسری قوموں کے اختیار میں تھا۔ حقیقتِ واقعہ یہی ہے۔ گزشتہ آیتوں میں ہم نے پڑھا ہے کہ سارے جہان کا مالک حقیقی خدا ہے۔ اس حقیقت پر ایمان رکھنا اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ ہم اس کے امانت دار ہیں۔ کس طرح ممکن ہے کہ ایک امانت دار امانت رکھوانے والے کے حکم کی پرواہ نہ کرے۔ اس حقیقت کا شعور انسان کو سخاوت و ایثار کی رُوح عطا کرتا ہے اور اس کے دل اور ہاتھ کو انفاق فی سبیل اللہ کے عزم سے نوازتا ہے۔ "مستخلفین" (جانشین) کی تعبیر ہو سکتا ہے اس طرف اشارہ ہو کہ انسان زمین پر اس کی نعمتوں کے تصرف کے سلسلہ میں خدا کی نمائندگی کرتا ہے۔ یا اس سے گزشتہ اقوام کی جانشینی مُراد ہو یا دونوں مراد ہوں۔ اور "مما" (ان چیزوں میں سے جو) کی تعبیر ایک عام تعبیر ہے اور محض مال و دولت ہی نہیں بلکہ اس میں خدا کی عطا کی ہوئی تمام نعمتیں شامل ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی ہم نے کہا ہے کہ انفاق کا ایک وسیع مفہوم ہے جو صرف مال و دولت تک محدود نہیں ہے اس میں علم اور ہدایت بھی شامل ہیں اور وہ عزّت بھی جو کسی کو معاشرہ میں حاصل ہو۔ اس کے علاوہ دیگر مادّی و معنوی سرمائے بھی اس کے مفہوم

میں داخل ہیں۔ اس کے بعد مزید تشویق کے لیے فرماتا ہے: " وہ لوگ جو تم میں سے ایمان لے آئیں اور انفاق کریں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔" (فالذین اٰمنوا منکم وانفقوا لھم اجر کبیر) ۔ اجر کے ساتھ جو لفظ کبیر استعمال ہوا ہے وہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی عظمت اور ان کی بے عیب ابدیت کی طرف اشارہ ہے۔ نہ صرف آخرت میں بلکہ اس دُنیا میں بھی اجر کبیر کا ایک حصہ انہیں ملے گا۔ ایمان و انفاق کے حکم کے بعد ان دونوں میں سے ہر ایک کے بارے میں ایک تشریح پیش کرتا ہے جو استدلال کی حیثیت رکھتی ہے۔ سب سے پہلے ایک ایسے استفہام کے انداز میں جو تنبیہہ کا پہلو لیے ہوئے ہے ایمان باللہ کے عنوان پر پیغمبر کی طرف سے دی ہوئی دعوتِ اسلام کو قبول نہ کرنے کا سبب تلاش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کیا سبب ہوا کہ تم خدا پر ایمان نہیں لائے حالانکہ اس کا رسول تمہیں تمہارے پروردگار پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے اور جب کہ اس نے تم سے عہد لیا ہے اگر تم ایمان کے لیے آمادہ ہو۔" (ومالکم لاتؤمنون باللہ والرسول یدعوکم لتؤمنوا بربکم وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مؤمنین)۔

یعنی واقعی اگر تم قبولِ حق کے لیے آمادہ ہوتے تو اس کے دلائل، فطرت وعقل کے تقاضوں کے مطابق بھی اور دلیل نقلی کے اعتبار سے بھی بالکل واضح اور روشن ہیں۔ ایک تو خدا کا پیغمبر واضح دلیلیں اور روشن آیات اور کھلے معجزے لے کر تمہارے پاس آیا ہے۔ دوسرے خُدا نے عالمِ ہستی میں اور خُود تمہارے وجود کے اندر اپنے آثار دکھا کر ایک قسم کا عہدِ تکوینی تم سے لے لیا ہے کہ خدا پر ایمان لے آؤ۔ لیکن تم نہ اپنی فطرت وعقل کی پرواہ کرتے ہو اور نہ وحیِ الٰہی کی طرف تمہاری توجہ ہوتی ہے۔ تم ایمان لانے کے لیے بالکل آمادہ نہیں ہو۔ اور تمہاری فکر پر جہالت وتعصب غالب ہے اور تم اندھی تقلید کا شکار ہو۔ جو کچھ ہم نے کہا اس سے واضح ہوا کہ ان کنتم مؤمنین کے جملہ سے یہ مُراد ہے کہ اگر تم کسی چیز پر ایمان لانے اور کسی دلیل کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو تو یہ ایسا ہی موقع ہے۔ کیونکہ اُس کے دلائل ہر لحاظ سے واضح ہیں۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ خُود پیغمبرؐ کو دیکھتے تھے اور آپؐ کی دعوتِ اسلام کو بغیر کسی واسطے اور وسیلہ کے سنتے تھے اور آپؐ کے معجزات کا مشاہدہ کرتے تھے۔ اب کونسا عُذر تھا جو ایمان لانے میں مانع ہو۔ اس سلسلہ میں ہمیں ایک حدیث ملتی ہے کہ ایک روز رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

(ای المؤمنین اعجب الیکم ایمانًا قالوا: الملائکۃ! قال: ومالھم لایؤمنون وھم عند ربھم؟ قالوا: فالانبیاء! قال فمالھم لایؤمنون والوحی ینزل علیھم؟ قالوا: فنحن قال: ومالکم لا تؤمنون وانا بین اظھرکم! ولکن اعجب المؤمنین ایمانا قوم یجیئون بعدکم یجدون صحفًا یؤمنون بما فیھا)

" مومنین میں سے کس کا ایمان لانا تمہارے نزدیک تعجب انگیز ہے۔ انہوں نے کہا "فرشتے"۔ فرمایا کونسی تعجب کی بات ہے کہ وہ ایمان لے آئیں وہ تو جوارِ خدا میں ہیں۔ انہوں نے عرض کیا "انبیاءؑ" فرمایا اس صورت میں کہ وحی ان پر نازل ہوتی ہے وہ کس طرح ایمان نہ لائیں۔ انہوں نے عرض کیا اس سے خُود ہم مُراد ہیں فرمایا: کونسی تعجب کی بات ہے کہ تم ایمان لے آئے جب کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ (یہ وہ مقام تھا کہ جہاں سب خاموش ہو گئے)۔ پیغمبر اسلامؐ

نے فرمایا: "سب سے زیادہ تعجب اس قوم پر ہے جو تمہارے بعد آئے گی وہ صرف اوراق اپنے سامنے دیکھے گی اور جو کچھ ان میں تحریر ہے اس پر ایمان لے آئے گی"۔[1]

یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ لوگ جو رحلت پیغمبر کے سالہا سال بعد دنیا میں آئیں گے اور صرف کتابوں میں پیغمبر کے آثار دیکھیں گے اور آپ کے دین کی حقانیت کی تہہ تک پہنچ جائیں گے، وہ دوسروں کے مقابلہ میں امتیاز خاص کے مالک ہیں۔ "میثاق" (وہ عہد جس میں تاکید کا عنصر شامل ہو) کی تعبیر ہو سکتا ہے کہ فطرت توحیدی کی طرف اشارہ ہو یا اُن دلائل عقلی کی طرف جو مشاہدہ فطرت سے انسان پر آشکار ہوتے ہیں اور "ربکم" (تمہارے پروردگار) کی تعبیر مذکورہ حقیقت پر شاہد ہے۔ بعض مفسرین میثاق کو یہاں "عالم ذر" کے عہد و پیمان کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں لیکن یہ معنی بعید از فہم نظر آتے ہیں سوائے اس تفسیر کے جو عالم ذر کے لیے ہم نے پہلے بیان کی۔[2]

بعد والی آیت انہی معانی کی توضیح کے سلسلے میں کہتی ہے: "وہی ہے جس نے واضح آیات اپنے بندہ پر نازل کیں تاکہ وہ تمہیں شرک و جہالت اور نادانی کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان، توحید اور علم کی روشنی کی طرف لے آئے اور خدا تم پر رؤف و مہربان ہے"۔ (هو الذی ینزل علٰی عبده اٰیات بیّنات لیخرجکم من الظلمات الی النور وان الله بکم لرءوف رحیم)۔ ایک گروہ نے یہاں آیاتِ بینات کا مفہوم معجزات بتایا ہے اور دوسرے گروہ نے قرآن لیکن آیت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور یہ سب معانی اس میں شامل ہیں، اگرچہ نازل کرنے کے الفاظ قرآن سے مناسبت رکھتے ہیں۔ وہی قرآن جو ظلمت و کفر اور ضلالت و نادانی کے پردے چاک کرتا ہے اور جس کی وجہ سے انسان کے باطن میں آفتابِ ایمان و آگہی طلوع ہوتا ہے۔ "رءوف رحیم" کے الفاظ اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہیں کہ خدا کی طرف سے یہ دعوتِ ایمان و انفاق، جو تم سب کے سامنے پیش کی گئی ہے، رحمتِ الٰہیہ کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔ اس دعوتِ ایمان کی تمام برکتیں اس دنیا میں بھی اور اُس دنیا میں بھی تمہیں کو حاصل ہوں گی۔

اِس بات کے بارے میں کہ رءوف اور رحیم کے درمیان کوئی فرق ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو کس قسم کا فرق ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ مناسب ترین رُخ کلام یہی ہے کہ رؤف میں جو محبت کا پہلو ہے اس سے خدا کی وہ محبت مراد ہے جو اُسے اپنے اطاعت گزاروں سے ہے اور رحیم میں جو رحمت کا پہلو ہے اس سے مراد وہ رحمت ہے جو نافرمان افراد کے شاملِ حال ہے۔ بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ رافت کا لفظ اس کے ظہور سے پہلے بھی بولا جاتا ہے لیکن رحمت اسی وقت بولا جاتا ہے جب وہ ظہور میں آچکی ہو۔ اس کے بعد انفاق کے مسئلہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "تم راہِ خدا میں انفاق کیوں نہ کرو حالانکہ زمین اور آسمانوں کی میراث اسی کے لیے ہے"۔ (وما لکم الّا تنفقوا فی سبیل الله ولله میراث السماوات والارض)۔ یعنی آخر کار تم اس جہان اور اس کی نعمتوں سے محروم ہو جاؤ گے اور سب کچھ چھوڑ کر چلے جاؤ گے لہٰذا اب جب کہ تمہارے اختیار میں ہے تو اپنا حصہ کیوں نہیں حاصل کرتے۔ "میراث" اصل میں جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے، اس مال کے معنی میں ہے جو بغیر کسی معاہدہ کے انسان کے ہاتھ لگتا ہے اور جو کچھ میت کی طرف سے پس ماندگان کو ملتا ہے وہ اس کا ایک مصداق ہے۔ کثرتِ استعمال کی وجہ سے اس لفظ کے بیان کے وقت یہی معنی سننے والے کے ذہن میں آتے ہیں: (لله میراث السماوات والارض) کی تعبیر اس لحاظ سے ہے کہ نہ صرف اموال اور رُوئے زمین کی دیگر ثروتیں بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین

1. صحیح بخاری مطابق نقل "مراغی" و "تفسیر فی ظلال القرآن" زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

2. تفسیر نمونہ جلد ۴ در ذیل آیت ۱۷۲ از سورہ اعراف ص ۳۳۱ سے رجوع فرمائیں۔

میں موجود ہے، اسی کی ذات پاک کی طرف لوٹتا ہے۔ تمام مخلوق فنا ہو جائے گی اور خدا ان سب کا وارث ہوگا۔ چونکہ انفاق فی سبیل اللہ مختلف حالات کے اعتبار سے مختلف قدر و قیمت کا حامل ہوتا ہے اس لیے بعد والے جملہ میں مزید فرماتا ہے: "جنہوں نے فتح کے بعد انفاق کیا ہے وہ ان کے برابر نہیں ہیں جنہوں نے فتح سے پہلے انفاق کیا تھا اور جنگ کی ہے۔" (لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل)۔[1]

اس فتح سے مراد کون سی فتح ہے اس کے بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے بعض اس سے فتح مکہ مراد لیتے ہیں جو ہجرت کے آٹھویں سال واقع ہوئی اور بعض اس سے فتح حدیبیہ مراد لیتے ہیں جو چھٹے سال ہجری میں ہوئی۔ البتہ اس بات کے پیش نظر کہ لفظ فتح سورہ (انا فتحنا لك فتحاً مبینا) کی تفسیر فتح حدیبیہ سے کی گئی ہے لہٰذا مناسب یہ ہے کہ یہاں بھی فتح حدیبیہ کی طرف اشارہ ہو۔ لیکن "قاتل" جنگ کرنے کی تعبیر فتح مکہ سے مناسبت رکھتی ہے کیونکہ حدیبیہ میں تو جنگ ہوئی ہی نہیں ہاں البتہ فتح مکہ کے سلسلہ میں مختصر سی تیز جنگ ہوئی تھی جو طول نہ پکڑ سکی۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیت میں "الفتح" سے مراد خود جنس فتح اور اسلامی جنگوں میں سے ہر جنگ میں مسلمانوں کی فتح مراد ہو یعنی وہ لوگ جو بحران کے مواقع پر جان و مال کے خرچ کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے، ان افراد سے جو طوفانوں اور آندھیوں کے رُکنے کے بعد آگے بڑھے ہیں، افضل و برتر ہیں۔ اسی لیے تاکید مزید کے لیے فرماتا ہے: "اس گروہ کا مقام برتر ہے ان لوگوں سے جنہوں نے فتح کے بعد انفاق و جہاد کیا ہے۔"

(اولٰئك اعظم درجة من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا)۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت جو آیت کو فتح مکہ یا فتح حدیبیہ سے منسوب کرتی ہے اس نے اس آیت میں انفاق کرنے والے کا مصداق حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سمجھا ہے حالانکہ اس میں شک نہیں کہ زمانۂ ہجرت سے لے کر اس وقت تک، جو چھ یا آٹھ سال کا طویل عرصہ ہے، اس میں بہت سی جنگیں ہوئیں اور ہزاروں افراد نے راہِ خدا میں انفاق بھی کیا اور جہاد بھی کیا کیونکہ فتح مکہ میں تاریخ کے مطابق دس ہزار افراد نے شرکت کی اور یقیناً اس گروہ میں سے کافی افراد نے جنگ سے متعلق اخراجات کے لیے مالی امداد بھی کی ہوگی اور انفاق فی سبیل اللہ بھی کیا ہوگا اور یہ طے شدہ ہے کہ "قبل" کی تعبیر کے معنی اس فتح کے موقع سے متعلق ہیں نہ کہ آغازِ اسلام سے جو اکیس سال پہلے کی بات ہے۔

اس نکتہ کا بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض مفسرین اس پر اصرار کرتے ہیں کہ انفاق جہاد سے افضل ہے تاکہ ان کے پہلے کیے ہوئے فیصلہ کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ اور شاید اُوپر والی آیت میں جہاد سے پہلے انفاق کے ذکر کو اسی مفہوم کا گواہ سمجھتے ہوں۔ حالانکہ واضح ہے کہ انفاق مالی کو مقدم رکھنا اس بنا پر ہے کہ جنگ کے وسائل، اس کے متعلقات، ساز و سامان اور آلاتِ حرب وغیرہ اس انفاق کے ذریعے ہی فراہم ہوتے ہیں ورنہ اس میں کوئی شک نہیں کہ جان دینا اور شہادت کے لیے آمادہ ہونا انفاقِ مال سے کہیں بہتر و برتر ہے۔ بہرحال چونکہ دونوں گروہ درجات کے فرق کے ساتھ عنایتِ پروردگار کے مستحق ہیں اس لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "خدا نے دونوں گروہوں سے اچھا وعدہ کیا ہے۔" (وکلًا وعد اللہ الحسنیٰ)۔ یہ ان تمام لوگوں کی ایک طرح کی قدر دانی ہے جنہوں نے اس راہ میں قدم اُٹھایا ہے۔ "حسنیٰ" کا یہاں ایک وسیع مفہوم ہے جس سے مراد دُنیا و آخرت کی بھلائیاں ہیں۔ چونکہ عمل کی قدر و قیمت خلوص پر مبنی ہوتی ہے لہٰذا آیت کے آخر میں

---

[1] اس آیت میں کچھ محذوف ہے جس کا مذکور سے استفادہ ہوتا ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے (لا یستوی من انفق من قبل الفتح وقاتل والذین انفقوا بعد الفتح وقاتلوا)

فرماتا ہے: "خدا اُس سے جسے تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے" (واللہ بما تعملون خبیر)۔ خدا تمہارے اعمال کی کمیت وکیفیت سے باخبر ہے اور تمہاری نیتوں اور معیار خلوص سے بھی آگاہ ہے۔ آخری زیر بحث آیت میں انفاق فی سبیل اللہ کے سلسلہ میں شوق دلانے کے لیے پھر ایک جاذب نظر اور عُمدہ تعبیر کے ذریعے فرماتا ہے: "کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دے اور ان اموال میں سے جو اس نے اُسے بخشے ہیں انفاق کرے تاکہ خدا اس کے لیے اس میں بہت سا اضافہ کردے اور بہت سا اجر قرار دے" (من ذاالذی یقرض اللہ قرضاً حسناً فیضاعفہ لہ ولہ اجر کریم)۔ حقیقتاً یہ تعبیر عجیب ہے کہ وہ خدا جو تمام نعمتوں کا بخشنے والا ہے اور ہمارے وجود کے تمام اجزا جس کے فیض بے پایاں کے سمندر سے بہرہ مند ہوتے ہیں، اور وُہ ان سب کا مالک ہے، وہ خود ہمیں صاحب مال شمار کرکے ہم سے قرض کا خواہاں ہے اور پھر، عام قرضوں کے خلاف جن میں اتنا ہی مال واپس کیا جاتا ہے جتنا قرض دیا جائے، بہت زیادہ اضافہ کردے گا کبھی سینکڑوں کی تعداد میں کبھی ہزاروں کی تعداد میں۔ اجرِ عظیم کا وعدہ اس کے علاوہ کیا ہے جو ایک عظیم صلہ ہے جسے خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

چند نکات

۱۔ انفاق کے اسباب

قابل توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیتوں میں انفاق کی تشویق کے لیے، عام اس سے کہ جہاد کے سلسلہ میں مدد کی جائے یا حاجت مندوں کی، دوسرے موضوعات کی تعبیریں بھی نظر آتی ہیں جن میں سے ہر ایک اس مقصد کے حصول کی طرف بڑھنے کا سبب بن سکتا ہے۔ ساتویں آیت میں لوگوں کے ایک دوسرے کے جانشین بننے کے مسئلہ کی طرف اشارہ ہے یا اُن ثروتوں کے سلسلہ میں خدا کے جانشین ہونے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے حقیقی مالکیت کو خدا سے مخصوص کیا گیا ہے اور تمام لوگوں کو اموال کے سلسلہ میں خدا کا نمائندہ تصور کیا گیا ہے۔ یہ انداز فکر ممکن ہے کہ انسان کے ہاتھ اور دل کو انفاق کے معاملہ میں کُشادہ رکھے اور اس کام پر آمادہ ہونے کا سبب بنے دسویں آیت میں ایک اور تعبیر آئی ہے جو سرمایئے کی ناپائیداری اور تمام انسانوں کے فنا ہو جانے کے بعد اس کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ تعبیر "میراث" ہے۔ پروردگار عالم فرماتا ہے: "آسمانوں اور زمین کی میراث خدا کے لیے ہے"۔ گیارہویں آیت میں جو تعبیر ہے وہ سب سے زیادہ حسّاس ہے اس میں خدا کو قرض لینے والا شمار کیا گیا ہے اور وہ ایسا قرض ہے کہ جس میں سُود کا دخل نہیں ہے اور یہ قرض کئی ہزار گنا کرکے واپس کیا جائے گا۔ وہ عظیم اجر اس کے علاوہ ہے جس کا تصور بھی محال ہے۔ یہ سب کچھ اس بنا پر ہے کہ حسن عمل سے انحراف رکھنے والے افکار، حرص و حسد، خود خواہی اور طویل خواہشات کو اُبھارنے والے ان جذبوں کو ختم کرے جو انفاق کی راہ میں حائل ہوتے ہیں اور ایک ایسے معاشرہ کو تشکیل دے جن میں اجتماعی رُوح کارفرما ہو، محبت پر مبنی رشتوں کا احساس ہو اور جس میں بہت زیادہ تعاون کی بنیاد موجود ہو۔

۲۔ راہِ خُدا میں انفاق کے شرائط

مندرجہ بالا آیت میں "قرضاً حسناً" کی تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ قرض دینے کی بھی اقسام ہیں جن میں سے

بعض کو "قرض حسنہ" (اچھا قرض) شمار کیا جاتا ہے اور بعض کو ایسا قرض جس کی کوئی اخلاقی قدر و قیمت نہ ہو۔ قرآن مجید نے اس قرض حسنہ کی شرائط بعض آیات میں بیان کی ہیں جو خدا کو دیا جائے اور بالفاظ دیگر جو ایسا انفاق ہے جس کی قدر کی جانی چاہیئے۔

۱۔ مال کے بہترین حصہ میں سے اس کا انتخاب ہو نہ کہ کم حیثیت مال میں سے۔ (یا ایها الذین اٰمنوا انفقوا من طیّبات ما کسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض ولا تیمموا الخبیث منه تنفقون ولستم باٰخذیه الّا ان تغمضوا فیه واعلموا ان الله غنی حمید) "اے ایمان لانے والو! پاکیزہ اموال میں سے، جو تمہارے ہاتھ آیا ہے یا جسے ہم نے زمین میں سے تمہارے لیے نکالا ہے، خرچ کرو اور ناپاک حصوں کو خرچ کرنے کی طرف دھیان نہ دو جب کہ تم خود تیار نہیں ہو کر انہیں قبول کرو مگر چشم پوشی کے طور پر اور جان لو کہ خدا بے نیاز ہے اور لائق حمد و ستائش ہے"۔ (بقرہ ـ ۲۶۷)

۲۔ ایسے اموال میں سے ہو جس کی انسان کو ضرورت ہو جیسا کہ فرماتا ہے: (و یؤثرون علٰی انفسهم ولو کان بهم خصاصة) وہ دوسروں کو خود پر ترجیح دیتے ہیں جب کہ وہ خود شدت کے ساتھ اس کے حاجت مند ہوں"۔ (حشر ـ ۹)

۳۔ ایسے لوگوں پر انفاق کرو جنہیں شدید ضرورت لاحق ہو اور اولویت کو نظر میں رکھو۔ (للفقراء الذین احصروا فی سبیل الله) "تمہارا انفاق ایسے ضرورت مندوں کے ساتھ مخصوص ہو جو راہ خدا میں محصور ہو گئے ہوں"۔ (بقرہ ـ ۲۷۳)

۴۔ انفاق اگر پوشیدہ طور پر ہو تو بہتر ہے۔ (وان تخفوها وتؤتوها الفقراء فهو خیر لکم) "اگر ضرورت مندوں کو دو اور چھپا کر دو تو بہتر ہے"۔ (بقرہ ـ ۲۷۱)

۵۔ کسی طرح کا احسان جتانا اور آزار پہنچانا اس کے ساتھ نہ ہو۔ (یا ایها الذین اٰمنوا لا تبطلوا صدقاتکم بالمن والاذٰی) اے ایمان لانے والو صدقات کو احسان جتانے اور تکلیف پہنچانے سے باطل نہ کرو۔ (بقرہ ـ ۲۶۴)

۶۔ انفاق اخلاص اور حسن نیت کے ساتھ کیا جائے۔ (ینفقون اموالهم ابتغاء مرضات الله) "وہ لوگ جو اپنا مال خوشنودیٔ خدا کے لیے صرف کرتے ہیں"۔ (بقرہ ـ ۲۶۵)

۷۔ "جو کچھ انفاق کرو اسے چھوٹا اور کم اہم شمار کیا جائے خواہ وہ بظاہر بہت بڑا ہو"۔ (ولا تمنن تستکثر) (مدثر ـ ۶)[1]

۸۔ انفاق ایسے مال میں سے ہو جس سے اُسے دلی لگاؤ ہو اور عشق ہو۔ (لن تنالوا البرّ حتّٰی تنفقوا مما تحبون) "نیکی کی حقیقت کو اس وقت تک نہیں پا سکو گے جب تک اس مال میں سے انفاق نہ کرو جسے عزیز رکھتے ہو"۔ (آل عمران ـ ۹۲)

۹۔ آدمی کو چاہیئے کہ اپنے آپ کو کبھی مالکِ حقیقی تصور نہ کرے بلکہ اپنے آپ کو خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ سمجھے۔ (وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیه)۔ "اس مال سے انفاق کرو جس میں خدا نے تمہیں اپنا نمائندہ قرار دیا ہے"۔ (حدید ـ ۷)

۱۰۔ اور ہر چیز سے پہلے انفاق مال حلال میں سے ہونا چاہیئے کیونکہ خدا صرف ایسے ہی انفاق کو پسند کرتا ہے (انما یتقبل الله من المتقین) (مائدہ ـ ۲۷)

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (لا یقبل الله صدقة من غلول)۔ "خدا اس انفاق کو کبھی قبول نہیں کرتا جس میں خیانت کا دخل ہو"۔[2]

---

[1] اس آیت کی کئی تفسیریں ہیں جن میں سے ایک وہی ہے جو ہم نے اُوپر بیان کی۔ مزید تشریح انشاء اللہ آپ سورہ مدثر کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

(۲ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

شرائط انفاق کے سلسلہ میں جو کچھ عرض کیا گیا وہ اس موضوع کا نہایت اہم حصہ ہے لیکن ان شرائط کو یہیں تک محدود نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اگر آیاتِ کلام مجید اور روایاتِ اسلامی پر زیادہ تفکر کیا جائے تو اور بھی شرائط دستیاب ہوسکتے ہیں۔ جو کچھ عرض کیا گیا ہے ان میں سے بعض شرائطِ انفاق واجب شمار ہوتے ہیں (مثلاً احسان نہ جتانا، تکلیف نہ پہنچانا، ریاکاری سے اجتناب کرنا)۔ بعض شرائطِ کمال ہیں مثلاً خُود ضرورت مند ہونے کے باوجود دوسروں کو اپنے اُوپر ترجیح دینا، اس شرط کا نہ ہونا انفاق کی قیمت کو کم نہیں کرتا اگرچہ اس کو اعلیٰ سطح پر بھی قرار نہیں دیتا۔

جو کچھ کہا گیا ہے اگرچہ انفاق کے موضوع پر تھا لیکن ان میں سے بہت سی شرطیں عام قرضوں پر بھی صادق آتی ہیں اور اصطلاح کے مطابق قرض حسنہ کی شرائط لازم یا شرائط کمال میں سے ہیں۔ راہِ خدا میں انفاق کی اہمیت کے بارے میں مبسوط تشریح سورہ بقرہ کی آیت ۲۶۱ سے لے کر ۲۶۷ تک کے ذیل میں ہم عرض کر چکے ہیں۔ (تفسیر نمونہ جلد ۱)۔

۲۔ ایمان، جہاد اور انفاق میں پیش قدمی کرنے والے

اس میں شک نہیں کہ جو ایمان اور اعمالِ خیر میں دوسروں سے مقدم ہوتے ہیں ان میں شجاعت بھی ہوتی ہے اور انہیں زیادہ آگاہی بھی حاصل ہوتی ہے اور ان میں جذبۂ ایثار و قربانی بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ سب درگاہ خدا میں برابر نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں اس مسئلہ پر انحصار کیا گیا تھا کہ وہ لوگ جنہوں نے (فتح مکّہ یا فتح حدیبیہ) سے پہلے یا مطلق فتوحاتِ اسلام میں انفاق کیا ہے اور جہاد کیا ہے، بارگاہِ خدا میں دوسرے ان کے برابر نہیں ہیں۔ ایک حدیث میں ابوسعید خدری سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ حدیبیہ کے سال (چھ ہجری) ہم رسولِ خداؐ کے ساتھ تھے جس وقت ہم "عسفان" (مکّے کے قریب ایک جگہ ہے) پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

"ہوسکتا ہے کہ عنقریب ایسی قوم آئے جو اپنے اعمال کا تمہارے اعمال سے موازنہ کرتے ہوئے تمہیں چھوٹا تصور کرے۔"

ہم نے کہا وہ کون ہیں؟ اے خدا کے رسولؐ! کیا اس سے مراد قریش ہیں؟ فرمایا:

"نہیں، وہ اہلِ یمن ہیں جن کے دل تم سے زیادہ رقیق اور نرم ہیں (اور ان کے اعمال تم سے زیادہ ہیں)۔

ہم نے عرض کیا کہ کیا وہ ہم سے بہتر ہیں۔ فرمایا:

"اگر ان میں سے کسی ایک کے پاس سونے کا پہاڑ ہو اور وہ اس کا راہِ خدا میں انفاق کرے تو ایک مُد[1] یا اس سے نصف جو تم خرچ کرتے ہو وہ اس کے برابر بھی نہیں ہے۔ جان لو کہ یہ فرق ہے ہمارے

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)
لہ ان دس اوصاف کو مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں اور فخر رازی نے تفسیر کبیر میں اور آلوسی نے رُوح المعانی میں نقل کیا ہے اور ہم نے مختصر سے تغیر اور تکمیل کے ساتھ اس کا اُوپر ذکر کیا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)
[1] ظاہراً مراد ایک مدِ طعام ہے جو کلو سے بہت کم ہے۔

اور دوسرے لوگوں کے درمیان اور خدا کا یہ ارشاد اس کا شاہد ہے کہ (لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح و قاتل ......)[1]

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ پروردگار کو قرض دینے سے مراد اس کی راہ میں ہر قسم کا انفاق ہے جس کا ایک اہم مصداق پیغمبرِ اسلام ص اور امام المسلمین کی مدد کرنا ہے تاکہ وہ حکومتِ اسلامی کے قیام و انصرام کے سلسلہ میں اسے ضروری مصارف میں خرچ کرے۔ اسی لیے کافی کی ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

(ان اللّٰہ لم یسئل خلقه مما فی ایدیھم قرضاً من حاجة به الیٰ ذالك و ما كان للّٰہ من حق فانما هو لولیه)

"خدا نے اپنے بندوں سے کسی احتیاج کی بنا پر قرض کا مطالبہ نہیں کیا۔ جو خدا کے حقوق ہیں وہ اس کے ولی اور نمائندہ کے لیے ہیں۔"[2]

ایک اور حدیث میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے:

(من ذا الذی یقرض اللّٰہ ......) کے ذیل میں مروی ہے کہ (نزلت فی صلة الامام)

"یہ آیت امام کو ہدیہ دینے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔"[3]

---

[1] درالمنثور جلد ۶ ص ۱۷۲

[2] تفسیر صافی ص ۵۲۲

[3] تفسیر صافی ص ۵۲۲

آثرِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد ۱۳ - ۲

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

مِصباحُ القرآن ٹرسٹ

پیشکش، حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر لاہور

حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب ـــــــ تفسیر نمونہ

جلد ـــــــ ۱۳

زیر نظر ـــــــ آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

مترجم ـــــــ حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفیؒ

ناشر ـــــــ مصباح القرآن ٹرسٹ۔ ۱۰ ارگنگا رام بلڈنگ
شاہراہِ قائدِ اعظم، لاہور

مطبع ـــــــ معراج دین پرنٹرز، لاہور

تاریخ اشاعت ـــــــ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ

ہدیہ ـــــــ 200/=

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر

۲۴۔ الفضل مارکیٹ اُردو بازار، لاہور

فون: ۷۱۲۲۴۲۳-۷۳۱۴۳۱۱

۱۲۔ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُورُهُمْ بَيْنَ
أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا ۚ ذٰلِكَ هُوَ
الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

۱۳۔ يَوْمَ يَقُولُ الْمُنٰفِقُونَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِينَ اٰمَنُوا انْظُرُونَا
نَقْتَبِسْ مِنْ نُورِكُمْ ۚ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ
فَالْتَمِسُوا نُورًا ۚ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَهُ بَابٌ ۚ بَاطِنُهُ
فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝

۱۴۔ يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ ۚ قَالُوا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ
فَتَنْتُمْ أَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ
وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانِيُّ حَتّٰى جَاءَ أَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ
بِاللّٰهِ الْغَرُورُ ۝

۱۵۔ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَلَا مِنَ الَّذِينَ

كَفَرُوا ؕ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ○

ترجمہ

۱۲۔ یہ عظیم اَجر اس دن کا ہے جب تو صاحبانِ ایمان مردوں اور عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نُور ان کے سامنے اور ان کے دائیں طرف تیزی سے چل رہا ہو گا۔ (اور ان سے کہیں گے) آج تمہارے لیے بشارت ہو جنّت کے ایسے باغوں کی جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔

۱۳۔ وہ دن کہ جس میں منافق مرد اور عورتیں مومنین سے کہیں گے کہ ہماری طرف نظر کرو تاکہ ہم تمہارے نُور سے روشنی حاصل کریں۔ تو ان سے کہا جائے گا کہ اپنے پیچھے کی طرف پلٹ جاؤ اور کسبِ نُور کرو۔ تو اس وقت ان کے درمیان دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس میں دروازہ ہو گا۔ جس کے اندر رحمت اور باہر عذاب ہے۔

۱۴۔ انہیں پُکار کر کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ وہ کہیں گے ہاں لیکن تم نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا اور پیغمبر کی موت کے منتظر رہے اور ہر چیز میں شک اور تردد رکھتے تھے اور تمہیں تمہاری لمبی چوڑی آرزوؤں نے دھوکے میں رکھا۔ یہاں تک کہ خدا کا فرمان آن پہنچا اور شیطان نے تمہیں خدا کے مقابلہ میں فریب دیا۔

۱۵۔ اس لیے آج تم سے اور کفّار سے کوئی تاوان قبول نہیں کیا جائے گا اور تمہارے رہنے

کی جگہ آگ ہے۔ وہ تمہاری سرپرست ہے اور کیا ہی بُری جگہ ہے۔

تفسیر

ہمیں اپنے نُور سے اِستفادہ کرنے دو

چونکہ گزشتہ آیتوں میں سے آخری آیت میں خدا نے انفاق کرنے والوں کو اَجرِ کریم کی خوش خبری دی تھی، زیرِ بحث آیت میں وہ یہ معیّن کرتا ہے کہ یہ اجرِ کریم کس دن دیا جائے گا۔ فرماتا ہے: "یہ اس دن پر مقرر ہے کہ جس دن ایماندار مرد اور عورتوں کو تو دیکھے گا کہ ان کا نُور ان کے آگے آگے اور دائیں طرف تیزی سے چل رہا ہوگا" (یوم تری المؤمنین والمؤمنات یسعٰی نورھم بین ایدیھم وبایمانھم)۔ اگرچہ یہاں مخاطب پیغمبرِ اسلامؐ ہیں لیکن مسلّم ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس منظر کو دیکھیں گے لیکن چونکہ پیغمبرؐ کی مومنین سے شناسائی ضروری ہے تاکہ وہ ان پر خصوصی نظر رکھیں تو اس نشانی سے آپ انہیں اچھی طرح پہچان لیں گے۔ اگرچہ مفسّرین نے اس نور کے سلسلہ میں بہت سے احتمال تجویز کیے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اس سے مراد نُورِ ایمان کا مجسّم ہونا ہے۔ چونکہ "نورھم" (صاحبِ ایمان مردوں اور عورتوں کا نور) کے الفاظ آئے ہیں، اور تعجب کی بات بھی نہیں ہے، کیونکہ اس دن انسانوں کے عقائد و اعمال کی تجسیم ہوگی، ایمان جو نورِ ہدایت ہے، ظاہری نور اور روشنی کی شکل میں مجسّم ہوگا اور کُفر کہ جو تاریکی مطلق ہے ظاہری تاریکی کی صُورت میں مجسّم ہوگا اسی لیے سُورہ تحریم کی آیت میں ہے یوم لا یخزی اللہ النبی والّذین اٰمنوا معہ نورھم یسعٰی بین ایدیھم) اور اس دن اللہ اپنے پیغمبرؐ اور ان لوگوں کو جو ایمان لا چکے ہیں رسوا نہیں کرے گا اور ان کا نور ان کے آگے چلے گا۔ قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی آیا ہے کہ خدا مومنین کو ظلمت کی طرف سے نور کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ "یسعٰی" سعی کے مادہ سے ہے جس کے معنی تیز حرکت اور چلنے کے ہیں۔ یہ لفظ اس امر کی دلیل ہے کہ بروزِ محشر خود مومنین بھی وہ راہِ بہشت جو سعادتِ جاودانی کا مرکز ہے تیزی سے طے کریں گے کیونکہ ان کے نور کی سریع حرکت ان کی اپنی سریع حرکت سے علیحدہ نہیں ہے۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ گفتگو صرف دو قسم کے انوار کے بارے میں درمیان میں آئی ہے۔ (ایک وہ نور جو مومنین کے آگے آگے چل رہا ہے۔ دوسرے وہ نور جو ان کے دائیں جانب ہے)۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تعبیر مومنین کے دو گروہوں کے بارے میں ہو۔ ایک تو مقربین کا گروہ ہے جن کی صُورت نورانی ہے اور ان کا نور ان کے آگے آگے چلتا ہے۔ دوسرے اصحابِ یمین جن کا نور ان کے دائیں جانب ہے، اس لیے کہ ان کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور اس میں سے نُور پھُوٹے گا۔ یہ احتمال بھی ہے کہ دونوں اشارے ایک ہی گروہ کی طرف ہوں اور نورِ یمین کنایہ ہو۔ اس نور کا جو ان کے نیک اعمال سے نکلے گا اور ان کے تمام اطراف کو گھیر لے گا اور روشن کرے گا۔ بہرحال یہ نور بہشت بریں تک ان کی رہنمائی کرے گا اور اس کے سائے میں وہ جنّت کی راہ تیزی سے طے کریں گے۔ چونکہ یہ نور بلا شک و شبہ ان کے ایمان اور عملِ صالح سے نکلے گا تو ایمان اور عملِ صالح کے اختلافِ مراتب کی وجہ سے لوگ بھی مختلف ہوں گے۔ ایک وہ جن کا ایمان بہت زیادہ قوی ہوگا ان کا نور زیادہ فاصلہ کو روشن کرے گا اور وہ لوگ جن کا ایمان کافی کمزور ہے، انہیں کمتر درجہ کا نور حاصل ہوگا یہاں تک کہ ان کے پاؤں کی اُنگلیوں کی نوکوں کو روشن

کرے گا جیسا کہ تفسیر علی ابن ابراہیم میں آیۂ زیر بحث کے ذیل میں اشارہ ہوا ہے کہ "یقسم النور بین الناس یوم القیامة علیٰ قدر ایمانھم" قیامت کے دن نور لوگوں کے درمیان ان کے ایمان کی مقدار کے مطابق تقسیم ہوگا۔[1]

یہ وہ مقام ہے جہاں ان کے احترام کی وجہ سے ملائکہ کی طرف سے ایک آواز آئے گی: "تمہارے لیے آج کے دن جنت کے باغات کی بشارت ہو جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں"۔ (بشراکم الیوم جنّات تجری من تحتھا الانھار)۔ "اس میں تم ہمیشہ رہو گے اور یہ ایک عظیم کامیابی و رستگاری ہے"۔ (خالدین فیھا ذالك ھو الفوز العظیم)۔

باقی رہے وہ منافقین جو کفر و نفاق اور گناہ کی وحشت ناک تاریکی میں مقیم ہوں گے تو اس موقع پر وہ فریاد کریں گے۔ وہ مومنین سے نور حاصل کرنے کی التجا کریں گے لیکن سوائے انکار کے انہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جیسا کہ بعد والی آیت میں پروردگار عالم فرماتا ہے:

(یوم یقول المنافقون والمنافقات للذین اٰمنوا انظرونا نقتبس من نورکم)۔[2]

"وہ دن جس میں منافق مرد اور عورتیں مومنین سے کہیں گے ہماری طرف دیکھو تاکہ ہم تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں۔

اقتباس کا مادّہ "قبس" ہے جس کے معنی ہیں آگ کا شعلہ لینا۔ اس کے علاوہ نمونوں کے انتخاب کے لیے بھی استعمال ہوا ہے "انظرونا" کے لفظ سے یہ مُراد ہے کہ ہماری طرف نگاہ کرو تاکہ تمہارے چہرہ کے نور سے ہم فائدہ اُٹھائیں اور اپنا راستہ دیکھ لیں، یا ہم پر لُطف و محبت کی نگاہ ڈالو اور اپنے نور کا ایک حصّہ ہمیں بھی دو۔ یہ احتمال بھی ہے کہ "انظرونا" سے مراد انتظار کرنا ہو یعنی ہمیں مہلت دو تاکہ ہم بھی تم تک پہنچ جائیں اور تمہارے نور کے زیر سایہ اپنی راہ تلاش کریں۔ لیکن بہرحال جو جواب انہیں دیا جائے گا وہ یہ ہے کہ اپنے پیچھے کی طرف پلٹ جاؤ اور کسب نور کرو۔ (قیل ارجعوا وراءکم فالتمسوا نوراً)۔ یہ نور حاصل کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ تمہیں چاہیئے تھا کہ یہ نور اس دنیا میں جسے تم پیچھے چھوڑ آئے ہو، ایمان اور عملِ صالح کے ذریعے حاصل کرتے۔ اب وقت گزر چکا ہے اور دیر ہو چکی ہے۔ اس وقت اچانک ان کے گرد ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس میں دروازہ ہوگا۔ (فضرب بینھم بسور له باب)۔ لیکن اس عظیم دیوار کے دونوں اطراف میں یا اس دروازہ کے دونوں اطراف میں بڑا فرق ہوگا" اس کے اندر رحمت اور باہر عذاب ہے"۔ (باطنه فیه الرحمة وظاهره من قبله العذاب)۔ سور کے معنی از روئے لغت دیوار کے ہیں جو گزشتہ زمانے میں شہروں کے گرد کھینچتے تھے جسے فصیل کہتے ہیں اور فارسی میں بارو کہتے ہیں۔ اس فصیل میں مختلف فاصلوں پر محافظوں اور نگہبانوں کے لیے برج ہوتے تھے لہٰذا مجموعی حیثیت سے اُسے" برج و بارو "کہتے ہیں۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "اُس کے اندر رحمت ہے اور باہر عذاب ہے"۔ یعنی مومنین ساکنینِ شہر کی طرح اس باغ کے اندر ہیں اور منافقین بیگانوں اور اجنبیوں کی طرح صحرائی حصہ میں ہیں۔ اس سے پہلے وہ ایک ہی معاشرہ میں اور ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے لیکن مختلف عقائد و اعمال کی ایک عظیم دیوار انہیں ایک دوسرے سے جُدا کیے ہوئے تھی۔ قیامت میں یہی معنی مجسّم ہو جائیں گے۔ رہی یہ بات کہ یہ دروازہ کس لیے ہے، ممکن ہے اس لیے ہو کہ منافقین اس دروازہ سے جنت کی نعمتوں کو دیکھیں اور حسرت و افسوس سے دوچار ہوں۔ یا یہ کہ وہ افراد جن کے گناہ کم ہیں وہ اصلاح کے بعد وہاں سے

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵ ص ۲۴۱، حدیث ۶۰

[2] "انظرونا" کا مادہ نظر ہے جس کے معنی ہیں سوچ بچار کرنا، نگاہ کرنا، کسی شے کا مشاہدہ کرنا یا ادراک کرنا۔ کبھی تامّل یا جستجو کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جب الیٰ کے ساتھ متعدی ہو تو کسی چیز پر نظر ڈالنے کے معنی میں ہے۔ اور جب فی کے ساتھ متعدی ہو تو تامّل و تدبر کرنے کے معنی میں ہے اور جب حرف جر کے بغیر متعدی ہو اور ہم کہیں کہ نظرته وانظرته وانتظرته تو تاخیر کرنے یا انتظار کرنے کے معنی میں ہے۔

گزر جائیں اور مومنین کے پاس آجائیں لیکن یہ دیوار اس طرح کی نہیں ہے کہ جس پر سے آواز نہ گزر سکے اس لیے بعد والی آیت میں مزید فرماتا ہے:
"انہیں پکار کر کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں ہوتے تھے" (ینادونھم الم نکن معکم)۔ ہم دُنیا میں بھی تمہارے ساتھ ایک ہی معاشرہ میں زندگی بسر کرتے تھے اور یہاں بھی تمہارے ساتھ ہی تھے۔ کیا ہوا کہ تم اچانک ہم سے الگ ہوگئے اور اور جوارِ رحمتِ الٰہی میں پہنچ گئے اور ہمیں عذاب کے جنگل میں چھوڑ گئے۔ تو وہ جواب میں کہیں گے کہ ہاں ہم اکٹھے ہی تھے۔ (قالوا بلٰی)۔ ہر جگہ اکٹھے تھے، کوچہ و بازار میں، سفر و حضر میں، کبھی ایک دوسرے کے ہمسائے تھے یہاں تک کہ کبھی ایک ہی گھر میں رہتے تھے لیکن عقیدہ و عمل کے اعتبار سے جُدا بنا لیا تھا اور اصول و فروع میں تم حق سے بیگانہ تھے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:
" تم بڑی بڑی خطاؤں میں گرفتار تھے منجملہ دیگر خطاؤں کے :

۱۔ "تم نے راہِ کفر کے عبور کرنے کی وجہ سے اپنے آپ کو فریب دیا اور ہلاک ہوئے۔ (ولکنکم فتنتم انفسکم)۔

۲۔ "تم پیغمبر کی موت، مسلمانوں کی فنا اور دینِ اسلام کی بساط اُلٹنے کے انتظار میں تھے۔ (و تربصتم)۔ اس کے علاوہ ہر مثبت کام کے انجام دینے اور ہر حرکتِ صحیح کے موقع پر صبر اور انتظار کی حالت میں رہتے تھے اور اس کی وجوہات بیان کرتے تھے۔

۳۔ "ہمیشہ قیامت، پیغمبرؐ کی دعوتِ اسلام اور قرآن کی حقانیت کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا رہتے تھے (وارتبتم)۔

۴۔ "تم ہمیشہ لمبی چوڑی آرزوؤں میں اسیر رہتے، ایسی آرزوئیں جنہوں نے کبھی تمہارا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ خدا کی طرف سے تمہاری موت کا فرمان آن پہنچا۔ (وغرتکم الامانی حتّٰی جاء امر اللّٰہ)۔ ہاں ان آرزوؤں نے تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی صحیح غور و فکر کی مہلت نہیں دی۔ تم خواب و خیال کی حالت میں مستغرق تھے اور توہمات کے عالم میں زندگی بسر کر رہے تھے اور مادی مقاصد اور شہوات کے حصول کی آرزو تم پر غالب تھی۔

۵۔ اُن تمام چیزوں سے قطع نظر، شیطان فریب کار جس نے تمہارے وجود میں اپنا ٹھکانہ مضبوط طور پر بنا رکھا تھا، اس نے تم کو دھوکہ دیا۔ (وغرکم باللّٰہ الغرور)۔ اس نے وسوسوں کے ذریعے تمہیں مغرور کیا۔ کبھی دنیا کو تمہارے سامنے جاودانی بنا کر پیش کیا اور قیامت کو ایک بھولی ہوئی چیز بتایا۔ کبھی تمہیں رحمتِ خدا کے سلسلہ میں مغرور کیا، کبھی وجودِ پروردگار کو مشکوک بنایا۔ یہ پانچ عوامل تھے جنہوں نے باہم مل کر تمہاری راہِ فکر و عمل کو ہماری راہِ فکر و عمل سے بالکل جُدا کر دیا۔ (فتنتم) کا مادہ فتنہ ہے۔ اس کے مختلف معانی ہیں آزمائش و امتحان، فریب دہی، بلا و عذاب، ضلالت و گمراہی اور شرک و بُت پرستی۔ یہاں آخری دو معانی زیادہ مناسب ہیں۔ "تربصتم" کا مادہ "تربص" ہے۔ اس کے معنی ہیں انتظار کرنا۔ چاہے نعمت کا انتظار ہو یا مصیبت کی فراوانی کا۔ یہاں زیادہ تر پیغمبر کی موت اور اسلام کے خاتمہ کا انتظار مراد ہے۔ گناہ سے توبہ اور ہر قسم کے کارِ خیر کے انجام دینے کے بارے میں مختلف بہانے بنانے کے معنی ہیں بھی ہے (وارتبتم) ریب کے مادہ سے ہر ایسے شک اور تردّد کے معنی میں ہے جس کے چہرہ سے بعد میں پردہ اُٹھ جائے۔ یہاں زیادہ تر قیامت اور قرآن کی حقانیت کے بارے میں شک کرنے کے معنی میں ہے۔ اگرچہ آیت میں استعمال ہونے والے الفاظ کا مفہوم وسیع ہے لیکن عنوانات کی ترتیب اس طرح ہے۔ مسئلہ شرک، اسلام اور پیغمبرؐ کی عمر کا اختتام پھر قیامت میں شک، اس کے بعد آرزوؤں اور شیطان کے دیئے ہوئے فریب کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بداعمالیاں اس بنا پر یہ پہلے تین قسم کے جملے اصولِ دین میں سے اوّل تین اصولوں کے بارے میں ہیں اور آخری دو فروعِ دین سے متعلق ہیں۔ آخر کار مؤمنین ایک صورتِ حال میں منافقین کو مخاطب

کرتے ہوئے کہتے ہیں : "آج کے دن تم سے کوئی تاوان یا جرمانہ وصول نہیں کیا جائے گا کہ تم عذابِ الٰہی سے نجات پاؤ" (فالیوم لا یؤخذ منکم فدیۃ)" اور نہ کفار ہی سے" (ولا من الذین کفروا)۔ اس طرح کفار کی قسمت بھی منافقوں جیسی ہے۔ یہ سب کے سب اپنے گناہوں اور بداعمالیوں میں گرفتار ہیں اور ان کی نجات کا کوئی امکان نہیں ہے۔ پھر فرماتا ہے : " تمہاری جگہ آگ ہے"۔ (مأواکم النار)" اور تمہارا مولا اور سرپرست بھی وہی جہنم ہے" (ھی مولاکم)[1]۔

"اور کیا ہی بُری جگہ ہے" (و بئس المصیر)۔ دنیا میں انسان عام طور پر سزاؤں سے بچنے کے لیے یا تو مالی نقصان برداشت کرتا ہے یا پھر کسی مددگار اور سفارش کرنے والے سے اعانت کا طلب گار ہوتا ہے لیکن آخرت میں کفار اور منافقین کے لیے ان دونوں میں سے کچھ نہیں ہے۔ قیامت اصولی طور پر وہ تمام مادی وسائل و اسباب بیکار ہو جائیں گے جو اس دنیا میں حصولِ مقاصد کے لیے کارآمد ہوتے ہیں۔ وہاں رشتے منقطع ہو جائیں گے جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۶۶ میں ہم پڑھتے ہیں۔ (وتقطعت بھم الاسباب)" اس دن نہ لین دین ہے اور نہ دوستی کا رابطہ"۔ (یوم لا بیع فیہ ولا خلۃ) (بقرہ ۔ ۲۵۴) " نہ کوئی عوض لیا جائے گا" (ولا یؤخذ منھا عدل) (بقرہ ۔ ۴۸)۔ " اور نہ کوئی شخص اپنے دوست کی فریاد کو پہنچے گا" (یوم لا یغنی مولًی عن مولًی شیئًا) (دخان ۔ ۴۱) " نہ منصوبے اور بہانے کام آئیں گے"۔ (یوم لا یغنی عنھم کیدھم شیئًا) (طور ۔ ۴۵) " نہ نسب اور رشتہ داری کا رابطہ کسی کام آئے گا" (فلا انساب بینھم یومئذٍ) (مومنون ۱۰۱) " خلاصہ یہ ہے کہ تمام لوگ اپنے اعمال میں گرفتار اور اپنے افعال میں گروی ہیں" (کل نفس بما کسبت رھینۃ) (مدثر ۳۸) اس طرح قرآن واضح کرتا ہے کہ اس دن نجات کا واحد ذریعہ ایمان اور عملِ صالح ہے، یہاں تک کہ شفاعت کا دائرہ بھی محدود ہے۔ شفاعت صرف ان کے لیے ہے جو مذکورہ دونوں صفتوں میں سے کچھ حصہ اپنے پاس رکھتے ہوں نہ کہ وہ لوگ جو ایمان و عمل صالح سے بالکل بیگانہ ہیں اور جنہوں نے خدا اور اس کے اولیا سے اپنا رشتہ بالکل منقطع کر رکھا ہے۔

ایک نکتہ

قیامت میں مجرموں کا بے مقصد مدد کرنا

چونکہ بہت سے لوگ عرصہ محشر میں آنے کے وقت اس نظام سے جو وہاں رائج ہے نا آشنا ہیں لہٰذا وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ وہاں بھی دنیاوی نظام رائج ہیں لہٰذا اُن سے فائدہ اُٹھائیں گے لیکن وہ بہت جلد سمجھ جائیں گے کہ وہ ایک عظیم غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ کبھی مجرم مومنین سے مدد طلب کریں گے اور کہیں گے۔ (انظرونا نقتبس من نورکم) ہم پر ایک نگاہ ڈالو تاکہ ہم تمہارے ایمان اور عملِ صالح کی روشنی سے کچھ نور حاصل کریں۔ (آیات زیر بحث) لیکن انہیں بہت جلد انکار سے دوچار ہونا پڑے گا اور وہ سُنیں گے کہ منبعِ نور یہاں نہیں ہے بلکہ وہاں دنیا میں تھا جہاں سے تم بے خبری کی حالت میں گزر آئے ہو۔ کبھی مجرم ایک دوسرے سے مدد طلب کریں گے۔ (پیرو کار اپنے رہبروں سے) اور کہیں گے: (فھل انتم مغنون عنا من عذاب اللہ من شیء) کیا تم ہمارے بدلے عذابِ الٰہی کا ایک حصہ قبول کرتے ہو؟ (ابراہیم ۔ ۲۱)۔

---

[1] مولیٰ یہاں ہوسکتا ہے کہ ولی و سرپرست کے معنی میں ہو یا اس چیز اور شخص کے معنی میں ہو جو انسان کے لیے اہمیت رکھتی ہو۔

انہیں یہاں بھی انکار سے دوچار ہونا پڑے گا حتیٰ کہ وہ خازنین جہنم سے ملتجی ہو کر کہیں گے : (ادعوا ربکم یخفف عنا یوما من العذاب) " اپنے پروردگار سے استدعا کرو کہ ایک دن کے لیے ہم پر سے عذاب ہٹا لے "۔ (مومن - ۴۹) کبھی اس سے بھی آگے بڑھ کر خدا سے مدد طلب کریں گے اور عرض کریں گے :(ربنا اخرجنا منھا فان عدنا فانا ظالمون) " پروردگار ہمیں اس جلانے والی آگ سے باہر لے آ۔ اگر ہم دوبارہ لوٹ آئے تو ہم ظالم ہیں "۔ (مومنون - ۱۰۷)

۱۶۔ اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ
اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ
قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝
۱۷۔ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَيَّنَّا
لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝
۱۸۔ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ
قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝

ترجمہ

۱۶۔ کیا وہ وقت نہیں آیا کہ جب مؤمنین کے دل ذکرِ خدا اور جو حق سے نازل ہوا ہے اس سے خشوع اختیار کریں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے آسمانی کتاب دی گئی ہے پھر ان پر ایک طویل زمانہ گزر گیا اور ان کے دلوں میں قساوت پیدا ہوگئی اور ان میں سے بہت سے گنہگار ہیں۔

۱۷۔ جان لو کہ خدا زمین کو اس کے مُردہ ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے۔ ہم نے اپنی آیات

تمہارے لیے بیان کی ہیں۔ شاید تم عقل کرو (اور سوچو)

۱۸۔ انفاق کرنے والے مرد اور عورتیں اور وہ جو خدا کو قرض حسنہ دیں ان کے لیے وہ رقم کئی گنا ہو جائے گی اور ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔

شانِ نزول

پہلی زیرِ بحث آیت کے متعلق کئی شانِ نزول بیان ہوئی ہیں منجملہ ان سب کے ایک یہ ہے کہ آیت مذکورہ ہجرت کے ایک سال بعد منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس بنا پر کہ ایک دن انہوں نے حضرت سلمان فارسیؓ سے پوچھا "جو کچھ تورات میں ہے ہم سے اس کی بات کرو کیونکہ تورات میں تعجب خیز مسائل ہیں" اس طرح وہ چاہتے تھے کہ قرآن کو نظر انداز کر دیں۔ اس بنا پر سورہ یوسف کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں تو سلمانؓ نے ان سے کہا کہ یہ قرآن احسن القصص ہے اور بہترین واقعات بیان کرتا ہے اور تمہارے لیے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ سود مند ہے۔ انہوں نے ایک مدت تک اپنے سوال کو نہ دہرایا پھر وہ سلمان کے پاس آئے اور اپنی خواہش کی تکرار کی تو اس وقت یہ آیت (اللہ نزل احسن الحدیث کتابًا متشابھًا مثانی تقشعر منہ جلود الذین یخشون ربھم ...) "خدا نے بہترین گفتگو کو نازل کیا ہے۔ ایسی کتاب جس کی آیات (لطف و زیبائی اور معانی کے لحاظ سے) ایک دوسرے کے مانند ہیں اس کی آیات مکرر ہیں۔ (لیکن یہ تکرار شوق انگیز ہے)۔ ان آیتوں کے سننے سے وہ لوگ جو خدا سے ڈرتے ہیں لرزہ براندام ہو جاتے ہیں ..." (زمر-۲۳)

پھر انہوں نے ایک مدت تک اپنے سوال کو نہ دہرایا۔ پھر تیسری مرتبہ سلمانؓ کے پاس آئے اور اپنا سوال دہرایا تو اس وقت زیرِ بحث آیت نازل ہوئی (اور ان کا مواخذہ کیا کہ کیا اس بات کا موقع نہیں آیا کہ تم خدا سے ڈرو اور ان باتوں سے دستبردار ہو جاؤ)۔

ایک اور شانِ نزول اس طرح ہے کہ پیغمبرؐ کے اصحاب مکہ میں خشک سالی اور سختی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ پھر جس وقت انہوں نے ہجرت کی اور ان کو نعمتوں کی فراوانی حاصل ہوئی تو ان کی کیفیت بدل گئی اور ایک جماعت کے دلوں میں سختی آگئی حالانکہ امکان اس بات کا زیادہ تھا کہ، قرآن ہمراہ ہونے کی وجہ سے، ان کے ایمان، خلوص اور یقین میں اضافہ ہو۔ (تو والی آیت نازل ہوئی اور اس نے ان کو تنبیہ کی)[1]

اس آیت کے سلسلہ میں کچھ اور شانِ نزول بھی نظر آتی ہیں لیکن چونکہ وہ آیت کو مکی بتاتی ہیں لہٰذا قابلِ اعتبار نہیں ہیں کیونکہ مشہور یہ ہے کہ یہ ساری سورت مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔

تفسیر

غفلت و بے خبری کب تک

ان تمام سرکوبی کرنے والی تنبیہوں اور گزشتہ آیتوں میں بیدار کرنے والی تخویفوں اور قیامت میں کافروں اور منافقوں کا جو حال ہوگا اس کو

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۲۳۷۔ تفسیر درالمنثور میں بھی کئی شانِ نزول بیان ہوئی ہیں جو مذکورہ دوسری شانِ نزول مطابقت رکھتی ہیں۔ درالمنثور جلد ۶ ص ۱۷۵۔ بیضاوی نے بھی اپنی تفسیر انوار التنزیل میں یہ شانِ نزول نقل کی ہے۔

بیان کرنے کے بعد پہلی زیر بحث آیت میں پروردگار عالم نتیجہ پیش کرتے ہوئے فرماتاہے : کیا اس چیز کا وقت نہیں آیا کہ صاحبِ ایمان افراد کے دل ، ذکرِ خدا سے اور جو کچھ حق میں سے نازل ہوا ہے ، اس سے خوف کھائیں اوران لوگوں کی طرح نہ ہوں جنہیں گزشتہ زمانے میں آسمانی کتاب دی گئی (مثل یہود و نصاریٰ کے) پھر ان کے اور پیغمبروں کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔ انہوں نے طولانی عمر پائی اور خدا کو فراموش کیا۔ ان کے دلوں میں قساوت پیدا ہوگئی ان میں سے بہت سے فاسق اور گنہگار تھے ۔ (الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ وما نزل من الحق ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتاب من قبل فطال علیھم الامد فقست قلوبھم وکثیر منھم فاسقون)[1]

" تخشع " کا مادہ "خشوع " ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ حالتِ تواضع اور جسمانی و رُوحانی اَدب جو کسی عظیم حقیقت یا بزرگ شخصیت کے سامنے کوئی انسان اختیار کرے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اگر خدا کی یاد انسان کے دل اور اس کی رُوح کی گہرائیوں میں اُتر جائے اور وہ ان آیات کو سُنے جو پیغمبرِ خُدا پر نازل ہوئی ہیں اور ان میں غور و فکر کرے تو ان آیتوں کو خوفِ خُدا کا سبب بننا چاہیئے۔ لیکن قرآن یہاں مؤمنین کے ایک گروہ کو سخت ملامت کرتا ہے کہ وہ ان حقائق کے پیشِ نظر کیوں خشوع اختیار نہیں کرتے اور بہت سی گزشتہ اُمتوں کی طرح کیوں غفلت و بے خبری کا شکار ہیں۔ وہی غفلت جس کا نتیجہ قساوتِ قلبی ہے اور وہی قساوت جس کا ثمر فسق و فجور اور گناہ ہے۔ کیا صرف ایمان کے دعویٰ پر قناعت کرنا اور اہم مسائل کے نزدیک سے بہ آسانی گزر جانا اور خود کو خوشحالی کے سپرد کر دینا اور ناز و نعمت میں رہنا اور ہمیشہ عیش و عشرت میں مگن رہنا ایمان کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے؟ (طال علیھم الامد) " ان پر زمانہ طولانی ہوگیا " یہ جملہ ہو سکتا ہے ان لوگوں اور ان کے پیغمبروں کے درمیانی فاصلہ کی طرف اشارہ ہو یا ان کے طول عمر اور آرزوؤں کی کثرت کی طرف یا عذاب الٰہی کے طویل زمانہ تک نازل نہ ہونے کی طرف یا ان سب کی طرف اس لیے کہ ممکن ہے ان میں سے ہر چیز غفلت و قساوتِ قلبی کا سبب ہو اور وہ فسق و گناہ کا سبب بنے۔

ایک حدیث میں حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

(لا تعاجلوا الامر قبل بلوغہ فتندموا ولا یطولن علیکم الامد فتقسو قلوبکم)۔

" کسی کام کے سلسلہ میں اس کا وقت آنے سے پہلے ، جلدی نہ کرو ورنہ پشیمان ہوگے اور تمہارے اور حق کے درمیان طویل فاصلہ نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ اس سے تمہارے دل قساوت کا شکار ہو جائیں گے۔"[2]

ایک اور حدیث میں حضرت عیسٰیؑ کی زبانی یہ مروی ہے کہ :

(لا تکثروا الکلام بغیر ذکر اللہ فتقسو قلوبکم فان القلب القاسی یعید من اللہ ولا تنظروا فی ذنوب العباد کانکم ارباب وانظروا فی ذنوبکم

---

[1] " یأن " کا مادہ " أنی " (بروزن امن) ہے اور " انا " بروزن " ندا " کے مادہ سے اور " أناء " بروزن " جفاء " کے مادہ سے نزدیک ہونے اور کسی چیز کے حضور کے وقت کے معنوں میں ہے ۔

[2] " بحار الانوار " جلد ۷۸ ص ۸۳ حدیث ۸۵۔

کانکم عبید، والناس رجلان : مبتلی، ومعافی، فارحموا اھل البلاء، واحمدوا الله علی العافیة)

" خدا کے ذکر سے جو خالی ہوں وہ باتیں زیادہ نہ کرو یہ قساوتِ قلب کا باعث ہے اور قساوت رکھنے والا دل خدا سے دُور ہے۔ بندوں کے گناہوں پر اس طرح نظر نہ ڈالو جس طرح مالک اپنے غلاموں پر نظر ڈالتے ہیں بلکہ اپنے گناہوں کی طرف اس طرح دیکھو جیسے کوئی غلام اپنے آقا کے سامنے ہو۔ لوگ دو طرح کے ہیں۔ ایک گروہ مبتلا ہے اور دوسرا اہلِ عافیت کا گروہ ہے۔ مبتلاؤں پر رحم کرو اور اہلِ عافیت کو دیکھ کر خدا کی حمد و ستائش کرو۔"[1]

چونکہ ذکرِ خدا سے مُردہ دلوں کا زندہ ہونا اور قرآن کے سامنے خضوع و خشوع اختیار کرنے سے حیاتِ معنوی کا پیدا ہونا، بارش کے حیات بخش قطروں کی برکت سے مُردہ زمینوں کے زندہ ہونے کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے اس لیے بعد والی آیت میں مزید فرماتا ہے:

" جان لو کہ خدا زمین کو مُردہ ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے۔" (اعلموا ان الله یحی الارض بعد موتھا)۔ " ہم اپنی آیتوں کو آفرینش کے میدان میں اور وحی کے میدان میں تمہارے لیے واضح کرتے ہیں اس خیال سے کہ شاید تم عقل سے کام لو" (قد بینا لکم الاٰیات لعلکم تعقلون)۔ درحقیقت یہ آیت بھی بارش کے وسیلہ سے زمینِ مُردہ کے زندہ ہونے کی طرف اور ذکرِ خدا و قرآن کے وسیلہ سے دل ہائے مُردہ کے زندہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن وہ ہے جو خدا کی طرف سے قلبِ پاک پیغمبر پر نازل ہوا ہے۔ ذکرِ خُدا و قرآن دونوں تدبّر و تعقل کے مستحق ہیں اسی لیے اسلامی روایات میں دونوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک حدیث امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے۔ آپؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا :

العدل بعد الجور

زمین کا عدالت و انصاف کے ذریعے زندہ ہونا مُراد ہے بعد اس کے کہ وہ ظلم و جور سے مُردہ ہو چکی ہو۔[2]

ایک دوسری حدیث امام محمد باقرؑ سے مروی ہے کہ آپؑ نے " اعلموا ان الله یحی الارض بعد موتھا " کی تفسیر میں فرمایا :

(یحی الله تعالی بالقائم بعد موتھا یعنی بموتھا کفر اھلھا والکافر میت)۔

" خدا زمین کو حضرت مہدیؑ کے ذریعے زندہ کرے گا بعد اس کے کہ وہ مُردہ ہو چکی ہو گی اور زمین کے مُردہ ہونے سے مُراد اس کے رہنے والوں کا کفر ہے اور کافر مُردہ ہے۔"[3]

یہ بات کہے بغیر ظاہر ہے کہ یہ تفسیریں زیرِ بحث آیت کے مصداقوں کا بیان ہیں اور ہرگز آیت کے مفہوم کو محدود نہیں کرتیں۔ ایک اور حدیث میں امام موسیٰ کاظمؑ سے منقول ہے کہ :

فان الله یحی القلوب المیتة بنور الحکمة کما یحی الارض المیتة بوابل المطر

" خدا مُردہ دلوں کو نورِ حکمت سے زندہ کرتا ہے جیسا کہ مُردہ زمینوں کو بابرکت بارشوں سے زندہ کرتا ہے"[4]

---

[1] " مجمع البیان " جلد ۹ ص ۲۳۸

[2] روضۃ الکافی مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۴۳۔

[3] " کمال الدین " مطابق نقل " نور الثقلین " جلد ۵ ص ۲۴۲

[4] بحار جلد ۷۸ ص ۳۰۸۔

بعد والی آیت ایک مرتبہ پھر انفاق، جو شجرِ ایمان کا ایک پھل ہے، اس کی طرف توجہ دلاتی ہے اور اسے موضوعِ گفتگو بناتی ہے اور وہی تعبیر جو گزشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں اسے کچھ اضافوں کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

"وہ مرد اور عورتیں جو راہِ خدا میں انفاق کریں اور وہ جو اس طرح خدا کو قرضِ حسنہ دیں خدا اس قرض کو کئی گنا کرتا ہے اور ان مردوں اور عورتوں کے لیے بیش قیمت اجر ہے" (انّ المصّدقین والمصّدقات و اقرضوا الله قرضاً حسناً یضاعف لھم ولھم اجر کریم)[1]

مسئلہ انفاق کو خدا نے قرضِ حسنہ دینے کے عنوان کے ماتحت کیوں پیش کیا ہے اور مذکورہ اضافہ اور اجرِ کریم کس بنا پر ہے اس سورہ کی آیت ۱۱ کے ذیل میں ہم اس پر بحث کر چکے ہیں۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال تجویز کیا ہے کہ اس آیت میں اور اسی قسم کی دوسری آیتوں میں[2] خدا کو قرضِ حسنہ دینے سے مُراد بندوں کو قرض دینا ہے اس لیے کہ خدا کو قرض لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مومن بندے ہی ہیں جنہیں قرض کی ضرورت ہے لیکن آیات کے سیاق و سباق کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ نظر آتا ہے کہ ان آیات میں قرضِ حسنہ سے مُراد وہی انفاق فی سبیل اللہ ہے اگرچہ بندگانِ خدا کو قرض دینا بھی افضل و برتر اعمال میں سے ہے اور یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے۔ فاضل مقداد نے بھی کنزالعرفان میں انہی معانی کی طرف اشارہ کیا ہے، اگرچہ وہ قرضِ حسنہ کی تفسیر میں تمام اعمالِ صالح کو پیش کرتے ہیں۔[3]

وُہ گنہگار افراد جنہوں نے یہ آیت سُن کر توبہ کی

آیت (الم یأن للذین اٰمنوا ۔۔۔) قرآن مجید کی ان لرزہ براندام کر دینے والی آیتوں میں سے ہے جو انسان کے دل اور اس کی رُوح کو مسخر کرتی ہیں اور غفلت کے پردے چاک کر کے پُکار پُکار کر کہتی ہیں کیا اس کا موقع نہیں آپہنچا کہ ایماندار دل خدا کے ذکر سے اور جو حق سے نازل ہوا ہے اس کو سُن کر خدا کا خوف اختیار کریں اور ان لوگوں کے مانند نہ ہوں جنہوں نے کتابِ آسمانی کی آیات کا ادراک کیا لیکن طولِ زمان کے زیرِ اثر ان کے دل قساوت کی طرف مائل رہے۔ اس لیے تاریخ کے طویل دور میں ہم بہت سے گنہگار افراد کو دیکھتے ہیں جو اس آیت کو سُن کر اس طرح کانپ اُٹھتے ہیں کہ ایک ہی لمحے میں اپنے تمام گناہوں کو ترک کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اُن میں سے بعض زاہدوں اور عابدوں میں قرار پائے ہیں۔ منجملہ دوسروں کے فضیل بن عیاض ہیں۔ فضیل جو کُتبِ رجال میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے موثق راویوں میں سے ہیں اور مشہور زاہدوں میں شمار ہوتے ہیں وہ آخری زندگی میں جوارِ کعبہ میں رہائش رکھتے تھے۔ انہوں نے اسی علاقہ میں بروز عاشورہ دُنیا سے رختِ سفر باندھا۔ وہ ابتدا میں ایک خطرناک رہزن تھے جس سے تمام لوگ ڈرتے تھے۔ وہ ایک آبادی کے قریب سے گزر رہے تھے کہ ایک لڑکی کو اُنہوں نے دیکھا۔ اس سے انہیں محبت ہو گئی۔ اس لڑکی کے عشق نے انہیں اس بات کی انگیخت دی کہ رات کے وقت وہ اس کے گھر کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہوں اور ہر قیمت پر اس کا وصال حاصل کریں۔ وہ جس وقت دیوار پھاند رہے تھے تو اس وقت قریب کے گھروں میں سے

---

[1] "المصدقین والمصدقات" المتصدقین والمتصدقات کے معنی میں ہے اور اقرضوا الله کا عطف جو جملہ فعلیہ ہے گزشتہ جملہ اسمیہ پر اسی بنا پر ہے کیونکہ یہ جملہ الذین اقرضوا الله کے معنی میں ہے۔

[2] بقرہ ۔ ۲۴۵، تغابن ۔ ۱۷، مزمل ۔ ۲۰۔ حدید ۔ ۱۱

[3] کنزالعرفان جلد ۲ ص ۵۸۔

ایک گھر میں کوئی شخص تلاوتِ قرآن مجید میں مشغول تھا اور وہ اس آیت کی تلاوت کر رہا تھا: الم یأن للذین اٰمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ ــ یہ آیت ایک تیر کی طرح فضیل کے دل پر لگی۔ انہوں نے دل میں چُبھن محسوس کی۔ ان کے دل میں ایک قسم کا ہیجان برپا ہوگیا۔ اُنہوں نے تھوڑا سا اس پر غور و فکر کیا کہ کون ہے جو یہ گفتگو کر رہا ہے اور کیسے یہ پیام دے رہا ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اے فضیل کیا وہ وقت نہیں آپہنچا کہ تُو بیدار ہو اور اس راہِ خطا سے لوٹ آئے؛ اس گناہ سے اپنا دامن بچالے اور توبہ کی راہ اختیار کرے؟ اچانک فضیل کی صدا بلند ہوئی۔ وہ مسلسل کہے جا رہے تھے: (بلی واللہ قد اٰن، بلی واللہ قد اٰن) " خدا کی قسم اس کا وقت آپہنچا ہے خدا کی قسم اس کا وقت آپہنچا ہے"۔ انہوں نے آخری فیصلہ کیا اور پختہ ارادہ کر لیا اور وہ بجلی کی سی ایک جست لگا کر حلقۂ اشقیا سے نکل آئے اور صفِ سعدا میں شامل ہوگئے۔ وہ دلوار سے نیچے اُتر آئے اور ایک ایسے خرابے میں داخل ہوئے جہاں مسافروں کی ایک جماعت قیام پذیر تھی۔ وہ مسافر اپنی منزل کی طرف کُوچ کرنے کے سلسلہ میں ایک دوسرے سے مشورہ کر رہے تھے اور آپس میں یہ کہہ رہے تھے، کہ فضیل اور اس کے ساتھی راستے میں ہیں اگر ہم جائیں گے تو وہ ہمارا راستہ روک لیں گے اور ہمارا مال و اسباب لُوٹ لیں گے۔ فضیل لرز گئے اور اپنے آپ کو سخت ملامت کرنے لگے اور کہنے لگے کہ میں کتنا بُرا شخص ہوں۔ یہ کون سی شقاوت و بدبختی ہے جس میں مبتلا ہوں۔ رات کی تاریکی میں گناہ کے ارادہ سے مَیں باہر نکلا ہوں اور مسلمانوں کا ایک گروہ میرے خوف کی وجہ سے اس خرابہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوا ہے۔ انہوں نے آسمان کی طرف مُنہ کیا اور توبہ کرنے والے دل سے ان الفاظ کو اپنی زبان پر جاری کیا: اللّٰھم انی تبت الیك وجعلت توبتی الیك جوار بیتك الحرام ۔ خدایا مَیں تیری طرف لوٹ آیا اور اپنی توبہ یہ قرار دی ہے کہ ہمیشہ تیرے گھر کے قُرب میں رہوں گا۔ خدایا میں اپنی بدکاری پر رنجیدہ ہوں اور اپنی دنائت کی وجہ سے آہ و بکا کرتا ہوں تو میرے درد کی دوا کر۔ اے ہر درد کی دوا کرنے والے! اے ہر عیب سے پاک و منزہ! اے وہ جو میری خدمات بجالانے سے بے نیاز ہے! اے وہ جسے میری خیانت سے کوئی نقصان نہیں! مجھے اپنی رحمت کے صدقہ میں بخش دے اور مجھ ہوا و ہوس کے اسیر کو اس قید و بند سے رہائی بخش۔ خُدا نے ان کی دُعا قبول کی اور ان پر عنایات فرمائیں وہ وہاں سے لَوٹ کر مکّہ آئے برسوں تک وہاں مجاور رہے اور اولیاء اللہ میں سے ہوگئے۔

ع گدائے کُوئے تو از ہشت خلد مستغنی است اسیرِ عشق تو از ہر دو کون آزاد است

تیرے کُوچہ کا گدا آٹھوں بہشتوں سے مستغنی ہے اور تیرے عشق کا قیدی دونوں جہاں سے آزاد ہے[1]

بعض مفسّرین نے لکھا ہے کہ بصرہ کے مشہور افراد میں سے ایک فرد کہتا ہے کہ میں ایک راستے سے گزر رہا تھا۔ اچانک ایک چیخ میں نے سُنی۔ مَیں اس چیخ مارنے والے کے قریب پہنچا تو مَیں نے دیکھا کہ ایک شخص زمین پر بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ مَیں نے پوچھا یہ کون ہے تو لوگوں نے بتایا کہ یہ ایک بیدار دل شخص ہے۔ قرآن کی ایک آیت اس نے سُنی ہے اور مدہوش ہوگیا ہے۔ مَیں نے کہا کہ کون سی آیت تو انہوں نے بتایا: الم یأن للذین اٰمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ ۔۔۔ میری آواز سُن کر وہ بے ہوش شخص اچانک ہوش میں آگیا اور ہوش میں آکر اس نے ان دل سوز اشعار کو پڑھنا شروع کیا:

اما اٰن للھجران ان یتصرما و للغصن غصن البان ان یتبسّما

و للعاشق انصب الذی ذاب وانحنی الم یأن ان یبکی علیہ و یرحما

[1] اقتباس از سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۳۶۹۔ اور رُوح البیان جلد ۹ ص ۳۶۵۔ اور تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۶۴۲۱

کتبت بماء الشوق بین جوانحی کتابا حکی نقش الوشی المنمنما

کیا اس کا موقع نہیں آیا کہ ہجر کا وقت ختم ہو اور میری اُمید کی بلند شاخ اور اس کی خوشبو مسکرائے اور کیا اس کا وقت نہیں آیا کہ اس بیقرار عاشق کے لیے جو پگھل کر پانی ہو چکا ہے اور اس کی کمر جھک گئی ہے، لوگ گریہ کریں اور وہ مرکز رحم قرار پائے جی ہاں شوق کے پانی کی روشنائی سے میں نے اپنے صفحہ دل پر لکھ دیا ہے اور ایک ایسا نامۂ شوق تحریر کیا ہے جو بہت ہی خوبصورت عُمدہ اور جاذبِ توجہ ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا مشکل ہے مشکل ہے یہ کہہ کر وہ دوبارہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا اس کو ہم نے ہلا کر دیکھا تو وہ اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر چکا تھا[1]

---

[1] تفسیر رُوح المعانی جلد ۲۷ ص ۱۵۶۔

۱۹۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ
وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۖ
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝

۲۰۔ اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّ
تَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۖ
كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ
فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۖ وَفِى الْاٰخِرَةِ
عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۖ وَ
مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝

ترجمہ

۱۹۔ وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسولؑ پر ایمان لے آئے وہ صدیقین و شہدا ہیں۔ اپنے پروردگار کے پاس۔ ان کے (اعمال) کا اجر اور ان کا نور (ایمان) ان کے لیے ہے اور جو لوگ کافر ہو گئے اور انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی وہ اصحاب جحیم ہیں۔

۲۰۔ جان لو کہ زندگیٔ دُنیا صرف کھیل کُود، سرگرمی، تجمل پرستی اور تمہارے درمیان تفاخر ہے اور مال و اولاد میں اضافہ کا طلب کرنا اس بارش کی طرح جس کا حاصل کسانوں کو تعجب میں ڈال دیتا ہے، پھر وہ (کھیتی) خشک ہو جاتی ہے اس طرح کہ تو اسے زرد دیکھتا ہے پھر وہ خشک بھوسہ کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ آخرت میں یا عذاب شدید ہے یا مغفرت و رضائے الٰہی۔ بہرحال زندگیٔ دنیا متاعِ غرور کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

تفسیر

دُنیا متاعِ غرور کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں

گزشتہ آیات کی بحث جس میں مومنین اور بارگاہِ خدا میں ان کے اجر سے متعلق گفتگو تھی اس کو جاری رکھتے ہوئے پروردگارِ عالم زیرِ بحث آیت میں مزید فرماتا ہے:

"وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہ اپنے پروردگار کے ہاں صدیقین اور شہداء ہیں: (والذین اٰمنوا باللہ ورسلہ اولٰئک ھم الصدیقون والشھداء عند ربھم)۔ "صدیق" صدق سے ہے اور صیغہ مبالغہ ہے اور اس شخص کے معنی میں ہے جو سراپا صداقت ہو۔ وہ جس کا علم اس کی گفتار کی تصدیق کرتا ہو اور وہ سچائی کا کامل نمونہ ہو۔ "شہداء" جمع ہے شہید کی، اس کی مادہ شہود ہے جس کے معنی ایسا حضور ہیں جس کے ساتھ مشاہدہ وابستہ ہو۔ چاہے وہ ظاہری آنکھ سے ہو چاہے دل کی آنکھ سے۔ اور اگر گواہ پر شاہد و شہید کا اطلاق ہوتا ہے تو وہ اس بنا پر ہے کہ اس نے کسی منظر کا مشاہدہ حاضر رہ کر کیا ہے۔ اسی طرح جس طرح اس کا اطلاق شہیدان راہِ خدا پر میدانِ جہاد میں ان کے حاضر ہونے کی بنا پر ہوتا ہے۔ لیکن زیرِ بحث آیت میں ہو سکتا ہے کہ، اعمال کی شہادت کے معنی میں ہو جیسا کہ قرآن کی دوسری آیتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اور انبیاءؑ اپنی اپنی اُمتوں کے اعمال کے گواہ ہیں اور پیغمبرِ اسلامؐ ان کے گواہ بھی ہیں اور اپنی اُمت کے بھی اور مسلمان بھی لوگوں کے اعمال کے شاہد اور گواہ ہیں[1]

اس بنا پر شہداء کا مقام (اعمال کے گواہ) ایک بلند مقام ہے جو ایمان دار افراد کو حاصل ہے۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال تجویز کیا ہے کہ یہاں شہداء انہی شہدائے راہِ خدا کے معنوں میں ہے یعنی جو مومن ہے وہ شہیدوں جیسا اجر رکھتا ہے اور بمنزلہ شہداء ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: (ادع اللہ ان یرزقنی الشھادۃ)۔ خدا سے دُعا

[1] تفسیر نمونہ کی جلد ۷ سورہ حج کی آیت ۸۸ کے ذیل میں اور جلد ۲ سورہ نساء کی آیت ۴۱ کے ذیل میں جو تحریر ہے اس کی طرف رجوع فرمائیں۔

کیجئے کہ وہ مجھے شہادت عطا فرمائے۔

امامؑ نے فرمایا :

"ان المؤمن شہید وقرأ ھٰذہ الاٰیۃ"

مومن شہید ہے اور پھر آپؑ نے اس آیت، (والّذین اٰمنوا باللّٰہ ورسلہ ـ ـ ـ) کی تلاوت فرمائی۔[1]

مذکورہ دونوں معانی کا اجتماع بھی ممکن ہے اس لیے کہ قرآن مجید میں شہید و شہداء کے الفاظ عام طور پر گواہوں کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ بہر حال خدا مؤمنین کی دو صفتیں بیان کرتا ہے۔ پہلی صفت صدیق اور دوسری شہید، اور یہ چیز بتاتی ہے کہ زیرِ بحث آیت میں مومنین سے مراد وہ افراد ہیں جن کو ایمان کا بلند ترین مقام حاصل ہے ورنہ ایک عام مؤمن اسی قسم کے اوصاف کا حامل نہیں ہوتا۔[2]

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: " ان کے لیے ان کے اعمال کا اجر ہے اور ان کے ایمان کا نور "۔ (لھم اجرھم ونورھم)۔ یہ تفصیلی تعبیر، عظیم اجر اور ان کے حد سے زیادہ نور کی طرف اشارہ ہے۔ آخر میں فرماتا ہے : " لیکن وہ لوگ جو کافر ہو گئے اور انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی وہ اہلِ دوزخ ہیں"۔ (والّذین کفروا وکذبوا باٰیاتنا اولٰئك اصحاب الجحیم)۔ تاکہ ان دونوں گروہوں کے تقابل سے ، پہلے گروہ کا مقامِ بلند اور دوسرے گروہ کی پستی آشکار ہو جائے اور چونکہ پہلے گروہ میں ایمان کی بلند سطح مدِ نظر تھی لہٰذا اس گروہ کا بھی شدید کفر پیشِ نظر ہے اسی لیے اس گروہ کا ذکر آیاتِ الٰہی کی تکذیب کے عنوان سے ہُوا ہے اور چونکہ دنیا کی محبت ہر گناہ کا سرچشمہ ہے (رأس کل خطیئۃ) اس لیے بعد والی آیت میں دنیا کی کیفیتِ حیات اور اس کے مختلف مرحلوں کی گویا نمایاں تصویر کشی ہوئی ہے اور ہر مقام پر جو عوامل کار فرما ہیں وہ پیش کیئے گئے ہیں۔

پروردگارِ عالم فرماتا ہے : " جان لو کہ زندگیِ دنیا صرف کھیل کُود ، جوش وخروش، تجمل پرستی ، ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر کرنا اور مال و اولاد میں اضافہ کا مطالعہ کرنا ہے"۔ (اعلموا انما الحیاۃ الدنیا لعب ولھو وزینۃ وتفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال والاولاد) ۔ اس اعتبار سے غفلت ، جوش وخروش، تجمل پرستی، تفاخر اور تکاثر انسانی زندگی کے پانچ مرحلوں کو تشکیل دیتا ہے۔ پہلا بچپن کا دَور ہے جس میں زندگی بے خبری اور لہو ولعب میں محصور رہتی ہے۔ اس کے بعد لڑکپن کا دَور آتا ہے۔ اس میں سرگرمی اور جوش و خروش کھیل کُود کی جگہ لے لیتے ہیں اور اس مرحلہ میں انسان ایسے مسائل میں اُلجھا رہتا ہے جو اسے صرف اپنے ساتھ سرگرم رکھیں لیکن سنجیدہ مسائل سے دُور۔ تیسرا مرحلہ جوانی کا ہے جس میں شور و غوغا ہوتا ہے اور تجمل پرستی ہوتی ہے۔ اس مرحلے سے گزرے تو چوتھا مرحلہ آتا ہے۔ اس میں مقام و منصب کے حاصل کرنے اور فخر و مباہات کرنے کے جذبات انسان میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ آخر کار وہ پانچویں مرحلہ میں داخل ہو جاتا ہے جس میں افزائش مال و اولاد کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ پہلے مرحلے تو زندگی اور عمر کے مطابق طے شدہ ہیں لیکن بعد کے مرحلے مختلف افراد

---

1. تفسیر عیاشی مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۴۴۔

2. اُوپر والی تفسیر کے مطابق (اولئك ھم الصدیقون والشھداء عند ربھم) میں کوئی چیز مقدر نہیں ہے اور مؤمنین کے اُس گروہ کو صدیقین و شہداء کے مصداق شمار کیا گیا ہے لیکن بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ بمنزلہ صدیقین و شہداء ہیں نہ کہ خُود وہی ہیں یعنی ان کا اجر تو انہیں ملے گا لیکن تمام اعزازات و افتخارات نہیں ملیں گے اور وہ کہتے ہیں کہ آیت کی تقدیرِ عبارت اس طرح ہے (اولٰئك لھم مثل اجر الصدیقین والشھداء) تفسیر رُوح المعانی اور المیزان (در ذیل آیات زیر بحث) اور طبعاً "لھم" اور "اجرھم" کی ضمیروں کا مرجع بھی مختلف ہوگا لیکن یہ تفسیر ظاہر آیات کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

میں مکمل طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ انسان میں مال کی افزائش کا جذبہ آخر تک برقرار رہتا ہے۔ اگرچہ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ ان پانچ اصولوں میں سے ہر مرحلہ انسانی زندگی کے آٹھ سال پر محیط ہوتا ہے اور مجموعی طور پر چالیس سال تک جا پہنچتا ہے۔ جب انسان اس مرحلہ میں داخل ہوتا ہے تو اس کی شخصیت پختہ ہو جاتی ہے۔ یہ امر بھی پورے طور پر ممکن ہے کہ بعض انسانوں کی شخصیتیں پہلے یا دوسرے مرحلے ہی میں ٹھہر جاتی ہیں اور یہ بڑھاپے تک کھیل کود، سرگرمی اور معرکہ آرائی کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ یا یہ ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت تجمل پرستی میں اٹک کر رہ جاتی ہے اور انہیں مکان، سواری اور عمدہ لباس کی فراہمی کے علاوہ اور کوئی فکر لاحق نہیں ہوتی۔ یہ ادھیڑ عمر کے لوگ ہونے کے باوجود بچے ہوتے ہیں اور بوڑھے ہو کر بھی بچوں کے سے جذبات و احساسات رکھتے ہیں۔ اس کے بعد پروردگارِ عالم انسان کی دنیاوی زندگی اور اس کے آغاز و انجام کی ایک مثال بیان کرکے پوری کیفیت کو نگاہ انسانی کے سامنے مجسم کرکے پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے: "مثل بارش کے ہے جو آسمان سے زمین کی طرف آتی ہے اور اس طرح زمین کو زندہ کرتی ہے کہ اس پر نمایاں ہونے والے سبزے زراعت کرنے والوں کو تعجب میں ڈال دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ خشک ہو جاتے ہیں اور ایسے ہو جاتے ہیں کہ تو انہیں زرد رنگ کا دیکھتا ہے۔ پھر ٹوٹ پھوٹ کر اور چھوٹے چھوٹے تنکے بن کر خشک کٹی ہوئی گھاس میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔" (کمثل غیث اعجب الکفار نباتہ ثم یھیج فتراہ مصفراً ثم یکون حطاماً)[1]۔

یہاں لفظِ کفار بے ایمان افراد کے معنوں میں نہیں ہے بلکہ زراعت کرنے والوں کے معنی میں ہے کیونکہ کفر کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں اور چونکہ کسان بیج چھڑک کر اسے زمین کے اندر چھپا دیتا ہے اس لیے اسے کافر کہتے ہیں اور اسی لیے کفر بعض اوقات قبر کے معنی میں بھی آتا ہے کیونکہ وہ مرنے والے کے جسم کو چھپا دیتی ہے۔ کبھی رات کو بھی کافر کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی تاریکی ہر چیز کو چھپا لیتی ہے۔ درحقیقت زیرِ بحث آیت سورۂ فتح کی آیت کے مانند ہے جس میں گیاہ و نبات کے متعلق زیادہ گفتگو کرتا ہے تو فرماتا: (یعجب الزراع) "زراعت کرنے والوں کو تعجب میں ڈال دیتی ہے (یعنی کفار کی بجائے زراع کہا گیا ہے)۔ بعض مفسرین نے یہاں اس احتمال کو بھی پیش کیا ہے کہ یہاں کفار سے مراد وہی کفار کے وجود کا انکار کرنے والے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے چند توجیہات بھی پیش کی ہیں۔ لیکن یہ تفسیر زیادہ مناسب نظر نہیں آتی کیونکہ اظہارِ تعجب میں کافر و مومن دونوں شریک ہیں۔ "حطام" "حطم" کے مادہ سے ہے۔ اس کے معنی توڑنے اور چھوٹا کرنے کے ہیں۔ گھاس کے ان اجزا کو حطام کہا جاتا ہے جو تیز ہوا کی جنبش سے بکھر جاتے ہیں۔ جی ہاں وہ مرحلے جو انسان ستر سال یا اس سے زیادہ عمر میں طے کرتا ہے وہ گھاس اور دیگر نباتات پر چند مہینوں میں ظاہر ہو جاتے ہیں اور انسان ایک کھیت کے کنارے بیٹھ کر عمر کے گزرنے اور اس کے آغاز و انجام کو مختصر سی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ اس کے بعد زندگی کے ماحصل کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "لیکن آخرت کا معاملہ دو حالتوں سے خارج نہیں ہے یا عذاب شدید ہے یا اس کی مغفرت، رضا اور خوشنودی" (وفی الاٰخرۃ عذاب شدید ومغفرۃ من اللہ ورضوان)۔ آخرکار آیت کو اس جملہ پر ختم کرتا ہے: "اور زندگیِ دنیا سوائے متاعِ غرور اور فریب کے اور کوئی چیز نہیں ہے۔" (وما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع الغرور)۔ "غرور" اصل میں "غر" (بروزن حر) کے مادہ سے ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کا اثرِ ظاہری۔ اسی لیے گھوڑے کی پیشانی پر ظاہر ہونے والے اثر کو "غرہ" کہتے ہیں۔ اس کے بعد غفلت کی حالت پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے جہاں ظاہر میں انسان ہوشیار ہے لیکن حقیقت میں بے خبر ہے یہ فریب کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ "متاع" ہر قسم کے فائدہ اٹھانے کے وسائل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ تو اس بنا پر "دنیا متاعِ غرور ہے"

[1] "یھیج" کا مادہ "ھیجان" ہے یہ لغت میں دو معانی کے لیے آیا ہے ایک گھاس کا خشک ہو جانا دوسرے حرکت میں آنا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں معانی ایک ہی اصل کی طرف لوٹتے ہوں کیونکہ جب گھاس خشک ہو جائے تو وہ حرکت اور پراگندگی کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے۔

کے جُملے کا مفہوم یہ ہے کہ دُنیا فریب کاری کے لیے وسیلے کی مانند ہے، اپنے آپ کو فریب دینے کے لیے بھی اور دوسروں کو فریب دینے کے لیے بھی۔ البتہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو دُنیا کو اپنا انتہائی مقصود قرار دیتے ہیں اور اُسی میں دل لگا لیتے ہیں اور اسی پر انحصار کرتے ہیں۔ ان کی آخری آرزو یہی ہوتی ہے کہ دنیا حاصل کر لیں۔ لیکن اگر اس دنیا کی نعمتیں بلند اقدار اور سعادتِ جاودانی کے حصول کا ذریعہ بن جائیں تو پھر وہ ہرگز دنیا نہیں ہے، بلکہ آخرت کی کھیتی۔ عظیم مقاصد تک پہنچنے کا ایک پل ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اگر دنیا کی طرف ایک گزرگاہ یا آرام کرنے کی جگہ کی حیثیت سے نظر کی جائے تو اس کے دو پہلو سامنے آتے ہیں جن میں سے ایک میں جھگڑا اور فساد ہے، حد سے تجاوز ہے، ظلم ہے اور سرکشی و غفلت ہے۔ دوسرے پہلو میں بیداری کا وسیلہ ہے، آگاہی ہے، ایثار و قربانی ہے، بھائی چارہ ہے اور معاف کر دینا ہے۔

چند نکات

۱۔ قرآن مجید میں عظیم پیغمبروں اور ان جیسے افراد کی ایک جماعت کی تعریف صدق کے عنوان کے تحت کی گئی ہے۔ منجملہ دیگر افراد کے ایک حضرت ابراہیمؑ ہیں۔ (انه کان صدیقا نبیا) (سورہ مریم آیت ۔ ۴۱) خدا کے عظیم پیغمبر حضرت ادریسؑ کے بارے میں بھی یہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ (مریم ۔ ۵۶) حضرت مریمؑ مادرِ جناب عیسٰیؑ کے بارے میں بھی ہم پڑھتے ہیں: (وامه صدیقة)۔ (مائدہ ۔ ۷۵)۔

قرآن کی بعض آیتوں میں صدیقین کا ذکر پیغمبروں کے ہمراہ ہوا ہے جیسا کہ سُورہ نسا کی آیت ۶۹ میں ہم دیکھتے ہیں: (ومن یطع الله والرسول فاولٰئك مع الذین انعم الله علیهم من النبیین والصدیقین والشهداء والصالحین وحسن اولٰئك رفیقا) جو شخص خدا و پیغمبر کی اطاعت کرے وہ (قیامت میں) ایسے لوگوں کا ہم نشین ہوگا جن پر خدا نے اپنی نعمت کو تمام کیا ہے، پیغمبروں، صدیقین، شہداء اور صالحین میں سے اور وہ اچھے رفقا ہیں۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ یہ لفظ مبالغہ کا صیغہ ہے اس کا مادہ صدق ہے اور یہ اس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جس کے وجود کا صدق و راستی نے احاطہ کر لیا ہو اور صداقت اس کی پُوری زندگی پر حاوی ہو۔ یہ چیز مقامِ صدق کی اہمیت کو بتاتی ہے۔ باقی رہے شہداء تو جیسا کہ ہم نے کہا ہے کبھی تو اعمال کے گواہ کے معنوں میں اور کبھی شہیدانِ راہِ خُدا کے معنوں میں اور زیرِ بحث آیت میں ان دونوں معانی کا اجتماع بھی ممکن ہے۔ البتہ شہید اسلامی فرہنگ اور تمدن کے اعتبار سے صرف انہی افراد میں محدود نہیں ہے جو میدانِ جہاد میں قتل ہو جائیں اگرچہ وہ اس کے واضح ترین مصداق ہیں۔ حتٰی کہ وہ تمام افراد جو عقیدۂ حق رکھتے ہیں، راہِ حق میں قدم اُٹھاتے ہیں اور اسی راہ میں دنیا سے چلے جاتے ہیں، روایاتِ اسلامی کے مطابق سب زمرہ شہدا میں آتے ہیں۔

ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ:

(العارف منکم هذا الامر المنتظر له المحتسب فیه الخیر کمن جاهد والله مع قائم آل محمد بسیفه ثم قال بل والله کمن جاهد مع رسول الله بسیفه، ثم قال الثالثة: بل والله کمن استشهد مع رسول الله فی فسطاطه وفیکم آیة من کتاب الله قلت وای آیة جعلت فداك؟ قال قول الله عز وجل والذین آمنوا بالله ورسله اولٰئك هم الصدیقون والشهداء عند ربهم ... ثم قال صرتم والله صادقین شهداء عند ربکم)

جو شخص تم میں سے مسئلہ ولایت سے آشنا ہو اور ظہورِ مہدیؑ کے انتظار میں زندگی گزارے اور

اپنے آپ کو ان کی عادل حکومت کے لیے آمادہ رکھے اس شخص کی مانند ہے جو مہدی آل محمدؑ کی معیت میں اپنے ہتھیاروں سے جنگ کرے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا بلکہ، خدا کی قسم، اس شخص کے مانند ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں اپنے ہتھیاروں سے جہاد کیا۔ پھر آپ نے تیسری مرتبہ فرمایا بلکہ خدا کی قسم اس شخص کے مانند ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہ کر آپ کے خیمے میں شہید ہوا ہو۔ پھر فرمایا تمہارے بارے میں قرآن میں آیت نازل ہوئی ہے۔ راوی نے کہا: آپ پر قربان ہو جاؤں، کون سی آیت؟ فرمایا: خدا کا یہ کلام جس میں فرماتا ہے وہ جو خدا اور اس کے بھیجے ہوئے افراد پر ایمان لائے ہیں، وہ اپنے پروردگار کے ہاں صدیقین اور شہداء ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا: تو اس طرح سے تم خدا کی قسم اپنے پروردگار کے ہاں صدیقین بھی ہو اور شہداء بھی[1]

اس گفتگو کو ہم حضرت امیر المومنین علیؑ کی ایک گفتگو پر ختم کرتے ہیں جس وقت آپؑ کے اصحابؓ کا ایک گروہ جہاد کے وقت کے انتظار میں اور راہِ خدا میں شہادت پانے کے شوق میں بے تاب تھا تو آپؑ نے یہ جملہ فرمایا:

(ولا تستعجلوا بما لم یعجله الله لکم فانه من مات منکم علی فراشه و هو علی معرفة حق ربه و حق رسوله و اهل بیته مات شهیدًا)

اس چیز میں جس میں خدا عجلت روا نہیں رکھتا جلدی مت کرو کیونکہ تم میں سے جو شخص اپنے بستر پر مر جائے لیکن حقِ پروردگار، حقِ پیغمبر اور حقِ اہلِ بیت کی معرفت رکھتا ہو، وہ شہید مرا ہے۔[2]

دُنیاوی زِندگی ان اسباب و علل کا مجموعہ ہے

قرآن کی مختلف آیتوں میں کبھی تو دنیاوی زندگی کو لہو لعب کہا گیا ہے مثلاً: (وما الحیاة الدنیا الا لعب ولھو) "دنیاوی زندگی لہو لعب کے علاوہ کچھ نہیں ہے" (انعام۔ ۳۲) اور کبھی لہو و لعب، زینت، تفاخر اور تکاثر کے الفاظ آئے ہیں مثلاً (زیر بحث آیات) اور کبھی اسے "متاعِ غرور" سے تعبیر کیا گیا ہے مثلاً (آل عمران۔ ۱۸۵) (اور آیات زیر بحث) اور کبھی "متاع قلیل" (نساء ۷۷) اور کبھی عارضی و ظاہری اور جلد گزر جانے والے اَمر سے تعبیر کیا ہے۔ (نساء ۹۴) ان تعبیروں سے اور قرآن کی دوسری تعبیروں کے مجموعہ سے اسلام کا مادی زندگی اور اس سے متعلقہ نعمتوں کے بارے میں جو نظریہ ہے وہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اسلام اس زندگی کو بالکل بے قدر و قیمت قرار دیتا ہے اور اس کی طرف

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۳۸

[2] نہج البلاغۃ خطبہ ۱۹۰

میلان و توجہ کو اور اس سے وابستگی کو بے مقصد امور (لعب) اور خواہ مخواہ مصروف رکھنے والے مقاصد (لہو) اور تجمل پرستی (زینۃ) اور حُبِّ مقام و منصب اور ریاست اور دوسروں پر برتری کی خواہش (تفاخر) اور حرص و آز اور افزوں طلبی (تکاثر) شمار کرتا ہے۔ اور دُنیا سے عشق کرنے کو انواع و اقسام کے مظالم اور گناہوں کا سرچشمہ قرار دیتا ہے لیکن اگر یہ نعمتیں اپنی جہت کو بدل لیں اور مقاصدِ الٰہی تک پہنچنے کا زینہ بن جائیں تو ایسا سرمایہ بن جائیں گی جنہیں خدا مؤمنین سے خریدتا ہے اور بہشتِ جاوداں اور سعادتِ ابدی انہیں بخشتا ہے۔

"ان اللہ اشتریٰ من المؤمنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ ..." (توبہ - ۱۱۱)

۲۱۔ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا
كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ
وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ
ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝
۲۲۔ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ
اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى
اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ۚۖ
۲۳۔ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ
اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ ۝
۲۴۔ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۭ وَمَنْ
يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝

ترجمہ

۲۱۔ ایک دُوسرے پر سبقت کرو اپنے پروردگار کی مغفرت اور اس جنّت تک پہنچنے کے لیے جس کی وُسعت آسمان و زمین کی وسعت جیسی ہے اور تیار کی گئی ہے ایسے لوگوں کے لیے جو خدا اور رسُولوں پر ایمان لائے ہیں یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہے دیتا ہے اور خُدا صاحبِ فضلِ عظیم ہے۔

۲۲۔ کوئی مصیبت زمین میں اور تمہارے وجُود میں نمودار نہیں ہوتی مگر یہ کہ زمین کی تخلیق سے پہلے سے لوحِ محفوظ میں ثبت ہے اور یہ چیز خدا کے لیے آسان ہے۔

۲۳۔ یہ اس لیے ہے تاکہ اس پر جسے تم گُم کر چکے ہو افسوس نہ کرو اور جو کچُھ تمہیں دیا گیا ہے اس سے خوش نہ ہو اور خُدا کسی متکبّر فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔

۲۴۔ وہ لوگ جو بُخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بُخل کی دعوت دیتے ہیں اور جو شخص (اس فرمان سے) رُوگرداں ہو (خُدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا) کیونکہ خدا بے نیاز اور لائقِ ستائش ہے۔

تفسیر

ایک عظیم معنوی مقابلہ

دُنیا اور اس کی لذتوں کی ناپائیداری کے بیان کے بعد اور اس بیان کے بعد کہ لوگ اس دُنیا میں بے قیمت سرمائے کے سلسلہ میں ایک دُوسرے سے تفاخر و تکاثر کرتے ہیں لوگوں کو، زیرِ بحث آیات میں، ان چیزوں کے طریقۂ کسب کے لیے جو پائیدار اور ہر قسم کی سعی و کوشش کے لائق ہیں، دعوتِ فکر دیتے ہوئے فرماتا ہے: " اپنے پروردگار کی بخشش، مغفرت اور اس جنت کے حصُول کے لیے جس کی وسعت آسمان و زمین کی وسعت کے مانند ہے اور جو ایسے لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو خدا اور اس کے بھیجے ہوئے رسُولوں پر ایمان لائے ہیں، ایک دُوسرے پر سبقت کرو۔"

(سابقوا الیٰ مغفرۃ من ربکم و جنۃ عرضھا کعرض السماء والارض اُعدت للذین اٰمنوا باللہ

ورسلہ) حقیقت میں پروردگار کی طرف سے عطا کی ہوئی مغفرت، کلیدِ جنت ہے۔ وہ جنت جو زمین و آسمان کی وسعتوں کو گھیرے ہوئے ہے اور ابھی سے مؤمنین کی پذیرائی کے لیے آمادہ ہے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ جنت اُدھار ہے اور اُدھار سے دل نہیں لگانا چاہیئے۔ جنت اگرچہ اُدھار فرض کی گئی ہے لیکن وہ ہر نقد سے زیادہ شمار کی جاتی ہے کیونکہ اس کا وعدہ اس خدا کی طرف سے کیا گیا ہے جو ہر چیز پر قادر ہے۔ چہ جائیکہ وہ پُورے طور پر نقد ہے اور اَب بھی موجود ہے۔ اِن معانی سے مشابہت رکھتی ہوئی گفتگو سُورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۳۳ میں آئی ہے اس فرق کے ساتھ کہ یہاں "سابقوا" "مُسابقہ" کے مادّہ سے اور وہاں "سارعوا" "مسارعہ" کے مادّہ سے ہے اور ایسے افراد کے لیے ایک دوسرے کے مقابلہ میں تیزی و سُرعت کرنے کے معنی میں آیا ہے جو ایک دوسرے کے مقابل ہوں (باب مفاعلہ کے مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو دو افراد کے ایک دوسرے پر غلبہ کی کوشش کو مجسّم کرتا ہے)۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ وہاں "عرضها السماوات والارض" ہے اور یہاں "کعرض السّماء والارض" ہے۔ تھوڑے سے غور و فکر سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں تعبیریں ایک ہی حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔ وہاں فرماتا ہے: "پرہیزگاروں کے لیے تیار ہے"۔ اور یہاں فرماتا ہے: "مومنین کے لیے"۔ چونکہ پرہیزگاری شجرِ ایمان کا ثمر ہے لہٰذا یہ دونوں تعبیریں ایک ہی حقیقت کی ترجمان ہیں۔ یہ صُورتِ حال بتاتی ہے کہ دونوں آیتیں دو مختلف بیانات کے ساتھ ایک ہی حقیقت کو پیش کرتی ہیں۔ اِسی بنا پر، جیسا کہ بعض مفسّرین کا نقطۂ نظر ہے کہ اُنہوں نے سُورۂ آلِ عمران کی آیت کو مقرّبین کی جنت کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور زیرِ بحث آیت میں مؤمنین کی بہشت کی طرف اشارہ قرار دیا ہے، تو یہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ یہاں عرض کا لفظ طول کے مقابلہ میں نہیں ہے، جیسا کہ بعض مفسّرین نے لکھا ہے، اور اس کے بعد وہ ایسی طویل و عریض جنت کی تلاش میں ہیں جس کا عرض آسمان و زمین کے برابر ہو اور اس کاوش کی وجہ سے وہ زحمت اُٹھا رہے ہیں۔ ایسے موقع پر عرض کے معنی وسعت کے ہوتے ہیں جیسا کہ ہم فارسی میں کہتے ہیں: "پہنۂ دشت" جس کے معنی ہیں وسعتِ صحرا۔

مغفرت کی تعبیر جو جنّت کی بشارت سے پہلے دونوں آیات میں آئی ہے وہ اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ جب تک انسان گناہ سے پاک نہ ہو وہ جنت اور جوارِ پروردگار میں ورود کے قابل نہیں ہوگا۔ یہ نکتہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ پروردگار کی مغفرت کی طرف سبقت کرنے کے معنی یہ ہیں کہ حصولِ مغفرت کے اسباب کی طرف توجہ کی جائے جیسے توبہ کا راستہ اختیار کرنا، وہ اطاعتیں جو نظر انداز ہو گئی ہیں ان کی تلافی کرنا اور اصولی طور پر اطاعتِ پروردگار گناہوں اور معاصی سے پرہیز ہی کا نام ہے۔ اور اگر بعض احادیث و روایات میں واجبات و مستحبات پر انحصار کیا گیا ہے، مثال کے طور پر جماعت کی صفِ اوّل کی طرف بڑھنا، جہاد کی پہلی صف میں جگہ لینا، امامِ جماعت کے ساتھ تکبیرۃ الاحرام کہنا، اول وقت میں نماز پڑھنا تو یہ مثالوں کے ذکر کے طور پر ہے یا واضح اور روشن مصداق کا بیان ہے اور آیت کے مفہوم کی وسعت میں کمی نہیں کرتا۔ آیت کے آخر میں مزید فرماتا ہے: "یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور خدا صاحبِ فضلِ عظیم ہے" (ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم)۔ یقیناً اس قسم کی وسیع جنت جس میں اتنی عظیم نعمتیں ہوں وہ ایسی چیز نہیں ہوتی جو ناچیز اعمال کے ذریعہ انسان کو حاصل ہو جائے یہ صرف اللہ کا فضل و کرم ہے جو قلیل اعمال کے بدلے اتنا بڑا اَجر مقرر کیا گیا ہے اور خُدا سے اس کے علاوہ اور کوئی توقع بھی نہیں کی جا سکتی وہ اس لیے کہ اَجر ہمیشہ اعمال کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ اَجر دینے والے کے کرم کے مطابق ہوتا ہے۔ بہرحال یہ تعبیر اچھی طرح بتاتی ہے کہ ثواب اور جزاءِ عمل کی مزدوری نہیں ہیں بلکہ یہ ایک طرح کا فضل و کرم ہے۔ اس کے بعد دُنیا سے عدمِ دل بستگی، اس کے حصول پر خوش نہ ہونے اور اس کے منہ موڑنے پر غمگین نہ ہونے کے بارے میں تاکید مزید کے لیے فرماتا ہے: "کوئی مصیبت زمین میں واقع نہیں ہوتی مگر یہ کہ وہ تمہاری اور زمین کی خلقت سے پہلے سے کتاب (لوحِ محفوظ) میں ثبت ہے اور یہ امر خدا کے لیے آسان ہے"۔
(ما اصاب من مصيبة في الارض ولا في انفسكم الا في كتاب من قبل ان نبرأها ان ذالك على الله

لیسیں)۔[1]

جی ہاں وہ مصیبتیں جو زمین میں پیش آتی ہیں مثلاً زلزلے، طوفان، سیلاب اور انواع و اقسام کے دردناک حوادث جن سے انسان دوچار ہوتا ہے، وہ سب پہلے سے طے شدہ ہیں، اور لوحِ محفوظ میں ثبت ہیں۔ لیکن توجہ کرنی چاہیئے کہ وہ مصیبتیں جن کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے، صرف اسی نوعیت کی ہیں جن سے کسی طرح نہیں بچا جا سکتا اور وہ انسانوں کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہیں (بالفاظِ دیگر یہاں حصر حصرِ اضافی ہے)۔ اس امر کا ثبوت یہ ہے کہ سورۂ شوریٰ کی آیت ۳۰ ہمیں بتاتی ہے کہ: "وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم و یعفوا عن کثیر۔" جو مصیبت بھی تمہیں پہنچے وہ ان اعمال کی وجہ سے ہے جنہیں تم انجام دیتے ہو اور بہت سے گناہوں کو وہ معاف کر دیتا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ آیتیں ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں، جس وقت یہ آیتیں ایک دوسرے کے مقابل ہوں، تو بتاتی ہیں کہ وہ مصیبتیں جو انسان پر نازل ہوتی ہیں وہ دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ جو انسان کے اعمال کی سزا ہوتی ہیں یا گناہوں کا کفارہ ہوتی ہیں۔ یہ مصیبتیں بے شمار ہیں۔ ظلم و ستم، بے انصافیاں، خیانتیں، وعدہ خلافیاں وغیرہ اور نہ معلوم کتنے کام اور ایسی چیزیں جو ہمارے خود کردہ مصائب کا سرچشمہ ہیں۔ لیکن مصائب کا ایک حصہ ایسا ہے جس میں ہم کسی قسم کا دخل نہیں رکھتے۔ اس حصہ کے مصائب ایک ایسے ناگزیر امر کی صورت میں انسان یا معاشرہ کا مقدر بنتے ہیں جن سے کسی طرح بچنا ممکن نہیں ہوتا۔ ان دونوں کا حساب الگ الگ ہے اسی لیے بہت سے انبیاء، اولیاء اور صلحاء اس قسم کی مصیبتوں کا شکار ہوتے تھے۔ ان مصائب کا ایک دقیق فلسفہ ہے جس کی طرف ہم خداشناسی اور عدل الٰہی کے مباحث میں اور یہ مسئلہ آفات و بلیات کے ماتحت اشارہ کر چکے ہیں۔

ایک حدیث ہماری نظر سے گزری ہے کہ جس وقت امام زین العابدین علیہ السلام کو یزید کی مجلس میں ایسی حالت میں لے جایا گیا کہ آپ زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے تو یزید نے امام کی طرف رُخ کر کے سورۂ شوریٰ کی آیت پڑھی: وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ ظاہر کرے کہ خاندانِ رسالتؐ کے مصائب خود ان کے اعمال کا نتیجہ ہیں۔ اس طرح وہ دلِ امامؑ پر زبان کا زخم لگانا چاہتا تھا لیکن امامؑ نے فوراً اس کے کلام کی تردید کی اور فرمایا:

(کلا ما نزلت ھذہ فینا انما نزلت فینا ما اصاب من مصیبة فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا)

ایسا نہیں ہے یہ آیت ہمارے بارے میں نازل نہیں ہوئی بلکہ ہمارے بارے میں ایک اور آیت نازل ہوئی ہے جو یہ ہے کہ: جو مصیبت بھی تمہارے وجود میں یا زمین پر پڑتی ہے تمہاری خلقت سے پہلے سے لوحِ محفوظ میں ثبت ہے۔ (اور اس کا ایک فلسفہ ہے اور حکمت ہے)[2]

اس سلسلہ میں تفصیلی بحث ہم سورۂ شوریٰ کی آیت ۳۰ کے ذیل جلد ۱۱ میں کر چکے ہیں۔[3]

---

[1] یہ کہ "نبرأھا" مرجع ضمیر کیا چیز ہے اس میں کئی احتمال ہیں۔ بعض اس کا مرجع زمین اور انفس کو سمجھتے ہیں بعض مصیبت کو اور بعض سب کو۔ لیکن آیت کے لب و لہجے پر توجہ کرتے ہوئے پہلے معنی مناسب ہیں کیونکہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ زمین و آسمان اور تمہاری خلقت سے پہلے ان مصائب کی پیش بینی ہوئی ہے۔

[2] تفسیر علی بن ابراہیم مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۴۷۔

[3] جلد ۲ ص ۵۱۵ سے آگے اور سورہ نساء کی آیت ۷۸، ۷۹ کے ذیل میں بھی ایک اور بحث تھی جو زیر بحث آیات کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔

مکتب اہل بیتؑ کے شاگردوں نے یہی معانی سمجھے ہیں جیساکہ وہ کہتے ہیں کہ جس وقت "سعید ابن جبیرؒ" کو حجاج کے پاس لے گئے اور اس نے آپ کے قتل کا مصمم ارادہ کرلیا تو حاضرین میں سے ایک شخص رونے لگا تو سعیدؒ نے کہا: کیوں رو رہے ہو؟ اس نے کہا: اس مصیبت کی بنا پر جو آپ کو پیش آئی ہے" تو انہوں نے کہا گریہ نہ کرو یہ علم خدا میں تھا کہ اس طرح ہو۔ کیا تم نے نہیں سُنا کہ خدا فرماتا ہے:

(ما اصاب من مصیبة فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأها) [1]

البتہ تمام حوادث جو عالم میں رُونما ہوتے ہیں لوحِ محفوظ میں ثبت ہیں اور خدا کے علم بے پایاں میں ہیں۔ اگر یہاں صرف زمین اور نفوسِ انسانی میں رُونما ہونے والے مصائب کی طرف اشارہ ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ موضوعِ سخن یہی تھا جیساکہ ہم دیکھیں گے کہ بعد والی آیت میں اس کا نتیجہ پیش کیا گیا ہے: (ان ذالك علی الله یسیر) کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ لوحِ محفوظ میں تمام حالات کا ثبت ہونا حوادث کی کثرت کے باوجود خدا کے لیے دُشوار نہیں ہے اور لوحِ محفوظ سے مُراد خدا کا لامحدود علم ہے یا صفحۂ جہانِ خلقت ہے یا پھر نظامِ علت و معلول جو خدا کے علمِ فعلی کا مصداق ہے (غور فرمایئے) ہمیں دیکھنا ہے کہ لوحِ محفوظ میں ان مصائب کی تقدیر اور پھر قرآن میں اس حقیقت کا بیان دراصل کیا چیز ہے۔ بعد والی آیت اس اہم راز کے چہرے سے پردہ اُٹھاتی ہے اور کہتی ہے: "یہ اس بنا پر ہے کہ جو کچھ تم نے گنوایا ہے اس پر غمگین نہ ہونا اور جو کچھ خدا نے تمہیں دیا ہے اس پر خوش نہ ہونا"۔ (لکیلا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اٰتاکم)

یہ دو جملے حقیقت میں فلسفۂ آفرینش کے ایک پیچیدہ مسئلہ کو حل کرتے ہیں اس لیے کہ انسان عالمِ ہستی میں ہمیشہ مشکلات اور حوادث سے دوچار رہتا ہے اور اکثر اوقات اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ، اس کے باوجود کہ خدا مہربان و کریم ہے، یہ دردناک حوادث کس وجہ سے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ مقصد یہ تھا کہ تم اس جہان سے خوش اور اس چمک دمک کے اسیر نہ بن جانا، اس گزرگاہ اور اس پُل کی حیثیت کو جس کا نام دُنیا ہے اور اپنی حیثیت کو فراموش نہ کر دینا اور اس کے والا و شیدا نہ بن جانا اور اس کو ابدی اور جاودانی نہ سمجھنا کیونکہ یہ حد سے زیادہ وابستگی تمہاری سعادت کی بہت بڑی دشمن ہے۔ وہ تمہیں یادِ خدا سے غافل کرتی ہے اور ترقی کے راستے سے منحرف کرتی ہے۔ یہ مصیبتیں غافلوں کے لیے "ہوشیار رہو" کی آوازیں ہیں اور سوئی ہوئی ارواح کے لیے اس جہان کی ناپائیداری کی ایک رمز ہیں، اور اس زندگی کے مختصر ہونے کی طرف ایک اشارہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دارالغرور کے فریب دینے والے مظاہر انسان کو بہت جلد اپنی طرف کھینچ کر یادِ خُدا سے غافل کر دیتے ہیں۔ جب وہ اچانک باخبر ہوتا ہے اور دیکھتا ہے کہ قافلہ چلا گیا اور وہ محوِ خواب ہے جب کہ سامنے ایک وسیع بیاباں ہے۔ یہ حوادث جو ہمیشہ زندگی میں تھے اور ہمیشہ رہیں گے یہاں تک کہ علم و دانش کی عظیم ترقی بھی زلزلوں، طوفانوں، سیلابوں، بیماریوں اور اس قسم کے دردناک حوادث سے پناہ نہیں دلا سکتے اور نہیں دلا سکیں گے۔ یہ زمانہ کی بے مہری کے بارے میں ایک درس ہے جو انسان کو پُکار پُکار کر بتاتا ہے۔

ع این دشت خواب گاہ شہیدان است فرصت شمار وقت تماشا را

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان اس دنیا میں خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو ٹھکرا دے یا ان سے فائدہ نہ اُٹھائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کا قیدی نہ بن جائے اور ان کو مقصدِ حیات نہ بنا لے اور محض اسی کو اپنی زندگی کا حصہ شمار نہ کرے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ جو کچھ انسان گنوا دے اُسے (فاتکم) (جو کچھ تم سے فوت ہو جائے) سے تعبیر کر رہا ہے لیکن ہاتھ آنے والی نعمتوں کو اپنی طرف

[1] رُوح البیان جلد ۹ ص ۳۷۵۔

نسبت دیتا ہے۔ (بما اٰتاکم) کیونکہ فنا ہونا خود اشیا کی ذات میں پوشیدہ ہے اور وجود کا سرچشمہ وجودِ خداوندی ہے۔ جی ہاں یہ مصیبتیں ہیں جو غرور کو شکستہ کرتی ہیں اسی لیے آیت کے آخر میں کہتا ہے: "خدا کسی متکبر فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔" (واللہ لایحب کل مختال فخور)۔ "مختال" خیال کے مادہ سے لیا گیا ہے اور متکبر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس لیے کہ تکبر فضیلت کے خیال اور دوسروں کے مقابلہ میں برتری کے تصور سے پیدا ہوتا ہے۔ "فخور" مبالغہ کا صیغہ ہے اس کا مادّہ فخر ہے۔ فخور کے معنی ہیں وہ شخص جو دوسروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ فخر کرے۔ ان حالات کا صرف وہی شخص شکار ہوتا ہے جو ناز و نعمت میں کھو جائے۔ لیکن مصیبتیں اور آفتیں ان لوگوں کو مدہوشی سے محفوظ رکھتی ہیں جو بیداری کی حالت میں ہوں اور ہدایت پانے کے قابل ہوں۔

صاحب ایمان افراد، مذکورہ بالا اصل کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جس وقت خدا کی جانب سے کوئی نعمت پائیں تو وہ خود کو اس نعمت کا امانت دار سمجھتے ہیں۔ وہ نہ اس کے چلے جانے سے غمگین ہوتے ہیں نہ اس کی موجودگی سے مغرور ہوتے ہیں۔ درحقیقت وہ اپنے آپ کو بیتُ المال کے نگراں اور جواب دہ فرد کی حیثیت دیتے ہیں جو ایک دن بہت زیادہ مال حاصل کرتے ہیں اور دوسرے دن ہزاروں کی تعداد میں واپس دے دیتے ہیں۔ انہیں نہ اس مال کے حاصل ہونے سے خوشی ہوتی ہے نہ اس کے چلے جانے کا رنج ہوتا ہے۔

امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام اس آیت کے بارے میں کتنی عمدہ تعبیر پیش کرتے ہیں:

(الزھد کلہ بین کلمتین من القراٰن قال اللہ تعالیٰ لکیلا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اٰتاکم ومن لم یأس علی الماضی ولم یفرح بالاٰتی فقد اخذ الزھد بطرفیہ)۔

سارا زہد قرآن کے دو جملوں کے درمیان میں ہے جہاں خداوند متعال فرماتا ہے: "یہ اس لیے ہے کہ جو چیز ہاتھ سے جاتی رہے اس کے لیے غمگین نہ ہونا اور جو کچھ خدا نے تمہیں دیا ہے اس پر غرور نہ کرنا"۔ لہٰذا جو شخص گزشتہ پر تاسف نہ کرے اور جو کچھ اس کے قبضہ میں ہو اس پر مغرور نہ ہو تو اس نے زہد کو دونوں طرف سے قبضہ میں کر رکھا ہے۔[1]

دُوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس حقیقت کی طرف توجہ کرنا کہ، ناکامیاں انسان کی زندگی کے ساتھ ابتداء سے رکھی گئی ہیں اور سُنّتِ حکیمانہ کے مطابق مقرر ہوئی ہیں اور دنیا ہمیشہ نشیب و فراز رکھتی ہے، انسان کو مصیبتوں کی برداشت کے ضمن میں بہادر اور حوادث کے مقابلہ میں صابر اور ثابت قدم بنا دیتا ہے۔ وہ انسان کو سکونِ قلب عطا کرتا ہے اور بے تابیوں اور رونے دھونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ لیکن ہم پھر تاکید کرتے ہیں کہ یہ چیز صرف ان مصائب کے بارے میں ہے جن سے بچنا ممکن نہیں ہے ورنہ وہ مصیبتیں اور ناکامیاں جو خود انسان کے گناہوں اور اس کی سہل انگاری کا نتیجہ ہوتی ہیں وہ اس بحث سے خارج ہیں۔ زندگی کے نظام الاوقات میں ان سے مقابلہ کرنا ایک صحیح راہِ عمل ہے اس بحث کو ہم ایک سرگزشت پر ختم کرتے ہیں جو بعض مفسرین نے بیان کی ہے۔ قتیبہ بن سعید[2] کہتا ہے میں ایک عرب قبیلہ میں گیا جو صحرا میں تھا وہ صحرا اونٹوں سے پُر تھا جو سب مر چکے تھے اور لاتعداد تھے۔ وہاں ایک بُڑھیا عورت تھی میں نے اس سے پُوچھا کہ یہ اُونٹ کس کے تھے۔ اس نے کہا اس بوڑھے شخص کے تھے جو ٹیلے پر تو دیکھ رہا ہے کہ اُون بُن رہا ہے۔ میں اس کے پاس گیا اور پُوچھا کہ یہ سب اُونٹ تیرے تھے۔

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار کلمہ ۴۳۹۔

[2] "قتیبہ بن سعید" ایک محدث ہے جو مالکؒ ابن انس سے روایت کرتا ہے (منتھی الادب)

اُس نے کہا کہ میرے نام سے تھے۔ مَیں نے کہا کہ کیا وجہ ہوئی جو ان کا یہ حال ہوا۔ اس نے جواب میں (بغیر ان کے کہ ان کی موت کا سبب بیان کرے) کہا کہ جس نے دیے تھے اس نے واپس لے لیے۔ میں نے کہا تجھے کوئی پریشانی نہیں ہے اور تُو نے اس سلسلہ میں کیا کیا ہے۔ اس نے کہا میں نے یہ دو شعر کہے ہیں:

ع لا والذی انا عبد من خلائقہ   والمرء فی الدھر نصب الرزء والمحن

ما سرنی ان ابلی فی مبارکھا   وما جری من قضاء اللہ لم یکن[1]

قسم ہے اُس کی جس کی مخلوق میں سے میں بھی ایک بندہ ہوں کہ انسان دنیا میں محنتوں اور مصیبتوں کا ہدف ہے۔ میرے اُونٹ اگر اپنے بیٹھنے اور سونے کی جگہ پر ہوتے ہیں اور یہ قضائے الٰہی جو آئی ہے نہ آتی تو میں خوش نہ ہوتا۔ (میں تو صرف اس کی رضا پر راضی ہوں اور جو کچھ اس نے چاہا ہے اسی کو پسند کرتا ہوں)[1]

آخری زیر بحث آیت اس چیز کی توضیح و تفسیر ہے جو گزشتہ آیت میں آئی ہے۔ وہ حقیقت میں مختال فخور کا تعارف کراتی ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "وہ ایسے افراد ہیں جو بُخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بُخل کی دعوت دیتے ہیں۔" (الذین یبخلون و یأمرون الناس بالبخل)[2]

جی ہاں دنیا کی نعمتوں سے بہت زیادہ دل لگانے کا نتیجہ تکبر و غرور ہے اور تکبر و غرور کا لازمہ بُخل کرنا اور دُوسروں کو بُخل کی دعوت دینا ہے بُخل کرنا تو اس بنا پر ہے کہ وہ ان اموال ہی کو اپنا سرمایہ حیات سمجھتے ہیں جو انہیں حاصل ہے اور کبھی نہیں چاہتے کہ وہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے دوسروں کو بُخل کی دعوت دینا اس بنا پر ہے کہ اگر کوئی دُوسرا سخاوت کرے گا تو یہ ذلیل ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ چونکہ بُخل کو دوست رکھتے ہیں لہٰذا ایسی چیز کے مبلغ ہیں جسے دوست رکھتے ہیں۔ اور اس بنا پر کہ کہیں یہ تصور نہ پیدا ہو جائے کہ خدا کا انفاق کے مسئلہ پر اصرار کرنا اور بُخل کو ترک کرنے کی تاکید کرنا، حتٰی کہ بندوں سے قرض لینے کی بات کرنا، جیسا کہ گزشتہ آیات میں آیا ہے، اس کی کسی احتیاج اور ضرورت کی وجہ سے ہے لہٰذا آخر میں فرماتا ہے: "جو شخص اس حکم سے منہ پھیرے تو وہ خُدا کو نقصان نہیں پہنچاتا اس لیے کہ خدا بے نیاز اور لائق ستائش ہے۔" (ومن یتول فان اللہ ھو الغنی الحمید)۔ سب اس کے محتاج و نیازمند ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں ہے وہ سب سے بے نیاز ہے کیونکہ تمام چیزوں کے خزانے اور منابع اس کے قبضہ میں ہیں اور چونکہ وہ تمام صفات کمال کا جامع ہے اس لیے ہر حمد و ستائش کے قابل ہے۔ اگرچہ مذکورہ بالا آیت میں لفظ بخل صرف انفاق مال میں بُخل کرنے سے تعلق رکھتا ہے پھر بھی اس لفظ کا ایک وسیع مفہوم ہے جو علم میں بُخل کرنے اور حقوق وغیرہ کی ادائیگی میں بُخل کرنے سے بھی تعلق رکھتا ہے۔

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۱۱ ص ۵۳۔ انہی معانی کی مثال تفسیر روح البیان جلد ۹ ص ۳۶۷ پر نقل کی گئی ہے۔

[2] (الذین ...) بدل ہے کل مختال فخور (تفسیر کشاف در ذیل آیات زیر بحث) ضمناً توجہ کرنی چاہیئے کہ بدل اور مبدل منہ میں معرفہ اور نکرہ ہونے کا تطابق شرط نہیں ہے۔

۲۵۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ
الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا
الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ
وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝

ترجمہ

۲۵۔ ہم نے اپنے رسُولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا ہے اور ان پر اپنی کتاب (آسمانی) (اور حق اور عادلانہ قوانین کی شناسائی کی) میزان نازل کی تاکہ لوگ عدالت کے ساتھ قیام کریں۔ اور ہم نے لوہے کو نازل کیا جس میں شدید قوت ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں تاکہ خدا جان لے کہ کون شخص اس کی اور اس کے رسُولوں کی مدد کرتا ہے بغیر اس کے کہ وہ اسے دیکھیں۔ خُدا قوی اور ناقابلِ شکست ہے۔

تفسیر

بعثتِ انبیاء کا مقصدِ اعلیٰ

چونکہ پروردگار کی رحمت، مغفرت اور بہشت کی طرف سبقت کرنا (جس کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے) رہبرانِ الٰہی کی رہبری کا محتاج ہے لہٰذا زیرِ بحث آیت میں، جو قرآن کی زیادہ مفہوم رکھنے والی آیتوں میں سے ایک آیت ہے، اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور انبیاء کے بھیجنے کا مقصد اور ان کے دستور العمل کو نہایت باریک بینی کے ساتھ پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

" ہم نے اپنے رسُولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا ہے ": (لقد ارسلنا رسلنا بالبیّنات)۔ اور ہم نے ان کے ساتھ آسمانی کتاب اور میزان کو نازل کیا": (وانزلنا معھم الکتاب والمیزان)۔ تاکہ لوگ عدل و انصاف کے ساتھ قیام کریں": (لیقوم النّاس بالقسط)۔" بیّنات " (واضح دلائل) اس کے معنی وسیع ہیں جن میں معجزات اور عقلی دلائل دونوں شامل ہیں اور جن کی صلاحیت خدا کے رسولؐ اپنی ذات میں رکھتے تھے۔" کتاب " سے مُراد وہی کُتبِ آسمانی ہیں اور چونکہ سب کی رُوح اور حقیقت ایک ہے لہٰذا لفظ کتاب مفرد آیا ہے، اگرچہ زمانے کے گزرنے اور انسانوں کے علمی ارتقا سے اس کا مفہوم زیادہ وسیع ہوجاتا ہے۔ باقی رہی میزان تو وہ وزن کرنے اور ناپ تول کے آلے اور ذریعہ کے معنی میں ہے۔اس کا مادّی مصداق وہی ترازو ہے جس کے ذریعے چیزوں کے وزن کی ناپ تول ہوتی ہے۔ لیکن مسلمہ طور پر یہاں اس کا مصداق اس کی معنوی حقیقت ہے یعنی ایسی چیز جس سے تمام انسانوں کے اعمال کی ناپ تول کی جاسکتی ہے اور وہ کُلّی طور پر خُدائی احکام و قوانین ہیں یا اس کا آئین و دستور ہے اور جو نیکیوں بُرائیوں، قدروں، قیمتوں اور ان کی ضد کو جانچنے کا معیار ہے۔اس اعتبار سے انبیا تین چیزیں اپنے ساتھ رکھتے تھے، واضح دلائل، کُتبِ آسمانی اور حق و باطل کی ناپ تول کا معیار اور اس چیز میں کوئی مانع نہیں ہے کہ قرآن مجید" مبینہ " (معجزہ) بھی ہو۔آسمانی کتاب بھی اور احکام و قوانین کو بیان کرنے والا بھی۔ یعنی ایک ہی چیز میں تینوں پہلو موجود ہوں۔ بہرحال ان عظیم افراد (انبیاؑ) کو پورے ساز و سامان کے ساتھ بھیجنے کا مقصد قسط و عدل کا اجرا ہے۔ دراصل یہ آیت رسُولوں کے بھیجنے کے متعدد مقاصد میں سے ایک مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ انبیاءؑ و مرسلین متعدد مقاصد کے لیے کام کرتے تھے۔ان کے آنے کا ایک مقصد لوگوں کی تعلیم و تربیت تھا جیسا کہ سُورہ جمعہ کی آیت ۲ میں آیا ہے۔ (ھوالذی بعث فی الامیین رسولاً منھم یتلوا علیھم اٰیاتہ و یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ) وہی ہے جس نے مکّہ والوں میں سے ایک فرد کو رسول بنا کر بھیجا تاکہ وہ ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھے، ان کے نفوس کا تزکیہ کرے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ انسان کی غلامی کی زنجیریں توڑ دے جیسا کہ سُورہ اعراف کی آیت ۱۵۷ میں درج ہے : (ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم) پیغمبرِ اسلامؐ ان کے کاندھوں پر سے بہت بھاری بوجھ ہٹاتا ہے اور وہ زنجیریں جو ان کے ہاتھ پاؤں اور گردن میں ہیں ان کو توڑ دیتا ہے۔تیسرا مقصد اخلاقی اقدار کی تکمیل ہے جیسا کہ مشہور حدیث میں ہے :

(بعثت لاتمم مکارم الاخلاق)

مَیں اخلاقی فضائل کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں [1]

آخری ایک مقصد اور ہے اور وہ ہے " اقامہ قسط " جس کی طرف زیرِ بحث آیت میں اشارہ ہوا ہے اور اس طرح بعثتِ انبیاءؑ کے مقاصد کا سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی تعلیم و تربیت کے عنوان کے ماتحت خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات بالکل آشکار ہے کہ زیرِ بحث آیت میں تنزیل کتب کے قرینے کے پیشِ نظر رسولوں سے مراد اُولوالعزم پیغمبر ہیں یا وہ پیغمبر ہیں جو ان کے مانند ہیں۔

ایک دُوسرا نکتہ " لیقوم النّاس بالقسط "کے جملہ میں یہ ہے کہ لوگوں کی ترغیب کے بارے میں گفتگو کرتا ہے یہ نہیں فرماتا : " مقصد یہ تھا کہ انبیاؑ انسانوں میں قیامِ عدل کی تحریک پیدا کریں " بلکہ فرماتا ہے کہ :" لوگ انصاف کو بروئے کار لائیں "۔

---

[1] بحارالانوار جلد ۱۷ ص ۳۷۲ باب حسن الخلق در ذیل حدیث اوّل۔

جی ہاں اہم بات یہ ہے کہ لوگوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ وہ خود عدالت و انصاف کو جاری کرنے والے بن جائیں اور اس راہ کو اپنے قدموں سے طے کریں۔ لیکن چونکہ ایک انسانی معاشرہ میں بہرحال جس قدر بھی اخلاق، اعتقاد اور تقویٰ کی سطح بلند ہوگی اس میں پھر بھی ایسے افراد پیدا ہوں گے جو طغیان و سرکشی کے لیے آمادہ ہوں اور قیام عدل کی راہ میں روڑے اٹکائیں اس لیے اس آیت کو برقرار رکھنے اور دوام بخشنے کے لیے فرماتا ہے: "ہم نے لوہے کو نازل کیا جس میں شدید قوت ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں" (وانزلنا الحدید فیه بأس شدید و منافع للناس)۔ جی ہاں انبیائے خدا کی تین قوتیں اجرائے عدالت کے لیے اپنے اصلی مقصد کو اس وقت حاصل کر سکتی ہیں جب وہ لوہے جیسی طاقت اور شدید قوت سے بہرہ ور ہوں۔ اگرچہ بعض مفسرین نے یہ تصور کیا ہے کہ انزلنا کے الفاظ یہ بتاتے ہیں کہ لوہا زمین پر دُوسرے کُروں سے آیا ہے لیکن حق یہ ہے کہ انزال کی تعبیر اس قسم کے مواقع پر ایسی نعمتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو بلند مقام کی جانب سے پست مقامات کو دی جائیں۔ چونکہ ہر چیز کے خزائن خدا کے پاس ہیں اور وہی ہے جس نے لوہے کو اس کی گوناں گوں منفعتوں کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس لیے لفظ انزال آیا ہے۔ اسی بنا پر ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے اس جملہ کی تفسیر میں فرمایا:

(انزاله ذالك خلقه اياه)

لوہے کو نازل کرنے سے مراد اس کو پیدا کرنا ہے۔[1]

جیسا کہ سُورہ زمر کی آیت ۶ میں چوپاؤں کے بارے میں ہمیں ملتا ہے:

(وانزل لكم من الانعام ثمانية ازواج)

"اور تمہارے چوپاؤں کے آٹھ جوڑے نازل کیے ہیں"

بعض مفسرین نے انزلنا کو "نزل" (بروزن شتر) کے مادّہ سے ایسی چیز کے معنی میں لیا ہے جسے مہمان کی تواضع کے لیے تیار کرتے ہیں لیکن ظاہر وہی پہلے معنی ہیں۔ "بأس" لغت میں شدّتِ قدرت کے معنی میں ہے اور جنگ کو بھی باس کہا جاتا ہے اس لیے بعض مفسرین نے جنگی وسائل کے معنی میں لیا ہے۔ عام اس سے کہ وہ دفاعی ہوں یا جنگجویانہ۔

ایک روایت میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: (یعنی السلاح وغیر ذالك) مُراد اسلحہ وغیرہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بیان مصداق ہی کی قبیل میں سے ہے۔ "منافع" سے مُراد ہر قسم کا نفع ہے جو انسان لوہے سے حاصل کرتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ لوہے کی اہمیت انسانی زندگی میں اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے انکشاف سے تاریخ بشر میں ایک نیا دُور شروع ہوگیا جو لوہے کے دُور کے نام سے مشہور ہے۔ چونکہ اس کے انکشاف سے انسانی زندگی کا چہرہ تمام رُوئے زمین پر دوسری سمتوں میں پھیل گیا ہے۔ یہ صُورتِ حال مذکورہ آیت میں منافع کی وسعت کو بیان کرتی ہے۔ قرآن مجید میں بھی مختلف آیات میں انہی معانی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک مقام پر فرماتا ہے:

"جس وقت ذوالقرنین نے اپنی مشہور دیوار کے بنانے کا پکّا ارادہ کیا تو کہا: (اٰتونی زبر الحدید) "میرے لیے لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے لے آؤ۔ (کہف ۹۶) اور جس وقت خدا نے داؤد پر اپنا کرم کیا تو لوہے کو اس کے لیے نرم کردیا تاکہ وہ اس سے زرہ بنائیں

---

[1] تفسیر نورالثقلین جلد ۵ ص ۲۵۰ (حدیث ۱۰۰ و ۱۰۱)۔

اور جنگ کے خطروں اور دشمنوں کے حملوں میں کمی واقع ہو سکے۔ (والنّا له الحديد ان اعمل سابغات) (سبا ۱۰ ۱۱)۔ اس کے بعد ارسال رسل، نزول کتب آسمانی اور لوہے جیسے وسائل کی خلقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: " مقصد یہ ہے کہ خدا جان لے کہ کون لوگ اس کی اور اس کے رسولوں کی اس کے غیب میں مدد کرتے ہیں " (وليعلم الله من ينصره ورسله بالغيب)۔ یہاں خدا کے علم سے مراد اس کے علم کی تحقیق عینی ہے یعنی یہ بات واضح ہو جائے کہ کون لوگ خدا کی اور اس کے مکتب فکر کی مدد کے لیے آمادہ ہوتے ہیں اور قیام بالقسط کرتے ہیں اور وہ کون لوگ ہیں جو اس عظیم ذمہ داری سے رُوگردانی کرتے ہیں۔ حقیقت میں اس آیت کا مفہوم اُس کے مشابہ ہے جو سُورۂ آل عمران کی آیت ۱۷۹ میں آیا ہے۔ (ما كان الله ليذر المؤمنين على ما انتم عليه حتّٰى يميز الخبيث من الطيّب) " ممکن نہیں تھا کہ خدا مؤمنین کو اس شکل میں جس میں تم ہو چھوڑ دے مگر یہ کہ ناپاک کو پاک سے الگ کر دے " تو اس طرح انسانوں کی آزمائش اور امتحان کا مسئلہ اور مختلف صفوں کو الگ کرنا اور ان کا تصفیہ کرنا اس دستور العمل کا ایک عظیم مقصد تھا۔ خدا کی مدد کرنے کی جو تعبیر ہے وہ مسلمہ طور پر اس کے دین و آئین اور اس کے نمائندوں کی مدد کرنے اور دینِ حق اور عدل و انصاف کو پھیلانے کے معنی میں ہے اس لیے کہ خدا کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ سب اس کے نیازمند ہیں۔ اس لیے ان معانی کو ثابت کرنے کے لیے آیت کو اس جملے پر ختم کرتا ہے کہ " خدا قوی اور ناقابلِ شکست ہے " (انّ الله قوی عزیز)۔ اُس کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایک ہی اشارے سے سارے جہان کو زیر و زبر کرلے اور اپنے تمام دشمنوں کو ختم کر دے اور اپنے اولیاء کو کامیابی عطا کرے لیکن وہ مقصدِ اصلی جسے انسان کی تربیت اور اس کا ارتقا کہا جا سکتا ہے اس طرح حاصل نہیں ہوتا اس لیے وہ انسان کو دینِ حق کی مدد کے لیے دعوتِ عمل دیتا ہے۔

چند نکات

۱۔ منطق اور زبردستی کی قلمرو

مندرجہ بالا آیت گویا تعلیم و تربیت، انسانی معاشرہ میں عدل و انصاف کی وسعت اور اس کے اجراء کے سلسلہ میں اسلام کی مُنہ بولتی تصویر ہے۔ اسلام سب سے پہلے بیّنات، واضح دلائل، کُتبِ آسمانی اور اس کی قدر و قیمت کے ناپ تول کے معیار اور احکام و قوانین کے بیان سے مدد لیتا ہے۔ اس طرح فکری و معاشرتی انقلاب کی بُنیاد رکھتا ہے اور عقل و منطق سے مدد کا طلب گار ہوتا ہے لیکن اگر یہ چیزیں اثرانداز نہ ہوں اور معاملہ مشکل ہو جائے یعنی طاقت ور اور سرکش افراد پیدا ہو جائیں جو نہ بیّنات کے سامنے جُھکتے ہیں اور نہ کتاب و میزان کے لیے کسی قدر و قیمت کے قائل ہیں تو پھر نوبت حدید تک پہنچ جاتی ہے جس میں باس شدید ہے۔ پھر ہتھیاروں سے سرکشوں کے دماغ کو کُچلا جاتا ہے تاکہ وہ عدل و انصاف کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیں۔ اس مرحلہ پر ایماندار افراد سے مدد لی جاتی ہے اور یہ جو ایک حدیث میں رسولِ خُدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

(بعثت بالسيف بين يدى الساعة حتى يعبد الله وحده لاشريك له وجعل رزقى تحت ظل رمحى)

" مَیں قیامت کی قیام گاہ پر تلوار کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں تاکہ لوگ خدائے یگانہ کی عبادت کریں اور میری روزی میرے نیزے کے سائے میں ہے۔" [1]

حاشیہ اگلے صفحے پر

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ میں مامور ہوں کہ اس سرکش گروہ کے مقابلہ میں تلوار اُٹھاؤں، اپنے کام کی بنیادی ضرورت کے طور پر نہیں بلکہ اس طرح جس طرح مذکورہ بالا آیت میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے :

(الخیر کلہ فی السیف وتحت السیف وفی ظل السیف)

"تمام خُوبیاں تلوار میں، تلوار کے نیچے اور تلوار کے سائے میں ہیں"۔ [۱]

ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ :

(انّ اللہ عزّوجل فرض الجہاد وعظمہ وجعلہ نصرہ وناصرہ واللہ ماصلحت دنیا ولا دین الا بہ)

"خدا نے جہاد کو واجب کیا ہے، اس کو بڑا شمار کیا ہے اور اس کو مددگار قرار دیا ہے۔ خدا کی قسم دین و دُنیا میں کسی چیز کی بھی اصلاح جہاد کے بغیر ممکن نہیں"۔ [۲]

اس بات کو ہم رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا :

(لایقیم النّاس الّا السیف والسیوف مقالید الجنّة والنّار)

لوگوں کو تلوار کے علاوہ کوئی چیز سیدھا نہیں کر سکتی اور تلواریں دوزخ وجنّت کی چابیاں ہیں"۔ [۳]

اسی وجہ سے خدا کے مقرر کردہ رہبروں کے ایک ہاتھ میں کتابِ آسمانی ہوتی ہے اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کو پہلے دلیل ومنطق سے حق و انصاف کی طرف بلاتے ہیں لیکن جب طاقتور اور نشہ زور افراد منطق کے سامنے سرِتسلیم خم نہیں کرتے تو پھر ان کے خلاف تلوار استعمال کرتے ہیں۔

۲۔ زندگی کی عُمدہ ضرورتیں لوہے سے تعلق رکھتی ہیں

بعض مفسّرین مندرجہ بالا آیت کا ایک تجزیہ پیش کرتے ہیں جس کا خلاصہ اس طرح ہے۔ انسان کی زندگی کے چار اصول ہیں :

۱۔ زراعت ، ۲۔ صنعت ، ۳۔ مسکن ، ۴۔ حکومت

وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان غذا ، لباس اور مکان کا محتاج ہے اور چونکہ وہ ایک اجتماعی و معاشرتی وجُود ہے لہٰذا وہ تنہائی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ بالفاظِ دیگر اجتماع کے مسائل اجتماع ہی سے حل ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ہر اجتماع میں مفادات کا تصادم ضرور ہوتا ہے اس لیے اس کے سدِّباب کے لیے ایک حکومت کی ضرورت ہوتی ہے جو اس معاشرہ میں انصاف قائم کر سکے۔ حیران کُن بات یہ

گزشتہ صفحہ کا حاشیہ [۱]

[۱] تفسیر مراغی جلد ۲۷ ص ۱۸۳

حاشیہ صفحہ ہذا [۱]، [۲] فروع کافی جلد ۵ ص ۸ (حدیث ۱۰ ، ۱۱)

[۳] فروع کافی جلد ۵ ص ۲ حدیث ۱

ہے کہ یہ چاروں "حـدیـد" یعنی لوہے کی احتیاج رکھتے ہیں۔ اگر یہ وسیلہ نہ ہوتا تو انسان کی زندگی بہت مشکل ہوجاتی۔ پھر یہ کہ چونکہ انسان کو لوہے کی بہت زیادہ ضرورت ہے لہٰذا خُدا نے اسے بہت زیادہ اور آسانی سے حاصل ہونے والا بنایا ہے۔ (یہ ٹھیک ہے کہ دُوسری دھاتیں بھی انسانی زندگی میں دخل رکھتی ہیں لیکن زیادہ ضرورت لوہے کی ہے)۔ یہاں سے (فیہ بأس شدید ومنافع للناس) کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔

۲۶۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا
النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ
مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ○

۲۷۔ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى
ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ
الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا
مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا
رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ
اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ○

ترجمہ

۲۶۔ ہم نے نوحؑ و ابراہیمؑ کو بھیجا اور ان کی ذُرّیّت میں نبوّت و کتاب قرار دی۔ بعض ان میں سے ہدایت یافتہ ہیں اور ان میں سے بہت سے فاسق ہیں۔

۲۷۔ پھر ان کے بعد ہم نے دُوسرے رسُول بھیجے ان کے بعد ہم نے عیسیٰؑ ابن مریمؑ کو مبعوث کیا اور انہیں انجیل عطا کی۔ ان لوگوں کے دل میں جنہوں نے ان کی پیروی کی ہم نے

رحمت و رافت پہنچائی اور جس رہبانیت کا انہوں نے اختراع کیا تھا وہ ہم نے ان پر عائد نہیں کی تھی۔ اگرچہ خوشنودئ خدا ان کا مقصد تھا لیکن اس کے حق کی اُنہوں نے رعایت نہیں کی۔ اس لیے ہم نے ان میں سے جو ایمان لے آئے ان کو اُجر دیا اور ان میں کثرت فاسقوں کی ہے۔

تفسیر

ہم نے یکے بعد دیگرے انبیاء بھیجے

جیسا کہ ہم جانتے ہیں قرآن کا شیوہ یہ ہے کہ وہ اپنی تعلیمات کے اصولِ کلّی کے ایک سلسلہ کو بیان کرنے کے بعد گزشتہ قوموں کے حالات کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ وہ اس بیان کے سلسلہ میں شاہد کا کام دیں اس مقصد کے لیے یہاں بھی گزشتہ مسائل کے بعد ارسالِ رسل، بینات وکتاب و میزان کے ذکر اور مغفرت و سعادتِ جاودانی تک پہنچنے کے لیے ایک دُوسرے کے مقابلہ میں سبقت کرنے کے تذکرے کے ساتھ گزشتہ اقوام اور پیغمبروں کے نام لیتا ہے اور اسلام کے اصول کلی کو اُن کی زندگی میں ثابت کرتا ہے۔

سب سے پہلے سلسلۂ گفتگو نوحؑ و ابراہیمؑ سے شروع کرتا ہے جو شیخ الانبیا ہیں اور نمایاں رسُولانِ حق میں سے ہیں اور فرماتا ہے:

"ہم نے نوحؑ و ابراہیمؑ کو بھیجا اور ان دونوں کی ذرّیت میں نبوّت وکتاب آسمانی قرار دی" (ولقد ارسلنا نوحًا وابراھیم وجعلنا فی ذرّیّتھما النبوّة والکتاب)۔ "لیکن ان لوگوں نے ان عظیم نعمتوں سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ ایک گروہ ان کی تعلیم پر ایمان لایا اور ان میں سے اکثریت گنہگاروں اور بے ایمان لوگوں کی ہے۔" (فمنھم مھتد وکثیر منھم فاسقون)۔

جی ہاں وہ نبوّت جس کے ساتھ شریعت اور آئین بھی تھے حضرت نوحؑ سے شروع ہوئی اور ان کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے، جو دُوسرے اولوالعزم پیغمبر ہیں، اس شریعت کو دوام بخشا اور یہی ان کی ذرّیت میں برقرار رکھی گئی۔ لیکن ہمیشہ اس نُورِ ہدایت سے اقلیت ہی نے فائدہ اُٹھایا جب کہ اکثریت نے راہِ خطا طے کی۔ اس کے بعد اجمالی طور پر دُوسرے پیغمبروں کے سلسلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے کے آخری نبی یعنی حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے حوالے سے فرماتا ہے: (ثم قفّینا علیٰ اٰثارھم برسلنا)۔ جو یکے بعد دیگرے آئے اور اُنہوں نے لوگوں کے راستے میں ہدایت کے چراغ روشن کیے یہاں تک کہ عیسٰی علیہ السّلام تشریف لائے۔ "ہم اس کے بعد عیسٰی ابنِ مریمؑ کو لے آئے"۔ (وقفّینا بعیسی ابن مریم)۔ "قفّینا" "قفا" کے مادّہ سے ہے جس کے معنی پُشت کے ہیں۔ قافیہ کو اسی لیے قافیہ کہتے ہیں کہ شعر کے آخری حصّے ایک دوسرے کے مشابہ اور عقب میں قرار پاتے ہیں مذکورہ بالا جُملے سے مُراد یہ ہے کہ انبیاء و مُرسلین نے یکساں طریقہ پر ہم آہنگ مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر یکے بعد دیگرے عرصہ وجود میں قدم

رکھا ہے اور ایک دوسرے کی تعلیمات کی تائید و تکمیل کی ہے۔ یہ تعبیر درحقیقت "توحید نبوت" کی طرف ایک بہت ہی خوبصورت اشارہ ہے۔ اس کے بعد حضرت مسیح کی کتاب آسمانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

"ہم نے اسے انجیل عطا کی" (وآتیناہ الانجیل)۔ اس کے بعد ان کے پیروکاروں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"ہم نے ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے اس کی پیروی کی رحمت و رافت قرار دی"۔ (وجعلنا فی قلوب الّذین اتبعوہ رأفة و رحمة)۔ بعض مفسرین نے رحمت و رافت دونوں کے ایک ہی معنی تجویز کیے ہیں لیکن مفسرین کا ایک گروہ ان دونوں کے درمیان فرق کا قائل ہے۔ رافت رفع مضرات کی محبت کے لیے ہے اور رحمت حصول منافع کی محبت کے معنوں میں ہے۔ اسی لیے رافت کا ذکر عام طور پر رحمت سے پہلے ہوتا ہے اور اسی وجہ سے زناکاروں کی سزا والی آیت میں فرماتا ہے: ولا تأخذکم بھما رأفة فی دین اللہ "کہیں ایسا نہ ہو کہ تم خدا کی مقرر کی ہوئی حد کے جاری کرنے کے سلسلہ میں رافت و محبت کا شکار ہو جاؤ اور خدا کے حکم کو فراموش کردو" (نور-۲)

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے سچے پیروکاروں کی رحمت و رافت کا مسئلہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کی طرف صرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہو بلکہ سورہ مائدہ کی آیت ۸۲ میں بھی ہمیں ملتا ہے۔ ولتجدن اقربھم مودة للذین اٰمنوا الذین قالوا انا نصارٰی ذالك بان منھم قسیسین و رھبانًا و انھم لا یستکبرون "تو مومنین کے قریب ترین دوست (غیر مسلموں میں سے) ان لوگوں کو پائے گا جو کہتے ہیں ہم نصارٰی ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ان میں تارک الدنیا اور صاحب علم افراد ہیں اور وہ (حق کے مقابلے میں) تکبر نہیں کرتے۔ اگرچہ یہ آیت زیادہ تر حبشہ کے عیسائیوں اور نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے مسلمانوں کو پناہ دی تھی اور ان سے خلوص محبت روا رکھا تھا، لیکن کُلّی طور پر سچے عیسائیوں کی رافت و محبت کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے مُراد وہ خونخوار بھیڑیے اور آدم نما دیو نہیں ہیں جو ہمارے زمانے میں اپنے آپ کو نصارٰی کہتے ہیں اور ساری دنیا میں غارت گری کرتے ہیں اور لوگوں کو خون میں نہلاتے ہیں۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "ان کے دلوں کو ہم نے رہبانیت کی طرف لگا دیا ہے جو خُود ان کی اختراع ہے اور اسے ہم نے ان کے لیے مقرر نہیں کیا تھا۔ ان کا مقصد تھا کہ خوشنودیٔ خُدا حاصل کریں لیکن انہوں نے حق کی رعایت نہیں کی لہٰذا ہم نے ان میں سے ان لوگوں کو جو ایمان لائے تھے، اجر عطا کیا لیکن ان میں سے بہت سے فاسق و گنہگار ہیں"۔ (و رھبانیة ابتدعوھا ما کتبناھا علیھم الّا ابتغاء رضوان اللہ فما رعوھا حق رعایتھا فاٰتینا الذین اٰمنوا منھم اجرھم و کثیر منھم فاسقون)[1]۔

تو اس طرح انہوں نے نہ صرف یہ کہ مسیح کے آئینِ توحید کی رعایت نہیں کی بلکہ اس رہبانیت کے حق کی بھی رعایت نہیں کی جو خُود ان کی اپنی اختراع تھی اور زہد و رہبانیت کے نام پر اُنہوں نے مخلوقِ خدا کے راستے میں جال بچھائے ہیں اور گرجاؤں کو مختلف قسم کے فسادات کا مرکز

---

[1] اس آیت کی ترکیب اور معنی میں مفسرین کے درمیان بہت کچھ اختلاف ہے۔ بعض نے اسے رأفت و رحمت پر عطف سمجھا ہے اور لفظ "حب" رہبانیت سے پہلے مقدر سمجھا ہے کیونکہ رہبانیت کوئی ایسی چیز نہیں جو دل میں ہو بلکہ اس کی محبت کا تعلق دل سے ہے اور ایک جماعت نے اُسے فعل مضمر سے منصوب سمجھا ہے جس کا مفسر ابتدعوھا ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے "ابتدعوا رھبانیة ابتدعوھا"۔ (الّا ابتغاء رضوان اللہ) میں بھی دو نظریے ہیں پہلا یہ کہ استثنائے منقطع ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے: (ولکنھم ابتدعوھا ابتغاء رضوان اللہ) دُوسرا یہ کہ استثنائے متصل ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے رہبانیت کی ایک قسم ان پر مقرر کی تھی جس کا مقصد رضائے الٰہی کو حاصل کرنا تھا لیکن انہوں نے رہبانیت کی ایک دوسری نوع ایجاد کر لی جو حق تعالیٰ کی رضا کے خلاف تھی یوں نظر آتا ہے کہ دونوں موارد میں پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

بنا دیا ہے اور انہوں نے دین مسیح میں بہت سی خرابیاں پیدا کر دی ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق رہبانیت دین مسیح کا جُز نہیں تھی بلکہ حضرت عیسٰیؑ کے پیروکاروں نے اُن کے بعد اس کی اختراع کی تھی۔ ابتداء میں اس رہبانیت کا ایک معتدل انداز تھا لیکن بعد میں اس میں دین سے بالکل انحراف کی کیفیت پیدا ہوگئی اور اس کی وجہ سے بہت سے مفاسد رُونما ہوئے۔ دُوسری تفسیر کے مطابق دینِ مسیح میں ایک طرح کا زہد موجود تھا لیکن اس کے پیروکاروں نے جو بدعتیں رہبانیت کے نام پر جاری کیں وہ کچھ اور تھیں جس کا پروردگارِ عالم نے انہیں کبھی مکلف نہیں بنایا تھا۔[1]

پہلی تفسیر مناسب ہی نہیں بلکہ بعض حیثیتوں کے اعتبار سے زیادہ مناسب ہے۔ بہرکیف مندرجہ بالا آیات سے ظاہری طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رہبانیت دینِ مسیح میں موجود نہیں تھی۔ ان کے پیروکاروں نے ان کے بعد اسے اپنی طرف سے دینِ مسیح میں شامل کیا ہے۔ ابتداء میں ایک قسم کے زہد کی طرف جھکاؤ اچھا لگتا تھا۔ مثال کے طور پر بہت سے مراسم اور سننِ حسنہ جو ابھی تک لوگوں میں رائج ہیں اور کوئی شخص بھی ان کو شرعی احکام کے ماتحت نہیں سمجھتا لیکن یہ سُنّت اور یہ رسم بعد میں دینِ حق سے انحراف کی شکل اختیار کر گئی حتٰی کہ آلودۂ گناہ ہوگئی۔ (فمارعوھا حق رعایتھا) "انہوں نے اس کے حق کی رعایت نہیں کی" اس جملہ کی قرآنی تعبیر اس امر کی دلیل ہے کہ اگر اس کے حق کو ادا کیا جاتا تو وہ ایک اچھی سُنّت ہوتی اور سُورۂ مائدہ کی آیت ۸۲ کی تعبیر جو رہبانیت اختیار کرنے والوں اور سچے عیسائی علما کو اچھی نظر سے دیکھتی ہے وہ اس مقصد کی شاہد ہے۔ (غور کیجئے) اور اگر رہبانیت رأفت و رحمت پر عطف ہے تو پھر اس مدعا پر ایک اور شاہد پیدا ہو جائے گا کیونکہ وہ پھر رافت و رحمت کا ہم ردیف ہوگا جسے خدا نے ایک پسندیدہ عنوان کے ماتحت ان کے دلوں میں ڈال دیا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر کوئی سُنّتِ حسنہ لوگوں میں رائج ہو جائے (مثلاً زُہد کا دستور) جس کے اصولِ کُلی دینِ حق میں موجود ہوں اور لوگ اس سُنّت کو خصوصیت کے ساتھ دین سے منسُوب بھی نہ کریں بلکہ اسے اصولِ کُلی کا ایک مصداق سمجھیں اور اس کا حق ادا کریں تو اس میں کوئی بُرائی نہیں ہے بدبختی وہاں سے شروع ہوتی ہے کہ جب افراط و تفریط کی صورتِ حال پیدا ہو جائے اور اس سُنّتِ حسنہ کو سُنّت سیئہ میں تبدیل کردے، جیسا کہ موجودہ زمانے میں ہمارے ہاں مراسم سوگواری اور دین کے پیشواؤں کا یوم ولادت و وفات منانے کا سلسلہ جاری ہے۔ اور اسی طرح شہیدوں اور مرحوم عزیزوں کی یاد منانا، ان کا یومِ ولادت و شہادت منانا یا دسواں اور چالیسواں کرنا یہ اسلام کے اصولِ کُلی کے مطابق ہے اور تعظیم شعائر کے ذیل میں آتا ہے اور دین کے رہبروں اور شہدائے عموم مسلمین کی یاد منانے کا جو معمول ہے اسی سے ماخوذ و مربوط ہے۔ شہدائے کربلا کی عزاداری اور اس قسم کے ایام مصائب کی بُنیاد اسلام کے اصولوں کی رُوح کُلی کے مطابق ہے۔ ان مراسم کی جزئیات و تفاصیل کسی مخصوص شرعی حکم کے ماتحت نہیں ہے بلکہ یہ دستور اسلامی کی رُوح کلی کے مطابق انجام پاتی ہیں تو جب تک ان مراسم میں حدُودِ شریعت سے تجاوز نہیں ہے اور گناہ و خرافات سے آلودہ ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے تو یقیناً یہ "ابتغاء رضوان اللہ" کی مصداق ہیں اور سُنّتِ حسنہ کہلائے جانے کی مستحق ہیں۔ اگر یہ شکل نہ ہو تو پھر معاملہ مختلف ہے۔ یُوں نظر آتا ہے کہ رہبانیت "رھبہ" کے مادّہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی خوف خدا

---

[1] پہلی تفسیر استثنا کے منقطع ہونے کی صُورت میں ہے اور دُوسری تفسیر اس کے متصل ہونے کے مطابق ہے۔ غور کیجئے یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اگر رہبانیت کا عطف "رافت و رحمت" پر ہو جیسا کہ ہم نے متن میں منتخب کیا ہے تو پھر دلوں میں اس کے جعل کرنے سے مُراد ان کا اس مسئلہ کی طرف میلانِ قلبی ہے جب کہ "ماکتبناھا" سے مُراد یہ ہے کہ مسئلہ رہبانیت دین مسیح میں ایک حکم الٰہی کی شکل میں نہیں تھا اگرچہ اس سے لگاؤ اور اس کی محبت خدا نے ہی ان کے دل میں ڈالی تھی تو اس بنا پر ابتدعوھا کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتا۔

کے ہیں۔ شروع میں یہ رہبانیت دُنیا سے بے اعتنائی کا مصداق تھی لیکن بعد میں اس میں بہت سی تحریفیں دخل انداز ہوگئیں۔ اگر اب ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام اس رہبانیت کا شدت سے مخالف ہے تو اس کی اِس حد سے تجاوز کی ہوئی آخری صُورت کی بنا پر ہے چنانچہ نکات کی بحث میں ہم اِنشاءاللہ اِس کی مزید تشریح کریں گے۔

چند نکات

۱۔ اِسلام اور رہبانیت

جیسا کہ ہم نے کہا ہے رہبانیت " رہبہ " کے مادّہ سے خوف کے معنوں میں ہے اور یہاں مُراد خوف خدا ہے۔ " مفردات " میں " راغب " کے بقول اس سے ایسا خوف مُراد ہے جس میں پرہیز و اضطراب کی آمیزش ہو اور " ترہب " یعنی " تعبد " اور عبادت کرنے کے معنی میں ہے لہٰذا رہبانیت کے معنی شدید تعبد ہیں۔ مذکورہ بالا آیت کی ہم جس طرح بھی تفسیر کریں اس سے ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ عیسائیوں میں ایک طرح کی رہبانیت موجود تھی اگرچہ دینِ مسیح میں اس طرح کا لازم حکم نہیں دیا گیا تھا لیکن مسیح کے پیروکاروں نے اس رہبانیت کے سلسلہ میں اس کی حدُود سے تجاوز کیا اور وہ اسے دین سے برگشتگی کی طرف لے گئے۔ اس وجہ سے اسلام نے اس کی شدت سے مذمت کی اور یہ مشہور حدیث (لا رهبانية في الاسلام) " اِسلام میں رہبانیت نہیں ہے " بہت سے منابع اِسلامی میں نظر آتی ہے۔[۱]

عیسائیوں کی رہبانیت کے سلسلہ میں دُوسری قبیح بدعتوں کے علاوہ ایک بدعت یہ تھی کہ تارک الدنیا مردوں اور عورتوں نے ازدواج کو اپنے اُوپر حرام کر لیا تھا اور دوسری چیز یہ تھی کہ اجتماعی گوشہ نشینی کو جائز سمجھ لیا گیا تھا۔ اس طرح معاشرتی ذمہ داریوں کو ٹھوکر مار کر عبادت کرنے کے ارادہ سے دُور دراز کے گرجاؤں کو منتخب کرنا اور معاشرتی ماحول سے دُور زندگی بسر کرنا دین کا جُزو سمجھا جانے لگا تھا۔ اس طرح گرجاؤں اور رہبانیت کے قائل لوگوں کی زندگی کے مرکزوں سے بہت سے مفاسد وابستہ ہو گئے تھے جن کے ایک گوشہ کے بارے میں اِنشاءاللہ اس بحث کی تکمیل کے وقت ہم ایک بحث پیش کریں گے۔

یہ ٹھیک ہے کہ تارک الدنیا عورتوں اور مردوں (راہبین و راہبات) نے بہت سی مثبت خدمات انجام دی ہیں، مثال کے طور پر ناقابلِ علاج بیماروں کی تیمارداری کا فرض انجام دینا (جذام اور کوڑھ کے مریض)۔ اور دُور دراز علاقوں میں جا کر وحشی اقوام میں تبلیغ کا فرض انجام دینا اور اسی طرح کے دیگر مطالعاتی اور تحقیقی پروگراموں کو بروئے کار لانا لیکن یہ تمام امور ان پروگراموں سے متعلق مفاسد کے مقابلہ میں بہت کم ہیں اور مفاسد کئی گنا زیادہ ہیں۔

اصولی طور پر انسان ایک ایسا موجود ہے جو معاشرتی طور پر زندگی گزارنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اُس کی مادّی و معنوی ترقی بھی اسی میں مضمر ہے کہ وہ تمدنی اور اجتماعی زندگی بسر کرے۔ اسی لیے کسی آسمانی مذہب نے انسان کے بارے میں اس اجتماعی زندگی کے خلاف کوئی راہِ عمل تجویز نہیں کی بلکہ اس کی بنیادوں کو مستحکم کیا ہے۔ خدا نے انسان میں اس کی حفاظتِ نسل کے لیے " غریزہ جنسی " پیدا کیا ہے۔ لہٰذا ہر وہ چیز جو اس حفاظتِ نسل کی مطلق طور پر نفی کرے وہ یقیناً باطل ہے۔ اسلامی زُہد ایک مختلف چیز ہے۔ اس کے معنی ہیں سادہ طور پر زندگی بسر کرنا، عیش و عشرت کو ترک کرنا اور مال و مقام کے چنگل میں پھنسنا

---

[۱] مجمع البحرین میں مادہ " رھب " میں یہ حدیث آئی ہے اور نہایہ ابن اثیر میں بھی بیان ہوئی ہے۔

اس زہد کا عیسائیت کی رہبانیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ رہبانیت کے معنی ہیں معاشرتی اور اجتماعی زندگی سے فرار اختیار کرنا جب کہ زُہد کے معنی ہیں اجتماعی زندگی کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنا۔ مشہور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ عثمان بن مظعون کا بیٹا مرگیا تھا تو وہ بہت غمگین ہوئے یہاں تک کہ اُنھوں نے گھر کو مسجد بنالیا اور عبادت میں مشغول ہوگئے اور باقی تمام کام چھوڑ دیے۔ یہ خبر رسولِ خُدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے عثمان کو بلایا اور فرمایا :

(یا عثمان ان اللّٰہ تبارک و تعالیٰ لم یکتب علینا الرھبانیۃ انما رھبانیۃ امتی الجھاد فی سبیل اللّٰہ)

"اے عثمان خُدا نے میری اُمت کے لیے رہبانیت کو تجویز نہیں کیا ہے۔ میری اُمت کی رہبانیت تو یہ ہے کہ راہِ خدا میں جہاد کیا جائے[1]" اس کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تو چاہتا ہے کہ مادّی زندگی سے رُوگرداں ہو جائے تو اس عمل کو منفی شکل میں انجام نہ دے اور اجتماعی گوشہ نشینی کی راہ اختیار نہ کر بلکہ اسے ایک مثبت طریقِ عمل میں تلاش کر اور وہ مثبت طریقِ عمل راہِ خدا میں جہاد ہے۔ اس کے بعد پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے لیے ایک تفصیلی بحث نماز با جماعت کی فضیلت کے مسئلہ میں بیان کرتے ہیں جو گوشہ نشینی اور رہبانیت کی نفی کی تائید میں ہے۔ ایک اور حدیث میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ کے بھائی علیؑ ابن جعفرؒ نے آپ سے سوال کیا:

الرجل المسلم ھل یصلح ان یسیح فی الارض او یترھب فی بیت لا یخرج منہ؟

قال لا۔

کیا مردِ مسلمان کے لیے مناسب ہے کہ وہ سیاحت کرے یا رہبانیت اختیار کرے اور اپنے گھر میں بیٹھ رہے اور باہر نہ نکلے تو امام نے فرمایا نہیں[2]

اس کی وضاحت یہ ہے کہ وہ سیاحت جس کی اس روایت میں ممانعت ہوئی ہے رہبانیت ہی کی قسم کی ایک چیز ہے یعنی وہ ایک طرح کی سیر کرنے والی رہبانیت ہے اور وہ یُوں ہے کہ بعض افراد بغیر اس کے کہ ان کا کوئی گھر بار یا کاروبار ہو جہاں گردی کی شکل میں سامانِ سفر کے بغیر ہمیشہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف جاتے تھے اور لوگوں سے مدد حاصل کرکے اور گدائی کرکے زندگی بسر کرتے تھے اور اسے ایک قسم کا زُہد اور ترکِ دُنیا خیال کرتے تھے۔ لیکن اسلام اس کی ہی نہیں بلکہ "مقیم رہبانیت" کی بھی نفی کرتا ہے۔ جی ہاں تعلیماتِ اسلامی کی نظر میں اہم یہ ہے کہ انسان اجتماعی زندگی اختیار کرتے ہوئے زہد اختیار کرے نہ یہ کہ معاشرتی زندگی کو خیرباد کہہ کر زاہد بنے۔

۲۔ رہبانیت کا تاریخی سرچشمہ

مسیحیت کی موجودہ تاریخیں بتاتی ہیں کہ وہ رہبانیت جو موجودہ شکل میں ہے یہ مسیحیت کے قرونِ اولیٰ میں موجود نہیں تھی وہ اس

[1] بحار الانوار جلد ۷۰ ص ۱۱۴ (باب نہی از رہبانیت حدیث ۱)

[2] بحار الانوار جلد ۷۰ ص ۱۱۹ حدیث ۱۰

کی ابتدا تیسری صدی میلادی کے بعد امپراطور روم ریسوس کے ظہور اور مسیح کے پیروکاروں سے اس کی شدید لڑائی کے بعد سے بتاتی ہیں۔ عیسائیوں نے اس امپراطور (خونخوار) سے شکست کھانے کے بعد پہاڑوں اور بیابانوں میں پناہ لی تھی[1]

اسلامی روایات میں بھی یہی معانی دقیق شکل میں پیغمبر گرامیؐ سے منقول ہیں کہ ایک دن آنحضرتؐ نے ابن مسعودؓ سے فرمایا:

"تم جانتے ہو کہ رہبانیت کب پیدا ہوئی؟ انہوں نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا پیغمبر بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بعد جبارین کی ایک جماعت کا ظہور ہوا اور مومنین نے تین مرتبہ ان سے جنگ کی اور شکست کھائی لہٰذا بیابانوں میں جا چھپے اور موعود عیسٰے علیہ السلام (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ظہور کے انتظار میں پہاڑوں کے غاروں میں عبادت میں مشغول ہوگئے۔ ان میں سے بعض اپنے دین پر باقی رہے اور بعض نے کفر کی راہ اختیار کی۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

جانتے ہو میری اُمت کی رہبانیت کیا ہے؟ عرض کیا خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا: الھجرۃ والجھاد والصلٰوۃ والصوم والحج والعمرۃ۔

"میری اُمت کی رہبانیت: ہجرت، جہاد، نماز، روزہ، حج اور عمرہ ہے"[2]

مشہور عیسائی مؤرخ "ویل ڈورانت" اپنی مشہور تاریخ کی جلد ۱۳ میں ایک تفصیلی بحث راہبوں کے بارے میں درج کرتا ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ راہبوں کے ساتھ راہبوں کا میل جول چوتھی میلادی سے شروع ہوا اور رہبانیت کا معاملہ روز بروز بڑھتا گیا یہاں تک کہ دسویں صدی میلادی میں اپنی انتہا کو پہنچ گیا[3]

اس میں شک نہیں کہ اس اجتماعی طور پر ظہور میں آنے والے معاملے کے دُوسرے معاملات کی طرح تاریخی اسباب کے علاوہ نفسیاتی اسباب بھی ہیں۔ منجملہ ان تمام کے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ اصولی طور پر متفرق افراد و اقوام کا شکستوں اور ناکامیوں کے مقابلہ میں جو ردِّ عمل ہے وہ مختلف ہوتا ہے۔ بعض گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں اور باطن کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو اجتماعی مصروفیتوں سے بے تعلق کر لیتے ہیں جب کہ دوسرا گروہ شکست سے استقامت کا درس لیتا ہے اور اپنے اندر زیادہ صلابت اور ثابت قدمی پیدا کر لیتا ہے۔ پہلا گروہ رہبانیت یا اسی قسم کی کسی صُورتِ حال کو اختیار کر لیتا ہے اور دوسرا گروہ زیادہ اجتماعی ردِّ عمل پیش کرتا ہے۔

۳۔ رہبانیت سے پیدا ہونے والے اجتماعی اور اخلاقی مفاسد

قوانینِ خلقت سے انحراف ہمیشہ اپنے پیچھے منفی ردِّ عمل رکھتا ہے۔ اس وجہ سے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جس وقت انسان اجتماعی

---

[1] دائرۃ المعارف قرن بیستم مادہ "رھب)

[2] تفسیر "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۲۴۳ (تھوڑے سے خلاصہ کے ساتھ) تفسیر درالمنثور میں اس کے مقابل ایک اور حدیث نقل ہوئی ہے (جلد ۶ ص ۱۷۷)۔

[3] تاریخ "ویل ڈورانت" جلد ۱۳ ص ۲۴۳

زندگی سے، جو اس کی فطرت میں رچی بسی ہے، دُور ہو جائے تو شدید ردِّ عمل کا شکار ہو جاتا ہے اس لیے رہبانیت جو انسان کے اصولِ فطرت اور طبیعت و مزاج کے برخلاف ہے زیادہ مفاسد کا باعث بنتی ہے۔

۱۔ رہبانیت انسان کے مدنی الطبع ہونے کی رُوح کے خلاف جنگ کرتی ہے اور انسانی معاشروں کو انحطاط اور پس ماندگی کی طرف لے جاتی ہے۔

۲۔ رہبانیت نہ صرف یہ کہ کمالِ نفس، تہذیبِ رُوح اور تہذیبِ اخلاق کا سبب نہیں ہے بلکہ اخلاقی تنزل، سستی و کاہلی، بدبینی، غرور و تکبّر و عجب اور نامعقول احساسِ برتری کا باعث بنتی ہے۔ فرض کیجیے کہ انسان حالتِ گوشہ نشینی میں اخلاقی فضیلت تک پہنچ بھی جائے تو یہ کیفیت فضیلت شمار نہیں ہوگی۔ فضیلت تو یہ ہے کہ انسان اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے اندر رہ کر خُود کو اخلاقی گراوٹوں سے بچا سکے۔

۳۔ ترکِ ازدواج جو رہبانیت کے اصولوں میں سے ہے نہ صرف یہ کہ کسی کمال کو پیدا نہیں کرتا بلکہ کئی نفسیاتی اُلجھنوں اور بیماریوں کی تخلیق کا سبب بنتا ہے۔ دائرۃ المعارف قرن بلیستم میں ہم پڑھتے ہیں کہ بعض راہب صنفِ نازک کی طرف توجہ کو اس قدر شیطانی عمل سمجھتے تھے کہ وہ اس بات پر تیار نہیں ہوتے تھے کہ کسی مادہ جانور کو اپنے گھر لے جائیں اس خوف سے کہ کہیں رُوح شیطانی اس کی رُوحانیت پر ضرب نہ لگا دے۔ اس کے باوجود تاریخ گرجاؤں کے بارے میں اپنے اندر بہت زیادہ قباحتیں لیے ہوئے ہے یہاں تک کہ بقول "ویل ڈورانت" "اینوسان کے تیسرے پوپ" نے ایک گرجے کی فاحشہ خانے کے عنوان سے تعریف کی ہے۔[1]

ان میں سے بعض گرجے شکم پرستوں، دُنیا طلبوں اور اچھا وقت گزارنے والوں کے اجتماع کا مرکز بن چکے تھے۔ یہاں تک کہ بہترین شراب گرجوں ہی میں ملتی تھی۔ البتہ تاریخ کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے شادی قطعاً نہیں کی لیکن یہ چیز ہرگز اس امر سے آپ کی مخالفت کی بنا پر نہیں تھی بلکہ حضرت مسیحؑ کی مختصر سی عمر اور دُنیا کے مختلف علاقوں کی طرف ان کے مسلسل سفر نے ان کو اس امر کی مہلت نہ دی۔

رہبانیت کے بارے میں بحث کرنا ایک مُستقل کتاب چاہتا ہے۔ اگر ہم اس کی تفصیلات کی طرف جائیں تو بحثِ تفسیری سے خارج ہو جائیں گے۔ اس بحث کو حضرت علی علیہ السلام کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آپؑ نے آیہ ذیل کی تفسیر میں فرمایا:

قل ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالاً الذین ضلّ سعیھم فی الحیٰوۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعًا۔

"کہہ دے کیا میں تمہیں خبر دوں کہ لوگوں میں سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ وُہ وہ ہیں جن کی کوشش دُنیاوی زندگی میں گُم ہو گئی لیکن اس کے باوجود وہ گمان کرتے ہیں کہ اچھا کام انجام دے رہے ہیں۔"[2]

حضرت علی علیہ السلام نے اس کی تفسیر میں فرمایا: (ھم الرھبان الذین حبسوا انفسھم فی السواری) اس کا ایک واضح مصداق

---

[1] ویل ڈورانت جلد ۱۳ ص ۲۴۳

[2] سُورہ کہف (آیت ۱۰۳ و ۱۰۴)

وہ راہب ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو پہاڑوں اور بیابانوں کی اُونچی جگہوں میں قید کر رکھا ہے۔ اور وہ گمان کرتے ہیں کہ اچھا کام انجام دے رہے ہیں۔"[1]

۴۔ انجیل یا اناجیل

انجیل اصل میں ایک یونانی لفظ ہے اس کے معنی ہیں بشارت یا جدید تعلیم اور یہ اس کتاب کا نام ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ یہ لفظ بارہ مرتبہ قرآن مجید میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ مفرد کی شکل میں ہے لیکن قابل توجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جو چیز انجیل کے نام سے مشہور ہے وہ بہت سی کتابوں کا مجموعہ ہے جنہیں اناجیل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان میں سے مشہور چار انجیلیں ہیں:
"لوقا" "مرقس" "متی" اور "یوحنا"۔

عیسائیوں کا نظریہ ہے کہ چار انجیلیں اصحاب مسیح یا ان اصحاب کے شاگردوں میں سے چار افراد کے ذریعہ تحریر کی گئی ہیں۔ ان کی تالیف کی تاریخ حضرت مسیحؑ کے ۳۸ سال بعد سے لے کر تقریباً ایک صدی بعد تک پہنچتی ہے۔ اس بنا پر مسیح علیہ السلام کی اصل کتاب ایک آسمانی کتاب کی حیثیت سے مستقل طور پر پردہ خفا میں چلی گئی ہے۔ صرف اس کے بعض حصے جو ان چاروں افراد کے حافظے میں رہ گئے تھے ان کے اپنے افکار کی آمیزش کے ساتھ ان چاروں انجیلوں میں تحریر ہوئے ہیں۔ اس عنوان پر زیادہ تفصیلی بحث ہم سورہ آل عمران کی آیت ۳ میں پیش کر چکے ہیں۔[2]

---

[1] کنز العمال جلد ۲ حدیث ۴۴۹۶۔

[2] تفسیر نمونہ جلد ۲ ص ۲۴۱ سے آگے۔

۲۸۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ یُؤْتِكُمْ
كِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَ یَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ
بِهٖ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۚۙ
۲۹۔ لِّئَلَّا یَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّنْ
فَضْلِ اللّٰهِ وَ اَنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ
وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۧ

ترجمہ

۲۸۔ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو خُدا سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ تاکہ وُہ اپنی رحمت کے دو حصّے تمہیں بخش دے اور تمہارے لیے ایسا نُور قرار دے جس کے ساتھ (لوگوں کے درمیان اپنی راہِ حیات میں) چلو پھرو اور تمہارے گناہوں کو بخش دے اور خُدا غفور و رحیم ہے۔

۲۹۔ تاکہ اہلِ کتاب جان لیں کہ وہ فضلِ خدا میں سے کسی چیز پر قُدرت نہیں رکھتے اور فضل (رحمت) سب کا سب اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وُہ جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور خُدا صاحبِ فضلِ عظیم ہے۔

شانِ نزول

بہت سے مفسرین نے مذکورہ بالا آیت کے لیے ایک شانِ نزول نقل کی ہے جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جعفرؓ ابن ابی طالب کو ستر افراد کے ساتھ نجاشی (حبشہ) کی طرف بھیجا۔ حضرت جعفرؓ نجاشی کے پاس گئے اور اسے اسلام کی دعوت دی۔ وہ دعوت قبول کرکے ایمان لے آیا۔ حبشہ سے واپسی کے وقت اس ملک کے چالیس افراد نے جو ایمان لا چکے تھے حضرت جعفرؓ سے کہا ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم اس پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوں اور اپنا اسلام اس کے سامنے پیش کریں۔ پھر وہ حضرت جعفرؓ کے ساتھ مدینہ آئے۔ جس وقت انہوں نے مسلمانوں کا فقر و فاقہ دیکھا تو رسولؐ خدا سے عرض کیا کہ ہم اپنے دیار میں بہت زیادہ مال و متاع رکھتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنے ملک کی طرف پلٹ جائیں اور اپنا مال اپنے ساتھ لے آئیں اور مسلمانوں میں تقسیم کر دیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت دے دی وہ گئے اور اپنا مال لے آئے اور اسے اپنے اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور ان کی توصیف کی۔ الذین اٰتینٰهم الکتاب من قبله هم به یؤمنون ..... (قصص ۵۲ تا ۵۴)

اہلِ کتاب میں سے وہ لوگ جو ایمان نہیں لائے تھے جب انہوں نے یہ جملہ جو مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں آیا ہے سُنا۔ اولٰئك یؤتون اجرهم مرتین بما صبروا۔ " وہ اپنا اجر اپنے صبر و استقامت کی بنا پر دو مرتبہ حاصل کریں گے" تو وہ مسلمانوں کے سامنے کھڑے ہوگئے اور کہا: اے مسلمانو! جو شخص تمہاری کتاب اور ہماری کتاب دونوں پر ایمان لائے گا اسے دوہرا اجر ملے گا اور جو ہماری کتاب پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے تمہاری طرح صرف ایک اجر ہے۔ اس بنا پر تمہارے اپنے اقرار کے مطابق تم ہم پر کوئی فضیلت نہیں رکھتے"۔ یہ وہ منزل تھی کہ جس کے پیشِ نظر اوپر والی آیات نازل ہوئیں۔ یا ایها الذین اٰمنوا اتقوا الله اور اعلان کیا کہ مسلمانوں کو بھی دُگنا اَجر ملے گا۔ علاوہ خدائی نور اور مغفرت کے اور پھر مزید کہا کہ " اہلِ کتاب جان لیں کہ وہ خدا کے فضل و رحمت میں سے کوئی چیز اپنے ہاتھ میں لینے کی طاقت نہیں رکھتے۔[۱]

چونکہ گزشتہ آیات میں گفتگو عیسائیوں اور اہلِ کتاب کے بارے میں تھی، زیرِ بحث آیات اسی کی تکمیل ہیں جو گزشتہ آیات میں آیا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: (یا ایها الذین اٰمنوا اتقوا الله و اٰمنوا برسوله)۔ " اے ایمان لانے والو خُدا کے بارے میں تقویٰ اختیار کرو اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ"۔ اس آیت کا مخاطب کون ہے؟ اس کے بارے میں مفسرین کے دو قول ہیں:

پہلا یہ کہ مخاطب مؤمنین ہیں البتہ ان سے کہا جائے گا کہ ظاہری ایمان کافی نہیں ہے بلکہ وہ ایمان درکار ہے جو رُوح کی گہرائی تک ہو، جس کے نتیجے میں ہونے والے اعمال تقویٰ سے متصف ہوں تاکہ وہ اَجر جو آیت میں بیان ہوتے ہیں وہ حاصل ہو سکیں۔

دُوسرا یہ کہ مخاطب اہلِ کتاب میں سے مؤمنین ہیں یعنی اے وہ لوگو جو گزشتہ پیغمبروں اور کتابوں پر ایمان لائے ہو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی ایمان لے آؤ تاکہ انواع و اقسام کے اَجر حاصل کر سکو۔ جو چیز دوسری تفسیر کی شاہد بن سکتی ہے وہ کئی گنا اجر ہے جس کا ذکر آیت کے ذیل میں آیا ہے۔ ایک اجر گزشتہ انبیا پر ایمان لانے کا اور دُوسرا اجر پیغمبرؐ اسلام پر ایمان لانے کا۔ لیکن یہ تفسیر، علاوہ اس کے کہ، بعد والی آیت کے ساتھ، جیسا کہ ہم وضاحت کریں گے، سازگار نہیں ہے، آیت کی شانِ نزول اور یا ایها الذین اٰمنوا

---

[۱] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۴۴ یہی معنی تفسیر ابوالفتوح رازی اور رُوح المعانی میں اختلافات کے ساتھ زیرِ بحث آیات کے ذیل میں نقل ہوئے ہیں۔

کے اطلاق کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس بنا پر قبول کر لینا چاہیئے کہ مخاطب سب مؤمنین ہیں جنہوں نے بظاہر پیغمبرؐ کی طرف سے دی ہوئی دعوت اسلام کو قبول کر لیا ہے لیکن وہ ایمان راسخ جو ان کی رُوح کی گہرائیوں کو روشن کرے اور ان کے اعمال سے ظاہر ہو ابھی ان میں پیدا نہیں ہوا ہے۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں تین ایسی نعمتوں کی طرف جو مضبوط ایمان اور تقویٰ کے سائے میں حاصل ہوتی ہیں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اگر ایسا کرو تو خدا تمہیں اپنی رحمت میں سے دو حصہ دے گا اور تمہیں روشنی بخشے گا۔ جس کے سہارے زندگی کی راہ تلاش کرو وہ تمہیں بخش دے گا اور خدا غفور و رحیم ہے۔" (یؤتکم کفلین من رحمته و یجعل لکم نورًا تمشون به و یغفر لکم واللّٰہ غفور رحیم)۔ "کفل" (بروزن طفل) اس حصہ کے معنی میں ہے جو انسان کی حاجت کو پورا کرے اور ضامن کو اسی وجہ سے کفیل کہتے ہیں کہ وہ مدّ مقابل کی کفالت کرتے ہوئے اس کا حصہ دیتا ہے [1]

بہرحال ان دو حصوں سے مُراد وہی ہے جو سُورہ بقرہ کی آیت ۲۰۱ میں آیا ہے: ربّنا اٰتنا فی الدنیا حسنة وفی الاٰخرة حسنة " خداوندا! دُنیا میں بھی ہم کو نیکی دے اور آخرت میں بھی نیکی عطا فرما۔" یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ ان دونوں حصوں میں سے ایک حصہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کی وجہ سے ہے اور دوسرا حصہ گزشتہ انبیاء پر ایمان لانے کی وجہ سے ہے کیونکہ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ تمام گزشتہ انبیاءؑ اور ان کی آسمانی کتابوں پر ایمان لائے اور سب کو محترم شمار کرے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد پے در پے اور دائمی اجر ہیں۔ مذکورہ بالا معانی اور یہ معانی دونوں بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ ان کے دوسرے اجر (ویجعل لکم نورًا تمشون به) سے، بعض مفسرین کے بقول، مراد وہی نورِ ایمان ہے جو قیامت میں ان کے آگے اور دائیں سمت چل رہا ہوگا اور اس نور کی بدولت مؤمنین ظلماتِ محشر کو چیر کر نکل جائیں گے اور سعادتِ ابدی یعنی بہشت کی طرف بڑھیں گے جیسا کہ اس سورہ کی آیت ۱۲ میں آیا ہے: (یوم تری المؤمنین والمؤمنات یسعٰی نورهم بین ایدیهم و بایمانهم) جب کہ بعض دوسرے مفسرین اسے نور قرآن کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو دنیا میں مومنین کے پاس آیا ہے۔ جیسا کہ سُورہ مائدہ کی آیت ۱۵ میں ہم پڑھتے ہیں: (قد جاءکم من اللّٰہ نور و کتاب مبین) " خدا کی طرف سے تمہارے پاس نور آیا ہے اور کتابِ مبین آئی ہے۔" لیکن ظاہر ہے کہ آیت کا مفہوم مطلق اور وسیع ہے جو دُنیا کے ساتھ اختصاص رکھتا ہے۔ اور نہ آخرت کے ساتھ۔ دوسرے معنی میں ایمان اور تقویٰ سبب بنتے ہیں کہ مؤمنین کے دل پر سے حجاب ہٹ جائیں اور وہ حقائق کا چہرہ ویسا ہی دیکھیں جیسا وہ ہے اور اس کے سائے میں انہیں وہ مخصوص نگاہ نصیب ہو جن سے بے ایمان افراد محروم ہیں۔ اور یہ جو روایاتِ اہل بیتؑ میں آیا ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں نور سے مُراد وہ امام معصوم ہے جس کی لوگ اقتداء کرتے ہیں تو یہ حقیقت میں ایک واضح مصداق کا بیان ہے۔

[1] بعض کا نظریہ ہے کہ یہ لفظ کفل (بروزن وکل) سے لیا گیا ہے اور وہ اس چیز کو کہتے ہیں جو چوپاؤں کی کفل (پیٹھ کا آخری حصہ) پر رکھتے ہیں تاکہ وہ شخص جو سواری پر سوار ہو وہ گرنے نہ پائے۔ اس لیے ہر وہ چیز جو نگہداری کا سبب ہو اُسے کفل کہا جاتا ہے اور اگر ضامن کو کفیل کہتے ہیں تو وہ بھی اسی بنا پر ہے (ابوالفتوح رازی در ذیل آیات زیر بحث)۔ لیکن راغب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کے دو معنی ہیں اور دوسرے معنی بے قدر و قیمت چیز ہے، چوپاؤں کی کفل کے مشابہ (پیٹھ) کیونکہ جو شخص وہاں سوار ہو اُسے گرنے کا خوف نہیں ہوتا۔ (غور کیجئے)۔

(۲۔ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

آخر میں مؤمنین کا تیسرا اجر وہی گناہوں کا بخشنا ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان کے لیے کوئی نعمت خوشگوار ثابت نہیں ہو سکتی۔ پہلے اسے عذاب الٰہی سے محفوظ ہونا چاہیئے اس کے بعد وہ ایمان اور تقویٰ کے نور سے اپنی راہ روشن کرے اور آخر میں وہ خدا کی کئی گنا رحمتوں سے فیض یاب ہو۔ بعد والی آیت جو اس سورۃ کی آخری آیت ہے اس میں اس دلیل کا بیان ہے جو گزشتہ آیات میں آئی ہے فرماتا ہے: یہ کئی گنا خدائی نعمتیں نورانیت اور مغفرت کے علاوہ اس وجہ سے ہیں تاکہ اہل کتاب جان لیں کہ وہ فضل خدا میں سے کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے اور یہ کہ فضل و رحمت سب اسی کے ہاتھ میں ہے اور جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور خدا عظیم فضل و رحمت کا مالک ہے: (لئلا یعلم اهل الکتاب الّا یقدرون علٰی شیءٍ من فضل الله و ان الفضل بید الله یؤتیه من یشاء والله ذوالفضل العظیم)[۱]

یہ ان کا جواب ہے جو یہ کہتے تھے کہ (مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق) خداوند اہل کتاب کے اس گروہ کو جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لایا ہے دو اجر دے گا تو اس وجہ سے ہم جو ایمان نہیں لائے وہ مسلمانوں کی طرح ایک اجر تو رکھتے ہیں۔[۲] قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ مسلمان عام طور پر دو اجر رکھتے ہیں کیونکہ وہ پیغمبر اسلام اور تمام گزشتہ پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن اہل کتاب کا وہ گروہ جو ایمان نہیں لایا وہ کوئی حصہ نہیں رکھتا تھا کہ انہیں پتہ چل جائے کہ رحمت الٰہی ان کے اختیار میں نہیں ہے کہ جسے چاہے وہ دے سکیں اور جسے چاہے نہ دیں۔ یہ آیت، ہو سکتا ہے کہ، یہود و نصاریٰ کی بلند پروازیوں اور بے بنیاد دعووں کا بھی جواب ہو جو بہشت اور رحمت الٰہی کو اپنے لیے مخصوص سمجھتے تھے اور دوسروں کو اس سے محروم خیال کرتے تھے۔ (و قالوا لن یدخل الجنّة الّا من کان هودًا او نصارٰی تلك امانیهم قل هاتوا برهانکم ان کنتم صادقین) "انہوں نے کہا کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا مگر وہ جو یہودی یا نصرانی ہو۔ یہ ان کی آرزوئیں ہیں۔ کہہ دے اگر سچ کہتے ہو تو اپنی دلیل لاؤ۔" (بقرہ - ۱۱۱)

ایک نکتہ

تقویٰ اور نگاہ دُور رس کا رابطہ

قرآن مجید نے تقویٰ کے بہت سے آثار بیان کیے ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ انسان کی فکر اور اس کے دل سے پردے

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)
[۲] یہ روایات نورالثقلین جلد ۵ ص ۲۵۲ اور ۲۵۳ پر نقل ہوئی ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)
[۱] یہ کہ لا (لئلا یعلم اهل الکتاب) میں زائدہ ہے یا اصلی مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بہت سے لا کو زائدہ اور تاکید کے لیے سمجھتے ہیں (جیسا کہ ہم نے اُوپر کہا ہے) اور اگر لا کو اصلی سمجھا جائے تو پھر آیت کے معانی گوناں گوں بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک مراد یہ ہے کہ اہل کتاب جان لیں کہ اگر وہ بھی اسلام و ایمان کو قبول کر لیں تو اپنے لیے فضل خدا کو فراہم کر سکتے ہیں۔ (دوسرے لفظوں میں یہاں نفی در نفی اثبات کے معنوں میں ہے) یا یہ کہ ہم نے یہ سب مواہب مسلمانوں کو دیے ہیں تاکہ اہل کتاب یہ تصور نہ کریں کہ مسلمان فضل خدا میں سے کوئی حصہ نہیں رکھتے لیکن آیت کے ذیل کی طرف توجہ کرتے ہوئے: (ان الفضل بید الله) اور اس شان نزول کو دیکھتے ہوئے جسے ہم نے اُوپر نقل کیا ہے لا کا زائد ہونا زیادہ مناسب نظر آتا ہے بلکہ بعض کے نظریے کے مطابق قرآن تمام موارد میں جہاں جملہ منفی پر مشتمل ہو لا زائدہ ہوگا مثلاً: (ما منعك الا تسجد اذ امرتك) (اعراف - ۱۲) (وما یشعرکم انها اذا جاءت لا یؤمنون) (انعام - ۱۰۹) غور کیجئے)

ہٹ جائیں۔ ایمان اور تقویٰ کا نگاہ دُوررس سے جو رابطہ ہے۔ اس کے متعلق قرآن کی دوسری آیات میں اشارے ہیں۔ سورہ انفال کی آیت ۲۹ میں ہم پڑھتے ہیں: یا ایھا الذین اٰمنوا ان تتقوا اللّٰہ یجعل لکم فرقانًا ۔ اے ایمان لانے والو! اگر تقویٰ اختیار کرو اور گناہوں سے پرہیز کرو تو خدا تمہارے لیے حق و باطل میں امتیاز کا ذریعہ قرار دے گا" سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۲ میں آیا ہے:
واتقوا اللّٰہ ویعلمکم اللّٰہ "خدا کا خوف اختیار کروگے تو خدا تمہیں علم و دانش سے نوازے گا" اور زیر بحث آیات میں بھی یہ معنی صراحت کے ساتھ آئے ہیں کہ اگر ایمان لے آؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو خدا تمہارے لیے نور قرار دے گا جس کے سائے میں تم قدم بڑھا سکو گے۔ ان دونوں کا رابطہ، علاوہ معنوی پہلوؤں کے، جنہیں ہم نہیں سمجھ سکتے، تحلیل عقلی کے نتیجے میں سمجھ میں آسکتا ہے کیونکہ معرفت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اور سب سے بڑا پردہ جو انسان کے دل پر پڑا رہتا ہے اور اسے حقائق کو نہیں دیکھنے دیتا اس کی وہ سرکش خواہشات اور لاتعداد تمنائیں اور آرزوئیں ہیں اور دنیا کی چمک دمک میں اس کا اُلجھا ہوا ہونا ہے جو اسے صحیح فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اسے حقائق کا چہرہ نہیں دیکھنے دیتا۔ جس وقت ایمان اور تقویٰ کے زیر سایہ گرد و غبار بیٹھ جاتا ہے اور رُوح انسانی پر چھائے ہوئے تاریک بادل چھٹ جاتے ہیں تو پھر صفحۂ دل پر آفتاب حقیقت چمکتا ہے اور حقائق تک اس کی دسترس ہو جاتی ہے اور اس کو ادراک کی لذت نصیب ہو جاتی ہے۔ یہ وہ لذت ہے جو تعریف و توصیف سے ماوراء ہے۔ اس کے بعد انسان اپنی منزل مقصود کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ جی ہاں یہ تقویٰ ہی ہے جو انسان کو آگاہی بخشتا ہے اور جس طرح علم اور آگاہی اسے تقویٰ سے ہم کنار کرتے ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے متقابل تاثیر رکھتے ہیں۔ اسی لیے ہمیں مشہور حدیث میں ملتا ہے:

لولا ان الشیاطین یحوطون علی قلوب بنی اٰدم لنظروا الی ملکوت السماوات

اگر شیاطین انسانی دلوں پر مسلّط نہ ہو جاتے تو وہ ملکوت سموات کو دیکھ سکتے۔

اس بات کے بہتر ادراک کے لیے ہم حضرت علیؑ کے ارشادِ گرامی سے استفادہ کرتے ہیں:

لا دین مع ھوی۔ لا عقل مع ھوی من اتبع ھواہ اعماہ واصمہ واذلہ واضلہ۔

جہاں ہوائے نفس ہو وہاں دین نہیں ہوتا۔ اسی طرح عقل اور ہوائے نفس ایک جگہ جمع نہیں ہوتے۔

جب انسان ہوائے نفس کی پیروی کرتا ہے تو وہ اسے اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے اور وہ ذلیل و گمراہ ہو جاتا ہے۔

پروردگارا! ہمیں ہوائے نفس سے محفوظ رکھ اور ہمیں تقویٰ اور نگاہ دُوررس عطا فرما۔

خداوندا! تمام رحمتیں تیرے قبضۂ قدرت میں ہیں ہمیں ان سے محروم نہ کر۔

بارالٰہا! ہمیں حق اور عدل و انصاف قائم کرنے کی توفیق عطا فرما اور بیّنات سے استفادہ کے زیر سایہ مُنہ زور افراد کے مقابلہ میں کھڑے ہونے کا حوصلہ اور حریم کتاب و میزان کی پاسداری کی توفیق عطا فرما۔

سُورہ "حدید" کا اختتام
۲۰/ رجب/ ۱۴۰۶ھ

اختتام ترجمہ بتاریخ ۲۶ شوال ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۳ جون ۱۹۸۷ء بروز منگل بوقت سوا ایک بجے دوپہر بمکان حقیر رقم کردہ جمشیدی محل سلطان محمد شریف اعوان

قرآن مجید کے اٹھائیسویں پارہ کا آغاز

۵۔ سُورہ مُجادِلہ

- یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہُوا۔
- اِس میں ۲۲ آیتیں ہیں۔

تاریخ شروع ۲۰/رجب/۱۴۰۶ھ م
۱۱/۱/۱۳۶۵ھ ش

سورۂ "مجادلہ" کے مضامین

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا ہے اور مدنی سورتوں کی طبیعت و مزاج کے مطابق زیادہ تر فقہی احکام، اجتماعی نظام زندگی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی روابط کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ اس سورہ کے تمام مباحث کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ پہلا حصّہ "ظہار" کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ یہ زمانۂ جاہلیت میں ایک قسم کی طلاق اور دائمی جدائی شمار ہوتی تھی۔ اسلام نے اس میں اعتدال پیدا کیا اور اس کی صحیح راہ متعین کی۔

۲۔ دوسرے حصّہ میں آدابِ مجالست کے احکام کے بارے میں گفتگو ہے۔ سرگوشی سے منع کیا گیا ہے اور جو نئے لوگ مجلس میں داخل ہوں اُنہیں جگہ دینے کے بارے میں احکام ہیں۔

۳۔ تیسرے اور آخری حصّہ میں جو بحث ہے وہ گویا مُنہ سے بولتی ہوئی بھی ہے، تفصیلی بھی اور سرکوبی کرنے والی بھی۔ منافقین یعنی وہ لوگ جو بظاہر اسلام کا دم بھرتے ہیں لیکن دشمنانِ اسلام کے ساتھ پوشیدہ طور پر ربط و ضبط رکھتے ہیں، ان کے بارے میں گفتگو ہے۔ سچے مسلمانوں کو گروہ شیاطین و منافقین میں داخل ہونے سے ڈرایا گیا ہے اور انہیں "حُب فی اللہ" اور "بغض فی اللہ" کے پیشِ نظر حزب اللہ میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔

سورۂ "مجادلہ" کی تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں دو روایتیں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہیں۔ پہلی روایت میں ہے کہ:

من قرأ سورة المجادلة كتب من حزب الله يوم القيامة

جو شخص سورہ مجادلہ کی تلاوت کرے (اور اس میں غور و فکر کرے اور اس پر کاربند ہو) تو
بروز قیامت وہ حزبُ اللہ میں شمار ہوگا۔

دُوسری حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

من قرأ سورة الحديد والمجادلة فی صلوٰة فريضة وادمنهالم
يعذبه الله حتى يموت ابدًا ولا يرى في نفسه ولا فی اهله سوءًا ابدًا و
لاخصاصة فی بدنه

جو شخص سُورہ حدید و مجادلہ واجب نمازوں میں پڑھے اور اس کا وِرد رکھے تو خدا اس کی پُوری
زندگی میں اس پر کوئی عذاب نازل نہیں کرے گا اور وہ اپنی ذات میں اور اپنے اہلِ خانہ میں
کوئی بُرائی نہیں دیکھے گا، نیز فقر و بدحالی میں گرفتار نہیں ہوگا۔

ان کو سُورتوں کے مضامین کی جو مناسبت مذکورہ بالا اجر اور جزا کے ساتھ ہے وہ واضح ہے اور یہ چیز خُود بتاتی ہے کہ تلاوت کا
مقصد زندگی میں عملی شکل دینا ہے، ایسی تلاوت نہیں جو غور و خوض اور عمل سے خالی ہو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْٓ
اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ○
۲۔ اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ۭ
اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰۗـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا
مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ○
۳۔ وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا
قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَاۗسَّا ۭ ذٰلِكُمْ
تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○
۴۔ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ
اَنْ يَّتَمَاۗسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ۭ
ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ خدا نے اس عورت کا قول سُنا جس نے اپنے شوہر کے بارے میں تجھ سے رجوع کیا تھا اور خُدا کی بارگاہ میں شکایت کی تھی۔ خدا تمہاری آپس کی گفتگو (اس عورت کا اصرار اس کی مشکل کے حل کے سلسلہ میں) سُن رہا تھا اور خُدا سُننے اور دیکھنے والا ہے۔

۲۔ تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں کے بارے میں ظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں (انت علیّ کظھر امّی) (تو میرے لیے میری ماں کی پُشت کی مانند ہے) تو وہ ہرگز ان کی مائیں نہیں ہیں۔ ان کی مائیں تو صرف وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے۔ وہ بڑی قبیح اور باطل بات کرتے ہیں اور خدا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

۳۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں پھر اپنی ہی کہی ہوئی بات سے پلٹ جاتے ہیں تو اُن کو اُن کے ساتھ صُحبت کرنے سے پہلے ایک غلام آزاد کرنا چاہیئے۔ یہ وہ حکم ہے جس کی انہیں نصیحت کی جاتی ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے باخبر ہے۔

۴۔ اور جو شخص غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تو وہ صحبت کرنے سے پہلے دو ماہ پے در پے روزے رکھے اور جو اس کی بھی طاقت نہیں رکھتا وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ تم خدا اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ۔ یہ خُدا کی حدود ہیں جو ان کی مخالفت کریں گے ان پر دردناک عذاب ہوگا۔

شانِ نزول

اکثر مفسرین نے اس سورہ کی پہلی آیات کے لیے کئی شانِ نزول نقل کی ہیں جن میں سے ہر ایک کا نفسِ مضمون اجمالی طور پر ایک ہی ہے اگرچہ جزئیات میں ایک دوسرے سے اختلاف ہے لیکن یہ اختلاف اس چیز پر جس کے ہم تفسیری بحث میں ضرورت مند ہیں اثرانداز نہیں ہوگا۔

واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ گروہ انصار کی ایک عورت جس کا نام "خولہ" تھا۔ (دوسری روایات میں اس عورت کے اور بھی نام بیان ہوئے ہیں) وہ قبیلہ "خزرج" سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے شوہر کا نام "اوس بن صامت" تھا۔ کسی بات پر خولہ کا شوہر اس سے ناراض ہوگیا۔ وہ ایک تندخو اور شدید الحس آدمی تھا۔ اُس نے اپنی عورت سے علیٰحدگی کا مصمم ارادہ کر لیا اور کہا "انت علیّ کظھر امی" (تو میرے لیے میری ماں کی پُشت کی طرح ہے)۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ طلاق کی ایک قسم تھی۔ لیکن یہ طلاق اس طرح کی تھی کہ نہ تو اس میں رجوع ممکن تھا نہ عورت مرد سے آزاد ہوتی تھی کہ اپنے لیے کوئی دوسرا شوہر منتخب کرے۔ یہ بدترین حالت تھی جس سے کوئی شوہردار عورت دوچار ہوتی تھی۔ وہ شخص جلد ہی پشیمان ہوگیا اور چونکہ زمانۂ جاہلیت میں "ظہار" (مذکورہ بالا جملہ کہنا) ایک ایسی طلاق شمار ہوتا تھا جس میں طرفین ایک دوسرے سے قطعاً رجوع نہیں کر سکتے تھے، وہ اپنی بیوی سے کہنے لگا کہ میرا خیال ہے تو مجھ پر ہمیشہ کے لیے حرام ہوگئی۔ عورت نے کہا ایسا نہ کہہ تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جا اور اس مشکل کا حل دریافت کر۔ مرد نے کہا مجھے شرم آتی ہے۔ عورت نے کہا میں جاتی ہوں۔ اس نے کہا: کوئی حرج نہیں تُو چلی جا۔ وہ عورت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا اے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرے شوہر "اوس بن صامت" نے مجھ سے شادی کی تھی۔ اُس وقت میں صاحبِ دولت و ثروت تھی اور خوبصورت تھی۔ میرا خاندان بھی اچھا تھا۔ وہ میرا مال اپنے مصرف میں لے آیا۔ اب جب کہ میں جوان نہیں رہی میرا خاندان بھی پراگندہ ہوگیا ہے تو اب اُس نے "ظہار" کیا ہے۔ لیکن وہ اپنے اس اقدام پر پشیمان ہے۔ تو کیا ایسی صورت ہے کہ ہم ایک دوسرے سے رجوع کر لیں۔

پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"تو اس پر حرام ہوگئی ہے"۔

عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس نے صیغۂ طلاق جاری نہیں کیا۔ پھر وہ میری اولاد کا باپ بھی ہے۔ اور ان سب چیزوں کے علاوہ مجھے اس سے بہت زیادہ محبت ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"تو اُس پر حرام ہو چکی ہے اور اس سلسلہ میں میرے پاس سرِدست کوئی دوسرا حکم نہیں ہے"۔

وہ عورت مسلسل اصرار کرتی تھی اور گڑگڑا کر عرضِ حال کرتی تھی۔ آخر کار اس عورت نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: (اشکوا الی اللہ فاقتی وحاجتی وشدۃ حالی اللّٰھم فانزل علی لسان نبیّک) پروردگار! میں اپنی بے چارگی اور احتیاج کی شدت تجھ سے عرض کرتی ہوں۔ خداوندا کوئی فرمان اپنے پیغمبرؐ پر نازل فرما اور اس مشکل کو حل کر دے۔ ایک روایت میں ہے کہ اس عورت نے عرض کیا:

اللھم انک تعلم حالی فارحمنی فان لی صبیۃ صغار ان ضممتھم الیہ ضاعوا و ان ضممتھم الی جاعوا

خداوندا! تُو میری حالت کو جانتا ہے مجھ پر رحم کر میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جنہیں میں اگر اپنے شوہر کے حوالے کر دوں تو وہ ضائع ہو جائیں گے اور اگر اپنے پاس رکھوں تو بھوکے مر جائیں گے۔

اس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کی حالت طاری ہوئی اور اس سُورہ کی ابتدائی آیات آپؐ پر نازل ہوئیں جو ظہار کی مشکل کو حل کرنے کا راستہ بتاتی ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اپنے شوہر کو بُلا کر لا۔

جب وہ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذکورہ آیات کی اس کے سامنے تلاوت کی اور فرمایا:

"کیا تُو ایک غلام ظہار کے کفارے کے طور پر آزاد کر سکتا ہے"۔

اُس نے کہا: "اگر ایسا کروں گا تو میرے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہے گا"۔

فرمایا: "دو مہینے تک مسلسل روزے رکھ سکتا ہے؟"

اُس نے کہا: "میرے کھانے میں تین مرتبہ تاخیر ہو جائے تو میری آنکھ بیکار ہو جائے اور مجھے خوف ہے کہ میں نابینا ہو جاؤں"۔

فرمایا: "تو کیا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتا ہے"۔

عرض کیا: نہیں، مگر اس طرح کہ آپ میری مدد کریں"۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَیں تیری مدد کروں گا اور پندرہ صاع (پندرہ من ایرانی جو ساٹھ مسکینوں کی خوراک میں ہر شخص کے لیے ایک مُد یعنی ½ من تقریباً چودہ چھٹانک) غذا اس کو دی۔ اس نے کفارہ ادا کیا۔ اس طرح وہ میاں بیوی اپنی سابقہ ازدواجی زندگی کی طرف پلٹ آئے[1]۔

جیسا کہ ہم نے کہا ہے اس شانِ نزول کو بہت سے لوگوں نے تفسیر و تاریخ و حدیث کی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرطبی، ابوالفتوح رازی اور کنز العرفان کے نام نمایاں ہیں۔

تفسیر

ظہار زمانۂ جاہلیّت کا ایک قبیح عمل

جو کچھ شانِ نزول کے سلسلہ میں عرض کیا گیا اسے اور آیات زیرِ بحث کے نفسِ مضمون کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس سورہ کی ابتدائی آیات کی تفسیر واضح ہو گئی ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

"خُدا نے اس عورت کا قول سُنا جس نے اپنے شوہر کے بارے میں تجھ سے رجوع کیا تھا اور بحث و تکرار کرتی تھی، اس کی التجا کو قبول کیا"۔ (قد سمع اللہ قول التی تجادلک فی زوجھا)۔ "تجادل" "جدل" کے مادّہ سے ہے جس کے اصلی معنی رسی بٹنے

[1] "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۲۶۴ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)۔

کے ہیں۔ چونکہ طرفین اصرار آمیز گفتگو کے موقع پر یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے کو خاموش کر دیں لہٰذا اس پر مجادلہ کا اطلاق ہوا ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "وہ عورت، اس کے علاوہ کہ تجھ سے مجادلہ کرتی تھی اس نے خدا کی بارگاہ میں شکایت بھی کی اور حلِ مشکل کی استدعا بھی کی۔ (و تشتکی الی اللّٰہ)۔ یہ اس حالت میں تھا کہ جب خدا تمہاری گفتگو اور اس عورت کے اصرار کو سُن رہا تھا۔ (واللّٰہ یسمع تحاورکما)۔ "تحاور" "حور" (بروزن غور) کے مادہ سے گفتگو یا غور و خوض میں رجوع کرنے کے معنوں میں ہے اور محاورہ کا طرفین کی گفتگو پر اطلاق ہوتا ہے "اور خدا سُننے اور دیکھنے والا ہے۔" (ان اللّٰہ سمیع بصیر)۔ جی ہاں! خدا تمام مسموعات و مبصرات سے، بغیر اس کے کہ بینائی و سماعت کے اعضاء کا محتاج ہو، آگاہ ہے۔ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور ہر چیز کو دیکھتا اور ہر بات کو سُنتا ہے۔ اس کے بعد ظہار کے حکم کی طرف رجوع ہے اور تمہید کلام کے طور پر اس بے ہودہ نظریہ کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینکنے کے لیے مختصر مگر قاطع جُملے ارشاد فرماتا ہے: "تم میں سے وہ لوگ جو اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں: (انت علیّ کظھر امی) "تو میرے لیے میری ماں کی پشت کی طرح ہے" وہ ہرگز ان کی مائیں نہیں ہیں۔ ان کی مائیں تو صرف وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنا ہے (الّذین یظاھرون منکم من نسائھم ما ھن امھاتھم ان امھاتھم الا اللائی ولدنھم)۔ ماں اور بیٹا ہونا ایسا نہیں ہے جو صرف الفاظ سے درست ہو جائے وہ تو ایک ظاہر ہونے والی حقیقتِ واقعی ہے جو کسی صُورت میں بھی الفاظ کے ساتھ کھیلنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس بناء پر اگر کوئی انسان سو مرتبہ بھی اپنی بیوی سے کہے کہ تُو میری ماں کی طرح ہے تو وہ ماں کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتی۔ یہ محض ایک فضول بات ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "وہ ایک بُری اور قبیح بات کہتے ہیں۔ اور ان کا قول باطل و بے بُنیاد ہے" (وانھم لیقولون منکرًا من القول و زورًا)[1]۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس بات کا کہنے والا قصدِ "اخبار" نہیں رکھتا بلکہ اس کا مقصود "انشاء" ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس جملے کو صیغۂ طلاق کا درجہ دے لیکن اس جملہ کا نفسِ مضمون ٹھیک "منہ بولے بیٹے" جیسی خرافات کی طرح بے بنیاد ہے جو زمانۂ جاہلیت کی ایک رسم تھی کہ کسی بچے کو اپنا بیٹا کہہ دیتے تھے اور پھر اس پر احکام پسر جاری کرتے تھے، جس کی قرآن نے مذمت کی ہے اور اسے باطل و بے بنیاد بات قرار دیا ہے۔ ذالکم قولکم بافواھکم۔ یہ ایسی بات ہے جسے تم صرف اپنے منہ سے کہتے ہو اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے (احزاب-۴)۔ اس آیت کے مطابق ظہار ایک منکر اور حرام عمل ہے لیکن چونکہ تکلیفِ شرعی گزشتہ اعمال سے تعلق نہیں رکھتی اور اس کا اطلاق نزول کے وقت سے ہوتا ہے لہٰذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "خدا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔" (وان اللّٰہ لعفو غفور) اس بناء پر اگر کوئی مسلمان ان آیات کے نزول سے پہلے اس عمل کا مرتکب ہوا ہے تو اسے پریشان نہیں ہونا چاہیئے خدا اسے بخش دے گا۔ بعض فقہا اور مفسّرین کا نظریہ یہ ہے کہ اب بھی ظہار ایک گناہ ہے، گناہانِ صغیرہ کے مانند بخشا ہوا خُدا نے جس کے بارے میں گناہانِ کبیرہ کے ترک کی صُورت میں عفو کا وعدہ کیا لیکن اس مفہوم پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور اُوپر والا جُملہ اس امر پر گواہ نہیں بن سکتا۔ بہر حال کفارے کا مسئلہ اپنی پُوری قوت کے ساتھ باقی ہے۔ حقیقت میں یہ تعبیر اس کے مشابہ ہے جو سُورہ احزاب کی آیت ۵ میں آیا ہے جہاں "منہ بولے بیٹے" کے مسئلہ کی نفی کرنے کے بعد مزید فرماتا ہے: (ولیس علیکم جناح فیما اخطأتم بہ ولٰکن ما تعمدت قلوبکم وکان اللّٰہ غفورًا رحیمًا)

---

[1] "زور" اصل میں سینے کے اُوپر والے حصہ کا ٹیڑھا اور جُھکا ہوا ہونا ہے۔ یہ منحرف ہونے کے معنی میں بھی آیا ہے اور چونکہ جھوٹی بات اور باطل گفتگو حق سے انحراف رکھتی ہے لہٰذا اسے زور کہتے ہیں۔ اسی بنا پر یہ لفظ بت کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔

[2] "کنز العرفان" جلد ۲ ص ۲۹۰۔ المیزان میں بھی انھی معانی کی طرف اشارہ ہے۔

اس غلطی کا تم پر کوئی گناہ نہیں ہے جو اس موضوع پر تم سے سرزد ہوئی ہے لیکن جو کچھ تم عمداً کہو تو خدا اس پر مواخذہ کرتا ہے اور خدا غفور و رحیم ہے۔ (گزشتہ بے راہ روی کے بارے میں)۔ "عفو" اور "غفور" کے درمیان کیا فرق ہے؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "عفو" بخششِ خدا کی طرف اشارہ ہے اور "غفور" گناہ کی پردہ پوشی کی طرف۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی کسی کے گناہ کو تو بخش دے لیکن اس کو چھپائے ہرگز نہیں۔ لیکن خدا بخشتا بھی ہے اور چھپاتا بھی ہے۔ بعض مفسرین نے غفران کے معنی یہ لیے ہیں کہ کسی شخص کو عذاب سے چھپا لیا جائے جس کا مفہوم عفو سے مختلف ہے اگرچہ نتیجہ ایک ہی ہے۔ چونکہ یہ قبیح اور تکلیف دہ گفتگو کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی کوئی پرواہ نہ کی جائے لہٰذا اس کا کفارہ نسبتاً سنگین قرار دیا گیا ہے تاکہ اس کی تکرار کا سدِباب کیا جائے۔ فرماتا ہے: "وہ لوگ جو اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں اور پھر وہ اپنی کہی ہوئی بات سے پلٹتے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ مباشرت سے پہلے ایک غلام آزاد کریں۔ (والذین یظاھرون من نسائھم ثم یعودون لما قالوا فتحریر رقبة من قبل ان یتماسا)۔ "پھر اپنے کہے سے (ثم یعودون لما قالوا) پلٹتے ہیں کے جملے کے بارے میں کئی احتمال پیش کیے گئے ہیں۔ فاضل مقداد نے کنز العرفان میں اس کی چھ تفسیریں نقل کی ہیں۔ لیکن اس کا ظاہر (خصوصاً "من قبل ان یتماسا" پر توجہ کرتے ہوئے) یہ ہے کہ وہ اپنے کلام پر نادم ہوتے ہیں اور گھریلو زندگی اور جنسی آمیزش کی طرف پلٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ روایاتِ آئمہ اہل بیتؑ میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ ہے[1]

اس جملے کی اور تفسیریں بھی کی گئی ہیں لیکن وہ آیت کے معانی کے ساتھ چنداں مناسبت نہیں رکھتیں۔ مثلاً یہ کہ "عود" سے مراد "ظہار" کی تکرار ہے۔ یا یہ کہ "عود" سے مراد ایسے مواقع پر زمانۂ جاہلیت کے طریقوں پر عمل کرنا ہے، یا یہ کہ "عود" اس عمل کے تدارک اور تلافی کے معنوں میں ہے اور اسی قسم کے دیگر احتمالات[2]۔ "رقبة" اصل میں گردن کے معنوں میں ہے لیکن یہاں انسان کا کنایہ اس بنا پر ہے کہ گردن دیگر اعضائے بدن کے مقابلہ میں زیادہ حساس سمجھی جاتی ہے۔ کبھی لفظ راس بھی کہا جاتا ہے اور اس سے مُراد انسان ہوتا ہے مثلاً پانچ افراد کی جگہ پانچ راس کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "یہ ایک دستور ہے جس کا تمہیں وعظ کیا گیا ہے" (ذالکم توعظون بہ)۔ یہ گمان نہ کرنا کہ ظہار کے سلسلہ میں اس قسم کا کفارہ غیر معتدل ہے۔ کیونکہ یہ پند و نصیحت، بیداری اور تمہارے نفوس کی تربیت کا سبب ہے تاکہ اس قسم کے حرام کاموں کے سلسلہ میں تم اپنے نفوس کو قابو میں رکھ سکو۔ اصولی طور پر تمام کفارے تربیتی پہلو رکھتے ہیں۔ اکثر اوقات وہ کفارے جو مالی حیثیت رکھتے ہیں ان کی تاثیر تعزیرات کے مقابلہ میں، جو بدنی حیثیت رکھتی ہیں، کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اور چونکہ اس بات کا امکان تھا کہ بعض افراد مختلف بہانوں سے کفارے سے جان چھڑائیں گے اور ظہار کے بعد بغیر کفارہ ادا کیے اپنی بیوی سے جنسی آمیزش رکھیں گے آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "خدا اس سے جو تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے"۔ (واللّٰہ بما تعملون خبیر)۔ ظہار سے بھی آگاہ ہے اور کفارہ نہ دینے سے بھی اور تمہاری نیتوں سے بھی۔ اور چونکہ ایک غلام کا آزاد کرنا تمام افراد کے لیے ممکن نہیں جیسا کہ ہم نے آیت کی شانِ نزول میں دیکھا ہے۔ "اوس بن صامت" جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہیں اس نے پیغمبرؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں یہ کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہوں اور اگر ایسا کروں تو تمام پونجی کو گنوا دوں گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انسان مالی اعتبار سے تو غلام

---

[1] مجمع البیان در ذیل آیات محلِ بحث۔

[2] کنز العرفان جلد ۲ ص ۲۹۰ و مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۴۷ کی طرف رجوع کیا جائے۔

کے آزاد کرنے کی قدرت رکھتا ہو لیکن اسے کوئی غلام دستیاب نہ ہو جیسا کہ ہمارے زمانے میں ہے۔ اس لیے اسلام کے دین جاودانی ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ بعد کے مرحلہ میں غلاموں کے آزاد کرنے کا کوئی نعم البدل مذکور ہو اس لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: " جو شخص غلام آزاد کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو جنسی آمیزش سے پہلے دو ماہ مسلسل روزے رکھے۔ (فمن لم یجد فصیام شھرین متتابعین من قبل ان یتماسا)۔ اس قبیح عمل کو روکنے کے لیے یہ کفارہ بھی ایک گہرا اثر رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ روزہ رُوح کی صفائی اور تہذیب نفس کا باعث ہے لہٰذا اس قسم کے اعمال کے اعادہ کا سدِباب کر سکتا ہے۔ البتہ ظاہر آیت تو یہ ہے کہ روزے ساٹھ دن تک مسلسل رکھے جائیں۔ بہت سے فقہائے اہلِ سُنّت نے بھی اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے لیکن آئمہ اہل بیتؑ کی روایتوں میں آیا ہے کہ اگر دوسرے مہینے میں سے کچھ دن حتیٰ کہ ایک دن بھی پہلے مہینے کے تسلسل کے ساتھ روزہ رکھ لے تو شھرین متتابعین یعنی مسلسل دو ماہ کا تقاضا پورا ہو جائے گا اور یہ تصریح ظہور آیت پر حاکم ہے[1]۔

یہ چیز بتاتی ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں اور سُورۂ نسا کی آیت ۹۲ میں (کفارہ قتل خطا) تتابع سے مُراد فی الجملہ پے دَر پے ہونا ہے۔ البتہ اس قسم کی تفسیر صرف امام معصوم سے سننے میں آئی ہے جو علوم پیغمبرؐ کا وارث ہے اور اس قسم کے روزے رکھنا مکلفین کے لیے آسانی کا باعث ہیں (اس موضوع کے بارے میں مزید تفصیل کتاب الصوم اور ابواب ظہار و کفارہ قتل خطا میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے) (فمن لم یجد) کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ وہ ضروریاتِ زندگی سے زائد کوئی چیز نہ رکھتا ہو جس سے غلام خرید کر آزاد کر سکے۔ اور چونکہ بعض لوگ دوسرے کفارے یعنی مسلسل دو ماہ روزے رکھنے پر بھی قادر نہیں ہیں۔ لہٰذا ایک اور متبادل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: " جب کوئی دو ماہ تک مسلسل روزے نہ رکھ سکتا ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ (فمن لم یستطع فاطعام ستین مسکینًا)۔ اطعام کے معنی یہ ہیں کہ ایک مرتبہ اتنی غذا دے کہ کھانے والا سیر ہو جائے لیکن اسلامی روایات میں ایک مد طعام (ایرانی من کا چوتھا حصہ یا تقریباً ۷۵۰ گرام معین ہوا ہے) جب کہ بعض فقہا نے اسے دو مد (ڈیڑھ کلو) قرار دیا ہے[2]۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں ایک مرتبہ پھر اس قسم کے کفاروں کے اصل مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

" یہ اس لیے ہے کہ تم خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لے آؤ " (ذالک لتؤمنوا باللہ و رسولہ)۔ جی ہاں! کفاروں کے ذریعہ گناہوں کی تلافی ایمان کے ستونوں اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کرتی ہے اور انسان کو مقرراتِ الٰہی کا علماً و عملاً پابند کرتی ہے آیت کے آخر میں اس کے پیشِ نظر کہ تمام مسلمان اس مسئلہ کو ایک پختہ امر کے طور پر قبول کریں، فرماتا ہے: " یہ احکام خدا کی حدود ہیں

---

[1] " وسائل الشیعہ " جلد ۷، ص ۲۷۱ سے رجوع فرمائیں (باب ۳ از ابواب بقیۃ الصوم الواجب)

[2] ہمارے فقہا کے درمیان، جیسا کہ ہم نے کہا ہے، مشہور وہی ایک مد ہے اور اس کی دلیل بہت سی روایات ہیں جو شاید حدِ تواتر میں ہوں جن میں سے بعض قتل خطا کے کفارے کے بارے میں اور بعض قسم کے کفارے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور بعض ماہِ مبارک رمضان کے کفارے کے بارے میں اس ضمیمہ کے ساتھ کہ فقہا میں سے کسی نے کفاروں کی اقسام میں فرق نہیں رکھا لیکن مرحوم " شیخ طوسی " سے " خلاف "، " مبسوط "، " نہایۃ " اور " تبیان " میں منقول ہے کہ اس کی مقدار دو مد ہے اور اس سلسلہ میں ابوبصیر کی روایت سے استدلال کیا ہے جو کفارۂ ظہار کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے اور اس کی مقدار دو مد معین کرتی ہے لیکن یہ روایت یا تو کفارۂ ظہار سے مخصوص ہونی چاہیئے یا اگر ہم قبول کر لیں کہ فقہا کفاروں کے درمیان فرق کے قائل نہیں ہوئے جیسا کہ واقعی ایسا ہے تو پھر اسے استحباب پر محمول کرنا چاہیئے۔

جو خدا کی مخالفت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور کافر ہو جائیں۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔" (وتلك حدود الله وللكافرين عذاب الیم)۔ یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ لفظ کفر کے مختلف معانی ہیں جن میں سے ایک کفر عملی ہے یعنی معصیت و گناہ ہے اور زیر بحث آیت میں یہی معنی مُراد ہیں جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت ۹۷ میں ان لوگوں کے بارے میں جو فریضۂ حج بجا لاتے ہیں فرماتا ہے: ولله على الناس حج البيت من استطاع اليه سبيلاً و من كفر فان الله غنيّ عن العالمين "لوگوں پر لازم ہے کہ جو استطاعت رکھتے ہیں وہ خدا کے لیے اس کے گھر کا ارادہ کریں اور جو شخص کفر کرے (اور حج کو چھوڑ دے) اس نے اپنے اُوپر ظلم کیا ہے اور اللہ عالمین سے بے نیاز ہے۔" "حد" اس چیز کے معنوں میں ہے جو دو چیزوں کے درمیان مانع ہے۔ اسی لیے مختلف ملکوں کی سرحدوں کو حدُود کہا جاتا ہے۔ احکام الٰہی کو اس لیے حدود کہتے ہیں کہ ان کو عبور کرنا جائز نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں مزید تشریح پہلی جلد سُورہ بقرہ آیت ۱۸۷ کے ذیل میں ہم پیش کر چکے ہیں۔

بعض احکام ظہار

۱۔ ظہار کی رسم جس طرف قرآن مجید کی دو آیتوں میں (زیر بحث آیت اور سورۂ احزاب آیت ۴) اشارہ ہوا ہے، زمانۂ جاہلیت کے قبیح کاموں میں سے تھی۔ جب کوئی مرد اپنی بیوی سے اُکتا جاتا تو اس غرض سے کہ عورت کو تنگ کرے یہ کہہ دیتا کہ (انت علیّ کظھر امّی) "تُو میرے لیے میری ماں کی طرح ہے۔"[۱]

اس کے بعد وہ یہ سمجھتا تھا کہ عورت اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو گئی یہاں تک کہ وہ دوسرا شوہر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس طرح وہ عضو معطل ہو کر رہ جاتی۔ اسلام نے اس اقدام کو، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، غلط قرار دیا اور اس کے بارے میں کفارہ کا حکم صادر کیا۔ لہٰذا اگر کوئی مرد اپنی بیوی سے ظہار کرے تو اس کی بیوی حاکم شرع سے رجوع کر کے اس مرد سے یا تو طلاق حاصل کر سکتی ہے یا اسے ازدواجی زندگی کی طرف پلٹ جانے کا پابند بنا سکتی ہے۔ لیکن ازدواجی زندگی کو بحال کرنے سے پہلے وہ کفارہ جو مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے اس مرد کو ادا کرنا ہو گا یعنی استطاعت کی صُورت میں غلام آزاد کرے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو مسلسل دو مہینے تک روزے رکھے اور اگر اس کی بھی مقدرت نہ ہو تو پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ اس طرح یہ کفارہ اصلاح و تربیت کا کام کرتا ہے۔

۲۔ ظہار گناہانِ کبیرہ میں سے ہے اور مندرجہ بالا آیات کا لب و لہجہ اس پر گواہ ہے۔ یہ جو بعض فقہاٗ نے اسے صغائر میں شمار کیا ہے اور وہ اسے قابل معافی سمجھتے ہیں یہ درست نہیں ہے۔

۳۔ اگر کوئی شخص کسی قسم کا بھی کفارہ ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تو کیا صرف توبہ و استغفار پر اکتفا کر سکتا ہے اور ازدواجی زندگی کی طرف پلٹ سکتا ہے؟ فقہاٗ کے درمیان اس میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت اس حدیث پر انحصار کرتے ہوئے جو امام جعفر

---

[۱] "ظھر" مندرجہ بالا عبارت میں جیسا کہ بعض مفسرین نے لکھا ہے پُشت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ کنایہ ہے اس رابطہ کا جو زوجیت کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس جملہ کے معنی یہ ہوں گے۔ (تجھ سے زوجیت والا رابطہ اپنی ماں سے رابطے کی طرح ہے)۔ "لسان العرب" مادہ ظہر اور تفسیر خوارزمی کی طرف رجوع فرمائیں۔

صادقؑ سے منقول ہے[1]

اس نظریہ کی حامل ہے کہ دُوسرے کفاروں کے سلسلہ میں تو عدم استطاعت کی صُورت میں توبہ کفایت کر سکتی ہے لیکن کفارۂ ظہار میں کفایت نہیں کرتی لہٰذا طلاق کے ذریعہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کیا جائے۔ ایک دوسری جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں توبہ و استغفار کفارہ کا بدل ثابت ہوں گے اور وہ اس کی دلیل ایک اور روایت سے پیش کرتے ہیں جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے[2]

بعض کا یہ بھی نظریہ ہے کہ بصُورتِ استطاعت اٹھارہ دن کے روزے کافی ہیں[3]

مذکورہ روایتوں کو ایک جگہ جمع کرنا بھی ممکن ہے، اس طرح سے کہ ہر طرح کے عدم استطاعت کی صورت میں ازدواجی زندگی کی طرف پلٹا جا سکتا ہے۔ اگرچہ مستحب ہے کہ ایسی صورت میں طلاق دے کر بیوی سے الگ ہو جائے (کیونکہ اس قسم کی جمع دونوں احادیث کے معتبر ہونے کی صُورت میں ایک واضح جمع ہے اور فقہ میں اس کی بہت سی نظائر ہیں)۔

۴۔ بہت سے فقہأ کا نظریہ ہے کہ اگر کئی مرتبہ ظہار کرے (یعنی مذکورہ جملے کی شدتِ قصد کے ساتھ تکرار کرے) تو پھر اسے اتنے ہی کفّارے دینے ہوں گے، خواہ ایک ہی دفعہ تکرار صُورت پذیر ہو مگر یہ کہ تکرار سے اس کا مقصد صرف تاکید ہو نہ کہ نیا ظہار۔

۵۔ جب کفّارہ ادا کرنے سے پہلے اپنی بیوی سے جنسی اختلاط کرے تو دو کفّارے دینے ہوں گے۔ ایک کفّارہ ظہار کا اور دوسرا کفّارہ ظہار کا کفارہ ادا کرنے سے پہلے جنسی اختلاط کا۔ اس حکم پر فقہا کے درمیان اتفاق رائے ہے۔ البتہ مذکورہ آیات اس کے بارے میں خاموش ہیں لیکن رِوایاتِ اہلبیت میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔[4]

۶۔ ظہار کے بارے میں اِسلام کا واضح اور قطعی طرزِ عمل اس حقیقت کو پیش کرتا ہے کہ اسلام اس امر کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ خود غرض مرد ظالمانہ رسم و رواج سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے عورت کے حقوق کو پامال کریں، بلکہ وہ ہر اس غلط اور بے ہودہ رسم و رواج کو جو لوگوں میں رائج ہو، خواہ وہ کتنا ہی مضبُوط و مستحکم کیوں نہ ہو، ختم کرتا ہے۔

۷۔ ایک غلام کو آزاد کرنا جو ظہار کا پہلا کفّارہ ہے علاوہ اس کے کہ وہ خُود غرض مردوں کے جنگل میں پھنسی ہوئی عورت کی غلامی اور کنیزی کے ساتھ ایک پُرکشش مناسبت رکھتا ہے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اسلام چاہتا ہے کہ تمام ممکنہ طریقوں سے غلامی کی رسم کو ختم کرے لہٰذا نہ صرف کفّارۂ ظہار میں بلکہ قتل خطا کے کفّارے میں، اسی طرح ماہِ رمضان کے روزے کے کفّارے میں، (جس نے عمداً روزہ نہ رکھا ہو)، اسی طرح قسم کی مخالفت کے کفّارے میں یا نذر توڑنے کے بارے میں یہی اُمر وارد ہوا ہے جو غلاموں کی اصلی آزادی کو عملی حیثیت سے حقیقی بنانے کا خود ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

۱۔ "وسائل الشیعہ" جلد ۱۵ ص ۵۵۴ (حدیث ا باب ۶)

۲۔ "وسائل الشیعہ" ص ۵۵۵ (حدیث ۴)

۳۔ "کنز العرفان" جلد ۲، ص ۲۹۲

۴۔ "وسائل الشیعہ" جلد ۱۵، ص ۵۲۶ (حدیث ۱، ۳، ۴، ۵، ۶)

۵۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحَآدُّوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ کُبِتُوۡا کَمَا کُبِتَ
الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ وَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ؕ وَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ
عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ ۚ﴿۵﴾

۶۔ یَوۡمَ یَبۡعَثُہُمُ اللّٰہُ جَمِیۡعًا فَیُنَبِّئُہُمۡ بِمَا عَمِلُوۡا ؕ اَحۡصٰىہُ
اللّٰہُ وَ نَسُوۡہُ ؕ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ ٪﴿۶﴾

۷۔ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ مَا
یَکُوۡنُ مِنۡ نَّجۡوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا ہُوَ رَابِعُہُمۡ وَ لَا خَمۡسَۃٍ اِلَّا
ہُوَ سَادِسُہُمۡ وَ لَاۤ اَدۡنٰی مِنۡ ذٰلِکَ وَ لَاۤ اَکۡثَرَ اِلَّا ہُوَ مَعَہُمۡ
اَیۡنَ مَا کَانُوۡا ۚ ثُمَّ یُنَبِّئُہُمۡ بِمَا عَمِلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ
اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۷﴾

ترجمہ

۵۔ وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں وہ ذلیل و خوار ہوں گے جس طرح ان سے پہلے کے لوگ ذلیل و خوار ہوئے۔ ہم نے واضح آیات نازل کی ہیں اور کافروں کے لیے خوار کرنے والا عذاب ہے۔

۶۔ جس دن خدا ان سب کو اُٹھائے گا اور ان اعمال سے جو انہوں نے انجام دیے ہیں انہیں باخبر کرے گا، وہ اعمال جن کا خدا نے احصا کیا ہے اور وہ انہیں بھول گئے ہیں اور خدا ہر چیز کا شاہد و ناظر ہے۔

۷۔ کیا تُو نہیں جانتا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے خدا اسے جانتا ہے۔ کسی جگہ تین اشخاص آپس میں سرگوشی نہیں کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چوتھا ہوتا ہے اور کہیں پانچ افراد سرگوشی نہیں کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چھٹا ہوتا ہے۔ اور اس سے کم تعداد میں اور نہ اس سے زیادہ تعداد میں مگر یہ کہ وہ ان کے ہمراہ ہے، وہ جہاں کہیں بھی ہوں۔ پھر قیامت کے دن انہیں ان کے اعمال سے آگاہ کرے گا کیونکہ خدا ہر چیز کو جانتا ہے۔

تفسیر

وُہ جو خُدا سے دُشمنی کرتے ہیں

کیونکہ گزشتہ آیات کا آخری جملہ سب کے لیے خطرہ کا اشارہ ہے کہ حدودِ الٰہی کی رعایت کی جائے اور ان سے تجاوز نہ کیا جائے۔ زیرِ بحث آیت میں ان لوگوں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جو نہ صرف یہ کہ ان حدود سے تجاوز کرتے ہیں بلکہ خدا اور اس کے رسولؐ سے لڑنے کے لیے آمادہ ہیں۔ اس طرح خدا، اس دنیا میں اور دوسرے جہان میں، ان لوگوں کے انجام کو ظاہر کرتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

"جو لوگ خدا اور اس کے رسولؐ سے دُشمنی کرتے ہیں وہ ذلیل و خوار ہوں گے جیسا کہ ان سے پہلے کے لوگ ذلیل و خوار ہوئے"

(انّ الّذین یحا دون اللہ ورسولہ کبتوا کما کبت الذین من قبلھم)۔ "یحادون" "محادہ" کے مادہ سے ہے اور مسلح ہو کر لڑنے کے معنی میں ہے اور حدید یعنی لوہے سے مستفاد ہے اور غیر مسلح ہو کر لڑنے کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ بعض مفسّرین نے کہا ہے کہ محادّہ کے معنی اصل میں ممانعت کے ہیں۔ اس کا مادّہ حد ہے جو دو چیزوں کے درمیان مانع کی حیثیت رکھتی ہے اسی لیے دربان کو حدّاد کہتے ہیں۔ دونوں معنی نتیجے کے لحاظ سے ایک ہی ہیں اگرچہ دونوں دو مختلف اصل سے لیے گئے ہیں۔ "کبتوا" کا مادّہ "کبت" (بروزن "ثبت") ہے۔ اس کے معنی مانع کے ہیں۔ ایسا مانع جو ذلیل بھی کرتا ہو۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا ان لوگوں کی سزا ذلّت و خواری قرار دیتا ہے جو اس سے اور اس کے پیغمبر سے لڑنے کے لیے آمادہ ہیں۔ وہ ان کو اپنے لطف

بے پایاں سے محروم کر دیتا ہے[1]

یہ تعبیر اس تعبیر کی نظیر ہے جو سُورہ بقرہ کی آیت ۱۱۴ میں آئی ہے۔ جس میں ان افراد کے بارے میں، جو لوگوں کو مساجد میں نہیں جانے دیتے، عبادت سے روکتے ہیں اور دینِ حق سے لڑنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں، فرماتا ہے: لھم فی الدنیا خزی ولھم فی الأخرۃ عذاب عظیم۔ "ان کے لیے دُنیا میں ذلت و رسوائی ہے اور آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے۔" سورۂ مائدہ کی آیت ۳۳ میں بھی اسی طرح ان لوگوں کے بارے میں جو خدا اور اس کے رسول سے لڑنے کے لیے آمادہ ہو جائیں اور زمین میں فساد کریں، فرماتا ہے: ذالك لھم خزی فی الدنیا ولھم فی الأخرۃ عذاب عظیم۔ "یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی کا باعث ہے اور آخرت میں ان کے لیے عذابِ عظیم ہے۔" اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "ہم نے واضح آیات نازل کیں۔" (وقد انزلنا اٰیات بینات)۔ اِس سلسلہ میں کافی اتمامِ حجت ہوا ہے اور مخالفت کے لیے کوئی عُذر یا بہانہ باقی نہیں رہا۔ اس کے باوجُود اگر مخالفت کریں تو پھر ان کو سزا ملنی چاہیئے اور نہ صرف اس دنیا میں انہیں سزا دی جائے گی بلکہ "کفار کے لیے قیامت میں ذلیل وخوار کرنے والا عذاب ہے۔" (وللکافرین عذاب مھین) تو اس طرح گزشتہ جملہ میں اُن کے دُنیاوی عذاب کی طرف اشارہ ہوا اور اس جملہ میں ان کے اُخروی عذاب کی طرف اشارہ ہے اور ان معانی پر شاہد (کما کبت الذین من قبلھم) (جیسا کہ ان سے پہلے کے لوگ رُسوا ہُوئے) کا جملہ ہے۔ بعد والی آیت بھی انھی معانی کی گواہی دیتی ہے۔ بہرحال یہ خدائی تہدیدیں ان لوگوں کے بارے میں ہے جو پیغمبر اور قرآن کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور جنگِ بدر و خندق و خیبر وغیرہ میں ذلت و خواری اور شکست سے دوچار ہو گئے تھے۔ آخر کار فتح مکہ نے ان کے اقتدار کی بساط اُلٹ دی اور اسلام ہر جگہ کامیاب ہوا۔ بعد والی آیت میں ان کے اُخروی عذاب کے وقوع کے زمانے کے بارے میں اس طرح فرماتا ہے: "یہ ایسے دن ہوگا جب خدا ان کو قبروں سے اُٹھائے گا اور جو اعمال اُنہوں نے انجام دیے ہیں انہیں ان سے باخبر کرے گا۔ (یوم یبعثھم اللہ جمیعًا فینبئھم بما عملوا)[2]

جی ہاں خدا نے ان کے تمام اعمال کو شمار کیا ہے اگرچہ وہ خود اسے فراموش کر چکے ہیں۔ (احصاہ اللہ ونسوہ)۔ اسی وجہ سے جب ان کی نظر اپنے نامۂ اعمال پر پڑے گی تو ان کی فریاد بلند ہوگی۔ مالھٰذا الکتاب لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا "اس کتاب کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی چھوٹا بڑا کام ایسا نہیں جو اس میں منضبط نہ ہو۔" (کہف - ۴۹) اور یہ خود ایک دردناک عذاب ہے کہ خدا ان کے بھولے ہوئے گناہ ان کو یاد دلائے گا اور وہ میدانِ حشر میں تمام مخلوق کے سامنے رسوا ہوں گے۔ آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "خدا ہر چیز کا شاہد اور ہر جگہ ناظر ہے۔" (واللہ علیٰ کل شیءٍ شھید)۔ یہ درحقیقت بمنزلہ دلیل ہے اس چیز کے لیے جو گزشتہ جملے میں بیان ہوا ہے۔ جی ہاں! خدا کا حضور ہر جگہ اور ہر زمانے میں، خود ہمارے اندر اور باہر، اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ نہ صرف اعمال بلکہ وہ ہماری نیتوں اور عقائد کا بھی احصا کرتا ہے اور وہ عظیم دن جو "یوم البروز" ہے ان سب باتوں کو کھول دے گا تاکہ خُود انسان بھی اور دوسرے بھی جان لیں کہ اگر سخت عذاب نازل ہوا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کے بعد خدا کے ہر جگہ حاضر و ناظر

---

[1] بعض مفسرین نے "کبتوا" کو نفرین کے معنی میں لیا ہے۔ چونکہ خدائے قادرِ مطلق کی طرف سے کسی کے لیے نفرین اس بات کی دلیل ہے کہ جس گروہ کے خلاف نفرین ہے وہ ذلیل وخوار ہے لیکن آیت کی تعبیر کا ظاہر یہ ہے کہ یہ جملہ خبریہ ہے نہ کہ انشائیہ۔

[2] یوم ظرف ہے اور للکافرین سے متعلق ہے یا "مُھین" سے لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے اور بہت سے مفسرین نے اسی سے اتفاق کیا ہے اور یہ جو بعض مفسرین نے احتمال تجویز کیا ہے کہ "اذکر" محذوف ہے۔ یہ بہت زیادہ محذوف نظر آتا ہے۔

ہونے اور ہر چیز سے آگاہ ہونے کی تاکید کے لیے مسئلہ نجویٰ کو موضوع بنا کر فرماتا ہے: "کیا تو نہیں جانتا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے خدا اسے جانتا ہے" (الم تر ان اللہ یعلم ما فی السماوات وما فی الارض). اگرچہ رُوئے سُخن یہاں پیغمبرؐ کی طرف ہے لیکن مراد تمام لوگ ہیں[1]

درحقیقت یہ مسئلہ نجویٰ کے بیان کا دیباچہ ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: کبھی تین افراد آپس میں سرگوشی نہیں کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چوتھا ہوتا ہے اور کبھی پانچ افراد آپس میں باتیں نہیں کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چھٹا ہوتا ہے۔ (ما یکون من نجوٰی ثلاثۃ الا ھو رابعھم ولا خمسۃ الا ھو سادسھم)[2]

اور نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ تعداد مگر یہ کہ خدا ان کے ہمراہ ہوتا ہے وہ جہاں کہیں بھی ہوں۔ (ولا ادنیٰ من ذالك ولا اکثر الا ھو معھم این ما کانوا) - پھر قیامت کے دن انہیں ان کے اعمال سے آگاہ کرے گا کیونکہ خدا ہر چیز سے باخبر ہے۔ (ثم ینبئھم بما عملوا یوم القیامۃ ان اللہ بکل شیءٍ علیم)۔

اِس آیت میں چند نکات قابلِ توجہ ہیں

۱۔ نجویٰ اور نجات اصل میں بلند جگہ کے معنوں میں ہیں جو اپنے ارتفاع کی وجہ سے اپنے اطراف سے جُدا ہوئی ہو اور چونکہ انسان جب چاہے کہ دوسرا اس کی باتوں سے آگاہ نہ ہو تو وہ ایسی جگہ جاتا ہے جو دُوسروں سے الگ ہو اس لیے سرگوشی کو نجویٰ کہتے ہیں یا پھر اس لحاظ سے کہ چونکہ نجویٰ کرنے والا چاہتا ہے کہ اس کے اسرار دوسروں تک پہنچ جائیں لہٰذا وہ انہیں نجات بخشتا ہے۔

۲۔ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ نجویٰ حتمی طور پر تین یا تین سے زیادہ افراد کے مابین ہونا چاہیئے اور اگر صرف دو افراد کے درمیان ہو تو اسے (سرار) (بروزن کنار) کہتے ہیں لیکن یہ خود آیت کے ظہور کے خلاف ہے کیونکہ (ولا ادنی من ذالك) کا جملہ تین سے کم افراد یعنی دو کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ البتہ جس وقت دو شخص آپس میں نجویٰ کریں تو ضروری ہے کہ تیسرا آدمی ان کے قریب موجود ہو ورنہ نجویٰ لازم نہیں آتا لیکن یہ بات جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے ربط نہیں رکھتی۔

۳۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں پہلے تین افراد کے نجویٰ کی اور پھر پانچ کے نجویٰ کی بات ہوئی ہے لیکن چار افراد کے نجویٰ کی جو ان دونوں کے درمیان ہے، بات نہیں ہوئی۔ اگرچہ یہ محض مثال کی بات ہے مگر بعض نے اس کی مختلف وجوہ بیان کی ہیں جن میں سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ کلام میں فصاحت و بلاغت کی رعایت رکھی گئی ہے اور تکرار سے پہلو بچایا گیا ہے، اس لیے کہ اگر فرماتا کہ تین افراد نجویٰ کرتے ہیں تو خدا ان کا چوتھا ہوتا ہے اور چار افراد نجویٰ کرتے ہیں تو خدا ان کا پانچواں ہوتا ہے تو چار کے عدد کی محض تکرار ہوتی اور یہ فصاحت سے بعید ہوتا۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیات منافقین کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو ٹھیک انہی اعداد کے مطابق تھے۔ یعنی تین اور پانچ کی تعداد میں تھے۔

۴۔ اس سے مراد کہ خدا چوتھا یا چھٹا ہے یہ ہے کہ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور ہر چیز سے آگاہ ہے ورنہ اس کی پاک ذات نہ مکان

---

[1] "الم تر" رؤیت کے مادہ سے اصل میں حسی مشاہدہ کے معنی میں ہے لیکن بہت سے مواقع پر شہود قلبی اور علم و آگاہی کے معنی میں آیا ہے۔

[2] "نجویٰ" اگرچہ مصدر ہے لیکن یہاں اسم فاعل کے معنوں میں ہے یا زید عدل (زید خود عدالت ہے) کے قبیل میں سے ہے۔

رکھتی ہے اور نہ اعداد کے حوالے سے اس کی تعریف و توصیف کی جاسکتی ہے۔ اس کی یگانگت بھی وحدت عددی نہیں ہے بلکہ اس معنی میں ہے کہ وہ مثل و نظیر اور شبیہ نہیں رکھتا۔

۵۔ آیت کے ذیل میں بات کو نجویٰ سے بھی اُوپر لے جا کر کہتا ہے: "خدا ہر جگہ لوگوں کے ساتھ ہے اور قیامت کے دن ان کو ان کے اعمال سے باخبر کرے گا۔" آیت کو خدا کے احاطۂ علمی پر جا کر ختم کرتا ہے جیسا کہ آیت کی جو ابتدا ہے۔ وہ تمام چیزوں کے بارے میں خدا کا احاطۂ علمی ہے۔

۶۔ بعض مفسرین نے اس آیت کے لیے ابن عباسؓ سے ایک شانِ نزول نقل کی ہے کہ یہ آیت تین افراد ربیعہ، حبیب اور صفوان کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ خدا اس چیز کو جو ہم کہتے ہیں جانتا ہے۔ دُوسرے نے کہا اس کی کچھ مقدار کو جانتا ہے اور کچھ کو نہیں جانتا۔ تیسرے نے کہا: اگر کچھ مقدار کو جانتا ہے تو پھر ساری بات کو جانتا ہے (تو مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی) اور بتایا کہ خدا ہر نجویٰ میں موجود ہے اور آسمان و زمین کی ہر چیز سے آگاہ ہے تاکہ یہ دل کے اندھے اپنی غلط فہمی سے بچ جائیں۔[1]

ایک نکتہ

جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ خدا نہ جسم ہے اور نہ عوارض جسمانی رکھتا ہے، اس وجہ سے اس کے لیے زمان و مکان کا کوئی تصور نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اگر ہم تصور کریں کہ اس کے لیے کوئی جگہ ہو جہاں حاضر و ناظر ہو تو ہم نے اسے محدود کر دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ہر چیز پر احاطۂ علمی رکھتا ہے باوجودیکہ اس کے لیے کوئی مکان متصور نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں اس کے فرشتے ہر جگہ موجود ہیں جو تمام اقوال و اعمال کو سُنتے اور دیکھتے ہیں اور ثبت کرتے ہیں اسی لیے اس آیت کی تفسیر میں ہم حضرت علی علیہ السّلام سے ایک حدیث سُنتے ہیں:

(انما اراد بذالك استیلاء امنائه بالقدرة التی رکبها فیهم علی جمیع خلقه وان فعلهم فعله)

مراد یہ ہے کہ خدا کے اُمنا اس قدرت کی بنا پر جو انہیں بخشی گئی ہے اس کی ساری مخلوق پر تسلّط رکھتے ہیں اور چونکہ ان کا فعل اُس کا فعل ہے لہٰذا اِس حضور کی اُس کی طرف نسبت دی گئی ہے۔[2]

البتہ یہ اس معاملہ کا ایک رُخ ہے لیکن دوسری جہت سے خود ذاتِ خدا کا حضور پیش کیا جا رہا ہے۔ ہم ایک اور حدیث میں دیکھتے ہیں کہ دُنیائے عیسائیت کے ایک بہت بڑے عالم نے امیرالمومنین علی علیہ السلام سے پوچھا خدا کہاں ہے۔ فرمایا:

"هو هاهنا و هاهنا و فوق و تحت و محیط بنا و معنا و هو قوله ما یکون من نجویٰ

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۹ ص ۲۶۵

[2] تفسیر نورالثقلین جلد ۵ ص ۲۵۸ حدیث ۲۰۔

ثلاثۃ الاهو رابعهم.....“

وہ اِس جگہ ہے اور اُس جگہ ہے وہ اُوپر ہے نیچے ہے اور ہم پر احاطہ کیے ہوئے ہے اور ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے اور یہی معنی ہیں جن کے متعلق خدا کہتا ہے تین افراد آپس میں سرگوشی نہیں کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چوتھا ہوتا ہے۔[1]

مشہور حدیث اہلیلجہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ خدا کو سمیع کا نام جو دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تین افراد آپس میں نجویٰ نہیں کرتے مگر یہ کہ وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اس کے بعد آپؑ نے فرمایا :

”یسمع دبیب النمل علی الصفا و خفقان الطیر فی الهواء لا یخفی علیه خافیة ولا شیء مما ادرکه الاسماع والابصار وما لا تدرکه الاسماع والابصار ما جلّ من ذالك وما دق وما صغر وما کبر“

سخت پتھر پر چیونٹی کے چلنے کی صدا وہ سُنتا ہے اور فضا میں پرندوں کے پَر مارنے کی آواز وہ سُنتا ہے کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے اور وہ شے جس کا کان اور آنکھیں ادراک کرتی ہیں، اور وہ جس کا ادراک نہیں کرتیں، چھوٹی اور بڑی سب کی سب اس کے لیے ظاہر و آشکار ہیں۔[2]

---

[1] نورالثقلین جلد ۵ ص ۲۵۹ حدیث ۲۳۔

[2] نورالثقلین جلد ۵ ص ۲۵۸ حدیث ۲۱۔

۸۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا
نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ
الرَّسُوْلِ ۡ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ
اللّٰهُ ۙ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ؕ
حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○
۹۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ
وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ؕ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ○
۱۰۔ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ
بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○

ترجمہ

۸۔ کیا تُو نے نہیں دیکھا انہیں جن کو نجویٰ کی ممانعت کی گئی اس کے بعد اس کام کی طرف جس سے انہیں روکا گیا تھا لوٹ گئے اور گناہ و تعدی اور خُدا کے رسول کی نافرمانی کو انجام دینے کے لیے سرگوشی کرتے ہیں اور جس وقت تیرے پاس آتے ہیں تو تجھے وہ سلام کرتے ہیں جو خدا نے

تجھے نہیں کیا اور دل میں کہتے ہیں کہ خدا کیوں ہمیں ہماری باتوں پر عذاب نہیں کرتا۔ جہنم ان کے لیے کافی ہے۔ اس میں وہ وارد ہوں گے اور وہ بُری جگہ ہے۔

۹۔ اے ایمان لانے والو جس وقت سرگوشی کرتے ہو تو گناہ، تعدی اور رسولِ خدا کی نافرمانی کے لیے نہ کرو اور اچھے کام اور تقویٰ کے بارے میں سرگوشی کرو اور اُس خدا کی مخالفت سے، جس کی طرف تمہاری بازگشت ہے اور اس کے ہاں تمہیں جمع ہونا ہے، پرہیز کرو۔

۱۰۔ نجویٰ صرف شیطان کی طرف سے ہے وہ چاہتا ہے کہ مؤمنین اس سے غمگین ہوں لیکن انہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا مگر حکمِ خدا کے بغیر۔ اس لیے مؤمنین کو چاہیئے کہ وہ خدا پر توکل کریں۔

شانِ نزول

پہلی زیرِ بحث آیت کے بارے میں دو شانِ نزول نقل ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک آیت کے ایک حصّہ سے مربوط ہے۔ پہلی یہ کہ یہودیوں اور منافقوں کی ایک جماعت مومنین سے علیحدہ آپس میں سرگوشی کرتی اور ایک دوسرے کے کانوں میں باتیں کرتی اور کبھی یہ کہ مومنین کو آنکھوں سے پریشان کن اشارے کرتی۔ جب مومنین یہ منظر دیکھتے تو کہتے ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے عزیزوں اور رشتہ داروں کے بارے میں جو جہاد پر گئے ہوتے ہیں ان تک کوئی پریشان کن خبر پہنچی ہے۔ یہ اُس کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ یہ چیز مؤمنین کے غم و اندوہ کا باعث بنتی جب انہوں نے یہ حرکت بار بار کی تو مؤمنین نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے شکایت کی۔ رسولِ خدا نے حکم دیا کہ کوئی شخص مُسلمانوں کے سامنے ایک دُوسرے سے سرگوشی نہ کرے تو مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔ (اور انہیں اس کام پر سختی سے سرزنش کی) [1]

صحیح بخاری، صحیح مسلم اور بہت سی کتب تفسیر نے تحریر کیا ہے کہ یہودیوں کا ایک گروہ پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا اور السلام علیک کی بجائے السام علیک یا ابا القاسم کہا۔ (اس کا مفہوم ہے تجھ پر موت یا ملامت و خستگی ہو)۔ پیغمبرؐ نے ان کے جواب میں فرمایا: وعلیکم "(یہی چیز تم پر ہو)"۔

حضرت عائشہ کہتی ہیں: کہ مَیں اس مفہوم کی طرف متوجہ ہوئی اور مَیں نے کہا: علیکم السام ولعنکم اللہ وغضب علیکم۔ "تم پر موت وارد ہو۔ خُدا تم پر غضب کرے" تو پیغمبرؐ نے فرمایا:

"نرمی سے کام لو اور سختی و بدگوئی سے پرہیز کرو۔"

تو مَیں نے کہا: کہ آپ نہیں سُن رہے تھے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ "تجھ پر موت ہو" فرمایا:

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۴۹

"کیا تُو نے نہیں سُنا کہ مَیں نے ان کے جواب میں علیکم کہا ہے۔"

یہ وہ موقع تھا کہ مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی کہ "جس وقت یہ گروہ تمہارے پاس آتا ہے تو ایسا سلام کرتا ہے جیسا سلام خدا نے تم پر نہیں کیا۔"[1]

تفسیر

اِن آیات کی بحث اس طرح نجویٰ کے ان مباحث کا تسلسل ہے جو گزشتہ آیتوں میں تھے۔ پہلے فرماتا ہے :

"کیا تُو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہیں سرگوشی سے منع کیا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ اس کام کی طرف پلٹے جس کی ممانعت کی گئی تھی اور وہ گناہ، تعدی اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کو انجام دینے کے لیے نجویٰ کرتے ہیں۔"

(الم تر الی الذین نھوا عن النجوٰی ثم یعودون لما نھوا عنه و یتناجون بالاثم والعدوان و معصیت الرسول)۔ اس تعبیر سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انہیں خبردار کیا گیا تھا کہ وہ نجویٰ سے پرہیز کریں۔ وہ ایسا کام ہے جو دوسروں میں بدگمانی اور پریشانی پیدا کرتا ہے لیکن انہوں نے، نہ صرف یہ کہ، اس حکم پر کان نہیں دھرا بلکہ اپنے نجویٰ کے لیے ایسے امور منتخب کیے جن میں گناہ کی انجام دہی تھی اور جو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے خلاف تھے۔

اثم، عدوان اور معصیت الرسول میں اس لحاظ سے فرق ہے کہ اثم ان گناہوں کو کہتے ہیں جو انفرادی پہلو رکھتے ہیں۔ مثلاً (شراب پینا) اور عدوان ان امور کے لیے آتا ہے جو دوسروں کے حقوق کے سلسلہ میں تجاوز کا باعث ہوں۔ باقی رہی معصیت الرسول تو وہ ان فرامین سے تعلق رکھتی ہے جنہیں خُود پیغمبرِ اسلام حکومتِ اسلامی کے سربراہ کی حیثیت سے اسلامی معاشرہ کی مصلحتوں کے سلسلہ میں صادر فرماتے تھے۔ اس وجہ سے وہ اپنی سرگوشیوں میں ہر قسم کے غلط کاموں کو شامل کرتے تھے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ عمل خُود انہی سے تعلق رکھتے تھے، یا دوسروں سے متعلق تھے یا حکومتِ اسلامی اور ذاتِ پیغمبرؐ سے ان کا تعلق تھا۔ "یعودون" اور "یتناجون" کی تعبیر، جو فعل مضارع کی صُورت میں آئی ہے، بتاتی ہے کہ وہ یہ کام بار بار کرتے تھے اور ان کا مقصد مؤمنین کے دلوں میں پریشانی اور شک پیدا کرنا تھا۔ بہرحال مندرجہ بالا آیت، ایک اخبارِ غیبی کے عنوان سے ان کے غلط اعمال کے چہرے سے پردہ اُٹھاتی ہے اور ان کی راہ انحراف کا انکشاف کرتی ہے۔ اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے منافقوں اور یہودیوں کے ایک اور غلط عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید ارشاد ہوتا ہے :

"اور جس وقت وہ تیرے پاس آتے ہیں تو ایسا سلام کرتے ہیں جیسا خدا نے تجھے نہیں کیا۔"

(واذا جاءوك حیوك بما لم یحیك به الله)۔ "حیوك" "تحیت" کے مادّہ سے اصل میں حیات سے لیا گیا ہے اور سلامتی و زندگی تازہ کے لیے دُعا کرنے کے معنی میں ہے۔ اس آیت میں تحیتِ الٰہی سے مُراد وہی السلام علیک (یا سلام اللہ علیک) کا جملہ ہے جس سے ملتا جُلتا جملہ قرآنی آیتوں میں پیغمبروں اور بہشتیوں کے لیے بارہا آیا ہے۔ منجملہ دیگر آیتوں کے ہم سورۂ صافات کی آیت ۱۸۱ میں دیکھتے ہیں وسلام علی المرسلین۔ "پروردگار کے تمام رسُولوں پر سلام۔" باقی رہا وہ سلام جو خدا نے نہیں بتایا اور جو جائز نہیں تھا وہ السام علیکم کا جملہ تھا (تجھ پر موت یا ملامت و خستگی ہو)۔ یہ احتمال بھی ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے سلام کی طرف اشارہ ہو جیسا کہ وہ کہتے تھے

[1] تفسیر مراغی جلد ۲۸ ص ۱۳

" انعم صباحًا " (تیری صبح راحت سے ہم کنار ہو)۔(انعم مساءً) تیرا وقت عصر راحت سے ہم کنار ہو" بغیر اس کے کہ خدا کی طرف توجہ کرے اور اس سے اپنے مقابل کے لیے سلامتی طلب کرے۔

یہ صورتِ حال اگرچہ زمانۂ جاہلیت میں تھی لیکن اس کا حرام ہونا ثابت نہیں ہے لہٰذا مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں اسے پیش کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے: " وہ نہ صرف یہ کہ بڑے بڑے گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں بلکہ اس طرح بادۂ غرور میں مست ہیں کہ دل میں کہتے ہیں کہ اگر ہمارے اعمال بُرے ہیں اور خدا جانتا ہے تو ہماری باتوں کی وجہ سے ہم پر عذاب نازل کیوں نہیں کرتا۔ (و یقولون فی انفسھم لولا یعذبنا اللہ بما نقول) اس طرح پیغمبر کی نبوت پر اپنے ایمان کے نہ ہونے کو ثابت کرتے ہیں اور خدا کے علمی احاطہ پر بھی اپنے ایمان کے نہ ہونے کو پایۂ ثبوت تک پہنچاتے ہیں لیکن قرآن ایک مختصر سے جملہ میں انہیں اس طرح جواب دیتا ہے "جہنم ان کے لیے کافی ہے اور کسی اور عذاب کی ضرورت نہیں ہے۔ وہی جہنم جس میں وہ عنقریب داخل ہوں گے اور وہ کیا ہی بُری جگہ ہے"۔ (حسبھم جھنم یصلونھا فبئس المصیر)۔ بہرکیف یہ تعبیر اس بات کی نفی نہیں کرتی کہ وہ دُنیاوی عذاب سے بچ جائیں گے اور اس حقیقت کو آشکار کرتی ہے کہ اگر کوئی اور عذاب، جہنم کے عذاب کے علاوہ، نہ بھی ہو تو یہ جہنم کا عذاب ہی ان کے لیے کافی ہے اور یہ اپنے تمام اعمال کا عذاب اکٹھا جہنم میں دیکھیں گے اور چونکہ مؤمنین کبھی کبھی ضرورت اور اپنی دلی خواہش کے ماتحت سرگوشی کرتے تھے لہٰذا بعد والی آیت میں رُوئے سخن ان کی طرف کرتے ہوئے، اس خیال کے پیش نظر کہ وہ اس کام میں منافقوں اور یہودیوں جیسے گناہوں میں آلودہ نہ ہوں، فرماتا ہے:

" اے ایمان لانے والو! جس وقت تم نجویٰ کرو تو گناہ، تعدی اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کے لیے نجویٰ نہ کرو تمہارے نجویٰ کا مضمون پاکیزہ ہو اور خوفِ خدا لیے ہوئے ہو۔ نیک کاموں اور تقوے کے لیے نجویٰ کرو " (یا ایھا الّذین اٰمنوا اذا تناجیتم فلا تتناجوا بالاثم والعدوان ومعصیت الرسول وتناجوا بالبر والتقوٰی) ۔ اور خُدا کی معصیت سے پرہیز کرو تم سب کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے " (واتقوا اللہ الّذی الیہ تحشرون) ۔ اس تعبیر سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ نجویٰ اگر مؤمنین کے درمیان ہو تو وہ سُوئے ظن اور بدگمانی کے جذبات کو نہ اُبھارے ، پریشانی پیدا نہ کرے اور اس کا نفسِ مضمون نیکیوں کی وصیّت پر مبنی ہو پھر وہ جائز ہو لیکن اگر نجویٰ یہودیوں اور منافقوں کے درمیان واقع ہو، جس کا مقصد ہی پاکیزہ دل مؤمنین کو تکلیف پہنچانا ہے تب یہ عمل قبیح اور حرام ہے چہ جائیکہ اس کا نفسِ مضمون بھی شیطانی ہو۔ اس لیے بعد والی آیت میں جو زیرِ بحث آیتوں میں سے آخری آیت ہے مزید فرماتا ہے : " نجویٰ صرف شیطان کی طرف سے ہے ۔ (انما النجوٰی من الشیطٰن)۔" اس مقصد کے پیش نظر کہ مومنین پریشان و غمگین ہوں" (لیحزن الّذین اٰمنوا) ۔ لیکن انہیں جان لینا چاہیئے کہ شیطان اذنِ پروردگار کے بغیر مومنین کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ (ولیس بضارھم شیئًا الّا باذن اللہ) عالمِ ہستی میں جو مؤثر بھی ہے اس کی تاثیر حکمِ خدا ہی سے ہے یہاں تک کہ آگ کا جلانا اور تلوار کا کاٹنا بھی اسی کے حکم کے ماتحت ہے۔ اگر جلیل حکم نہ دے تو خلیل کے حلق پر چھری نہیں کاٹتی۔ اسی لیے مومنین کو صرف خدا پر توکل کرنا چاہیئے اور اس کے علاوہ کسی چیز سے نہیں ڈرنا چاہیئے اور اس کے غیر سے محبت نہ کی جائے۔ (وعلی اللہ فلیتوکل المؤمنون)۔ وہ توکل کی رُوح اور خُدا پر ایمان رکھنے کی وجہ سے اچھی طرح مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں اور شیطان کے پیروکاروں کے منصوبے کو ناکام بنا سکتے ہیں اور ان کی سازشوں کو درہم و برہم کر سکتے ہیں ۔

چند نکات

۱۔ نجویٰ کی اقسام اور سرگوشی کی باتیں : یہ عمل فقہ اسلامی کے لحاظ سے شرائط کے اختلاف کے مطابق مختلف احکام رکھتا ہے اور اصطلاح کے مطابق پانچوں احکام میں تقسیم ہوتا ہے۔ یعنی کبھی حرام ہے اور وہ اس صورت میں کہ کسی مسلمان کی اذیت اور اس کے وقار کے برباد کرنے کا موجب ہو۔ (جیسا کہ مندرجہ بالا آیات میں اس کی طرف اشارہ ہوا تھا)۔ چونکہ اس کا مقصد مومنین کو غمگین کرنا ہے اس لیے ایسا نجویٰ شیطانی ہے۔ اس کے برعکس یہ کبھی واجب ہو جاتا ہے اور وہ اس صورت میں کہ جب کوئی ایسا مسئلہ زیر بحث ہو جس کا پوشیدہ رکھنا ضروری ہو، اس کا افشا خطرناک ہو اور مسلمانوں کے حقوق کو برباد کرتا ہو۔ یہی نجویٰ کبھی مستحب ہو جاتا ہے وہ اس صورت میں کہ جب انسان اچھے نیک اور تقویٰ کے کاموں میں اسے اختیار کرے۔ اس طرح اس کے بارے میں کراہت اور اباحت کا حکم ہے۔ اصولی طور پر بات یہ ہے کہ اگر کوئی اہم ترین مقصد پیش نظر نہ ہو تو نجویٰ کرنا کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے اور آداب مجلس کے خلاف ہے کیونکہ یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے بے اعتمادی اور بے اعتنائی کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی لیے ہم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں :

اذا کنتم ثلاثۃ فلا یتناج اثنان دون صاحبھما فان ذالک یحزنہ

جب تم تین افراد ایک جگہ ہو تو دو افراد تیسرے سے الگ ہو کر سرگوشی نہ کرو کیونکہ یہ چیز تیسرے شخص کو غمگین کر دیتی ہے۔[1]

ایک اور حدیث میں ابو سعید خدری سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم پیغمبرؐ کے احکام کے اجرا کے لیے ایک رات کسی ضروری مقصد کے پیش نظر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خانۂ اقدس کی طرف رواں تھے اور بہت سے افراد جمع ہو گئے تھے اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باہر تشریف لائے اور فرمایا :

ما ھٰذہ النجوٰی الم تنھوا عن النجوٰی؟

یہ کیا سرگوشی ہے کیا تمہیں نجویٰ سے منع نہیں کیا گیا؟[2]

دیگر متعدد روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان مومنین کو غمگین کرنے کے لیے ہر ذریعہ سے فائدہ اٹھاتا ہے، نہ صرف نجویٰ سے بلکہ خواب کے عالم میں کوئی منظر اس کی آنکھوں کے سامنے مجسّم کر دیتا ہے تاکہ وہ اس کے غم و اندوہ کا موجب ہوں۔ اسی لیے حکم دیا گیا ہے کہ مومنین اس قسم کے مواقع پر خدا کی پاک ذات سے پناہ طلب کر کے اور اسی پر توکل کر کے اس قسم کے شیطانی منصوبوں کو اپنے سے دور کر سکتے ہیں۔[3]

---

[1] تفسیر مجمع البیان در ذیل آیات زیر بحث و درالمنثور جلد ۶ ص ۱۸۴ و اصول کافی جلد ۲ ص ۴۸۳ باب المناجات، حدیث ۱، ۲۔

[2] درالمنثور جلد ۶ ص ۱۸۴

[3] ان روایات سے آگاہی کے لیے تفسیر نورالثقلین جلد ۵ ص ۲۶۱، ۲۶۲ حدیث ۳۱، ۳۲ ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ خدا کا سلام کون سا ہے ؟

عام طور پر مجالس و محافل میں ورُود کے موقع پر لوگ ایک دوسرے سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو احترام و محبت کی ترجمانی کرتی ہیں اور وہ اس کا نام " تحیت " رکھتے ہیں۔ مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلام کو بھی خدا کی رضا کا حامل ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ معاشرت کے تمام آداب و رسوم (کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے)۔ سلام میں مقابل کے احترام و اکرام کے علاوہ خدا کی یاد بھی جھلکنی چاہیئے۔ جیسا کہ سلام کرتے وقت ہم اپنے مقابل کی سلامتی کی خدا سے استدعا کرتے ہیں۔ تفسیر علی بن ابراہیم میں زیر بحث آیات کے ذیل میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ کے اصحابؓ کی ایک جماعت جس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئی تو انعم صباحاً وانعم مساءً کہتی ہوئی (تیری صبح راحت سے ہم کنار ہو اور تیرا وقت عصر راحت سے ہم کنار ہو)۔ یہ زمانۂ جاہلیت کا سلام تھا۔ قرآن نے اس سے منع کیا اور رسولؐ خدا نے ان سے فرمایا کہ خدا نے ہمیں اس سے بہتر سلام کا حکم دیا ہے۔ وہ اہلِ بہشت کا سلام ہے :

" السلام علیکم "[1] جس کے معنی سلام اللہ علیکم ہیں۔ اسلامی سلام کا امتیاز یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ ذکرِ خدا کو لیے ہوئے ہے۔ دوسری طرف ہر قسم کی سلامتی کو پیش کرتا ہے۔ وہ دین و ایمان کی سلامتی ہو یا جسم و جان کی۔ سلام کا مقصد محض راحت و آسائش کی خواہش نہیں ہے[2]

سلام اور اس کے آداب کے سلسلہ میں ہم سورۂ نسا کی آیت ۸۶ کے ذیل میں تفصیلی بحث پیش کر چکے ہیں۔ تفسیر نمونہ جلد ۴ ص ۱۴ سے آگے ملاحظہ فرمائیں۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین حدیث ۳۰۔

[2] کتاب " بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب میں زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے سلام کی تفصیلی بحث اور انعم صباحًا و مساءً کے جملہ کی تفسیر مذکور ہے جلد ۲ ص ۱۹۲

۱۱۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِیْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَ اِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝

ترجمہ

۱۱۔ اے ایمان لانے والو! جس وقت تم سے کہا جائے کہ مجلس کو وسعت بخشو (نئے آنے والوں کو جگہ دو) تو اسے وسعت بخشو۔ خدا تمہارے لیے (جنت کو) وسعت دے گا۔ جب کہا جائے کہ کھڑے ہو جاؤ تو کھڑے ہو جاؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو خدا ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور علم سے بہرہ ور ہیں عظیم درجات بخشے گا۔ اور اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔

شانِ نزول

طبرسی نے مجمع البیان میں اور آلوسی نے روح المعانی میں اور دوسرے مفسّرین کی ایک جماعت نے تحریر کیا ہے کہ پیغمبر اسلام ایک جمعہ کو "صفہ" (بڑا سا چبوترہ جو مسجد نبوی کے قریب تھا) پر تشریف فرما تھے اور ایک گروہ آپ کی خدمت میں حاضر تھا اور جگہ تنگ تھی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ عادت تھی کہ آپ مجاہدینِ بدر کا زیادہ احترام کرتے تھے خواہ وہ مہاجر ہوں یا انصار۔ اسی دوران بدریوں کا ایک گروہ آیا۔ اس وقت دوسرے لوگ آپ کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے تھے اور جگہ خالی نہ تھی۔ وہ جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے آئے تو انہوں نے سلام کیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جوابِ سلام دیا مگر وہ لوگ کھڑے رہے اور منتظر رہے کہ حاضرین انہیں جگہ دیں۔ لیکن کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ اُٹھا۔ یہ بات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ناگوار گزری۔ اپنے چاروں طرف بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کچھ کی طرف آپ نے رُخ کیا اور فرمایا فلاں فلاں شخص کھڑا ہو جائے۔ اس طرح چند افراد کو آپ نے اُٹھایا تاکہ آنے والے بیٹھ سکیں۔ (یہ ایک قسم کا ایمان اور جہاد میں سبقت کرنے والوں کے بارے میں ادب اور احترام کا درس تھا)۔ لیکن یہ بات ان چند افراد کو ناگوار گزری جو اپنی جگہ

سے اُٹھے تھے خفگی کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں تھے۔ منافقین جو ہر موقع سے فائدہ اُٹھاتے تھے وہ کہنے لگے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصاف سے کام نہیں لیا وہ لوگ جو عاشقانہ انداز میں آپؐ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے انہیں ان لوگوں کی خاطر جو مجلس میں بعد وارد ہوئے تھے اُٹھا دیا اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی (اور مجلسوں میں بیٹھنے کے آداب کے کچھ حصّہ کی ان کے لیے شرح کی) [۱]

تفسیر

مجالس میں پہلے آنے والوں کا احترام

اس حکم کے بعد جو گزشتہ آیات میں مجالس میں سرگوشی ترک کرنے اور اسے مخصوص مواقع تک محدود کرنے کے سلسلہ میں آیا تھا اس آیت میں ایک اور مجلسی ادب کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اے ایمان لانے والو! جس وقت تم سے کہا جائے کہ مجلس کو وسعت دو اور نئے آنے والوں کو جگہ دو تو اس کی اطاعت کرو"

(یاایھا الذین اٰمنوا اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا) [۲]

اگر ایسا کروگے تو خدا تمہاری جگہ کو جنّت میں وسعت بخشے گا اور اس جہان میں بھی تمہارے دل و جان اور رزق میں وسعت دے گا۔ (یفسح اللہ لکم)۔ "تفسحوا" "فسح" (بروزن قفل) کے مادہ سے ہے اور وسیع مکان کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر "تفسح" وسعت دینے کے معنی میں ہے اور اسے آدابِ مجلس میں شامل سمجھنا چاہیئے۔ جس وقت کوئی نیا شخص مجلس میں وارد ہو تو حاضرین قریب قریب ہو جائیں اور اس کو جگہ دے دیں تاکہ وہ پریشان اور نادم نہ ہو۔ یہ موضوع محبّت اور دوستی کے رشتوں کو محکم کرنے کے وسائل میں سے ہے یہ نجویٰ کے برعکس ہے جس کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے اور جو نفرت، بدبینی اور دشمنی کے عوامل میں سے ہے۔ قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ قرآن مجید، جو عظیم آسمانی کتاب ہے اور مسلمانوں کے بنیادی قانون کی حیثیت رکھتا ہے، اس نے اخلاقی مسائل اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی بہت سی جزئیات کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ اس نے اہم اور بُنیادی قوانین کے ذیل میں بھی ان جزئیات کی طرف اشارہ کیا ہے تاکہ مسلمان یہ تصور نہ کریں کہ ان کے لیے صرف کُلّی اصولوں کا پابند ہونا ہی کافی ہے۔ (یفسح اللہ لکم) "خدا تمہیں وسعت بخشے گا" کے جملے کی مفسرین کی ایک جماعت نے یہ تفسیر کی ہے کہ جنّت کی مجالس کو وسعت دی جائے گی۔ یہ وہ اُجر ہے جو خدا ان افراد کو دے گا جو اس جہان میں آدابِ مجلس کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ چونکہ آیت مطلق ہے اور اس میں کوئی قید و شرط نہیں ہے لہٰذا اس کا مفہوم وسیع اور خدا کی طرف سے ہر قسم کی وسعت بخشنے پر حاوی ہے اور وہ وسعت جنّت میں ہو یا دنیا میں، رُوح و فکر میں ہو یا عمر اور زندگی میں، مال و متاع میں ہو یا رزق میں، یہ سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ فضلِ خدا سے یہ بعید نہیں ہے کہ اس قسم کے چھوٹے سے کام کے صلہ میں وہ اس طرح کا عظیم اجر عطا کردے

---

[۱] رُوح المعانی جلد ۲۸ ص ۲۵ و مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۵۳۔ دُوسرے مفسرین رازی، قرطبی، سیوطی اور فی ظلال نے بھی یہی مفہوم زیرِ بحث آیت کے ذیل میں مختصر سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

[۲] "تفسحوا" اور "فافسحوا" کی دو تعبیروں کا فرق جن میں سے ایک باب تفعّل سے ہے اور دُوسری باب ثلاثی مجرد سے ہے شاید اس وجہ سے ہو کہ پہلی ایک قسم کے تکلّف کی حامل ہے اور دوسری اس سے خالی ہے یعنی جب کہنے والا زحمت کرتے ہوئے کہے کہ نو وارد کو جگہ دو تو وہ زحمت کا احساس کیے بغیر جگہ دے دیں (غور کیجئے)

کیونکہ اُجر کی مقدار اس کے کرم پر منحصر ہے نہ کہ ہمارے اعمال پر۔ اور چونکہ کبھی مجلسوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کچھ افراد کے اُٹھے بغیر دوسروں کے لیے جگہ نہیں بنتی، یا اگر ہو تو ان کی ضرورت کے مطابق نہیں ہوتی لہٰذا آیت کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتا ہے :

" جس وقت تم سے کہا جائے کہ اُٹھ کھڑے ہو، تو اُٹھ کھڑے ہو" (واذا قیل انشزوا فانشزوا)[1]

نہ تو بہانے بناؤ اور نہ جس وقت اُٹھو اس وقت پریشان ہو۔ کیونکہ بعض اوقات نووارد افراد بیٹھنے کے تم سے زیادہ حقدار ہوتے ہیں، زیادہ تھکن کی وجہ سے یا ضعیفی کی وجہ سے یا خاص احترام کی بنا پر یا اور کسی ایسے ہی سبب کی بنا پر۔ حاضرین کو چاہیئے کہ وہ ایثار سے کام لیں اور اس اسلامی اُدب پر عمل پیرا ہوں جیسا کہ ہم نے شانِ نزول میں پڑھا ہے کہ پیغمبرؐ نے ایک جماعت کو، جو آپؐ کے قریب بیٹھی ہوئی تھی، حکم دیا کہ اپنی جگہ ان نوواردوں کو دے دو جو مجاہدینِ بدر میں سے ہیں اور علم و فضل کے لحاظ سے دوسروں پر برتری رکھتے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس بنا پر کہ " انشزوا " (اُٹھ کھڑے ہو) یہاں مطلق ہے اس کی زیادہ وسیع معانی پر مبنی تفسیر کی ہے جس میں مجلس سے اُٹھنا بھی شامل ہے اور یہ جہاد کے لیے اُٹھ کھڑے ہونے اور نماز اور دوسرے امورِ خیر کے لیے مستعد ہونے کے معانی پر بھی حاوی ہے۔ لیکن اس سے پہلے جُملے کی طرف توجہ سے، جس میں " فی المجالس " کی قید ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جملہ بھی اسی شرط کا پابند ہے جس کی تکرار سے، قرینہ کے موجود ہونے کی بنا پر، پرہیز کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس حکم کے اُجر کو بیان کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے :

" اگر ایسا کرو گے تو خدا ان لوگوں کو جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور علم سے بہرہ وَر ہیں عظیم درجات بخشے گا " (یرفع اللّٰہ الذین اٰمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات)[2]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان قوانین کی اطاعت ایمان و علم کی دلیل ہے۔ نیز اس طرف اشارہ ہے کہ اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض افراد کو حکم دیا ہے کہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو جاؤ اور نووارد افراد کو جگہ دے دو تو یہ ایک ایسا مقدس مقصود ہے جس کا حکم خدا کی طرف سے ہے اور یہ ایمان و علم میں سبقت کرنے والوں کے احترام کی بنا پر ہے۔ " درجات " کی تعبیر (نکرہ کی شکل میں اور صیغۂ جمع کے ساتھ) عظیم اور بلند مراتب کی طرف اشارہ ہے جو خدا اس قسم کے افراد کو عطا کرتا ہے جو علم و ایمان دونوں کے حامل ہوں۔ حقیقت میں وہ لوگ جو نووارد افراد کو اپنے پاس جگہ دیتے ہیں ایک درجہ پر فائز ہوتے ہیں اور جو ایثار سے کام لیں اور اپنی جگہ ان کو دے دیں اور وہ علم و معرفت سے بھی بہرہ ور ہوں، تو ان کے لیے بہت سے درجات ہیں۔ اور چونکہ ایک گروہ ان آداب کو خلوصِ دل سے بروئے کار لاتا ہے لہٰذا آیت کے آخر میں مزید فرماتا ہے : " خدا اس سے جسے تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے " (واللّٰہ بما تعملون خبیر)۔

چند نکات

اگرچہ یہ آیت ایک خاص موقف کو لے کر نازل ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود اس کا ایک عام مفہوم بھی ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ جو چیزیں

---

[1] " انشزوا " " نشز " (بروزن نصر) کے مادہ سے ہے جس کے معنی بلند زمین کے ہیں۔ اس لیے یہ لفظ اُٹھنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔
" ناشزہ " اس عورت کو کہتے ہیں جو اپنے آپ کو اس عورت سے بہتر سمجھتی ہو جو اپنے شوہر کی اطاعت کرے۔ یہ لفظ کبھی زندہ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے کیونکہ یہ چیز کسی کے اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہونے کا سبب بنتی ہے۔

[2] مندرجہ بالا آیت میں " یرفع " اس صیغۂ امر کی وجہ سے مجزوم ہے جو اس سے پہلے ہے اور حقیقت میں مفہوم شرط رکھتا ہے اور یرفع اس کی جزا کے طور پر ہے

انسان کے رُتبہ کو خدا کی بارگاہ میں بلند کرتی ہیں وہ دو ہیں، ایک ایمان اور دُوسرے علم ۔ ہمیں معلوم ہے کہ شہید کا اسلام میں بلند ترین مقام ہے لیکن اس کے باوجود ایک حدیث پیغمبر اسلام سے منقول ہے :

(فضل العالم علی الشهید درجة و فضل الشهید علی العابد درجة ......
وفضل العالم علی سائر الناس کفضلی علی ادناهم)

عالم شہید سے ایک درجہ بلند ہے اور شہید عابد سے ایک درجہ بلند ہے اور عالم کی فضیلت باقی لوگوں پر ان میں سے پست ترین کے مقابلے میں میری فضیلت جیسی ہے [1]

ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ :

(من جائته منیته وهو یطلب العلم فبینه وبین الانبیاء درجة)

جس کو طالب علمی کے زمانہ میں موت آجائے اس کے اور انبیا کے درمیان صرف ایک درجہ کا فاصلہ ہے [2]

ہمیں معلوم ہے کہ چاندنی راتوں میں خصوصاً مہینے کی چودھویں رات کو جب چاند بالکل مکمل ہوتا ہے ستارے چاند کے نور میں مدھم ہو جاتے ہیں اور لُطف کی بات یہ ہے کہ عالم و عابد کے موازنہ میں ایک اور حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ :

(فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلة البدر علی سائر الکواکب)

عالم کی عابد پر فضیلت و برتری چودھویں رات کے باقی تمام ستاروں پر برتری کے مانند ہے [3]

قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ عابد عبادت انجام دیتا ہے جو مقصدِ خلقتِ انسانی ہے لیکن رُوحِ عبادت معرفتِ الٰہی ہے لہٰذا عالم عابد پر حد سے زیادہ برتری رکھتا ہے ۔ چونکہ مندرجہ بالا روایات میں عالم کی عابد کے مقابلہ میں فضیلت و برتری کے بارے میں آیا ہے اس سے مُراد ان دونوں کے درمیان ایک عظیم فاصلہ ہے اس لیے ایک دوسری حدیث میں ان دونوں کے فرق کے سلسلہ میں ایک درجہ کی بجائے سو درجہ کا فرق بیان ہوا ہے جس میں ہر درجہ کا فاصلہ دوسرے درجہ سے تیز رفتار گھوڑے کے ستر سال تک دوڑنے کی مقدار کے برابر ہے [4]

یہ بھی واضح ہے کہ قیامت میں شفاعت ہر شخص کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ مقربانِ بارگاہِ خدا کا مقام ہے لیکن ہمیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ملتی ہے :

(یشفع یوم القیامة ثلاثة الانبیاء ثم العلماء ثم الشهداء) [5]

قیامت میں تین گروہ شفاعت کریں گے انبیا، ان کے بعد علما اور پھر شہدا

حقیقت میں راہِ خُدا پر چلنا، خوشنودیِ خُدا کا حاصل کرنا اور اس کے قرب کی توفیق کا حصول دو عوامل کا مرہونِ منت ہے ایک تو ایمان و عمل، دوسرے آگاہی و تقویٰ جس میں سے کوئی بھی دُوسرے کے بغیر ہدایت و کامیابی حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں ہے ۔

۱، ۲ "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۲۵۳

۳، ۴ جوامع الجامع مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۶۴ ۔ قرطبی جلد ۹ ص ۶۴۷۵

۵ رُوح المعانی جلد ۲۸ ص ۲۶ ۔ قرطبی جلد ۹ ص ۶۴۷۰

۲۔ آدابِ مجلس

قرآن کریم میں بارہا اہم مسائل کے ساتھ ساتھ مجالس کے اسلامی آداب کی طرف اشارے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر سلام کرنے کے آداب، دعوتِ طعام کے آداب، پیغمبرؐ کے ساتھ گفتگو کرنے کے آداب، نوواردوں کو مجلس میں جگہ دینے کے آداب، علی الخصوص فضیلت کے حامل افراد اور ایمان کی طرف سبقت کرنے والے افراد کو مجلس میں جگہ دینے کے آداب[1]۔

اِس بات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ہر موضوع کے لیے اس کے مقام کے اعتبار سے اس کی اہمیت کا قائل ہے۔ اسلام اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ انسانی معاشرت کے آداب کچھ افراد کی بے اعتنائی کی وجہ سے پامال کر دیئے جائیں۔ کتب احادیث میں سینکڑوں روایات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین سے دوسروں کے ساتھ معاشرت کے آداب کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور مرحوم شیخ "حر عاملی" نے انہیں کتاب وسائل کی جلد آٹھ باب ۱۶۶ میں جمع کر دیا ہے اور جو جزئیات ان روایات میں ہیں وہ بتاتی ہیں کہ اسلام اس سلسلہ میں کس حد تک باریک بین اور سخت گیر ہے۔ ان روایات میں بیٹھنے، بات کرنے، مسکرانے، مذاق کرنے، کھانا کھلانے، خط لکھنے حتیٰ کہ دوستوں کی طرف نگاہ کرنے کے بارے میں بھی ہدایات مل جاتی ہیں اور جو احکام ہر موضوع پر دیے گئے ہیں ان کا نقل کرنا ہمیں تفسیری بحث کے دائرہ سے خارج کر دے گا۔ ہم حضرت علی علیہ السلام کی ایک حدیث پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

(لیجتمع فی قلبك الافتقار الی الناس والاستغناء عنهم یکون افتقارك الیهم فی لین کلامك وحسن سیرتك ویکون استغنائك عنهم نزاهة عرضك وبقاء عزك)۔

"تیرے دل میں لوگوں کے لیے نیازمندی و حاجت مندی اور بے نیازی و بے احتیاجی دونوں موجود ہونے چاہئیں۔ تیری نیازمندی و حاجت مندی گفتگو کی نرمی اور حُسنِ سلوک کے ذریعہ ظاہر ہو اور تیری بے نیازی و بے احتیاجی حفظِ آبرو اور عزّتِ نفس کے ذریعہ جلوہ گر ہو"[2]

---

[1] یہ احکام ترتیب کے ساتھ درج ذیل آیات میں آئے ہیں۔ سلام کرنے کے آداب سُورۂ نساء آیت ۸۶۔ دعوتِ طعام کے آداب سُورہ احزاب ۵۳۔ پیغمبرؐ سے گفتگو کرنے کے آداب حجرات آیت ۲ اور مجلس میں جگہ دینے کے آداب زیر بحث آیت میں۔

[2] "وسائل الشیعہ" جلد ۸ ص ۴۰۱۔

۱۲۔ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا نَٰجَيْتُمُ ٱلرَّسُولَ فَقَدِّمُوا۟ بَيْنَ
يَدَىْ نَجْوَىٰكُمْ صَدَقَةً ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَأَطْهَرُ ۚ
فَإِن لَّمْ تَجِدُوا۟ فَإِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○
۱۳۔ ءَأَشْفَقْتُمْ أَن تُقَدِّمُوا۟ بَيْنَ يَدَىْ نَجْوَىٰكُمْ صَدَقَٰتٍ ۚ
فَإِذْ لَمْ تَفْعَلُوا۟ وَتَابَ ٱللَّهُ عَلَيْكُمْ فَأَقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ
وَءَاتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ وَأَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ ۚ وَٱللَّهُ خَبِيرٌۢ بِمَا
تَعْمَلُونَ ○

ترجمہ

۱۲۔ اے ایمان لانے والوں جس وقت تم چاہو کہ رسولؐ خدا کے ساتھ نجویٰ کرو تو اس سے پہلے (راہِ خدا میں) صدقہ دے دو۔ یہ تمہارے لیے بہتر اور زیادہ پاکیزہ بات ہے اور اگر استطاعت نہ رکھتے ہو تو خدا غفور و رحیم ہے۔

۱۳۔ کیا ڈر گئے ہو کہ فقیر ہو جاؤ گے جو تم نے سرگوشی سے پہلے صدقہ دینے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اب جب کہ یہ کام تم نے نہیں کیا اور خدا نے تمہاری توبہ کو قبول کر لیا ہے تو نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور خدا اور اس کے پیغمبرؐ کی اطاعت کرو۔ (جان لو) کہ خدا اس کام سے جسے تم انجام دیتے ہو باخبر ہے۔

شانِ نزول

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں اور دیگر مشہور مفسرین کی ایک جماعت نے ان آیات کی شانِ نزول کے بارے میں یہ تحریر کیا ہے کہ اغنیا کا ایک گروہ محفلِ پیغمبرؐ میں آکر آپ سے نجویٰ کیا کرتا تھا۔ (یہ کام علاوہ اس کے کہ پیغمبرؐ کے قیمتی وقت کے بے جا صرف کا سبب بنتا غریبوں کی پریشانی اور امیر لوگوں کے ایک قسم کے امتیاز کا باعث بھی بنتا) ۔ اس موقع کے لیے پروردگارِ عالم نے مندرجہ بالا آیات نازل کیں اور انہیں حکم دیا کہ پیغمبرؐ سے نجویٰ کرنے سے پہلے حاجت مندوں کو صدقہ دیا کرو۔ اغنیاء نے جب یہ دیکھا تو نجویٰ سے احتراز برتنے لگے اس پر دوسری آیت نازل ہوئی (انہیں ملامت کی اور پہلے حکم کو منسوخ کیا) ۔ اور سب کو نجویٰ کرنے کی اجازت دے دی۔ لیکن نجویٰ صرف وہی جو اطاعت پروردگار کے سلسلہ میں ہو[1]۔

بعض مفسرین نے تصریح کی ہے کہ نجویٰ کرنے والے گروہ کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس طرح دوسروں کے مقابلہ میں برتری حاصل کریں۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اپنی مخصوص بزرگانہ حیثیت کے پیشِ نظر باوجود اس کے کہ وہ اس بات سے ناخوش تھے، ان لوگوں کو اس سرگوشی سے منع نہیں فرمایا۔ یہاں تک کہ قرآن نے ان لوگوں کو اس کام سے منع کیا[2]۔

تفسیر

ایک جاذبِ توجہ امتحان

گزشتہ آیات کے ایک حصہ میں نجویٰ کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیرِ بحث آیات اسی مفہوم کو جاری و ساری رکھتی ہیں اور اس کی تکمیل کرتی ہیں پہلے فرماتا ہے :

" اے ایمان لانے والو! تم جب چاہو کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے نجویٰ کرو تو اس سے پہلے راہِ خدا میں صدقہ دے دو" (یاایھا الذین اٰمنوا اذا ناجیتم الرسول فقدموا بین یدی نجواکم صدقة) ۔ جیسا کہ شانِ نزول میں ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ حکم اس لیے تھا کہ لوگوں کا ایک گروہ خصوصاً اغنیاء پیغمبرؐ سے نجویٰ کرتے اور ان کو مصروف رکھتے۔ یہ ایسا کام تھا جو دوسروں کے لیے غم و اندوہ کا باعث بنتا تھا اور نجویٰ کرنے والوں کے لیے سبب امتیاز ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں پیغمبرِ اسلامؐ کے قیمتی وقت کے ضائع ہونے کا سبب بھی بنتا تھا تو مندرجہ بالا حکم نازل ہوا۔ یہ حکم ان کے لیے ایک آزمائش، حاجت مندوں کے لیے مدد کا باعث اور مذکورہ زحموں کے کم کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ تھا۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے :

" یہ تمہارے لیے بہتر اور زیادہ پاکیزہ ہے" (ذالك خیر لكم واطهر) ۔ صدقہ کا اغنیاء کے لیے خیر ہونا اس وجہ سے ہے کہ یہ موجب ثواب تھا اور حاجت مندوں کے واسطے اس لیے کہ ان کی مدد کا ذریعہ تھا۔ باقی رہا اطہر ہونا تو وہ اس وجہ سے تھا کہ وہ

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۵۲ اور بہت سی تفاسیر در ذیل آیات زیرِ بحث۔

[2] رُوح المعانی جلد ۲۸ ص ۲۷

اغنیاء کے دلوں سے مال کی محبت کو دھوتا تھا اور حاجت مندوں کے دلوں سے کینے اور پریشانی کو دُور کرتا تھا۔ نجویٰ جب مُفت نہ ہوسکتا اور صدقہ کی ادائیگی کے ساتھ مشروط ہوتا تو خُود بخود کم ہو جاتا جیسا کہ کم ہوا۔ لہٰذا یہ چیز مسلمانوں کے فکری اور اجتماعی ماحول کے لیے ایک قسم کی پاکیزگی بن گئی۔ لیکن اگر نجویٰ سے پہلے صدقہ کا وجوب عمومیت رکھتا تو پھر فقراء اہم مسائل یا اپنی ضرورتیں پیغمبرؐ کی بارگاہ میں پیش کرنے سے تلصر رہ جاتے۔ لہٰذا آیت کے ذیل میں صدقہ کا حکم اس گروہ سے واپس لیتے ہوئے فرماتا ہے :

" اور اگر استطاعت نہ رکھتے ہوں تو خدا غفور الرحیم ہے۔" (فان لم تجدوا فان الله غفور رحیم)۔ اس طرح جو لوگ مالی اعتبار سے مضبُوط تھے ان کے لیے نجویٰ سے پہلے صدقہ دینا واجب تھا اور جن کی مالی حالت اچھی نہ تھی وہ صدقہ کے بغیر نجویٰ کر سکتے تھے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا حکم نے ایک عجیب تاثیر پیدا کی اور ایک عُمدہ آزمائش پیش کی۔ ایک شخص کے علاوہ سب نے صدقہ دینے اور نجویٰ کرنے سے پہلوتہی کی اور وہ ایک شخص حضرت علی علیہ السلام تھے۔ یہ وہ مقام تھا کہ جہاں جس چیز کی وضاحت اور اس کے نمایاں ہونے کی ضرورت تھی وہ واضح ہو گئی اور جو کچھ مسلمانوں کو اس حکم سے سمجھنا چاہیئے تھا اور درس لینا چاہیئے تھا اس کو انہوں نے سمجھا اور درس لیا۔ لہٰذا بعد والی آیت نازل ہوئی اور اس حکم کو منسُوخ کر دیا اور یہ حکم پیش کیا :

" کیا تم ڈر گئے کہ فقیر ہو جاؤ گے جس کی وجہ سے نجویٰ سے پہلے صدقہ دینے سے تم نے احتراز کیا۔ (ء اشفقتم ان تقدموا بین یدی نجواکم صدقات)۔ معلوم ہوتا ہے کہ مال کی محبت تمہارے دل میں پیغمبرؐ سے نجویٰ کرنے کے لگاؤ سے زیادہ پرکشش ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان سرگوشیوں میں عام طور پر زندگی کے مسائل موضوعِ گفتگو نہیں ہوتے تھے ورنہ کیا مانع تھا جو لوگ نجویٰ کرنے سے پہلے صدقہ دے دیتے اور پھر نجویٰ کرتے خصوصاً جب کہ صدقہ کے لیے کوئی مقدار بھی مقرر نہیں تھی اور وہ تھوڑی سی رقم سے اس مشکل کو حل کر سکتے تھے۔

پھر مزید فرماتا ہے :

"اَب جب کہ تم نے یہ کام نہیں کیا اور خُود تم اپنی کوتاہی کو بھانپ چکے ہو اور خدا نے بھی تمہیں معاف کر دیا ہے اور تمہاری توبہ قبول کر لی ہے تو نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور خدا اور اس کے پیغمبرؐ کی اطاعت کرو اور جان لو کہ جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے باخبر ہے (فاذ لم تفعلوا و تاب الله علیکم فاقیموا الصلوٰة وأتوا الزکوٰة و اطیعوا الله و رسوله والله خبیر بما تعلمون)۔

توبہ کی تعبیر بتاتی ہے کہ وہ گزشتہ نجووں میں گناہ کے مرتکب ہوتے تھے، خواہ ریا کاری کی بنا پر یا پیغمبرؐ کو تکلیف پہنچانے کی وجہ سے یا فقیر مؤمنین کو اذیت دے کر۔ اگرچہ اس آیت میں صراحت کے ساتھ گفتگو نجویٰ کے جواز میں نہیں ہوئی لیکن اس آیت کی تعبیر یہ بتاتی ہے کہ پہلا حکم اُٹھا لیا گیا۔ جہاں تک نماز قائم کرنے، زکوٰۃ ادا کرنے اور خدا و پیغمبرؐ کی اطاعت کرنے کا معاملہ ہے تو وہ ان امور کی اہمیت کی بنا پر ہے نیز اس طرف اشارہ ہے کہ اگر اس کے بعد سرگوشی کرو تو وہ ان عظیم مقاصد کے حصول کے لیے ہو اور خدا و رسول صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی اطاعت کی راہ میں ہو۔

چند نکات

۱۔ آیہ نجویٰ و صدقہ پر عمل کرنے والا تنہا شخص

اکثر شیعہ اور اہلِ سُنّت مفسّرین نے لکھا ہے کہ اکیلا وہ شخص جس نے اس آیت پر عمل کیا وہ امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام تھے۔

جیسا کہ طبرسی ایک روایت میں خود آنجناب سے نقل کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا :

(اٰیة من کتاب الله لم یعمل بها احد قبلی ولا یعمل بها احد بعدی کان لی دینار فصرفته بعشرة دراهم فکنت اذا جئت الی النبی تصدقت بدرهم)

قرآن میں ایک ایسی آیت ہے جس پر نہ مجھ سے پہلے کسی نے عمل کیا ہے اور نہ کوئی میرے بعد عمل کرے گا۔ میرے پاس ایک دینار تھا۔ میں نے اسے دس درہموں میں تبدیل کر لیا۔ جس وقت میں چاہتا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نجویٰ کروں تو ایک درہم صدقہ میں دے دیتا۔[1]

یہی مضمون شوکانی نے عبدالرزاق، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ سے نقل کیا ہے۔[2]

فخر رازی نے بھی اس حدیث کو کہ وہ اکیلا شخص، جس نے مندرجہ بالا آیت پر عمل کیا، حضرت علی علیہ السلام تھے، محدثین کی جماعت کے ذریعہ ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔[3]

دُرالمنثور میں بھی متعدد روایات مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں اسی معنی میں آئی ہیں۔[4]

تفسیر رُوح البیان میں عبداللہ ابن عمر بن خطاب سے منقول ہے کہ :

(کان لعلی ثلاث لو کانت لی واحدة منهن کانت احبّ الی من حمر النعم، تزویجه فاطمه واعطائه الرایة یوم خیبر واٰیة النجوی)

حضرت علی علیہ السلام کی تین ایسی فضیلتیں ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی مجھے حاصل ہو جاتی تو سُرخ بالوں والے اُونٹوں سے بہتر تھی (یہ تعبیر عربوں میں گراں بہا مال کی طرف اشارہ کے لیے استعمال ہوتی ہے اور اسے ضرب المثل کے طور پر کسی چیز کے بہت ہی نفیس ہونے کے بیان کے وقت استعمال کرتے ہیں)۔ پہلی فضیلت یہ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی شادی ان سے کرنا، دوسرے خیبر کے دن علم ان کو عطا کرنا اور تیسری آیۂ نجویٰ۔[5]

حضرت علی علیہ السلام کے لیے اس عظیم فضیلت کا ثابت ہونا اکثر کتب تفسیر و حدیث میں آیا ہے اور اس طرح مشہور و معروف ہے کہ مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔

---

[1] طبرسی جلد ۲۸ ص ۱۵

[2] تفسیر البیان فی تفسیر القرآن جلد ا ص ۳۷۵۔ سید قطب نے بھی یہی روایت فی ظلال القرآن جلد ۸ ص ۲۱ پر نقل کی ہے۔

[3] تفسیر فخر رازی جلد ۲۹ ص ۲۷۱

[4] درالمنثور جلد ۶ ص ۱۸۵

[5] تفسیر رُوح البیان ج ۹ ص ۴۰۶ (اس حدیث کو طبرسی نے مجمع البیان میں، زمخشری نے کشاف میں اور قرطبی نے تفسیر جامع میں زیر بحث آیات کے ذیل میں نقل کیا ہے۔

۲۔ نجویٰ سے پہلے صدقہ کی تشریع اور پھر نسخ کا فلسفہ

پیغمبرؐ سے نجویٰ کرنے سے پہلے وجوبِ صدقہ کی تشریع کیوں ہوئی اور پھر تھوڑی سی مدت کے بعد وہ کیوں منسُوخ ہوگیا؟ اس سوال کا جواب مندرجہ بالا آیت اور اس کی شانِ نزول میں موجود قرائن سے اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے۔ مقصد ان بلند بانگ دعویٰ کرنے والوں کی آزمائش تھا جو اس طریقہ سے پیغمبرؐ سے ایک خاص لگاؤ کا اظہار کرتے تھے۔ چنانچہ معلوم ہوگیا کہ یہ لگاؤ اور محبت کا اظہار صرف اس صورت میں تھا جب تک نجویٰ مفت تھا لیکن جس وقت تھوڑا سا مال خرچ کرنا پڑ گیا تو محبت کے اظہار کا جذبہ بھی سرد پڑ گیا۔ اس بات سے قطع نظر اس حکم نے مسلمانوں پر ہمیشہ اثر کیا اور ان پر واضح کر دیا کہ جب تک ضرورت نہ ہو پیغمبرؐ اور دوسرے عظیم اسلامی رہبروں کا گراں بہا وقت نجویٰ اور سرگوشی میں ضائع نہیں کرنا چاہیئے اور دوسرے لوگوں کی تکلیف کا باعث نہیں بننا چاہیئے۔ درحقیقت یہ آئندہ کی سرگوشیوں کو قابو میں لانے کا ایک عمل تھا۔ اس بنا پر مذکورہ حکم ابتدا میں ایک عارضی و وقتی پہلو رکھتا تھا لیکن جب اس کا مقصد پُورا ہوگیا تو وہ منسُوخ ہوگیا کیونکہ اس کو برقرار رکھنا بھی مشکل پیدا کر دیتا۔ بعض اوقات ضروری مسائل پیش آتے ہیں جن میں ضروری ہوتا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ انہیں پیغمبرؐ کی خدمت میں پیش کیا جائے، چنانچہ اگر صدقہ کا حکم باقی رہ جاتا تو اکثر اوقات ان ضرورتوں کے تقاضے پُورے نہ ہوتے اور اس طرح اسلامی معاشرہ کو نقصان پہنچتا۔

مواردِ نسخ میں کلّی طور پر حکم ہمیشہ پہلے ہی سے محدُود اور وقتی پہلو رکھتا تھا۔ اگرچہ لوگ بعض اوقات اس معنی سے آگاہ نہ ہوتے اور اسے حکم سمجھ لیتے جو ہمیشہ کے لیے ہو۔

۳۔ کیا یہ فضیلت تھی؟

اس میں شک نہیں کہ حضرت علی علیہ السلام اصحابِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دولت مندوں کے زمرہ میں داخل نہیں تھے آپؑ کی زندگی سادہ اور زاہدانہ تھی۔ اس کے باوجود اس حکمِ الٰہی کے احترام میں اس مختصر سی مدت میں آپؑ نے چند مرتبہ صدقہ دیا اور ضروری مسائل نجویٰ کے ذریعہ پیغمبرؐ کے سامنے رکھے۔ اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ مسئلہ مفسّرین اور اربابِ حدیث کے درمیان طے شدہ اور مسلّم ہے لیکن بعض لوگ اس حقیقت کو قبول کرنے کے باوجود اس پر اصرار کرتے ہیں کہ اس کے افضل ہونے کا انکار کریں۔ وہ منجملہ دیگر باتوں کے یہ کہتے ہیں کہ اگر بزرگانِ صحابہؓ نے یہ اقدام نہیں کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی، یا ان کے پاس کافی وقت نہیں تھا، یا وہ خیال کرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فقرا کی تکلیف و پریشانی اور اغنیا کی وحشت کا سبب بنے۔ اس بنا پر حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے لیے یہ اقدام کسی فضیلت اور دوسروں سے سلبِ فضیلت کا سبب نہیں ہے[1]

لیکن انہوں نے دوسری آیت کے متن پر غور نہیں کیا جس میں خدا سرزنش کے عنوان سے فرماتا ہے: (ءَاشفقتم ان تقدموا بین یدی نجواکم صدقات) "کیا تم فقر و فاقہ سے ڈر گئے ہو اور تم نے بُخل کیا ہے جو نجویٰ کے لیے صدقہ نہیں دیا۔" یہاں تک کہ آیت کے ذیل میں توبہ کا ذکر آتا ہے جو واضح طور پر ان معانی پر دلالت کرتا ہے کہ صدقہ دے کر پیغمبرؐ سے نجویٰ کا اقدام کرنا ایک

---

[1] تفسیر فخر رازی "رُوح البیان" آیات زیر بحث کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

پسندیدہ کام تھا ورنہ توبہ اور سرزنش کی ضرورت نہ ہوتی۔ اس میں شک نہیں کہ اصحاب پیغمبرؐ میں سے جانے پہچانے افراد کی ایک جماعت اس واقعہ سے پہلے پیغمبرؐ سے نجویٰ کرتی تھی۔ (کیونکہ عام اور دور افتادہ افراد یہ اقدام بہت کم کرتے تھے) لیکن انہی مشہور صحابہ نے صدقہ کے حکم کے بعد نجویٰ کرنا چھوڑ دیا۔ وہ تنہا شخص جس نے اس حکم کا احترام کیا اور اسے عملی جامہ پہنایا وہ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ تھے۔ اس میں کون سی قباحت ہوگی کہ ہم واضح آیات اور روایات کے پیش نظر جو اس سلسلہ میں مختلف اسلامی کتب میں مندرج ہیں انہیں قبول کرلیں اور کمزور و بے بنیاد احتمالات کی بنا پر ایک حقیقت کو نظر انداز نہ کریں اور عبداللہ ابن عمر کے ہمنوا بن جائیں جو اس فضیلت کو حضرت فاطمہ علیہا السلام کے ساتھ تزویج اور فتح خیبر کے دن کی علمداری سے مربوط اور حمر النعم (سرخ رنگ کے اونٹ) سے افضل و برتر سمجھتے ہیں۔

۴۔ مدّت حکم اور مقدارِ صدقہ

مندرجہ بالا حکم یعنی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نجویٰ کرنے سے پہلے صدقہ کا وجوب کتنی مدّت پر حاوی ہو کر منسوخ ہوا، اس سلسلہ میں مختلف قول نقل ہوئے ہیں۔ بعض اس کو صرف ایک گھنٹے اور بعض ایک رات تک محدود سمجھتے ہیں اور بعض اس مدّت کو دس روز پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ صحیح تیسرا قول ہی ہے کیونکہ ایک گھنٹہ یا ایک رات اس قسم کے امتحانی حکم کے لیے ہرگز کافی نہیں ہے، اس لیے کہ وہ عذر پیش کر سکتے تھے کہ اس مختصر سی مدّت میں نجویٰ کے لیے کوئی سبب پیش نہیں آیا لیکن دس دن کی مدّت حقائق کو واضح کر سکتی ہے اور اس حکم سے تخلف کرنے والوں کے لیے ملامت و سرزنش کے اسباب فراہم کر سکتی ہے۔ جہاں تک صدقہ کی مقدار کا تعلق ہے تو آیت میں اس کو معین نہیں کیا گیا اور اسلامی روایات کے مطالعہ سے بھی کوئی مقدار دستیاب نہیں ہوتی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اقدام کے لیے ایک درہم بھی کفایت کرتا تھا۔

۱۴۔ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ تَوَلَّوۡا قَوۡمًا غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ ؕ مَا ہُمۡ مِّنۡکُمۡ وَ لَا مِنۡہُمۡ ۙ وَ یَحۡلِفُوۡنَ عَلَی الۡکَذِبِ وَ ہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ۝

۱۵۔ اَعَدَّ اللّٰہُ لَہُمۡ عَذَابًا شَدِیۡدًا ؕ اِنَّہُمۡ سَآءَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۝

۱۶۔ اِتَّخَذُوۡۤا اَیۡمَانَہُمۡ جُنَّۃً فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَلَہُمۡ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ ۝

۱۷۔ لَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡہُمۡ اَمۡوَالُہُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ شَیۡئًا ؕ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ؕ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ۝

۱۸۔ یَوۡمَ یَبۡعَثُہُمُ اللّٰہُ جَمِیۡعًا فَیَحۡلِفُوۡنَ لَہٗ کَمَا یَحۡلِفُوۡنَ لَکُمۡ وَ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّہُمۡ عَلٰی شَیۡءٍ ؕ اَلَاۤ اِنَّہُمۡ ہُمُ الۡکٰذِبُوۡنَ ۝

۱۹۔ اِسۡتَحۡوَذَ عَلَیۡہِمُ الشَّیۡطٰنُ فَاَنۡسٰہُمۡ ذِکۡرَ اللّٰہِ ؕ

أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ○

ترجمہ

۱۴۔ کیا تُو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے ان افراد کے ساتھ دوستی کر لی ہے جو محلِ غضب خُدا ہیں یہ نہ تم میں سے ہیں اور نہ ان میں سے جھُوٹی قسم کھاتے ہیں (کہ وُہ تم میں سے ہیں) حالانکہ وہ خُود جانتے ہیں کہ وہ جھُوٹ بول رہے ہیں)۔

۱۵۔ خُدا نے ان کے لیے شدید عذاب فراہم کر رکھا ہے کیونکہ جن اعمال کو وہ انجام دیتے ہیں وُہ بُرے ہیں

۱۶۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال قرار دیا ہے اور لوگوں کو خدا کی راہ سے روک رکھا ہے لہٰذا ان کے لیے خوار کرنے والا عذاب ہے۔

۱۷۔ انکے مال و اولاد کسی طرح بھی انہیں عذابِ الٰہی سے محفوظ نہیں رکھ سکتے وہ اصحابِ آتش ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

۱۸۔ یاد کرو اس دن کو جب خُدا سب کو قبروں سے اُٹھائے گا وہ خدا کے لیے بھی جھوٹی قسم کھائیں گے۔ جس طرح (آج) تمہارے لیے قسم کھاتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ (ان جھوٹی قسموں کے ساتھ) کوئی کام انجام دے سکتے ہیں۔ وہ جھُوٹے ہیں۔

۱۹۔ شیطان ان پر غالب آچکا ہے اور خُدا کی یاد ان کے دلوں سے نکال کر لے گیا ہے۔ وہ شیطان کا گروہ ہیں۔ جان لو کہ شیطان کا گروہ ہی خسارے میں ہے۔

تفسیر

حزب شیطان

یہ آیات منافقین کی بعض سازشوں کو بے نقاب کرتی ہیں اور ان کی نشانیوں کے ساتھ مسلمانوں سے ان کا تعارف کراتی ہیں نجوی[1] کی آیات کے بعد اس چیز کا عنوانِ کلام بننا شاید اس مناسبت سے ہے کہ پیغمبر[2] سے نجوی کرنے والوں میں کچھ منافق افراد بھی تھے جو اس چیز کو اپنی سازشوں پر پردہ ڈالنے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اظہارِ قرب کے لیے استعمال کرتے تھے اور یہی بات سبب بنی کہ قرآن ایک امرِ کلی کی شکل میں اس کو پیش کرتا ہے۔ پروردگارِ عالم پہلے فرماتا ہے:

"کیا تُو نے ان افراد کو نہیں دیکھا جو ایسی قوم سے دوستی کی طرح ڈالتے ہیں جس پر خدا نے غضب کیا ہے"۔ (الم تر الی الذین تولوا قومًا غضب اللہ علیھم)۔ یہ مغضوب علیھم قوم واضح طور پر قوم یہود تھی جس کا سورۂ مائدہ آیت ۶۰ میں اسی عنوان سے تعارف ہوا ہے۔ وہاں یہودیوں کے بارے میں پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

قل ھل انبئکم بشر من ذالک مثوبۃ عند اللہ من لعنہ اللہ وغضب علیہ ..." کہہ دے کیا تمہیں ان افراد سے باخبر کروں جن کی وضع وکیفیت اس سے زیادہ بُری ہے وہ ایسے لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور انہیں موردِ غضب قرار دیا ہے۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"یہ نہ تم میں سے ہیں اور نہ ان میں سے (یہود) (ما ھم منکم ولا منھم)۔ نہ مشکلات میں اور نہ پریشانیوں میں تمہارے مددگار ہیں نہ ان کے کوئی جگری دوست ہیں بلکہ منافق ہیں جو ہر روز رُخ بدل لیتے ہیں اور ہر روز نئی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں یہ تعبیر سورۂ مائدہ کی آیت ۵۱ کے ساتھ منافات نہیں رکھتی جو کہتی ہے: ومن یتولھم منکم فانہ منھم۔ جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی اور محبت کرے وہ انہی میں سے ہے اس لیے کہ وہ تمہارے دشمنوں میں شمار ہوں گے اگرچہ حقیقتًا ان کا جز شمار نہ ہوں۔

اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "تم سے اپنی وفاداری کو ثابت کرنے کے لیے قسم کھاتے ہیں لیکن جھوٹی قسم جسے وہ خود بھی جانتے ہیں۔ (ویحلفون علی الکذب وھم یعلمون)۔ یہ منافقین کے طور طریقے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے قبیح اور قابلِ نفرت چہرہ کو چھپانے کے لیے جھوٹی قسموں کی پناہ لیتے ہیں جب کہ ان کا عمل ان کا بہترین تعارف کراتا ہے۔ اس کے بعد ان ہٹ دھرم منافقین پر نازل ہونے والے عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"خدا نے ان کے لیے عذابِ شدید تیار کیا ہے"۔ (اعد اللہ لھم عذابًا شدیدًا)۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ عذاب عادلانہ ہے کیونکہ وہ بُرے اعمال بجا لاتے ہیں۔ (انھم ساء ما کانوا یعملون)۔ اس کے بعد ان منافقین کی علامتوں کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے فرماتا ہے:

"اُنہوں نے اپنی قسموں کو سپر بنا رکھا ہے تاکہ لوگوں کو راہِ خدا سے روکے رکھیں" (اتخذوا ایمانھم جنۃ فصدوا عن سبیل اللہ)[3]۔

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

وہ قسم کھاتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور سوائے اصلاح کے ہمارا کوئی مقصد نہیں ہے حالانکہ اس قسم کے پردہ کے پیچھے وہ انواع و اقسام کے فساد، تخریبی کارروائیوں اور سازشوں میں مصروف ہیں اور حقیقت میں خدا کا مقدّس نام لے کر راہِ خدا سے روکنے کا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ جی ہاں! جھوٹی قسمیں کھانا منافقین کی نشانی ہے جو یہاں کے علاوہ سُورۂ منافقین میں بھی ان کے اوصاف کے بیان میں پیش ہوئی ہے۔ (سُورۂ منافقین آیت ۲)

آیت کے آخر میں مزید فرماتا ہے :

"اِس بنا پر ان کے لیے خوار کرنے والا عذاب ہے۔" (فلھم عذاب مھین)۔ وہ چاہتے تھے کہ ان جھوٹی قسموں کے ذریعے اپنے لیے سامانِ عزّت فراہم کریں لیکن خدا انہیں ذلیل و خوار کرنے والے عذاب میں مبتلا کرے گا۔ اس نے پہلے بھی فرمایا ہے:

"ان کے لیے عذاب شدید ہے۔" (اسی سورہ کی آیت ۱۵) اس لیے کہ یہ سچے مؤمنین کے دلوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ دونوں عذاب آخرت سے تعلق رکھتے ہیں اور چونکہ دو مختلف اوصاف کے ساتھ بیان ہوئے ہیں لہٰذا تکرار بھی نہیں ہے کیونکہ عذاب کی تشریح ان دو صفتوں کے ساتھ قرآن مجید میں عام طور پر آخرت کے عذابوں کے سلسلہ میں آتی ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے یہ احتمال تجویز کیا ہے کہ پہلا عذاب دنیا یا قبر سے متعلق ہے اور دُوسرا عذاب آخرت سے مربوط ہے اور چونکہ منافقین عام طور پر حلِ مشکلات کے سلسلہ میں اپنے مال اور اولاد (اقتصادی اور انسانی قوّت) پر انحصار کرتے تھے لہٰذا قرآن بعد والی آیت میں کہتا ہے : "ان کے مال اور اولاد انہیں عذابِ الٰہی سے کسی طرح بھی محفوظ نہیں رکھیں گے۔" (لن تغنی عنھم اموالھم ولا اولادھم من اللہ شیئًا)[۱]۔

بلکہ یہی اموال ان کی گردن میں لعنت کا طوق بن جائیں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب کا سبب بنیں گے، جیسا کہ سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۸۰ میں ہم پڑھتے ہیں : سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیامۃ اور اسی طرح ان کی گمراہ اولاد ان کے عذاب کا باعث ہوگی اور اگر ان کے درمیان مومن اور نیکو کار افراد ہوں تو وہ ان سے بیزاری اختیار کرتے ہیں۔ جی ہاں قیامت کا دن ایسا دن ہے کہ جس میں خدا کی (رحمت) کے علاوہ کوئی پناہ گاہ نہیں ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ بیکار ہو جائے گا جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۶۶ میں ہم پڑھتے ہیں : (و تقطعت بھم الاسباب)۔ "ان کا ہاتھ ہر قسم کے ذریعے اور اسباب سے منقطع ہو جائے گا۔" اور پھر آیت کے آخر میں اس جملہ کے ساتھ تہدید کرتا ہے۔ "وہ اصحابِ دوزخ ہیں اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔" (اولٰئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون)۔ اور اس طرح ان پر نازل ہونے والے عذاب کو کبھی شدید کہہ کر باعثِ تہدید بناتا ہے اور کبھی "مھین" ذلیل کرنے والا کہہ کر اور کبھی اس کا جاودانی ہونا باعثِ تہدید ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک منافقین کے اعمال کی وجہ سے مناسب حال ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ منافقین قیامت میں بھی اپنی منافقت سے دست بردار نہیں ہوں گے جیسا کہ بعد والی آیت میں آیا ہے "یاد کرو اس دن کو جس میں خدا ان سب کو مبعوث کرے گا اور ان کے اعمال ان کے سامنے پیش کرے گا اور اپنی دادگاہِ عدل میں ان سے سوال کرے گا لیکن وہ خدا کے سامنے بھی جھوٹی قسمیں کھائیں گے جیسی کہ وہ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں۔ (یوم یبعثھم اللہ

(حاشیہ گزشتہ صفحہ)

[۱] جنّۃ اصل میں "جن" (بروزن فن) کے مادہ سے کسی چیز کے چھپانے کے معنی میں ہے اور چونکہ ڈھال انسان کو دشمن کی ضربوں کے مقابلہ میں چھپاتی ہے لہٰذا اسے جنّۃ، مجن اور مجنہ کہتے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا)

[۱] بعض مفسرین نے یہاں لفظ عذاب کو مقدر سمجھا ہے اور کہا ہے کہ مراد من عذاب اللہ ہے (قرطبی، رُوح البیان، کشاف) لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ آیت میں کوئی چیز مقدر نہ ہو اور من اللہ سے مراد یہ ہے کہ وہ خدا کے علاوہ کوئی دوسری پناہ گاہ نہیں پائیں گے۔

جمیعًا فیحلفون لہ کما یحلفون لکم)۔[1]

قیامت انسان کے اس دنیا کے اعمال اور نیتوں کی تجلی گاہ ہے اور چونکہ منافقین یہی احساسات اپنے ساتھ قبر اور برزخ میں لے کر جائیں گے لہٰذا میدانِ قیامت میں بھی آشکار ہوں گے اور باوجودیکہ وہ جانتے ہیں کہ خدا علاّم الغیوب ہے اور کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے لیکن پھر بھی بُرائی عادات کی بنا پر جھوٹی قسمیں کھائیں گے ۔ یہ چیز اس وادگاہِ عدلِ الٰہی کے بعض مواقف میں ان کے گناہوں کے اقرار کے ساتھ متصادم نہیں ہے کیونکہ قیامت کے مختلف منازل و مواقف میں ہر جگہ ایک الگ انضباط اوقات ہے ۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے :

" وہ گمان کرتے ہیں کہ ان جھوٹی قسموں سے وہ اپنے لیے کوئی نفع حاصل کرسکتے ہیں یا کسی نقصان کو دُور کرسکتے ہیں (و یحسبون انھم علی شیء)۔ یہ ایک واہمہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ۔لیکن چونکہ دنیا میں انہوں نے یہ عادت بنا رکھی تھی کہ جھوٹی قسموں کے ذریعہ خطروں اور مضر چیزوں کو اپنے سے دُور کریں اور فائدہ حاصل کریں لہٰذا یہ قبیح اور پست و پُختہ عادتیں وہاں بھی اپنا اثر دکھائیں گی ۔ آخر کار آیت کو اس جملہ پر ختم کرتا ہے :" جان لو کہ وہ جھوٹے ہیں " (الا انھم ھم الکاذبون)۔ یہ اعلان ممکن ہے کہ دنیا کے ساتھ تعلق رکھتا ہو یا قیامت سے مربوط ہو یا دونوں کے ساتھ ربط رکھتا ہو ۔ اس طرح ان کی رسوائی کا ڈنکا ہر جگہ بج رہا ہے اور ہر جگہ منادی ہو رہی ہے ۔آخری زیرِ بحث آیت میں ان تاریک دل رکھنے والے منافقین کی حقیقی سرگزشت کو اس طرح بیان کرتا ہے : " شیطان ان پر مسلط ہوگیا ہے اور تیزی کے ساتھ ہانکتا ہے اور اس بنا پر ان کے دل سے خدا کی یاد نکال کرلے گیا ہے (استحوذ علیھم الشیطان فانساھم ذکر اللہ)۔

اسی دلیل کی رُو سے "وہ گروہ شیطان ہیں" (اولئك حزب الشیطان)۔

آگاہ رہو کہ گروہ شیطان ہی گھاٹا اُٹھانے والوں میں ہے"۔ (الا ان حزب الشیطان ھم الخاسرون)۔

"استحوذ" "حوذ" (بروزن "موز") کے مادہ سے ہے اور اُونٹ کی ران کے پُشت والے حصّہ کے معنی میں ہے اور چونکہ ساربان اُونٹوں کو ہنکاتے وقت ان کی رانوں کی پُشت پر ضرب لگاتا ہے اس لیے یہ لفظ تسلّط حاصل کرنے اور تیزی کے ساتھ ہانکنے کے لیے آتا ہے ۔

جی ہاں! جھوٹے اور مغرور منافقین باوجود مال و دولت اور مقام و منزلت کے اس کے علاوہ اور کوئی قسمت نہیں رکھتے کہ وہ شیطان کی گرفت اور اس کی خواہشات کے اختیار میں ہوتے ہیں اور وہ خدا کو کُلی طور پر بُھول جاتے ہیں اور نہ صرف خُدا سے منحرف ہو جاتے ہیں، بلکہ شیطان کے عُمّال ، انصار ، مددگار اور لشکر کے زمرہ میں آکر دوسروں کو گمراہ کرنے والے قرار پاتے ہیں ۔

حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام فتنوں اور اختلافات کے وقوع کے آغاز کے بارے میں فرماتے ہیں :

(ایھا الناس انما بدأ وقوع الفتن اھواء تتبع و احکام تبتدع یخالف فیھا کتاب اللہ، یتولی فیھا رجال رجالا، فلو ان الباطل خلص لم یخف علی ذی حجی، ولو ان الحق خلص لم یکن اختلاف، ولکن یؤخذ من ھذا ضغث ومن ھذا ضغث، فیمزجان فیجیئان معًا فھنالك استحوذ الشیطان علی اولیائه ونجی الذین سبقت لھم من اللہ الحسنی)۔

"اے لوگو! فتنوں کے وقوع کا آغاز باطل آراء ہیں جن کی پیروی کی جاتی ہے اور ایسی بدعتیں ہیں جو حکمِ خدا کے خلاف قائم کی جاتی ہیں ۔ لوگوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کی دوستی میں ان

---

[1] "یوم" ظرف ہے اور "اذکر" محذوف سے متعلق ہے یا اس کے ماقبل یعنی لھم عذاب مھین سے یا اولئك اصحاب النار سے متعلق ہے ۔ لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے ۔

امور میں ان کی پیروی اختیار کرتا ہے۔ اگر باطل اپنی خالص شکل میں خود نمائی کرتا تو کسی صاحب عقل کی نگاہ سے پنہاں نہ رہتا اور اگر حق، باطل کی آمیزش سے پاک و صاف ہوتا تو اختلاف پیدا نہ ہوتا لیکن کچھ حصہ اس کا لے لیتے ہیں اور کچھ حصہ اس کا اور انہیں آپس میں ملا دیتے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے کہ شیطان اپنے دوستوں پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے اور وہ لوگ جن کے توفیق الٰہی شامل حال ہے وہ رہائی پا جاتے ہیں۔" [۱]

یہی تفسیر امام حسین علیہ السلام کے کلام میں کربلا میں نظر آتی ہے۔ جس وقت اہل کوفہ کی صفوں کو اندھیری رات اور غل مچاتے ہوئے سیل آب کی طرح اپنے مدِمقابل دیکھا تو فرمایا:

"بہت بُرے لوگ ہو کہ خدا کی اطاعت اور پیغمبرؐ پر ایمان کا اظہار کرتے ہو لیکن اب اس لیے آئے ہو کہ اولادِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرو۔"

(لقد استحوذ علیکم الشیطان فانساکم ذکر اللّٰہ العظیم) شیطان نے تم پر غلبہ حاصل کر لیا ہے وہ خدائے عظیم کی یاد تمہارے دلوں سے نکال کر لے گیا ہے اس کے بعد آپؑ نے فرمایا:

"تم کو اور جو کچھ تم چاہتے ہو خدا نیست و نابود کر دے انّا للّٰہ وانّا الیہ راجعونؑ" [۲]

حزب الشیطٰن اور حزب اللہ کے بارے میں انشاء اللہ آئندہ آیات کے ذیل میں ہم تفصیلی بحث کریں گے۔

---

[۱] اصول کافی مطابق نقل تفسیر نورالثقلین جلد ۵ ص ۲۶۷

[۲] تفسیر نورالثقلین جلد ۵ ص ۲۶۶

۲۰۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحَآدُّوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗۤ اُولٰٓئِکَ فِی الۡاَذَلِّیۡنَ ۝

۲۱۔ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ۝

۲۲۔ لَا تَجِدُ قَوۡمًا یُّؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ یُوَآدُّوۡنَ مَنۡ
حَآدَّ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ لَوۡ کَانُوۡۤا اٰبَآءَہُمۡ اَوۡ اَبۡنَآءَہُمۡ
اَوۡ اِخۡوَانَہُمۡ اَوۡ عَشِیۡرَتَہُمۡ ؕ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ
الۡاِیۡمَانَ وَ اَیَّدَہُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡہُ ؕ وَ یُدۡخِلُہُمۡ جَنّٰتٍ
تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ
وَ رَضُوۡا عَنۡہُ ؕ اُولٰٓئِکَ حِزۡبُ اللّٰہِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ اللّٰہِ ہُمُ
الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۝

ترجمہ

۲۰۔ وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسولؐ سے دشمنی کرتے ہیں وہ ذلیل ترین افراد کے زمرہ میں ہیں۔

۲۱۔ خدا نے اس طرح مقرر کر رکھا تھا کہ مَیں اور میرے رسولؐ کامیاب ہوں گے کیونکہ خدا قوی اور
ناقابلِ شکست ہے۔

۲۲۔ کسی ایسی قوم کو تو نہیں پائے گا جو خدا اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتی ہو اور وہ خدا اور اس کے

رسولؐ کے دشمنوں کے ساتھ دوستی کرے خواہ وہ ان کے آباؤ اجداد، اولاد، بھائی اور رشتہ دار کیوں نہ ہوں وہ ایسے لوگ ہیں جن کے صفحۂ دل پر ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک رُوح کے ذریعے ان کی تقویت فرمائی ہے۔ انہیں جنت کے باغوں میں داخل کرے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ خدا ان سے خوش ہے اور وہ خدا سے خوش ہیں۔ وہ اللہ کا حزب ہیں۔ جان لو کہ اللہ کا حزب ہی کامیاب ہے۔

تفسیر

حزب اللہ کامیاب ہے

گزشتہ آیات میں گفتگو منافقین اور دشمنانِ خدا کے بارے میں اور ان کی کچھ صفات اور علامتوں سے متعلق تھی۔ اس بحث کو جاری رکھتے ہوئے ان آیتوں میں جو سورۂ مجادلہ کی آخری آیات ہیں ان کی کچھ اور نشانیاں پیش کرتا ہے اور ان کی حتمی سرنوشت جو شکست و بربادی ہے اسے واضح کرتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

"وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دُشمنی کرتے ہیں وہ ذلیل ترین افراد کے زمرہ میں ہیں"۔

(ان الّذین یحادون اللہ ورسولہ اولٰئک فی الاذلین)[1]

بعد والی آیت حقیقت میں ان معانی کی دلیل ہے فرماتا ہے:

"خدا نے اس طرح مقرر کیا تھا کہ میں اور میرے پیغمبر ہی کامیاب ہوں گے"۔ (کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی)۔ "ایسا کیوں نہ ہو اس لیے کہ خدا قوی اور ناقابلِ شکست ہے"۔ (ان اللہ قوی عزیز)۔ جس قدر خدا صاحبِ قوت ہے اتنے ہی اس کے دشمن کمزور اور ذلیل ہیں اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ گزشتہ آیت میں (اذلین) کی تعبیر آئی ہے تو اس کی وجہ یہی تھی "کتب" (لکھا ہے) کی تعبیر اس کامیابی کے قطعی ہونے کی تاکید ہے اور لاغلبن کا جملہ لام تاکید اور نون ثقیلہ کے ساتھ اس کامیابی کے موکد ہونے کی دلیل ہے اس طرح کہ کسی شخص کے لیے کسی قسم کے شک اور تردّد کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ اس چیز کے مشابہ ہے جو سورۂ صافات کی آیت ۱۷۱ تا ۱۷۳ میں آئی ہے۔ (ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین انھم لھم المنصورون وان جندنا لھم الغالبون)

"ہمارا قطعی وعدہ ہمارے مُرسل بندوں کے بارے میں پہلے سے مُسلّم ہو چکا ہے کہ ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر تمام میدانوں

---

[1] "یحادون" "محادہ" کے مادہ سے مسلح یا غیر مسلح مبارزہ کے معنی میں ہے یا ممانعت کے معنی میں ہے۔ (ہم اس سورہ کی آیت ۵ کے ذیل میں وضاحت کر چکے ہیں)

ہیں کامیاب ہے۔"

تاریخ کے طویل دَور میں خدا کے پیغمبروں اور اس کے بھیجے ہوئے افراد کی کامیابی مختلف صُورتوں میں نمایاں ہوئی ہے۔ مختلف عذابوں کی صُورت میں مثلاً طوفانِ نوحؑ میں، صاعقۂ عاد و ثمود میں، قومِ لُوطؑ کو تباہ و برباد کرنے والے زلزلے کی صُورت میں اور اسی قسم کی چیزوں میں، مختلف جنگوں میں مثلاً جنگ بدر و حنین، فتح مکہ اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باقی غزوات میں۔ ان سب سے زیادہ اہم شیطانی مکاتبِ فکر اور حق و عدالت کے دُشمنوں پر ان کی منطقی کامیابی تھی۔ یہاں ان لوگوں کے سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ وعدہ قطعی تھا تو پھر کیوں بہت سے انبیا و مرسلین، آئمہ معصومینؑ اور سچّے مومنین کو ان کے دشمنوں نے شہید کیا اور وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ ان اعتراض کرنے والوں نے حقیقت میں کامیابی کے معنی کو صحیح طرح نہیں سمجھا۔ مثلاً ممکن ہے (تصوّر کریں) کہ امام حسین علیہ السلام نے کربلا میں شکست کھائی اس لیے کہ آپؑ خُود اور آپؑ کے یاور و انصار تمام کے تمام شہید ہو گئے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آپؑ اپنے اصلی مقصد تک پہنچ گئے۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ بنی اُمیّہ رسوا ہوں اور مکتبِ آزادی کی بُنیاد رکھی جائے اور ساری دنیا کے لوگوں کو درسِ آزادی دیا جائے۔ آپؑ نے یہ مقصد یقیناً حاصل کیا اور آپ آج بھی سرورِ شہیدانِ عالم اور جہانِ انسانیت کے رہبرِ کامل کی حیثیت سے انسانوں کے ایک عظیم طبقہ کے دِلوں پر کامیابی کے ساتھ حکومت کر رہے ہیں۔[1]

اس چیز کی یاد آوری بھی ضروری ہے کہ یہی حکم یعنی خدائی وعدہ کے مطابق کامیابی انبیاؑ و اولیاؑ کے پیروکاروں کے بارے میں بھی ثابت ہے یعنی ان کی کامیابی کی بھی خُدا کی طرف سے ضمانت دی گئی ہے جیسا کہ سُورۂ مؤمن کی آیت ۵۱ میں ہم پڑھتے ہیں۔ (انّا لننصر رسلنا والّذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا و یوم یقوم الاشھاد) ہم یقیناً اپنے رُسولوں کی اور ایمان لانے والوں کی زندگیِ دُنیا میں اور اس دن جب گواہ قیام کریں گے (قیامت کے دن) مدد کریں گے۔ یقیناً خدا جس کی مدد کرے وہ کامیاب ہے۔ لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ خدا کا یہ حتمی وعدہ قید اور شرط کے بغیر نہیں ہے۔ اس کی شرط ایمان اور آثارِ ایمان ہیں اس کی شرط یہ ہے کہ بندہ سُستی و کمزوری کو اپنے اندر پیدا نہ ہونے دے اور مشکلات سے نہ گھبرائے اور غمگین نہ ہو جیسا کہ آلِ عمران کی آیت ۱۳۹ میں فرماتا ہے :

(ولا تھنوا ولا تحزنوا و انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین) اس کی دوسری شرط یہ ہے کہ تغیّرات کو اپنی ذات سے شروع کرے کیونکہ خدا کسی قوم و ملّت کی نعمتوں کو متغیّر نہیں کرتا جب تک کہ وہ خود اپنے اندر تغیّر پیدا نہ کریں۔ (ذالک بان اللہ لم یک مغیرًا نعمۃ انعمھا علٰی قوم حتّٰی یغیّروا مابانفسھم) (انفال ۵۳) انہیں خدا کی رسّی کو مضبُوطی سے پکڑے رہنا چاہیئے۔ انہیں چاہیئے کہ اپنی صفوں کو متحد رکھیں اور اپنی قوّتوں کو مجتمع کریں، نیّتوں کو خالص رکھیں اور مطمئن رہیں کہ دشمن خواہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو اور وہ خُود بظاہر کمزور ہوں اور تعداد میں کم ہوں لیکن آخر کار جہاد، کوشش اور خدا پر توکّل کی وجہ سے وہ کامیاب ہوں گے۔ مفسرین کی ایک جماعت نے مندرجہ بالا آیت کے لیے ایک شانِ نزول بیان کی ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے ایک گروہ نے جس وقت حجاز کی بعض آبادیوں کی فتح کو دیکھا تو انہوں نے کہا کہ خدا عنقریب ہمیں روم و ایران کی فتح بھی نصیب کرے گا اس پر منافقین نے کہا کہ تم سمجھتے ہو کہ ایران و روم بھی ان بستیوں کی مانند ہیں جنہیں تم نے فتح کر لیا ہے اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس کامیابی کا الٰہی وعدہ کیا۔ آخری زیرِ بحث آیت جو سُورہ مجادلہ کی آخری اور آیاتِ قرآنی میں سب سے زیادہ سرکوبی کرنے والی آیت ہے مؤمنین کو باخبر کرتی ہے کہ "خدا کی محبت"

[1] اس سلسلہ میں مزید وضاحت کے لیے اسی تفسیر کی جلد ۱۰ سُورہ صافات کی آیت ۱۷۱ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

اور" دُشمنانِ خدا کی محبت " کو ایک ہی دل میں جمع کرنا ممکن نہیں ہے لہٰذا وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کریں ۔ اگر واقعی وہ مومن ہیں تو انہیں دُشمنانِ خدا کی دوستی سے پرہیز کرنا چاہیئے ورنہ وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ نہ کریں۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے :

"کسی ایسے گروہ کو جو خدا اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہو تو نہیں پائے گا کہ وہ خدا اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے دوستی کریں چاہے وہ ان کے آباؤ اجداد ، اولاد یا رشتہ دار ہوں" (لا تجد قومًا یؤمنون باللّٰه والیوم الاٰخر یوادون من حاداللّٰه ورسوله ولوکانوا اٰبائهم او ابنائهم او اخوانهم او عشیرتهم)۔ جی ہاں! ایک دل میں دو متضاد محبتیں جمع نہیں ہوسکتیں اور جو دو متضاد محبتوں کے حامل ہوں وہ یا تو ضعیف الایمان ہوتے ہیں یا پھر منافق ہوتے ہیں اِسی لیے غزواتِ الٰہی میں ہم دیکھتے ہیں کہ مخالف صفوں میں مسلمانوں کے عزیز و اقارب کی ایک جماعت تھی لیکن چونکہ اُنہوں نے اپنا رشتہ خدا سے توڑ رکھا تھا اور وہ حق تعالیٰ کے دُشمنوں کی صف سے وابستہ تھے لہٰذا مسلمانوں نے ان سے جنگ کی یہاں تک کہ ان میں سے بہت سوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ آباؤ اجداد ، اولاد اور رشتہ داروں کی محبت بہت اچھی چیز ہے اور انسان کے جذبۂ کرم کے زندہ ہونے کی نشانی ہے لیکن جب اس محبت کا مقابلہ خدا کی محبت سے ہو تو پھر یہ محبت اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتی ہے ۔ البتہ انسان کے مرکزِ محبت صرف یہی چار گروہ نہیں ہوتے جن کا ذکر مذکورہ آیت میں ہوا ۔ یہ انسان کے نزدیک ترین افراد ہیں اور ان کی مثال کو پیشِ نظر رکھ کر باقی افراد کی کیفیت بھی واضح ہو جائے گی۔ اسی لیے زیرِ بحث آیت میں گفتگو بیوی، شوہر ، مال و دولت ، تجارت اور گھروں کے متعلق ، جو مرکزِ محبت ہوسکتے ہیں، درمیان میں نہیں آئی۔ جب کہ سُورہ توبہ کی آیت ۲۴ میں یہ سب امور موردِ توجہ قرار پائے ہیں خدا فرماتا ہے :

(قل ان کان اٰبائکم و ابنائکم و اخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم و اموال اقترفتموها و تجارة تخشون کسادها و مساکن ترضونها احب الیکم من اللّٰه و رسوله وجهاد فی سبیله فتربصوا حتّٰی یأتی اللّٰه بامره واللّٰه لا یهدی القوم الفاسقین) "کہہ دے اگر تمہارے باپ دادا ، اولاد ، بھائی اور قبیلہ اور وہ مال جو تمہارے ہاتھ لگے ہیں اور وُہ تجارت جس کے نقصان کا تمہیں خطرہ ہے اور وہ گھر جن سے تمہارا دلی تعلق ہے خدا اس کے پیغمبر اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر اس انتظار میں رہو کہ خدا اپنا عذاب تم پر نازل کر دے اور خدا نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔"

دُوسرے امور کے زیرِ بحث آیت میں مذکور نہ ہونے کی دوسری دلیل ممکن ہے وہ شان ہائے نزول ہوں جو آیت کے لیے بیان ہوئی ہیں۔ منجملہ دوسری شان ہائے نزول کے ایک یہ ہے کہ "حاطبؓ ابن ابی بلتعہ" نے اہلِ مکّہ کو خط لکھا اور انہیں خبردار کیا کہ ہوسکتا ہے رسولِ خدا فتح مکہ کے لیے روانہ ہوں۔ جب یہ بات کھُلی ، تو حاطب نے عُذر پیش کیا کہ میرے عزیز و اقارب مکّہ میں کفار کے چنگل میں ہیں۔ مَیں نے چاہا کہ اہلِ مکّہ کی خدمت کروں تاکہ میرے عزیز امان میں رہیں۔[1]

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت عبداللہ ابن ابی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس کا بیٹا صاحبِ ایمان تھا۔ اس نے ایک دن دیکھا کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پانی نوش فرما رہے ہیں تو اس نے عرض کیا کہ تھوڑا سا پانی اس برتن میں رہنے دیجئے تاکہ میں وہ اپنے باپ کو پلاؤں شاید خدا اس کے دل کو پاک کر دے۔ مختصر یہ کہ وہ جس وقت پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیئے ہوئے پانی میں سے بچا ہوا پانی اپنے باپ کے پاس لے کر پہنچا تو اس نے وہ پانی پینے سے انکار کر دیا اور نہ صرف یہ بلکہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق

[1] مجمع البیان، جلد ۹ ص ۲۵۵

ایک بہت ہی توہین آمیز جملہ کہا۔ اس کا بیٹا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس نے اپنے باپ کے قتل کرنے کی اجازت طلب کی. پیغمبرؐ نے اجازت نہ دی اور فرمایا اس کا لحاظ کرو لیکن دل میں اس کے اعمال سے بیزار رہو۔

اس کے بعد پروردگارِ عالم اس گروہ کے عظیم اجر کو پیش کرتا ہے جس کے دل مکمل طور پر عشقِ خدا کے قبضہ میں ہیں اور پانچ موضوعات کو بیان کرتا ہے جن میں سے بعض امداد اور توفیق کی شکل میں ہیں اور بعض نتیجے اور انجامِ کار کی صورت میں۔ پہلے اور دوسرے حصہ کے سلسلہ میں فرماتا ہے: "وہ ایسے لوگ ہیں کہ خدا نے ایمان کا خط ان کے دلوں کے صفحے پر کھینچ دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح کے ذریعے ان کو تقویت پہنچائی ہے"۔ (اولئك كتب فی قلوبهم الايمان وايدهم بروح منه)۔ واضح رہے کہ یہ امداد اور لطفِ الٰہی انسان کے ارادہ واختیار کی آزادی کی روح سے متصادم نہیں ہوتے کیونکہ پہلے قدم، یعنی دشمنان کی محبت کو ترک کرنا، خود انہی کی طرف سے اُٹھائے گئے ہیں۔ اِس کے بعد خدا کی طرف سے امداد "استقرارِ ایمان" کی شکل میں ان کی جانب آئی ہے۔

کیا یہ روحِ الٰہی جس سے خدا مومنین کی تائید کرتا ہے ایمان کی بنیادوں کی تقویت ہے یا عقلی دلائل ہیں یا قرآن ہے یا وہ خدا کا عظیم فرشتہ ہے جس کا نام روح ہے؟ اس سلسلے میں مختلف تفسیریں اور احتمالات بیان ہوتے ہیں اور ان سب کا اجتماع بھی ممکن ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ یہ روح ایک طرح کی جدید حیاتِ معنوی ہے جس کا فیضان خدا مومنین پر کرتا ہے۔ تیسرے مرحلہ میں فرماتا ہے:

"خدا انہیں جنّت کے باغات میں داخل کرے گا جن کے درختوں اور محلوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے"۔ (و يدخلهم جنّات تجری من تحتها الانهار خالدين فيها)۔ چوتھے مرحلے میں اضافہ کرتا ہے:

"خدا اُن سے راضی اور خوش ہے اور وہ خدا سے راضی وخوش ہیں"؛ (رضی الله عنهم و رضوا عنه)۔ قیامت کے مادّی انعامات یعنی حور وقصور کے مقابلے میں یہ عظیم ترین روحانی اجر ہے جو مومنین کے اس گروہ کو دیا جائے گا۔ یہ گروہ احساس کرے گا کہ خدا ان سے راضی ہے۔ ان کے معبود کی یہ رضامندی کہ اس نے انہیں قبول کر لیا ہے اور اپنی عنایت سے انہیں نوازا ہے اور اپنی بساطِ قرب پر انہیں بٹھایا ہے بہترین لطف دینے والا احساس ہے جو انہیں حاصل ہوگا اور اس کا نتیجہ خدا سے ان کی مکمل خوشنودی ہے۔ جی ہاں کوئی نعمت اس دوہری نعمت کے برابر نہیں ہے۔ اور یہ دوسری نعمتوں کی کلید ہے اس لیے کہ جب خدا کسی سے خوش ہو تو جو وہ طلب کرے گا خدا اسے دے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ کریم بھی ہے اور قادر وتوانا بھی۔ کیا ہی عمدہ تعبیر ہے۔ فرماتا ہے:

"خدا بھی ان سے راضی ہے اور وہ بھی خدا سے راضی ہیں"۔ یعنی ان کا مقام اس قدر اونچا ہو گیا ہے کہ ان کا نام خدا کے نام کے ساتھ اور ان کی رضامندی خدا کی رضا کے پہلو بہ پہلو قرار پائی ہے۔ آخری مرحلہ میں ایک ایسے عمومی اعلان کی شکل میں، جو ایک اور نعمت کی ترجمانی کرتا ہے، فرماتا ہے:

"وہ اللہ کی جماعت ہیں اور جان لو کہ اللہ کی جماعت ہی کامیاب ہے"۔ (اولئك حزب الله الا ان حزب الله هم المفلحون)۔ نہ صرف انہیں دوسرے جہان میں کامیابی اور قیامت میں انواع واقسام کی مادّی ومعنوی نعمتیں حاصل ہوں گی بلکہ جیسا کہ گزشتہ آیات میں بھی آیا ہے وہ اس دنیا میں بھی اللہ کی مہربانی سے دشمنوں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کریں گے اور اس دنیا کے اختتام پر بھی حق و عدالت کی حکومت ان کے قبضہ میں ہوگی۔

چند نکات

۱۔ حزبُ اللہ اور حزبِ شیطان کی اصل نشانی

قرآن مجید کی دو آیتوں میں حزب اللہ کی طرف اشارہ ہوا ہے (زیر بحث آیت اور سُورۂ مائدہ کی آیت ۵۶) اور ایک آیت میں حزب شیطان کی طرف اشارہ ہے۔ دونوں مواقع جن پر حزب اللہ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے (حُب فی اللہ اور بُغض فی اللہ) اور اولیائے حق کی ولایت کے مسئلہ پر انحصار کرتا ہے۔ سُورہ مائدہ میں مسئلہ ولایت اور خدا و رسولؐ کی اطاعت کے وجوب کی بات کرتا ہے جس میں مذکور ہے کہ (علیؑ) نے حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دی ہے۔ (ومن یتول اللہ و رسولہ والذین اٰمنوا فان حزب اللہ ھم الغالبون)۔ زیر بحث آیت میں بھی دُشمنانِ خدا کی دوستی سے قطع روابط پر تکیہ کرتا ہے۔ اس بنا پر حزب اللہ کا خط وہی خطِ ولایت ہے اور خدا، پیغمبرؐ اور اس کے اوصیا کے دُشمنوں سے قطع تعلق کا خط ہے۔
اس کے مقابلے میں حزبِ شیطان کے تعارف کے وقت جس کی طرف اس سورہ کی گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے اس کی جو واضح ترین نشانیاں بتائی ہیں وہ نفاق، حق سے دُشمنی، یادِ خدا کی فراموشی، جھوٹ اور فریب ہیں۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ ایک موقع پر کہتا ہے: (فان حزب اللہ ھم الغالبون) اور دُوسری جگہ فرماتا ہے: (الا ان حزب اللہ ھم المفلحون) اس طرف توجہ کرنے سے کہ فلاح بھی دشمن کے مقابلہ میں کامیابی اور ان پر غلبہ کے ہمراہ ہے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ دونوں آیتوں کا مفہوم ایک مربوط صورت میں اس امر کے ساتھ ظاہر ہے کہ فلاح و رستگاری غلبہ وکامیابی کی نسبت زیادہ گہرا مفہوم رکھتی ہے، اس لیے کہ وہ مقصد تک پہنچنے کو بھی مشخص کرتی ہے۔ اس کے برعکس حزبِ شیطان کا تذکرہ اس کی شکست، اس کے نقصان اور مقاصد میں ناکامی کے حوالے سے کرتا ہے۔ مسئلہ ولایت، ولایت خاص معانی میں اور "حب فی اللہ اور بغض فی اللہ" عام معانی میں، ایک ایسا مسئلہ ہے کہ روایاتِ اسلامی میں اس کی بہت تاکید ملتی ہے۔ یہاں تک کہ حضرت سلمان فارسیؓ امیرالمومنینؑ سے عرض کرتے ہیں کہ جب بھی میں پیغمبرؐ کی خدمت میں گیا تو انہوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر آپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"کہ اے سلمان! یہ شخص اور اس کا گروہ کامیاب ہے۔ (یا ابا الحسن ما اطلعت علی رسول اللہ الاضرب بین کتفی وقال یا سلمان ھذا و حزبہ ھم المفلحون)[1]

دوسرے مورد میں یعنی ولایت عامہ کے سلسلہ میں ایک حدیث پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہمیں ملتی ہے:

(ود المؤمن للمؤمن فی اللہ من اعظم شعب الایمان)

ایک مومن کی دُوسرے مومن سے برائے خدا خوشنودی اہم ترین شعبۂ ایمان ہے۔[2]

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰؑ پر وحی کی کہ کیا کوئی عمل میرے لیے بھی انجام دیا ہے۔ عرض کیا: جی ہاں میں نے تیرے لیے نماز پڑھی ہے، روزہ رکھا ہے انفاق کیا ہے اور تجھے یاد کرتا رہا ہوں۔ فرمایا:

نماز تیرے لیے حق کی نشانی تھی۔ روزہ جہنم کی آگ کے مقابلہ میں سپر تھا۔ انفاق محشر کے لیے سایہ ہے اور ذکر نور ہے اے موسیٰ میرے لیے تم نے کونسا عمل کیا ہے؟

---

[1] یہ حدیث تفسیر برہان میں اہلِ سنّت کی کتب سے نقل ہوئی ہے۔ (برہان جلد ۴ ص ۳۲۱)

[2] اصول کافی جلد ۲ باب حب فی اللہ حدیث ۳۔

عرض کیا خداوندا ! خود تو اس سلسلہ میں میری رہنمائی فرما۔ فرمایا :

(ھل والیت لی ولیا وھل عادیت لی عدوا قط فعلم موسیٰ ان افضل الاعمال الحبّ فی اللہ والبغض فی اللہ)

کبھی میرے لیے کسی سے محبت کی ہے اور میری خاطر کسی سے دشمنی کی ہے یہ وہ مقام تھا کہ حضرت موسیٰ سمجھ گئے کہ افضل ترین عمل حب فی اللہ اور بغض فی اللہ ہے۔ اللہ کے لیے دوستی اور اللہ کے لیے دشمنی۔[1]

ایک حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

(لایمحض رجل الایمان باللہ حتّٰی یکون اللہ احب الیہ من نفسہ وابیہ وامہ وولدہ واھلہ ومالہ ومن الناس کلھم)

"کسی شخص کا اللہ پر ایمان کامل نہیں ہوتا تاوقتیکہ خدا اس کو اس کی جان، اس کے ماں باپ، اولاد، اہل خانہ اور اس کے مال سے زیادہ محبوب نہ ہو۔"[2]

اس عنوان کے ماتحت اثبات کی سمت بھی یعنی دوستانِ خدا سے دوستی اور نفی کی سمت میں بھی دوستانِ خدا سے دشمنی سے روایات بہت زیادہ ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم اس گفتگو کو امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک پُرمعنی حدیث پر ختم کردیں۔ آپؑ نے فرمایا ہے :

(اذا اردت ان تعلم ان فیك خیرا فانظر الی قلبك فان کان یحب اھل طاعۃ اللہ عزّوجل و یبغض اھل معصیتہ ففیك خیر واللہ یحبك واذا کان یبغض اھل طاعۃ اللہ و یحب اھل معصیتہ لیس فیك خیر واللہ یبغضك والمرء مع من احب)۔

اگر یہ جاننا چاہو کہ تم ایک اچھے انسان ہو تو اپنے دل میں جھانک کر دیکھو اگر وہ اللہ کی اطاعت کرنے والوں کو دوست اور اس کے نافرمانوں کو دشمن رکھتا ہے تو جان لو کہ تم اچھے انسان ہو اور خدا بھی تمہیں دوست رکھتا ہے اور اگر تمہارا دل خدا کی اطاعت کرنے والوں کو دشمن اور اس کی معصیت کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے تو پھر تم میں کوئی خوبی نہیں اور خدا تم سے دشمنی رکھتا ہے اور انسان ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا ہے جسے وہ دوست رکھتا ہے۔[3]

۲۔ حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کا اُجر

جیسا کہ ہم نے مندرجہ بالا آیات میں دیکھا ہے کہ خدا نے ان لوگوں کے لیے، جو اس کے عشق کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے ہیں اور ہر تعلق کو اس سے لگاؤ کے ماتحت قرار دیتے ہیں، اس کے دوستوں کو دوست اور اس کے دشمنوں کو دشمن قرار دیتے ہیں، پانچ عظیم اجر مقرر کیے ہیں جن میں سے تین اُجر تو اسی دُنیا میں عطا کرتا ہے اور دو اُجر قیامت میں عطا فرمائے گا۔ اس جہان کی پہلی نعمت ایمان کا ان کے دلوں میں قرار

[1] و [2] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۲۰۱۔

[3] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۲۰۱

ثبات ہے۔ خدا ان کے دلوں میں ایمان کا نقش اس طرح مرتسم کرتا ہے کہ حوادث کے ہاتھ اور زندگی کے طوفان اسے محو نہیں کر سکتے اور، قطع نظر اس سے ایک نئی رُوح سے ان کو تقویت دیتا ہے اور تیسرے یہ کہ انہیں اپنے حزب میں شمار کرتا ہے اور دُشمنوں کے مقابلہ میں کامیابی عطا کرتا ہے۔ آخرت میں بہشتِ جاوداں اپنی تمام نعمتوں کے ہمراہ ان کے اختیار میں دے دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی مطلق خوشنودی و رضا کا اعلان کرتا ہے۔ ایک حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے :

(مامن مؤمن الّا ولقلبه اذنان فی جوفه اذن ينفث فيها الوسواس الخناس و اذن ينفث فيها الملك فيؤيد الله المؤمن بالملك فذالك قوله و ايدهم بروح منه)

ہر مومن کے دل کے دو کان ہیں ایک وہ جس میں " وسواس خناس " پھونک مارتا ہے اور دوسرے کان میں ملک پھونک مارتا ہے۔ خدا مومن کو فرشتے کے ذریعہ تقویت دیتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق فرماتا ہے : (وايدهم بروح منه)[۱]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام کی تفسیر کے سلسلہ میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا :

(اذا زنى الرجل فارقه روح الايمان)

جب انسان زنا کرتا ہے تو اس وقت رُوحِ ایمان اس سے جُدا ہو جاتی ہے۔ یہ رُوحِ ایمان وہی ہے جس کے متعلق خدا نے قرآن میں فرمایا ہے : (وايدهم بروح منه)[۲]

مندرجہ بالا احادیث سے رُوحِ ایمان کی وسعت اور رُوحِ انسانی کے اعلیٰ مرتبہ اور شمولِ فرشتہ کے بارے میں وضاحت ہوتی ہے۔ یہ آیات اس حقیقت کو بھی بتاتی ہیں کہ روحِ ایمان کے اس مرتبہ کے ہوتے ہوئے انسان شراب خوری اور اس قسم کے دوسرے گناہوں کا مرتکب نہیں ہوتا۔

خداوندا ! اگر تو ہمیں یہ رُوحِ ایمان عطا کر دے تو اپنے کمزور اور ضعیف بندوں پر تیرا احسانِ عظیم ہوگا۔ اس کے بعد انہیں کوئی غم نہیں رہے گا۔
پروردگارا ! ہمیں اپنے دوستوں کی دوستی اور اپنے دشمنوں کی دشمنی کی توفیق عطا فرما اور اپنے دشمنوں کی دوستی اور دوستوں کی دُشمنی سے محفوظ فرما۔
بارالہا ! تُو نے سچے مؤمنین سے کامیابی کا وعدہ کیا ہے اور انہیں حزب اللہ شمار کیا ہے۔ ہمیں اس حزب میں داخل ہونے کی اجازت مرحمت فرما اور اپنی کامیابی ہمارے شاملِ حال فرما (آمین یا ربّ العالمین)

سُورۂ مجادلہ کا اختتام
جمعہ ۸ ، شعبان ۱۴۰۶ھ

اختتام ترجمہ ۳۰ ، شوال بروز ہفتہ ۱۴۰۷ھ
مطابق ۲۷ ، جون ۱۹۸۷ء بوقت بارہ بجے دن بر مکان
حقیر قم المقدسہ کوئے جمشیدی محل سلطان محمد شریف ایران

---

[۱] کافی مطابق نقل تفسیر المیزان جلد ۱۹ ص ۲۸۸
[۲] " " " " " "

۶۔ سُورَہ حَشَرْ

- یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہُوا۔
- اس میں ۲۴ آیتیں ہیں

شروع جمعہ ۸ شعبان ۱۴۰۶ھ ق
۲۹/۱/۱۳۶۵ھ ش

سُورۂ حشر کے مضامین

یہ سُورہ زیادہ تر مسلمانوں اور یہود بنی نظیر کی لڑائی سے متعلق بیانات پر مشتمل ہے اور آخر کار ان کے مدینہ سے اخراج یعنی ان کے وجود سے اس مقدس سرزمین کے پاک ہو جانے پر ختم ہوتا ہے، اس لیے یہ قرآن مجید کے بیدار کرنے والی اور جھنجوڑنے والی اہم سورتوں میں سے ایک ہے اور یہ گزشتہ سُورہ کی آخری آیات سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے جن میں حزب اللہ سے کامیابی کا وعدہ کیا گیا ہے اور فی الحقیقت یہ کامیابی کا ایک واضح نمونہ ہے۔

اس سُورہ کے مشمولات کو چھ حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلے حصّہ میں صرف ایک آیت ہے جو اس سُورہ کے مختلف مباحث کے لیے دیباچہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں پروردگار علیم و حکیم کی اس تسبیح کے بارے میں گفتگو ہے جو تمام موجودات بجا لاتے ہیں۔ دوسرے حصّہ میں دو سے لے کر دس تک کل نو آیتیں ہیں وہ مسلمانوں کی مدینہ کے عہد شکن یہودیوں سے لڑائی کے واقعہ کو بیان کرتی ہیں۔ تیسرا حصّہ جو آیت گیارہ سے لے کر سترہ تک محیط ہے، منافقین کے بارے میں ہے جو اس اقدام میں یہودیوں سے ساز باز رکھتے تھے۔ چوتھا حصّہ جو چند آیتوں سے زیادہ نہیں تمام مسلمانوں کے لیے پند و نصائح کے ایک سلسلہ پر مشتمل ہے اور درحقیقت مندرجہ بالا واقعہ سے نتیجہ اخذ کرنے کے مترادف ہے۔ پانچویں حصّہ میں صرف ایک آیت ہے اس میں قرآن کی توصیف بلیغ ہے اور پاکبازی میں رُوح کی تاثیر کا بیان ہے۔ چھٹے اور آخری حصّہ میں بائیس سے لے کر چوبیس تک تین آیتیں ہیں اس میں خدا کے اوصافِ جلال و جمال اور اس کے اسمائے حُسنیٰ کے اہم حصّہ کا بیان ہے۔ یہ حصّہ اللہ کی معرفت کے سلسلہ میں انسان کی نہایت عُمدہ انداز میں مدد کرتا ہے۔

اس سُورہ کا نام اس کی دوسری آیت سے ماخوذ ہے جس میں مدینہ سے یہودیوں کے کُوچ کرنے کے لیے جمع ہونے اور مسلمانوں کے اس امر کے لیے جمع ہونے کا ذکر ہے کہ یہودیوں کو مدینہ سے نکالا جائے۔ یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس حشر (جمع ہونے) کا قیامت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض مفسّرین نے اس سُورہ کا نام سورہ بنی نظیر بتایا ہے کیونکہ اس کا زیادہ حصّہ انہی کے بارے میں ہے۔ بالآخر یہ سُورہ بھی مسبحات میں سے ایک ہے۔

یعنی اُن سُورتوں میں سے ایک ہے جو خُدا کی تسبیح سے شروع ہوتی ہیں اور یہ ایک حُسنِ اتفاق ہے کہ اس سُورہ کا اختتام بھی تسبیحِ الٰہی پر ہوا ہے ۔

اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت

اس سُورہ کی تلاوت کی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے ۔ منجملہ دیگر فضیلتوں کے ایک فضیلت کے بارے میں ہم پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ملتی ہے :

(من قرأ سورة الحشر لم يبق جنة ولا نار ولا عرش ولا كرسي ولا حجاب ولا السماوات السبع ولا الارضون السبع والهوام والرياح والطير والشجر والدواب والشمس والقمر والملائكة الا صلوا عليه واستغفروا له وان مات من يومه او ليلته مات شهيدًا)

جو شخص سُورۂ حشر پڑھے تو جنّت و دوزخ عرش و کُرسی ، حجاب ، ساتوں آسمان ، ساتوں زمینیں ، حشرات الارض ، ہوائیں ، پرندے ، درخت ، چلتے پھرتے ہوئے جاندار چاند اور سُورج اور ملائکہ سب اس کے لیے دُعائے مغفرت کریں گے اور وہ اگر اس دن یا رات فوت ہو جائے تو شہید شمار ہو گا۔[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السّلام سے منقول ہے :

من قرأ اذا امسى الرحمٰن والحشر وكل الله بداره ملكا شاهرًا سيفه حتّٰى يصبح)

جو شخص سُورۂ رحمٰن اور سُورۂ حشر غروبِ آفتاب کے وقت پڑھے تو خدا ایک فرشتے کو ننگی تلوار کے ساتھ اس کے گھر کی حفاظت پر مامور کرے گا۔[2]

اس میں شک نہیں کہ یہ تمام آثار اس سُورہ کے مضامین میں غور و فکر کرنے سے پیدا ہوتے ہیں ۔ یہ غور و فکر اس کی قرأت کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے اور انسانی زندگی پر اپنا عکس ڈالتا ہے ۔

---

[1]، [2] "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۲۵۵، ۲۵۶ ۔ پہلی حدیث کو قرطبی نے بھی اسی سُورہ کے آغاز میں تحریر کیا ہے ۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱. سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝

۲. ھُوَ الَّذِیْٓ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ مِنْ
دِیَارِھِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ؕ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ یَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا
اَنَّھُمْ مَّانِعَتُھُمْ حُصُوْنُھُمْ مِّنَ اللّٰہِ فَاَتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ
حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا ۖ وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الرُّعْبَ یُخْرِبُوْنَ
بُیُوْتَھُمْ بِاَیْدِیْھِمْ وَاَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ ۖ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی
الْاَبْصَارِ ۝

۳. وَلَوْلَآ اَنْ کَتَبَ اللّٰہُ عَلَیْھِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَھُمْ فِی الدُّنْیَا ؕ
وَلَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابُ النَّارِ ۝

۴. ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ شَآقُّوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ۚ وَمَنْ یُّشَآقِّ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ
شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝

۵. مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّیْنَۃٍ اَوْ تَرَکْتُمُوْھَا قَآئِمَۃً عَلٰٓی اُصُوْلِھَا

فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے خُدا کی تسبیح کرتا ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے۔

۲۔ وہی ہے جس نے اہلِ کتاب کفّار کو مسلمانوں سے پہلے مقابلہ میں ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ تم گمان نہیں کر سکتے تھے کہ وہ خارج ہوں گے اور وہ خُود بھی گمان کرتے تھے کہ ان کے مستحکم قلعے انہیں عذابِ الٰہی سے مانع ہوں گے۔ لیکن خُدا نے جہاں سے وُہ گمان نہیں کرتے تھے ان کو آ لیا۔ اور ان کے دل میں خوف ڈال دیا اس طرح سے کہ وہ اپنے گھروں کو خُود بھی ویران کرتے اور مومنین بھی اُن کو ویران کرتے تھے۔ پس اے آنکھوں والو عبرت حاصل کرو۔

۳۔ اور اگر یہ نہ ہوتا کہ خدا نے جلاوطنی ان کے لیے مقرّر کر دی تھی تو وہ ان پر اس دُنیا میں عذاب نازل کرتا اور ان کے لیے آخرت میں بھی آگ کا عذاب ہے۔

۴۔ یہ اس بنا پر ہے کہ انہوں نے خدا اور اس کے رسول کے ساتھ دُشمنی کی اور جو خدا کے ساتھ دُشمنی کرے تو عذابِ الٰہی اس کے لیے شدید ہے۔

۵۔ کھجور کا ہر قیمتی درخت جو تم نے قطع کیا، یا اسے اس کی جگہ برقرار رکھا سب کچھ خُدا کے فرمان سے تھا، تاکہ خُدا فاسقوں کو رُسوا کرے۔

شانِ نزول

مفسّرین و محدثین و اربابِ تاریخ نے ان آیات کے بارے میں ایک مفصّل شانِ نزول بیان کی ہے جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔ مدینہ میں یہودیوں کے تین قبیلے رہتے تھے، بنی نظیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع، کہا جاتا ہے کہ وہ اصلاً اہلِ حجاز نہ تھے لیکن چونکہ اپنی مذہبی کتب میں انہوں

نے پڑھا تھا کہ ایک پیغمبر مدینہ میں ظہور کرے گا لہٰذا انہوں نے اس سرزمین کی طرف کوچ کیا اور وہ اس عظیم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتظار میں تھے۔
جس وقت رسولِ خدا نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو آپؐ نے ان کے ساتھ عدمِ تعرض کا عہد باندھا لیکن ان کو جب بھی موقع ملا انہوں نے یہ عہد توڑا۔
دوسری عہد شکنیوں کے علاوہ یہ کہ جنگِ اُحد کے بعد (جنگِ اُحد ہجرت کے تیسرے سال واقع ہوئی) کعب ابن اشرف چالیس سواروں کے ساتھ مکہ پہنچا۔ وہ اور اس کے ساتھی سب قریش کے پاس گئے اور ان سے عہد کیا کہ سب مل کر محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف جنگ کریں۔ اس کے بعد ابوسفیان چالیس مکی افراد کے ساتھ اور کعب بن اشرف ان چالیس یہودیوں کے ساتھ مسجد الحرام میں وارد ہوئے اور انہوں نے خانہ کعبہ کے پاس اپنے عہد و پیمان کو مستحکم کیا۔ یہ خبر بذریعہ وحی پیغمبرِ اسلامؐ کو مل گئی۔ دوسرے یہ کہ ایک روز پیغمبرِ اسلامؐ اپنے چند بزرگ اصحاب کے ساتھ قبیلۂ بنی نضیر کے پاس آئے۔ یہ لوگ مدینہ کے قریب رہتے تھے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی آمد کا مقصد یہ تھا کہ بنی عامر کے دو مقتولوں کی دیت ادا کرنے کے سلسلہ میں جو عمرو بن اُمیہ (ایک صحابی) کے ہاتھوں قتل ہوگئے تھے ان سے مدد قرض لیں غالباً پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کا مقصدِ حقیقی یہ تھا کہ آپ اس طرح بنو نظیر کے حالات قریب سے دیکھنا چاہتے تھے اس لیے کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان غفلت کا شکار ہو کر دشمنوں کے ہاتھوں مارے جائیں۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہود کے قلعہ کے باہر تھے۔ آپؐ نے کعب بن اشرف سے اس سلسلہ میں بات کی۔ اسی دوران یہودیوں کے درمیان سازش ہونے لگی۔ وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ ایسا عمدہ موقع اس شخص کے سلسلہ میں دوبارہ ہاتھ نہیں آئے گا۔ اب جب کہ یہ تمہاری دیوار کے پاس بیٹھا ہے ایک آدمی چھت پر جائے اور ایک بہت بڑا پتھر اس پر پھینک دے اور ہمیں اس سے نجات دلا دے۔ ایک یہودی جس کا نام عمر بن حجاش تھا، نے آمادگی ظاہر کی وہ چھت پر چلا گیا۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بذریعہ وحی باخبر ہوئے اور وہاں سے اُٹھ کر مدینہ آگئے۔ آپؐ نے اپنے اصحاب سے کوئی بات نہیں کی ان کا خیال تھا کہ پیغمبرؐ لوٹ کر آ جائیں گے۔ ان کو معلوم ہوا کہ آپؐ مدینہ پہنچ گئے چنانچہ وہ بھی مدینہ پلٹ آئے۔ یہ وہ منزل تھی کہ جہاں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہودیوں کی پیمان شکنی واضح و ثابت ہوگئی۔ آپؐ نے مسلمانوں کو جنگ کے لیے تیار ہو جانے کا حکم دیا۔ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ بنی نظیر کے ایک شاعر نے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجو کہی اور آپؐ کے بارے میں بدگوئی بھی کی۔ ان کی پیمان شکنی کی یہ ایک اور دلیل تھی۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وجہ سے کہ ان پر پہلے سے ایک کاری ضرب لگائیں محمد بن مسلمہ کو جو کعب بن اشرف رئیسِ یہود سے آشنائی رکھتا تھا، حکم دیا کہ وہ کعب کو قتل کر دے۔ انہوں نے کعب کو قتل کر دیا۔ کعب بن اشرف کے قتل ہو جانے نے یہودیوں کو متزلزل کر دیا۔ اُس کے ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ ہر مسلمان اس عہد شکن قوم سے جنگ کرنے کے لیے چل پڑے۔ جس وقت وہ اس صورتِ حال سے باخبر ہوئے تو انہوں نے اپنے مضبوط و مستحکم قلعوں میں پناہ لی اور دروازے بند کر لیے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ چند کھجوروں کے درخت جو قلعوں کے قریب ہیں کاٹ دیے جائیں یا جلا دیے جائیں۔ یہ کام غالباً اس مقصد کے پیشِ نظر ہوا کہ یہودی اپنے مال و اسباب سے بہت محبت رکھتے تھے وہ اس نقصان کی وجہ سے قلعوں سے نکل کر آمنے سامنے جنگ کریں گے۔ مفسرین کی طرف سے یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ کاٹے جانے والے کھجوروں کے یہ درخت مسلمانوں کی نقل و حرکت میں رکاوٹ ڈالتے تھے۔ لہٰذا انہیں کاٹ دیا جانا چاہیئے تھا۔ بہرحال اس پر یہودیوں نے فریاد کی۔ انہوں نے کہا: "اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپؐ تو ہمیشہ اس قسم کے کاموں سے منع کرتے تھے یہ کیا سلسلہ ہے؟" تو اس سورہ کی مندرجہ بالا آیات میں سے پانچویں آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا کہ یہ ایک مخصوص حکمِ الٰہی تھا۔ محاصرہ نے کچھ دن طول کھینچا اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خوں ریزی سے پرہیز کرتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ مدینہ کو خیرباد کہہ دیں اور کہیں دوسری جگہ چلے جائیں۔ انہوں نے اس بات کو قبول کر لیا۔ کچھ سامان اپنا لے لیا اور کچھ چھوڑ دیا۔
ایک جماعت "اذرعات" شام کی طرف اور ایک مختصر سی تعداد خیبر کی طرف چلی گئی۔ ایک گروہ حیرہ کی طرف چلا گیا۔ ان کے چھوڑے ہوئے اموال زمینیں

باغات اور گھر مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ چلتے وقت جتنا ان سے ہو سکا انہوں نے اپنے گھر توڑ پھوڑ دیے۔ یہ واقعہ جنگِ اُحد کے چھ ماہ بعد اور ایک گروہ کے نظریہ کے مطابق جنگِ بدر کے چھ ماہ بعد ہوا[1]

تفسیر

یہودِ بنی نظیر کی مدینہ میں سازش کا خاتمہ

یہ سُورہ خدا کی تسبیح و تنزیہ اور اس کی عزّت و حکمت کے بیان سے شروع ہوتا ہے۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے :

"جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے خدا کی تسبیح کرتا ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے۔" (سبح للہ ما فی السماوات وما فی الارض وھو العزیز الحکیم)

یہ درحقیقت یہود بنی نظیر کی سرگزشت کے بیان کی تمہید ہے۔ یہ لوگ خدا اور اس کی صفات کی معرفت کے سلسلہ میں انواع و اقسام کی تحریفوں کا شکار تھے انہیں اپنی قوّت و عزّت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ یہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو گئے۔ زمین و آسمان کے موجودات کی عمومی تسبیح، عام اس سے کہ تسبیح کرنے والے فرشتے ہوں یا انسان یا حیوانات و جمادات و نباتات، ممکن ہے کہ زبان قال کے ساتھ ہو یا پھر زبانِ حال کے ساتھ، اس لیے کہ حیران کُن نظام جو ہر ذرّہ کی تخلیق میں مصروفِ کار ہے وہ زبانِ حال سے خدا کے علم و قدرت اور اس کی عظمت کو بیان کرتا ہے پھر علماء کی ایک جماعت کے نظریہ کے مطابق ہر موجود اپنے وجود میں عقل و ادراک و شعور کا ایک حصّہ رکھتا ہے اگرچہ ہم اس سے آگاہ نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام وجود اپنی زبان سے خدا کی تسبیح کرتے ہیں، اگرچہ ہمارے کان ان کے سُننے کی صلاحیّت نہیں رکھتے۔ تمام عالم میں اس کی تسبیح و حمد کا غلغلہ ہے۔ اگرچہ ہم اس سے بے خبر ہیں لیکن وہ جو صحیح معنی میں زندہ ہیں اور پتھر نہیں ہیں ان کو غیب کے سلسلہ میں ایک چشم بینا عطا ہوئی ہے وہ عالم کے تمام موجودات کے راز دار ہیں، وہ پانی اور مٹی کے نطق کو اچھی طرح سُنتے ہیں۔ یہ نطق اہل دل کو محسوس ہوتا ہے۔

به ذکرش هرچه خواهی در خروش است   دلے داند چنیں معنی کہ گوش است

نہ بُلبل بر گلش تسبیح خوان است   کہ ہر خارے بہ توحیدش زبان است

جس کو تو دیکھے گا وہ اس کی تسبیح میں مصروف ہے لیکن اسے وہ سُن سکتا ہے جسے خدا نے کان عطا کیے ہیں۔ نہ صرف بُلبل اپنے پھُول کو دیکھ کر تسبیح کر رہا ہے بلکہ ہر خار اس کی توحید کی زبان ہے۔

اس سلسلہ میں مزید تشریح سُورہ اسریٰ کی آیت ۴۴ کے ذیل میں آچکی ہے (جلد ۶ ص ۵۷۵ تا ۵۸۲)۔ اس تمہید کو بیان کرنے کے بعد مدینہ کے بنو نظیر کے نکلنے کی داستان بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے :

"خدا وہی ہے جس نے اہل کتاب کفّار کو مسلمانوں کے مقابلہ میں پہلے اجتماع میں ہی ان کے گھروں سے نکالا۔" (ھو الذی اخرج الذین کفروا من اھل الکتاب من دیارھم لاول الحشر)۔ "حشر" اصل میں کسی گروہ کو میدانِ جنگ یا اسی قسم کی کسی دوسری جگہ کی طرف بھیجنے کے معنی میں ہے۔ یہاں اس سے مُراد مسلمانوں کا اجتماع اور مدینہ سے یہودیوں کے قلعوں کی طرف چل پڑنا ہے یا یہودیوں کا مسلمانوں سے لڑنے کے لیے اکٹھا ہونا ہے۔ چونکہ اپنی نوعیّت کے اعتبار سے یہ پہلا اجتماع تھا لہٰذا قرآن میں اسے "لاول الحشر" کا عنوان دیا گیا ہے اور یہ خود ایک لطیف اشارہ ہے

---

[1] مجمع البیان، تفسیر علی بن ابراہیم، تفسیر قرطبی، نور الثقلین در ذیل آیات زیر بحث (تلخیص کے ساتھ)۔

(بنی نظیر اور یہود خیبر سے مقابلہ کی طرف ۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کے سلسلہ میں کئی ایسے احتمال پیش کیے ہیں
آیت کے نفس مضمون سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے ۔ دوسرے احتمالات میں سے ایک یہ ہے کہ حشر اوّل سے مُراد روز قیامت کا حشر ہے،
جب قبروں سے محشر کی طرف رجوع ہوگا ۔ زیادہ عجیب یہ ہے کہ بعض نے اس آیت کو اس امر کی دلیل قرار دیا ہے کہ قیامت میں حشر سرزمین شام میں
واقع ہوگا کیونکہ یہودی مدینہ سے نکل کر شام کی طرف گئے تھے ۔ یہ تمام ضعیف احتمال لفظ حشر سے پیدا ہوئے ہیں ۔ حالانکہ یہ لفظ حشر قیامت کے معنی
میں نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق ہر قسم کے اجتماع ، قرارگاہ سے نکلنے اور میدان میں حاضر ہونے پر ہوا ہے ۔ جیسا کہ سُورہ نمل کی آیت ۱۷ میں ہم
پڑھتے ہیں : (وحشر لسلیمان جنوده من الجن والانس والطیر) سلیمانؑ کا لشکر جِنّ و انس اور پرندوں میں سے ان کے پاس جمع ہوا ۔ اسی
طرح فرعونی جادوگروں سے حضرت موسیٰؑ کے مبارزہ کے مشاہدہ کے لیے اجتماع کے بارے میں ہمیں ملتا ہے کہ : (وان یحشر الناس ضحی) ۔
ہماری قرارداد یہ ہے کہ جس وقت دن چڑھے سب لوگ جمع ہوں) ۔ (طٰہٰ ۔ ۵۹) ۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے : " تم ہرگز یہ گمان نہ کرتے تھے کہ وہ اس مقام سے چلے جائیں گے اور وہ یہ گمان رکھتے تھے کہ ان کے مستحکم قلعے
(؟)ٹ اور عذابِ الٰہی سے انہیں محفوظ رکھیں گے ۔ (ما ظننتم ان یخرجوا وظنوا انھم مانعتھم حصونھم من اللّٰہ) ۔ وہ اس
طرح مغرور اور اپنی ذات سے رضامند تھے کہ ان کی تکیہ گاہ ان کے مضبُوط قلعے اور ان کی ظاہری قوت تھی ۔ آیت کا یہ اندازِ بیان بتاتا ہے کہ بنونظیر کے
یہودی مدینہ میں وسیع وسائل کے حامل تھے اور ان کے پاس بہت سازو سامان تھا ۔ اس طرح نہ وہ خُود باور کرتے تھے کہ آسانی کے ساتھ مغلوب
ہو جائیں گے نہ دُوسرے لوگ ۔ لیکن چونکہ خدا چاہتا تھا کہ سب پر واضح کر دے کہ اس کے ارادہ کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی یہاں تک کہ
جنگ واقع ہوئے بغیر انہیں اس سرزمین سے نکال دیا اس لیے اس آیت کو جاری رکھتے ہوئے فرماتا ہے :

" لیکن خدا نے جہاں سے انہیں گمان نہیں تھا اُن کو آ لیا اور ان کے دل میں خوف ڈالا اس طرح سے کہ وہ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں
ویران کرتے تھے " ۔ (فاتاھم اللّٰہ من حیث لم یحتسبوا وقذف فی قلوبھم الرعب یخربون بیوتھم بایدیھم وایدی
المومنین) ۔ جی ہاں خدا نے اس غیر مرئی (نظر نہ آنے والا) لشکر یعنی خوف کے لشکر کو جسے بہت سی جنگوں میں مؤمنین کی مدد کے لیے بھیجتا تھا
ان کے دلوں پر مسلط کیا اور ان سے ہر قسم کے مقابلہ کی طاقت چھین لی ۔ انہوں نے اپنے آپ کو بیرونی لشکر کے مقابلہ کے لیے تیار کیا تھا ۔ وہ اس سے
بے خبر تھے کہ خدا ان کے اندر سے ایک لشکر ان کے لیے بھیجے گا اور اس طرح انہیں ایک تنگ گلی میں بند کر دے گا کہ وہ خُود دشمن سے مل کر
اپنا تخریب کاری اور ویرانی میں مدد کریں گے ۔ ٹھیک ہے کہ ان کے رئیس کعب بن اشرف کے مارے جانے نے اس واقعہ سے پہلے ان کے
دل میں ایک طرح کی وحشت پیدا کر دی تھی لیکن یہ طے ہے کہ آیت سے مُراد یہ نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے گمان کیا ہے بلکہ یہ ایک قسم کی
الٰہی امداد تھی جو بارہا اسلامی جنگوں میں مسلمانوں کی مدد کے لیے سامنے آئی ہے ۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ مسلمان باہر سے ان کے گھروں کو تباہ کرتے تھے
تاکہ اندر جانے کا راستہ پائیں اور یہودی انہیں اندر سے ویران کرتے تھے تاکہ وہ مکان صحیح و سلامت مسلمانوں کے ہاتھ نہ آئیں ۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ
ان کے استحکام کا ویران ہونا تھا ۔ اس آیت کے بارے میں کچھ اور تفاسیر بھی پیش کی گئی ہیں ۔ ایک یہ کہ یہودی اندر سے اپنے مکانوں کی دیواروں کو
توڑتے تھے کہ بھاگ کھڑے ہوں اور مسلمان باہر سے توڑتے تھے کہ ان پر قبضہ کر سکیں (لیکن یہ احتمال بعید ہے) ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت
میں معانی کنایۃً رکھے گئے ہیں ۔ جیسے کہ ہم کہیں کہ فلاں شخص نے اپنا گھر اور اپنی زندگی اپنے ہاتھ سے تباہ کی یعنی نادانیوں اور کج فہمیوں کی وجہ سے اپنی
زندگی کے برباد ہونے کا سبب بنا ۔ یا یہ کہ یہودیوں کا بعض گھروں کو ویران کرنے سے مقصد یہ تھا کہ قلعوں کے اندر کے کوچوں کے دھانے بند کر دیں تاکہ

مسلمان اندر نہ آسکیں اور آئندہ یہاں رہائش اختیار نہ کر سکیں، یا یہ کہ قلعوں کے اندر کے کچھ گھر انہوں نے خراب کیے تاکہ اگر قلعہ کے اندر کا حصہ میدان جنگ بن جائے تو جنگ کرنے کے لیے کافی جگہ موجود ہو، یا یہ کہ بعض گھروں کی تعمیر میں گراں قیمت اشیاء صرف ہوئی تھیں۔ انہوں نے گھروں کو خراب کیا تاکہ جو کچھ اُٹھانے کے قابل ہو اسے اُٹھا کر لے جائیں۔ لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے۔ آیت کے آخر میں ایک مجموعی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"پس عبرت حاصل کرو اے آنکھوں والو" (فاعتبروا یا اولی الابصار)۔ "اعتبروا" "اعتبار" کے مادّہ سے اصل میں عبور سے لیا گیا ہے۔ اس کے معنی ایک چیز سے گزر کر دوسری چیز کی طرف جانا ہے۔ یہ جو اشکِ چشم کو "عبرہ" کہا جاتا ہے آنسوؤں کے قطروں کا آنکھ کو عبور کرنے کی بنا پر ہے اور عبارۃ کو اس بنا پر عبارت کہتے ہیں کہ وہ مفاہیم کو ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل کرتی ہے اور خواب کے مفہوم پر تعبیرِ خواب کا اطلاق اس بنا پر ہے کہ وہ انسان کو اُس کے ظاہر سے اُس کے باطن کی طرف منتقل کرتی ہے۔ اسی مناسبت سے وہ حوادث جو انسان کو نصیحت کا سرمایہ دیتے ہیں انہیں عبرت کہا جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کی کلّی تعلیمات کے ایک سلسلہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور ایک مطلب سے دُوسرے مطلب کی طرف منتقل کرتے ہیں۔ "اولی الابصار" کی تعبیر (آنکھوں والے) ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو حوادث کو اچھی طرح دیکھتے ہیں اور اپنی بصیرت سے ان کی تہہ تک پہنچتے ہیں۔ بصر کا لفظ عام طور پر بینائی کے عضو، بصیرتِ باطنی یعنی ادراک و آگاہی کے لیے بولا جاتا ہے۔[1]

حقیقت میں اولی الابصار" وہ لوگ ہیں جو درسِ عبرت حاصل کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔ اسی لیے قرآن انہیں تنبیہ کرتا ہے کہ وہ اس حادثہ سے ضرور سبق حاصل کریں۔ اس میں شک نہیں کہ عبرت پکڑنے سے مراد یہ ہے کہ مشابہ حوادث جو حکمِ عقلی کے لحاظ سے یکساں ہیں ان کا ایک دوسرے پر قیاس کریں۔ مثلاً دوسرے کفّار اور ان کی عہد شکنیوں کی حالت کا بنو نظیر کے یہودیوں کے احوال پر قیاس کریں لیکن یہ جملہ ہرگز قیاساتِ ظنّی سے تعلق نہیں رکھتا جن سے بعض لوگ احکامِ دینی کے استنباط میں فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ بعض فقہائے اہلِ سُنّت نے اس مقصد کے اثبات کے لیے مندرجہ بالا آیت سے استفادہ کیا ہے جب کہ بعض دوسروں نے اس پر اعتراض کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ عبرت اور اعتبار سے مُراد مندرجہ بالا آیت میں ایک موضوع سے دُوسرے موضوع کی طرف منطقی اور قطعی انتقال ہے نہ یہ کہ خیال و گمان پر عمل کرنا۔ بہرحال واقعیٔ اس قومِ یہود کی سرگزشت، باوجود اس قوت و عظمت و شوکت کے اور باوجود وسائل و امکانات و استحکامات کے عبرت انگیز تھی، یہاں تک کہ بغیر اس کے کہ کسی کو ہاتھ لگائیں، مسلمانوں کی ایسی جمعیت کے مقابلہ میں، جو بظاہر ہرگز ان کے مقابلہ کے قابل نہیں تھی، سرِ تسلیم خم کر دیا اور ہتھیار ڈال دیے۔ اپنے گھر اپنے ہاتھوں برباد کیے اور اپنے مال ضرورت مند مُسلمانوں کے لیے چھوڑ گئے اور مختلف علاقوں میں بکھر گئے۔ حالانکہ تاریخوں کے حوالوں کے مطابق ابتدا میں انہوں نے مدینہ میں اس لیے سکونت اختیار کی تھی کہ جس پیغمبر کی آمد کا ان کی کتابوں میں وعدہ کیا گیا تھا اس کو حاصل کریں اور اس کے اصحاب کی صفِ اوّل میں قرار پائیں۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ:

(کان اکثر عبادة ابی ذر التفکر والاعتبار)

ابوذر کی زیادہ تر عبادت غور و فکر کرنا اور عبرت حاصل کرنا تھی۔[2]

---

[1] مفرداتِ راغب۔

[2] کتاب خصال مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۷۴

لیکن افسوس کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو دردناک حوادث کو خود آزمائیں اور شکستوں کا تلخ مزہ خود چکھیں لیکن کوئی عبرت حاصل نہ کریں
امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں :

(السعید من وعظ بغیرہ)

سعادت مند وہی ہے جو دوسروں سے وعظ و نصیحت حاصل کرے[1]

اس کے بعد والی آیت کہتی ہے :

"اگر یہ نہ ہوتا کہ خدا نے ان کے لیے مقرر کر رکھا تھا کہ جلاوطن ہو جائیں اور اس جگہ کو چھوڑ دیں تو ان پر اسی دنیا میں عذاب نازل کرتا" (ولولا ان کتب اللہ علیھم الجلاء لعذبھم فی الدنیا)۔ اس میں شک نہیں کہ جلاوطنی اور ان عمدہ سرمایوں کا چھوڑ جانا جن جمع کرنے میں انہوں نے ایک عمر صرف کی تھی خود ان کے لیے ایک دردناک عذاب تھا۔ اسی بنا پر اُوپر والے جملہ سے مُراد یہ ہے کہ اگر یہ عذاب ان کے لیے مقدر نہ کیا گیا ہوتا تو دوسرا عذاب ان پر نازل ہوتا یعنی مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوتے اور قتل ہو جاتے۔ خُدا چاہتا تھا کہ وہ دنیا میں دربدر مارے مارے پھریں اور یہ دربدر ہونا ان کے لیے بسا اوقات زیادہ دردناک تھا اس لیے کہ جس وقت وہ اپنے ان تمام قلعوں، سجے سجائے گھروں، کھیتوں اور باغات کو یاد کرتے' جو اب دوسروں کے قبضہ میں تھے اور وہ خود عہد شکنی اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف سازشیں کرنے کی وجہ سے دوسرے علاقوں میں محروم و سرگرداں تھے تو وہ بہت زیادہ تکلیف اور رُوحانی عذاب میں گرفتار ہوتے تھے۔
جی ہاں خدا یہ چاہتا تھا کہ یہ مغرور، فریب کار اور عہد شکن گروہ اس قسم کے دردناک عذاب سے دوچار ہو لیکن یہ صرف ان کا دنیاوی عذاب تھا' اس لیے آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے :

"اور ان کے لیے آخرت میں بھی جہنم کا عذاب ہے۔" (ولھم فی الاٰخرۃ عذاب النار)۔

یہ ہے دُنیا و آخرت ان لوگوں کی جو حق و انصاف کو ٹھکرا دیتے ہیں اور غرور و خود پرستی کے رہوار پر سوار ہوتے ہیں۔ چونکہ اس واقعہ کا بیان' علاوہ اس کے کہ پروردگار کی قدرت اور پیغمبر اسلام کی حقانیت کا بیان ہے، تمام لوگوں کو تنبیہ کرتا ہے جو یہود بنی نظیر جیسے اعمال کے عامل ہیں تاکہ مسئلہ انہی تک محدود نہ رہے لہٰذا بعد والی آیت میں ایک بامقصد تعلیم دیتے ہوئے مزید فرماتا ہے :

"یہ دُنیا و آخرت کا عذاب اس بنا پر ان پر نازل ہوا کہ وہ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن بن گئے" (ذالك بانھم شاقوا اللہ ورسولہ)۔ "اور جو شخص خدا کی دشمنی اختیار کرے تو وہ اس پر عذاب نازل کرتا ہے' اس لیے کہ وہ شدید العقاب ہے۔" (ومن یشاق اللہ فان اللہ شدید العقاب)[2]

"شاقوا" مادہ "شقاق" سے اصل میں دو چیزوں کے درمیان شگاف پڑنے اور جدائی کے معنوں میں ہے اور چونکہ دشمن ہمیشہ مدمقابل قرار پاتا ہے اور اپنے آپ کو الگ کر لیتا ہے' لہٰذا اس کے عمل کو شقاق کہتے ہیں۔ بعینہٖ یہی آیت بہت جزوی اختلاف کے ساتھ سُورہ انفال کی آیت ۱۳ میں جنگِ بدر کے واقعہ اور مشرکین کے شکست کھانے کے واقعہ کے بعد آئی ہے جو ہر لحاظ سے اس کے مضمون کو بیان کرتی ہے۔ قابلِ توجہ یہ کہ پروردگارِ عالم آغازِ آیت میں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دشمنی کو پیش کرتا ہے جب کہ آیت کے ذیل میں صرف خدا کی دشمنی کی بات کرتا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ رسولِ خدا سے دُشمنی بھی خدا کی دشمنی ہے اور وہ دونوں ایک دُوسرے

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۸۶

[2] من شرطیہ ہے اور اس کی جزا محذوف ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے کہ ومن یشاق اللہ یعاقبہ فان اللہ شدید العقاب۔

سے جدا نہیں ہیں۔ شدید العقاب کی تعبیر ارحم الراحمین ہونے کے ساتھ کسی قسم کا تضاد نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ جو عفو و رحمت کا مقام ہے وہاں وہ ارحم الراحمین ہے اور جہاں عذاب، سزا اور عقوبت کا مقام ہے وہاں وہ اشد المعاقبین ہے جیسا کہ دعا میں آیا ہے۔ وایقنت انک انت ارحم الراحمین فی موضع العفو والرحمة واشد المعاقبین فی موضع النکال والنقمة [۱]

مجھے یقین ہے کہ تو عفو و رحمت کے مقام پر ارحم الراحمین ہے اور عذاب و سزا کی منزل میں اشد المعاقبین ہے۔ زیر بحث آیات کی آخری آیت میں خداوند عالم ایک اعتراض کا جواب پیش کرتا ہے جو بنو نضیر کے یہودیوں نے جیسا کہ ہم شان نزول میں بھی کہہ چکے ہیں اُس موقعہ پر پیغمبر اسلام پر کیا تھا جب آپؐ نے حکم دیا تھا کہ یہودیوں کے قلعوں کے پاس کی کھجوروں کے کچھ درخت کاٹ دیے جائیں (تاکہ جنگ کے لیے جگہ کھلی ہو جائے یا اس لیے کہ یہودی پریشان ہوں اور قلعوں سے باہر نکل کر جنگ کریں) اُنہوں نے کہا تھا کہ اے محمدؐ! کیا وہ آپ ہی نہیں تھے جو اس قسم کے کاموں سے منع کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی کہ

"کھجور کے جن قیمتی درخت کو تم نے کاٹا تھا یا اسے اپنی حالت پر رہنے دیا ہے یہ سب کچھ خدا کے حکم سے تھا۔"

(ما قطعتم من لینة او ترکتموها قائمة علیٰ اصولها فباذن الله)[۲]

مقصد یہ تھا کہ فاسقین کو ذلیل و رسوا کرے۔ (ولیخزی الفاسقین)۔ "لینة" "لون" کے مادہ سے ہے اور اس کے معنی کھجور کے درخت کی ایک اعلیٰ نوع کے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس کی "لین" کے مادہ سے کھجور کے درخت کی ایک نوع کی نرمی کے معنوں میں تفسیر کی ہے۔ یہ درخت نرم ہوتا ہے اور اس کی شاخیں زمین کے قریب ہوتی ہیں۔ اس درخت میں لگنے والی کھجوریں نرم اور لذیذ ہوتی ہیں۔ اور کبھی لینة کی تفسیر "الوان" کے حوالے سے ہوتی ہے جس کے معنی کھجور کے درخت کی مختلف انواع ہیں۔ اس کی تفسیر "نخل کریمہ" بھی کی گئی ہے۔ یہ سب تفسیریں ایک ہی نوعیت کی ہیں۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ بنو نضیر کے کھجوروں کے درخت بعض مسلمانوں نے کاٹے جبکہ دوسرے مسلمان مخالف تھے۔ اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور نزاع کو ختم کیا۔[۳]

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت اصحاب میں سے دو افراد کے عمل سے متعلق ہے کہ جن میں سے ایک کھجور کے اچھے درخت کاٹ رہا تھا تاکہ یہودی غصہ میں آکر قلعوں سے باہر نکل آئیں۔ دوسرا کم قیمت درختوں کو کاٹتا تھا تاکہ جو قیمتی درخت ہیں ان سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ اس بنا پر ان کے درمیان اختلاف ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی اور بتایا کہ دونوں کام اللہ کے حکم سے تھے۔[۴]

لیکن آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے "لینة" اچھی قسم کے درختوں کو کاٹا اور ان میں سے بعض کو چھوڑ دیا۔ یہ چیز یہودیوں کے اعتراض کا سبب بنی اور قرآن نے اس کا جواب دیا تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ کام ہوائے نفس کے نتیجے میں نہیں تھا بلکہ اس سلسلہ میں ایک حکم الٰہی صادر ہوا تھا کہ محدود طریقہ پر اس کام کو کیا جائے تاکہ نقصان زیادہ نہ ہو۔ بہرصورت یہ حکم اسلام کے ایک مشہور قانون کا استثنا تھا جو یہ کہتا ہے کہ دشمن پر حملے کے وقت درختوں کو نہیں کاٹنا چاہیے، جانوروں کو ذبح نہیں کرنا چاہیے اور کھیتوں میں آگ نہیں لگانی چاہیے۔ یہ استثناء صرف ایسے موقف سے تعلق رکھتا تھا کہ جہاں دشمن کو قلعہ سے باہر نکالنے یا میدان جنگ بنانے کی ضرورت تھی۔

---

[۱] دعائے افتتاح از "ادعیۂ ماہ مبارک رمضان"۔

[۲] اوپر والی آیت میں ما شرطیہ ہے اور فباذن الله اس کی جزا ہے۔

[۳] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۱۱ ص ۹۳۔ یہی معنی تفسیر درالمنثور جلد ۶ ص ۱۸۸ پر بیان ہوئے ہیں۔

[۴] تفسیر فخر رازی جلد ۲۹ ص ۲۸۳۔

ان کلی میں ضروری جزوی استثناء عام طور پر موجود ہوتے ہیں جیسا کہ اصل کلی مردار کا گوشت نہ کھانا ہے لیکن مجبوری اور اضطرار کی صورت میں "اکل میتة" مردار کا کھانا (ولیخزی الفاسقین) "تاکہ فاسقوں کو ذلیل و رسوا کرے۔ یہ جملہ بتاتا ہے کہ اس کا ایک محدود مقصد یہ تھا کہ دشمن کو ذلیل کیا جائے اور ان کے حوصلوں کو پست کیا جائے۔

چند نکات

خدا کے غیر مرئی لشکر

اہل دنیا کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنی ظاہری اور مادی قوتوں پر انحصار کرتے ہیں لیکن خدا پرستوں کا انحصار خدائی مدد پر ہوتا ہے اس کا ایک نمونہ ہم نے بنو نظیر کے شکست کھانے اور مدینہ سے باہر نکلنے کے سلسلہ میں مندرجہ بالا آیتوں میں دیکھا ہے۔ ان آیتوں میں ہم نے پڑھا ہے کہ کامیابی کا ایک مؤثر سبب وہی خوف تھا جو خدا نے یہودیوں کے دلوں میں ڈالا تھا یہاں تک کہ وہ اپنے گھروں کو اپنے ہی ہاتھوں سے توڑنے لگے اور اس بات پر آمادہ ہوگئے کہ اپنے اموال کو نظر انداز کر دیں اور اس علاقہ سے باہر نکل جائیں۔ ان معانی کی نظیر قرآنی آیات میں چند مرتبہ آئی ہے۔ منجملہ دوسرے مواقع کے ایک موقع پر جب کہ مسلمان بنو قریظہ سے جنگ احزاب میں آمنے سامنے ہوئے تھے، موجود ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

(و انزل الذین ظاھروھم من اھل الکتاب من صیاصیھم و قذف فی قلوبھم الرعب فریقاً تقتلون و تاسرون فریقا) "خدا نے اہل کتاب میں سے ایک گروہ کو جس نے مشرکین عرب کی حمایت کی اس کے محکم قلعوں سے نیچے اتارا اور ان کے دل میں خوف ڈال دیا۔ یہاں تک کہ ان میں سے ایک گروہ کو تم نے قتل کیا اور ایک گروہ کو اسیر کیا۔" (احزاب ۲۶)

یہی مفہوم جنگ بدر کے واقعہ میں بھی موجود ہے جہاں کہا گیا ہے۔ (سالقی فی قلوب الذین کفروا الرعب) "میں عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا۔" اسی رعب کا ایک حصہ جو خدا کے ایک غیر مرئی لشکر کا حکم رکھتا ہے، طبیعی ہے اگرچہ اس کا ایک حصہ پُراسرار ہے اور اس کے روابط عام وسائل کے ذریعہ ہم پر منکشف نہیں ہیں۔ جو چیز طبعی و فطری ہے کہ مومنین ہمیشہ ہر حالت میں اپنے آپ کو کامیاب سمجھیں چاہے قتل ہو کر شہید ہو جائیں اور چاہے دشمن کی سرکوبی کریں۔ جس کی یہ منطق ہو وہ خوف اور وحشت کو اپنے دل میں جگہ نہیں دیتا بلکہ اس قسم کا عجیب انسان اپنے دشمن کے لیے باعث خوف و وحشت ہوتا ہے۔ جیسا کہ دنیا میں ہم بڑے بڑے ممالک کو دیکھتے ہیں کہ باوجود جدید ترین ہتھیار رکھنے کے اور بہت عظیم ہونے کے سچے مومنوں کے ایک چھوٹے گروہ سے ڈرتے ہیں اور ان سے جنگ کرنا ان کے لیے خوف کا باعث ہوتا ہے اور ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان سے نہ الجھیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ملتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

(نصرت بالرعب مسیرة شھر)

"میری خدا کی جانب سے ایک ماہ کے فاصلہ سے خوف و وحشت سے مدد کی گئی ہے۔"[1]

یعنی نہ صرف وہ لوگ جو میدان جنگ میں میرے سامنے ہوتے ہیں مجھ سے خوف کھاتے ہیں بلکہ جن علاقوں میں دشمن مجھ سے ایک ماہ کے فاصلے پر ہوتے ہیں ان پر بھی وحشت و اضطراب طاری رہتا ہے۔ حضرت مہدیؑ کی فوج کے بارے میں بھی ہم پڑھتے ہیں کہ تین لشکر

---

[1] مجمع البیان جلد ۲ ص ۵۱۹ (آل عمران کی آیت ۱۵۱ کے ذیل میں)۔

آپ کی مدد کریں گے ۔۱ الملائکۃ والمؤمنون والرعب) "فرشتے مومن اور خوف"[1]

حقیقت میں وہ تو کوشش کرتے ہیں کہ انہیں باہر سے کوئی ضرب نہ لگے لیکن خدا انہیں اندر سے ضرب لگاتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اندرونی ضرب زیادہ جانکاہ اور ناقابلِ تلافی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اگر تمام دنیا کے ہتھیار اور لشکر کسی کے قبضہ میں ہوں لیکن اس میں جنگ کرنے کا جذبہ اور حوصلہ نہ ہو تو اُسے ضرور شکست ہوگی۔

۲۔ موجودہ زمانے میں یہودیوں کی سازشیں

تاریخ اسلام اپنے آغاز ہی سے یہودیوں کی سازشوں سے بھری پڑی ہے۔ اور ہم بہت سے دردناک حوادث میں میدان کے اندر یا پس منظر میں ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ پیغمبر موعودؐ کے عشق و محبت میں سرزمین حجاز میں آئے تھے لیکن ان کے عظیم ظہور کے بعد بدترین دشمن ہوگئے اور موجودہ زمانے میں بھی اسلام کے خلاف ہونے والی سازشوں میں ہم یہودیوں کو منظر یا پس منظر میں دیکھتے ہیں اور یہ صاحبانِ بصیرت کے لیے سامانِ عبرت ہے۔

جیسا کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تاریخ بتاتی ہے، یہودیوں کو پسپا کرنے کا واحد راستہ ان سے براہ راست مقابلہ کرنا ہے خصوصاً صیہونیت جس کی لغت میں عدل و انصاف اور نرمی کا کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ طاقت ان کی زبان ہے۔ سوائے قوت و طاقت کے ان سے بات نہیں کی جاسکتی لیکن اس کے باوجود وہ سچّے مومنین سے بہت ڈرتے ہیں۔ اگر موجودہ زمانے کے مسلمان اصحاب پیغمبرؐ کی طرح ایمان و استقامت سے کافی حد تک بہرہ ور ہوں تو ان کا خوف خون خوار دشمنوں پر غالب آجائے اور اسی لشکر خدائی کے ذریعہ یہودیوں کو مقبوضہ علاقوں سے باہر نکالا جاسکتا ہے۔ یہ ایسا درس ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمیں چودہ سو سال پہلے دیا تھا۔

---

[1] اثبات الہداۃ جلد ۷، ص ۱۲۴

۶ وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ
وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝
۷ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ
الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ ۭ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ
عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

ترجمہ

۶۔ اور جو کچھ خدا اپنے رسولؐ کو ان یہود سے لوٹا دے تو وہ ایسی چیز ہے جس پر قبضہ کرنے کے لیے (تم نے کوئی زحمت نہیں اُٹھائی) نہ تم نے گھوڑا دوڑایا ہے، نہ کوئی اُونٹ۔ لیکن خدا اپنے رسولوں کو جس پر چاہے مسلط کر دیتا ہے اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

۷۔ جو کچھ خدا ان آبادیوں والوں سے اپنے رسولؐ پر لوٹائے وہ خدا، رسول، ذوی القربٰی، یتیموں، مسکینوں اور ابن السبیل (راستہ میں عاجز ہو کر رہ جانے والوں) کے لیے ہے تاکہ (یہ عظیم مال) دست بدست تمہارے دولت مندوں کے درمیان گردش نہ کرے۔ جو کچھ خدا کا رسولؐ تمہارے لیے لایا ہے وہ لے لو اور جس سے منع کرے اس سے رُک جاؤ اور خدا کی مخالفت سے پرہیز

کرو کیونکہ خدا شدید العقاب ہے۔

شانِ نزول

چونکہ یہ آیتیں گزشتہ آیتوں کی تکمیل میں جو یہودِ بنی نظیر کی شکستوں کو بیان کر رہی تھیں، لہٰذا ان کی شانِ نزول بھی اُسی شانِ نزول کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ بنی نظیر کے یہودیوں کے مدینہ سے چلے جانے کے بعد ان کے باغات، زمینیں، زراعتیں گھر اور دوسرے مال کا کچھ حصہ مدینہ میں رہ گیا۔ مسلمانوں کے سرداروں کی ایک جماعت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور زمانۂ جاہلیت کے قانون کے مطابق جو بات ان کے دل میں تھی وہ انہوں نے عرض کی اور وہ یہ کہ اس مالِ غنیمت کا منتخب حصہ اور باقی کی ایک چوتھائی آپ لے لیجیے اور باقی ہمیں دے دیجئے تاکہ اسے ہم اپنے درمیان تقسیم کر لیں۔ اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور صراحت کے ساتھ کہا کہ چونکہ ان اموالِ غنیمت کے لیے جنگ نہیں ہوئی اور مسلمانوں نے کوئی زحمت و مشقت برداشت نہیں کی لہٰذا یہ تمام مال و اسباب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ملکیت ہیں۔ جس طرح ان کی مصلحت ہوگی وہ تقسیم کریں گے اور جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ اموال ان مہاجرین کے درمیان، جو مدینہ میں مالِ دنیا نہ رکھتے تھے، اور انصار کی وہ تھوڑی سی تعداد جنہیں مال کی شدید احتیاج تھی، ان کے درمیان تقسیم کر دیے۔ [1]

تفسیر

ان اموالِ غنیمت کے بارے میں حکم جو جنگ کے بغیر ہاتھ لگیں

یہ آیتیں جیسا کہ ہم نے کہا ہے، بنو نظیر کے اموالِ غنیمت کے بارے میں جو حکم ہے اسے پیش کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان تمام اموالِ غنیمت کے سلسلہ میں ایک قانونِ کلی کو بھی واضح کرتی ہیں، جو مال بغیر کسی زحمت و مشقت کے اسلامی معاشرہ کو ملے اسے فقہ اسلامی میں "فے" کہتے ہیں۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے:

"جو کچھ خدا نے اپنے رسولؐ کی طرف ان سے پلٹایا وہ ایسی چیز ہے جس کے حصول کے لیے نہ تم نے گھوڑے دوڑائے ہیں اور نہ اونٹ"

وما افاء اللہ علی رسولہ منھم فما اوجفتم علیہ من خیل ولا رکاب) [2]

"افاء" "فیٔ" کے مادہ سے اصل میں رجوع و بازگشت کے معنی میں ہے اور یہ جو اموالِ غنیمت پر اس کا اطلاق ہوا ہے شاید اسی بنا پر ہے کہ خدا نے اس جہان کی تمام نعمتیں اصل میں مومنین کے لیے اور سب سے پہلے اپنے پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے پیدا

---

[1] "مجمع البیان" اور دوسری تفاسیر در ذیل آیاتِ زیرِ بحث۔

[2] "ما" ما افاء اللہ میں موصولہ ہے اور مبتدا اور "ما" فما اوجفتم میں نافیہ ہے اور یہ سارا جملہ خبر ہے۔ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ پہلا "ما" شرطیہ اور دوسرا اس کے بعد والے جملہ کے ساتھ جوابِ شرط ہو (فا کا آنا اس خبر پر جو شرط کے مشابہ ہو کوئی مانع نہیں رکھتا)۔

کی ہیں جو اشرف کائنات و فخرِ موجودات ہیں اور غیر مومن و گنہگار افراد حقیقت میں ان اموال کے غاصب ہیں (اگرچہ وہ حسب قوانین شرعی و عرفی مالک شمار ہوں)۔ جس وقت یہ اموال حقیقی مالکوں کی طرف لوٹیں تو فیء ان کے لیے بہترین عنوان ہے۔ "اوجفتم" "ایجاف" کے مادہ سے تیزی سے ہانکنے کے معنی میں ہے جس کا عام طور پر جنگوں میں اتفاق ہوتا ہے۔ خیل کے معنی گھوڑے ہیں۔ (یہ ایسی جمع ہے جس کا مفرد خود اس کی جنس سے نہیں ہے)[1]

"رکاب" "رکوب" کے مادہ سے عام طور پر سواری کے اونٹوں کے لیے آتا ہے۔ پورے جملہ سے مقصود یہ ہے کہ وہ تمام مواقع جن میں مالِ غنیمت حاصل کرنے کے سلسلہ میں کوئی جنگ واقع نہ ہو وہاں مالِ غنیمت جنگجو افراد میں تقسیم نہیں ہوگا اور وہ مکمل طور پر رئیسِ مسلمین کے اختیار میں ہوگا اور وہ اپنی صوابدید کے مطابق بعد والی آیت میں بیان شدہ مصارف میں سے کسی مَصرف میں صَرف کرے گا۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے :

"اس طرح نہیں کہ کامیابیاں ہمیشہ تمہاری جنگوں کا نتیجہ ہوں لیکن خدا اپنے رسولوں کو جس پر چاہے تسلّط عطا کر دیتا ہے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے"۔ (ولٰکن اللہ یسلط رسلہ علیٰ من یشاءُ واللہ علی کل شیءٍ قدیر)۔ جی ہاں یہودِ بنی نظیر جیسے قوی دشمن پر کامیابی خدا کی مدد کے نتیجے میں ممکن ہوئی تاکہ تم جان لو خدا ہر چیز پر قادر ہے اور چشم زدن میں ایک طاقتور قوم کو زبوں حال بنا سکتا ہے اور ایک گروہ کو ان پر مسلّط کر سکتا ہے اور پہلے گروہ کے تمام امکانات و وسائل دوسرے گروہ کو منتقل کر سکتا ہے۔ یہ وہ منزل ہے کہ مسلمان اس قسم کے میدانوں میں اللہ کی معرفت کا درس بھی لے سکتے ہیں اور پیغمبرؐ کی حقانیّت کی نشانیاں بھی دیکھ سکتے ہیں اور ذاتِ پاک خدا سے خلوص اور اسی پر انحصار کو مشعلِ راہ بنا سکتے ہیں۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہود بنی نظیر کے اموال غنیمتِ جنگ کے بغیر مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں آئے بلکہ انہوں نے لشکر کشی کی اور یہودیوں کے قلعوں کا محاصرہ کیا۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ کسی حد تک تلوار بھی چلی۔ جواب میں ہم کہتے ہیں کہ بنو نظیر کے قلعے، جیسا کہ مؤرخین نے کہا ہے، مدینہ سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہیں تھے۔ (بعض مفسّرین نے یہ فاصلہ دو میل یا تین کلومیٹر سے کم بیان کیا ہے)۔ مسلمان پیادہ قلعوں کی طرف آئے اس وجہ سے انہوں نے کوئی مشقت برداشت نہیں کی۔ باقی رہی تلواروں کی جنگ تو وہ تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے۔ محاصرہ نے بھی زیادہ طول نہیں کھینچا۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ، حقیقت میں وہ چیز جسے جنگ کا نام دیا جا سکے، واقع نہیں ہوئی اور کوئی قطرۂ خون زمین پر نہیں گرا۔ بعد والی آیت وضاحت کے ساتھ فے کا مَصرف بتاتی ہے جو گزشتہ آیت میں آیا تھا۔ خداوندِ عالم ایک قاعدہ کلّی کے طور پر فرماتا ہے :

"جو کچھ خدا نے ان آبادیوں والے لوگوں سے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف پلٹایا ہے وہ خدا، رسولؐ، اس کے ذوی القربیٰ، یتیموں، مسکینوں اور راستوں میں درماندہ لوگوں کے لیے ہے۔ (ما افاء اللہ علیٰ رسولہ من اھل القریٰ فللہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل)۔ یعنی مسلح جنگ کے اموال غنیمت کی مانند نہیں جن کا صرف پانچواں حصہ پیغمبرؐ اور دوسرے حاجت مندوں کے اختیار میں ہے، باقی چار حصے جنگجو افراد کے لیے ہیں۔ نیز اگر گزشتہ آیت میں کہا گیا ہے کہ وہ تمام کا تمام رسولِؐ خدا سے متعلق ہے تو اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ سارے کا سارا اپنے شخصی اور ذاتی مصارف میں صَرف کریں بلکہ اس لیے کہ وہ اسلامی حکومت

---

[1] راغب مفردات میں کہتا ہے کہ خیل اصل میں خیال کے مادہ سے خیالات اور ذہنی تصورات کے معنی میں ہے اور "خیلا" تکبّر اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کے معنی میں ہے، اس لیے کہ ایک قسم کا تخیّل فضیلت سے پیدا ہوتا ہے اور چونکہ انسان جب گھوڑے پر سوار ہو تو عام طور پر ایک قسم کا غرور محسوس کرتا ہے لہٰذا لفظ خیل کا گھوڑے پر اطلاق ہوا ہے۔ قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ خیل گھوڑوں اور سواروں دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

کے سربراہ ہیں اور خصوصاً حاجت مندوں کے حقوق کے محافظ ہیں لہٰذا وہ اس کا زیادہ حصّہ ان پر خرچ کریں گے ۔

اس آیت میں کلی طور پر فے کے لیے چھ مصرف بیان ہوئے ہیں :

۱۔ سہم خدا :۔ واضح ہے کہ خدا ہر چیز کا مالک ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کسی چیز کا محتاج نہیں ہے ۔ یہ ایک قسم کی نسبت تشریفی و اعزازی ہے تاکہ دوسرے گروہ جو اس کے بعد بیان ہوئے ہیں کسی قسم کی حقارت محسوس نہ کریں اور اپنا حصّہ خدا کے حصّہ کا سلسلہ خیال کریں، اس طرح ان کی شخصیت عام افراد کے ذہنوں میں کسی نقص کا شکار نہ ہو ۔

۲۔ سہم پیغمبرؐ :۔ جس سے فطری طور پر ان کی ذاتی ضرورتیں، اس کے بعد مقامی حاجتیں اور وہ توقعات جو لوگ ان سے رکھتے ہیں وہ سب اس سے پوری ہوں ۔

۳۔ سہم ذوی القربیٰ :۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے یہاں مراد پیغمبرؐ کے ذوی القربیٰ ہیں اور بنی ہاشم ہیں جو زکوٰۃ کے لینے سے محروم ہیں جو عام مسلمانوں کے اموال کا جز ہے[1]

اصولی طور پر اس کے کوئی معنی نہیں کہ اس سے مراد عام لوگوں کے ذوی القربیٰ ہوں کیونکہ اس صورت میں تمام مسلمانوں کو بغیر کسی استثناء کے شامل کرنا پڑے گا کیونکہ تمام لوگ ایک دوسرے کے عزیز و اقربا ہیں ۔ اب رہا یہ کہ ذوی القربیٰ میں احتیاج و فقر شرط ہے یا نہیں اس پر مفسرین کے درمیان اختلاف ہے ۔ اگرچہ وہ قرائن جو اس آیت کے آخر میں اور بعد والی آیت میں ہیں اس کا شرط ہونا زیادہ صحیح نظر نہیں آتا ۔

۴، ۵، ۶ ۔ یتیموں، مسکینوں اور سفر میں درماندہ افراد کا حصّہ ہے ۔ یہ کہ یہ تینوں گروہ بنی ہاشم میں سے ہونے چاہئیں یا عام یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا اس میں حصّہ ہے مفسرین کے درمیان اس میں اختلاف ہے ۔ زیادہ تر فقہائے اہل سُنّت اور ان کے مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ عمومیت رکھتا ہے جب کہ وہ روایتیں جو طرق اہلبیت سے ہم تک پہنچی ہیں وہ اس سلسلہ میں مختلف ہیں ۔ بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصّہ بنی ہاشم کے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے مخصوص ہے لیکن بعض روایات میں تصریح ہوئی ہے کہ یہ حکم عمومیت رکھتا ہے ۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے اس طرح مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

(كان ابي يقول لنا سهم رسول الله وسهم ذي القربى ونحن شركاء الناس فيما بقي)

ہمارے لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ذوی القربیٰ کا حصّہ ہے اور ہم ان باقی ماندہ حصّوں میں لوگوں کے ساتھ شریک ہیں[2]

اس سُورہ کی آیت ۸، ۹ جو اس آیت کی وضاحت کرتی ہیں اور گواہی دیتی ہیں کہ یہ حصّہ بنی ہاشم کے لیے مخصوص نہیں ہے کیونکہ ان میں عام فقراء، مہاجرین و انصار کے بارے میں گفتگو ہے ۔ علاوہ ازیں مفسرین نے نقل کیا ہے کہ پیغمبرؐ نے بنو نظیر کے واقعہ کے بعد ان اموال

---

[1] یہ تفسیر نہ صرف شیعہ مفسرین نے بلکہ بہت سے اہل سنّت مفسرین نے بھی تحریر کی ہے مثلاً فخر رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں، برسوئی نے رُوح البیان میں، سید قطب نے فی ظلال میں، مراغی نے اپنی تفسیر میں اور آلوسی نے رُوح المعانی میں ۔

[2] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۶۱ ، وسائل الشیعہ جلد ۶ ص ۳۶۸ (حدیث ۱۲ باب ۱ ابواب انفال) ۔

کو جو دہ چھوڑ گئے تھے مہاجرین میں جو عام طور پر مدینہ میں سخت حالات میں زندگی گزار رہے تھے، اور انصار کے تین گروہوں میں جو بہت زیادہ حاجت مند تھے تقسیم کر دیے اور یہ امر آیت کے مفہوم کی عمومیت کی دلیل ہے۔ اَب اگر بعض روایات اس کی تائید نہ کرتی ہوں تو ظاہر قرآن کو ترجیح دینی چاہیئے۔[1]

اس کے بعد اس حساب شدہ تقسیم کے فلسفہ کو پیش کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے :

"یہ اس بنا پر ہے کہ یہ عظیم اموال تمہارے امیر لوگوں کے درمیان دست بدست گردش نہ کرتے رہیں اور حاجت مند اُن سے محروم ہوں۔" (کیلا یکون دولة بین الاغنیاء منکم)[2]

مفسرین نے اس جُملہ کے لیے خصوصیت کے ساتھ ایک شانِ نزول بیان کی ہے جس کی طرف پہلے بھی اجمالاً اشارہ ہو چکا ہے اور وہ یہ کہ رؤسا مسلمین کی ایک جماعت واقعہ بنی نظیر کے بعد پیغمبرؐ کی خدمت میں آئی اور عرض کیا جس کو آپ خُود منتخب کریں وہ اور ان اموال غنیمت کا چوتھا حصہ آپ لیجئے اور بقایا ہمارے اختیار میں دے دیجئے تاکہ ہم اپنے درمیان تقسیم کر لیں جیسا کہ اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں تھا۔ تو مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں متنبہ کیا کہ یہ اموال اغنیاء میں دست بدست گردش نہ کرنے پائیں۔ یہ آیت اقتصادِ اسلامی کے ایک بنیادی اصول کو بیان کرتی ہے اور وہ یہ کہ اسلام کے اقتصادی نظام کا مزاج۔ ہے کہ باوجود شخصی اور خصوصی مالکیت کے احترام کے سلسلہ کار ایسا رکھا جائے کہ مال و دولت ایک مخصوص گروہ میں محدُود ہو کر نہ رہ جائیں۔ اور ایسا نہ ہو کہ صرف انہیں کے درمیان گردش کریں۔ البتہ اس آیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم اپنی طرف سے قوانین وضع کر لیں اور مال و دولت ایک گروہ سے لے کر دوسرے گروہ کے حوالے کر دیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر دولت کے حصول کے سلسلہ میں اسلام کے مقرر کیے ہوئے اصول سرکاری مالیات مثلاً خُمس، زکوٰۃ اور اخراج وغیرہ کے احکام اور بیتُ المال و انفال کے احکام ٹھیک طرح سے عملی جامہ پہن لیں تو خود بخود یہ نتیجہ نکل آئے گا کہ باوجود انفرادی کوششوں کے احترام کے اجتماعی مصلحتیں بھی پُوری ہو جائیں گی۔ اور معاشرہ میں نہ بہت امیر طبقہ رہے گا نہ بہت غریب، بلکہ دولت کی معتدل تقسیم بروئے کار آئے گی۔ خداوند تعالیٰ آیت کے آخر میں فرماتا ہے :

"جو کچھ خدا کا رسولؐ تمہارے لیے لایا ہے اُسے لے لو اور جس سے اس نے تمہیں منع کیا ہے اس سے باز رہو اور تقویٰ اختیار کرو، اس لیے کہ خدا شدید العقاب ہے۔" (وما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنه فانتھوا واتقوا اللّٰه ان اللّٰه شدید العقاب)۔

یہ جملہ اگرچہ بنو نظیر کے اموالِ غنیمت کے بارے میں نازل ہوا ہے لیکن یہ مسلمانوں کے تمام کاروبارِ زندگی میں ایک حکمِ عمومی کی حیثیت رکھتا ہے اور نیز سنتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حجت ہونے کی ایک واضح دلیل ہے۔ اس اصولِ اساسی کے پیشِ نظر تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ پیغمبرؐ کے اوامر و نواہی کو گوشِ دل سے سُنیں اور ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں، خواہ وہ حکومتِ اسلامی سے تعلق رکھنے والے مسائل کے بارے میں ہوں یا اقتصادی مسائل سے متعلق ہوں یا حقوقِ بندگان کے بارے میں ہوں یا ان سے علیحدہ ہوں۔ یہ حقیقت خصوصیت کے ساتھ پیشِ نظر رکھنی چاہیئے کہ جو لوگ مخالفت کریں گے ان کو شدید عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۶ ص ۳۵۶ (حدیث ۴ باب ۱ ابواب انفال)۔

[2] "دولة" (دال کے زبر اور پیش کے ساتھ) ایک ہی معنی میں ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے ان کے درمیان فرق کیا ہے کہ پہلے کو اموال کے ساتھ مخصوص اور دوسرے کو جنگ کے ساتھ اور مقام کے ساتھ مربوط جانا ہے یا پہلے کو اسم مصدر اور دوسرے کو مصدر شمار کیا ہے۔ بہرحال تداول کے مادّہ سے دست بدست کرنے کے معنی میں دونوں ایک ہی ہیں۔

ایک نکتہ

۱- فیٔ کا مَصرف (وُہ اموالِ غنیمت جو بغیر جنگ کے حاصل ہوں ان کا مصرف)

وہ اموال جو فیٔ کے عنوان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبضہ میں سربراہِ حکومتِ اسلامی کی حیثیت سے آتے تھے وہ ان تمام اموال پر مشتمل ہوتے تھے جو بغیر جنگ مسلمانوں کے ہاتھ لگتے تھے۔ یہ اموال اسلامی معاشرہ میں اعتدالِ ثروت کے سلسلہ میں اہم کردار انجام دے سکتے تھے کیونکہ زمانۂ جاہلیت کی رسم کے خلاف یہ اموال کبھی بھی اقوام وقبائل کے دولت مندوں میں تقسیم نہیں ہوتے تھے بلکہ براہِ راست مسلمانوں کے سربراہِ اعلیٰ کے اختیار میں ہوتے تھے اور وہ بھی سب سے زیادہ استحقاق کے اصول کو پیشِ نظر رکھ کر تقسیم کیے جا سکتے تھے جیسا کہ انفال کی بحث میں ہم نے کہا ہے کہ فیٔ انفال کا ایک حصّہ ہے اور اس کا دوسرا حصّہ وہ تمام اموال ہیں جن کا مالک مشخص نہیں ہوتا۔ اس کی تشریح فقہ اسلامی میں ہو چکی ہے اور اس سے متعلق زیادہ موضوعات ہیں۔ اس طرح الٰہی نعمتوں کا زیادہ حصّہ حکومتِ اسلامی کے قبضہ میں جاتا اور اس کے بعد ضرورت مندوں کو ملتا[1]

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ پہلی اور دوسری آیت کے درمیان، جیسا کہ ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے، کوئی تضاد نہیں ہے اگرچہ پہلی آیت بظاہر فیٔ کو خُود پیغمبرؐ کے اختیار میں دیتی ہے اور دُوسری آیت میں اس کے چھ مَصرف بیان ہوئے ہیں اور وہ اس لیے کہ یہ چھ مصرف ان شدید استحقاق رکھنے والوں سے متعلق ہیں جن کا پیغمبرؐ کو خصوصیّت سے خیال رکھنا چاہیئے۔ بالفاظِ دیگر پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان تمام اموال کو اپنی ذات کے لیے اپنے پاس نہیں رکھتے بلکہ حکومتِ اسلامی کے سربراہ وامیر کی حیثیت سے جس شعبہ میں ضرورت محسوس کرتے ہیں صرف فرماتے تھے یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہ حق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آئمہ معصومین کو اور ان کے بعد ان کے نائبین کو یعنی مجتہدینِ جامع الشرائط کو پہنچتا ہے کیونکہ اسلامی احکام کبھی معطّل نہیں ہوتے اور حکومتِ اسلامی ان اہم ترین مسائل میں سے ہے جس سے مسلمان سروکار رکھتے ہیں اور اس حکومت کی بنیاد کا ایک حصّہ اقتصادی مسائل پر منحصر ہے اور اصلی اسلامی اقتصادی مسائل یہی ہیں۔

۲۔ ایک سوال کا جواب

یہاں ہو سکتا ہے یہ سوال پیش ہو کہ خدا نے یہ حکم کس طرح دیا ہے کہ تمام افراد، بغیر کسی استثناء کے، جو کچھ پیغمبرؐ کہیں اسے بلا حیل وحجت قبول کر لیں لیکن اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ پیغمبرؐ کو معصوم کہتے ہیں اور یہ حق صِرف ان کے لیے اور ان کے معصوم جانشینوں کے لیے ہے

[1] "انفال" کے بارے میں مختلف موضوع اس طرح ہیں : (۱) وہ زمینیں جن کے مالکوں نے انہیں چھوڑ دیا ہے اور وہ وہاں سے چلے گئے (بنی نظیر کے یہودیوں کی زمینوں کی طرح) (۲) وہ زمینیں جن کے مالکوں نے انہیں اپنی مرضی سے مسلمانوں کے سربراہ کے سپرد کر دیا (فدک کی طرح) (۳) اراضی موات (غیر آباد زمینیں)۔ (۴) سمندروں کے کنارے۔ (۵) پہاڑوں کی چوٹیاں۔ (۶) درّے (۷) جنگلات (۸) بادشاہوں کے منتخب اموال جو جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ لگیں۔ (۹) جو کچھ مسلمانوں کا پیشوا اموالِ غنیمت میں سے اپنے لیے رکھے (۱۰) وہ اموالِ غنیمت جو ان جنگوں کے ذریعہ مسلمانوں کے ہاتھ لگیں جو سربراہِ مسلمین کی اجازت کے بغیر لڑی گئی ہوں۔ (۱۱) معدنیات (۱۲) اس شخص کی میراث جس کا کوئی وارث نہ ہو۔ (مذکورہ بالا بعض موارد میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے لیکن اکثریت ان موارد کو قبول کرتی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے کتب فقہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ بہت سی روایتوں میں اس مسئلہ کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ اگر خدا نے اپنے پیغمبر کو اس قسم کے اختیارات دیے ہیں تو یہ اس لیے ہیں کہ خدا نے اسے مکمل طور پر آزمایا ہے اور وہ حد سے زیادہ اخلاق حسنہ کا مالک ہے خلق عظیم کا مصداق ہے۔ یہ وجہ ہے کہ یہ حق اس پیغمبر کو منجانب اللہ تفویض کیا گیا ہے۔[1]

۲۔ فدک کی غم انگیز داستان

فدک اطرافِ مدینہ میں تقریباً ایک سو چالیس کلومیٹر کے فاصلہ پر خیبر کے نزدیک ایک آباد قصبہ تھا۔ جب سات ہجری میں خیبر کے قلعے یکے بعد دیگرے افواج اسلامی نے فتح کر لیے اور یہودیوں کی مرکزی قوت ٹوٹ گئی تو فدک کے رہنے والے یہودی صلح کے خیال سے بارگاہ پیغمبر میں سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے آئے اور انہوں نے اپنی آدھی زمینیں اور باغات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد کر دیے اور آدھے اپنے پاس رکھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حصّہ کی زمینوں کی کاشتکاری بھی اپنے ذمہ لی۔ اپنی کاشتکاری کی زحمت کی اُجرت وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وصول کرتے تھے۔ اس سورہ کی آیت فئ کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ زمینیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملکیت خا تھیں۔ اُن کی آمدنی کو آپؐ اپنے مَصرف میں لاتے تھے یا ان مدات میں خرچ کرتے تھے جن کی طرف اس سورہ کی آیت ۷ میں اشارہ ہوا ہے۔ لہٰذا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ساری زمینیں اپنی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کو عنایت فرما دیں یہ ایسی حقیقت ہے جسے بہت سے شیعہ اور اہلِ سنّت مفسرین نے تصریح کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ منجملہ دیگر مفسرین کے تفسیر درالمنثور میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جس وقت آیت (فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ) (روم ۳۸) نازل ہوئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کو فدک عنایت فرمایا:

(اقطع رسول الله فاطمة فدكا)[2]

کتاب کنزالعمال جو مسند احمد کے حاشیہ پر لکھی گئی ہے، میں صلہ رحم کے عنوان کے ماتحت ابو سعید خدری سے منقول ہے کہ جس وقت مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فاطمہ سلام اللہ علیہا کو طلب کیا اور فرمایا:

(يا فاطمة لك فدك)

اے فاطمہ فدک تیری ملکیت ہے۔[3]

حاکم نیشاپوری نے بھی اپنی تاریخ میں اس حقیقت کو تحریر کیا ہے۔[4]

ابن ابی الحدید معتزلی نے بھی نہج البلاغہ کی شرح میں داستانِ فدک تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے اور اسی طرح بہت سے دیگر مورخین نے بھی[5]

[1] وہ روایات جو اس بحث کو اچھی طرح پیش کرتی ہیں ان کے لیے تفسیر نور الثقلین کی جلد ۵ ص ۲۷۹ سے لے کر ص ۲۸۲ تک ملاحظہ کیے جائیں۔

[2] درالمنثور جلد ۴ ص ۱۷۷۔

[3] کنزالعمال جلد ۲ ص ۱۵۸۔

[4] کتاب فدک ص ۴۹ ملاحظہ فرمائیں۔

[5] شرح ابن ابی الحدید جلد ۱۶ ص ۲۰۹ سے آگے۔

لیکن وہ افراد جو اس اقتصادی قوت کو حضرت علی علیہ السلام کی زوجہ محترمہ کے قبضہ میں رہنے دینا اپنی سیاسی قوت کے لیے مضر سمجھتے تھے، انہوں نے مصمم ارادہ کیا کہ حضرت علی علیہ السلام کے یاور و انصار کو ہر لحاظ سے کمزور اور گوشہ نشین کر دیں۔ حدیث مجہول (نحن معاشر الانبیاء ولا نورث) کے بہانے انہوں نے اسے اپنے قبضہ میں لے لیا اور باوجودیکہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا قانونی طور پر اس پر متصرف تھیں اور کوئی شخص " ذوالید " (جس کے قبضہ میں مال ہو) سے گواہ کا مطالبہ نہیں کرتا جناب سیدہؑ سے گواہ طلب کیے گئے۔ بی بی نے گواہ پیش کیے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود انہیں فدک عطا فرمایا ہے لیکن انہوں نے ان تمام چیزوں کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ بعد میں آنے والے خلفاء میں سے جو کوئی اہلبیت سے محبت کا اظہار کرتا تو وہ فدک انہیں لوٹا دیتا لیکن زیادہ دیر نہ گزرتی کہ دوسرا خلیفہ اس کو چھین لیتا اور دوبارہ اس پر قبضہ کر لیتا۔ خلفائے بنی اُمیہ اور خلفائے بنی عباس بارہا یہ اقدام کرتے رہے۔ واقعہ فدک اور اس سے تعلق رکھنے والے مختلف النوع حوادث جو صدر اسلام میں اور بعد کے ادوار میں پیش آئے بہت زیادہ دردناک اور غم انگیز ہیں اور وہ تاریخ اسلام کا ایک عبرت انگیز حصہ بھی ہیں جو محققانہ طور پر مستقل مطالعہ کا متقاضی ہے تاکہ تاریخ اسلام کے مختلف حوادث نگاہوں کے سامنے آسکیں۔

۸۔ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ
اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّ يَنْصُرُوْنَ
اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ

۹۔ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ
هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً
مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ
خَصَاصَةٌ ؕ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُفْلِحُوْنَ ۚ

۱۰۔ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا
وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ
قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۧ

ترجمہ

۸۔ یہ اموال ان مہاجرین کے لیے ہیں جو اپنے گھر بار اور اموال سے باہر نکالے گئے ہیں اور وہ

اللہ کے فضل اور اس کی رضا کو طلب کرتے ہیں اور خُدا اور اس کے رسُولؐ کی مدد کرتے ہیں، وُہ سچے ہیں۔

۹۔ اور ان لوگوں کے لیے جو دارالہجرۃ (مدینہ) اور ایمان کے گھر میں مہاجرین سے پہلے سکونت اختیار کیے ہوئے ہیں وُہ ایسے لوگوں کو جو ان کی طرف ہجرت کریں، دوست رکھتے ہیں اور اپنے دل میں اس چیز کے لیے جو مہاجرین کو دی گئی ہے کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے، وہ مہاجرین کو خُود پر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ شدّت سے فقیر ہوں اور جن لوگوں کو خُدا نے بُخل اور اپنے نفس کی حرص سے بچا رکھا ہے وہی رُستگار اور نجات پانے والے ہیں۔

۱۰۔ اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئے ہیں اور کہتے ہیں پروردگارا! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو، جنہوں نے ایمان لانے میں ہم پر سبقت کی ہے، بخش دے اور ہمارے دلوں میں مومنین کی نسبت حسد و کینہ قرار نہ دے۔ پروردگار تو مہربان اور رحیم ہے۔

تفسیر

تین گروہ مہاجرین، انصار اور تابعین اور ان کے نمایاں اوصاف

یہ آیتیں گزشتہ آیتوں کے مباحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں جو مال فیٔ کے چھ مصارف کے بارے میں تھیں اور جو حقیقت میں تیموں، مسکینوں اور درماندہ مسافروں کی تفسیر ہیں اور سب سے زیادہ ابن السبیل کی تفسیر ہیں کیونکہ مسلمان مہاجرین کی زیادہ تر تعداد انہی پر مشتمل تھی جو اپنے وطن اور شہر میں تو مسکین نہیں تھے لیکن ہجرت کی بنا پر تہی دست ہو گئے تھے۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے:

"یہ اموال اُن مہاجرین کے لیے ہیں جو اپنے گھروں سے باہر نکالے گئے ہیں": للفقراء المهاجرين الّذين اخرجوا من ديارهم واموالهم)[1]

"وہ خدا کے فضل اور اس کی رضا کو طلب کرتے ہیں اور خدا اور اس کے رسُولؐ کی مدد کرتے ہیں اور وہ سچے ہیں"۔ (يبتغون فضلاً من الله ورضوانًا وينصرون الله ورسوله اولٰئك هم الصادقون)۔ یہاں مہاجرین کے تین اہم اوصاف بیان کیے گئے ہیں جو اخلاص جہاد

---

[1] للفقراء بدل ہے اور ابن السبیل کی تفسیر ہے۔

اور صدق پر منحصر ہیں۔ سب سے پہلے " ابتغائے فضلِ خدا و رضائے خدا" کو پیش کرتا ہے جو اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ ان کی ہجرت دنیا اور ہوائے نفس کے لیے نہیں تھی بلکہ پروردگار کی خوشنودی اور اس سے حاصل ہونے والے ثواب کے لیے تھی۔ اس بنا پر فضل یہاں ثواب کے معنی میں ہے اور رضوان خوشنودیٔ پروردگارِ عالم ہے جو تمنائے ثواب کا بلند ترین مرحلہ ہے، جیسا کہ متعدد آیاتِ قرآنی میں بھی یہی معنی آئے ہیں۔ منجملہ دیگر آیات کے سُورہ فتح کی آیت ۲۹ میں جہاں اصحاب پیغمبرِ خدا کی اس عبارت کے ساتھ توصیف کرتا ہے۔ (تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ و رضوانا) تُو ان کو ہمیشہ رکوع و سجود میں دیکھے گا جب کہ وہ خدا کے فضل اور اس کی رضا کو طلب کرتے ہیں۔ فضل کی تعبیر ممکن ہے اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کہ وہ اپنے اعمال کو اتنا حقیر سمجھتے ہیں کہ اسے مستحق ثواب ہی نہیں سمجھتے بلکہ ثواب کو وہ ایک انعام الٰہی شمار کرتے ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت نے فضل کی یہ تفسیر کی ہے کہ اس سے مُراد دُنیاوی رزق ہے۔ کیونکہ بعض دوسری آیاتِ قرآنی میں یہی معانی آئے ہیں۔ لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ مہاجرین کے اخلاص کے بیان کا مقام ہے، یہ معنی مناسب نہیں ہیں بلکہ مناسب وہی اجرِ خداوندی ہے۔ البتہ یہ احتمال بعید نہیں ہے کہ فضل سے جنّت کی جسمانی نعمتوں کی طرف اشارہ ہو اور رضوان معنوی اور رُوحانی نعمتوں کی طرف، لیکن جو کچھ بھی ہو وہ آخرت سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ دنیا سے۔ دوسرے یہ کہ وہ ہمیشہ دینِ حق اور خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کرتے ہیں اور اس راہ میں جہاد کرنے سے ایک لمحے کے لیے بھی دست بردار نہیں ہوتے۔ (توجہ رکھنی چاہیئے کہ ینصرون کا جملہ فعل مضارع اور استمرار کی دلیل ہے) تو اس طرح وہ صرف زبانی دعویٰ نہیں کرتے بلکہ انہوں نے اپنے اعمال کو مستقل جہاد سے ثابت کیا ہے۔ تیسرے مرحلہ میں خداوندِ عالم ان کی سچائی کے عنوان کے تحت تعریف کرتا ہے جس کے وسیع مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے ان کی صداقت کو ہر چیز میں منعکس کرتا ہے۔ وہ ایمان کے دعویٰ میں بھی سچے ہیں، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کے دعویٰ میں بھی اور دینِ حق کی طرف داری کے سلسلہ میں بھی۔ بغیر اظہار کیے یہ بات واضح ہے کہ یہ صفات اصحابِ پیغمبر میں ان آیات کے نزول کے زمانے میں تھیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان کے اندر کچھ ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے راستہ بدل لیا اور اس آیت کے عظیم اعزازات و افتخارات سے اپنے آپ کو محروم کر لیا، ان لوگوں کی طرح جنہوں نے بصرہ میں جنگِ جمل کی آگ اور شام میں صفین کی آگ بھڑکائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس خلیفۂ برحق کے مقابلہ میں، جس کی باتفاق مسلمین، اطاعت واجب تھی، آمادۂ جدال و قتال ہوئے اور اس طرح انہوں نے ہزاروں مسلمانوں کا خُونِ ناحق بہایا۔ اور پھر انہی جیسے دوسرے افراد بھی انہی کے زمرہ میں ہیں۔ بعد والی آیت میں ان اموال کے ایک اور مصرف کو پیش کرنے کے ضمن میں گروہِ انصار کی ایک بہت ہی جاذبِ توجہ، عُمدہ اور بلیغ توصیف پیش کرتا ہے اور وہ بحث جو گزشتہ آیت میں مہاجرین سے متعلق تھی اس کی تکمیل کرتے ہوئے فرماتا ہے :

" اور وہ لوگ جو دارالہجرۃ میں (مدینہ میں) اور ایمان کے گھر میں مہاجرین سے پہلے سکونت پذیر تھے"۔(والذین تبوؤ الدار والایمان من قبلھم)۔ قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ " تبوؤ" " بواء "(بروزن دوا) کے مادّہ سے اصل میں اجزائے مکان کی مساوات کے معنی میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں مکان کو صاف سُتھرا اور مرتب رکھنے کے لیے " بواء " آتا ہے۔ یہ تعبیر ایک لطیف کنایہ ہے اس اعتبار سے کہ انصار مدینہ اس سے پہلے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مہاجرین اس شہر میں وارد ہوں ہجرت کے لیے راہ ہموار کر چکے تھے اور جیسا کہ تاریخ کہتی ہے وہ دو مرتبہ " عقبہ " (مکّے کے قریب ایک گھاٹی ہے) میں آئے اور پوشیدہ طور پر انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کی اور مبلّغین کی شکل میں مدینہ لَوٹ گئے۔ یہاں تک کہ مکّے کے مسلمانوں میں سے ایک شخص مصعب ابن عمیر کو مبلّغ کی حیثیت سے وہ مدینہ اپنے ہمراہ لے گئے تاکہ عوام کے ذہنوں کو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کے لیے آمادہ کریں۔ اس وجہ سے نہ صرف یہ کہ انہوں نے اپنے ظاہری گھروں کو

مہاجرین کی پذیرائی کے لیے آمادہ کیا بلکہ اپنے خانۂ دل کو اور شہر کے ماحول کو بھی جتنا ہو سکتا تھا مہاجرین کے استقبال کے لیے سازگار بنایا۔" من قبلھم" کی تعبیر بتاتی ہے کہ یہ سب مکے کے مسلمانوں کی ہجرت سے پہلے ہو چکا تھا اور یہی چیز اہم ہے۔ اس تفسیر کے مطابق مدینہ کے انصار بھی ان اموال کے مستحقین میں سے تھے۔ یہ چیز اس سے تضاد نہیں رکھتی جو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے گروہ انصار میں سے صرف دو یا تین افراد کو اموالِ بنی نظیر میں سے کچھ عنایت فرمایا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ انصارِ مدینہ میں ان چند کے علاوہ مسکین و فقیر نہ ہوں جب کہ ان اموال کے استحقاق کی بنیادی شرط فقر ہے۔ مہاجرین کی صورتِ حال اس کے بالکل برعکس تھی اگر وہ فقیر کے مصداق نہ بھی ثابت ہوتے تو ابن السبیل ضرور تھے۔

اس کے بعد تین اور ایسے اوصاف جو انصار کے جذبات و احساسات کو بیان کرتے ہیں، پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"وہ لوگ اس طرح ہیں جو ہر اس مسلمان کو، جو ان کی طرف ہجرت کر کے آئے، دوست رکھتے ہیں۔" (یحبون من ھاجر الیھم)۔
اور اس سلسلہ میں ان کی نظر میں تمام مسلمان برابر ہیں بلکہ ان کے نزدیک ایمان و ہجرت اہم مسئلہ ہے۔ یہ دوست رکھنا ان کی ایک مستقل خصوصیت ہے۔
دوسرے یہ کہ وہ اپنے سینہ میں، اس کے بارے میں جو مہاجرین کو دیا گیا ہے، کسی قسم کی احتیاج محسوس نہیں کرتے۔ (ولا یجدون فی صدورھم حاجۃ مما اوتوا)۔ نہ ان اموال غنیمت پر ان کی آنکھ ہے جو انہیں دیے گئے ہیں اور نہ وہ ان سے حسد کرتے ہیں حتیٰ کہ جو چیزیں مہاجرین کو عطا ہوئی ہیں ان کے متعلق اپنے دل میں کوئی احتیاج محسوس نہیں کرتے۔ یہ چیز انصار کی انتہائی عظمت اور بلند نظری پر دلالت کرتی ہے تیسرے مرحلہ میں مزید فرماتا ہے:

"وہ مہاجرین کو خود پر مقدم سمجھتے ہیں اور انہیں ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود بہت زیادہ فقر میں مبتلا ہیں۔" (و یؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ)[1]

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر انصار کی تین نمایاں خصوصیات ہیں۔ ایک محبت، دوسرے بلند نظری اور تیسرے ایثار۔ مفسرین نے اس آیت کی شانِ نزول میں متعدد داستانیں بیان کی ہیں۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی نظیر کے یہودیوں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے کے دن انصار سے فرمایا:

"اگر پسند کرو تو اپنے مال اور گھر مہاجرین میں تقسیم کر دو اور ان اموال غنیمت میں ان کے ساتھ شریک ہو جاؤ اور اگر چاہو تو تمہارے اموال اور گھر تمہارے ہی رہیں اور ان اموال میں سے تمہیں کوئی چیز نہ دی جائے۔" اس پر انصار نے کہا:

"ہم اپنے اموال اور گھر بھی مہاجرین میں تقسیم کر دیتے ہیں اور اموالِ غنیمت میں سے بھی کچھ نہیں لیتے۔ ہم مہاجرین کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔" اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور ان کے اس اعلیٰ جذبہ کی تعریف کی۔[2]

۱۔ "خصاصۃ" "خصاص" کے مادہ سے (بروزن اساس) ان شگافوں کے معنی میں ہے جو گھر کی دیوار میں پڑ جاتے ہیں چونکہ فقر و فاقہ انسان کی زندگی میں شگاف پیدا کر دیتا ہے۔ لہٰذا اسے خصاصہ کہا گیا ہے۔

۲۔ مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۶۰

ایک اور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ ایک شخص خدمت پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آیا اور عرض کیا:

"میں بھوکا ہوں"

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا:

"میرے گھر سے اس کے لیے کھانا لے آئیں" لیکن آپؐ کے گھر میں کھانا نہیں تھا اس پر آپؐ نے فرمایا: "کون شخص ہے جو آج رات اس شخص کو مہمان رکھے"؟

انصار میں سے ایک شخص نے آمادگی ظاہر کی۔ وہ اسے اپنے گھر لے گیا۔ اس کے گھر میں تھوڑی سی غذا کے علاوہ کچھ نہیں تھا اور وہ بھی ان کے بچوں کے لیے تھی۔ اُس نے زوجہ سے کہا کہ مہمان کے لیے کھانا لے آئے اور چراغ گل کر دے اور جس طرح ممکن ہو بچوں کو سُلا دے۔ اس کے بعد بیوی اور شوہر دونوں دسترخوان پر بیٹھ گئے اور بغیر اس کے کہ کھانے میں سے کچھ کھائیں وہ اپنا منہ چلاتے رہے۔ مہمان نے خیال کیا کہ وہ بھی اس کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔ اُس نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ وہ دونوں میاں بیوی اس رات بھوکے سوئے۔ صبح کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ آپؐ ان کی طرف دیکھ کر مُسکرا دیے اور بغیر اس کے کہ وہ کچھ کہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مندرجہ بالا آیت کی تلاوت فرمائی اور ان کے ایثار کی تعریف کی۔ اُن روایات میں جو طُرقِ اہل بیتؑ سے پہنچی ہیں آیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام اور ان کے چھوٹے چھوٹے میزبان تھے اور جس نے بچوں کو بھوکا سُلا دیا وہ بانوئے اسلام حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا تھیں[1]۔

توجہ کرنی چاہیئے کہ ہو سکتا ہے پہلی داستان آیت کی شانِ نزول ہو۔ لیکن دوسری صُورتِ حال پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے حکم کی تطبیق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ایثار پر مبنی مہمانی کے بارے میں آیت کی تلاوت فرمائی۔ اس وجہ سے انصار کے بارے میں آیات کا نزول حضرت علی علیہ السلام کے میزبان ہونے کے ساتھ منافات نہیں رکھتا۔ بعض مفسّرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ آیت اُحد کی جنگ کے غازیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن میں سے سات افراد بہت زیادہ پیاسے تھے اور زخمی بھی تھے۔ کوئی شخص ایک آدمی کی پیاس بجھانے کی مقدار کے برابر پانی لے کر آیا۔ وہ جس کے پاس لے کر گیا اس نے دُوسرے کا حوالہ دیا اور اُسے اپنے اُوپر ترجیح دی آخرکار سب نے پیاس کی حالت میں جان دے دی اور خدا نے ان کے اس ایثار کی تعریف و توصیف کی[2]۔

لیکن واضح رہے کہ یہ آیت بنی نظیر کے واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے جب کہ اپنے مفہوم کی عمومیت کی بناء پر یہ آیت مشابہ موارد پر تطبیق ہے۔ آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے مذکورہ اوصاف کریمہ کی بنا پر اور نتیجے کے بیان کے طور پر مزید فرماتا ہے:

"وہ لوگ جن کو خدا نے بُخل اور حرص سے روکا وہی رستگار ہیں"۔ (ومن یوق شح نفسہ فاولٓئک ھم المفلحون)۔

"شح" جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے ایسے بخل کے معنی میں ہے جس میں حرص شامل ہو اور جو عادت بن چکا ہو۔ "یوق" "وقایۃ" کے مادہ سے اگرچہ فعل مجہول کی شکل میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کا فاعل یہاں خدا ہے یعنی جس شخص کو خدا اس عیب سے محفوظ رکھے وہ کامیاب ہے۔

ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک صحابی سے فرمایا:

(اتدری ماالشحیح)

---

1. مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۶۰
2. مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۶۲

"کیا تم جانتے ہو کہ شحیح کون ہے"؟

اُس نے جواب میں عرض کیا: ھو البخیل۔

تو امام علیہ السلام نے فرمایا:

"اشح اشد من البخل۔ ان البخیل یبخل بما فی یدہ والشحیح یشح بما فی ایدی النّاس وعلی ما فی یدہ حتّٰی لا یری فی ایدی النّاس شیئًا الّا تمنّٰی ان یکون لہ بالحلال والحرام ولا یقنع بما رزقہ اللہ عزّ وجل"

شح بُخل سے زیادہ سخت ہے۔ بخیل وہ ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہو اس کے متعلق بخل کرے لیکن شحیح وہ ہے جو اس کے بارے میں بھی بُخل کرتا ہو جو لوگوں کے پاس ہو اور جو کچھ اس کے اپنے پاس ہو اس میں بھی۔ یہاں تک کہ جو کچھ لوگوں کے پاس ہے وہ آرزو کرتا ہے کہ اس کے ہاتھ آجائے چاہے حلال طریقہ سے ہو چاہے حرام سے اور جو رزق اسے خدا نے دیا ہے اس پر کبھی قناعت نہیں کرتا۔[1]

ایک اور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

"لا یجتمع الشح والایمان فی قلب رجل مسلم ولا یجتمع غبار فی سبیل اللہ ودخان جھنم فی جوف رجل مسلم"

"بُخل و حرص و ایمان ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے جس طرح راہ جہاد کا گرد و غبار اور جہنم کا دھواں ایک مردِ مُسلمان کے اندر جمع نہیں ہو سکتے"۔

مختصر یہ کہ مندرجہ بالا آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ بُخل و حرص ترک کرنا انسان کو فلاح و کامیابی تک پہنچاتا ہے، جب کہ اس عیب سے آلودگی سعادتِ انسانی کے قصر کو ڈھا دیتی ہے اور اسے ویران کر دیتی ہے۔ آخری زیرِ بحث آیت مسلمانوں کے تیسرے گروہ کے بارے میں گفتگو کرتی ہے جو قرآن مجید کے الہام و ہدایت کی بنا پر ہمارے درمیان تابعین کے نام سے معروف ہیں۔ وہ مہاجرین و انصار کے بعد جن کے متعلق گزشتہ آیات میں گفتگو آئی تھی مسلمانوں کے تیسرے عظیم گروہ کو تشکیل دیتے ہیں۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے:

"اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئے ہیں وہ کہتے ہیں پروردگارا! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو جنہوں نے ایمان میں ہم پر سبقت حاصل کی ہے بخش دے اور ہمارے دلوں میں مومنین کی نسبت حسد و کینہ قرار نہ دے۔

پروردگارا! "تو مہربان و رحیم ہے"۔ (والذین جاءو من بعدھم یقولون ربّنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلًّا للذین اٰمنوا ربّنا انّک رءوف رحیم)۔

اگرچہ بعض مفسرین نے اِس جملہ کا مفہوم ان لوگوں میں محدود کر دیا جو اسلام کی کامیابی اور فتح مکّہ کے بعد مسلمانوں کے ساتھ آن ملے لیکن اس محدودیّت کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ قیامت تک کے تمام مسلمان اس میں شامل ہیں۔ (والذین جاءو ......) کا جملہ بظاہر عطف ہے "للفقراء المھاجرین" پر اور اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ اموالِ فیٔ مہاجرین و انصار کے مساکین کے لیے نہیں ہیں بلکہ قیامت تک آنے والے تمام مسلمان بھی اس میں شامل ہیں۔ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ یہ ایک مستقل جملہ ہے۔ (اس طرح سے والذین جاءو مبتدا اور

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۹۱ حدیث ۶۴

(اُن) خبر ہے)۔ لیکن گزشتہ آیات سے اس کی ہم آہنگی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ یہاں بھی (تابعین) کے تین اوصاف بیان کیے گئے ہیں پہلی صفت یہ کہ وہ اپنی اصلاح ، طلبِ آمرزش اور بارگاہِ خدا میں توبہ کی فکر میں رہتے ہیں۔ دوسری صفت (یہ کہ وہ) ایمان کی طرف سبقت کرنے والے کو بڑے بھائی کی طرح دیکھتے ہیں جو ہر لحاظ سے قابلِ احترام ہوتے ہیں اور ان کے لیے بھی بارگاہِ خدا (سے) بخشش و مغفرت کی استدعا کرتے ہیں۔ تیسری صفت یہ کہ ان کی کوشش ہے کہ ہر قسم کا کینہ، دشمنی اور حسد اپنے دل سے باہر نکال دیں (اور) اس راہ میں خداوندِ رؤف و رحیم سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے اپنی شخصیت کی تعمیر، ایمان کی طرف سبقت کرنے والوں کا احترام (اور) کینہ و حسد سے دُوری ان کی خصوصیات ہیں۔ "غل" (بروزن سل) جیسا کہ پہلے بھی ہم نے عرض کیا ہے اصل میں کسی چیز کے پوشیدہ طور پر (نفوذ) کے معنی میں ہے۔ اسی لیے درختوں کے درمیان جاری رہنے والے پانی کو "غلل" کہتے ہیں اور چونکہ حسد، عداوت اور دشمنی پوشیدہ طور پر انسان کے (باطن) میں نفوذ کرتے ہیں، اس لیے اسے "غل" کہا جاتا ہے اس بنا پر غل صرف حسد کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں (بہت) سے عیوب اور قبیح عادات شامل ہیں۔ "اخوان" (بھائی) کی تعبیر اور آیت کے آخر میں خداوند رؤف و رحیم سے مدد طلب کرنا رُوحِ محبت و (صفا) ہے اور اخوت کا ترجمان ہے جسے سارے اسلامی معاشرہ پر فرماں روا ہونا چاہیئے۔ اور جو شخص کسی نیکی کو چاہتا ہے وہ صرف اپنے لیے نہ (چاہ)ے بلکہ تمام کوششیں اجتماعی شکل میں سب کے لیے انجام پانی چاہئیں اور ہر قسم کا کینہ، بُغض، عداوت، دُشمنی، بخل، حرص اور حسد سینوں سے دھو دینا چاہیے

ایک نکتہ : صحابہ قرآن و تاریخ کی میزان میں

یہاں بعض مفسّرین ان اوصاف کی طرف توجہ کیے بغیر، جو مہاجرین و انصار اور تابعین میں سے ہر ایک کے لیے مندرجہ بالا آیت میں آئے ہیں (اصرار) رکھتے ہیں کہ تمام صحابہ کو بغیر کسی استثناء کے پاک و منزہ شمار کریں اور وہ غلط کام جو بعض اوقات خود زمانہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں یا (آپ) کے بعد ان میں سے بعض سے سرزد ہوئے ہیں، ان سے چشم پوشی کی جائے اور جو شخص بھی مہاجرین و انصار و تابعین کی صف میں قرار پایا ہے، (آنکھیں) بند کرکے اُسے مقدس و محترم سمجھیں۔ حالانکہ مندرجہ بالا آیت ان افراد کو دندان شکن جواب دیتی ہے اور سچے مہاجرین و انصار و تابعین کے ضوابط و (معیار) باریک بینی کے ساتھ معیّن کرتی ہے۔ مہاجرین میں پروردگارِ عالم اخلاص جہاد اور صدق بتاتا ہے۔ اور انصار میں مہاجرین کی بہ نسبت (محبت)، ایثار اور ہر قسم کے بُخل و حرص سے پرہیز کی نشان دہی کرتا ہے اور تابعین میں شخصی تعمیر، ایمان میں سبقت کرنے والوں کا احترام (اور ہر) قسم کے کینہ و حسد سے پرہیز جیسی صفات کو بیان کرتا ہے۔ ان حالات میں ہم اُن افراد کو کس طرح محترم شمار کریں جو جنگِ جمل (کے) افراد تھے اور انہوں نے اپنے امام و رہبر کے خلاف تلوار کھینچی۔ انہوں نے نہ تو اخوتِ اسلامی کی رعایت کی نہ اپنے سینوں کو غل، حسد اور بُخل سے پاک کیا اور نہ حضرت علی علیہ السلام کی سبقتِ ایمانی کا احترام کیا۔ ہم کس طرح ان پر ہر قسم کی تنقید کو (نا روا) سمجھیں اور آنکھیں بند کرکے ان کے اور ان کی باتوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ اس بنا پر خطِ ایمان کی طرف سبقت کرنے والوں کے احترام کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ان کے ایمان کے معاملے کو پیغمبرؐ کے زمانے کے حوالے سے اور ان شدید طوفانوں میں جو آپ کے بعد اسلامی معاشرہ کو لاحق ہوئے، ان کے حوالے سے باریک بینی اور دقتِ نظر کے ساتھ زیرِ مطالعہ رکھیں گے اور ان معیاروں کی (دلی)ل پر جو قرآن کی آیات سے ہمیں معلوم ہوئے ہیں، ان کے بارے میں فیصلہ کریں گے اور اپنا تعلق ان کے ساتھ مستحکم رکھیں گے (جنہوں) نے عہد و پیمان پر قائم رہے ہیں اور ان سے جنہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اپنا رابطہ آپ سے توڑ لیا، ہم رشتہ توڑ لیں گے۔ یہ ہے صحیح اور حکم قرآن و عقل سے ہم آہنگ منطق۔

۱۱۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ
مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ
لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝
۱۲۔ لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا
لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ
لَا يُنْصَرُوْنَ ۝
۱۳۔ لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝
۱۴۔ لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ
وَّرَاۗءِ جُدُرٍ ۭ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ۭ تَحْسَبُهُمْ
جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا
يَعْقِلُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۱۔ کیا تُو نے منافقین کو نہیں دیکھا جو اہلِ کتاب میں سے اپنے کافر بھائیوں سے کہتے تھے جس وقت تمہیں (وطن سے) باہر کریں تو ہم بھی تمہارے ساتھ ہوں گے اور تمہارے معاملہ میں کسی کی اطاعت نہیں کریں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔

۱۲۔ اگر انہیں باہر نکال دیں تو یہ ان کے ساتھ باہر نہیں جائیں گے اور اگر ان سے جنگ ہوئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے اور اگر مدد کریں بھی تو میدان سے فرار کریں گے پھر ان کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔

۱۳۔ تمہاری وحشت ان کے دلوں میں خدا کے خوف سے زیادہ ہے یہ اس بنا پر کہ وہ نادان گروہ ہے۔

۱۴۔ وہ کبھی بھی تمہارے ساتھ مجموعی صُورت میں جنگ نہیں کریں گے مگر مضبُوط قلعوں کے اندر سے یا دیواروں کے پیچھے سے۔ ان کی جنگ آپس میں شدید ہے۔ (لیکن تمہارے مقابلہ میں کمزور ہیں) ان کے ظاہر کی طرف تو دیکھتا ہے تو انہیں متحد پاتا ہے۔ جب کہ ان کے دل پراگندہ ہیں۔ یہ اس بنا پر ہے کہ وہ بے عقل قوم ہیں۔

شانِ نزول

مندرجہ بالا آیت کے لیے بعض مفسّرین نے ایک شانِ نزول بیان کی ہے جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔ منافقینِ مدینہ کے ایک گروہ عبداللہ بن ابی وغیرہ نے پوشیدہ طور پر کسی کو بنی نظیر کے یہودیوں کے پاس بھیجا اور کہا کہ تم آرام سے بیٹھے رہو۔ اپنے گھروں سے باہر نہ نکلو۔ اپنے قلعوں کو مستحکم کرلو۔ ہمارے پاس دو ہزار افراد ہیں جو آخر دم تک تمہاری مدد کے لیے تیار ہیں۔ بنی قریظہ اور تمہارے حلیف قبیلہ غطفان کے لوگ بھی تمہارا ساتھ دیں گے۔ یہی وہ محرک تھا جس نے بنی نظیر کے یہودیوں کو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت پر اُبھارا۔ لیکن اسی دوران بنی نظیر کے ایک سردار جس کا نام سلام تھا اس نے حی ابنِ اخطب سے، جو بنی نظیر کے لائحہ عمل کا نگرانِ خاص تھا، کہا تو عبداللہ بن ابی کا اعتبار نہ کر وہ چاہتا ہے کہ تجھے محمّد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف جنگ پر اُبھارے اور خُود اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور تجھے مصیبتوں کے حوالے کردے۔ حیؑ نے کہا: "ہم محمّد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دُشمنی اور اس سے جنگ کرنے کے علاوہ اور کسی چیز کو نہیں جانتے"۔ سلام نے اس کے جواب میں کہا کہ خدا کی قسم مَیں دیکھ رہا ہوں کہ ہمیں آخرکار اس سرزمین سے نکلنا پڑے گا اور ہمارا مال و دولت، شرف و بزرگی یہ سب برباد ہوں گے۔ ہمارے بچّے قیدی بنائے جائیں گے اور ہمارے جوان قتل کر دیے جائیں گے۔[1]

مندرجہ بالا آیات اس واقعہ کو بیان کرتی ہیں:

بعض مفسّرین کا نظریہ ہے کہ یہ آیات بنو نظیر کے واقعہ سے پہلے نازل ہوئیں اور اس کے بعد کے حوادث کو بیان کرتی ہیں۔ اور اس وجہ سے انہیں قرآن کے اخبارِ غیب میں شمار کرتے ہیں۔ آیات کا لب ولہجہ جو فعل مضارع کی شکل میں ہے۔ اگرچہ اس نظریہ کی تائید کرتا ہے لیکن گزشتہ آیات سے ان آیات کا جوڑ یہ بتاتا ہے کہ یہ بنو نظیر کے واقعہ کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ کیونکہ گزشتہ آیات بنو نظیر کی شکست کے واقعہ اور ان کی جلا وطنی کے بعد نازل ہوئی تھیں۔ فعل مضارع کا استعمال حکایتِ حال کے طور پر ہے۔ (غور فرمائیے)۔

تفسیر

یہُودیوں کی فتنہ انگیزی اور اس میں منافقین کی شمُولیّت

گزشتہ آیات میں یہود بنی نظیر کے واقعہ کو بیان کرنے اور مومنین کے تین گروہ یعنی مہاجرین، انصار اور تابعین کے حالات کی ہر ایک خصُوصیّت کو تشریح کے ساتھ پیش کرنے کے بعد پروردگارِ عالم زیرِ بحث آیات میں ایک اور گروہ یعنی منافقین اور ان کی اس واقعہ سے متعلق کارکردگی کو پیش کرتا ہے تاکہ تمام افراد کے حالات کی کیفیّت ایک دوسرے کے موازنہ کے ساتھ واضح کردے۔ اور یہ قرآن کا طریقِ کار ہے کہ وہ مختلف گروہوں کے تعارف کے لیے انہیں ایک دُوسرے کے تقابل کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ پہلے رُوئے سُخن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"کیا تُو نے منافقین کو نہیں دیکھا جو اپنے بھائی اہلِ کتاب کفار سے یہ کہتے ہیں کہ اگر تمہیں تمہارے وطن سے نکالا گیا تو ہم بھی تمہارے

[1] روح البیان جلد ۹ ص ۴۲۹۔ یہی معنی کچھ اختلاف کے ساتھ تفسیر درالمنثور جلد ۶ ص ۱۹۹ میں بھی آیا ہے۔

ہوں گے اور تمہارے بارے میں ہم کسی کی اطاعت نہیں کریں گے اور اگر تم سے جنگ ہوئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ (الم تر الی الذین نافقوا یقولون لاخوانھم الذین کفروا من اھل الکتاب لئن اخرجتم لنخرجن معکم ولا نطیع فیکم احدا ابدًا وان قوتلتم لننصرنکم)۔ اس طرح اس گروہ منافقین نے طائفہ یہود سے تین باتوں کا وعدہ کیا۔ جب کہ وہ ہر بات میں جھوٹے تھے۔ پہلا یہ کہ اگر انہوں نے اس سرزمین سے تمہیں نکالا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے۔ ہم نہیں چاہتے کہ تمہارے بعد اس خالی جگہ کو دیکھیں۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی حکم کسی شخص کی طرف سے تمہارے خلاف صادر ہو، نہ صرف اب بلکہ کبھی بھی تو ہم اس کی اطاعت نہ کریں گے۔ تیسرے یہ کہ اگر جنگ کی نوبت آئی تو ہم تمہارے دوش بدوش جنگ کریں گے اور تمہاری مدد کے سلسلہ میں کسی تردّد کا شکار نہیں ہوں گے۔ جی ہاں یہ قول و قرار تھے جو منافقین نے اس واقعہ سے پہلے یہود سے کیے تھے لیکن بعد کے واقعات نے بتایا کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ اسی بنا پر قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے:

" خدا گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں"۔ (واللہ یشھد انھم لکاذبون)۔ کیا لرزا دینے والا انداز کلام ہے جو ان اقسام کی تاکیدوں کے ساتھ ہے۔ خدا کا لفظ گواہ کو جملہ اسمیہ کی شکل میں لانا پھر "انّ" اور "لام" کی تاکید، یہ سب باتیں بتاتی ہیں کہ جھوٹ اور نفاق ایک دوسرے سے اس طرح ملے جلے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان جدائی ممکن نہیں ہے۔ منافق ہمیشہ جھوٹے ہوتے ہیں اور زیادہ تر جھوٹے منافق ہوتے ہیں۔ "لاخوانھم" (بھائی) کی تعبیر بتاتی ہے کہ منافقین اور کفار کے درمیان بہت نزدیکی رابطہ ہے جیسا کہ گزشتہ آیات میں مومنین کے درمیان رابطہ اخوت پر زور دیا گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ مومنین اپنی اخوت کے بارے میں سچے تھے اس لیے کسی قسم کے ایثار اور قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ اس کے برعکس منافقین آپس میں کسی قسم کی وفاداری اور ہمدردی نہیں رکھتے اور سخت ترین حالات میں اپنے بھائیوں کی ہمدردی سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ یہ مومنین اور کافرین کی اخوت میں فرق ہے۔ (ولا نطیع فیکم احدا ابدًا) " ہم تمہارے معاملے میں کسی کی اطاعت نہیں کریں گے" کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ ہم تمہارے بارے میں محمّد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیتوں، نصیحتوں اور تنبیہوں کو اور خطرات کے اشاروں کو مکمل طور پر نظرانداز کر دیں گے۔ اس کے بعد ان کی دروغ گوئی کے متعلق مزید وضاحت کے لیے اضافہ کرتا ہے:

" اگر یہودیوں کو نکال دیں تو یہ منافقین ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے"۔ (لئن اخرجوا لا یخرجون معھم)۔ "اور اگر ان کے ساتھ جنگ ہو تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے۔ (ولئن قوتلوا لا ینصرونھم)۔ اور بالفرض اگر اپنے قول پر عمل کریں اور ان کی مدد کے لیے آمادہ ہو بھی جائیں تو جلد ہی میدان سے فرار کر جائیں گے۔ (ولئن نصروھم لیولن الادبار)۔ " اور اس کے بعد ان کی مدد نہیں کی جائے گی"۔ (ثم لا ینصرون)۔ ان آیات کا قاطع لب ولہجہ ہر منافق کو لرزہ براندام کر دیتا ہے۔ خصوصاً یہ کہ آیت اگرچہ ایک خاص مورد میں نازل ہوئی ہے لیکن طے شدہ طور پر اسی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ منافقین کے تمام دشمنانِ اسلام سے رابطے، ایک دوسرے سے تعاون کار اور ان وعدوں کے سلسلہ میں جو وہ ایک دوسرے سے کرتے ہیں یہ ایک اصلی کلی ہے حالانکہ وہ تمام وعدے بے بنیاد ہوتے ہیں۔

یہ صورت حال نہ صرف گزشتہ تاریخ اسلام میں نظر آتی ہے بلکہ آج بھی اسلامی ممالک میں، منافقین کی دشمنانِ اسلام سے سازباز کے سلسلہ میں اس کے زندہ نمونے نظر آتے ہیں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور یہ طے شدہ ہے کہ اگر سچے مومنین اپنی اسلامی ذمہ داریاں پوری کریں اور اپنا فرض ادا کریں تو ان کے مقابلہ میں کامیابی سے ہم کنار ہوں گے اور ان کے منصوبے نقش برآب ثابت ہوں گے۔

بعد والی آیت میں اس شکست کے اسباب کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"تمہارا خوف ان کے دلوں میں خدا کے خوف سے زیادہ ہے" (لانتم اشد رھبۃ فی صدورھم من اللّٰہ)۔ چونکہ وہ خدا سے نہیں ڈرتے لہٰذا ہر چیز سے وحشت و خوف رکھتے ہیں۔ خصوصاً اے مومنو! تم جیسے سخت دشمن سے۔ "یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ ایک نادان گروہ ہے" (ذالک بانھم قوم لایفقھون)۔ "رھبۃ" اصل میں اس خوف کے معنوں میں ہے جس کے ساتھ اضطراب و احتیاط ہو۔ اور حقیقت میں یہ ایسا گہرا اور جڑیں رکھنے والا خوف اور وحشت ہے جس کے اثرات کردار میں منعکس ہوتے ہیں۔

اگرچہ مندرجہ بالا آیت یہود بنی نظیر اور مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کی شکست کے عوامل کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن اس کا نفسِ مضمون ایک حکمِ کلّی و عمومی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ انسان کے دل میں کبھی دو خوف جمع نہیں ہو سکتے " خوفِ خدا اور ماسوا اللہ کا خوف" اس لیے کہ تمام چیزیں حکم خدا کی تابع ہیں اور جو شخص خدا سے ڈرے اور اس کی قدرت سے آگاہ ہو وہ اس کے غیر سے کبھی خائف نہیں ہو سکتا۔ ان سب بدبختیوں کا سرچشمہ جہالت، نادانی اور حقیقتِ توحید سے بے خبر ہونا ہے۔ اگر اس زمانے کے مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان، مومن اور موحد ہوں تو وہ نہ صرف موجودہ دُنیا کی فوجی اور صنعتی طاقتوں سے خائف نہ ہوں بلکہ مذکورہ طاقتیں ان سے ڈریں۔ جیسا کہ ہم اس کے نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ طاقتیں باوجود ان ترقی یافتہ وسائل کے اور ان مہلک ہتھیاروں کے ایک چھوٹی سی لیکن قربانی دینے کی صلاحیت رکھنے والی قوم سے خوف زدہ ہیں۔ اسی مفہوم کی ایک نظیر سورۃ آلِ عمران کی آیت ۱۵۱ میں بھی آئی ہے۔ (سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرعب بما اشرکوا باللّٰہ مالم ینزل بہ سلطانا و ماواھم النار وبئس مثوی الظالمین) "عنقریب ہم کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے اس لیے کہ اُنہوں نے بغیر کسی دلیل کے کچھ چیزوں کو خدا کا شریک قرار دیا ہے۔ ان کے رہنے کی جگہ آگ ہے اور ظالموں کی قرارگاہ کیا ہی بُری ہے"

اس کے بعد اس اندرونی خوف کی واضح نشانی کو بیان کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

"وہ سوائے محکم قلعوں میں رہ کر یا پسِ دیوار ہو کر تم سے کبھی منظم ہو کر جنگ نہیں کر سکیں گے۔ وہ تمہارے سامنے آنے سے گھبراتے ہیں" (لایقاتلونکم جمیعا الّا فی قرًی محصنۃ او من وراء جدر)۔ "قری" جمع ہے قریہ کی جو آبادی کے معنی میں ہے، عام اس سے کہ شہر ہو یا گاؤں۔ کبھی ایک ہی جگہ جمع شدہ انسانوں کے بارے میں بھی یہ لفظ آتا ہے۔ "محصنۃ" کا مادّہ "حصن" (بروزن جسم) قلعہ کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر "قری محصنۃ" ان آبادیوں کو کہا جاتا ہے جو برجوں اور قلعوں کے ذریعہ یا خندق کھود کر یا اور دوسری رکاوٹیں کھڑی کرنے کی وجہ سے دشمن کی یلغار سے محفوظ ہوں۔ "جدر" جمع ہے "جدار" کی جو دیوار کے معنی میں ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنی بلندی کے ہیں۔ جی ہاں! چونکہ وہ ایمان اور توکّل علی اللہ کی پناہ گاہ سے باہر ہیں لہٰذا سوائے دیواروں اور قلعوں کی پناہ کے مومنین سے جنگ کرنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے،

"لیکن یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ کمزور، ناتواں اور فنونِ جنگ سے ناواقف افراد ہیں۔ جب جنگ خود ان کے مابین واقع ہو تو نہایت شدید ہوتی ہے" (بأسھم بینھم شدید)۔ لیکن تمہارے مقابلہ میں صورتِ حال بالکل بدل جاتی ہے اور خوف و وحشت اور ایک عجیب اضطراب ان پر مسلّط ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک بنیادی حقیقت ہے کہ تمام بے ایمان اقوام کی جب آپس میں جنگ ہو اور اس کے مقابلہ میں جب مسلمانوں سے مقابلہ ہو تو مذکورہ صورتِ حال پیش آتی ہے۔ اس کے نمونے ہم نے موجودہ زمانے میں بار بار دیکھے ہیں۔ جب خدا کی معرفت نہ رکھنے والے افراد ایک دوسرے سے لڑتے ہیں تو اس طرح ایک دوسرے کی سرکوبی کرتے ہیں کہ ان کی جنگ جوئی میں کسی قسم کا

شبہ باقی نہیں رہتا۔ لیکن جب ان کا مقابلہ مومنین اور شہادت فی سبیل اللہ کا شوق رکھنے والوں سے ہوتا ہے تو وہ فوراً ہتھیاروں، محکم مورچوں اور قلعوں کی پناہ لے لیتے ہیں اور اضطراب انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔ اگر مسلمان واقعی اسلامی اقدار اختیار کریں تو وہ دشمنوں کے مقابلہ میں از سرِ نو افضل و برتر ثابت ہوں۔

اسی آیت کو جاری رکھتے ہوئے ان کی شکست اور ناکامی کے ایک اور سبب کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"تُو ان کے ظاہر کی طرف دیکھے تو انہیں متفق و متحد تصوّر کرے گا حالانکہ ان کے دل پراگندہ ہیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وُہ ایک ایسی قوم ہیں جو عقل سے محروم ہیں"۔ (تحسبھم جمیعًا و قلوبھم شتّٰی ذالك بانھم قوم لا یعقلون)۔ شتی جمع ہے شیت کی یعنی متفرق قرآن تحصیل مسائل میں فی الواقعی بہت ہی دقیق اور الہام بخش ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ تفرقہ اور اندرونی نفاق جہالت، بے خبری اور نادانی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس لیے کہ شرک کا سبب جہالت ہے اور پراگندگی و انتشار کا سبب شرک ہے اور انتشار کا نتیجہ شکست ہے۔ اس کے برعکس علم جو ہے وہ عقیدۂ توحید، عملی اتفاق اور ہم آہنگی کو وجود میں لاتا ہے اور بجائے خود کامیابیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس طرح بے ایمان افراد کا ظاہری اجتماع، ان کے آپس کے معاہدے اور فوجی و اقتصادی وحدت سے ہمیں کبھی دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے۔ اس لیے کہ ان باہمی معاہدوں اور نعروں کے پیچھے وہ دل ہوتے ہیں جو انتشار کا شکار ہوں۔ اس کی دلیل بھی واضح ہے وُہ اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے مادّی مفاد کا محافظ ہوتا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ مادّی منفعتوں میں ہمیشہ ٹکراؤ ہوتا ہے۔ جب کہ مومنین کی وحدت اور ان کا اجتماع ایسے اصول کی بُنیاد پر ہوتا ہے جس میں تضاد کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ان کی وحدت کا اصول اصل ایمان، توحید اور الٰہی اقدار پر مبنی ہوتا ہے، لہٰذا جہاں کہیں مسلمانوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑے تو مندرجہ بالا آیات کے مطابق اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ حقیقتِ ایمانی سے محروم ہوتے ہیں جب تک اس کی طرف واپس نہیں لوٹیں گے ان کے حالات بہتر نہیں ہوں گے۔

۱۵۔ كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۚ

۱۶۔ كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ
قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

۱۷۔ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ
جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۚ

۱۸۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

۱۹۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

۲۰۔ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ
هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۵۔ یہودیوں کے اس گروہ کا کام ان لوگوں کی طرح ہے جو ان سے کچھ پہلے تھے۔ انہوں نے اپنے کام کا تلخ مزہ چکھا۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

۱۶۔ ان کا کام مثل شیطان کے ہے جس نے انسان سے کہا کافر ہو جا۔ (تاکہ تیری مشکلات حل ہو جائیں)۔ لیکن جب وہ کافر ہو گیا تو اس نے کہا میں تجھ سے بیزار ہوں۔ میں اس خدا سے جو عالمین کا پروردگار ہے ڈرتا ہوں۔

۱۷۔ انجام ان کا یہ ہوا کہ وہ دونوں جہنم کی آگ میں ہیں۔ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور یہ ستم گروں کی سزا ہے۔

۱۸۔ اے ایمان لانے والو! خدا کی مخالفت سے پرہیز کرو۔ اور ہر انسان کو دیکھنا چاہیئے کہ اس نے اپنے کل کے لیے آگے کیا بھیجا ہے اور خدا سے ڈرو اس لیے کہ خدا جس کام کو تم انجام دیتے ہو اس سے آگاہ ہے۔

۱۹۔ اور ان لوگوں کی طرح، جنہوں نے خدا کو فراموش کر دیا اور خدا نے بھی انہیں خود فراموشی کا شکار کیا، نہ ہو جاؤ۔ اور وہ فاسق و گنہگار ہیں۔

۲۰۔ ہرگز اصحابِ دوزخ اور اصحابِ بہشت یکساں نہیں ہیں صرف اصحابِ جنّت ہی کامیاب ہیں۔

تفسیر

شیطان کی بوسیدہ رسیوں کے ساتھ کنویں میں نہ جاؤ

یہ آیات اسی طرح یہودِ بنی نظیر اور منافقین کی داستان کے بارے میں بحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور ان دونوں گروہوں

کی حیثیتوں کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ مشخص کرتی ہیں۔ خداوندِ عالم پہلے فرماتا ہے،

"بنو نظیر کے یہودیوں کی داستان ایسے لوگوں کی داستان کی مانند ہے جو ماضی قریب میں ان سے پہلے تھے۔ وہی جنہوں نے اس دُنیا میں اپنے کام کا تلخ انجام دیکھا تھا اور قیامت میں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔" (کمثل الّذین من قبلھم قریبًا ذاقوا وبال امرھم ولھم عذاب الیم)[1]

رہی یہ بات کہ وہ کون سا گروہ تھا جس کی بنو نظیر کے واقعہ سے پہلے عبرت ناک سرگزشت تھی تو وہ اس طرح ہے کہ ان دو واقعات کے درمیان زیادہ وقفہ نہیں تھا۔ ایک جماعت تو انہی مشرکینِ مکّہ کی تھی جنہوں نے جنگِ بدر میں شکست کا تلخ مزہ اپنے پُورے وجود کے ساتھ چکھا تھا اور مجاہدینِ اسلام کی ضربوں نے انہیں تہہ تیغ کردیا تھا۔ بنو نظیر کا واقعہ جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے جنگِ اُحد کے بعد پیش آیا اور واقعۂ بدر اُحد سے ایک سال پہلے ہوا۔ اس وجہ سے ان دونوں واقعات کے درمیان کوئی خاص فاصلہ نہیں تھا۔ بہت سے مفسّرین اسے یہودِ بنی قینقاع کے واقعہ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو بدر کے واقعہ کے بعد ہوا اور یہود کے اس گروہ کے مدینہ سے نکالے جانے پر ختم ہوا۔ یہ تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ یہ یہودِ بنی نظیر کے ساتھ زیادہ مماثلت رکھتی ہے۔ یہودِ بنی قینقاع بھی یہودِ بنی نظیر کی مانند دولت مند، جنگ جُو اور مغرور افراد تھے اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور مسلمانوں کو اپنی قوت و طاقت کی بنا پر دھمکیاں دیتے تھے نکات کے زیرِ عنوان ہم انشاء اللہ اس کی تشریح پیش کریں گے۔ انہیں آخر کار سوائے بدبختیٔ دربدری اور آخرت کے عذابِ الیم کے اور کچھ نہ ملا۔

" وبال " کے معنی تلخ اور منحوس انجام کے ہیں اور اصل میں " وابل " شدید بارش کے معنوں میں ہے۔ اس لیے کہ شدید بارشیں عام طور پر خطرناک ہوتی ہیں اور انسان ان کے تلخ نتائج سے خوف زدہ ہوتا ہے۔ عام طور پر اس کے پیچھے خطرناک سیلاب ہوتے ہیں۔

اس کے بعد منافقین کے متعلق ایک تشبیہ پیش کرتے ہوئے خداوندِ عالم فرماتا ہے:

" ان کی داستان شیطان کی داستان جیسی ہے جس نے انسان سے کہا کافر ہو جا تاکہ مَیں تیری مشکلات کو حل کروں لیکن جب وہ کافر ہوگیا تو اس نے کہا مَیں تجھ سے بیزار ہوں، مَیں اس خدا سے جو عالمین کا پروردگار ہے ڈرتا ہوں۔" (کمثل الشیطان اذ قال للانسان اکفر فلما کفر قال انی بریء منك انی اخاف اللہ ربّ العالمین)[2]

یہ بات کہ اس آیت میں انسان سے کون مُراد ہے کیا مطلق طور پر انسان ہیں جو شیطان کے زیرِ اثر آجاتے ہیں، اس کے جھوٹے دعووں سے دھوکہ کھاتے ہیں اور راہِ کُفر اختیار کرتے ہیں اور شیطان آخر کار انہیں تنہا چھوڑ کر ان سے بیزاری اختیار کرتا ہے یا پھر اس سے مُراد کوئی خاص انسان ہے مثلاً ابوجہل اور اس کے پیروکار جو جنگِ بدر میں شیطان کے فریب دینے والے وعدوں سے سرگرمِ پیکار ہوئے اور آخرکار انہوں نے شکست کا تلخ مزہ چکھا، جیسا کہ سُورۂ انفال کی آیت ۴۸ میں ہم پڑھتے ہیں: (واذ زین لھم الشیطان اعمالھم وقال لاغالب لکم الیوم من الناس وانی جارلکم فلما تراءت الفئتان نکص علی عقبیہ وقال انی بریء منکم انی اریٰ مالاترون انی اخاف اللہ واللہ شدید العقاب) اور یاد کرو اس وقت کو

---

[1] یہ جملہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیرِ عبارت اس طرح ہے: مثلھم کمثل الذین من قبلھم۔

[2] اگرچہ کمثل کی تعبیر اس آیت میں اور اس سے قبل والی آیت میں ایک دوسرے سے مشابہ ہے اسی بنا پر بعض مفسّرین دونوں کو ایک ہی گروہ پر ناظر سمجھتے ہیں لیکن قرائن اچھی طرح گواہی دیتے ہیں کہ پہلی آیت بنو نظیر کی کیفیت کی طرف ناظر ہے اور دوسری منافقین کی کیفیت کی طرف۔ بہرحال یہ عبارت بھی مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیرِ عبارت اس طرح ہے: مثلھم کمثل الشیطٰن ...

ت شیطان نے مشرکین کے اعمال کو ان کی نگاہ میں وقیع بنایا اور کہا کہ آج تم پر کوئی شخص غالب نہیں آئے گا اور میں تمہارا ہمسایہ اور پناہ دینے والا ہوں لیکن جس وقت مجاہدین اسلام اور ان کے حامی فرشتوں کو دیکھا تو پیچھے ہٹ گیا اور کہا میں تم سے بیزار ہوں میں ایسی چیز دیکھ رہا ہوں جسے تم نہیں دیکھ رہے میں خدا سے ڈرتا ہوں اور خدا شدید العقاب ہے۔

یا پھر یہ کہ انسان سے مراد " برصیصا " بنی اسرائیل کا عابد ہے جس نے شیطان سے دھوکہ کھایا اور کافر ہو گیا اور پھر حساس لمحات میں شیطان نے اس سے بیزاری اختیار کی اور اس سے الگ ہو گیا۔ اس کی تفصیل انشاءاللہ آگے آئے گی۔ پہلی تفسیر آیت کے مفہوم کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے اور دوسری اور تیسری تفسیر ہو سکتا ہے، اس کے وسیع مفہوم کے ایک مصداق کا بیان ہو۔ بہر حال وہ عذاب جس سے شیطان اظہار وحشت کرے گا بظاہر عذاب دنیا ہے۔ اس بنا پر اس کا خوف واقعی اور پختہ ہے۔ کسی قسم کی شوخی اور مزاح نہیں ہے۔

بہت سے ایسے لوگ ہیں جو قریب کی سزا سے ڈرتے ہیں لیکن کافی مدت بعد کی سزا سے خائف نہیں ہوتے۔ جی ہاں! منافقین کی یہی حالت ہے اپنے دوستوں کو جھوٹے وعدوں کا سہارا دے کر اور مکر و فریب سے کام لے کر میدان جنگ میں بھیج دیتے ہیں۔ پھر انہیں تنہا چھوڑ کر بھاگ جاتے ہوتے ہیں، اس لیے کہ نفاق میں وفاداری نہیں ہوتی۔ بعد والی آیت میں ان دونوں گروہوں یعنی "شیطان اور اس کے پیروکار" اور "منافقین اور ان کے کافر دوست" کے انجام کو واضح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"ان کا انجام یہ ہوا کہ وہ دونوں جہنّم کی آگ میں ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ہے ظالموں کی سزا: (فکان عاقبتهما انهما فی النار خالدین فیها وذالك جزاؤا الظالمین)[1]

یہ ایک بنیادی حقیقت ہے کہ کفر و نفاق اختیار کرنے اور شیطان اور اس کے ساتھیوں کے شریک کار بننے کا انجام شکست و ناکامی سے دوچار ہونا ہے۔ عذاب دُنیا و آخرت اس پر مستزاد ہے جب کہ مومنین اور ان کے دوستوں کا مستقل طور پر شریک کار بننا کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے اور دونوں جہان میں رحمتِ خدا جیسی عظیم نعمت سے انسان کو سرفراز کرتا ہے۔ اس کے بعد کی آیت میں خداوند عالم مومنین کو خطاب کرتے ہوئے بے نظیر منافقین اور شیطان کے منحوس اور دردناک واقعہ سے ایک نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اے ایمان لانے والو خدا کی مخالفت سے ڈرو اور ہر انسان کو دیکھنا چاہیئے کہ اس نے قیامت کے دن کے لیے کیا چیز آگے بھیجی ہے" (یا ایها الذین اٰمنوا اتقوا الله ولتنظر نفس ما قدمت لغد)[2]

اس کے بعد دوبارہ تاکید کے لیے فرماتا ہے:

"خدا سے ڈرو اس لیے کہ خدا اس کام سے جسے تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے" (واتقوا الله ان الله خبیر بما تعملون)۔

تقویٰ اور خوفِ خدا سبب بنتے ہیں کہ انسان روزِ قیامت کے لیے اپنے اعمال کو پاک و پاکیزہ کرے۔ تقویٰ کے حکم کی تکرار، جیسا کہ ہم نے کہا ہے، تاکید کے لیے ہے کیونکہ تمام نیک اعمال بجا لانے اور گناہوں سے پرہیز کرنے کا سبب یہی تقویٰ اور خدا کا خوف ہے۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ تقویٰ کا پہلا حکم تو اچھے اعمال انجام دینے کا محرک ہے اور دوسرا حکم ان اعمال میں خلوص کی کیفیت

---

[1] عاقبتهما کان کی خبر ہے اور منصوب ہے اور انهما فی النار اسم کان کی جگہ ہے اور "خالدین" "هما" کا حال ہے۔

[2] یہ کہ "ما" "ما قدمت لغد" میں موصولہ ہے یا استفہامیہ مفسرین نے دو احتمال تجویز کیے ہیں اور یہ آیہ شریفہ میں دونوں کی گنجائش ہے۔ استفہامیہ زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

پیدا کرنے کے بارے میں ہے۔ یا یہ کہ پہلے حکم کی نظر اچھے کام انجام دینے کی طرف ہے۔ (ما قدمت لغد کے جملے کے قرینے سے) اور دوسرا گناہوں اور معاصی سے پرہیز کی طرف اشارہ ہے۔ یا یہ کہ پہلا حکم گناہوں سے توبہ کرنے کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا آئندہ کے تقویٰ کے لیے ہے لیکن آیات میں ان تفاسیر کے لیے کوئی قرینہ کلام موجود نہیں ہے۔ لہٰذا تاکید والی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ "غد" (کل) کی تعبیر قیامت کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ عمرِ دنیا کی سُرعتِ رفتار کی طرف توجہ کرنے سے یہ چیز محسوس ہو جاتی ہے کہ قیامت بہت جلد آجائے گی اور نکرہ کی صُورت میں اس کا ذکر اس کی اہمیت کی بنا پر ہے۔ "نفس" (ایک شخص) کی تعبیر ہو سکتا ہے، کہ ایک فرد کے معنی میں ہو یعنی انسان اپنے کل کی فکر کرے اور بغیر اس کے کہ دوسروں سے توقع رکھے کہ وہ اس کے لیے کوئی کام انجام دیں گے وہ جب تک اس دنیا میں ہے جو کچھ بھیج سکتا ہے آگے بھیجے۔ یہ تفسیر بھی اُوپر والی تعبیر کے بارے میں کی گئی ہے اور یہ ان افراد کی قلت کی طرف اشارہ ہے جو قیامت کی فکر کرتے ہیں بالکل اس طرح جیسے ہم کہیں گے کہ بس ایک ہی شخص مل جائے جو اپنی نجات کی فکر میں ہو۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے اور یا ایھا الذین اٰمنوا کا خطاب اور تقویٰ کے امر کی عمومیت کی دلیل ہے۔ اس کے بعد کی آیت تقویٰ اور معاد کی طرف توجہ کے امر کے بعد یادِ خدا کی تاکید کرتے ہوئے کہتی ہے:

"ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے خدا کو بھُلا دیا ہے اور خدا نے بھی انہیں خود فراموشی کا شکار بنا دیا ہے۔" (ولا تکونوا کالذین نسوا اللّٰہ فانساھم انفسھم)۔ اصولی طور پر تقویٰ کی اصل حقیقت اور بنیاد دو چیزیں ہیں؛

ایک تو خدا کی یاد یعنی خدا کی دائمی مراقبت اور اس کے ہر جگہ اور ہر حال میں حاضر و ناظر ہونے کا یقین اور یہ احساس کہ خدا عادل ہے۔

دوسرے اعمال کی طرف توجہ کہ کوئی چھوٹا بڑا کام ایسا نہیں ہے جو نامۂ اعمال میں مندرج نہ ہو۔ اس بنا پر یہی دو باتیں، مبداء اور معاد کی طرف توجہ انبیاء و اولیاء کے تربیّتی لائحہ عمل کا عنوان قرار پاتی ہیں اور ان کی تاثیر فرد اور معاشرہ دونوں کی اصلاح اور تزکیہ کی مکمل طور پر نگراں ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن یہاں صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ خدا کو بھُلا دینا خود فراموشی کا سبب ہوتا ہے۔ اس کی وجہ بھی واضح ہے کیونکہ ایک طرف تو پروردگار کو بھُول جانا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ انسان مادّی لذّتوں اور حیوانی خواہشات میں ڈوب جائے اور اپنے مقصدِ خلقت کو بھلا دے اور اس کے نتیجے میں روزِ قیامت کے لیے نیک اعمال کا ذخیرہ کرنا ہے اس سے غافل ہو جائے۔ دوسری جانب خدا کو فراموش کرنا اس کی صفاتِ پاک کو فراموش کرنے کے مترادف ہے، اس لیے کہ ہستیِ مطلق، علمِ بے پایاں اور غیر متناہی استغناء و تونگری کے ساتھ مخصوص ہے۔ اُس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کی ذاتِ پاک کا محتاج ہے۔ ان حقائق کو بھُلا دینا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ انسان خُود کو مستقل غنی اور بے نیاز کہنے لگے اور اس طرح اپنی حقیقت اور انسانی واقعیت کو فراموش کر دے۔[1]

اصولی طور پر انسان کی سب سے بڑی بدبختی اور مصیبت خود فراموشی ہے، اس لیے کہ وہ اپنی اس ذاتی قدر و قیمت، استعداد اور لیاقت کو جسے خدا نے اس کے وجود میں پوشیدہ رکھا ہے اور اسے باقی مخلوق سے ممتاز قرار دیا ہے، فراموشی کے سپرد کر دیتا ہے اور یہ اقدام اپنی انسانیت کو فراموش کر دینے کے مترادف ہے۔ اس قسم کا انسان ایک درندہ کی سطح تک گر جاتا ہے اور اس کا مقصد سوائے کھانے پینے، سونے جاگنے اور شہوت رانی کے اور کچھ نہیں رہتا۔ یہ باتیں فسق و فجور کا بنیادی سبب ہیں بلکہ یہ فراموشی فسق کا اور اطاعتِ خدا کے حلقہ سے نکل جانے کا بنیادی سبب ہے۔ اسی بنا پر آیت کے آخر میں فرماتا ہے:

"اس قسم کے فراموش کرنے والے انسان فاسق ہیں۔" (اولٰئک ھم الفاسقون)۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہ نہیں فرماتا کہ خدا کو

[1] المیزان جلد ۱۹ ص ۲۵۳

بھُولو بلکہ فرماتا ہے کہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو خدا کو بھُول گئے ہیں اور خدا نے انہیں خُود فراموشی کا شکار بنا دیا ہے۔ یہ موقعہ حقیقت میں ایک واضح حِسی مصداق کی نشان دہی کرتا ہے جس میں لوگ خدا کو فراموش کرنے کا انجام دیکھ سکتے ہیں۔ یہ آیت بظاہر منافقین کے متعلق ہے جن کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا تھا یا یہود بنی نظیر کے متعلق ہے یا دونوں کے متعلق ہے۔ اس مضمون کی ایک آیت سورہ توبہ کی آیت ۶۷ میں خصوصیت کے ساتھ منافقین کے بارے میں آچکی ہے جہاں پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

(المنافقون والمنافقات بعضهم من بعض يأمرون بالمنكر وينهون عن المعروف ويقبضون ايديهم نسوا الله فنسيهم ان المنافقين هم الفاسقون) "منافق مرد اور عورتیں سب ایک ہی گروہ سے ہیں وہ بُری چیز کا حکم دیتے ہیں اور اچھی چیز سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھ انفاق و بخشش سے روکے رکھتے ہیں۔ وہ خدا کو بھُول چکے ہیں۔ خدا نے بھی انہیں فراموش کر دیا ہے۔ منافقین یقیناً فاسق ہیں"۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہاں خدا کو فراموش کرنا اس کی رحمت کے منقطع ہونے کا سبب بیان ہوا ہے اور یہاں خود فراموشی کا سبب ہے جو دونوں ایک ہی نقطے پر منتہی ہوتے ہیں (غور کیجیے)۔

آخری زیرِ بحث میں ان دونوں گروہوں (مومنین، صاحبِ تقویٰ اور مبدا کی طرف متوجہ افراد اور خدا کو فراموش کرنے والے افراد جو خود فراموشی کا شکار ہوئے ہیں) کے موازنہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اصحاب دوزخ اور اصحابِ بہشت یکساں نہیں ہیں"۔ (لايستوى اصحاب النّار واصحاب الجنّة)۔ اس دنیا میں اور اس کے معارف میں طرزِ فکر میں، انفرادی و اجتماعی طرزِ زندگی میں، اس کے مقاصد میں آخرت اور اس کے عذاب و ثواب میں ان دونوں گروہوں کا خطِ عمل ایک دوسرے سے بالکل جُدا ہے۔ ایک یادِ خدا، قیامت، بلند انسانی اقدار کے تصوّرات میں محو اور زندگانیٔ جاودانی کے لیے ذخائرِ حسنات جمع کرنے میں مصروف ہے اور دوسرا مادّی خواہشات میں غرق اور ہر نیکی کی فراموشی میں گرفتار اور ہر ہوا و ہوس کا قیدی ہے۔[1]

اس طرح انسان دوراہے پر نظر آتا ہے، یا پہلے گروہ سے ملحق ہو جائے یا دوسرے سے وابستہ ہو جائے۔ درمیان میں تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ آیت کے آخر میں ایک حکم قاطع کی شکل میں فرماتا ہے:

"صِرف اصحاب جنّت ہی کامیاب ہیں"۔ (اصحاب الجنّة هم الفائزون)۔ نہ صرف قیامت میں رستگار و کامیاب ہیں بلکہ دنیا میں بھی کامیابی، آرام و سکون اور نجات انہی کے لیے ہے اور شکست دونوں جہان میں ان کا مقدّر ہے جو خدا کو فراموش کرنے والے ہیں۔

ایک اور حدیث رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمیں ملتی ہے جس میں آپ نے اصحابِ جنّت ایسے لوگوں کو قرار دیا جنہوں نے آپؐ کی اطاعت کی اور ولایت جنابِ امیر علیہ السّلام کو قبول کیا۔ لہٰذا اصحاب النّار وہ ہوئے جنہوں نے ولایت علیؑ کو قبول نہیں کیا آپ سے جنگ کی اور نقضِ عہد کیا۔ یہ آیت کے مفہوم کا ایک واضح مصداق ہے اور اس کی عمومیت میں اس سے کوئی کمی نہیں آتی۔

چند نکات

۱۔ اہلِ نفاق کے ساتھ بے مقصد شرکتِ عمل

جو کچھ مندرجہ بالا آیتوں میں منافقوں کی عہد شکنی اور اپنے دوستوں کو سخت لمحات میں تنہا چھوڑ دینے کے بارے میں آیا ہے، یہ ایک ایسی چیز ہے

---

[1] حذف متعلق "لا یستوی" عمومیت کی دلیل ہے۔

جس کے نمونے ہم نے بارہا اپنی زندگی میں دیکھے ہیں۔ یہ لوگ گمراہ کرنے والے شیطان کی طرح ہر شخص کے دل میں وسوسہ ڈالتے ہیں، ان سے ہر قسم کی مدد کا وعدہ کرتے ہیں، انہیں میدانِ حوادث میں بھیجتے ہیں اور انواع و اقسام کے گناہوں میں آلودہ کرتے ہیں لیکن بحرانی لمحات میں انہیں وسطِ میدان میں چھوڑ کر اپنی جان کی حفاظت اور مفادِ ذات کے لیے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کی سرگزشت ہے جو منافقین کے گروہ اور ان کے ساتھ عہدِ محبت استوار کرنے والے افراد ہیں۔ اس کا زندہ نمونہ ہمارے زمانہ میں وہ عہد و پیمان ہیں جو سپر طاقتیں (ہمارے زمانے کے شیاطین) ان ممالک کے سربراہوں سے کرتے ہیں جو ان سے وابستہ ہیں اور ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ یہ وابستہ ممالک، جنہوں نے اپنی ساری بضاعت طبقِ اخلاص میں رکھ کر ان شیطان صفت حامیوں کے سامنے پیش کر دی ہے، سخت حوادث میں مکمل طور پر تنہا رہ جاتے ہیں اور ہر جگہ سے دھتکارے جاتے ہیں۔ یہ وہ منزل ہے جہاں ہم قرآن کے اس پیغام سے زیادہ شناسائی حاصل کر سکتے ہیں جو کہتا ہے۔ (کمثل الشیطان اذ قال للانسان اکفر فلما کفر قال انی بریء منک انی اخاف اللہ رب العالمین) "ان کا کام شیطان کی مانند ہے جس نے انسان سے کہا کافر ہو جا جب وہ کافر ہو گیا تو اس نے کہا میں تجھ سے بیزار ہوں میں اس خدا سے ڈرتا ہوں جو عالمین کا پروردگار ہے۔"

۲۔ برصیصا عابد کی حیرت انگیز داستان

بعض مفسرین اور اربابِ حدیث نے ان آیات کے ذیل میں ایک پُرمعنی روایت بنی اسرائیل کے برصیصا عابد کے بارے میں پیش کی ہے جو تمام افراد کے لیے درسِ عبرت ہو سکتی ہے یعنی وہ یہ داستان سُن کر شیطان کے فریب سے خُود کو محفوظ رکھ سکتے ہیں جو شخص ان کے بہکانے میں آتا ہے وہ عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس داستان کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

بنی اسرائیل میں ایک نامی گرامی عابد تھا جس کا نام برصیصا تھا جس نے طویل عرصہ تک عبادتِ پروردگار کی تھی جس کی وجہ سے وہ اس مقام پر پہنچ گیا تھا کہ جاں بلب مریضوں کو اس کے پاس لاتے تھے اور اس کی دعا کے نتیجے میں انہیں دوبارہ صحت و سلامتی میسّر ہو جاتی تھی۔ ایک دن ایک معقول گھرانے کی عورت کو اُس کے بھائی اس کے پاس لائے اور طے پایا کہ کچھ عرصہ تک وہ عورت وہیں رہے تاکہ اُس کو شفا حاصل ہو۔ اَب شیطان نے اِس کے دل میں وسوسہ ڈالنے کا پروگرام بنایا اور اس قدر اُس کو اپنے دام میں اسیر کیا کہ اِس عابد نے اُس عورت سے زنا کیا۔ کچھ دنوں بعد یہ بات کُھل گئی کہ وہ عورت حاملہ ہے (کیونکہ ہمیشہ ایک گناہ عظیم تر گناہوں کا سرچشمہ بنتا ہے)۔ اس نے عورت کو قتل کر دیا اور بیابان کے ایک گوشہ میں دفن کر دیا۔ اُس عورت کے بھائی اس واقعہ سے باخبر ہوئے کہ مرد عابد نے اِس قسم کے ظلمِ عظیم کا اقدام کیا ہے۔ یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ یہاں تک کہ امیرِ شہر کے کانوں تک جا پہنچی۔ وہ کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر چلا تاکہ حقیقتِ حال سے باخبر ہو۔ جس وقت عابد کا ظلم ثابت ہو گیا تو اس کو اُس کی عبادت گاہ سے کھینچ کر باہر لے آئے۔ اقرارِ گناہ کے بعد حکم دیا گیا کہ اسے سُولی پر چڑھا دیا جائے۔ جس وقت وہ سُولی پر چڑھایا جانے لگا تو شیطان اس کے سامنے نمودار ہوا اور کہا وہ مَیں تھا جس نے تجھے اس مصیبت میں پھنسایا۔ اَب اگر جو کچھ میں کہوں تو مان لے تو میں تیری نجات کا سامان فراہم کرتا ہوں۔ عابد نے کہا میں کیا کروں۔ اس نے کہا میرے لیے تیرا صرف ایک سجدہ کافی ہے۔ عابد نے کہا جس حالت میں تو مجھے دیکھ رہا ہے اس میں سجدہ کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ شیطان نے کہا: اشارہ ہی کافی ہے۔ عابد نے گوشۂ چشم یا ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس طرح شیطان کی بارگاہ میں سجدہ بجا لایا اور اسی وقت مرگیا اور دنیا سے کافر گیا۔[1]

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۶۵، تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۶۵۱۸۔ اور تفسیر رُوح البیان میں یہ واقعہ زیادہ تفصیل کے ساتھ آیا ہے جلد ۹ ص ۴۴۶۔

۴۔ جو کچھ آگے بھیجنا چاہیئے

مندرجہ بالا آیات میں اس مسئلہ پر زور دیا گیا تھا کہ انسان کو دیکھنا چاہیئے کہ اس نے قیامت کے لیے کون سا ذخیرہ اعمال جمع کیا ہے۔ (ولتنظر نفس ما قدمت لغد) درحقیقت میدانِ قیامت میں انسان کا سرمایۂ اصلی وہ اعمال و افعال ہیں جو اس نے آگے بھیجے ہیں۔ دوسرا کوئی شخص اس فکر میں نہیں ہے کہ اس کے لیے اس کی موت کے بعد کوئی چیز بھیجے اور اگر بھیجے بھی تو اس کی زیادہ قدر و قیمت نہیں ہے۔

ایک حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے سامنے آئی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

"راہِ خدا میں انفاق کرو، چاہے تین سیر کھجوریں ہوں یا اس سے بھی کم، یا مُٹھی بھر ہوں یا اس سے بھی کم۔ یہاں تک کہ آدھا خرما ہی کیوں نہ ہو اور اگر کسی کو یہ بھی نہ مل سکے تو پھر وہ پاکیزہ باتوں سے دلوں کو خوش کرے، اس لیے کہ قیامت میں جب انسان بارگاہِ خدا میں پیش ہوگا تو خُدا پُوچھے گا کیا مَیں نے تیرے متعلق ایسا اور ایسا نہیں کیا؟ کیا کان اور آنکھ تیرے اختیار میں نہیں دیئے؟ کیا مال اور اولاد تجھ کو نہیں بخشے تھے؟ بندہ عرض کرے گا ہاں۔ تو اس وقت خداوند متعال کہے گا تو پھر دیکھ کہ تو نے اپنے آگے کے لیے کیا بھیجا ہے۔"

(فینظر قدامه وخلفه وعن یمینه وعن شماله فلا یجد شیئا یقی به وجهه من النار)۔

وہ اپنے آگے پیچھے اور دائیں بائیں دیکھے گا اسے کوئی چیز نہیں ملے گی جس کے ذریعے وہ اپنا چہرہ جہنم کی آگ سے محفوظ رکھ سکے۔[1]

ایک اور حدیث میں ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعض اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ قبیلہ مضر کا ایک گروہ وارد ہوا جن کی کمروں میں تلواریں لٹکی ہوئی تھیں۔ (وہ راہِ خدا میں جہاد کے لیے آمادہ تھے)۔ لیکن ان کے کپڑے اچھے نہیں تھے۔ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاجت مندی اور بھوک کے آثار ان کے چہروں پر دیکھے تو آپؐ کے چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہو گیا۔ آپؐ مسجد میں آئے، منبر پر تشریف لے گئے اور خدا کی حمد و ثنا بجا لانے کے بعد ارشاد فرمایا:

"خُدا نے یہ آیت قرآن مجید میں نازل فرمائی ہے۔" یاایها الذین اٰمنوا اتقوا الله ولتنظر نفس ما قدمت لغد...

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید فرمایا:

"راہِ خدا میں انفاق کرو اس سے پہلے کہ قوت و قدرت تم سے سلب ہو جائے اور راہِ خدا میں صدقہ دو قبل اس کے کہ اس میں کوئی مانع پیدا ہو جائے۔ جن کے پاس دینار ہے وہ دینار سے، جن کے پاس درہم ہے وہ درہم سے اور جو گندم و جَو رکھتے ہیں وہ گندم و جَو سے انفاق کریں اور کسی چیز کو کم تر خیال نہ کریں خواہ خرمہ کا آدھا دانہ ہی کیوں نہ ہو۔"

انصار میں سے ایک شخص کھڑا ہو گیا اور اس نے ایک تھیلی پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی تو آثارِ سرور و انبساط آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۹۲

کے چہرۂ مبارک پر ہویدا ہوئے، فرمانے لگے :

"جو شخص سُنتِ حسنہ کی بُنیاد رکھے اور لوگ اس پر عمل کریں تو اس کا اجر اور ان تمام لوگوں کا اجر جو اس پر عمل کرتے ہیں اس ابتدا کرنے والے شخص کو نصیب ہوگا بغیر اس کے کہ لوگوں کے اجر میں کوئی کمی واقع ہو اور جو شخص بُری رسم کو جاری کرے اس کا گناہ اور ان تمام لوگوں کا گناہ جو اس پر عمل کرتے ہیں اس رسم قبیح جاری کرنے والے کے ذمّہ ہوگا بغیر اس کے کہ دوسرے لوگوں کے گناہ میں کوئی کمی ہو۔"

لوگ کھڑے ہوگئے جس کے پاس دینار تھا وہ دینار لے آیا۔ جس کے پاس درہم تھا وہ درہم لے آیا۔ جس شخص کے پاس جو چیز تھی وہ خدمت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں لے آیا۔ اس طرح سے معقول قسم کی مدد، نقد اور بصورت اشیاء آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جمع ہوگئیں جسے آپؐ نے ان حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا۔[1]

یہی مفاہیم قرآن کی دوسری آیات میں بارہا آئے ہیں اور ان کی تاکید کی گئی ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۱۰ میں ہم پڑھتے ہیں:

(واقیموا الصّلٰوۃ واٰتوا الزّکٰوۃ وما تقدموا لانفسکم من خیر تجدوہ عند اللہ ان اللہ بما تعملون بصیر)

نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور جس کارِ خیر کو اپنے لیے تم آگے بھیجتے ہو اسے خدا کے ہاں پاؤ گے خدا تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔

[1] تفسیر درالمنثور ج ۶ ص ۲۰۱۔

۲۱۔ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ
خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○

۲۲۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ
الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ○

۲۳۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ
الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ
اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○

۲۴۔ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ
يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

ترجمہ

۲۱۔ اگر اس قرآن کو ہم پہاڑ پر نازل کرتے تو تُو دیکھتا کہ وُہ اس کے سامنے خشوع سے پیش آتا
اور خوفِ خدا سے ریزہ ریزہ ہو جاتا ۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کیلیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔

۲۲۔ خُدا وہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبُود نہیں ہے ۔ وُہ پوشیدہ و آشکار سے آگاہ ہے اور
وُہ رحمٰن و رحیم ہے۔

۲۳۔ خدا وہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ اصلی حاکم اور مالک وہی ہے ہر عیب سے منزّہ ہے۔ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ مومنین کو امنیت بخشتا ہے۔ ہر چیز کا نگہبان ہے۔ اسے شکست نہیں ہوتی۔ طاقتور ہے اپنے ہر ارادۂ نافذ کے ساتھ اصلاح کرتا ہے۔ وہ بزرگی و عظمت کے لائق ہے اور اس سے منزّہ ہے جسے اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔

۲۴۔ وہ خداوند خالق اور بے سابقہ پیدا کرنے والا ہے۔ وہ (بے نظیر) صورت کشی کرنے والا ہے۔ اس کے لیے اچھے نام ہیں۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کرتا ہے اور وُہ، عزیز و حکیم ہے۔

تفسیر

اگر قرآن پہاڑوں پر نازل ہوتا تو وُہ ریزہ ریزہ ہو جاتے

گزشتہ آیتوں کے بعد جو مختلف طریقوں سے انسانوں کے دلوں میں نفوذ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں اور جنہوں نے ان کے تقدیر ساز مسائل زندہ شکل میں پیش کیے، ان آیات میں، جو سُورہ حشر کی آخری آیات ہیں اور عام آیاتِ قرآنی پر روشنی ڈالتی ہیں، اس حقیقت کو منکشف کیا گیا ہے کہ قرآن کا نفوذ اس قدر گہرا ہے کہ اگر یہ پہاڑوں پر نازل ہوتا تو انہیں ہلا کر رکھ دیتا۔ لیکن تعجب ہے اس سنگ دل انسان پر کہ وہ اسے سُنتا تو ہے مگر اس پر لرزہ بھی طاری نہیں ہوتا۔ خداوندِ عالم پہلے فرماتا ہے:

"اگر قرآن کو ہم پہاڑ پر نازل کرتے تو تُو مشاہدہ کرتا کہ وہ اس کے سامنے خشوع کر رہا ہے اور خوفِ خدا سے اس میں شگاف پڑ گئے ہیں۔" (لو انزلنا ھٰذا القرآن علیٰ جبل لرأیتہ خاشعًا متصدعًا من خشیۃ اللّٰہ)۔ اور یہ ضربُ الامثال جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں وہ اس لیے ہیں کہ لوگ ان میں غور و فکر کریں۔" (وتلك الامثال نضربها للناس لعلکم یتفکرون)۔

بہت سے مفسّرین نے اس آیت کی تشبیہ کی شکل میں تفسیر کی ہے اور کہا ہے کہ یہ پہاڑ باوجود اس سختی کے جو ان میں ہے اگر عقل و احساس بھی رکھتے اور یہ آیات اِنسانوں کے دلوں کی بجائے ان پر نازل ہوتیں تو وہ اس طرح لرزہ براندام ہو جاتے کہ ان میں شگاف پڑ جاتے لیکن سخت دل انسانوں کا ایک گروہ اسے سنتا ہے اور بالکل متاثر نہیں ہوتا۔ اور اس جملہ کو (و تلك الامثال نضربها للناس) مذکورہ تفسیر پر دلیل قرار دیا ہے۔ بعض مفسّرین نے اسے اِس کے ظاہر پر محمول کیا ہے اور کہا ہے کہ اس جہان کے تمام موجودات جن میں پہاڑ بھی شامل ہیں، اپنے اندر ایک قسم کا ادراک و شعور رکھتے ہیں اور اگر یہ آیات پہاڑوں پر نازل ہوتیں تو وہ یقیناً ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ اِن معانی پر سُورہ بقرہ کی آیت

گواہ قرار دیتے ہیں. ثـم قست قلوبکم من بعد ذالك فهی کالحجارة او اشد قسوة وان من الحجارة لما یتفجر منه الانهار وان منها لما یشقق فیخرج منه الماء وان منها لما یهبط من خشیة الله) " پھر تمہارے دل اس واقعہ کے بعد پتھر کی طرح سخت ہو گئے یا اس سے بھی زیادہ سخت، کیونکہ کچھ پتھر ایسے ہیں جن میں شگاف پڑ جاتے ہیں اور ان میں سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جن میں شگاف پڑ جاتے ہیں اور ان میں سے پانی ٹپکنے لگتا ہے اور بعض خوفِ خدا کے باعث نیچے گر جاتے ہیں۔

"مثل" کی تعبیر ہو سکتا ہے کہ توصیف کے معنی میں ہو جیسا کہ یہ لفظ قرآن مجید میں بارہا اس معنی میں آیا ہے اس بنا پر مذکورہ تعبیر اس تفسیر سے نہیں ٹکراتی۔ قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ پہلے فرماتا ہے کہ پہاڑ قرآن کے سامنے خاشع و خاضع ہو جاتے ہیں، پھر مزید فرماتا ہے کہ ان میں شگاف پڑ جاتے ہیں جو اس طرف اشارہ ہے کہ قرآن ان میں بتدریج نفوذ کرتا اور ہر زمانے میں قرآن کی تاثیر کے نئے آثار ان میں نمایاں ہوتے ہیں یہاں تک کہ ان کی قوت جواب دے دیتی ہے اور یہ عاشقِ بے قرار کی طرح والہ و شیدا ہو جاتے اور پھر شگافتہ ہو جاتے ہیں۔[1]

لیکن بعد میں آنے والی آیات میں خدا کے اوصافِ جلال و جمال میں سے ایک اہم حصّہ کا تذکرہ ہے جس کی طرف توجہ کرنا تربیتِ نفوس اور تہذیبِ قلوب کے لیے بڑا پُر تاثیر ہے۔ پروردگارِ عالم اِن آیتوں میں سے تین آیات میں پندرہ صفتیں اور دوسرے الفاظ میں اٹھارہ اوصاف اپنی صفاتِ عظیمہ میں سے بیان کرتا ہے اور ہر آیت توحیدِ الٰہی اور اللہ کے مقدّس نام کے بیان سے شروع ہوتی ہے اور انسان کی حق تعالیٰ کے اسماء و صفات کے نورانی عالم کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ فرماتا ہے:

"خدا وہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، جو غیب و شہود سے آگاہ ہے اور رحمٰن و رحیم ہے۔" (هو الله الذی لا اله الا هو عالم الغیب والشهادة هو الرحمٰن الرحیم)۔ یہاں ہر چیز سے پہلے مسئلہ توحید جو تمام اوصافِ جلال و جمال کی رُوح ہے اور خدا کی معرفت کو اس پر مبنی قرار دیتا ہے اور غیب و شہود کے بارے میں خدا کے علم و دانش پر انحصار کرتا ہے۔ "شہادت و شہود" جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے: مشاہدہ کے ساتھ مشروط ہے چاہے دل کی آنکھ سے ہو چاہے ظاہری آنکھ سے۔ اسی بنا پر ان کا حسّی اور علمی دائرہ کار جو ہے وہ عالمِ شہود ہے اور جو کچھ اس دائرہ سے باہر ہے وہ عالمِ غیب شمار ہوتا ہے لیکن یہ سب علم خدا کے لیے یکساں ہے اس لیے کہ اُس کا وجود بے پایاں ہے اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور کوئی جگہ بھی اس کے علم و حضور کی قلمرو سے باہر نہیں ہے۔ اسی لیے سورہ انعام کی آیت ۵۹ میں ہمیں ملتا ہے۔ (وعنده مفاتح الغیب لا یعلمها الا هو) "غیب کی چابیاں صرف اس کے پاس ہیں اور اس کے علاوہ کوئی شخص انہیں نہیں جانتا۔ اس شان کے خدا کے نام کی طرف توجہ سبب بنتی ہے کہ انسان اسے ہر جگہ حاضر و ناظر سمجھے اور تقویٰ اختیار کرے۔ اس کے بعد اُس کی رحمتِ عام پر، جو تمام مخلوقات کے شاملِ حال ہے لفظِ رحمٰن کے حوالے سے اور اس کی رحمتِ خاص پر جو مومنین کے لیے مخصوص ہے، لفظ رحیم کے حوالہ سے انحصار ہوا ہے تاکہ وہ انسان کو اُمید دلائے اور اسے معرفتِ خدا اس طولانی راستے میں مدد دے جو اِس کو در پیش ہے۔ اس مرحلہ کا طے کرنا پروردگار کے لُطف و کرم کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ راستہ ایک طرح کا ظلمات ہے اور اس میں گمراہی کا خطرہ ہے۔ اس طرح صفتِ توحید کے علاوہ اس کی عظیم صفتوں میں سے اس آیت میں تین عظیم صفتیں بیان کی ہیں۔ فرماتا ہے:

---

[1] "متصدع" "صدع" کے مادہ سے سخت و محکم چیزوں میں شیشہ اور پتھر کی طرح شگاف پڑنے کے معنی میں ہے اور اگر دردِ سر کو صداع کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ گویا انسان کا سر پھٹ رہا ہے۔

" خدا وہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔(ھواللّٰہ الذی لا الٰہ الّا ھو)۔ " حاکم و مالک اصلی وہی ہے " (الملک)۔ہر عیب سے پاک و منزہ ہے۔" (القدوس)۔کسی پر کسی قسم کا ظلم و ستم روا نہیں رکھتا اور اس کی طرف سے سب سلامتی ہی ہیں۔" (السلام)[1] اصولی طور پر اس کی دعوتِ فکر سلامتی کی طرف لے جاتی ہے۔" واللہ یدعوا الی دار السلام) (یونس ۲۵) اور اُس کی ہدایت بھی سلامتی ہی کی طرف متوجہ ہے۔" (یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السّلام) (مائدہ ۱۶) اور جو قرارگاہ مومنین کے لیے ہے وہ سلامتی کا گھر ہے۔" (لھم دار السّلام عند ربّھم) " جنّتیوں کا درود و تحیّہ بھی سلام کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔" (الّا قیلاً سلامًا سلامًا) (واقعہ ۲۶)۔اس کے بعد مزید فرماتا ہے :

" وہ اپنے دوستوں کو تحفّظ بخشتا ہے اور ایمان عطا فرماتا ہے"۔(المؤمن)[2]

" ہر چیز کا نگہبان ہے۔" (المھیمن)[3]

" وہ ایسا صاحبِ قدرت ہے جو کبھی مغلوب نہیں ہوگا۔" (العزیز)۔" وہ اپنے نفوذ والے ارادہ کے ساتھ ہر چیز کی اصلاح کرتا ہے۔" (الجبّار) یہ لفظ جو مادّہ جبر سے لیا گیا ہے کبھی قہر و غلبہ اور نفوذِ ارادہ کے معنوں میں آتا ہے اور کبھی اصلاح کے معنوں میں۔ راغب دونوں' معنوں کو آپس میں ملا کر کہتا ہے، جبر کی اصل کسی چیز کی غلبہ اور قوّت سے اصلاح کرنا ہے ۔ یہ لفظ جب خدا کے لیے استعمال ہو تو اس کی ایک عظیم صفت کو بیان کرتا ہے یعنی وہ ارادہ کے نفوذ کے ساتھ اور کمالِ قدرت کے ساتھ ہر فساد کی اصلاح کرتا ہے۔ لیکن جب یہی لفظ خدا کے غیر کے لیے استعمال ہو تو مذمّت کا باعث ہوتا ہے اور بقول راغب ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو اپنی کوتاہیوں کا ازالہ ایسے منصب کا دعویٰ کرکے کرے جس کا وہ اہل نہ ہو۔ یہ لفظ قرآن مجید میں دس مواقع پر استعمال ہوا ہے جس میں سے نو موقعوں پر ظالم اور گردنیں کاٹنے والے مفسد افراد کے بارے میں ہے۔صرف ایک موقع پر قادرِ مطلق کے لیے استعمال ہوا ہے اور وہ اسی زیرِ بحث آیت میں ہے۔اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

---

[1] بعض مفسرین نے سلام کو یہاں ہر قسم کے عیب و نقص و آفت سے سلامتی کے معنی میں لیا ہے لیکن اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ معنی لفظ " قدوس" میں موجود ہیں' جو پہلے آچکا ہے' اس کے علاوہ سلام عام طور پر قرآن مجید میں دوسروں کو سلامتی بخشنے کے مسئلہ میں آیا ہے اور اصولی طور پر لفظِ سلام جو ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت کہا جاتا ہے ۔ وہ اظہارِ دوستی اور مدِّ مقابل سے روابط کی سلامتی کے بیان کے لیے ہے لہٰذا جو کچھ ہم نے اُوپر بیان کیا ہے وہ مناسب نظر آتا ہے۔

[2] بعض مفسرین نے یہاں مومن کی صاحب ایمان کے معنی میں تفسیر کی ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ وہ پہلا ہے جو خدا کی پاک ذات اور اس کے رسُولوں پر ایمان رکھتا ہے وہ خود وہی ہے لیکن جو کچھ ہم نے اُوپر بیان کیا ہے وہ زیادہ مناسب ہے۔

[3] اس لفظ کے اصل کے بارے میں مفسرین اور اربابِ لغت کے درمیان دو قول موجود ہیں۔بعض اسے " ھیمن " کے مادّہ سے جانتے ہیں جس کے معنی نگہبان کے ہیں اور' بعض ایمان کے مادّہ سے، کہ اس کا ہمزہ " ھا " میں بدل گیا ہے اور سکون و اطمینان دینے کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ دو مرتبہ قرآن مجید میں آیا ہے ۔ ایک دفعہ خُود قرآن کے بارے میں (مائدہ ۴۸) اور ایک دفعہ خدا کی تعریف و توصیف میں زیرِ بحث آیت میں استعمال ہوا ہے۔اور دونوں موارد میں وہی پہلے معنی مناسب ہیں۔(لسان العرب، تفسیر فخر رازی، رُوح المعانی) ابوالفتوح رازی زیرِ بحث آیت کے ذیل میں ابو عبیدہ سے نقل کرتا ہے کہ کلامِ عرب میں صرف پانچ نام ہیں جو اس وزن پر آتے ہیں۔" مھیمن " مسیطر " " مبیطر (طبیب کا جانور) "مبیقر" وہ شخص جو اپنا راستہ کھولتا ہو اور آگے بڑھتا ہو۔" مخیمر " ایک پہاڑ کا نام ہے ۔

"وہ بزرگی اور عظمت کے لائق ہے اور کوئی چیز اس سے برتر و بالا نہیں ہے۔" (المتکبر) متکبر تکبر کے مادہ سے دو معانی پر دلالت کرتا ہے۔ ایک معنی ممدوح ہیں جو خدا کے لیے استعمال ہوئے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ بزرگی، نیک کاموں اور بہت سی پسندیدہ صفتوں کا حامل ہونا۔ دوسرے معنی مذموم ہیں جو غیر خدا کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ چھوٹے اور کم حیثیت افراد بزرگی اور عظمت کا دعویٰ کریں اور جن صفات کے وہ حامل نہیں ہیں ان کا دعویٰ کریں اور چونکہ بزرگی و عظمت صرف خدا کو زیبا ہے، لہٰذا یہ لفظ اپنے ممدوح معنی میں صرف خدا کیلئے استعمال ہوتا ہے اور جب اس کے غیر کے لیے استعمال ہو تو مذموم معانی رکھتا ہے۔ آیت کے آخر میں دوبارہ مسئلہ توحید پر، جس سے ابتدا ہوئی تھی، زور دیتے ہوئے فرماتا ہے :

"خدا اس سے منزّہ ہے جسے اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔" (سبحان الله عما یشرکون)۔ جو وضاحت کی گئی ہے اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ کوئی موجود ان صفات میں، جو یہاں بیان ہوئی ہیں، اس کا شریک اور اس کی شبیہ و نظیر نہیں ہو سکتا۔ آخری زیرِ بحث آیت میں ان صفات کی تکمیل کے لیے چھ اور اوصاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے :

"وہ خدا ہے پیدا کرنے والا" (هوالله الخالق)۔ "وہ خدا جس نے مخلوقات کو بے کم و کاست اور بغیر کسی سابقہ نمونہ کے خلق کیا ہے۔" (البارئ)[1]۔

وہ خالق و آفریدگار جس نے ہر چیز کو ایک مخصوص شکل و صورت بخشی ہے (المصوّر) اور پھر چونکہ خدا کے اوصاف لامحدود ہیں بلکہ وہ اس کی رفعت و بلندی کی طرح لامتناہی ہیں، لہٰذا مزید فرماتا ہے،

"اس کے لیے اچھے نام ہیں" (له الاسماء الحسنٰی)۔ اسی وجہ سے وہ ہر قسم کے عیب اور نقص سے مبرّہ و منزہ ہے اور وہ تمام موجودات جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اسے ہر عیب و نقص سے پاک شمار کرتے ہیں۔ (یسبح له ما فی السماوات والارض)۔ آخرکار تاکید مزید کے لیے نظامِ آفرینش پر اس کی صفتوں میں سے دو صفتوں کی طرف، جن میں سے ایک پہلے آچکی ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے :

"وہ عزیز و حکیم ہے" (وهو العزیز الحکیم)۔ پہلی صفت ہر چیز پر کمالِ قدرت رکھنے اور ہر مانع پر غالب ہونے کی نشانی ہے۔ دوسری نظامِ آفرینش، امرِ خلقت اور تدبیر کے معاملہ میں دقیق اور باریک بینی سے منظم لائحہ عمل کے متعلق علم و آگہی کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرح ان تینوں آیتوں کے مجموعہ میں مسئلہ توحید کے علاوہ، جس کی دو مرتبہ تکرار ہوئی ہے، خدا کے اوصاف میں سے سترہ صفتیں آئی ہیں اور ان کی ترتیب یہ ہے :-

۱۔ عالم الغیب والشهاده۔
۲۔ رحمٰن
۳۔ رحیم

---

[1] "بارئ" مادہ "برء" (بروزن قفل) اصل میں صحت یابی اور ناخوشگوار امور سے رہائی کے معنی میں ہے لہٰذا باری اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کو کمی بیشی کے بغیر مکمل اور موزوں طور پر ایجاد کرے۔ بعض نے اسے "بری" (بروزن نفی) کے مادہ سے لکڑی کو تراشنے کے معنی میں لیا ہے جو اسے موزوں بنانے کے مقصد کے لیے انجام دیا جاتا ہے۔ بعض اہلِ لغت نے تصریح کی ہے کہ باری وہ شخص ہے جو کسی چیز کو بغیر سابقہ نمونہ کے ایجاد کرے۔

۴۔ ملک
۵۔ قدوس
۶۔ سلام
۷۔ مؤمن
۸۔ مھیمن
۹۔ عزیز
۱۰۔ جبّار
۱۱۔ متکبّر
۱۲۔ خالق
۱۳۔ بارئ
۱۴۔ مصوّر
۱۵۔ حکیم
۱۶۔ اسمائے حسنیٰ کا مالک
۱۷۔ عالم کے تمام موجودات جس کی تسبیح کرتے ھیں۔

صفتِ توحید کے شامل ہونے سے یہ صفات اٹھارہ ہو جاتی ہیں۔ (توجہ کیجئے کہ توحید بھی دو مرتبہ اور عزیز بھی دو مرتبہ بیان ہوا ہے)۔

ان تین آیات میں اِن تمام اوصاف ذات میں سے بالکل عام صفت علم اور اوصاف فعل میں سے بالکل عام صفت رحمت کا ذکر ہے جو تمام افعال کی اصل ہے۔ دوسری آیت میں اس کی حاکمیت اور اس کے کوائف کے بارے میں گفتگو ہے۔ اور قدوس و سلام و مومن و جبّار و متکبّر جیسی صفات کا اُن کے اُن معانی کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو ہم نے اُوپر بیان کیے ہیں، ذکر ہے۔ یہ سب خدا کی حاکمیّت مطلقہ کی خصوصیات ہیں۔ آخری آیت میں مسئلہ خلقت اور جو چیزیں اس سے متعلق ہیں مثلاً تنظیم، تشکیل، اور قدرت و حکمت کے بارے میں بحث ہے۔ اس طرح یہ آیات معرفتِ خدا کی راہ طے کرنے والوں کا ہاتھ پکڑ کر ان کو منزل بہ منزل آگے لے جاتی ہیں۔ اس کی ذاتِ پاک سے ابتداء کرتی ہیں اور پھر عالمِ خلقت کی طرف لے آتی ہیں اور پھر اسی " سیر الی اللہ " میں مخلوق سے خالق کی طرف لے جاتی ہیں۔ دل کو خدا کے اسماء و صفات کا مظہر اور انوارِ ربّانی کا مرکز قرار دیتے ہوئے ان معارف و انوار کے سلسلہ میں اس کی اصلاح و تربیّت کرتی ہیں اور تقویٰ کے شگوفہ اس کی شاخِ وجود پر ظاہر کر کے اُسے خدا کے قُرب و جوار کے قابل بناتی ہیں تاکہ وہ عام ذراتِ عالم کے ساتھ ہم آواز ہو کر تسبیح کرتے ہوئے سبوح قدوس کی نغمہ سرائی کرے اس لیے تعجب کا مقام نہیں کہ روایاتِ اسلامی میں ان آیتوں کو حد سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے جس کی طرف اِنشاء اللہ نکات کی بحث میں اشارہ ہوگا۔

چند نکات

قرآن کا حد سے زیادہ نفوذ

افکار اور دلوں میں قرآن کی تاثیر، ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور اسلام کی طویل تاریخ میں اس حقیقت کے بہت سے شواہد ملتے ہیں اور یہ عملی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ سخت ترین دل چند آیاتِ قرآنی سُننے کے بعد اس طرح نرم ہو جاتے تھے کہ فوراً اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیتے۔ صرف ہٹ دھرم اور کج فہم افراد اس اثر سے مستثنیٰ تھے۔ وہ ایسے افراد تھے جن کے وجود میں حصولِ ہدایت کی کوئی قابلیت ہی نہیں تھی۔ اسی لیے ہم نے اُوپر والی آیات میں پڑھا ہے کہ خدا فرماتا ہے:

اگر یہ قرآن پہاڑوں پر نازل ہوتا تو وہ خاضع ہوتے اور پھٹ جاتے۔ یہ سب اس خدائی کلام کی قوتِ جاذبہ کی نشانی ہے جسے ہم بھی غالب سے تلاوت کے موقع پر محسوس کرتے ہیں۔

سُورۂ حشر کی آخری آیات کی عظمت

اس سُورہ کی آخری آیات، جو اسماء و صفاتِ الٰہی کے اہم حصّہ پر مشتمل ہیں، حد سے زیادہ الہام بخش اور باعظمت آیات ہیں اور انسانوں کے لیے ایک بہت بڑا درسِ عبرت ہیں کیونکہ خدا کہتا ہے:

اگر قربِ خُدا طلب کرتے ہو اور عظمتِ کمال کے خواہاں ہو تو ان صفات کا ایک شعلہ اپنے وجود میں زندہ کر لو۔ بعض روایات میں خدا کا اسمِ اعظم سُورہ حشر کی آخری آیات میں ہے۔[1]

ہمیں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ملتا ہے:

(من قرأ اٰخر الحشر غفر له ما تقدم من ذنبه وما تأخر)

"جو شخص سُورہ حشر کے آخر کو پڑھے تو اس کے گزشتہ اور آئندہ گناہ بخش دیے جائیں گے۔"[1]

ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

(من قرأ لو انزلنا هٰذا القراٰن الیٰ اٰخرها فمات من لیلته مات شهیدًا)

"جو شخص لو انزلنا هٰذا القراٰن کی آیتوں کو آخر تک پڑھے اور اسی رات مرجائے تو وہ شہید مرتا ہے۔"[2]

ایک صحابی کہتا ہے: میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خدا کے اسمِ اعظم کے بارے میں سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

(علیك باٰخر الحشر واکثر قراءتها)

"تو سُورۂ حشر کے آخری حصّہ کو پڑھ اور زیادہ سے زیادہ پڑھ۔ میں نے دوبارہ یہی سوال کیا تو آپ

۱۔ مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۶۷۔

۲۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۹۳۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبارہ یہی جواب دیا۔[1]

یہاں تک کہ ایک حدیث میں آیا ہے :

(انها شفاء من کل داء الا السام والسام الموت)

" یہ آیات سوائے موت کے ہر بیماری کی دوا ہیں"[2]

خلاصہ یہ کہ اس سلسلہ میں شیعہ اور اہل سُنّت کی کتب میں بہت زیادہ روایات ہیں جو سب ان آیات کی عظمت اور ان کے نفس مضمون میں غور و فکر اور تدبر و تفکر پر زور دیتی ہیں ۔ قابل توجہ یہ کہ یہ سورہ جس طرح خدا کی تسبیح اور عزیز و حکیم کے نام سے شروع ہوتا ہے اسی طرح عزیز و حکیم کے نام پر ختم بھی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس سورہ کا مقصد خدا کی حقیقی معرفت، اس کی تسبیح اور اس کے مقدس اسماء و صفات سے آگاہی ہے۔ اسمائے حسنیٰ کے بارے میں جن کی طرف مذکورہ بالا آیات میں اشارہ ہوا ہے ۔ ایک تفصیلی بحث سورہ اعراف کی آیت ۱۸ میں گزر چکی ہے۔[3]

"خداوندا ! تجھے اپنے اسمائے حسنیٰ اور صفات مقدسہ کی عظمت کی قسم ہمارے دلوں کو قرآن مجید کے سامنے خاضع و خاشع قرار دے ۔"

" پروردگارا ! شیطان کا دام فریب سخت ہے اگر تیرا لطف و کرم مددگار نہ ہو تو ہمارا اس سے بچنا مشکل ہے۔ ہمیں اپنے لطف و کرم کی پناہ میں شیاطین کے وسوسوں سے محفوظ رکھ ۔"

" بارالٰہا ! ایثار و تقویٰ کی رُوح، ہر قسم کے بُخل، کینہ اور حسد سے دُور رکھ کر، ہمیں عطا فرما اور ہم کو خود پسندی و خُود خواہی سے محفوظ رکھ ۔ آمین یا رب العالمین !

سُورۂ حشر کا اختتام
جلد ۲۳ کا اختتام
آخر شعبان ۱۴۰۶ھ ق
۱۳۶۵/۲/۲۰ شمسی

اختتام ترجمہ بتاریخ ۸ ذی قعد ۱۴۰۷ھ مطابق ۵ر جولائی ۱۹۸۷ء بروز اتوار بوقت آٹھ بج کر دس منٹ صبح، بر مکان حقیر قم مقدس جمہوری اسلامی ایران ۔

الحمد للہ اولاً و آخراً وصلی اللہ علیٰ محمد و آلہ سرمداً ابداً

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۹۳ ۔

[2] تفسیر در المنثور جلد ۶ ص ۲۰۱ ۔

[3] تفسیر نمونہ جلد ۴ ص ۳۴۴ سے آگے ۔

سورۂ ممتحنہ

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا اور اس کی ۱۳ آیات ہیں

آغاز
اول ماہ مبارک رمضان ۱۴۰۶ ھ
بمطابق ۲۱، ۲، ۱۳۶۵ ش

سورۂ مُمتحنہ کے مضامین

حقیقت میں اس سورہ کے دو حصّے ہیں :-

پہلے حصّے میں: "حب فی اللّٰہ" اور "بغض فی اللّٰہ" کے مسئلہ اور مُشرکین سے دوستی کرنے سے ممانعت کا بیان ہے، مسلمانوں کو خُدا کے عظیم پیغمبرؑ سے ہدایت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور اسی سلسلہ میں کچھ اور خصوصیات کا بیان ہے۔

یہ مضمون جس طرح سورۃ کی ابتداء میں آیا ہے اسی طرح سورۃ کے اختتام پر بھی اس کی تکرار اور تائید ہوئی ہے۔

دوسرے حصّے میں : مہاجر عورتوں، ان کی آزمائش اور امتحان اور اسی سے مربُوط کچھ احکام سے بحث کی گئی ہے۔ اس سورہ کے لیے "ممتحنہ" کے نام کا انتخاب بھی اسی امتحان کے مسئلہ کی وجہ سے ہے جو آیت ۱۰ میں آیا ہے۔[1]

اس سورہ کے لیے ایک اور نام بھی بیان کیا گیا ہے اور وہ سورہ مودّت ہے کہ جو اس سورۃ کی پہلی آیت میں مُشرکین سے مودّت کرنے سے منع کرنے کی وجہ سے ہے۔

سورۂ ممتحنہ کی تلاوت کی فضیلت

رسولِ خُداؐ سے ایک حدیث میں آیا ہے :-

من قرء سورة الممتحنة كان المؤمنون والمؤمنات له شفعاء يوم القيامة۔

"جو شخص سُورۃ ممتحنہ کی تلاوت کرے گا، تمام مومنین و مومنات قیامت کے دن اس کے شفیع ہوں گے۔"[2]

---

[1] بعض نے اس کو ممتحَنہ (حاء کی فتح کے ساتھ) پڑھا ہے۔ مُہاجر خواتین کے لحاظ سے جن کا امتحان لیا جاتا تھا اور بعض نے ممتحِنہ (حاء کی زیر کے ساتھ) پڑھا ہے، کیونکہ یہ سورۃ خود امتحان کا ایک ذریعہ ہے۔

[2] مجمعُ البیان جلد ۹ ص ۲۶۷

ایک اور حدیث میں امام علی بن الحسینؑ سے آیا ہے :

من قرء سورة الممتحنة فی فرائضه ونوافله امتحن الله قلبه للایمان و نور له بصره ولا یصیبه فقر ابداً، ولا جنون فی بدنه ، ولا فی ولده.

جو شخص سُورۃ ممتحنہ کو واجب اور مستحب نمازوں میں پڑھے گا، خدا اس کے دل کو ایمان کے لیے خالص اور آمادہ کر دے گا۔ اور اُسے نورِ بصیرت عطا کرے گا اور ہرگز اُسے فقر و فاقہ دامن گیر نہ ہوگا اور وہ خود اور اس کی اولاد جنوُن میں گرفتار نہ ہوگی۔

یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ یہ تمام فضیلتیں اور اعزاز اس شخص کے لیے ہیں جو اس سورہ کی آیات پر "حب فی اللہ" "بغض فی اللہ" اور راہِ خُدا میں جہاد کرنے کے سلسلہ میں اس کے مضمون پر کاربند ہونے کے لیے توجہ دے گا اور صرف بے رُوح تلاوت اور علم و عمل کے بغیر پڑھنے پر اکتفا نہیں کرے گا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّیۡ وَ
عَدُوَّکُمۡ اَوۡلِیَآءَ تُلۡقُوۡنَ اِلَیۡهِمۡ بِالۡمَوَدَّةِ وَ قَدۡ
كَفَرُوۡا بِمَا جَآءَكُمۡ مِّنَ الۡحَقِّ ۚ يُخۡرِجُوۡنَ الرَّسُوۡلَ
وَ اِيَّاكُمۡ اَنۡ تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ رَبِّكُمۡ ؕ اِنۡ كُنۡتُمۡ خَرَجۡتُمۡ
جِهَادًا فِىۡ سَبِيۡلِىۡ وَابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِىۡ ۖ تُسِرُّوۡنَ
اِلَيۡهِمۡ بِالۡمَوَدَّةِ ۖ وَ اَنَا اَعۡلَمُ بِمَاۤ اَخۡفَيۡتُمۡ وَمَاۤ
اَعۡلَنۡتُمۡ ؕ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡهُ مِنۡكُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيۡلِ ۝
(۲) اِنۡ يَّثۡقَفُوۡكُمۡ يَكُوۡنُوۡا لَكُمۡ اَعۡدَآءً وَّيَبۡسُطُوۡۤا اِلَيۡكُمۡ
اَيۡدِيَهُمۡ وَاَلۡسِنَتَهُمۡ بِالسُّوۡٓءِ وَوَدُّوۡا لَوۡ تَكۡفُرُوۡنَ ۝
(۳) لَنۡ تَنۡفَعَكُمۡ اَرۡحَامُكُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ ۛۚ يَوۡمَ
الۡقِيٰمَةِ ۛۚ يَفۡصِلُ بَيۡنَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ۝

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

(۱) اے ایمان لانے والو! تم میرے دشمن اور اپنے دشمن کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ تم ان کے لیے محبت کا اظہار کرتے ہو، حالانکہ جو حق تمھارے پاس آیا ہے وہ اس سے کافر ہو گئے ہیں۔ وہ

رسولِ خدا ؐ کو اور تمھیں اس وجہ سے تمھارے شہر سے نکالتے ہیں کہ تم اپنے پروردگار خدا پر ایمان لائے ہو۔ اگر تم نے میری راہ میں جہاد کرنے اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہجرت کی ہے تو تم اُن سے دوستی کا رشتہ قائم نہ کرو، تم مخفی طور پر ان سے دوستی کا رابطہ قائم کر رہے ہو حالانکہ جو کچھ تم پنہاں و آشکارا کرتے ہو میں اس سے اچھی طرح آگاہ ہوں، اور تم میں سے جو بھی یہ کام کرے وہ راہِ راست سے گمراہ ہو گیا ہے۔

(۲) اگر وہ تم پر مسلّط ہو جائیں تو وہ تم سے دشمنی ہی کریں گے اور تمھارے ساتھ اپنے ہاتھ اور زبان سے بدی ہی کریں گے اور تمھیں کفر کی طرف پلٹانے کی کوشش کریں گے۔

(۳) تمھارے عزیز و اقربا اور تمہاری اولاد تمھیں ہرگز کوئی نفع نہیں دیں گے۔ وہ قیامت کے دن تمھارے درمیان جُدائی ڈال دے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو خُدا اُسے دیکھ رہا ہے۔

شانِ نزول

اکثر مفسرین نے تصریح کی ہے کہ یہ آیات (یا پہلی آیت) "حاطب بن ابی بلتعہ" کے بارے میں نازل ہوئی ہیں (البتہ مختصر سے فرق کے ساتھ) مرحوم طبرسی نے جو کچھ مجمع البیان میں ذکر کیا ہے ہم اُسے ذیل میں بیان کرتے ہیں:۔

واقعہ یہ ہُوا کہ ایک عورت جس کا نام "سارہ" تھا اور وہ مکّہ کے کسی قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی، مکّہ سے مدینہ میں پیغمبر ؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی، پیغمبرؐ نے اُس سے فرمایا:۔ کیا تو مُسلمان ہو کر آئی ہے؟ اُس نے عرض کیا:۔ نہیں! آپ نے فرمایا: کیا تو مُہاجرت کے عنوان سے آئی ہے؟ اُس نے کہا: نہیں!

آپ نے فرمایا: پھر تو کیوں آئی ہے؟ اُس نے عرض کیا: آپ ہماری اصل اور عشیرہ و قبیلہ تھے۔ میرے سارے کے سارے سرپرست چل دیے ہیں اور میں سخت محتاج ہو گئی ہُوں میں اس لیے آپ کے پاس آئی ہوں تاکہ آپ مجھے کچھ عطا کریں اور لباس اور سواری سے نوازیں۔

آپ نے فرمایا: مکّہ کے جوان کہاں چلے گئے؟ (یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ عورت گانے والی تھی اور جوانوں کے لیے گانے گایا کرتی تھی۔)

اُس نے کہا: جنگِ بدر کے بعد کسی نے مجھ سے گانے کی خواہش نہیں کی۔ (اس سے پتہ چلتا ہے کہ جنگِ بدر کی ضرب مُشرکینِ مکّہ پر کتنی سخت تھی۔)

آنحضرتؐ نے اولادِ عبدالمطلب کو حکم دیا تو اُنھوں نے اُسے لباس، سواری اور زادِ راہ دیا، یہ اس موقع کی بات ہے جب آپ فتح مکّہ کے لیے تیاری کر رہے تھے۔

اس موقعہ پر" حاطب بن ابی بلتعہ" (ایک مشہور مُسلمان جو جنگِ بدر و بیعت رضواں میں شریک تھا) 'سارہ' کے پاس آیا اُس نے ایک خط لکھ کر اُسے دیا اور کہا: یہ اہلِ مکّہ کو دے دینا۔ اُس نے دس دینار اور بقولے دس درہم اُسے دیے اور ایک یمنی کپڑا بھی اُسے دیا۔

"حاطب" نے اہلِ مکّہ کو خط میں یہ لکھا تھا کہ رسُولِ خُداؐ تمھاری طرف آنے کی تیاری کر رہے ہیں، لہٰذا تم اپنے دفاع کے لیے تیار رہو۔" سارہ نے خط لیا اور مدینہ سے مکّہ کی طرف چل پڑی۔

جبرئیل نے اس واقعہ کی اطلاع پیغمبرؐ کو پہنچائی۔ رسُولِ خُدا نے علیؑ و عمار و عمر و زبیر و طلحہ و مقداد و ابو مرثد کو حکم دیا کہ وہ سوار ہو کر مکّہ کی طرف جائیں۔ اُن سے یہ بھی فرمایا کہ تمھیں راستہ کے درمیان ایک منزل پر ایک عورت "سارہ" نامی ملے گی، جو مُشرکین مکّہ کے لیے "حاطب" کا ایک خط لے کر جا رہی ہے تم اُس سے وہ خط لے لو۔

وہ وہاں سے چل پڑے اور اسی جگہ اس تک جا پہنچے جہاں رسُولِ خُداؐ نے فرمایا تھا۔ اُس نے قسم کھائی کہ اُس کے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ اُنھوں نے اُس کے سامانِ سفر کی تلاشی لی، لیکن انھیں کوئی چیز نہیں ملی، اور سب نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ لیکن علیؑ نے فرمایا: نہ تو ہمارے پیغمبرؐ نے جھوٹ کہا ہے، اور نہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں، آپ نے تلوار سونت لی اور فرمایا: خط نکالو ورنہ خدا کی قسم! میں تمھاری گردن اُڑا دوں گا۔ 'سارہ' نے جب مسئلہ کی حقیقت کو سمجھ لیا تو خط جو اُس نے اپنے گیسوؤں میں چھپایا ہُوا تھا باہر نکالا اور وہ لوگ اس خط کو لے کر پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہُوئے۔

آنحضرتؐ نے کسی کو بھیج کر "حاطب" کو بُلوایا اور فرمایا: یہ خط پہچانتے ہو؟ اس نے عرض کیا: جی ہاں! آپ نے فرمایا: تم نے یہ کام کس لیے کیا ہے؟

اُس نے عرض کیا: یا رسُول اللہؐ! خدا کی قسم۔ جس دن سے میں نے اسلام قبول کیا ہے، ایک لمحہ کے لیے کافر نہیں ہُوا اور کبھی بھی آپ سے خیانت نہیں کی ہے۔ جب سے میں مُشرکین سے جُدا ہُوا ہُوں کبھی ان کی دعوت قبُول نہیں کی، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ سبھی مہاجرین کے کچھ کچھ لوگ مکّہ میں ہیں جو مُشرکین کے مقابلے میں ان کے گھر والوں کی حمایت کرتے ہیں۔ مگر میں اُن کے درمیان اجنبی ہوں اور میرے گھر والے ان کے چُنگل میں گرفتار ہیں۔ میں نے چاہا کہ اس طرح سے اپنا ایک حق اُن کی گردن پر رکھ دُوں تاکہ وہ میرے گھر والوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچائیں، حالانکہ میں جانتا ہُوں کہ آخر کار خُدا انھیں شکست دے گا اور میرا خط انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

پیغمبرؐ نے اس کا عُذر قبُول کر لیا، لیکن عمر بن خطاب نے کھڑے ہو کر کہا: یا رسول اللہؐ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس مُنافق کی گردن اُڑا دُوں۔

پیغمبرؐ نے فرمایا: یہ بدر کے غازیوں میں سے ہے اور خُدا ان پر ایک خاص نظرِ کرم رکھتا ہے۔ (اس موقعہ پر اوپر والی آیات نازل ہُوئیں اور ان میں مُسلمانوں کو مشرکین اور دشمنان خدا سے ہر قسم کی دوستی ترک کرنے کے سلسلے میں اہم

درس دیئے گئے۔[1]

تفسیر

خدا سے دوستی کرنے کا انجام

جیسا کہ ہم شانِ نزول کے ذریعے جان چکے ہیں ایک مسلمان سے ایک حرکت صادر ہوئی جو اگرچہ جاسوسی کے ارادہ سے نہیں تھی لیکن دشمنانِ اسلام سے اظہارِ محبت شمار ہوتی تھی۔ لہٰذا اُوپر والی آیات نازل ہوئیں اور مسلمانوں کو یہ تنبیہ کی گئی کہ آئندہ اِس قسم کے کاموں سے پرہیز کریں۔[1]

پہلے فرماتا ہے: اے ایمان لانے والو! تم میرے اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ (یاایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء)۔

یعنی وہ صرف خُدا ہی کے دشمن نہیں بلکہ وہ تم سے بھی دشمنی رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان حالات میں تم ان کی طرف دوستی کا ہاتھ کس طرح بڑھاتے ہو؟

اس کے بعد مزید کہتا ہے: تم ان کے لیے محبت کا اظہار کرتے ہو، حالانکہ وہ اس حق (اسلام و قرآن) سے جو تمہارے لیے آیا ہے کافر ہو گئے ہیں۔ وہ رسُولِ خدا کو اور تمھیں، تمھارے شہر و دیار سے اس وجہ سے باہر نکالتے ہیں کہ تم اپنے پروردگار خدا پر ایمان لائے ہو۔ (تلقون الیھم بالمودة وقد کفروا بما جاءکم من الحق یخرجون الرسول وایاکم ان تؤمنوا باللہ ربکم)۔[2]

وہ عقیدہ میں بھی تمھارے مخالف ہیں اور عملی طور پر جنگ کے لیے کھڑے ہیں۔ اِس کام کو جو تمھارے لیے عظیم ترین اعزاز و افتخار ہے۔ یعنی پروردگار پر ایمان، اسے اُنھوں نے تمھارے لیے بہت ہی بڑا گناہ شمار کیا ہے اور اسی وجہ سے انھوں نے تمھیں تمھارے شہر و دیار سے نکالا ہے۔ ان حالات میں کیا اس بات کی گنجائش ہے کہ تم ان کے لیے محبت کا اظہار کرو اور سپاہِ اسلام کے قوی ہاتھوں سے ہونے والے عذابِ الٰہی کے چنگل سے ان کی نجات کے لیے کوشش کرو؟

اِس کے بعد مزید وضاحت کے لیے اضافہ کرتا ہے: اگر تم نے راہِ جہاد میں جہاد کرنے اور میری خوشنودی کے حصول کے لیے ہجرت کی ہے تو تم ان سے دوستی کا رشتہ قائم نہ کرو (ان کنتم خرجتم جھادًا فی سبیلی وابتغاء مرضاتی)۔[3]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۲۶۹ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ) اس شانِ نزول کو بخاری نے اپنی صحیح (جلد ۶ ص ۱۸۵، ۱۸۶) میں، فخر رازی نے اپنی تفسیر میں اور اسی طرح تفسیر "رُوح المعانی" و "رُوح البیان" و "فی ظلال" و "قرطبی" و "مراغی" وغیرہ نے تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

[2] "تلقون الیھم بالمودة" کے جملہ کو "لا تتخذوا" کی ضمیر سے حال یا جملہ استینافیہ سمجھتے ہیں۔ (کشاف جلد ۴ ص ۵۱۲) اور "بالمودة" کی "باء" کو زائدہ اور تاکید کے لیے، جیسے (ولا تلقوا بایدکم الی التھلکة) ہے یا "سببیہ" ہے حذفِ مفعول کے ساتھ اور تقدیر میں اس طرح ہے۔ "تلقوا الیھم اخبار رسول اللہ بسبب المودة التی بینکم وبینھم" (وہی مدرک)

[3] مفسرین کی ایک جماعت یہ نظریہ رکھتی ہے کہ اس جُملہ شرطیہ کی جزاء محذوف ہے کہ جس کا گذشتہ جُملہ سے استفادہ ہوتا ہے۔ یہ تقدیر میں اس طرح ہے: (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اگر واقعتاً تم خدا کی دوستی کا دم بھرتے ہو، اسی کی خاطر تم نے اپنے شہر اور گھروں سے ہجرت کی ہے اور جہاد فی سبیل اللہ سے خدا کی رضا حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہ بات دشمنانِ خدا کی دوستی کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

اس کے بعد مزید وضاحت کے لیے اضافہ کرتا ہے: "تم مخفی طور پر اُن سے دوستی کا رابطہ قائم کر رہے ہو، حالانکہ جو کچھ تم پنہاں و آشکار کرتے ہو میں اس سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔ (تسرون الیھم بالمودة و انا اعلم بما اخفیتم وما اعلنتم)۔[1]

اس بناء پر خدا کے غیب و شہود کا عالم ہوتے ہوئے اخفاء کاری کا کیا فائدہ ہے۔

اس آیت کے آخر میں قاطع تہدید کے عنوان سے فرماتا ہے: "تم میں سے جو شخص بھی اس قسم کا کام کرے گا وہ سیدھے راستے سے منحرف اور گمراہ ہو جائے گا۔ (ومن یفعلہ منکم فقد ضل سواء السبیل)۔

وہ خدا کی معرفت کے راستہ سے بھی ہٹ گیا، کیونکہ اُس نے یہ گمان کر لیا کہ کوئی چیز خُدا سے مخفی رہ جاتی ہے۔ وہ ایمان اخلاص اور تقویٰ کی راہ سے بھی ہٹ گیا۔ جبھی تو خُدا کے دشمنوں سے دوستی کی بُنیاد رکھی ہے۔ اس نے اپنی زندگی کی جڑوں پر بھی کلہاڑی ماری ہے کہ اپنے دشمن کو اپنے اسرار سے باخبر کر دیا ہے۔ یہ وہ بدترین انحراف ہے جو مومن آدمی کو سرچشمۂ ایمان تک پہنچنے کے بعد عارض ہو سکتا ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں مزید تاکید و توضیح کے لیے فرماتا ہے: "تم ان کے ساتھ دوستی کیوں کرتے ہو؟ حالانکہ اگر وہ تم پر مُسلّط ہو جائیں تو وہ تم سے دشمنی ہی کریں گے اور تمھارے ساتھ اپنے ہاتھ اور زبان سے بدی ہی کریں گے۔" (ان یثقفوکم یکونوا لکم اعداء ویبسطوا الیکم ایدیھم والسنتھم بالسوء)۔[2]

تم ان کے ساتھ ہمدردی کرتے ہو، حالانکہ وہ تمھارے اتنے پکے دشمن ہیں کہ اگر وہ تم پر مُسلّط ہو جائیں تو وہ کسی بھی کام میں کوئی فروگذاشت نہ کریں گے اور تمھیں اپنے ہاتھ اور زبان سے ہر قسم کا آزار اور تکلیف پہنچائیں گے۔ کیا ایسے لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنا مُناسب ہے؟

سب سے بُری بات یہ ہے کہ "وہ یہ چاہتے ہیں کہ تمھیں اِسلام سے کفر کی طرف پلٹا دیں" اور اپنے سب سے بڑے افتخار، یعنی گوہرِ ایمان کو کھو بیٹھو۔ (ودّوا لو تکفرون)۔

(بقیہ حاشیہ) "ان کنتم خرجتم جهادًا فی سبیلی وابتغاء مرضاتی لا تتولوا اعدائی۔

[1] یہ ایک جُملۂ استینافیہ ہے اور "ما اسررتم" کے بجائے "ما اخفیتم" کی تعبیر اس لحاظ سے ہے کہ اس سے زیادہ مُبالغہ ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ اخفاء پنہاں کاری سے زیادہ عمیق مرحلہ ہے۔ (تفسیر فخر رازی زیرِ بحث آیت کے ذیل میں)

[2] "یثقفوکم" "ثقف اور ثقافة" کے مادہ سے، کسی چیز کی تشخیص اور اس کے انجام دینے میں مہارت کے معنی میں ہے۔ اِس لیے فرہنگ و تمدن یا کسی چیز پر ماہرانہ تسلط کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اور یہ واقعی ایک دردناک ترین ضرب ہے جو وہ تم پر لگانا چاہتے ہیں۔

آخری زیربحث آیت میں "حاطب بن ابی بلتعہ" جیسے افراد کو جواب دیتا ہے۔ جب پیغمبرؐ نے اُس سے فرمایا تھا کہ تو نے مسلمانوں کے اسرار مشرکینِ مکہ کے پاس کیوں پہنچائے؟ تو اُس نے یہ جواب دیا تھا: میرے عزیز و اقارب مکہ میں ہیں کہ جو کفار کے ہاتھوں میں گرفتار ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ انھیں آسیب پہنچائیں گے۔ اس لیے میں نے چاہا کہ اس طریقے سے اُن کی حفاظت کروں۔ خدا فرماتا ہے: تمھارے عزیز و اقرباء اور تمھاری اولاد ہرگز تمھیں کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی۔ (لن تنفعکم ارحامکم ولا اولادکم)۔

کیونکہ اگر اولاد اور عزیز و اقارب بے ایمان ہوں تو وہ نہ اس دُنیا کے لیے عزت و آبرو اور سرمایہ ہوں گے، نہ ہی آخرت میں ذریعۂ نجات۔ پس مومن اُن کے لیے ایسے کام کیوں کریں جو خُدا کے غضب اور اُس کے اولیاء سے منقطع ہونے کا موجب ہوں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "خُدا قیامت کے دن تمھارے اور ان کے درمیان جُدائی ڈال دے گا۔" (یوم القیامۃ یفصل بینکم)۔[1]

اہلِ ایمان جنت کی طرف اور اہلِ کفر دوزخ کی طرف جائیں گے۔ یہ حقیقت میں اس بات کے لیے ایک دلیل ہے جو پہلے بیان کی گئی ہے۔ یعنی وہاں تم ایک دُوسرے سے جُدا ہو جاؤ گے اور تمام رشتے کُلی طور پر منقطع ہو جائیں گے تو پھر وہ تمھیں کون سا نفع پہنچائیں گے؟

یہ آیت حقیقت میں اسی بات سے مُشابہ ہے جو سورۂ عبس کی آیہ ۳۴ تا ۳۶ میں بیان ہوئی کہ جس میں فرماتا ہے: یوم یفر المرء من اخیہ وامہ وابیہ وصاحبتہ وبنیہ: "وہ دن دُور نہیں جس میں انسان اپنے بھائی، ماں، باپ، بیوی اور اولاد سے فرار کرے گا۔"

آیت کے آخر میں ایک دفعہ پھر سب کو خبردار کرتا ہے کہ "جو کچھ تم کرتے ہو خُدا اُسے دیکھ رہا ہے۔" (واللّٰہ بما تعملون بصیر)۔

وہ تمھاری نیتوں سے آگاہ ہے اور اُن اعمال سے بھی جو تم پوشیدہ طور پر انجام دیتے ہو۔ اگر کچھ موارد میں وہ تمھارے اسرار کو "حاطب بن ابی بلتعہ" کی طرح فاش نہیں کرتا تو وہ کچھ مصالح کی بناء پر ہے، نہ یہ کہ وہ واقف اور آگاہ نہیں ہے۔

حقیقت میں خُدا کا غیب و شہود اور ظاہر و پوشیدہ علم، انسان کی تربیت کے لیے ایک مُؤثر ذریعہ ہے کہ وہ ہر حالت میں خود کو اس کی بارگاہ کے سامنے سمجھے اور سارے جہان کو خُدا کے حضُور میں حاضر جانے۔ وہ اپنی گفتار و رفتار حتّٰی کہ اپنی نیّت کا بھی خیال رکھے۔ یہی چیز ہے جو ہم کہتے ہیں کہ خُدا کی مکمل معرفت تقویٰ کے ظہور کا سرچشمہ ہے۔

---

[1] بہت سے مفسرین نے "یوم القیامۃ" کو یفصل کا متعلق سمجھا ہے۔ لیکن بعض اسے "لن تنفعکم" کے متعلق سمجھتے ہیں۔ تاہم دونوں کا نتیجہ قریب قریب ایک ہی ہے۔ اگرچہ پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ بعض "یفصل" کی تفسیر جُدائی ڈالنے کے معنی میں نہیں کرتے بلکہ فصل کو قضاوت اور فیصلہ کرنے کے معنی میں جانتے ہیں۔ لیکن یہاں پہلا معنی زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

(۴) قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیٓ اِبْرٰهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ ۚ
اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ
اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ
لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ رَبَّنَا عَلَیْكَ تَوَكَّلْنَا
وَاِلَیْكَ اَنَبْنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ۝
(۵) رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ
اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝
(۶) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ یَرْجُوا
اللّٰهَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ ؕ وَمَنْ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِیُّ
الْحَمِیْدُ ۝

ترجمہ

(۴) تمھارے لیے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی ایک اچھا نمونہ ہے ۔ جب اُنھوں نے اپنی مُشرک قوم سے کہا : ہم تم سے اور جنکی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو، ان سے بھی بیزار ہیں ۔ ہمارا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے ، اور ہمارے تمھارے درمیان ہمیشہ کی

دشمنی ہو چکی ہے اور یہ حالت اُس وقت تک جاری رہے گی حتّٰی کہ تم خدائے یگانہ پر ایمان لاؤ سوائے اس بات کے جس کا ابراہیمؑ نے اپنے باپ (چچا) سے وعدہ کیا تھا کہ میں تیرے لیے طلبِ بخشش کروں گا، لیکن اس کے باوجود میں خُدا کے مُقابلہ میں تیرے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہُوں، پروردگارا! ہم نے تجھ پر ہی توکّل کیا ہے، تیری ہی طرف لَوٹتے ہیں اور سب کی بازگشت تیری ہی طرف ہے۔

۵ پروردگارا! ہمیں کافروں کے لیے گمراہی کا سبب قرار نہ دے اور ہمیں بخش دے، اے ہمارے پروردگار! بے شک تُو عزیز و حکیم ہے۔

۶ ان کی زندگی میں تمھارے لیے ایک اچھا نمُونہ تھا، ان کے لیے جو خُدا اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو شخص رُوگردانی کرے گا تو وہ خُود اپنے آپ کو ہی ضرر پہنچائے گا، کیونکہ خُدا تو بے نیاز ہے اور ہر قسم کی تعریف و ستائش کے قابل ہے۔

تفسیر

ابراهیم تم سب کے لیے نمونه هیں

چُونکہ قرآن مجید بہُت سے موارد میں اپنی تعلیمات کی تکمیل کے لیے ایسے اہم نمونے جو جہانِ انسانیت میں موجُود ہیں، گواہ کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اِس لیے زیرِ بحث آیات میں بھی دشمنانِ خُدا سے دوستی کرنے سے سختی کے ساتھ منع کرنے کے بعد، ابراہیمؑ اور اُن کے طریقۂ کار کے بارے میں ایک ایسے عظیم پیشوا کے عنوان سے جو تمام اقوام کے لیے اور خاص طوؔ پر قومِ عرب کے لیے احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے، گفتگو کرتے ہُوئے فرماتا ہے: "تمھارے لیے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں اچھا نمُونہ ہے۔" (قد کانت لکم اسوة حسنة فی ابراهیم والذین معه)[1]

---

[1] مفسّرین نے اس جُملہ کی ترکیب میں کئی احتمال دیے ہیں، لیکن ظاہر یہ ہے کہ "اسوة حسنة" "کان" کا اسم اور "لکم" اس کی خبر ہے۔ اور "فی ابراهیم" "اسوة حسنة" کا متعلق ہے۔ ضمنی طور پر اس بات کی طرف توجّہ کرنا چاہیئے کہ "اسوة" تاسی اور پیروی کے معنی میں کبھی تو اچھے

(باقی اگلے صفحہ پر)

ابراہیمؑ پیغمبروں کے بزرگ تھے۔ ان کی زندگی سرتاسر خدا کی عبودیت، جہاد فی سبیل اللہ اور اس کی پاک ذات کے عشق کے لیے ایک سبق تھی۔ وہ ابراہیمؑ کہ اُمتِ اِسلامی ان کی بابرکت دُعا کا نتیجہ ہے اور ان کے رکھے ہوئے نام پر فخر کرتی ہے، وہ تمھارے لیے اس سلسلہ میں ایک اچھا نمونہ بن سکتے ہیں۔

"والذین معہ" (جو لوگ ابراہیمؑ کے ساتھ تھے) کی تعبیر سے مُراد وہ مؤمنین ہیں جو اس راہ میں ان کے پیرو اور ساتھی رہے۔ اگرچہ وہ قلیل تعداد میں تھے۔ باقی رہا یہ احتمال کہ اس سے مُراد وہ پیغمبر ہیں جو آپ کے ساتھ ہم آواز تھے یا اُن کے زمانے کے پیغمبر، جیسا کہ بعض نے احتمال دیا ہے۔ تاہم یہ بہت بعید نظر آتا ہے خصوصًا جبکہ مُناسب یہ ہے کہ قرآن یہاں پیغمبر اسلامؐ کو ابراہیمؑ کے ساتھ اور مُسلمانوں کو اُن کے اصحاب و انصار سے تشبیہ دے۔ یہ تو اریخ میں بھی آیا ہے کہ بابل میں ایک گروہ ایسا تھا جو ابراہیمؑ کے مُعجزات دیکھنے کے بعد ان پر ایمان لے آیا تھا اور شام کی طرف ہجرت میں وہ آپ کے ساتھ تھا، اِس سے پتہ چلتا ہے کہ ابراہیمؑ کے کچھ وفادار یار و انصار بھی تھے۔[1]

اس کے بعد اس معنی کی وضاحت کے لیے مزید کہتا ہے: "جب انھوں نے اپنی مُشرک اور بُت پرست قوم سے کہا: ہم تم سے اور جن غیر اللہ کی تم پرستش کرتے ہو، ان سے بھی بیزار ہیں"۔ (اذ قالوا لقومھم انا برءٰؤا منکم ومما تعبدون من دون اللہ)۔

ہم نہ تو تمھیں اور نہ ہی تمھارے دین و مذہب کو قبول کرتے ہیں۔ ہم تم سے اور تمھارے بے قدر و قیمت بُتوں سے بھی نفرت کرتے ہیں۔

دوبارہ مزید تاکید کے لیے فرمایا: ہم نے تم سے کفر اختیار کر لیا۔ (کفرنا بکم)۔

البتہ یہ کفر وہی برأت و بیزاری ہے کہ جس کی طرف بعض روایات میں کُفر کی پانچ اقسام کے شمار میں اشارہ ہُوا ہے۔[2]

پھر تیسری مرتبہ مزید تاکید کے لیے اضافہ کرتا ہے: "ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کی دُشمنی ہو چکی ہے۔" (وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء ابدًا)۔

اور یہ وضع و کیفیت اسی طرح جاری رہے گی۔ یہاں تک کہ تم خُدائے یگانہ پر ایمان لاؤ۔ (حتّٰی تؤمنوا باللہ وحدہ)۔

اِس طرح سے انھوں نے کسی بھی طرح کی لگی لپٹی کے بغیر دو ٹوک طریقے سے دشمنانِ خُدا سے جُدائی اور بیزاری کا اعلان کر دیا اور صراحت کے ساتھ کہا کہ جُدائی کسی قیمت پر بھی واپسی اور تجدیدِ نظر کے قابل نہیں ہے۔ یہ ابد تک جاری رہے گی مگر یہ کہ وہ اپنی راہ بدل لیں اور کُفر کو چھوڑ کر ایمان کی طرف آ جائیں۔

(بقیہ حاشیہ ص۵۳۶) کاموں کے لیے اور کبھی بُرے کاموں کے لیے آتا ہے۔ اِسی لیے اوپر والی آیات میں "حسنۃ" کے ساتھ مُقید ہوا ہے۔

[1] کامل ابن اثیر جلد ۱ ص ۱۰۰

[2] "براٰء" "بری" کی جمع ہے، جیسے "ظرفاء" و "ظریف"

لیکن چونکہ یہ کلی اور عمومی قانون ابراہیمؑ کی زندگی میں ایک استثناء رکھتا تھا جو بعض مشرکین کی ہدایت کے لیے صورت پذیر ہوا تھا، لہٰذا اس کے بعد فرماتا ہے : اُنھوں نے کافروں سے ہر قسم کا رابطہ منقطع کر لیا اور ان سے کوئی بھی محبت آمیز بات نہیں کی : "سوائے اس بات کے جو ابراہیمؑ نے اپنے باپ (چچا آذر) سے کی تھی کہ میں خدا سے تمھارے لیے طلب مغفرت کروں گا، لیکن اس کے باوجود میں خدا کے مقابلے میں تیرے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں اور بخشش تو صرف اُسی کے ہاتھ میں ہے۔" (الا قول ابراهيم لابيه لاستغفرن لك وما املك لك من الله من شيء) ۔[1]

حقیقت میں یہ ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کا بُت پرستوں سے ہر قسم کے ارتباط کو منقطع کرنے کے مسئلہ سے ایک ایسا استثناء ہے جو ایک خاص مصلحت اور حالات کی وجہ سے تھا، کیونکہ قرآن بتلاتے ہیں کہ ابراہیمؑ نے احتمالاً اپنے چچا آذر میں ایمان کے لیے آمادگی مشاہدہ کی ہوئی تھی، لیکن آذر اس مسئلہ سے پریشان تھا کہ اگر اس نے توحید کی راہ اختیار کی تو اُس کی بُت پرستی کے دور کا کیا بنے گا؟ لہٰذا ابراہیمؑ نے اُس سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ میں بارگاہِ خدا میں تیرے لیے استغفار کروں گا اور اس وعدہ پر آپ نے عمل بھی کیا۔ لیکن آذر ایمان نہ لایا۔ جب ابراہیمؑ پر یہ واضح ہو گیا کہ وہ دشمن خدا ہے اور ہرگز ایمان نہیں لائے گا تو پھر اُس کے لیے استغفار نہیں کیا اور اس سے قطع تعلق کر لیا۔

چونکہ مسلمان ابراہیمؑ اور آذر کے اِس واقعہ سے اجمالی طور پر باخبر تھے، لہٰذا ممکن تھا کہ یہی مطلب "حاطب بن ابی بلتعہ" جیسے لوگوں کے لیے کفار سے رازونیاز قائم رکھنے کا بہانہ بن جائے۔ اِس لیے قرآن کہتا ہے کہ یہ استثناء خاص حالات میں صورت پذیر ہوا۔ اور آذر کے ایمان لے آنے کا ایک ذریعہ تھا نہ کہ دنیوی مقاصد کے لیے تھا۔ اسی لیے سورۂ توبہ کی آیہ ۱۱۴ میں فرماتا ہے : وما كان استغفار ابراهيم لابيه الا عن موعدة وعدها اياه فلما تبين له انه عدو لله تبرأ منه ان ابراهيم لاواه حليم : ابراہیمؑ کا اپنے باپ (چچا آذر) کے لیے استغفار صرف اِس وعدہ کی بناء پر تھا جو اُنھوں نے اُس سے کر لیا تھا (تاکہ اسے ایمان کی طرف کھینچ لائیں) لیکن جب اُن پر یہ واضح ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو اُس سے بیزاری اختیار کر لی، بے شک ابراہیمؑ مہربان اور بُردبار تھے۔

لیکن مفسرین کی ایک جماعت نے اسے "ابراہیمؑ" کے اُسوہ سے استثناء سمجھا اور کہا ہے کہ سوائے ان کے اپنے چچا آذر کے لیے استغفار کرنے کے ہر چیز میں اُن کی اقتداء اور پیروی کرنا چاہیے۔

یہ مطلب اگرچہ چند ایک مفسرین کے کلام میں ہی آیا ہے، پھر بھی یہ بات بہت ہی بعید دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ اوّل تو وہ ہر چیز میں یہاں تک کہ اس عمل میں بھی اُسوہ تھے، کیونکہ اگر وہی "آذر" والے حالات بعض مشرکین میں پیدا ہو جاتے تو انھیں ایمان کی طرف کھینچ لانے کے لیے ان سے اظہارِ محبت کرنا اچھا کام ہوتا۔ دوسرے ابراہیمؑ ایک معصوم پیغمبر اور عظیم مجاہد انبیاء میں سے تھے۔ اور ان کے تمام کے تمام اعمال ہی نمونہ تھے، لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس مسئلہ کا

---

[1] "اصولِ کافی" بحوالہ "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۳۰۲

استثناء کریں ۔

خلاصہ یہ ہے کہ ابراہیمؑ اور اُن کے پیروکار پُوری قوت کے ساتھ بُت پرستوں کے مُخالف تھے ، لہٰذا ہمیں اس سبق کو اپنا دستور العمل بنانا چاہیئے ۔ آذر کے واقعہ میں کچھ خاص حالات تھے اور اگر وہ ہمارے لیے بھی پیدا ہو جائیں تو وہ ہمارے لیے بھی پیروی کے لائق ہیں ۔[1]

چونکہ دُشمنانِ خُدا کے ساتھ ایسی صراحت اور قاطعیّت کے ساتھ مبارزہ ، خصُوصاً اُس زمانہ میں جبکہ وہ قدرتِ ظاہری رکھتے تھے ، خُدا کی ذات پر توکّل کیے بغیر ممکن نہیں ہے ، لہٰذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے : پروردگارا ! ہم نے تجھ پر توکّل کیا ہے ، تیری طرف رُخ کیا ہے اور انجام کار سب کا آخری اور اصلی رجُوع تیری ہی طرف ہوتا ہے ۔ (ربنا علیك توکلنا والیك انبنا والیك المصیر) ۔

حقیقت میں اُنھوں نے اس عبارت میں تین مطالب خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیے ہیں :

اوّل : اُس کی ذات پر توکّل ، دُوسرے اُس کی طرف توبہ و بازگشت اور تیسرے اس حقیقت کی طرف توجّہ کہ تمام چیزوں کا آخری اور اصلی رجُوع اُسی کی طرف ہوتا ہے ، اور یہ ایک دُوسرے کے علّت و معلُول ہیں ۔ معاد اور آخری بازگشت پر ایمان لانا توبہ کا سبب بنتا ہے ، اور توبہ رُوحِ توکّل کو انسان میں زندہ کرتی ہے ۔[2]

بعد والی آیت میں ابراہیمؑ اور اُن کے ساتھیوں کی ایک اور درخواست کی طرف جو اس سلسلے میں حسّاس اور جاذب ہے اشارہ کرتے ہُوئے کہتا ہے : "پروردگارا ! ہمیں کافروں کی گمراہی کا سبب نہ بنا ۔" (ربنا لا تجعلنا فتنة للذین کفروا) ۔

یہ تعبیر ممکن ہے ایسے اعمال کی طرف اشارہ ہو جو بعض بے خبر لوگوں سے سرزد ہو جاتے ہوں جیسا کہ "حاطب بن ابی بلتعہ" کا عمل تھا ۔ یعنی وہ لوگ ایسا کام کر بیٹھتے ہیں جو گمراہوں کی تقویت کا سبب بن جاتا ہے حالانکہ ان کا گمان یہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے ۔

یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہمیں ان کے چُنگل میں گرفتار نہ کرانا اور ان کے مُقابلے میں مغلوب نہ کر دینا اور کہیں وہ یہ نہ کہنے لگ جائیں کہ اگر یہ حق پر ہوتے تو ہرگز شکست نہ کھاتے ۔ اور یہی بات اُن کی گمراہی کا سبب بن جائے گی ۔

---

[1] مذکورہ بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں "استثناء متصل ہے اور "مستثنیٰ منہ" ایک محذوف جُملہ ہے کہ جس پر آیت کا متن دلالت کرتا ہے ۔ تقدیر میں اس طرح ہے : ان ابراھیم وقومه تبرءوا منهم ولم یکن لهم قول یدل علی المحبة الا قول ابراھیم ... لیکن دوسری تفسیر کے مُطابق استثناء منقطع ہو جائے گا اور یہ خود اس پر دوسرا اعتراض ہے ۔

[2] ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے ، اس سے واضح ہو گیا کہ یہ جملہ ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کا ہے ۔ اگرچہ بعض مفسّرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہ ایک مستقل جُملہ ہے جو مُسلمانوں کی تعلیم کے عنوان سے ان آیات کے وسط میں نازل ہُوا ہے لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے ۔

یعنی اگر وہ اپنی شکست اور کافروں کے تسلّط سے ڈرتے ہیں تو خود اپنی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ دینِ حق پر کوئی اعتراض نہ ہو اور مشرکین کی ظاہری کامیابی ان کی حقانیت کی دلیل نہ سمجھی جائے۔ گویا ایک مومنِ واقعی کا طریقہ یہی ہے کہ وہ جو چاہتا ہے خدا کے لیے چاہتا ہے، وہ سب سے کٹ کر خدا کا ہوگیا ہے اور تمام کام اسی کی رضا کے لیے کرتا ہے۔

سوی تو کردیم روی و دل بہ تو بستیم
از ہمہ باز آمدیم با تو نشستیم !!
ہرچہ نہ پیوند یار بود بریدیم
ہرچہ نہ پیمان دوست بود گسستیم

ہم نے تیری طرف رُخ کیا ہے اور تجھ سے ہی دِل لگایا ہے۔
ہم سب کو چھوڑ کر تیرے ساتھ ہو بیٹھے ہیں۔
جس کا تعلق محبوب سے نہ ہو اُس سے ہم کٹ گئے ہیں۔
جو دوست کا عہد و پیمان نہیں تھا ہم نے اُس کو توڑ دیا ہے۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "پروردگارا! اگر ہم سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو ہمیں بخش دینا"۔ (واغفرلنا ربنا)۔
تُو عزیز و حکیم ہے: (انك انت العزيز الحكيم)۔
تیری قدرت شکست ناپذیر ہے اور تیری حکمت ہر چیز میں نافذ ہے۔ ہو سکتا ہے یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اگر ہماری زندگی میں تیرے دشمنوں کی طرف تمائل، محبت اور دوستی کی نشانی موجود ہو تو ہماری اس لغزش کو بخش دے۔ نیز یہ تمام مسلمانوں کے لیے ایک درس ہے کہ وہ بھی اس کو دستور العمل بنائیں اور اگر کوئی "حاطب" ان میں پیدا ہو جائے تو وہ استغفار کریں اور خدا کی طرف پلٹ آئیں۔

٭ ٭ ٭

پھر آخری زیرِ بحث آیت میں دوبارہ اسی مطلب کو بیان کرتا ہے جو پہلی آیت میں بیان کیا گیا تھا۔ فرماتا ہے: ان کی زندگی تم مسلمانوں کے لیے ایک اچھا نمونہ تھے ان لوگوں کے لیے جو خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ (لقد كان لكم فيهم اسوة حسنة لمن كان يرجوا الله واليوم الاخر)[1]
نہ صرف بُت پرستوں اور کفر کے طریقہ سے ان کی برأت اور بیزاری بلکہ بارگاہِ خدا میں ان کی دُعائیں اور تقاضے بھی... جن کے کچھ نمونے گزشتہ آیات میں گزر چکے ہیں، تمام مسلمانوں کے لیے دستور العمل ہیں۔
یہ دستور العمل اور نمونہ وہی لوگ قبول کرتے ہیں جنھوں نے خدا کے ساتھ دل لگا لیا۔ مبدء و معاد پر ایمان نے ان کے

---

[1] ...ن نے یہ کہا ہے کہ اوپر والی آیت میں "لمن"، "لکم" کا بدل ہے۔ (تفسیر فخر رازی و روح المعانی زیرِ بحث آیات کے

دل کو روشن کردیا اور وہ طریقِ حق پر چل پڑے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اس تأسی اور پیروی کا نفع سب سے پہلے خود مسلمانوں کو ہی پہنچتا ہے۔ اسی لیے آخر میں مزید کہتا ہے: "جو شخص رُوگردانی کرے گا اور دشمنانِ خدا سے دوستی کی بُنیاد ڈالے گا، وہ خود اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچائے گا اور خدا کو اس کی کوئی حاجت نہیں ہے کیونکہ وہ سب سے بے نیاز اور ہر قسم کی حمد و ستائش کے لائق ہے۔" (ومن یتول فان اللّٰہ ھو الغنی الحمید)۔

کیونکہ دُشمنانِ خدا کے ساتھ دوستی کرنا انھیں تقویت پہنچاتا ہے، اور ان کی قوّت خود تمھاری شکست کا باعث ہے۔ اگر وہ تم پر مُسلّط ہوگئے تو پھر وہ کسی چھوٹے بڑے پر رحم نہیں کریں گے۔[1]

چند نکات

۱: ابدی نمونے

عملی نمونے ہمیشہ مؤثر ترین نمونے ہوتے ہیں، چونکہ عمل ہی انسان کے قول پر اس کے ایمان کی گہرائی کا ترجمان ہوتا ہے، اور جو بات دل سے نکلتی ہے لازمی طور پر دل پر اثر کرتی ہے۔

ہمیشہ عظیم نمونے اور دستور العمل ہی انسانوں کی زندگی میں اُن کی تربیت کا مؤثر ذریعہ رہے ہیں۔ اِسی بناء پر پیغمبرؐ اور آئمہ معصومینؑ ہدایت کی اہم ترین شاخ کی اپنے عمل سے نشان دہی کیا کرتے تھے۔ بناء بریں جب "سنّت" کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ "سُنّت" معصوم کے "قول" و "فعل" و "تقریر" کو کہا جاتا ہے۔ یعنی معصوم پیشواؤں کا قول، فعل و سکوت سب حجّت اور رہنما ہیں، یہی وجہ ہے کہ تمام پیغمبروں اور آئمہ میں عصمت شرط ہے تاکہ وہ تمام امور میں نمونہ بن سکیں۔

قرآن نے بھی اس اہم مسئلہ پر مُہرِ تصدیق ثبت کی اور تمام امُور میں مومنین کے لیے نمونوں اور اُسوہ ہائے حسنہ کا تعارف کرایا ہے۔ ان میں سے زیرِ بحث آیات میں ابراہیمؑ اور اُن کے ساتھیوں کے بارے میں دو مرتبہ گفتگو کی ہے۔ نیز سُورہ احزاب میں خود ذاتِ پیغمبرؐ کا مُسلمانوں کے لیے نمونہ اور اُسوہ کے عُنوان سے تعارف کرایا ہے۔

(اس بات پر توجہ رکھنا چاہیئے کہ "اُسوۃ" مصدری معنی رکھتا ہے جو اتباع کرنے اور عملی پیروی کے معنیٰ میں ہے۔ اگرچہ

---

[1] اس قول کی بناء پر جُملہ "من یتول" جملۂ شرطیہ ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے۔ وہ تقدیر میں اس طرح ہے: من یتول فقد اخطأ حظ نفسہ وذھب عما یعود نفعہ الیہ ۔ جو رُوگردانی کرے اُس نے اپنے حصّہ سے خطا کی اور اُس چیز سے دُور ہوگیا ہے، جس کا نفع اس کی طرف لوٹتا ہے۔

(مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۷۲)

اس کے روز مرہ کے استعمالات میں اُس شخص کے معنی میں ہے کہ جس کی اتباع اور پیروی کرنی چاہیئے ۔)

خطروں سے بھری ہوئی جنگِ احزاب میں جبکہ مسلمان سخت ترین آزمائش میں مُبتلا تھے ، اور ہمت توڑ دینے والے حوادث نے قوی ترین افراد کو بھی لرزہ براندام کر دیا تھا، خُدائے تعالےٰ اس طوفان کے درمیان استقامت ، پامردی ، ایمان، اخلاص اور اطمینانِ قلب کے نمونہ کے طور پر اپنے پیغمبرؐ کا تعارُف کراتا ہے ۔ البتہ یہ امر صرف میدانِ احزاب میں ہی منحصر نہیں تھا بلکہ پیغمبرؐ ہر جگہ مُسلمانوں کے لیے ایک عظیم نمونہ شمار ہوتے تھے ۔

"کونوا دعاة الناس باعمالکم ولا تکونوا دعاة بالسنتکم" [1]

"لوگوں کو اپنے عمل سے خدا کی طرف دعوت کرو نہ کہ اپنی زبان سے ۔"

یہ شعار اور نعرہ جو امام جعفر صادقؑ کی حدیث سے لیا گیا ہے اس بات کی دلیل ہے کہ تمام سچے مسلمانوں کو بھی اپنی جگہ پر دوسروں کے لیے نمونہ بننا چاہیئے ، اگر یہ کام ہو جاتا تو اسلام عالمگیر ہو جاتا ۔

۴: خُدا سب سے بے نیاز ہے ۔

قرآن مجید میں بارہا اس نکتے کا بیان ہُوا ہے کہ اگر خدا تمھیں کچھ ایسے احکام دیتا ہے جو بعض اوقات مشکل اور شاق نظر آتے ہیں، تو اس بات کو نہ بھولیں کہ ان کے تمام منافع تمھاری طرف ہی لوٹتے ہیں ۔ کیونکہ خُدا کی ہستی کے بیکراں سمندر میں کوئی کمی نہیں ہے کہ وہ تُم سے مدد لے ، اِس کے علاوہ تمھارے پاس کچھ ہے ہی نہیں کہ تم اُس کو مدد دو ، بلکہ جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ اُسی کا ہے ۔

حدیثِ قُدسی میں آیا ہے :

"میرے بندو ! تم مجھے ہرگز کوئی نقصان نہیں پُہنچا سکتے اور نہ ہی کوئی نفع دے سکتے ہو ۔ اے میرے بندو ! اگر اوّلین و آخرین اور جنّ و انس پاکیزہ ترین دل رکھتے ہوں تو بھی میرے ملک میں ذرہ برابر اضافہ نہیں کر سکتے ۔ اگر اوّلین و آخرین اور جنّ و انس ناپاک ترین دل رکھتے ہوں تو میرے ملک میں کوئی کمی نہیں کر سکتے ۔"

"اے میرے بندو ! اگر اوّلین و آخرین اور جنّ و انسان کسی میدان میں جمع ہو جائیں ، جو کچھ وہ چاہیں مجھ سے طلب کریں اور میں وہ سب کچھ اُن کو دے دُوں تو بھی میرے خزانوں میں کسی چیز کی کمی نہیں ہو گی ، اور وہ سب کچھ اس رطوبت کے مانند ہو گا جو ایک رسّی سمندر سے حاصل کرتی ہے ۔"

"اے میرے بندو ! میں تمھارے اعمال کا ذخیرہ کرتا ہوں اور پھر میں اُنھیں تمھاری طرف لوٹا دُوں گا، اب اگر کوئی اچھی چیز حاصل کرے تو وہ خُدا کا شکر کرے اور جو اس کے سوا دیکھے تو وہ اپنے سوا کسی اور

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۲۷۸ مادۂ عمل

کی ملامت نہ کرے۔ [1]

"حب فی اللہ و بغض فی اللہ" بنیادی اصل ہے۔

مذہب کا رشتہ وہ اہم ترین رشتہ ہے جو انسانوں کو ایک دُوسرے کے ساتھ مربُوط کرتا ہے اور دُوسرا ہر رشتہ اسی کے زیرِ اثر ہے۔

یہ وہ بات ہے جس پر قرآن نے بارہا تاکید کی ہے، اگر یہ رشتہ، دوستی، عزیزداری اور منافع شخصی روابط کے زیرِ اثر ہو جائے تو ارکانِ مذہب متزلزل ہو جائیں گے۔

اِس کے علاوہ اصل قدروقیمت ایمان وتقویٰ کی ہے، لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ان لوگوں کے ساتھ رابطہ قائم کریں جن میں یہ دونوں چیزیں نہیں ہیں۔

امام جعفر صادق کی ایک حدیث میں آیا ہے:

"من احب للہ وابغض للہ، واعطی للہ جل وعز فھو ممن کمل ایمانہ"

"جو شخص خُدا کے لیے دوست رکھتا ہے، خُدا کے لیے دشمن رکھتا ہے اور خُدا کے لیے عطا وبخشش کرتا ہے تو وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا ایمان کامل ہو گیا ہے۔" [2]

ایک اور حدیث میں انہی حضرت سے آیا ہے:

"من اوثق عری الایمان ان تحب فی اللہ، وتبغض فی اللہ وتعطی فی اللہ، وتمنع فی اللہ۔"

"ایمان کو محکم ترین کرنے والی چیزوں میں سے یہ ہے کہ تُو خدا کے لیے دوستی رکھے، خُدا کے لیے ہی دشمنی رکھے۔ خُدا کے لیے ہی دے اور خدا کے لیے ہی روکے۔" [3]

اس سلسلے میں احادیث بہت زیادہ ہیں، مزید آگاہی کے لیے اصُولِ کافی کی جلد دوم باب الحب فی اللہ کی طرف رجُوع کریں۔ مرحوم کلینی نے اس باب میں، اِس سلسلے کی سولہ احادیث نقل کی ہیں۔

علاوہ ازیں "حب فی اللہ اور بغض فی اللہ" کی مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۱۳ سورۂ مجادلہ کی آیت ۲۲ کے ذیل میں ہمارے بیان سے رجُوع کریں۔

---

[1] رُوح البیان جلد ۹ ص ۴۷۹
[2] اصُولِ کافی جلد ۲ باب الحب فی اللہ حدیث ۱ ۲
[3] اصُولِ کافی جلد ۲ باب الحب فی اللہ حدیث ۱ ۲

(۷) عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ۭ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝
(۸) لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝
(۹) اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

ترجمہ

(۷) اُمید ہے کہ خدا تمھارے اور تمھارے دشمنوں کے درمیان (اسلام کے ذریعے) رشتۂ محبت قائم کرے گا، اور خدا قادر، بخشنے والا اور مہربان ہے۔

(۸) خدا نے تمھیں ان لوگوں سے جنھوں نے امرِ دین میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمھیں تمھارے شہر اور دیار سے باہر نہیں نکالا، نیکی کرنے اور عدالت کی رعایت کرنے سے منع نہیں کیا، کیونکہ خدا عدالت کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

(۹) خُدا تو تمھیں صرف ان لوگوں سے دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جنھوں نے امرِ دین میں تم سے جنگ کی اور تمھیں تمھارے گھروں سے باہر نکالا یا تمھارے باہر نکالنے میں مدد کی ہے اور جو شخص ان سے دوستی کرے گا وہی تو ظالم و ستمگر ہیں۔

تفسیر

اُن کفّار سے دوستی جو برسرِ پیکار نہیں ہیں

ان آیات میں ان مُباحث کو جاری رکھا گیا ہے جو گزشتہ آیات میں "حبّ فی اللہ" اور "بُغض فی اللہ" اور مُشرکین سے قطع تعلق کرنے کے سلسلہ میں آئے تھے۔ چونکہ یہ قطع تعلّق مسلمانوں کی ایک جماعت کے لیے قرابت داری میں ایک قسم کا خلا پیدا کرتا تھا، اِس کے باوجود سچے مومنین اور صحابۂ رسُول نے اس راہ میں ثابت قدمی دکھائی تھی، لہٰذا خُدا ان کی جزاء کے لیے اور اس کمی کو دُور کرنے کے لیے انھیں بشارت دیتا ہے کہ: "تم غم نہ کھاؤ۔ یہ حالت ہمیشہ اسی طرح نہیں رہے گی،" فرماتا ہے:

" اُمید ہے کہ خُدا تمھارے اور تمھارے دشمنوں کے درمیان (اسلام قبول کرنے کے ذریعے) دوستی کا رشتہ قائم کر دے گا" (عسی اللہ ان یجعل بینکم و بین الذین عادیتم منھم مودۃ)۔

انجام کار یہ وعدہ پُورا ہوگیا، ہجرت کا آٹھواں سال آیا اور مکّہ فتح ہوگیا۔ اہلِ مکّہ یدخلون فی دین اللہ افواجا کے مصداق گروہ در گروہ مُسلمان ہو گئے، دشمنی و عناد کے سیاہ بادل ان کی زندگی کے آسمان سے چھٹ گئے اور آفتابِ ایمان محبت و دوستی کی گرمجوشی کے ساتھ چمکنے لگا۔

بعض مفسّرین اس جُملہ کو "اُمّ حبیبہ" دخترِ ابوسفیان کے ساتھ پیغمبرؐ کے ازدواج کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ جو مُسلمان ہوچکی تھی اور اپنے شوہر عبید اللہ بن جحش[1] کے ہمراہ مہاجرینِ حبشہ کے ساتھ حبشہ گئی تھی۔ اُس کا شوہر وہاں عیسائی ہوگیا تو پیغمبرِ اسلامؐ نے کسی کو نجاشی کے پاس بھیجا اور اُمّ حبیبہ کو اپنی ازواج میں داخل کر لیا۔ چونکہ عربوں میں دامادی کا رشتہ عداوتوں اور دشمنیوں کی کمی کا باعث بنتا تھا، لہٰذا اس مسئلہ نے ابوسفیان اور اہلِ مکّہ پر اثر ڈالا۔

لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔ زیرِ بحث آیات فتح مکّہ کے قریب نازل ہوئیں، کیونکہ "حاطب بن ابی بلتعہ" کا مشرکین مکّہ کو خط لکھنے سے مقصد یہ تھا کہ وہ انھیں اس واقعہ کی اطلاع دے۔ جبکہ ہم جانتے ہیں کہ جعفر بن ابی طالب اور ان کے ساتھی اس واقعہ سے پہلے (فتح خیبر کے قریب) مدینہ کی طرف پلٹ آئے تھے۔[2]

بہرحال اگر وہ لوگ جو مُسلمانوں کے عزیز و رشتہ دار ہیں، ان کے مذہب سے جُدا ہو جائیں تو انھیں اُن کے اسلام کی

---

[1] عبید اللہ بن جحش، عبداللہ بن جحش کا بھائی ہے، افسوس ہے کہ عبید اللہ اسلام پر باقی نہ رہا اور حبشہ میں اُس نے دینِ عیسائیت اختیار کرلیا۔ اسی بنا پر اُم حبیبہ اس سے الگ ہوگئی۔ لیکن عبیدُ اللہ کا بھائی عبدُ اللہ اسلام پر باقی رہا۔ وہ مجاہدینِ اُحد میں سے تھا۔ اور اسی میدان میں اُس نے شربتِ شہادت نوش کیا۔

[2] اس واقعہ کا خلاصہ بُہت سے مفسّرین نے نقل کیا ہے۔ تاہم اس واقعہ کی تفصیل "اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ" جلد ۵ ص ۵۷۳ میں مُطالعہ فرمائیے۔

لوٹنے سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ خدا ہر چیز پر قادر ہے، وُہی ہے جو دلوں کو تبدیل کر سکتا ہے اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی خطاؤں اور گناہوں کو بخشتا ہے، لہٰذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے" خدا قادر و توانا اور غفور و رحیم ہے۔ (و الله قدير والله غفور رحيم)۔

لفظ "عسیٰ" عربی زبان میں ان موارد میں بولا جاتا ہے جہاں کسی چیز کے پُورا ہونے کی اُمید ہو، چُونکہ یہ معنی بعض اوقات جہالت یا عجز سے ملا ہُوا ہوتا ہے لہٰذا بہت سے مُفسّرین نے قرآنِ مجید میں اس کی تفسیر خُدا سے دوسروں کے اُمید رکھنے کے معنی میں کی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ یہ لفظ خدا کے کلام میں اپنا وہی اصلی معنی رکھتا ہو۔ کیونکہ بعض اوقات کسی ہدف اور مقصد تک پہنچنے کے لیے کچھ شرائط اور حالات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے بعض شرائط حاصل نہ ہوں تو یہی تعبیر استعمال ہوگی۔ (غور کیجیے)

بعد والی آیات میں مُشرکین سے دوستی کے رابطے ترک کرنے کے مسئلہ کی تشریح و توضیح ہے۔ فرماتا ہے: "خدا تمھیں ان لوگوں سے نیکی کرنے اور عدالت کی رعایت کرنے کے بارے میں، جنھوں نے تم سے جنگ نہیں کی اور نہ ہی تمھیں اپنے گھربار سے باہر نکالا ہے، منع نہیں کرتا"۔

(لاينهٰكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم ان تبروهم وتقسطوا اليهم)۔

کیونکہ خدا عدالت اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (ان الله يحبّ المقسطين)۔

٭ ٭ ٭

خدا تو تمھیں صرف ان لوگوں کی دوستی سے منع کرتا ہے جنھوں نے دین کے مُعاملہ میں تم سے جنگ کی اور تمھیں تمھارے گھر اور شہر سے باہر نکالا، یا تمھیں باہر نکالنے میں مدد کی ہے۔ ہاں! خُدا تمھیں ان سے ہر قسم کے تعلّق اور دوستی سے منع کرتا ہے۔ (انما ينهٰكم الله عن الذين قاتلوكم في الدين واخرجوكم من دياركم وظاهروا على اخراجكم ان تولوهم)۔

"اور جو شخص انھیں دوست رکھے وہ ظالم و ستمگر ہے۔" (ومن يتولهم فاولٰئك هم الظالمون)۔

اِس طرح سے غیر مسلم افراد دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو مُسلمانوں کے مُقابلہ میں کھڑا ہو گیا۔ ان کے سامنے تلوار کھینچ لی اور انھیں گھربار سے جبرًا باہر نکال دیا۔ اس طرح انھوں نے اپنی اسلام اور مسلمانوں سے دُشمنی کو گفتار و عمل سے آشکار کیا۔ اس صُورت میں مسلمانوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ اس گروہ کے ساتھ ہر قسم کے میل جول اور تعلق کو ختم کر دیں اور ہر قسم کی دوستی اور محبت کا تعلق چھوڑ دیں۔ اس کا واضح مصداق مشرکین مکّہ خصوصًا سردارانِ قریش تھے کہ جن میں سے ایک گروہ نے تو رسمی طور پر یہ کام کیا تھا اور دوسرے گروہ نے اس میں ان کی مدد کی تھی۔

لیکن ایک اور گروہ ایسا بھی تھا جو کفر و شرک کے باوجود مُسلمانوں کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رکھتا تھا۔ نہ تو وہ عداوت و دُشمنی رکھتے تھے، نہ ہی ان کے ساتھ جنگ کرتے تھے اور نہ اُن کو ان کے گھربار اور شہر و دیار سے باہر نکالنے کا اقدام کرتے

تھے۔ یہاں تک کہ اُن میں سے ایک گروہ نے تو مسلمانوں سے دشمنی نہ کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔ پس اس گروہ سے نیکی کرنے اور اظہارِ محبت کرنے میں کوئی مانع نہیں تھا اور اگر اُن سے کوئی معاہدہ کیا ہُوا ہے تو اس کو وفا کرنا چاہیئے اور ان سے عدالت کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اِس گروہ کا مصداق قبیلۂ "خزاعہ" تھا، جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ ترکِ مخاصمت کا عہد و پیمان باندھا ہُوا تھا۔

اِس بناء پر بعض مُفسّرین کی اس توجیہہ کی گنجائش نہیں کہ جنھوں نے اس حکم کو منسُوخ سمجھا اور اس کا ناسخ سورہ توبہ کی آیۂ ۵ کو بیان کیا ہے کہ جس میں کہتا ہے: "فاذا انسلخ الاشھر الحرم فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم" "جب محترم مہینے ختم ہو جائیں تو پھر بُت پرستوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو" کیونکہ سورۂ توبہ کی یہ آیت صرف اُن مُشرکین کے بارے میں گفتگو کرتی ہے جنھوں نے عہد شکنی کی اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف علی الاعلان اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ اِس بات کی گواہ اس کے بعد والی آیات ہیں۔[1]

بعض مفسّرین نے اس آیت کے بارے میں ایک روایت کی ہے کہ ابوبکر کی مُطلّقہ بیوی اپنی بیٹی "اسماء" کے لیے مکّہ سے کچھ ہدیے لائی تو "اسماء" نے انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ اپنی ماں کو بھی گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ تب اوپر والی آیت نازل ہُوئی اور پیغمبرؐ نے اُسے حکم دیا کہ اپنی ماں کو گھر میں آنے دے، اس کا ہدیہ بھی قبول کرلے اور اس کا اکرام و احترام کرے۔[2]

یہ روایت بتاتی ہے کہ مکّہ کے سارے لوگ اِس آیت کے مشمول نہیں تھے، بلکہ مسلمانوں کے درمیان ایک ایسی اقلیّت بھی موجُود تھی جو مُسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کی کوئی دشمنی اور مُخاصمت نہیں رکھتے تھے۔

بہرحال ان آیات سے مُسلمانوں کے غیر مسلموں کے ساتھ رابطے کی کیفیّت کی "ایک بُنیادی اور کُلّی اصل" کا پتہ چلتا ہے جو نہ صرف اس زمانہ کے لیے بلکہ آج کے اور آئندہ زمانے کے لیے بھی ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ہر ایسا گروہ، جمعیت اور مُلک جو اُن سے دشمنی رکھتا ہو، اِسلام اور مسلمانوں کے مُخالف ہو یا دشمنانِ اِسلام کی مدد کرتا ہو، اس کے خلاف سختی کے ساتھ مقابلے کے لیے کھڑے ہو جائیں اور ان سے ہر قسم کی دوستی کا رشتہ منقطع کرلیں۔

لیکن اگر وہ کافر ہونے کے باوجُود اسلام اور مُسلمانوں کے بارے میں غیر جانبدار ہوں یا ان کی طرف مائل ہوں تو پھر مُسلمان ان کے ساتھ دوستانہ روابط رکھ سکتے ہیں، البتّہ اس حد تک نہیں جو وہ مُسلمان بھائیوں کے ساتھ رکھتے ہیں اور نہ ہی اس حد تک کہ وہ مُسلمانوں میں نفُوذ پیدا کرلیں۔

اگر کوئی گروہ یا کوئی حکومت گروہِ اوّل میں سے ہو اور وہ اپنی روش کو بدل دیں یا اس کے برعکس وہ دُوسرے گروہ میں ہوں اور وہ اپنا راستہ بدل لیں تو پھر ان کی موجودہ وضع و کیفیت کو معیار قرار دیا جائے گا اور ان کے ساتھ اوپر والی آیات کے مُطابق طرزِ عمل اختیار کیا جائے گا۔

---

[1] بعض مفسّرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ دوستی کی اجازت ان مومنین کے بارے میں ہے جو اسلام تو قبول کر چکے تھے، لیکن وہ مکّہ میں رہ رہے تھے اور انھوں نے ہجرت نہیں کی تھی۔ لیکن آیات کا لب ولہجہ بتلاتا ہے کہ یہ تمام باتیں غیر مُسلموں کے بارے میں ہو رہی ہیں۔

[2] "روح البیان" جلد ۹ ص ۴۸۱ یہ روایت صحیح بخاری اور دوسری بہت سی کتب تفسیر میں بھی کچھ اختلاف کے ساتھ آئی ہے۔

(۱۰) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ
فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ
مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ
لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ؕ وَلَا
جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ
وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوْا مَآ
اَنْفَقُوْا ؕ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○
(۱۱) وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ
فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ○

ترجمہ

(۱۰) اے ایمان لانے والو! جب مومن عورتیں ہجرت کرکے تمھارے پاس آئیں تو تم اُن کی آزمائش کر لیا کرو۔ خدا تو اُن کے ایمان سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ پھر جب تم انھیں مومنہ پاؤ تو انھیں کُفّار کی طرف مت لوٹاؤ کہ نہ تو وہ کُفّار کے لیے حلال ہیں اور نہ ہی کفار اُن کے لیے

حلال ہیں۔ اور جو کچھ اُن کے شوہروں نے (اُن سے ازدواج کرنے میں) خرچ کیا ہے وہ انھیں دے دو۔ اب تمھارے لیے ان سے نکاح کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے جبکہ تم ان کا مہر انھیں ادا کر دو، اور تم بھی کافرہ بیویوں کو ہرگز اپنی زوجیت میں نہ رکھو (اور اگر تمھاری عورتوں میں سے کوئی کافرہ ہو جائے اور وہ کافروں کے شہر کی طرف بھاگ جائے) تو تُم حق رکھتے ہو کہ جو حقِ مہر تم نے ادا کیا ہے اُس کا مُطالبہ کرو جس طرح وہ حق رکھتے ہیں کہ جن عورتوں سے وہ جُدا ہو گئے ہیں، ان کے حقِ مہر کا تم سے مُطالبہ کریں، یہ خدا کا حکم ہے جو تمھارے درمیان حکم کرتا ہے۔ اور خدا علیم و حکیم ہے۔

(۱۱) اگر تمھاری بیویوں میں سے بعض تمھارے ہاتھ سے نکل جائیں (اور کفّار کی طرف پلٹ جائیں) اور تم جنگ میں ان پر کامیابی حاصل کر لو اور مالِ غنیمت تمھارے ہاتھ آئے، تو جن کی بیویاں چلی گئی ہیں، ان کو اتنا مہر دے دو جتنا اُنھوں نے دیا ہے اور اس خُدا کی مخالفت سے پرہیز کرو جس پر تم سب ایمان رکھتے ہو۔

شانِ نزول

مفسّرین کی ایک جماعت نے ان آیات کے شانِ نزول میں اِس طرح نقل کیا ہے کہ رسُولِ خداؐ نے صلح حدیبیہ میں مشرکین مکّہ سے ایک معاہدہ کیا تھا۔ اس مُعاہدے کی ایک شق یہ تھی کہ جو شخص اہلِ مکہ میں سے مسلمانوں کے ساتھ آملے وہ اسے واپس کر دیں گے۔ لیکن اگر مسلمانوں میں سے کوئی شخص اِسلام کو چھوڑ کر مکہ کی طرف پلٹ جائے تو وہ اُسے واپس نہیں کرینگے۔

اِسی دوران ایک عورت جس کا نام "سبیعہ" تھا، اُس نے اسلام قبول کر لیا اور اسی سرزمین حدیبیہ میں مسلمانوں سے آملی۔ تب اس کا شوہر پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا اور کہا: یا محمّدؐ! میری بیوی مجھے پلٹا دو، کیونکہ ہمارے معاہدہ کی ایک شق یہ بھی ہے اور ابھی اس کی سیاہی بھی خشک نہیں ہُوئی ہے۔ اس پر اوپر والی آیت نازل ہُوئی اور حکم دیا گیا کہ مہاجر عورتوں کا امتحان کر لیا کرو۔ (ابنِ عباس کہتے ہیں کہ ان کا امتحان یہ تھا کہ ان سے قسم لی جائے کہ ان کی ہجرت شوہر سے بُغض و کینہ یا نئی زمین سے لگاؤ یا کسی دُنیاوی مقصد کے لیے نہیں ہے بلکہ ان کی ہجرت صرف اِسلام کی وجہ سے ہے۔)

اس عورت نے قسم کھائی کہ ایسا ہی ہے تو اس موقع پر پیغمبرؐ نے وہ حق مہر جو اُس کے شوہر نے اس کو دیا تھا، اور تمام خرچہ جو اُس کے شوہر نے کیا تھا، اُس کے شوہر کو ادا کر کے فرمایا: "قرار دادِ مُعاہدہ کی اِس شق کے مُطابق عورتوں کو نہیں صرف مردوں کو لوٹانا ہے"[1]

تفسیر

مُسلمانوں اور کُفّار کے نُقصان کی تلافی

گزشتہ آیات میں "بُغض فی اللہ" اور دُشمنانِ خُدا سے قطع تعلق کے بارے میں گفتگو تھی، لیکن زیرِ بحث آیات میں "حبّ فی اللہ" اور ان لوگوں سے ــ جو کُفر سے جُدا ہو کر ایمان کے ساتھ تعلق قائم کریں رشتہ جوڑنے کے بارے میں گفتگو ہے۔

پہلی آیت میں مُہاجر عورتوں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور اس آیت میں مجموعی طور پر سات احکام وارد ہُوئے ہیں جو زیادہ تر مہاجر عورتوں کے بارے میں ہیں اور ان کا ایک حصّہ کافر عورتوں کے بارے میں بھی ہے۔

۱ : پہلا حکم : "مہاجر عورتوں" کی آزمائش کے بارے میں ہے۔" رُوئے سُخن مُومنین کی طرف کرتے ہُوئے فرماتا ہے: "اے ایمان لانے والو! جب مُومنہ عورتیں ہجرت کر کے تمھارے پاس آئیں تو تم انھیں واپس نہ کیا کرو بلکہ ان کا امتحان کر لیا کرو" (یاایها الذین اٰمنوا اذا جاءکم المؤمنات مهاجرات فامتحنوهن)۔

انھیں مومنات کہنے کے باوجود امتحان کا حکم دینا اس بناء پر ہے کہ وہ ظاہری طور پر تو شہادتین کو زبان پر جاری کرتی تھیں اور اہلِ ایمان کے زُمرہ میں تھیں، لیکن یہ امتحان اس لیے تھا تاکہ اطمینان ہو جائے کہ ــ یہ ظاہر باطن کے ساتھ ہم آہنگ ہے ــ

باقی رہا امتحان کا طریقہ تو جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ وہ اسی طرح سے تھا کہ انھیں قسم دلاتے تھے کہ ان کی مُہاجرت اسلام قبول کرنے کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے نہیں تھی۔ انھیں یہ قسم کھانی چاہیئے کہ اُنھوں نے شوہر سے دُشمنی یا کسی دُوسرے مرد سے تعلق یا مدینہ کی سرزمین سے لگاؤ اور اسی طرح کی دُوسری باتوں کے لیے ہجرت نہیں کی ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اسی سورۃ کی بارھویں آیت مُہاجر عورتوں کے امتحان کی کیفیت کی تفسیر ہو، (جس کے مُطابق انھیں چاہیئے) کہ وہ پیغمبرؐ کی اس بات پر بیعت کریں کہ وہ راہِ شرک اختیار نہیں کریں گی، اور وہ چوری، منافیِ عفّت اعمال،

---

[1] اوپر والی شانِ نزول بہت سی تفسیروں میں آئی ہے۔ ہم نے اسے مجمع البیان سے کچھ تلخیص کے ساتھ اوپر پیش کیا ہے۔ "طبرسیؒ" نے اس حدیث کو "ابنِ عباسؓ" سے نقل کیا ہے۔

اولاد کو قتل کرنے اور اس قسم کے اعمال کی مرتکب نہ ہوں گی اور رسُولِ خداؐ کے فرمان کو کامل طور سے تسلیم کریں گی۔

البتہ ممکن ہے کہ کچھ افراد اس قسم اور بیعت میں بھی غلط بیانی سے کام لیں، لیکن اُس زمانہ میں بہت سے لوگوں حتٰی کہ مُشرکین کا مسئلہ بیعت اور خدا کی قسم کے لیے مقیّد ہونا اس بات کا سبب بنا کہ بہت کم افراد جھوٹ بولیں۔ اِس طرح سے مذکورہ امتحان اگرچہ ہمیشہ اُن کے ایمانِ واقعی کی دلیل تو نہیں ہوتا تھا، لیکن عام طور پر اس واقعیت کو بیان کرنے والا ہو سکتا تھا۔

لہٰذا بعد کے جُملہ میں مزید کہتا ہے: "خُدا ان کے دل کی اندرُونی کیفیت اور اُن کے ایمان کے متعلق سب سے زیادہ آگاہ ہے۔" (اللہ اعلم بایمانھن)۔

۲: اس کے بعد والے حکم میں فرماتا ہے: "جب وہ اس امتحان میں پُوری اُتر جائیں اور تم نے واقعی انھیں مومنہ جان لیا تو پھر انھیں کفّار کی طرف نہ پلٹاؤ۔" (فان علمتوھن مؤمنات فلا ترجعوھن الی الکفار)۔

یہ درست ہے کہ حدیبیہ میں زبردستی کے مُعاہدے کا ایک جُزء یہ تھا کہ وہ افراد جو مُسلمان ہو کر مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کریں گے، انھیں مکّہ کی طرف واپس لوٹا دیا جائے گا۔ لیکن اس جُزء کا عورتوں پر اطلاق نہیں ہوتا تھا، لہٰذا پیغمبرؐ نے انھیں ہرگز کفّار کی طرف نہیں پلٹایا۔ یہ ایک ایسا کام تھا کہ اگر یہ انجام پا جاتا تو اس مُعاشرے میں عورتوں کے حد سے کمزور ہونے کی وجہ سے ان کے لیے سخت خطرناک ہوتا۔

۳: تیسرے مرحلہ میں جو حقیقت میں گزشتہ حکم کی ایک دلیل ہے۔ مزید کہتا ہے: "نہ تو یہ عورتیں کافروں پر حلال ہیں اور نہ ہی وہ کافر مرد ان ایماندار عورتوں پر حلال ہیں۔" (لا ھن حل لھم ولا ھم یحلون لھن)۔

یہ اسی طرح ہونا چاہیئے، کیونکہ ایمان و کفر ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اور ازدواج کا مقدس پیمان مومن و کافر کے درمیان رابطہ قائم نہیں کر سکتا۔ اِس لیے کہ یہ دونوں دو مُتضاد نظریات رکھتے ہیں جبکہ پیمانِ ازدواج کو بیوی اور شوہر کے درمیان ایک قسم کی وحدت قائم کرنی چاہیے اور یہاں دونوں ایک دُوسرے سے سازگار نہیں ہیں۔

البتہ ابتداءِ اسلام میں جبکہ ابھی اسلامی مُعاشرہ مستحکم نہیں ہوا تھا ایسے شوہر اور بیویاں تھیں کہ جن میں سے ایک کافر اور دُوسرا مُسلمان ہوتا تھا۔ مگر پیغمبرؐ اس سے منع نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ اسلام کی بُنیادیں مضبُوط ہو گئیں۔ چنانچہ ظاہری طور پر صُلح حدیبیہ کے بعد مکمّل طور پر جُدائی کا حکم دیا گیا، اور زیرِ بحث آیت اِس موضوع کی ایک دلیل ہے۔

۴: چونکہ عربوں میں معمُول یہ تھا کہ وہ اپنی عورتوں کا حق مہر پہلے دے دیتے تھے۔ لہٰذا چوتھے حکم میں مزید کہتا ہے: "ان کے کافر شوہروں نے جو کچھ اس ازدواج میں خرچ کیا ہے وہ ان کو دے دو۔" (و اٰتوھم ما انفقوا)۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان کے شوہر کافر ہیں۔ لیکن چونکہ جُدائی اور علیحدگی کا اقدام ایمان لانے کی بناء پر عورت کی طرف سے شرُوع ہُوا ہے۔ لہٰذا عدالتِ اسلامی کا تقاضا یہ ہے کہ اس شوہر کے خسارے پُورے کیے جائیں۔

کیا یہاں انفاق سے مُراد صرف حق مہر ہے یا اس میں وہ تمام اخراجات شامل ہیں جو اُس نے اس سلسلہ میں کیے ہیں؟ اکثر مفسّرین نے پہلے معنیٰ کو اختیار کیا ہے اور آیت میں قدرِ مُسلّم بھی یہی ہے۔ اگرچہ "ابوالفتوح رازیؒ" کے مانند بعض مُفسّرین نے

اپنی تفسیر میں دُوسرے مخارج بھی اس میں شامل کیے ہیں۔ ؎

البتہ یہ حق مہر کا ادا کرنا ایسے مُشرکین کے بارے میں تھا جنھوں نے مُسلمانوں کے ساتھ حدیبیہ یا دُوسرے مواقع پر ترکِ مخاصمت کا عہد کیا تھا۔

لیکن یہ مہر کس کو ادا کرنا چاہیے ؟ ظاہر یہ ہے کہ یہ کام حکومتِ اسلامی اور بیت المال کے ذمّہ ہے ، کیونکہ ایسے تمام اُمور جن کا اِسلامی معاشرہ میں کوئی خاص شخص ذمّہ دار نہیں وہ حکومت ہی کے ذمّہ ہوتے ہیں اور زیرِ بحث آیت میں جمع مخاطب کا صیغہ اسی معنی کا گواہ ہے۔ (جیسا کہ چور کی حد اور زانی کی حد والی آیات میں نظر آتا ہے۔)

۵ : ایک اور حکم جو اوپر والے احکام کے بعد آیا ، وہ یہ ہے کہ فرماتا ہے : " اگر تم ان کے ساتھ نکاح کر لو تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے جبکہ تم ان کا حق مہر ادا کر دو۔ (ولا جناح علیکم ان تنکحوھن اذا اٰتیتموھن اجورھن)۔

کہیں تم یہ تصور نہ کر لو۔ چونکہ وہ سابقہ شوہر سے حق مہر پہلے ہی لے چکی ہیں اور اس کے بدلے میں بیت المال سے اُس کے شوہر کو دے دیا گیا ہے اور تمھارا مفت میں کام ہو جائیگا۔ نہیں ! ایسا نہیں ہے ، عورت کی حُرمت اور عزّت کا تقاضا یہی ہے کہ جدید ازدواج میں بھی مُناسب حق مہر اس کو دیا جائے۔

توجہ رکھنا چاہیے کہ یہاں عورت اپنے کافر شوہر سے طلاق کے بغیر الگ ہو جائے گی لیکن عدّت پوری کرنا پڑے گی۔

مشہور فقیہہ "صاحبِ جواہر" نے محقق کے کلام کی شرح کرتے ہُوئے کہ جو اُنھوں نے شرائع میں بیان کیا گیا ہے کہ : "اہلِ کتاب زوجہ وشوہر کے علاوہ ، زوجہ وشوہر میں سے جو کوئی بھی اِسلام قبول کر لے۔ اگر یہ دخول سے پہلے ہو تو عقد بلا فاصلہ فسخ ہو جائے گا۔ اگر دخول کے بعد ہو تو پھر وہ عدّت کے ساتھ وابستہ ہے۔" فرماتے ہیں : " ان احکام میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے ، کیونکہ روایات اور فقہاء کے فتوے اس بارے میں ہم آہنگ ہیں۔" ؎

۶ : لیکن اگر مُعاملہ اس کے برعکس ہو ، یعنی شوہر اسلام قبول کر لے اور عورت کفر پر باقی رہے تو یہاں بھی زوجیّت کا رابطہ ٹوٹ جائے گا اور نکاح فسخ ہو جائے گا ، جیسا کہ اسی آیت کو جاری رکھتے ہُوئے فرماتا ہے : " کافر بیویوں کو اپنی زوجیّت میں نہ روکے رکھو۔" (ولا تمسکوا بعصم الکوافر)۔

"عصم" ، "عِصمت" کی جمع ہے جو اصل میں منع کرنے کے معنی میں ہے ، یہاں جیسا کہ مفسّرین نے کہا اور قرائن گواہی دیتے ہیں ، نکاح اور زوجیّت کے معنی میں ہے۔ (البتہ بعض نے یہ تصریح کی ہے کہ اس سے مُراد نکاح دائمی ہے اور عصمت کی تعبیر بھی اسی معنی کے ساتھ مُناسبت رکھتی ہے۔ کیونکہ نکاح دائمی عورت کو کسی بھی دُوسرے شخص سے ازدواج کرنے سے ہمیشہ کے لیے منع کرتا ہے۔

تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۱۱ ص ۵۴

جواہر الکلام جلد ۳۰ ص ۵۴

"کوافر"، "کافرۃ" کی جمع اور کافر عورتوں کے معنی میں ہے۔ کیا یہ حکم مشرک عورتوں کے ساتھ ہی مخصوص ہے یا اہلِ کتاب مثلِ عیسائی اور یہودی عورتوں کے لیے بھی ہے؟ اس بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں روایات مختلف ہیں اور ان کی تشریح و تفصیل کا فقہ کی کتابوں میں مطالعہ کرنا چاہیئے۔ لیکن آیت کا ظاہر مطلق ہے اور تمام کافر عورتوں کے لیے ہے۔ نیز شانِ نزول اسے محدود نہیں کرتا۔ لیکن عدت کا مسئلہ یہاں بطریقِ اُولیٰ برقرار ہے، کیونکہ اگر اُس عورت سے بچہ پیدا ہو تو وہ مسلمان بچہ ہوگا کہ اُس کا باپ مسلمان ہے۔

۷: آخری حکم جو آیت میں بیان ہوا ہے اس میں ان عورتوں کے حق مہر کے بارے میں گفتگو ہے جو اسلام سے علیحدگی اختیار کر کے اہلِ کفر سے جا ملیں، فرماتا ہے: "اگر تمھاری عورتوں میں سے کوئی اسلام سے الگ ہو جائے تو تم حق رکھتے ہو کہ جو حق مہر تم نے ادا کیا ہے اس کا مطالبہ کرو، جیسا کہ وہ حق رکھتے ہیں کہ اپنی ان عورتوں کے مہر کا مطالبہ کریں۔ جو اُن سے جُدا ہو کر اِسلام سے وابستہ ہو گئی ہیں۔ (وسئلوا ما انفقتم ولیسئلوا ما انفقوا)۔ اور یہ عدالت اور برابر حقوق کا تقاضا ہے۔

جو کچھ بیان ہو چکا، آیت کے آخر میں ان پر تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یہ اللہ کے وہ احکام ہیں جن کا وہ تمھیں حکم دیتا ہے اور خدا علیم و حکیم ہے۔" (ذالکم حکم اللہ یحکم بینکم واللہ علیم حکیم)۔

یہ ایسے احکام ہیں جن کا سرچشمہ علمِ الٰہی ہے: یہ حکمت کی آمیزش رکھتے ہیں، ان میں تمام افراد کے حقوق نظر میں رکھے گئے ہیں اور یہ اصل اسلامی عدالت و انصاف کے ساتھ کامل طور پر ہم آہنگ ہیں۔ ان احکام کے اجراء کیلئے عظیم ترین ضمانت شمار ہوتا ہے۔

دوسری اور آخری زیرِ بحث آیت میں اسی بات کو جاری رکھتے ہوئے فرماتا ہے: "اگر تمھاری بیویوں میں سے بعض تمھارے ہاتھ سے نکل گئی ہوں اور اسلام کو چھوڑ کر کفار سے جا ملی ہوں۔ اِس کے بعد تمھیں جنگ میں ان پر کامیابی حاصل ہو جائے اور کچھ مالِ غنیمت تمھارے ہاتھ لگ جائے تو ان افراد کو جو اپنی بیویاں ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں، جتنا مہر اُنھوں نے ادا کیا ہوا ہے اتنا غنائم میں سے انھیں دے دو"۔ (وان فاتکم شیءٌ من ازواجکم الی الکفار فعاقبتم فاٰتوا الذین ذھبت ازواجھم مثل ما انفقوا)۔

گزشتہ آیت کے مطابق مسلمان اس قسم کی عورتوں کا حق مہر کفار سے لے سکتے تھے، جیسا کہ وہ حق رکھتے تھے کہ اپنی ان بیویوں کا حق مہر مسلمانوں سے لے لیں جو اسلام سے وابستہ ہو کر مدینہ کی طرف ہجرت کر گئی ہیں۔ لیکن بعض روایات کے مطابق اس عادلانہ حکم پر مسلمانوں کے عمل کے باوجود مشرکین مکہ نے اُس سے رُوگردانی کی۔ لہٰذا ان افراد کے حق کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے یہ حکم دیا گیا کہ جب مالِ غنیمت ہاتھ آئے تو پہلے ان کا حق دیا جائے اور اس کے بعد باقی مالِ غنیمت کو تقسیم کیا جائے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اوپر والا حکم ایسی اقوام کے ساتھ مربوط ہو جن سے مسلمانوں کا کوئی عہد و پیمان نہیں تھا، لہٰذا طبعی طور پر وہ اس قسم کی عورتوں کا حق مہر مسلمانوں کو واپس دینے کے لیے تیار نہیں تھے، تاہم دونوں معانی کا جمع ہونا بھی ممکن ہے۔

"عاقبتم" "معاقبۃ" کے مادہ سے اصل میں "عقب" (بروزن کدر) "پاؤں کی ایڑی" کے معنی میں ہے، اسی مناسبت سے لفظ "عقبیٰ" کسی کام کی جزا کے معنی میں اور "عقوبت" کسی غلط کام کی سزا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور بعض اوقات

یہ لفظ "مُعاقبہ" باری باری کام کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، کیونکہ وہ لوگ جو کسی کام کو باری باری انجام دیتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک دُوسرے کے بعد آپہنچتا ہے۔ اس لیے اوپر والی آیت میں "عاقبتم" مُسلمانوں کے کفّار پر غالب ہونے اور انھیں سزا دینے کے معنی میں ہے جو ضمنی طور پر غنائم لینے سے تفسیر ہُوا ہے اور "تناوب" (باری باری) کے معنی میں بھی ہے، کیونکہ ایک دن کفّار کی باری ہے تو دُوسرے دن مسلمانوں کی باری آجاتی ہے اور یہ اُن پر غالب آجاتے ہیں۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس جملہ سے مُراد کام کا انتہا اور آخر کو پہنچنا ہے۔ یہاں کام کی انتہا سے مُراد جنگی غنائم حاصل کرنا ہے، ان معانی میں سے جو کوئی معنی بھی ہو نتیجہ ایک ہی ہے صرف اس نتیجے تک پہنچنے کے راستے مختلف بیان کیے گئے ہیں۔ (غور کیجئے)

آیت کے آخر میں تمام مُسلمانوں کو تقوٰی کی دعوت دیتے ہُوئے فرماتا ہے: "جس خُدا پر تم سب ایمان لائے ہو اس سے ڈرو اور اس کی مخالفت نہ کرو۔" (و اتقوا الله الذی انتم بہ مؤمنون)۔

ممکن ہے یہاں تقوٰے کا حکم اِس بناء پر ہو کہ عام طور پر حق مہر کی تشخیص میں بیوی اور شوہر کے قول پر ہی اعتماد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے ثبوت کا طریقہ ان کے قول کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ لہٰذا اس بات کا امکان ہے کہ شیطانی وسوسے مقدارِ واقعی سے زیادہ کا دعوٰے کرنے کا سبب بن جائیں اسی لیے انھیں تقوٰی کی وصیّت اور نصیحت کرتا ہے۔

تواریخ اور روایات میں آیا ہے کہ یہ اسلامی حکم صرف چھ عورتوں کو شامل ہُوا جو اپنے مسلمانوں شوہروں سے جُدا ہو کر کفّار سے جا ملیں اور پیغمبرؐ نے ان کا حق مہر جنگی غنائم سے اُن کے شوہروں کو دیا۔

ایک نکتہ

دشمنوں کے لیے بھی عدالت

اوپر والی آیت میں لطافت وظرافت اور خاص نکتہ کی بات جو مذکورہ احکام میں استعمال ہُوئی ہے یہ بتلاتی ہے کہ احکام اسلامی کی تشریع میں اصل عدالت پر کس قدر توجہ دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ طوفانی اور بحُرانی مواقع پر بھی اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ کسی شخص حتّٰی کہ کفّار کو بھی نقصان نہ پہنچے۔

جبکہ دُنیا کا معمول یہ ہے کہ بحُرانی کیفیت میں سب یہی کہتے ہیں کہ حالات حد سے زیادہ سخت ہیں، لہٰذا ان کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اور حقدار کو حق دینے کی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا ہر قسم کی بے سرو سامانی کو برداشت کرنا چاہیے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ سخت ترین حالات میں بھی یہ کوشش کرنی چاہیے کہ کسی کا حق ضائع نہ ہو، اور نہ صرف دوست بلکہ اگر دشمن بھی کوئی حق رکھتا ہو تو اس کی بھی رعایت کرنا چاہیئے۔

اس قسم کے اسلامی احکام، اعجاز کی ایک قسم اور پیغمبرؐ کی دعوت کی حقانیّت کی نشانی ہیں کہ جو اس قسم کے ماحول میں بھی جہاں نہ مال کا کوئی احترام تھا اور نہ ہی جان کی کوئی قدر وقیمت تھی، اِسلام حقدار کو اس کا حق دینے میں اس حد تک کوشش کرتا ہے۔

(۱۲) یَاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَکَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَکَ عَلٰٓی
اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ بِاللّٰهِ شَیْئًا وَّلَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ
وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ
بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَلَا یَعْصِیْنَکَ فِیْ
مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

ترجمہ

اے پیغمبرؐ! جب مومن عورتیں تیرے پاس آئیں اور تجھ سے ان شرائط پر بیعت کریں کہ وہ کسی چیز کو خُدا کا شریک قرار نہیں دیں گی۔ چوری نہیں کریں گی۔ زنا سے آلودہ نہ ہوں گی۔ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی اور اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے آگے کوئی افتراء اور بُہتان نہیں باندھیں گی، اور کسی شائستہ کام میں تیرے حکم کی مُخالفت نہیں کریں گی تو تم ان سے بیعت لے لو اور ان کے لیے بارگاہِ خُدا میں طلبِ بخشش کرو، بیشک خُدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

عورتوں کی بیعت کے شرائط

گزشتہ آیات کے بعد کہ جن میں مہاجرین کے احکام کا بیان تھا، زیرِ بحث آیت میں پیغمبرؐ سے عورتوں کے بیعت کرنے کے حکم کی تشریح کرتا ہے۔

جیسا کہ مفسّرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت فتح مکّہ کے دن نازل ہوئی جبکہ پیغمبرؐ نے کوہِ صفا پر قیام فرمایا اور مردوں سے بیعت لی، بعدہٗ مکّہ کی وہ عورتیں جو ایمان لے آئی تھیں بیعت کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو اُوپر والی آیت نازل ہوئی اور ان کی بیعت کی تفصیل بیان کی۔

رُوئے سُخن پیغمبرؐ کی طرف کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اے پیغمبرؐ! جب مومن عورتیں تیرے پاس آئیں اور ان شرائط پر تُجھ سے بیعت کریں کہ وہ کسی چیز کو خُدا کا شریک قرار نہیں دیں گی، چوری نہیں کریں گی، زنا سے آلودہ نہیں ہوں گی، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی، اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے آگے کوئی افتراء اور بُہتان نہیں باندھیں گی اور کسی شائستہ حکم میں تیری نافرمانی نہیں کریں گی تو تم اُن سے بیعت لے لو اور ان کے لیے بخشش طلب کرو، بے شک خُدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔" (یاایها النبی اذا جاءك المؤمنات یبایعنك علی ان لا یشرکن بالله شیئًا ولا یسرقن ولا یزنین ولا یقتلن اولادهن ولا یأتین ببهتان یفترینه بین ایدیهن وارجلهن ولا یعصینك فی معروف فبایعهن واستغفرلهن الله ان الله غفورٌ رحیم)۔

اِس کے بعد پیغمبرؐ نے اُن سے بیعت لی۔

بیعت کی کیفیّت کے بارے میں بعض نے یہ لکھا ہے کہ پیغمبرؐ نے پانی کا ایک برتن لانے کا حکم دیا اور اپنا ہاتھ پانی کے اُس برتن میں رکھ دیا۔ عورتیں اپنے ہاتھ برتن کے دُوسری طرف رکھ دیتی تھیں۔ بعض نے کہا ہے پیغمبرؐ لباس کے اُوپر سے بیعت لیتے تھے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت میں عورتوں کے بیعت کرنے کے لیے چھ شرطیں بیان کی گئی ہیں اور ان کے لیے ان سب کو قبول کرنا ضرُوری ہے۔

۱: ہر قسم کے شرک اور بُت پرستی کو ترک کرنا۔ یہ شرط اسلام و ایمان کی بُنیاد ہے۔

۲: چوری کو ترک کرنا اور شاید اِس سے مُراد زیادہ تر شوہر کا مال ہو، کیونکہ اُس زمانہ کی مالی بدحالی، مردوں کی سخت گیری اور تہذیب و تمدّن کی سطح کا پست ہونا اس بات کا سبب ہوتا تھا کہ عورتیں اپنے شوہروں کے مال میں سے چوری کریں اور احتمالاً اپنے رشتہ داروں کو دے دیں۔ "ہند" کی داستان جو بعد میں آئے گی، وہ بھی اسی معنی کی گواہ ہے۔

بہرحال آیت کا مفہوم وسیع اور عام ہے۔

۳ : زنا سے آلودہ نہ ہونا۔ کیونکہ تاریخ یہ تبلاتی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عفت کی راہ سے بہت زیادہ انحراف تھا۔

۴ : اولاد کو قتل نہ کرنا۔ یہ فعل دو صورتوں میں یعنی بعض اوقات "اسقاطِ حمل" کی صورت میں اور کبھی "وئاد" (لڑکیوں اور لڑکوں کو زندہ درگور کرنے) کی صورت میں انجام پاتا تھا۔

۵ : بہتان و افتراء کو ترک کرنا۔ بعض نے اس کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ وہ مشکوک بچوں کو راستے سے اُٹھا لیتی تھیں، اور یہ دعویٰ کرتی تھیں کہ یہ بچّہ اُن کے شوہر سے ہے۔ (یہ امر شوہر کی طویل غیبت کے زمانہ میں زیادہ امکان پذیر تھا)

بعض نے اسے شرم آور کام کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ وہ بھی زمانۂ جاہلیت کے باقیات میں سے تھا اور وہ یہ تھا کہ ایک عورت اپنے آپ کو چند افراد کے اختیار میں دے دیتی اور جب اس سے کوئی بچّہ پیدا ہوتا تو وہ ان میں سے جس کی طرف مائل ہوتی، بچّے کو اُس کی طرف منسوب کر دیتی تھی۔

لیکن اس طرف توجّہ کرتے ہوئے کہ مسئلہ زنا پہلے بیان ہو چکا ہے اور اس قسم کے کام کا اسلام میں جاری رہنا ممکن نہیں تھا یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے اور پہلی ہی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ اگرچہ آیت کے مفہوم کی وسعت ہر قسم کے افتراء اور بہتان کو شامل ہے۔

"بین ایدیھن و ارجلھن" (ان کے ہاتھوں اور پاؤں کے آگے) کی تعبیر، ممکن ہے وہی سرِ راہ ملنے والے بچوں کی طرف اشارہ ہو جو دودھ پلانے کے وقت دامن میں ہوتے تھے۔ لہٰذا طبعًا وہ ان کے پاؤں اور ہاتھوں کے سامنے ہوتے تھے۔

۶ : پیغمبرؐ کے اصلاحی احکام کی نافرمانی نہ کرنا۔ یہ حکم بھی وسعت رکھتا ہے اور پیغمبرؐ کے تمام فرامین کو شامل ہے اگرچہ بعض نے اسے زمانۂ جاہلیت کے بعض افعال مثلاً مُردوں پر بلند آواز میں نوحہ کرنا، گریبان چاک کرنا اور منہ کو نوچنا وغیرہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ عورتوں کی بیعت کیوں ان شرائط کے ساتھ مشروط تھی؟ حالانکہ مردوں کی بیعت صرف اسلام اور جہاد پر تھی۔

اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مردوں کے بارے میں اس معاشرے اور ماحول میں جو چیز سب سے زیادہ اہم تھی وہ ایمان اور جہاد ہی تھا۔ چونکہ عورتوں کے لیے جہاد مشروع نہیں تھا لہٰذا ان کے لیے دوسرے شرائط ذکر کرتے ہوئے کہ جن میں توحید کے بعد سب سے زیادہ اہم اُمور وہی تھے جن سے اس معاشرے کی عورتیں انحراف میں مُبتلا تھیں۔

چند نکات

۱ : عورتوں کی بیعت کا ان کی اسلامی شخصیت کے ساتھ ربط

ہم سورۂ فتح کی تفسیر کرتے ہوئے (آیۃ ۱۸ کے ذیل میں) بیعت، اس کے شرائط اور اسلام میں اس کی خصوصیات

کے بارے میں ایک تفصیلی بحث کر چکے ہیں کہ جس کے دُہرانے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ لہ

یہاں جس بات کا بیان کرنا ضروری ہے، وہ عورتوں کے پیغمبرؐ کی بیعت کرنے کا مسئلہ ہے اور وہ بھی ایسی مُفید اور اصلاحی شرائط کے ساتھ کہ جو اوپر والی آیت میں بیان ہُوئے ہیں۔

بے خبر اور مفاد پرست لوگوں کے برخلاف جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام انسانی معاشرے کے نصف حصّے یعنی عورتوں کے لیے کسی قدر و قیمت کا قائل نہیں، اور اُس نے انھیں کسی حساب میں شمار نہیں کیا ہے، یہ مسئلہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام نے اسے خصوصیّت کے ساتھ اہم ترین مسائل میں شمار کیا ہے۔ منجملہ ان کے مسئلۂ بیعت ہے جو ایک مرتبہ صلح حدیبیہ میں (ہجرت کے چھٹے سال) اور ایک مرتبہ فتح مکّہ میں انجام پایا تو عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش اس خُدائی عہدو پیمان میں داخل ہُوئیں۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے مردوں کی نسبت زیادہ شرائط کو قبول کیا۔ ایسی شرائط کہ جو عورت کی انسانی حیثیّت کو زندہ کرتی تھیں۔ نیز اس کو بے قدر و قیمت متاع میں تبدیل ہونے یا بوالہوس مردوں کی لُطف اندوزی کا ذریعہ بننے سے نجات دیتے تھے۔

❊ ❊ ❊

۲: ابوسفیان کی بیوی ھند کی بیعت کا ماجرا

فتح مکّہ کے واقعہ میں جن عورتوں نے پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی ان میں سے ایک ابُوسفیان کی بیوی "ہند" بھی تھی۔ یعنی وہ عورت جس کی طرف سے تاریخ اسلام بہت سے دردناک واقعات محفوظ رکھے ہُوئے ہے، ان میں سے ایک میدانِ اُحد میں حمزہ سیّد الشّہداء کی شہادت کا واقعہ ہے کہ جس کی کیفیّت بہت ہی غم انگیز ہے۔

اگرچہ آخرکار وہ مجبُور ہو گئی کہ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور ظاہراً مُسلمان ہو جائے لیکن اس کی بیعت کا ماجرا بتاتا ہے کہ وہ حقیقت میں اپنے سابقہ عقاید کی اسی طرح وفادار تھی، لہٰذا اس میں تعجّب کی کوئی بات نہیں ہے کہ بنی اُمیّہ کا خاندان اور ہند کی اولاد نے پیغمبرؐ کے بعد اس قسم کے جرائم کا ارتکاب کیا کہ جن کی سابقہ زمانہ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

بہرحال مفسّرین نے اس طرح لکھا ہے کہ ہند نے اپنے چہرے پر نقاب ڈالا ہُوا تھا وہ پیغمبرؐ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہُوئی جب آپ کوہِ صفا پر تشریف فرما تھے اور عورتوں کی ایک جماعت بھی ہند کے ساتھ تھی۔ جب پیغمبرؐ نے یہ فرمایا کہ میں تم عورتوں سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم کسی چیز کو خُدا کا شریک قرار نہیں دو گی۔ تو ہند نے اعتراض کیا اور کہا: "آپ ہم سے ایسا عہد لے رہے ہیں جو آپ نے مردوں سے نہیں لیا، (کیونکہ اس دن مردوں سے صرف ایمان اور جہاد پر بیعت لی گئی تھی۔)

پیغمبرؐ نے اس کی بات کی پرواہ کیے بغیر اپنی گفتگو کو جاری رکھا اور فرمایا: "کہ تم چوری بھی نہیں کرو گی"۔

لہ تفسیر نمونہ جلد ۱۲ میں سورۂ فتح آیۃ ۱۸ کے ذیل میں دیکھیں۔

ہند نے کہا : ابوسُفیان کنجوس اور بخیل آدمی ہے میں نے اس کے مال میں سے کچھ چیزیں لی ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ وہ انھیں مجھ پر حلال کرے گا یا نہیں! ابوسفیان موجود تھا، اُس نے کہا: "جو کچھ تو نے گزشتہ زمانہ میں میرے مال میں سے لے لیا ہے وہ سب میں نے حلال کیا۔ (لیکن آئندہ کے لیے پابندی کرنا۔)

اس موقع پر پیغمبرؐ ہنسے اور ہند کو پہچان کر فرمایا: "کیا تو ہند ہے؟" اس نے کہا: "جی ہاں یا رسُول اللہ! پچھلے امُور کو بخش دیجئے خدا آپ کو بخشے۔"

پیغمبرؐ نے اپنی گفتگو کو جاری رکھا : "اور تم زنا سے آلودہ نہیں ہوگی۔"

ہند نے تعجب کرتے ہُوئے کہا: "کیا آزاد عورت اس قسم کا عمل بھی انجام دیتی ہے؟" حاضرین میں سے بعض لوگ جو زمانۂ جاہلیت میں اس کی حالت سے واقف تھے اس کی اس بات پر ہنس پڑے۔ کیونکہ ہند کا سابقہ زمانہ کسی سے مخفی نہیں تھا۔

پھر پیغمبرؐ نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہُوئے فرمایا: "اور تم اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گی۔" ہند نے کہا: "ہم نے تو انھیں بچپن میں پالا پوسا تھا، مگر جب وہ بڑے ہُوئے تو آپ نے انھیں قتل کر دیا۔ اب آپ اور وہ خود بہتر جانتے ہیں۔" (اس کی مُراد اس کا بیٹا "حنظلہ" تھا جو بدر کے دن علیؑ کے ہاتھوں مارا گیا تھا)

پیغمبرؐ نے اس کی اس بات پر تبسّم فرمایا۔ اور جب آپ اس بات پر پہنچے اور فرمایا: "تم بہتان اور تہمت کو روا نہیں رکھو گی۔" تو ہند نے کہا: "بہتان قبیح ہے اور آپ ہمیں صلاح و درستی، نیکی اور مکارمِ اخلاق کے سوا اور کسی چیز کی دعوت نہیں دیتے۔"

جب آپ نے یہ فرمایا: "تم تمام اچھے کاموں میں میرے حکم کی اطاعت کرو گی۔" تو ہند نے کہا: "ہم یہاں اس لیے نہیں بیٹھی ہیں کہ ہمارے دل میں آپ کی نافرمانی کا ارادہ ہو۔" (حالانکہ مُسلّمہ طور پر معاملہ اس طرح نہیں تھا۔ لیکن تعلیماتِ اسلامی کے مطابق پیغمبرؐ اس بات کے پابند تھے کہ ان کے بیانات کو قبول کر لیں) [1]

۳ : معروف میں اطاعت

ان عمدہ نکات میں سے جو اوپر والی آیات سے معلوم ہوتے ہیں ایک یہ ہے کہ پیغمبرؐ کی اطاعت کو معروف کے ساتھ مُقیّد کیا ہے، حالانکہ پیغمبرؐ معصوم تھے اور کبھی بھی منکر اور بُری بات کا حکم نہیں دیتے تھے۔ لیکن ممکن ہے یہ تعبیر ان تمام احکام کے لیے ایک نمُونہ کے عنوان سے ہو جو اسلامی سربراہوں سے صادر ہوتے ہیں۔ یعنی وہ احکام

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۷۶

"قرطبی" نے بھی اس داستان کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اسی طرح سے "سیوطی" نے "در المنثور" میں اور "ابوالفتوح رازی" نے تفسیر "رُوح الجنان" میں زیر بحث آیات کے ذیل میں بیان کیا ہے۔

صرف اسی صورت میں محترم اور قابلِ اجراء ہیں جبکہ وہ تعلیمات قرآن اور اصولِ شریعتِ اسلام کے ساتھ سازگار ہوں اور "لا یعصینك فی معروف" کے مصداق ہوں۔

وہ لوگ (حقیقت سے) کتنے دُور ہیں جو برسرِ اقتدار لوگوں کو واجب الاطاعت سمجھتے ہیں، چاہے وہ کچھ بھی ہوں اور کسی بھی شخص کی طرف سے ہوں۔ حالانکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو نہ تو عقل کے ساتھ سازگار ہے اور نہ ہی شریعت اور قرآن کے حکم کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔

امیرالمومنینؑ نے اپنے اس خط میں جو آپ نے مصر کے لوگوں کو "مالک اشتر" کی فرمانروائی (گورنری) کے بارے میں لکھا تھا ان تمام اوصافِ بلند کے باوجود جو آپ نے مالک کے بارے میں بیان فرمائے تھے آخر میں یہ لکھا تھا:

فاسمعوا له واطيعوا امره فيما طابق الحق
فانه سيف من سيوف الله :[1]

"اُس کی بات کو سنو اور اس کے اس حکم کی جو حق کے مطابق ہو اطاعت کرو، کیونکہ وہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے۔"

٭ ٭ ٭

[1] نہج البلاغۃ خطبہ ۳۸، (یہ وہ مختصر خط ہے، جو امامؑ نے مصر کے لوگوں کے نام لکھا تھا اور مالک اشتر کے نام معروف فرمان جس کے علاوہ ہے۔)

(۱۳) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ
قَدْ يَئِسُوا مِنَ الْآخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ أَصْحَابِ الْقُبُورِ ۝

ترجمہ

(۱۳) "اے ایمان لانے والو! وہ قوم جس پر اللہ نے غضب کیا ہے اس سے دوستی نہ کرو۔ وہ آخرت سے اسی طرح مایوس ہو چکے ہیں جس طرح قبروں میں مدفون کفار مایوس ہیں۔"

تفسیر

اس مغضوب علیہ قوم سے دوستی نہ کرو

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس سورۃ کا آغاز، دشمنانِ خدا سے قطع تعلق کرنے کے مسئلہ سے ہوا ہے اور اب اسی چیز پر اس کا اختتام ہو رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس سورۃ کا اختتام اس کے آغاز کی طرف ایک بازگشت ہے، فرماتا ہے: "اے ایمان لانے والو! وہ قوم جس پر خدا نے غضب کیا ہے اس سے دوستی نہ کرو"۔ (یاایھا الذین آمنوا لا تتولوا قومًا غضب اللہ علیھم)۔

تمہیں ان سے دوستی نہیں کرنی چاہیے اور اپنے اسرار اور بھیدوں کو ان تک نہیں پہنچانا چاہیے۔

اس بارے میں کہ "مغضوب علیہم قوم" کون لوگ ہیں، بعض تو صراحت اس کو یہودیوں سے متعلق سمجھتے ہیں، کیونکہ قرآن کی دوسری آیات میں انھیں اس عنوان کے ساتھ یاد کیا گیا ہے جیسا کہ سورۃ بقرکی آیت ۹۰ میں یہود کے بارے میں بیان ہوا ہے: "فباء و بغضب علی غضب" پس وہ غضب بالائے غضب کے مستحق ہوئے۔

یہ تفسیر اس شانِ نزول سے بھی سازگار ہے جو مفسرین نے بیان کی ہے۔ کیونکہ انھوں نے کہا کہ فقراء مسلمین کی ایک جماعت مسلمانوں کی خبریں یہودیوں کے پاس لے جایا کرتی تھی اور یہودی اس کے بدلے میں انھیں اپنے درختوں کے پھل بطور ہدیہ کے دیا کرتے تھے۔ اس پر اُوپر والی آیت نازل ہوئی اور انھیں اس کام سے منع کیا۔[۱]

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس آیت کی تعبیرات ایک وسیع مفہوم رکھتی ہیں جو تمام کفار و مشرکین کو شامل ہیں، کیونکہ قرآن مجید میں غضب کی تعبیر "یہود" میں منحصر نہیں ہے بلکہ یہی تعبیر منافقین کے بارے میں بھی آئی ہے۔ (سورۃ فتح-۶) اور

[۱] "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۲۷۶

شانِ نزول بھی آیت کے مفہوم کو محدود نہیں کرتا۔

بناء بریں اس آیت میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ اس وسیع مطلب کے ساتھ ہم آہنگ ہے جو اس سورۃ کی پہلی آیت میں دشمنانِ خدا سے دوستی نہ کرنے کے عنوان سے آیا ہے۔

اس کے بعد ایک اور مطلب کو بیان کرتا ہے جو اس نہی کی دلیل کے طور پر بیان ہوا ہے۔ فرماتا ہے: "وہ آخرت میں نجات سے کلی طور پر مایوس ہیں جیسا کہ قبروں میں مدفون کفار مایوس ہیں۔ (قد یئسوا من الاٰخرۃ کما یئس الکفار من اصحاب القبور)۔[1]

کیونکہ کفار میں سے جو مرچکے ہیں وہ عالم برزخ میں اپنے کاموں کے نتائج دیکھ رہے ہیں اور تلافی کے لیے واپسی کی کوئی راہ نہیں ہے، لہٰذا وہ کلی طور پر مایوس ہیں۔ یہ زندوں کا گروہ بھی گناہ سے اس قدر آلودہ ہے کہ ہرگز اپنی نجات کی اُمید نہیں رکھتا، اور یہ ٹھیک کفار کے مُردوں کی طرح ہے۔

اِس قسم کے لوگ یقیناً خطرناک اور ناقابلِ اعتماد افراد ہیں۔ نہ تو ان کے قول پر کوئی اعتماد ہے اور نہ ہی ان کی صداقت اور ارادے پر کوئی اعتبار ہے وہ حق تعالٰی کی رحمت سے مایوس ہیں، اسی بناء پر ہر جُرم و گناہ پر ہاتھ ڈالتے ہیں، ان حالات میں تم ان پر کس طرح اعتماد کرتے اور ان سے دوستی کرتے ہو؟

* * *

خداوندا! ہمیں اپنے بے پایاں لطف و کرم سے ہرگز محروم و مایوس نہ کرنا۔

پروردگارا! ہمیں ایسی توفیق مرحمت فرما کہ ہم ہمیشہ تیرے دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن رہیں اور تیری دوستی کی راہ میں ثابت قدم رہیں۔

بارالٰہا! ہمیں اپنے اولیاء اور انبیاء کرام کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرما۔

آمین یا رب العالمین

۵ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

۲۵، ۲، ۱۳۶۵ ش

اختتام ترجمہ بروز جمعرات بوقت پونے چھ بجے صبح بتاریخ ۱۲ ذیقعد ۱۴۰۷ھ مطابق ۹ جولائی ۱۹۸۷ء بر مکان حقیر کوی جمشیدی محل سلطان محمد شریف۔ قم مقدس - ایران

---

[1] بعض نے اس آیت کی تفسیر میں اور احتمال بھی دیئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ آخرت کے ثواب سے اسی طرح مایوس ہیں جس طرح مشرکین اصحاب قبور کے زندہ ہونے سے مایوس ہیں، لیکن جو تفسیر ہم نے اوپر بیان کی ہے وہ زیادہ مُناسب ہے۔ (توجہ رہے کہ پہلی تفسیر کے مطابق "من اصحاب القبور" کفار کا وصف ہے اور آخری تفسیر کے مطابق "یئس" سے متعلق ہے۔)

سورۂ
صفّ

یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہوا اور اس کی ۱۴ آیات ہیں

تاریخ آغاز
۵ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

سُورۂ صفّ کے مضامین

یہ سُورہ درحقیقت دوبُنیادی محوروں کے گرد گھومتا ہے۔ اوّلاً اسلام کی تمام آسمانی ادیان پر برتری اور خدا کی طرف سے اس کی بقاء و دوام کی ضمانت اور ثانیاً اس دین کی حفاظت اور ترقّی کے لیے جہاد کا لازم ہونا۔

لیکن تفصیلی نظر سے اسے سات حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :۔

۱ : سورۃ کا آغاز خداوندِ عزیز وحکیم کی تسبیح سے ہُوا ہے اور بعد کے امُور وحقائق کو قبول کرنے کے لیے دلوں میں آمادگی پیدا کرتا ہے۔

۲ : گفتار وکردار میں ہم آہنگی اور بلا عمل باتوں سے پرہیز کی دعوت۔

۳ : عزمِ راسخ اور اتّحادِ کامل کے ساتھ جہاد کی دعوت۔

۴ : بنی اسرائیل کی پیمان شکنی کی یاد آوری اور ظہُورِ اسلام کے بارے میں مسیحؑ کی بشارت۔

۵ : دین اسلام کی تمام ادیان پر فتح مندی کی ضمانت۔

۶ : جہاد کی طرف مُوثّر دعوت اور مُجاہدین راہِ حق کی دنیاوی اور اُخروی جزاؤں کا بیان۔

۷ : حضرت عیسٰیؑ کے حوارین کی زندگی کے بارے میں ایک مختصر سا اشارہ اور ان سے ہدایت کا سبق حاصل کرنا۔

لیکن جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں اس سُورہ کا اصلی محور اسلام اور جہاد ہی ہے۔

سُورہ کے لیے "صفّ" کے نام کا انتخاب اس تعبیر کی بناء پر ہے جو اس سورہ کی چوتھی آیت میں آئی ہے لیکن بعض اوقات یہ سُورہ "عیسٰی" یا سُورہ حوارین کے نام سے بھی موسُوم ہوا ہے۔

مشہُور قول ہے کہ یہ سارا سُورہ مدینہ میں نازل ہُوا ہے اور اس سورہ میں آیاتِ جہاد کا ہونا بھی اس معنی کی تائید کرتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ مکہ میں جہاد کی تشریع قطعاً نہیں ہُوئی تھی۔

سُورۂ صفّ کی تلاوت کی فضیلت

پیغمبر گرامیؐ سے آیا ہے :

"مـن قـرأ سورة عيسٰى كان عيسٰى مصليا عليه مستغفرًا له ما دام فى الدنيا وهـو يوم القيامة رفيقه"

"جو شخص سورۂ عیسٰی (سُورۂ صفّ) کو پڑھے تو حضرت عیسٰی اُس کے لیے دُعائے رحمت کریں گے جب تک وہ دُنیا میں زندہ ہے اس کے لیے استغفار کریں گے اور قیامت میں وہ ان کا رفیق اور ساتھی ہوگا[1]۔ (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایک اور حدیث میں امام محمدؑ باقرؑ سے منقول ہے:

"من قرأ سورة الصف و ادمن قرائتها فی فرائضه ونوافله صفه الله مع ملائكته و انبيائه المرسلين."

جو شخص سورۂ صف کو پڑھے یا واجب اور مستحب نمازوں میں اس کی مداومت کرے، خدا اُسے فرشتوں اور انبیاء مرسلین کی صف میں قرار دے گا۔[1]

* * *

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) [1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۷۷ نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۰۹

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۷۷ نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۰۹

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ۚ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ○

(۲) یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ○

(۳) کَبُرَ مَقۡتًا عِنۡدَ اللّٰہِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ○

(۴) اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ صَفًّا کَاَنَّہُمۡ بُنۡیَانٌ مَّرۡصُوۡصٌ ○

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خُدا کے نام سے۔

(۱) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، وہ سب خُدا کی تسبیح کرتے ہیں، اور وہ صاحبِ قدرت اور حکیم و دانا ہے۔

(۲) اے ایمان لانے والو! تم ایسی بات کیوں کرتے ہو جس پر تم خُود عمل نہیں کرتے۔

(۳) خُدا کے ہاں یہ بات بہُت ہی غضب کا مُوجب ہے کہ تم ایسی بات کرو جس پر تم خود عمل نہیں کرتے۔

(۴) خدا اُن لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر قتال کرتے ہیں جیسے وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

شانِ نزول

مفسّرین نے آیۂ لم تقولون مالا تفعلون کی شان نزول میں بہت سی روایات بیان کی ہیں کہ جن میں کچھ زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ ان میں کچھ یہ ہیں :

۱ : مومنین کی ایک جماعت یہ کہا کرتی تھی کہ (اس کے بعد) جب بھی ہم دشمن کے مقابل ہوں گے تو پُشت نہیں پھیریں گے اور فرار نہیں کریں گے۔ لیکن انھوں نے اپنے قول کو پورا نہ کیا، اور جنگِ اُحد کے دن بھاگ کھڑے ہُوئے، یہاں تک کہ پیغمبر اکرمؐ کی پیشانی زخمی ہوگئی اور آپ کے دو دندانِ مُبارک بھی شہید ہو گئے۔

۲ : جس وقت خُدا نے شہُدائے بدر کا ثواب بیان کیا تو صحابہ کی ایک جماعت نے کہا: "اب جبکہ مُعاملہ اس طرح ہے تو ہم آئندہ کی جنگوں میں اپنی تمام توانائیاں صَرف کر دیں گے، پھر وہ جب اُحد میں بھاگ کھڑے ہُوئے تو اوپر والی آیت نازل ہُوئی اور انھیں سرزنش کی۔

۳ : مُسلمانوں کی ایک جماعت حکمِ جہاد کے نزول سے پہلے یہ کہا کرتی تھی: "اے کاش! خُدا ہمیں بہترین اعمال کی نشاندہی کرتا کہ ہم ان پر عمل کرتے"۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ خُدا نے انھیں یہ خبر دی کہ "افضل اعمال، ایمانِ خالص اور جہاد ہے"۔ لیکن یہ خبر انھیں اچھی نہ لگی اور لیت ولعل کرنے لگے تو یہ آیت نازل ہُوئی اور انھیں سرزنش کی۔[1]

❊ ❊ ❊

تفسیر

فولادی دیوار کی طرح جم کر لڑنے والے

اس سورۃ کی ابتداء بھی خُدا کی تسبیح کے ساتھ ہے، اسی بناء پر مفسّرین نے اس سورۃ کو بھی "مسبّحات" (وہ سورتیں جو تسبیحِ خُدا سے شروع ہوتی ہیں) میں شمار کیا ہے۔ فرماتا ہے: "جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب خدا کی تسبیح کرتے ہیں" (سبح لله مافی السماوات ومافی الارض)۔[2]

اس کی تسبیح کیوں نہ کریں اور اُسے ہر عیب ونقص سے منزّہ شمار کیوں نہ کریں، جبکہ "وہ شکست ناپذیر قادر ہے، اور ہر چیز سے آگاہ ہے" (وھو العزیز الحکیم)۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۷۸ فی مفسّرین نے بھی کچھ فرق کے ساتھ یہی روایات بیان کی ہیں۔

[2] عالم کے تمام موجودات کی تسبیح کی کیفیت کے سلسلہ میں ہم نے اس تفسیر میں بارہا گفتگو کی ہے ان میں سے سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۴۴ کے ذیل میں (تفسیر نمونہ جلد ۶) اور سورہ نور کی آیت ۴۱ کے ذیل میں (جلد ۸) کو ملاحظہ فرمائیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں یہ سُورہ ، سورۂ ایمان و توحید و معرفت ہے ۔ موجُودات کی عمومی تسبیح کے مسئلہ کی طرف توجہ کہ جو زبانِ حال وقال سے صورت پذیر ہوتی ہے اور اس میں موثر شگفت انگیز نظام جو عزیز و حکیم خالق کے وجود پر بہترین دلیل ہے ۔ یہ چیزیں ایمان کی بنیادوں کو دلوں کے اندر مستحکم بناتی اور فرمانِ جہاد کے لیے راستہ استوار کرتی ہیں۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد ان افراد سے جو اپنی کہی ہُوئی باتوں پر عمل نہیں کرتے، ملامت و سرزنش کے عنوان سے فرماتا ہے :
"اے ایمان لانے والو ! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو ، جس پر عمل نہیں کرتے" ؟ (یاایھا الذین اٰمنوا لم تقولون ما لا تفعلون)۔[1]

اگرچہ شانِ نزول کے مُطابق یہ آیات جہاد کی باتوں اور پھر جنگِ اُحد کے دن فرار کر جانے کے بارے میں نازل ہُوئی ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ شانِ نزول آیات کے وسیع مفاہیم کو ہرگز محدُود نہیں کرتی ۔ لہٰذا ہر قسم کی ایسی گفتگو جس پر عمل نہ ہو، ملامت کے لائق ہے چاہے وہ میدانِ جہاد میں پامردی کے لحاظ سے ہو یا کسی اور مثبت اور تربیتی عمل سے متعلق ہو ۔

بعض مفسرین نے ان آیات میں مخاطب کو ظاہری مومن اور باطنی منافق سمجھا ہے ، حالانکہ خطاب "یا یھا الذین اٰمنوا" اور بعد والی آیات کی تعبیریں یہ بتاتی ہیں کہ خطاب حقیقی مومنین ہی سے ہے ، لیکن ایسے مومنین جو ابھی تک کمالِ ایمان کی سرحد تک نہیں پہنچے اور ان کی گفتار و کردار ہم آہنگ نہیں ہُوئے ہیں ۔

٭ ٭ ٭

اِس کے بعد اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہُوئے مزید کہتا ہے : "یہ فعل خُدا کے نزدیک عظیم غضب کا موجب ہے کہ تم ایسی باتیں کہو جن پر عمل نہیں کرتے (کبر مقتًا عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون)۔[2]

مجالس عمومی میں بیٹھ کر دادِ سُخن دیتے ہو لیکن جب میدانِ عمل کا وقت آتا ہے ، تو پھر ہر شخص ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوتا ہے ۔

سچے مومنین کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اُن کی گفتار و کردار سو فیصد ہم آہنگ ہو ۔ ہاں جس قدر انسان اس اصل سے دُور ہوتا ہے ، اتنا ہی حقیقت ایمان سے دُور ہوتا ہے ۔

"مقت" اصل میں "اس شخص کے لیے بُغض شدید کے معنی میں ہے جس نے کوئی قبیح کام انجام دیا ہو ۔ لہٰذا عرب جاہلی میں جو شخص اپنے باپ کی بیوی کو اپنے نکاح میں لے آتا تھا ، اسے "نکاح مقت" کہتے تھے ۔ "کبر مقتًا" کے جملہ میں لفظ 'مقت' 'کبر' کے ساتھ ملا ہُوا ہے جو اور بھی شدت و سنگینی اور عمل سے خالی گفتار کے بارے میں خدا کے عظیم

---

[1] "لم" اصل میں "لما" (لام جارہ اور ماء استفہامیہ سے مُرکب تھا) اس کے بعد اس کا الف کثرت استعمال سے یا 'اخبار' و 'استفہام' میں فرق رکھنے کے لیے گر گیا ہے ۔
[2] بعض مفسرین نے "کبر" کو "افعال مدح وذم" میں سے سمجھا ہے (تفسیر رُوح البیان زیرِ بحث آیات کے ذیل میں) اور بعض نے اسے تعجب کے معنی میں سمجھا ہے ۔ (تفسیر کشاف)

غضب اور غصّہ کی دلیل ہے۔ ؎۱

"علامہ طباطبائی" "المیزان" میں فرماتے ہیں: " اس بات میں کہ انسان کوئی ایسی بات کہے جسے انجام نہیں دے گا، اور اس بات میں کہ کسی ایسے کام کو انجام نہ دے جو وہ کہتا ہے، فرق ہے۔ پہلا عمل نفاق کی دلیل ہے، اور دوسرا ضعفِ ارادہ کی دلیل ہے"۔

بہرحال اوپر والی آیت ہر قسم کے عہد و پیمان اور وعدہ سے تخلّف، یہاں تک کہ بعض کے قول کے مطابق نذر کو بھی شامل ہے، اسی لیے مالک اشتر والے فرمان میں آیا ہے کہ امام علیؑ نے اُن سے فرمایا:۔

" ایاك .... ان تعهد هم فتتبع موعدك بخلفك...۱..والخلف يوجب المقت عند الله والناس ، قال الله تعالیٰ : كبر مقتًا عند الله ان تقولوا ما لا تفعلون"۔

" اور یہ کہ تم لوگوں سے کوئی وعدہ کرو اور پھر اس وعدے سے تخلّف کرو، اس بات سے سختی کے ساتھ پرہیز کرنا۔ کیونکہ یہ بات خُدا کے ہاں اور لوگوں کے نزدیک بھی خشم عظیم کا موجب ہو گی۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "كبر مقتًا عند الله ان تقولوا ما لا تفعلون"۔ ؎۲

ایک اور حدیث امام صادقؑ سے آئی ہے:

" عدة المؤمن اخاه نذر لا كفارة فيه فمن اخلف فيخلف الله بدأ ولمقته تعرض ، و ذلك قوله : "يا ايها الذين اٰمنوا لم تقولون مالا تفعلون كبر مقتًا عند الله ان تقولوا مالا تفعلون"۔

"مومن کا اپنے بھائی سے وعدہ کرنا ایک قسم کی نذر ہے، اگرچہ اس کا کوئی کفّارہ نہیں ہے۔ جو شخص وعدہ کے خلاف کرے گا اُس نے خُدا کی مخالفت کی ہے اور خود کو اُس کے غضب کا مستحق بنا دیا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے: "يا ايها الذين اٰمنوا لم تقولون ما لا تفعلون"۔ ؎۳

٭ ٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں اصل مسئلہ کہ جو جہاد ہے، اسے سامنے لاتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح سے جہاد کرتے ہیں، جیسے کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو"۔ "ان الله يحب الذين يقاتلون في سبيله صفًّا كانهم بنيان مرصوص"۔ ؎۴

؎۱ المیزان جلد ۱۹ ص ۲۸۷

؎۲ "نہج البلاغہ" مکتوب ۵۳ (ص ۴۴۴ صبحی صالح)

؎۳ "اصول کافی" جلد ۲ باب خلف الوعد

؎۴ "صفًّا" یہاں حال کے عنوان سے منصوب ہے۔

اِس بناء پر محض جنگ کرنا اہم نہیں۔اہم بات یہ ہے کہ وہ جنگ "فی سبیل اللہ ہو اور وہ بھی مکمل اتحاد، نظم وضبط کے ساتھ ۔ جیسے کہ فولادی دیوار ہو۔

"صف" اصل میں مصدری معنی رکھتا ہے اور کسی چیز کو سیدھے خط میں قرار دینے کے معنی میں ہے۔ لیکن یہاں اسم فاعل کے طور پر آیا ہے۔

"مرصوص" "رصاص" کے مادہ سے سیسہ کے معنی میں ہے۔چونکہ بعض عمارتوں کے استحکام اور مضبوطی کے لیے سیسہ پگھلا کر عمارت کے مختلف حصوں میں اِس طرح ڈالتے تھے کہ وہ حد سے زیادہ محکم اور یکجان ہو جاتی تھی۔اِس لیے ہر محکم اور مضبوط عمارت پر "مرصوص" کا اطلاق ہوتا ہے۔

یہاں مُراد یہ ہے کہ مجاہدین راہِ خدا میں دشمن کے مُقابلے میں ایک دل، ایک جان، مستحکم اور استوار کھڑے ہوں۔ گویا کہ وہ سب آپس میں پیوستہ ہیں کہ جن کے درمیان کوئی شگاف و سُوراخ نہیں ہے۔اِسی لیے تفسیر علی بن ابراہیم میں اس آیت کی توضیح میں یہ کہا ہے: "یصطفون کالبنیان الذی لایزول": "مجاہدین راہِ خُدا میں اس دیوار کی طرح صف بستہ ہوتے ہیں جو ہرگز نہیں ڈولتی"۔ [1]

ایک حدیث میں آیا ہے کہ امیرالمومنین علیؑ جب اپنے اصحاب کو جنگ کے لیے "میدانِ صفین" میں آمادہ کرنا چاہتے تھے تو آپ نے فرمایا:

"خدائے عزّوجل نے تمھیں اس فریضہ کی طرف رہنمائی کی اور فرمایا ہے: "ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفًّا کانھم بنیان مرصوص": لہٰذا تم اپنی صفوں کو آہنی دیوار کی طرح مستحکم کرلو۔جو زرہ پوش ہیں وہ آگے رہیں اور جن کے پاس زرہ نہیں ہے وہ اُن کے پیچھے رہیں، دانتوں کو مضبوطی کے ساتھ بھینچ کر رکھو اور نیزوں کے آگے پیچ وخم میں رہو کیونکہ یہ چیز دشمن کے نیزہ کو ردّ کرنے کے لیے زیادہ مُؤثر ہے۔دشمن کے انبوہ کی طرف تیز نگاہ سے دیکھو تاکہ تمھارا دل زیادہ قوی اور تمھاری رُوح زیادہ سکون و آرام میں رہے، باتیں کم کرو کہ یہ چیز سُستی اور کمزوری کو دُور کرتی ہے اور تمھارے وقار کے لیے زیادہ مُناسب ہے۔اپنے پرچم اور جھنڈوں کو خم نہ ہونے دو، اور انھیں ان کی جگہ سے نہ ہلاؤ۔نیز دلیر اور بہادر افراد کے علاوہ خود کو کسی کے سپرد نہ کرو۔ [2]

☆ ☆ ☆

---

[1] "نورُ الثقلین" جلد ۵ ص ۳۱۱

[2] "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۳۰۱ اسی کے مشابہ نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۲۴ میں بھی آیا ہے۔

چند نکات

۱ : صفوں میں وحدت کی ضرورت

میدانِ جنگ میں نظم وضبط اور صفوں کا ملے ہُوئے رہنا دشمنوں کے مقابلے میں کامیابی کے اہم عوامل میں سے ہے ۔ نہ صرف فوجوں کی جنگ میں بلکہ سیاسی اور اقتصادی جنگ میں بھی وحدت کے بغیر کوئی کام نہیں بن سکتا ۔

حقیقت میں قرآن، دشمنوں کو ایسے تباہ کن سیلاب سے تشبیہ دیتا ہے کہ جسے فولادی بند کے ساتھ ہی روکا جا سکتا ہے ۔ "بنیان مرصوص" ایک عمدہ ترین تعبیر ہے جو اس سلسلے میں بیان کی گئی ہے ۔ ایک دیوار یا عظیم بند میں سے ہر ایک کا ایک خاص اثر ہے ۔ لیکن یہ نقش و اثر اسی صورت میں مُوثر ہوتا ہے جبکہ ان کے درمیان کسی قسم کا فاصلہ اور شگاف نہ ہو اور اس کے اجزاء اس طرح سے مُتحد ہوں کہ گویا وہ سب ایک ہی چیز ہیں ۔ سب کے سب ایک ہاتھ اور ایک عظیم اور محکم مٹھی کی طرح ہوں جو دشمن کی سرکوبی کر کے اُسے ریزہ ریزہ کر دے ۔

افسوس اسلام کی یہ عظیم تعلیم بُھلا دی گئی ہے اور اتنا بڑا اسلامی مُعاشرہ نہ صرف یہ کہ "بنیانِ مرصوص" کی صورت نہیں رکھتا بلکہ پراگندہ صفوں میں تبدیل ہو چکا ہے کہ جو ایک دُوسرے کے مُقابلے میں کھڑی ہُوئی ہیں جن میں سے ہر ایک کے سر میں ہوا اور دل میں ہوس بھری ہُوئی ہے ۔

اِس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہیئے کہ وحدتِ صفوف باتوں اور نعروں سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے "وحدتِ ہدف" اور "وحدتِ عقیدہ" کی ضرورت ہے ۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو خلوصِ نیت ، معرفت واقعی ، صحیح اسلامی تربیت اور قرآنی تہذیب و تمدّن کے احیاء کے بغیر ممکن نہیں ہے ۔

اگر خُدا ان مجاہدین کو دوست رکھتا ہے جو بُنیان مرصوص کی طرح ہیں تو پھر وہ اُن پراگندہ اور منتشر صفوں کو دشمن رکھتا ہے ۔ جیسا کہ اب ہم خُدا کے اس غضب کے آثار اس کئی سو ملین مُعاشرے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ جس کا ایک نمونہ صیہونیوں کے ایک چھوٹے سے گروہ کا اسلامی سرزمین پر مُسلّط ہو جانا ہے ۔ خدایا ! ہمیں قرآن اور اس کی حیات بخش تعلیمات کی آگاہی ، بیداری اور آشنائی مرحمت فرما ۔

۲ : گفتار بلا عمل

زبان دل کی ترجمان ہوتی ہے ۔ اگر ان دونوں کا راستہ ایک دُوسرے سے الگ ہو جائے تو یہ نفاق کی نشانی ہے ، اور ہم جانتے ہیں کہ ایک منافق انسان کی فکر و رُوح سلامت نہیں ہوتی ۔

بدترین بلائیں جو کسی معاشرے پر مُسلّط ہو سکتی ہیں اُن میں سے ایک سلبِ اطمینان کی بلا ہے اور اس کا اصلی عامل گفتار کی کردار سے جُدائی ہے ۔ وہ لوگ باتیں تو کرتے ہیں لیکن ان پر عمل نہیں کرتے ، وہ ہرگز ایک دُوسرے پر اعتماد نہیں

کر سکتے اور مشکلات کے مقابلے میں ہم آہنگ نہیں ہو سکتے - ان کے درمیان اخوت، برادری اور خلوص ہرگز کارفرما نہیں ہو سکتا، ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی اور کوئی بھی دشمن ان سے مرعوب نہیں ہوگا۔

جب شام کے لشکر کے غارت گروں نے عراق کی سرحد کو تاخت و تاراج کیا اور یہ خبر امام علیؑ کے کانوں تک پہنچی تو آپ کو سخت دکھ پہنچا۔ آپ نے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا:

"ایها الناس المجتمعة ابدانهم المختلفة اهواؤهم، کلامکم یوهی الصم الصلاب، وفعلکم یطمع فیکم الاعداء، تقولون فی المجالس کیت وکیت، فاذا جاء القتال قلتم حیدی حیاد!"

امام علیؑ اپنے خطبے میں، جو آپ کے سوزِ دل کی حکایت بیان کرتا ہے، عراق کے لوگوں سے کہتے ہیں:

"اے وہ لوگو! جن کے بدن تو اکٹھے ہیں لیکن افکار و خواہشات مختلف و پراگندہ ہیں، تمھاری گرما گرم باتیں تو سخت پتھروں کو بھی توڑ دیتی ہیں، لیکن تمھارے کمزور اعمال دشمنوں کو طمع دلاتے ہیں۔ مجالس و محافل میں تو تم اِس طرح اور اُس طرح کہتے ہو لیکن جنگ کے وقت ہائے وائے کرتے ہو کہ اے جنگ ہم سے دُور ہو جا۔" [1]

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"یعنی بالعلماء من صدق فعله قوله، ومن لم یصدق فعله قوله فلیس بعالم۔"

"عالم وہ ہے، جس کا عمل اس کے قول کی تصدیق کرے۔ جس کا عمل اُس کے قول کی تصدیق نہیں کرتا، وہ عالم نہیں ہے۔" [2]

ایسی اقوام وملل جو اہلِ قول تو ہیں لیکن اہلِ عمل نہیں ہیں؛ وہ اسی بنا پر ہمیشہ دشمنوں کے چنگل میں اسیر رہتے ہیں۔ ایک معاصر شاعر نے ان کی سرنوشت ایک خوبصورت داستان میں بلبل اور شکاری باز کی زبانی پیش کرتے ہوئے اس کی تصویر کشی کی ہے:

دوش می گفت بلبلے با باز
کز چہ حال تو خوشتراست از من

تو کہ زشتی و بد عبوس و مہیب
تو کہ لالی و گنگ و بستہ دہن

---

[1] "نہج البلاغۃ" خطبہ ۲۹

[2] "اصول کافی" جلد اوّل (باب صفۃ العلماء حدیث)

مست و آزاد روی دستِ شہاں

با دو صد ناز می کُنی مسکن

من بدیں ناطقی و خوش خوانی

با خوشی اندامی و ظریفی تن

قفسم مسکن است و روزم شب

بہرہ ام غصہ است و رنج و محن

باز گفتا کہ راست می گوئی!

لیک سِرّش بُود بسی روشن

داب تو گفتن است و نا کردن

خوئے من کردن است و نا گفتن

ترجمہ:

کل رات ایک بلبل باز سے کہہ رہی تھی

کہ تیری حالت مجھ سے کیوں بہتر ہے؟

حالانکہ تو قبیح منظر، ترش رُو اور مُہیب شکل ہے۔

تو بے زبان گونگا ہے اور تیرا مُنہ بند ہے۔

تو پھر بھی مست اور آزادی کے ساتھ بادشاہوں کے ہاتھوں پر

سینکڑوں ناز اور نخرے کے ساتھ بیٹھتا ہے۔

لیکن میں اس نطق اور خوش خوانی کے باوجود

اور خوش اندام اور عمدہ بدن کے ساتھ

پنجرہ تو میرا مسکن ہے اور میرا روشن دن شب تاریک ہے۔

میرے نصیب میں غم اور رنج و محن برداشت کرنا ہے۔

باز نے کہا کہ تُو سچ کہتی ہے

لیکن اس کا راز تو بہت ہی واضح ہے

تیرا طریقہ صرف باتیں بنانا ہے عمل کرنا نہیں

اور میری عادت عمل کرنا ہے باتیں بنانا نہیں

۵ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ
تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ۭ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ
قُلُوْبَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ○
۶ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِنِّىْ
رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ
وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۭ فَلَمَّا
جَاۗءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○

ترجمہ

۵ اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: "اے میری قوم تم مجھے تکلیف کیوں دیتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمھاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ جب وہ حق سے منحرف ہو گئے تو خدا نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔ اور خدا فاسقوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

۶ اور اس وقت کو یاد کرو جب عیسیٰ بن مریمؑ نے کہا: اے بنی اسرائیل! میں تمھاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ میں اس کتاب کی جو مجھ سے پہلے بھیجی گئی، یعنی تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں۔ اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمدؐ ہے۔ لیکن جب وہ (احمدؐ) معجزات اور واضح دلائل کے ساتھ اُن کی طرف آیا تو انھوں نے کہا کہ یہ تو ایک کھلا جادو ہے۔

تفسیر

میں احمدؐ کے ظہور کی بشارت لے کر آیا ہوں۔

ان دو احکام کے بعد جو گزشتہ آیات میں "گفتار و کردار کی ہم آہنگی" اور "وحدتِ صفوف" کے بارے میں آئے تھے، اِس میں ان معنی کی تکمیل کے لیے دو پیغمبروں موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی زندگی کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ افسوس ہے "گفتار و عمل کی جُدائی" اور "صفوف کے عدم نظم" کے کئی واضح نمونے، ایسی منحوس سرنوشت کے ساتھ جو ان امُور کے بعد ان میں پیدا ہوئی، ان دونوں کے پیرو کاروں کی زندگی میں نظر آتے ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا: "اے میری قوم! تم مجھے کیوں تکلیف پہنچاتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمھاری طرف خدا کا بھیجا ہُوا رسُول ہوں" (و اذ قال موسٰی لقومه یا قوم لم تؤذوننی وقد تعلمون انی رسول الله الیکم)۔

یہ آزار و اذیّت ممکن ہے ان تمام مخالفتوں اور بہانہ جوئیوں کی طرف اشارہ ہو جو بنی اسرائیل نے موسیٰ ؑ کی زندگی میں اِس عظیم پیغمبر کے ساتھ کی تھیں، یا بیت المقدس کی مانند کسی ماجرے کی طرف اشارہ ہو کہ جس میں انھوں نے موسیٰؑ سے کہا۔ ہم اس شہر میں داخل ہونے کے لیے تیار نہیں اور نہ ہی ہم "عمالقہ" کے ساتھ جنگ پر تیار ہیں جو ایک طاقتور اور جبّار گروہ ہے۔ تم اور تمھارا پروردگار جاکر اس کو فتح کرو تو پھر ہم اس میں داخل ہوں گے۔" (مائدہ - ۲۴)

اسی سبب سے وہ سالہا سال تک وادیٔ "تیہ" میں گھومتے رہے اور جہاد کے حکم میں فضُول، بیہودہ اور کمزور بہانے بنانے کا تلخ مزہ چکھتے رہے۔

لیکن اس چیز کی طرف توجہ کرتے ہُوئے جو سُورۂ احزاب کی آیت ۶۹ میں وارد ہُوئی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اذیّت و آزار ان ناروا نسبتوں کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے موسیٰؑ کی طرف دیں اور خُدا نے موسیٰؑ کو ان سے مبّرا قرار دیا تھا۔ اس آیت میں آیا ہے: "یاایها الذین اٰمنوا لا تکونوا کالذین اٰذوا موسٰی فبراٰه الله مما قالوا و کان عند الله وجیهًا۔"

"اے ایمان لانے والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے موسیٰؑ کو اذیّت پہنچائی اور خُدا نے انھیں (بنی اسرائیل کی ناروا باتوں سے) بری قرار دیا۔

یہ نسبتیں بہُت سی تھیں۔ کبھی تو وہ انھیں اپنے بھائی ہارونؑ کو قتل کرنے کے ساتھ مُتہم کرتے۔ کبھی (نعوذ باللّٰہ) ایک بدکار عورت کے ساتھ غیر شرعی روابط کی تہمت لگاتے۔ (وہ سازش جو حیلہ باز قارُون نے تیار کی تاکہ وہ زکات سے مستثنیٰ رہے) کبھی ان پر جادو اور جُنون کا اتّہام لگاتے تھے، یا انھیں چند ایک جسمانی عیوب کے ساتھ متّہم کرتے تھے کہ جن کی تفصیل سورہ احزاب کی مذکورہ آیت میں آچکی ہے۔[1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی پیغمبر پہ ایمان لانے کا دعوے دار ہو اور پھر وہ اس کو ایسی ناروا نسبتیں دے؟ کیا یہ گفتار کے کردار سے جُدا ہونے کا واضح ترین نمونہ نہیں ہے؟ اسی لیے تو موسیٰؑ کہتے ہیں: "باوجودیکہ تم اِس بات کا یقین رکھتے ہو کہ میں خدا کا رسول ہوں، پھر یہ ناروا باتیں کیوں کرتے ہو۔"

لیکن یہ عمل سزا کے بغیر نہ رہا جیسا کہ زیرِ بحث آیت کے آخر میں آیا ہے: "جب وہ حق سے منحرف ہو گئے تو خُدا نے بھی اُن کے دلوں کو منحرف کر دیا اور خدا فاسقوں کو ہدایت نہیں کرتا۔" (فلمّا زاغوا ازاغ اللّٰہ قلوبھم واللّٰہ لایھدی القوم الفاسقین)۔

اِس سے بڑی مصیبت اور کیا ہو گی کہ انسان خدائی ہدایت سے محروم اور اس کا دل حق سے منحرف ہو جائے؟ [۱]

اِس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت و ضلالت اگرچہ خدا کی طرف سے ہے، لیکن اس کے اسباب اور عوامل خُود اِنسان کی طرف سے ہوتے ہیں، کیونکہ ایک طرف تو فرماتا ہے: "جس وقت وہ حق سے منحرف ہو گئے تو خدا نے بھی ان کے دلوں کو منحرف کر دیا"۔ یعنی پہلا قدم انھوں نے اُٹھایا ہے، دوسری طرف یہ کہتا ہے: "خدا فاسق قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔" پہلے فسق و گناہ سرزد ہوتا ہے کہ جس سے انسان توفیق و ہدایت الٰہی کے سلب ہو جانے کا مستحق ہوتا ہے اور اس کے بعد اس عظیم محرُومیّت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اِس سلسلہ میں تفصیلی بحث سورۂ زمر کی آیت ۳۶ کے ذیل میں آ چکی ہے۔ (تفسیر نمونہ جلد ۱۱ کی طرف رجُوع کریں۔)

بعد والی آیت میں حضرت عیسیٰؑ کی رسالت اور اس کے مقابلے میں بنی اسرائیل کی کارشکنی اور تکذیب کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے مزید کہتا ہے: "اس وقت کو یاد کرو جب عیسیٰ ابن مریمؑ نے کہا: "اے بنی اسرائیل! میں تمھاری طرف خُدا کا بھیجا ہوا رسُول ہوں، جبکہ میں اس کتاب کی جو مجھ سے پہلے بھیجی گئی (یعنی تورات) کی تصدیق کرنے والا ہوں"۔ (و اذ قال عیسی ابن مریم یا بنی اسرائیل انی رسول اللّٰہ الیکم مصدقًا لما بین یدیّ من التوراۃ)۔

"اور میں اس رسول کی بشارت دینے والا بھی ہوں جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمدؐ ہے۔" (ومبشرًا برسول یأتی من بعدی اسمہ احمد)۔

اِس بناء پر میں وہ حلقۂ اتّصال ہوں جو اُمّتِ مُوسیٰؑ اور ان کی کتاب کو آنے والے پیغمبر (پیغمبرِ اسلام) کی اُمت اور اُن کی کتاب سے ملانے والا ہُوں۔

اِس طرح حضرت عیسیٰؑ کا رسالتِ خداوندی کے سوا اور کوئی دعویٰ نہیں تھا اور وہ بھی ایک خاص زمانہ کے لیے تھا۔ بعد میں ان کی طرف الوہیت یا خدا کا بیٹا ہونے کے بارے میں جو افتراء باندھا گیا وہ سب جھُوٹ اور بُہتان ہے۔

(حاشیہ سابقہ صفحہ) [۱] تفسیر نمونہ جلد ۹ سُورۂ احزاب آیت ۶۹ کے ذیل میں دیکھیں۔

[۲] "زاغوا" مادہ "زیغ" سے، صراطِ مستقیم سے انحراف کے معنی میں ہے۔

اگرچہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ اس موعود نبی پہ ایمان لے آیا، لیکن ان کی ایک بہت بڑی جمعیت نہایت سختی کے ساتھ اس کے مقابلہ میں کھڑی ہوگئی۔ یہاں تک کہ انھوں نے اس کے واضح معجزات کا بھی انکار کر دیا۔ اس لیے آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "جب وہ (احمدؐ) ان کے پاس معجزات اور واضح دلائل کے ساتھ آیا تو انھوں نے کہا: یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔" (فلما جاء ھم بالبینات قالوا ھٰذا سحر مبین)۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ گروہ یہود، مشرکین عرب سے پہلے اس پیغمبر کو پہچانے ہوئے تھا۔ یہاں تک کہ انھوں نے اس کے شوقِ دیدار کے لیے ترکِ وطن کیا اور ان کے کئی قبائل سرزمینِ مدینہ میں آکر آباد ہو گئے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بہت سے بت پرستوں نے تو اس پیغمبر موعود کو پہچان لیا اور اس پہ ایمان لے آئے، لیکن اکثر یہودی ہٹ دھرمی، عناد اور انکار پہ ڈٹے رہے۔

مفسرین کے ایک گروہ نے "فلما جاء ھم" کی ضمیر کو، جیساکہ ہم نے اوپر نقل کیا ہے، پیغمبر اسلام (احمدؐ) کی طرف لوٹایا ہے۔ لیکن بعض نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ یہ ضمیر حضرت عیسیٰ کی طرف لوٹتی ہے۔ یعنی عیسیٰؑ جب بنی اسرائیل کے لیے واضح معجزات لے کر آئے تو انھوں نے اس کا انکار کیا اور جادو قرار دیا۔

لیکن بعد والی آیات بتلاتی ہیں کہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے، کیونکہ ان آیات میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کا تذکرہ ہوا ہے۔

٭ ٭ ٭

چند نکات

۱: بشارت اور تکمیلِ دین کا ربط

ظہورِ اسلام کے بارے میں عیسیٰؑ کے خبر دینے میں "بشارت" کی تعبیر گزشتہ ادیان کی نسبت اس دین کی تکمیل کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔ آیاتِ قرآنی کا مطالعہ اور اسلامی عقائد، احکام، قوانین اور مسائلِ اخلاقی و اجتماعی کے سلسلے میں قرآن کے معارف و تعلیمات کا اس کے ساتھ موازنہ کہ جو کتب عہدین (توریت و انجیل) میں آیا ہے، اس برتری کی واضح طور پہ نشان دہی کرتا ہے۔

اگرچہ اوپر والی آیت میں اس کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کہ یہ بشارت مسیحؑ کی آسمانی کتاب کے متن میں بھی ہے یا نہیں؟ لیکن قرآن کی دوسری آیات، خود انجیل میں اس کے ذکر کی گواہ ہیں۔ سورۃ اعراف آیۃ ۵۷ میں آیا ہے: "الذین یتبعون الرسول النبیّ الامی الذی یجدونه مکتوبًا عندھم فی التوراۃ والانجیل"۔ وہ لوگ جو خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر اُمّی کی پیروی کرتے ہیں، وہی پیغمبر جس کی صفات کو وہ اپنے پاس توراۃ و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔۔۔ اور بعض دوسری آیات۔ [1]

[1] "المیزان" جلد ۱۹ ص ۲۹۰

۲ : عہدین کی بشارتیں اور "فارقلیطا" کی تعبیر

اِس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ میں یہود و نصاریٰ کے پاس جو کچھ تورات و انجیل کے نام سے موجود ہے، وہ خُدا کے عظیم پیغمبروں یعنی موسیٰؑ و عیسیٰؑ پر نازل شدہ کتابیں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ اُن کتابوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو اُن کے اصحاب یا ان کے بعد آنے والوں کے ذریعے تالیف ہُوا ہے۔ ان کتابوں کا ایک اجمالی مطالعہ اس بات کا زندہ گواہ ہے اور خود عیسائیوں اور یہودیوں کا بھی اس کے سوا اور کوئی دعویٰ نہیں ہے۔

لیکن اس کے باوجود اس میں بھی شک نہیں ہے کہ مُوسیٰؑ و عیسیٰؑ کی تعلیمات اور کتبِ آسمانی کے مضامین و مطالب کا کچھ حصّہ ان کے پیروکاروں کے کلام کے ضمن میں منتقل ہو گیا ہے۔ اسی بنا پر جو کچھ عہدِ قدیم (توراۃ اور اس سے وابستہ کتابوں) اور عہدِ جدید (انجیل اور اس سے وابستہ کتابوں) میں آیا ہے، نہ تو اس سارے کے سارے کو قبول ہی کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی وہ سب کا سب قابلِ انکار ہے۔ بلکہ یہ دونوں کتابیں ان دو عظیم پیغمبروں کی تعلیمات اور دُوسرے لوگوں کے افکار و تصوّرات سے وجُود میں آئی ہیں۔

بہرحال موجودہ کتب میں بہت سی ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں جو ایک عظیم ظہور کی بشارت دیتی ہیں کہ جس کی نشانیاں سوائے اسلام اور اس کے لانے والے کے اور کسی پر منطبق نہیں ہوتیں۔

قابلِ توجّہ بات یہ ہے کہ وہ پیشگوئیاں جو ان کتابوں میں نظر آتی اور پیغمبرِ اسلام کی ذات پر صادق آتی ہیں، ان کے علاوہ انجیل 'یوحنا' کے تین موارد میں لفظ 'فارقلیط' آیا ہے۔[1] اِس کا فارسی نسخوں میں "تسلّی دینے والا" کے ساتھ ترجمہ ہُوا ہے۔ اب آپ انجیل یوحنا کی طرف رجوع کریں :

"میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دُوسرا "تسلّی دینے والا" دے گا جو ابد تک تمھارے ساتھ رہے گا۔"[2]

بعد والے باب میں آیا ہے :

"اور جب وہ "تسلّی دینے والا" آئے گا جسے میں باپ کی طرف سے تمھاری طرف بھیجوں گا، یعنی سچائی کی رُوح جو باپ کی طرف سے آئے گی' وہ میرے بارے میں شہادت دے گی۔"[3]

پھر اس کے بعد والے باب میں آیا ہے :

لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لیے مُفید ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ "تسلّی دینے

---

[1] یہ تفسیر عربی انجیل چاپ لندن مطبع ولیم وٹس سال ۱۸۵۷ء میں آئی ہے۔

[2] انجیل یوحنا باب ۱۵ جملہ ۲۶

[3] انجیل یُوحنا باب ۱۶ جملہ ۷

والا" تمھارے پاس نہیں آئے گا، لیکن اگر میں چلا جاؤں تو اُسے تمھارے پاس بھیج دوں گا۔[1]

اہم بات یہ ہے کہ سریانی اناجیل کے متن میں جو اصل یونانی سے لی گئی ہیں "تسلّی دینے والے" کے بجائے "پارقلیطا" آیا ہے۔ اور یونانی متن میں "پیرکلتوس" آیا ہے کہ جو یونانی لغت کے لحاظ سے "لائق تعریف شخص" کے معنی میں ہے جو "محمدؐ" و "احمدؐ" کا معادل ہے۔

لیکن جب اربابِ کلیسا (عیسائی پادریوں) نے یہ دیکھا کہ اس قسم کے ترجمہ کی نشر و اشاعت اُن کے گھڑے ہوئے نظریات پر ضربِ شدید لگائے گی تو "پیرکلتوس" کی بجائے "پاراکلتوس" لکھ دیا کہ جو "تسلّی دینے والے" کے معنٰی میں ہے۔ اس واضح تحریف کے ذریعے انھوں نے اس زندہ سند کو بدل کر رکھ دیا۔ اگرچہ اس تحریف کے باوجود بھی مستقبل کے عظیم ظہور کی ایک واضح بشارت موجود ہے۔[2]

ایک مشہور عیسائی پادری جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا، (فخر الاسلام مؤلف کتاب معروف انیس الاعلام) کی ناطق گواہی "فارقلیطا" کی تفسیر میں اُس کے عظیم اُستاد کے حوالے سے ہم تفسیرِ نمونہ کی جلد اوّل میں نقل کر چکے ہیں۔ وہ اس بات کو واضح کرتی ہے کہ یہ بشارتیں "احمدؐ" اور "محمدؐ" نامی شخص کے بارے میں تھیں۔[3]

یہاں ہم آپ کو اس لفظ کے اس ترجمہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں جو اس سلسلہ میں دائرۃ المعارف بزرگ نے فرانسہ میں کیا ہے:
محمدؐ موسّس دینِ اسلام، خدا کا بھیجا ہوا اور خاتم انبیاء ہے۔ لفظ محمدؐ بہت زیادہ تعریف کیے گئے کے معنی میں ہے اور مادہ حمد سے مشتق ہوا ہے جو تجلیل وتمجید کے معنی میں ہے۔ عجب اتفاق کے زیر اثر ایک اور نام ذکر ہوا کہ اس کا مادہ بھی حمد ہی ہے۔ اور لفظ محمدؐ کا مترادف اور ہم معنی ہے، یعنی احمد۔ یہاں احتمال قوی یہ ہے کہ عرب کے عیسائی اس لفظ کو فارقلیط کے بجائے استعمال کرتے تھے۔ احمد یعنی زیادہ تعریف کیا ہوا اور لفظ پیرکلتوس کا بہت عمدہ ترجمہ ہے کہ جس کی بجائے غلطی سے لفظ "پارہ کلتوس" رکھ دیا گیا ہے۔ مسلمان مذہبی مولفین نے یہ بارہا گوشزد کیا ہے کہ اس لفظ سے مراد پیغمبرِ اسلام کے ظہور کی بشارت ہے اور قرآن مجید بھی سورۃ صفّ کی حیرت انگیز آیت میں اِس موضوع کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتا ہے۔[4]

خلاصہ یہ ہے کہ "فارقلیطا" کا معنی رُوح القدس یا تسلّی دینے والا نہیں ہے، بلکہ یہ "احمدؐ" کے معادل مفہوم رکھتا ہے۔ (غور کیجئے)

۳: کیا پیغمبرِ اسلام کا نام احمدؐ ہے؟

یہاں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ کا مشہور نام محمدؐ ہے، جبکہ زیرِ بحث آیت میں 'احمدؐ' کے عنوان سے

---

[1] انجیل یوحنا باب ۱۶ جملہ ۷ [2] "الفرقان فی تفسیر القرآن" جلد ۲۷، ۲۸ ص ۳۰۶، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں وہاں اوپر والے جملوں کے متن کے ساتھ واضح طور پر سریانی متن بھی آیا ہے۔

[3] تفسیر نمونہ جلد اوّل سورۂ بقرۃ آیت ۴۱ کے ذیل میں۔

[4] دائرۃ المعارف بزرگ فرانسہ جلد ۲۳ ص ۴۱۷۶

سے ذکر ہوا ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک دُوسرے سے کس طرح سازگار ہیں۔

اس سوال کے جواب میں ضروری ہے کہ ذیل کے نکات کی طرف توجہ کی جائے۔ :

الف تواریخ میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ بچپن سے ہی دو نام رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ لوگ بھی آپ کو دونوں ہی ناموں سے خطاب کیا کرتے تھے۔ آپ کا ایک نام "محمدؐ" اور دوسرا "احمدؐ" تھا۔ پہلا نام آپ کے جدّ امجد عبدالمطلب نے اور دوسرا نام آپ کی والدہ محترمہ جناب آمنہ نے انتخاب کیا تھا۔

یہ مضمون سیرۃ حلبیہ میں تفصیل کے ساتھ ذکر ہوا ہے :

ب جن لوگوں نے پیغمبر اسلامؐ کو بارہا اس نام کے ساتھ یاد کیا ہے ان میں سے ایک آپ کے چچا ابو طالب تھے۔ آج بھی وہ کتاب جو دیوانِ ابوطالب کے نام سے ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے اس میں بہت سے ایسے اشعار نظر آتے ہیں کہ جن میں پیغمبر گرامیؐ کو 'احمدؐ' کے نام سے یاد کیا گیا ہے، مثلاً :

ارادوا قتل احمد ظالموهم

ولیس بقتلهم فیهم زعیم

ان کے اوپر ظلم کرنے والے احمدؐ کے قتل کا ارادہ رکھتے تھے۔

لیکن اس کام کے لیے کوئی رہبر انھیں نہیں مل سکا۔

وان کان احمد قد جائهم

بحق ولم یأتهم بالکذب

احمدؐ قطعی طور پر ایک دینِ حق لے کر ان کے پاس آیا ہے اور،

وہ ہرگز جھوٹا دین لے کر نہیں آیا۔ [1]

دیوانِ ابوطالب کے علاوہ بھی جناب ابوطالب کے کچھ اشعار اس سلسلے میں نقل ہوئے ہیں :

لقد اکرم الله النبی محمدا

فاکرم خلق الله فی الناس احمد

خدا نے اپنے پیغمبر محمدؐ کو مکرّم و محترم قرار دیا ہے۔ اسی لیے لوگوں کے نزدیک مخلوقِ خدا میں سب سے زیادہ گرامی احمدؐ ہے۔ [2]

ج پیغمبرؐ کے ہمعصر مشہور شاعر "حسان بن ثابت" کے اشعار میں بھی یہ تعبیر نظر آتی ہے :

مفجعة قد شفها فقد احمد

فظلت لالاء الرسول تعدد

---

[1] دیوانِ ابوطالب ص ۲۵، ۲۹ [2] تاریخ ابن عساکر جلد ۱ ص ۲۷۵

وہ مصیبت زدہ جسے احمدؐ کے فقدان نے کمزور کر دیا تھا۔ وہ ہمیشہ
رسول خدا کے عطایا و مواہب کو شمار کیا کرتا تھا۔[1]

ابوطالب یا ان کے علاوہ دوسرے افراد کے وہ اشعار جن میں (محمدؐ کے بجائے) احمدؐ کا نام آیا ہے اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کو یہاں نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم اس بحث کو دو اور عمدہ اشعار کے ساتھ ختم کرتے ہیں جو ابوطالب کے فرزند علیؑ نے کہے ہیں:۔

إتأمرني بالصبر في نصر احمد
و واللہ ما قلت الذی قلت جازعًا
ساسعی لوجہ اللہ فی نصر احمد
نبی الھدی المحمود طفلا و یافعًا

کیا تو مجھ سے یہ کہتا ہے کہ میں احمدؐ کی مدد اور نصرت میں صبر سے کام لوں۔
خدا کی قسم! میں نے جو کچھ کہا ہے وہ جزع و فزع اور بے صبری کی بناء پر نہیں کہا۔
میں تو خدا کے لیے احمدؐ کی نصرت میں کوشش کرتا ہوں۔
وہی پیغمبر ہدایت جو بچپن اور جوانی میں ہمیشہ محمود اور قابلِ تعریف تھا۔[2]

د جو روایات مسئلۂ معراج کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں ان میں یہ کثرت سے آیا ہے کہ خدا نے پیغمبر اسلام کو شب معراج بارہا "احمدؐ" کے نام سے خطاب کیا۔ شاید اسی وجہ سے یہ مشہور ہو گیا ہے کہ آنحضرتؐ کا نام آسمانوں میں احمدؐ اور زمین میں مُحمّد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھے۔

ایک حدیث میں امام محمدؐ باقرؑ سے بھی آیا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے دس نام تھے۔ ان میں سے پانچ نام قرآن میں آئے ہیں۔ "محمّد" و "احمد" و "عبداللہ" و "یٰس" و "ن"۔[3]

ھ جب پیغمبرؐ نے (سورۂ صف) کی اوپر والی آیات کو مدینہ اور مکّہ کے لوگوں کے سامنے پڑھا تو یقینی طور پر یہ اہلِ کتاب کے کانوں تک بھی پہنچیں۔ مگر مشرکین اور اہلِ کتاب میں سے کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ انجیل تو احمدؐ

---

[1] دیوان حسان بن ثابت ص ۵۹ تحقیق محمد عزت نصراللہ

[2] 'الغدیر' جلد ۷ ص ۳۵۸

[3] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۱۳ - تفسیر در المنثور جلد ۶ ص ۱۴ میں بھی اس سلسلے میں کئی روایات آئی ہیں کہ جن کے نقل کرنے سے طول ہو جائے گا۔

کے آنے کی بشارت دیتی ہے اور تمھارا نام محمدؐ ہے۔ یہ سکوت خود اس ماحول میں اِس نام کی شہرت کی دلیل ہے۔ اگر کوئی اعتراض ہوا ہوتا تو وہ ہمارے لیے بھی نقل ہوتا، کیونکہ دشمنوں کے اعتراضات تاریخ میں ثبت ہیں یہاں تک کہ ایسے موارد میں بھی جو بہت چبھنے والے ہیں۔

اس تمام بحث سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "احمدؐ" پیغمبرِ اسلامؐ کے مشہور ناموں میں سے تھا۔[1]

۞ ۞ ۞

---

[1] اس بحث اور گزشتہ بحث میں کتاب "احمد موعودِ انجیل" اور "تفسیر فرقان" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

(۷) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ
يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝
(۸) يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ
وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝
(۹) هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ
عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

ترجمہ

(۷) اُس شخص سے بڑھ کر اور کون ظالم ہو گا جو خدا پر جھوٹ باندھے (اور تکذیب کرے) حالانکہ اُسے اِسلام کی دعوت دی جا رہی ہے، اور خُدا ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

(۸) وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ خُدا کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں لیکن خدا اپنے نُور کو مکمّل کرکے رہے گا، چاہے کافروں کو پسند نہ آئے۔

(۹) وہی تو ہے کہ جس نے اپنے رسُول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے چاہے مشرکوں کو بُرا ہی لگے۔

تفسیر

وہ نورِ خدا کو اپنی پھونکوں سے خاموش کرنا چاہتے ہیں

گزشتہ آیات میں بیان ہُوا تھا کہ مخالف اور ہٹ دھرم گروہ، پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں گزشتہ پیغمبر حضرت عیسیٰؑ

کی بشارت کے باوجود اور پیغمبر اسلامؐ کی دعوت کے "بیّنات"، واضح دلائل اور معجزات کے ساتھ قوی ہونے کے باوجود کس طرح مقابلہ اور انکار کے لیے کھڑا ہو گیا۔ زیرِ بحث آیات میں اُن لوگوں کے انجام کار اور ان کی سرنوشت کی تشریح کرتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو خدا پر جھوٹ باندھے۔ حالانکہ اُسے اِسلام کی دعوت دی جا رہی ہے" (ومن اظلم ممن افترٰی علی اللّٰہ الکذب و ھو یدعٰی الی الاسلام)۔

ہاں! ایسا آدمی جو پیغمبر اسلامؐ کی دعوت کو جھوٹ، ان کے معجزات کو جادو اور ان کے دین کو باطل شمار کرے، وہ سب سے بڑھ کر ظالم ہے۔ کیونکہ وہ راہِ نجات و ہدایت کو اپنے لیے اور دیگر بندگانِ خدا کے لیے بھی روک دیتا ہے اور انھیں اس خدائی سرچشمۂ فیض سے محروم کر دیتا ہے، جو ان کی سعادتِ ابدی کا ضامن ہے۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "خدا ستمگر قوم کو ہدایت نہیں کرتا" (و اللّٰہ لا یھدی القوم الظّالمین)۔

خدا کا کام ہدایت کرنا ہے، اور اس کی ذاتِ پاک نور اور معنوی روشنی ہے۔ "اللّٰہ نور السماوات والارض" لیکن ہدایت کے لیے استعداد کی ضرورت ہے اور یہ استعداد ان لوگوں میں موجود نہیں ہوتی جو حقیقت کے دشمن ہوتے ہیں۔

یہ آیت ایک مرتبہ پھر اس حقیقت پر زور دیتی ہے کہ ہدایت و ضلالت خدا کی طرف سے ہے، لیکن اس کے مقدمات خود انسان کی طرف سے شروع ہوتے ہیں، اور اسی بناء پر اس میں ہرگز جبر لازم نہیں آتا۔

"و ھو یدعٰی الی الاسلام" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبرؐ کی دعوت انسانوں کی دُنیا و آخرت کی سلامتی اور نجات کی ضامن ہے۔ اس حالت میں انسان کیسے اپنی سعادت کی جڑ کاٹتا ہے؟

"من اظلم" (کون سب سے بڑھ کر ظالم ہے) کی تعبیر قرآن میں پندرہ مرتبہ دُہرائی گئی ہے اور ان میں سے زیرِ بحث آیت آخری ہے۔ اگرچہ ان کے موارد ظاہری طور پر مختلف ہیں اور ممکن ہے اسی بات سے یہ سوال پیدا ہو کہ کیا ظالم ترین لوگ ایک گروہ سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں؟ لیکن ان آیات میں غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سب کی بازگشت آیاتِ الٰہی کی تکذیب اور لوگوں کو راہِ حق سے روکنے پر ہے۔ اور واقعی اس سے بڑھ کر کوئی اور ظلم نہیں ہے کہ لوگوں کو اس قسم کے راستے تک پہنچنے سے باز رکھیں جو ان کے تمام کاموں میں کامیابی کی راہ ہے۔

❊ ❊ ❊

اِس کے بعد یہ بتلانے کے لیے کہ دشمنانِ حق اس کے دین کو ختم کرنے پر قادر نہیں ہیں ایک عمدہ تشبیہ کے ضمن میں فرماتا ہے: "وہ یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں، لیکن خدا اپنے نور کو کامل کر کے رہے گا، چاہے یہ بات کافروں کو پسند نہ آئے" (یریدون لیطفئوا نور اللّٰہ بافواھھم واللّٰہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون)۔

وہ اس شخص کی مانند ہیں جو آفتاب عالمتاب کے نور کو پھونک مار کر بجھانا چاہتا ہو۔ وہ ایسی چمگادڑیں ہیں جو یہ گمان کرتی ہیں کہ اگر وہ سورج کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور خود کو رات کی تاریکی کے پردوں میں چھپا لیں تو اِس سے

وہ چشمۂ نُور کے مُقابلہ میں کھڑی ہو سکتی ہیں۔

تاریخ اِسلام قرآن کی اس عظیم پیشین گوئی کے پُورا ہونے کی ایک زندہ سند ہے، کیونکہ ظہورِ اسلام کے پہلے دن سے ہی اس کی نابودی کے لیے سازشیں اور منصُوبے بنائے جاتے رہے ہیں:

کبھی دشمنوں کے تمسخر اور ایذاء و آزار کے ذریعے۔

کبھی اقتصادی و اجتماعی مقاطعہ کے ذریعے۔

کبھی اُحد و احزاب و حُنین وغیرہ کے میدانوں میں مختلف جنگوں میں اُلجھانے کے ذریعے۔

کبھی منافقوں کی اندرونی سازشوں کے ذریعے۔

کبھی مسلمانوں کی صفوں میں اختلاف پیدا کرنے کے ذریعے۔

کبھی صلیبی جنگوں کے ذریعے۔

کبھی عظیم اسلامی سلطنت کو چالیس سے زیادہ ملکوں میں تقسیم کرنے کے ذریعے۔

کبھی مذہبی قوانین کو بدل کر اور مُسلمان جوانوں کو اُن کی پُرانی تہذیب و تمدن سے دُور کرنے کے ذریعے۔

کبھی جوانوں میں فحشاء و منکر، فساد اخلاق اور انحرافِ عقیدہ کے وسائل کی نشر و اشاعت کے ذریعے۔

کبھی فوجی، سیاسی اور اقتصادی تسلّط کے ذریعے۔

اور کبھی دُوسرے طریقوں سے اِسلام کو نابُود کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔

لیکن جس طرح خُدا نے ارادہ کیا تھا، یہ نورِ الٰہی روز بروز پھیل رہا ہے اور ہر زمانے میں اِسلام کا دامن پہلے سے وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اعداد و شمار بتلاتے ہیں کہ مسلمانوں کی جمعیت، صیہونیوں، صلیبیوں اور مشرق کے مادیین کی مشترکہ کوششوں کے باوجود بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ہاں! وہ ہمیشہ سے چاہتے تو یہی ہیں کہ خدا کے اس نور کو بجھا دیں، لیکن خدا کا ارادہ کچھ اور ہے۔ اور یہ قرآن کا ایک ابدی اور جاودانی معجزہ ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ مضمون قرآن مجید کی آیات میں دو مرتبہ آیا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ ایک مقام پر تو "یریدون ان یطفئوا" آیا ہے۔ (توبہ - ۳۲) لیکن یہاں "یریدون لیطفئوا" ہے۔

راغب "مُفردات" میں اِس اختلاف اور فرق کی وضاحت کرتے ہُوئے کہتا ہے کہ پہلی آیت میں تو مقدمہ کے بغیر خاموش کرنے کی طرف اشارہ ہے، لیکن دوسری آیت میں مقدمات کے ذریعے بجھانے کی طرف اشارہ ہے۔

یعنی چاہے وہ مقدمات فراہم کریں یا نہ کریں نورِ خدا کو خاموش کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔

⁂ ⁂ ⁂

آخری زیرِ بحث آیت میں مزید تاکید کے لیے صراحت کرتے ہُوئے کہتا ہے: "وہی ہے کہ جس نے اپنے رسُول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ وہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے، چاہے مشرکین کو بُرا ہی لگے" (ھو الذی ارسل رسولہ بالھدٰی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون)۔

"ارسل رسوله بالهدیٰ و دین الحق" کی تعبیر اسلام کی کامیابی اور غلبہ کی رمز کے بیان کے طور پر ہے کیونکہ یہ غلبہ اور کامیابی 'ہدایت' اور 'دینِ حق' کی طبیعت میں رکھی ہوئی ہے۔ اسلام اور قرآن نورِ الٰہی ہیں، اور جہاں کہیں بھی نور ہو وہ اپنے آثار اور نشانیاں دکھا کر رہتا ہے اور یہ کامیابی کا سبب ہے۔ کافروں اور مشرکوں کی ناپسندیدگی اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتی۔

ایک خاص بات ہے کہ یہ آیت بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ قرآن مجید میں تین مرتبہ آئی ہے۔ یعنی سُورۂ توبہ (آیت ۳۳) سورۂ فتح (آیت ۲۸) اور اسی سُورۂ صف میں بھی ہے۔

لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ تکرار اور تاکید اس زمانہ میں تھی جب اسلام دنیا کے دیگر خطوں میں تو کیا ابھی جزیرہ عرب میں بھی اچھی طرح نہیں پھیلا تھا۔ لیکن قرآن نے اسی وقت تاکید کے ساتھ اس مسئلہ کو پیش کیا اور آئندہ کے واقعات نے اس عظیم پیشین گوئی کی صداقت کو سچ کر دکھایا اور انجام کار اسلام عقل و منطق اور عملی پیش رفت کے لحاظ سے بھی دُوسرے ادیان و مذاہب پر غالب آگیا۔ اُس نے دشمنوں کو دُنیا کے وسیع حصّوں سے پیچھے دھکیل کر ان کی جگہ لے لی اور اس وقت بھی بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

لیکن اس پیش رفت کا اصلی مرحلہ ہمارے عقیدہ کے مطابق حضرت امام مہدیؑ ارواحنا فداہ کے ظہُور کے ساتھ پُورا ہو گا اور یہ آیات بھی خود اس عظیم ظہُور کی ایک دلیل ہیں۔

اِس آیت کے مضمون کے بارے میں کہ اِس سے مُراد منطقی غلبہ ہے یا غلبۂ قدرت اور اس کا ربط حضرت امام مہدیؑ کے ظہُور کے ساتھ کس طرح ہے ہم نے سورۃ توبہ کی آیت ۳۳ کے ذیل میں ضروری بحث کی ہے۔[1]

٭ ٭ ٭

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۴ سورۃ توبہ آیت ۳۳ کی طرف رجوع کریں۔

(۱۰) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ
تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ○

(۱۱) تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ
اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۙ○

(۱۲) یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَیُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ
عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۙ○

(۱۳) وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ؕ
وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ○

ترجمہ

(۱۰) اے ایمان لانے والو! کیا میں تمھیں ایسی تجارت کی طرف رہبری نہ کروں جو تمھیں دردناک عذاب سے رہائی بخشے۔

(۱۱) خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آؤ اور خدا کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرو۔ یہ تمھارے لیے ہر چیز سے بہتر ہے اگر تم جانو۔

(۱۲) اگر تم یہ کام کروگے تو خدا تمھارے گناہوں کو بخش دے گا اور تمھیں اس جنّت کے باغوں

ہیں داخل کرے گا جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور بہشت جاوداں کے مساکن میں تمھیں جگہ دے گا، اور یہ ایک عظیم کامیابی ہے۔

(۱۳) اور ایک دوسری نعمت تمھیں بخشے گا جسے تم دوست رکھتے ہو۔ اور خدا کی نصرت اور فتح قریب ہے اور مومنین کو بشارت دے دے۔

تفسیر

سود مند اور بے نظیر تجارت

جیسا کہ ہم اس سورۃ کے آغاز میں بیان کر چکے ہیں اِس آیت کے اہم مقاصد میں سے ایک ایمان اور جہاد کی دعوت ہے۔ زیرِ بحث آیات میں بھی انہی دونوں باتوں کی تاکید ایک ایسی لطیف مثال سے کی گئی ہے جو انسان کے دل و جان میں حرکتِ الٰہی کے جذبے کو وجود میں لاتی ہے۔ وہ جذبہ جو تمام دینوں پر دینِ اسلام کے غلبے کی شرط ہے۔ اِس کی طرف گزشتہ آیات میں بھی اشارہ ہوا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "اے ایمان لانے والو! کیا میں تمھیں ایسی تجارت کی طرف رہبری نہ کروں جو تمھیں دردناک عذاب سے نجات دے؟" (یاایھا الذین اٰمنوا ھل ادلکم علٰی تجارۃ تنجیکم من عذاب الیم)۔

اس کے باوجود کہ "ایمان" اور "جہاد" یقینی اور قطعی واجبات میں سے ہیں مگر یہاں انھیں حکم کی صورت میں نہیں بلکہ تجارت کی پیش کش کی صورت میں بیان کرتا ہے، وہ بھی ایسی تعبیروں کے ساتھ جو خدا کے بے پایاں لطف و کرم کی حکایت بیان کرتی ہیں۔

اِس میں شک نہیں کہ "عذابِ الیم سے نجات" انسان کی اہم ترین خواہشات میں سے ایک ہے۔ اِس لیے یہ سوال کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تمھیں ایسی تجارت کی طرف رہنمائی کروں جو تمھیں عذابِ الیم سے رہائی بخشے، سب کے لیے جالبِ توجہ ہے۔

جب اس سوال کے ساتھ دلوں کو اپنی طرف جذب کر لیا تو ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس سود مند تجارت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور وہ یہ ہے کہ تم خدا اور اُس کے رسول پر ایمان لے آؤ اور خدا کی راہ

میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرو۔" (تؤمنون باللہ و رسولہ و تجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم)۔ [1]

اِس میں شک نہیں کہ خدا کو اس سُود مند تجارت کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کے نفع کا کلی تعلق صرف مومنین کے ساتھ ہے، اِسی لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "یہ تمھارے لیے ہر چیز سے بہتر ہے، اگر تم جانو" (ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یاایھا الذین اٰمنوا کے قرینہ سے مخاطب مومنین ہیں اور عین اس حالت میں انھیں "ایمان" اور "جہاد" کی دعوت دیتا ہے۔ ممکن ہے یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ سطحی اور نام کا ایمان کافی نہیں، گہرے اور خالص ایمان کی ضرورت ہے کہ جو ایثار، فداکاری اور جہاد کا سرچشمہ بن سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خدا اور رسُولؐ پر ایمان کا ذکر یہاں اس ایمان کی تشریح ہو جو گزشتہ آیت میں اجمالی طور پر آیا ہے۔

بہرحال پیغمبرؐ پر ایمان، خُدا پر ایمان سے الگ نہیں ہے، جیسا کہ جان کے ساتھ جہاد، مال کے ساتھ جہاد سے جُدا نہیں ہو سکتا، کیونکہ تمام جنگیں [illegible] امکانات کی محتاج ہوتی ہیں جنھیں مالی امدادوں کے ذریعے پورا کیا جانا چاہیے۔ بعض لوگ دونوں طرح کے جہادوں پر قادر ہوتے ہیں اور بعض صرف میدانِ جنگ سے پیچھے رہ کر مالی جہاد پر ہی قدرت رکھتے ہیں۔ اِسی طرح بعض لوگ صرف جان ہی پیش کر سکتے ہیں اور اسے قربان کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔

بہرحال دونوں قسم کے جہادوں کو ہر صورت میں ایک دُوسرے سے توام ہونا چاہیے تاکہ کامیابی حاصل ہو۔ اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مالی جہاد کو مقدّم رکھا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ جانی جہاد سے زیادہ اہم ہے۔ بلکہ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ اس کا مقدمہ شمار ہوتا ہے، کیونکہ جہاد کے آلات و اسلحہ مالی امدادوں کے ذریعے ہی فراہم ہوتے ہیں۔

یہاں تک اس عظیم اور بے نظیر تجارت کے تین ارکان مشخص ہُوئے ہیں: "خریدار" خُدا ہے۔ "بیچنے والے" صاحب ایمان لوگ ہیں، اور "متاع" ان کی جانیں اور مال ہیں۔ اب چوتھے رُکن کی نوبت آتی ہے جو اس بڑے سودے کی قیمت ہے۔

فرماتا ہے: "جب تم ایسا کرو گے تو خُدا تمھارے گناہ بخش دے گا اور تمھیں جنّت کے باغوں میں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور بہشت جاودانی کے پاکیزہ مسکنوں میں جگہ دے گا۔ اور یہ ایک عظیم کامیابی ہے"۔ (یغفر لکم ذنوبکم و یدخلکم جنّات تجری من تحتھا الانھار و مساکن طیبۃ فی جنّات عدن ذالک الفوز العظیم)۔ [2]

---

[1] تؤمنون باللہ کا جُملہ "جملہ استینافیہ" ہے جو تجارت کی تفسیر کرتا ہے اور بعض نے اسے عطفِ بیان سمجھا ہے۔ یہاں یہ "جملہ خبریہ" بمعنی 'امر' کی صورت میں ہے۔

[2] یغفر لکم کا جُملہ ایک محذوف "شرط" کی "جزاء" کے طور پر آیا ہے کہ جس کا سابقہ جُملہ سے استفادہ ہوتا ہے۔ تقدیر میں اس طرح ہے۔ ان تؤمنوا باللہ و

(باقی اگلے صفحہ پر)

اُخروی اجر کے مرحلہ میں پہلے گناہوں کی بخشش کی بات کرتا ہے۔ کیونکہ انسان کو زیادہ تر فکر و پریشانی اپنے گناہوں سے ہوتی ہے۔ جب مغفرت اور بخشش یقینی ہو جائے تو پھر فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ تعبیر بتلاتی ہے کہ اس کی راہ میں شہید ہونے والوں کے لیے پہلا ہدیۂ خداوندی یہ ہے کہ وہ اُن کے گناہوں کو بخش دیتا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ کیا یہ صرف "حقِ خدا" کے بارے میں ہے یا "حق الناس" کو بھی شامل ہے؟ تو آیت کا مُطلق ہونا عمومیّت کی دلیل ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجّہ کرتے ہُوئے کہ خدا نے حق الناس خود انھیں کے سپرد کیے ہُوئے ہیں، لہٰذا بعض نے اس کی عمومیّت میں شک کیا ہے۔

اِس طرح سے اوپر والی آیات میں دو شاخیں تو ایمان کی ہیں، (خدا اور رسولؐ پر ایمان) اور دو شاخیں جہاد کی ہیں (مال اور جان کے ساتھ جہاد) اور دو شاخیں اُخروی جزاؤں کی ہیں، (گناہوں کی بخشش اور بہشت جاودان میں دخول) اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے بعد والی آیت میں دنیا میں مواہب الٰہی کی بھی دو شاخیں آئی ہیں۔

٭ ٭ ٭

جہاں فرماتا ہے: "اور دوسری وہ نعمت تمھیں عنایت کرے گا جسے تم دوست رکھتے ہو اور تمھیں جس سے بہت لگاؤ ہے اور وہ خدا کی مدد و نصرت اور نزدیک کی فتح ہے۔" (و اخرٰی تحبونها نصر من الله وفتح قريب)۔ [1]

کتنی سُود مند اور برکت والی تجارت ہے جو سراسر فتح و کامیابی اور نعمت و رحمت ہے اور اسی وجہ سے اس کو فوز عظیم اور بہت بڑی کامیابی قرار دیا ہے۔

اِسی وجہ سے بعد میں مومنین کو اس عظیم تجارت کے بارے میں مُبارکباد کے ساتھ بشارت دیتا اور مزید کہتا ہے:

"اور مومنین کو بشارت دے دو۔" (وبشر المؤمنين)۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب لیلة عقبة (جس رات پیغمبرؐ نے مکّہ کے قریب مدینہ کے کچھ لوگوں سے مخفی طور پر مُلاقات کی اور ان سے بیعت لی) رسول اللہؐ اور مدینہ کے مسلمانوں کے درمیان عہد و پیمان ہُوا تو عبداللہ بن رواحہ نے عرض کیا: "اس پیمان کے ضمن میں آپ اپنے لیے اور اپنے پروردگار کے لیے جو شرط چاہیں رکھ لیں۔"

پیغمبرؐ نے فرمایا: "میرے پروردگار کے لیے تو یہ شرط ہے کہ کسی طرح بھی کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہیں دو گے اور میرے لیے یہ شرط ہے کہ جس طرح تم اپنی جان و مال کا دفاع کرتے ہو اسی طرح میرا بھی دفاع کرو گے۔"

عبداللہ نے کہا: "اس کے مقابلے میں ہمیں کیا دیا جائے گا؟"

پیغمبرؐ نے فرمایا: بہشت!

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) رسوله وتجاهدوا في سبيله ... يغفر لكم ذنوبكم" یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہ "امر" کا جواب ہو کہ جو تؤمنون اور تجاهدون کے جملہ خبریہ سے معلوم ہوتا ہے۔

[1] "اخرٰی" ایک محذوف موصوف کی صفت ہے۔ مثلاً نعمت یا خصلت، لبعض نے یہ بھی کہا ہے کہ موصوف "تجارت" ہے لیکن یہ بعید نظر آتا ہے۔

عبداللہ نے کہا: ربح البیع لا نقبل ولا نستقبل ـ "کتنا سودمند اور نفع بخش مُعاملہ ہے؟ نہ تو ہم اس مُعاملے سے خود پھریں گے اور نہ ہم اس مُعاملہ سے پھر جانے کو قبول کریں گے (نہ تو فسخ کریں گے اور نہ ہی فسخ کو قبول کریں گے۔)" ؎

چند نکات

۱: فتح قریب کون سی ہے؟

ان آیات میں جس فتح کا وعدہ کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کو منطقی پہلوؤں میں اور جنگ کے میدانوں میں بھی بارہا حاصل ہُوئی ہے۔

لیکن اس بارے میں کہ "فتح قریب" سے مُراد کون سی فتح ہے؟ مفسّرین نے کئی احتمال دیئے ہیں، اور بہت سے مفسّرین نے تو اس کی 'فتح مکّہ' کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ بعض نے ایران و روم کے شہروں کی فتح اور بعض نے تمام اسلامی فتوحات سے تعبیر کیا ہے جو مسلمانوں کے ایمان وجہاد کے بعد تھوڑے سے عرصے میں ہی حاصل ہوگئیں۔

چونکہ مخاطب صرف پیغمبرؐ کے اصحاب و انصار ہی نہیں، بلکہ طول تاریخ کے تمام مومنین اس خطاب کے مخاطب ہیں، لہٰذا "نصر من اللہ وفتح قریب" کا جملہ، ایک وسیع وعریض معنی رکھتا ہے اور یہ ان سب کے لیے ایک بشارت ہے، اگرچہ پیغمبرؐ کے زمانے میں اور ان آیات کے نزول کے وقت، اس کا واضح مصداق فتح مکّہ ہی تھا۔

⁂ ⁂ ⁂

۲: مساکن طیّبہ کیا ہیں؟

جنّت کی نعمتوں میں سے یہاں خصوصیّت کے ساتھ پاکیزہ اور شاندار مساکن کا ذکر ہُوا ہے۔ جو جنّت کے ابدی اور جاودانی باغات میں ہوں گے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ انسان کے آسائش و آرام کے بنیادی شرائط میں سے ایک یہی مسکن کا مسئلہ ہے وہ بھی ایسا پاک و پاکیزہ مسکن، جو ہر قسم کی ظاہری و باطنی آلودگی سے پاک ہو کہ جس میں انسان راحت و آرام کے ساتھ رہ سکے۔

راغب "مفردات" میں کہتا ہے: طیّب کا معنی اصل میں ایک ایسی چیز ہے جس سے ظاہری اور باطنی حواس لذّت حاصل کریں۔ یہ ایک جامع معنی ہے جو ایک مسکن کے تمام مناسب شرائط کو اپنے اندر

؎ "فی ظلال" جلد ۸ ص ۸۷

لیے ہوئے ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن میں تین چیزیں آرام وسکون کا سبب شمار کی گئی ہیں :

رات کی تاریکی وجعل اللیل سکنًا (انعام-۹۶)

سکونت کے لیے گھر واللہ جعل لکم من بیوتکم سکنًا (نحل - ۸۰)

محبت کرنے والی بیویاں ومن اٰیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجًا لتسکنوا الیھا (روم - ۲۱)

۳ : دنیا اولیاء خدا کا تجارت خانہ ہے

نہج البلاغۃ میں آیا ہے کہ امام علیؑ نے ایک ایسے دعویٰ کرنے والے شخص سے، جو اصطلاح کے مطابق "جانماز آب می کشید" (جائے نماز کو بھی غسل دیتا تھا) اور مسلسل دُنیا کی مذمت کیا کرتا تھا، فرمایا: تجھے غلطی لگی ہے، دُنیا ان لوگوں کے لیے جو بیدار و آگاہ ہیں، بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اس کے بعد آپ نے تشریح بیان فرمائی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ دُنیا "متجر اولیاء اللہ" دوستانِ خدا کا تجارتخانہ ہے[۱]

اِس بناء پر اگر ایک جگہ دُنیا کو "مزرعۂ اخرت" سے تشبیہ دی گئی ہے تو یہاں اسے تجارت خانہ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ انسان نے جو سرمایے خُدا سے لیے ہیں، انھیں گراں ترین قیمت میں خود اسی کے ہاتھ بیچ دے اور ناچیز وحقیر مال ومتاع کے بدلے میں اس سے عظیم ترین نعمت حاصل کرلے۔

اصولی طور پر تجارت کی تعبیر اور وہ بھی ایسی فائدہ مند تجارت، انسان کے اہم ترین محرکات کو تحریک دینے کے لیے ہے۔ وہ جلبِ منفعت اور دفع ضرر کے محرکات ہیں، کیونکہ یہ خُدائی تجارت صرف سود مند ہی نہیں بلکہ "عذاب الیم" کو بھی دفع کرتی ہے۔

اسی مطلب کی نظیر سورۃ توبہ کی آیت ۱۱۱ میں بھی آئی ہے: ان اللہ اشترٰی من المؤمنین انفسھم و اموالھم بانّ لھم الجنۃ : خدا مومنین سے ان کی جانوں اور مالوں کو خرید لیتا ہے اور اس کے بدلے میں انھیں جنّت عطا فرماتا ہے۔

ہم نے اس سلسلے میں سورۂ توبہ کی تفسیر میں بھی تشریح کی ہے۔[۲]

---

[۱] نہج البلاغۃ کلمات قصار جملہ ۱۳۱ (تلخیص کے ساتھ)۔ [۲] تفسیر نمونہ جلد ۴ (سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۱ کے ذیل میں)

(۱۴) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ
عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى
اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ
مِّنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۟

ترجمہ

(۱۴) اے ایمان لانے والو! خدا کے ناصر و مددگار ہو جاؤ، جیسا کہ عیسیٰ ابن مریمؑ نے حواریوں سے کہا تھا۔ خدا کیطرف کون میرا یاور و مددگار بنے گا؟ تو حواریوں نے جواب دیا تھا ہم خُدا کے یاور و مددگار ہیں۔ اس موقع پر بنی اسرائیل کا ایک گروہ تو ایمان لے آیا اور ایک گروہ کافر ہوگیا، ہم نے ان لوگوں کی جو ایمان لائے تھے، ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد کی، اور انجام کار وہ ان پر غالب ہوئے۔

تفسیر

حواریوں کی طرح ہو جاؤ

سُورۃ صف کی اس آخری آیت میں امر جہاد پر دوسری مرتبہ تاکید کی گئی ہے کہ جو اس سورۃ کا محور اصلی ہے۔ البتہ اس مسئلے کو ایک دُوسرے طریقہ سے بیان کیا اور بہشت اور بہشت کی نعمتوں سے بھی زیادہ ایک اہم مطلب کو بیان

کرتے ہوئے فرماتا ہے :

"اے ایمان لانے والو! خدا کے ناصر و مددگار بن جاؤ" (یاایھا الذین اٰمنوا کونوا انصار اللہ)۔

ہاں ! خُدا کے مددگار ، وہ خدا جو تمام قدرتوں اور طاقتوں کا سرچشمہ ہے اور سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔ وہ خدا جس کی قُدرت بے پایاں اور شکست ناپذیر ہے۔ تعجّب کی بات یہ ہے کہ یہاں اُس نے بندوں کو اپنی مدد کے لیے پکارا ہے۔ اور یہ ایک ایسا افتخار و اعزاز ہے کہ جس کی کوئی نظیر نہیں ہے ، اگرچہ اس کا معنیٰ و مفہوم وہی پیغمبرؐ اور اس کے دین کی مدد و نصرت ہے ، لیکن اس میں ایک عجیب لطف و رحمت موجُود ہے۔

اس کے بعد ایک تاریخی نمونہ کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ وہ یہ جان لیں کہ یہ راستہ نہ تو راہ نورد کے بغیر تھا اور نہ ہے۔ فرماتا ہے :

جیسا کہ عیسیٰ بن مریمؑ نے حواریوں سے کہا تھا : "خدا کی طرف میری مدد کرنے والا کون ہے" (کما قال عیسی ابن مریم للحواریین من انصاری الی اللہ)۔

اور حوارین نے بڑے فخر کے ساتھ جواب دیا : "ہم خُدا کے انصار ہیں" (قال الحواریون نحن انصار اللہ)۔

اور اسی راہ میں دشمنانِ خُدا کے ساتھ مبارزہ کے لیے اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ بنی اسرائیل کا ایک گروہ تو ایمان لے آیا (اور حواریوں کے ساتھ مل گیا) اور ایک گروہ کافر ہو گیا۔ (فاٰمنت طائفۃ من بنی اسرائیل وکفرت طائفۃ)۔

اِس موقع پر ہماری نصرت اور مدد ان کی کمک کے لیے آپہنچی۔ "ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان لا چکے تھے دشمنوں کے مقابلے میں تقویت دی اور انجام کار وہ غالب آگئے" (فایدنا الذین اٰمنوا علٰی عدوھم فاصبحوا ظاھرین)۔

تم بھی محمدؐ کے حواری ہو اور اس اعزاز کے ساتھ متفخر ہو کہ اللہ کے انصار ہو جاؤ ، جیسا کہ عیسیٰؑ کے حواری دشمنوں پر غالب آ گئے تھے ، تم بھی کامیاب ہو جاؤ گے۔ تمھیں اس جہان میں اور دُوسرے جہان میں بھی سربلندی اور افتخار نصیب ہو گا۔

یہ موضوع رسول اللہؐ کے انصار و اصحاب میں ہی منحصر نہیں تھا ، بلکہ ہمیشہ ہی جبکہ حق کے طرفدار اہلِ باطل کے مقابلے میں مسلسل ٹکراتے رہیں تو وہ خدا کے یاور و انصار ہیں اور انجامِ کار انھیں بھی کامیابی نصیب ہوگی۔

رگ رگ است این آب شیرین و آب شور
بر خلائق می رود تا نفخ صور!

یہ میٹھا اور کڑوا پانی خون کی رگیں ہیں۔

جو لوگوں کے اندر نفخ صور تک دوڑتا رہے گا۔

⁂ ⁂ ⁂

ایک نکتہ

حواریین کون ہیں؟

قرآن مجید میں پانچ مرتبہ عیسیٰؑ کے حواریوں کے بارے میں ذکر آیا ہے، ان میں سے دو مرتبہ تو اسی سورہ میں ہے۔ یہ تعبیر حضرت عیسیٰؑ کے مخصوص بارہ اصحاب کی طرف اشارہ ہے کہ جن کے نام موجودہ اناجیل (انجیل متی و لوقا باب ۶) میں ذکر ہوئے ہیں جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا تھا۔ یہ لفظ مادّہ "حور" سے دھونے اور سفید کرنے کے معنی میں ہے۔ چونکہ وہ پاک دل اور باصفا رُوح رکھتے تھے اور اپنی اور دوسروں کی رُوح و جان کو پاک و صاف کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس لیے اس لفظ کا ان پر اطلاق ہوا ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے ان میں سے ہر ایک کو اپنی نمائندگی کے عنوان سے دُنیا کے مختلف علاقوں کی طرف بھیجا تھا۔ وہ مخلص ایثار کرنے والے مجاہد اور مبارزہ کرنے والے افراد تھے اور انھیں حضرت عیسیٰ سے بہت عشق اور محبت تھی۔

لیکن عیسائیوں کی روایات میں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے ان میں سے ایک کہ جس کا نام "یھودای اسخریوطی" تھا، آخر کار حضرت عیسیٰ سے خیانت کی اور وہ مطرُود و مردُود قرار پایا۔

اِس سلسلے میں سورہ آل عمران کے ذیل میں بہت سی وضاحتیں پیش کی جاچکی ہیں۔ [1]

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر گرامیؐ جب عقبہ میں اہلِ مدینہ کی اُس جماعت سے ملے جو بیعت کے لیے آئی تھی تو آپ نے فرمایا:

"اپنے میں سے بارہ افراد کو منتخب کر کے ان کا مجھ سے تعارف کراؤ تاکہ وہ اپنی قوم کے نمائندے ہوں جیسا کہ حواریین کی حضرتِ عیسیٰ ابن مریمؑ سے نسبت تھی۔ [2]

یہ بات ان بزرگواروں کے مقام و مرتبہ کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

خداوندا! ہمیں توفیق دے کہ ہم اس سود مند تجارت میں شرکت کریں کہ جسے تو نے اپنے اولیاء

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۲ (سورہ آلِ عمران آیت ۵۲ کے ذیل میں)

[2] الدر المنثور جلد ۶ ص ۲۱۴

کے لیے فراہم کیا ہے، تاکہ ہم بھی اس کی عظیم برکتوں سے بہرہ مند ہوں۔

پروردگارا! اختلاف و پراگندگی نے مسلمانانِ عالم کی صفوں کو دشمنوں کے مقابلے میں متزلزل کر دیا ہے، تو انھیں ایسی آگاہی اور بیداری مرحمت فرما کہ ساری دنیا کے مسلمان "بنیانِ مرصوص" (سیسہ پلائی ہوئی دیوار) کی طرح خونخوار دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جائیں۔

بارِ الٰہا! تیرا دین بے ناصر و مددگار نہیں رہ سکتا، یہ اعزاز و افتخار ہمیں نصیب فرما کہ ہم ان یاورانِ اسلام کے زمرہ میں داخل ہوں۔ آمین یا رب العالمین

☆ ☆ ☆

سورۂ صف کا اختتام

۱۰ر رمضان المبارک ۱۴۰۶ ، ۲۰،۳۰ ، ۱۳۶۵ش

ترجمہ کا اختتام

۱۴ر ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ بمطابق ۱۱ر جولائی ۱۹۸۷ء

بر مکانِ حقیر۔ قُم

سورۂ جُمعۃ

یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہُوا اور اِس کی گیارہ آیات ہیں

شروع ۱۰ ر رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ ۔ ۱۳۶۵/۲/۳۰ش

سورۂ جمعہ کے مضامین

یہ سورہ حقیقت میں دو اصلی اور بنیادی محوروں پر گردش کرتی ہے:
۱ : توحید ، صفاتِ خدا ، پیغمبر اسلامؐ کی بعثت کا ہدف اور مسئلۂ معاد کی طرف توجّہ۔
۲ : نمازِ جُمعہ کا اصلاحی نقشہ اور اس عظیم عبادت کی بعض خصوصیات۔
لیکن دُوسرے لحاظ سے اس سورہ کے مطالب کو چند حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:
۱ : موجُودات کی عمومی تسبیح۔
۲ : تعلیم وتربیت کے لحاظ سے پیغمبر اسلامؐ کی بعثت کا ہدف۔
۳ : مومنین کو تنبیہ کہ وہ دینِ حق کے اصولوں سے منحرف نہ ہوں کہ جس طرح یہودی مُنحرف ہو گئے ہیں۔
۴ : موت کے عمومی قانون کی طرف اشارہ جو عالمِ بقاء کی طرف ایک دریچہ ہے۔
۵ : نمازِ جُمعہ کا فریضہ انجام دینے کے لیے تاکیدی حکم، اور اِس میں شرکت کے لیے کاروبار کی تعطیل۔

٭ ٭ ٭

سُورۂ جُمعہ کی تلاوت کی فضیلت

اِس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں۔ چاہے اسے مستقل طور پر پڑھا جائے یا یومیہ نمازوں کے ضمن میں پڑھا جائے۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے مروی ہے:

"من قرء سورة الجمعة اعطی عشر حسنات بعدد من اتی الجمعة، وبعدد من لم یأتها فی امصار المسلمین"

"جو شخص سورہ جمعہ کی تلاوت کرے، خدا اُسے بلادِ مُسلمین میں سے ان لوگوں کی تعداد سے جو نمازِ جُمعہ میں شرکت کرتے ہیں اور ان لوگوں کی تعداد سے جو اس میں شرکت نہیں کرتے، دس گنا حسنہ بخشے گا۔" [1]

---

[1] مجمع البیان آغاز سورۂ جمعہ، نور الثقلین ج ۵ ص ۳۲۰

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے :

"ہمارے شیعوں میں سے ہر مومن پر لازم ہے کہ شبِ جمعہ میں سُورہ "جمعہ" اور سورہ 'الاعلیٰ' پڑھے اور جمعہ کے ظہر میں، سُورہ جمعہ' اور 'منافقین' پڑھے۔ جب وہ ایسا کرے گا تو گویا اُس نے رسُول اللہؐ کا عمل انجام دیا اور خدا کے ہاں اس کا اجر و ثواب بہشت ہے۔" [۱]

خصُوصیت کے ساتھ اس بات کی بہت تاکید ہُوئی ہے کہ نمازِ جمعہ میں سُورہ جمعہ اور منافقین پڑھیں۔ ان روایات میں سے بعض میں یہ آیا ہے کہ حتی الامکان اس کو ترک نہ کریں۔ [۲]

باوجُود اس کے کہ قرأت نماز میں سورہ 'توحید' اور 'کافرون' سے عدول جائز نہیں ہے، لیکن نماز جمعہ میں خصُوصیت سے یہ استثناء ہُوا ہے۔ یعنی ان دونوں سورتوں سے سورہ 'جمعہ اور منافقین' کی طرف عدول جائز بلکہ مُستحب شمار کیا گیا ہے۔

یہ سب امُور قرآن مجید کی اس سُورہ کی حد سے زیادہ اہمیّت کا نشان ہیں۔

٭ ٭ ٭

---

[۱] مجمع البیان آغاز سورۃ جمعہ نور الثقلین ج ۵ ص ۳۲۰

[۲] نور الثقلین ج ۵ ص ۳۲۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ الۡمَلِکِ
الۡقُدُّوۡسِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ۝

(۲) ہُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ
اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ ٭ وَ
اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ۝

(۳) وَّ اٰخَرِیۡنَ مِنۡہُمۡ لَمَّا یَلۡحَقُوۡا بِہِمۡ ؕ وَ ہُوَ
الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ۝

(۴) ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ
ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ ۝

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

(۱) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، وہ ہمیشہ خدا کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، اس خدا کی جو مالک
اور حاکم ہے اور ہر عیب و نقص سے مبرّا اور عزیز و حکیم ہے۔

(۲) وہی ہے کہ جس نے امیّین میں، خود انھیں میں سے ایک رسُول مبعُوث کیا، تاکہ وہ

اس کی آیات کی ان پر تلاوت کرے، انھیں پاک کرے اور کتاب وحکمت کی انھیں تعلیم دے، اگرچہ وہ اِس سے پہلے واضح گمراہی میں تھے۔

(۳) اور وہ ان دُوسرے لوگوں کے لیے بھی رسُول ہے جو ابھی ان سے مُلحق نہیں ہُوئے، اور وہ عزیز وحکیم ہے۔

(۴) یہ خدا کا فضل ہے، وہ جسے چاہے (اور لائق دیکھے) اسے عطا کردے، اور خُدا صاحبِ فضلِ عظیم ہے۔

تفسیر

پیغمبر کی بعثت کا مقصد

یہ سُورہ بھی خدا کی تسبیح وتقدیس سے شروع ہو رہا ہے اور اس کے صفاتِ جمال وجلال کے ایک حصّہ اور اس کے اسماءِ حسنیٰ کی طرف اشارہ کر رہا ہے، جو حقیقت میں آئندہ کے مباحث کے لیے ایک مقدمہ ہے۔

فرماتا ہے: "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ ہمیشہ خُدا کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، اور زبانِ حال وقال کے ساتھ اس کو تمام نقائص اور عیوب سے پاک شمار کرتے ہیں"[۱] (یسبح للّٰہ ما فی السماوات وما فی الارض)۔

"وہی خدا جو مالک وحاکم ہے، اور ہر عیب ونقص سے مبرّا ہے۔" (الملک القدوس)۔

"وہ خدا جو عزیز وحکیم ہے۔" (العزیز الحکیم)۔

اور اس طرح سے پہلے اس کی "مالکیت اور حاکمیّت" کی اور پھر ہر قسم کے ظلم وستم اور نقص وعیب سے اس کے منزّہ ہونے کی تاکید کرتا ہے، کیونکہ ملوک اور بادشاہوں کے بے حساب مظالم کی طرف توجہ کرتے ہُوئے لفظ "ملک" سے غیر مقدس معانی کا گمان ہوتا ہے جو لفظ "قدوس" سے پاک وپاکیزہ ہو جاتا ہے۔

اور ایک طرف سے "قدرت اور علم" پر تکیہ کرتا ہے، جو حکومت کے دو اصلی رُکن ہیں، اور جیسا کہ آئندہ چل کر معلوم ہو جائے گا کہ یہ صفات اس سُورہ کے آنے والے مباحث کے ساتھ قریبی ربط رکھتے ہیں، اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مختلف آیاتِ قرآنی میں، حق تعالیٰ کے اوصاف کا انتخاب، حساب وکتاب اور ایک

خاص قسم کے نظم و ربط کے ماتحت ہوتا ہے۔

موجوداتِ عالم کی عمومی تسبیح کے بارے میں ہم پہلے ہی تفصیلی بحثیں کر چکے ہیں۔[1]

* * *

اِس مختصر اور پُرمعنی اشارہ کے بعد، جو مسئلہ توحید اور صفاتِ خدا کی طرف ہوا ہے، پیغمبر اسلامؐ کی بعثت اور اس عظیم رسالت کے ہدف کو، جو خدا کے عزیز و حکیم اور قدّوس ہونے کے ساتھ مربُوط ہے، بیان کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: "وہی ہے کہ جس نے امیّین میں انھیں میں سے ایک رسول کو مبعوث کیا، تاکہ وہ ان کے سامنے اس کی آیات کی تلاوت کرے۔" (ھو الذی بعث فی الامیین رسولًا منھم یتلوا علیھم ایاتہ)۔

اور اس تلاوت کے ذریعہ "انھیں ہر قسم کے شرک، کفر، انحراف، فساد اور خرابی سے پاک و پاکیزہ کر دے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔" (و یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ)۔

"اگرچہ وہ اس سے پہلے ضلال مبین اور واضح گمراہی میں تھے۔" (وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی بعثت کو ان خصوصیات کے ساتھ، جن کی طریقِ اعجاز کے علاوہ اور کوئی تعبیر نہیں کی جا سکتی، عظمتِ خدا کی نشانی اور اس کے وجُود کی دلیل قرار دیتے ہوئے کہتا ہے:

"خدا وہی ہے کہ جس نے اس شان کے پیغمبر کو مبعوث کیا اور آفرینش میں اس طرح کا شاہکار عالمِ وجود میں لایا ہے۔"

"امیین" جمع ہے "امّی" کی، جس کا معنی ہے وہ جس نے کبھی سے درس نہ پڑھا ہو۔ (جو "ام" (ماں) کے ساتھ منسُوب ہے، یعنی ماں کی گود کے علاوہ اور کوئی مدرسہ نہ دیکھا ہو) اور بعض نے اسے "اہلِ مکّہ" کے معنی میں سمجھا ہے، کیونکہ "مکّہ" کو "اُمّ القریٰ" (آبادیوں کی ماں) کہتے تھے۔ لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے، چونکہ نہ تو پیغمبر اسلام صرف اہلِ مکّہ کے لیے مبعوث ہُوئے اور نہ ہی سورہ جمعہ مکّہ میں نازل ہُوئی ہے۔

بعض مفسّرین نے اس کی یہودیوں اور دُوسرے لوگوں کے مقابلہ میں "امّتِ عرب" کے معنی میں بھی تفسیر کی ہے، اور وہ سورہ آل عمران کی آیت ۷۵ کو اس معنی پر شاہد سمجھتے ہیں جو یہ کہتی ہے:

قالوا لیس علینا فی الامیین سبیل: "یہودیوں نے کہا کہ ہم امیّین (غیر یہود) کے مقابلہ میں جوابدہ نہیں ہیں۔"

اگر ہم اس تفسیر کو قبول بھی کر لیں تو بھی اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودی اپنے آپ کو اہلِ کتاب اور پڑھے لکھے افراد سمجھتے تھے اور امت عرب کو اَن پڑھ اور بے علم کہتے تھے۔ اس بنا پر پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔[2]

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۶ : ذیل آیت ۴۴ سورۃ اسراء و جلد ۸ ذیل آیت ۴۱ سورۃ نور

[2] اُمّی کے معنی کے بارے میں سورہ اعراف کی آیت ۱۵۷ کے ذیل میں ہم نے بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ (تفسیر نمونہ جلد ۴ کی طرف رجُوع کریں۔)

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ فرماتا ہے: "پیغمبر اسی گروہ اور ان پڑھ طبقہ میں سے مبعوث ہوا ہے تاکہ اس کی رسالت کی عظمت کو واضح کرے اور یہ چیز اس کی حقانیت کی دلیل بنے۔ کیونکہ قرآن جیسی کتاب، ایسے عمیق و عظیم مطالب اور اسلام جیسی ثقافت کے ساتھ، محال ہے کہ یہ کسی بشر کی فکر کا ثمرہ ہو۔ وہ بشر بھی ایسا بشر کہ جس نے نہ تو خود کسی کے سامنے تعلیم کے لیے زانوئے ادب تہ کیا ہو اور نہ ہی علم و دانش کے ماحول میں اُس نے پرورش پائی ہو۔ یہ ایک ایسا نور ہے جو ظلمت کی سرزمین سے اٹھا ہے، اور ایک سرسبز باغ ہے جو شورزار سے نکلا ہے، اور یہ خود پیغمبرؐ کی حقانیت کا ایک واضح معجزہ اور ایک روشن سند ہے۔

اوپر والی آیت میں اِس بعثت کے مقصد کا تین چیزوں میں خلاصہ کیا ہے، جن میں سے ایک تو تمہیدی پہلو رکھتی ہے، اور وہ آیاتِ الٰہی کی تلاوت ہے اور دُوسرے دو حصے، یعنی "تہذیب وتزکیۂ نفوس" اور "تعلیم کتاب وحکمت" دو اصلی اور اہم مقاصد ہیں۔

ہاں! پیغمبر اسی لیے آئے ہیں کہ علم و دانش کے سلسلہ میں اور اخلاق وعمل کے بارے میں بھی انسان کی تربیت کریں تاکہ وہ ان دونوں پروں کے ذریعے آسمانِ سعادت کی بلندی پر پرواز کریں اور خدائی راستہ کو اختیار کرکے اس کے مقامِ قرب کو حاصل کریں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ بعض آیاتِ قرآنی میں تو 'تزکیہ'، 'تعلیم' پر مقدم ہے اور بعض میں 'تعلیم' 'تزکیہ' پر مقدم شمار ہوئی ہے۔ یعنی چار موارد میں سے تین میں تربیت، تعلیم پر مقدم ہے اور ایک مقام پر تعلیم تربیت پر مقدم ہے۔

یہ تعبیر جہاں ضمناً یہ بتاتی ہے کہ یہ دونوں اُمور ایک دُوسرے میں تاثیرِ متقابل رکھتے ہیں (یعنی اخلاق علم کی پیداوار ہے جیسا کہ علم اخلاق سے پیدا ہوتا ہے) وہاں تربیت کی اصالت کو بھی مشخص کرتی ہے، البتہ اس سے مُراد حقیقی علوم ہیں نہ کہ اصطلاحی کہ جو علم کے لباس میں موجُود ہیں۔

ممکن ہے کتاب وحکمت میں یہ فرق ہو کہ کتاب تو قرآن کی طرف اشارہ ہے اور حکمت، پیغمبرؐ کے ارشادات کی طرف اشارہ ہے کہ جس کا نام سُنّت ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ کتاب تو اِسلام کے اصل احکام کی طرف اشارہ ہو اور "حکمت" ان کے فلسفہ اور اسرار کی طرف راجع ہو۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ "حکمت" اصل میں بغرض اصلاح کسی کو منع کرنے اور روکنے کے معنی میں ہے اور گھوڑے کی لگام کو اس وجہ سے حکمت کہتے ہیں کہ وہ اسے روک کر صحیح راستے پر ڈالتی ہے۔ اِس بنا پر حکمت سے مُراد عقلی دلائل ہیں۔ یہیں سے واضح ہو جاتا ہے کہ کتاب وحکمت کا ایک دُوسرے کے بعد ذکر ہو سکتا ہے کہ شاید یہ معرفت وشناخت کے دو سرچشموں یعنی "وحی" "عقل" کی طرف اشارہ ہو یا دوسرے لفظوں میں احکام آسمانی اور تعلیماتِ اسلام کہ ان کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے اور وہ عقلی لحاظ سے بھی قابلِ فہم اور لائقِ ادراک ہیں (مراد کلیات

احکام ہیں)

باقی رہا "ضلال مبین" (واضح گمراہی) جو آیت کے ذیل میں قوم عرب کے سابقہ حالات کے عنوان سے بیان ہُوا ہے، زمانۂ جاہلیت کی طرف ایک سربستہ اور پُرمعنی اشارہ ہے، جس میں گمراہی ان کے پُورے مُعاشرے پر چھائی ہوئی تھی۔ اس سے بدتر گمراہی اور کیا ہوگی کہ وہ اُن بُتوں کی پُوجا کرتے تھے، جنھیں وہ پتّھر اور لکڑی سے اپنے ہاتھ سے تراش کر بناتے تھے اور اپنی مشکلات میں انھیں بے شعُور موجودات کی پناہ لیتے تھے۔

اپنی بیٹیوں کو اپنے ہاتھ سے زندہ درگور کر دیتے تھے۔ یہ تو آسان تھا۔ لیکن اس عمل پر فخر و مباہات بھی کیا کرتے تھے کہ ہم نے اپنے ناموس کو بیگانوں کے ہاتھ میں نہیں جانے دیا۔

ان کے مراسم نماز و عبادت، خانۂ کعبہ کے پاس تالیاں پیٹنا اور سیٹیاں بجانا تھے، یہانتک کہ عورتیں مادرزاد برہنہ صُورت میں خانۂ خُدا کے گرد طواف کرتیں اور اسے عبادت شمار کرتی تھیں۔

ہاں! پیغمبر اکرمؐ تشریف لائے اور انھیں کتاب و حکمت کی برکت سے اس ضلال مُبین اور واضح گمراہی سے نجات دلائی اور انھیں تعلیم و تربیّت دی اور واقعتاً اِس قسم کے گمراہ معاشرے میں نفوذ پیدا کرنا عظمتِ اسلام کی دلیل اور ہمارے عظیم پیغمبرؐ کا ایک آشکار مُعجزہ ہے۔

ٗ ٗ ٗ

لیکن چُونکہ پیغمبر اسلام صرف اسی 'اُمّی' قوم کے لیے مبعوث نہیں ہُوئے تھے بلکہ آپ کی دعوت پورے عالم کے لیے تھی، اِس لیے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "اور وہ ان دُوسرے مومنین کے لیے بھی رسُول ہے، جو ابھی تک ان سے مُلحق نہیں ہُوئے۔" (و اٰخرین منھم لما یلحقوا بھم)[1]

وہ دُوسری قومیں جنھوں نے اصحابِ پیغمبرؐ کے بعد عرصۂ وجود میں قدم رکھا انھوں نے بھی پیغمبرؐ کی تعلیم و تربیّت کے مکتب میں پرورش پائی ہے اور وہ بھی قرآن اور سُنّتِ محمدی کے چشمۂ زلال سے سیراب ہُوتے ہیں۔ ہاں! وہ بھی اِس عظیم دعوت میں شامل ہیں۔

اِس طرح سے اوپر والی آیت، عرب و عجم میں ان تمام اقوام کو شامل ہے جو صحابۂ پیغمبر کے بعد وجُود میں آئی ہیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی تو لوگوں نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ تو پیغمبرؐ نے اپنا ہاتھ سلمان کے کاندھے پر رکھ کر فرمایا:

"لو کان الایمان فی الثریا لنالتہ رجال من ھٰؤلاء"

"اگر ایمان ثریّا (ایک بہُت دُور ستارہ ہے جو اس سلسلہ میں ضربُ المثل ہے) میں

---

[1] "اٰخرین" "امیین" پر عطف ہے اور "منھم" کی ضمیر "مومنین" کی طرف لوٹتی ہے جو کلام کے اندر سے معلوم ہوتی ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "یعلمھم" کی ضمیر پر عطف ہو لیکن پہلا معنی زیادہ مُناسب ہے۔

بھی ہو تو اس گروہ (ایرانیوں) میں سے کچھ افراد اس کو وہاں سے بھی حاصل کر لیں گے۔"[1]

چونکہ ان تمام امور کا سرچشمہ خدا کی قدرت و حکمت ہے، للذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "وہ عزیز و حکیم ہے۔" (و ھو العزیز الحکیم)۔

اس کے بعد اس عظیم نعمت، یعنی پیغمبر گرامیٔ اسلام کی بعثت اور ان کے ذریعے تعلیم و تربیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے۔ "یہ خدا کا فضل ہے، وہ جسے چاہے (اور لائق دیکھے اسے) عطا کر دے اور خدا فضلِ عظیم کا مالک ہے۔" (ذالك فضل الله یؤتیه من یشاء والله ذو الفضل العظیم)۔

حقیقت میں یہ آیت سورہ آل عمران کی آیت ۱۶۴ کے مانند ہی ہے جو یہ کہتی ہے: لقد من الله علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم اٰیاته و یزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔ اور اس آیت کی تمام باتیں تقریباً زیر بحث آیات سے مشابہ ہیں۔

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "ذالك فضل الله" (یہ اللہ کا فضل ہے) اصل میں مقامِ نبوت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا یہ مقام جسے اس لائق دیکھتا ہے اُسے عطا فرماتا ہے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ اگرچہ دونوں تفاسیر کے درمیان جمع بھی ممکن ہے کہ پیغمبر کی رہبری بھی امت کے لیے اللہ کا فضل ہے اور مقامِ نبوت بھی پیغمبر کے لیے اللہ کا فضل ہے۔

یہ بات کہے بغیر ہی واضح ہے کہ "من یشاء" (جسے چاہے) کی تعبیر کا مفہوم یہ نہیں کہ خدا کسی حساب کتاب کے بغیر ہی اپنے فضل و رحمت سے کسی کو دے دیتا ہے بلکہ یہاں مشیت حکمت کے ساتھ توأم ہے جیسا کہ سورہ کی پہلی آیت میں خدا کی عزیز و حکیم سے توصیف بھی اسی مطلب کو واضح کرتی ہے۔

امیر المومنین علیؑ بھی اس فضلِ الٰہی کی تشریح میں نہج البلاغۃ میں فرماتے ہیں:

"فانظروا الی مواقع نعم الله علیھم، حین بعث الیھم رسولا، فعقد بملته طاعتھم، وجمع علی دعوته الفتھم، کیف نشرت النعمة علیھم جناح کرامتھا، واسالت لھم جداول نعیمھا، والتفت الملة بھم فی عوائد برکتھا فاصبحوا فی نعمتھا غرقین، وفی

---

[1] اس حدیث کو "طبرسی" نے "مجمع البیان" میں، علامہ طباطبائی نے "المیزان" میں، سیوطی نے درّ المنثور میں، زمخشری نے "کشاف" میں، قرطبی نے اپنی تفسیر میں، راغی نے اپنی تفسیر میں اور سید قطب نے "فی ظلال" میں زیر بحث آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے۔ یہ حدیث اصل میں صحیح بخاری سے لی گئی ہے۔

خضرة عیشها فکهین".

"اس امّت پر خدا کی نعمتوں کی طرف دیکھو! اس زمانے میں جب اپنے رسولؐ کو اُن کی طرف بھیجا تو اپنے دین کا انھیں مطیع بنا دیا اور اس کی دعوت کے ساتھ انھیں متحد کیا۔ دیکھو! اس عظیم نعمت نے اپنی کرامت کے پروبال کس طرح ان پر پھیلا دیئے، اور اپنی نعمتوں کی نہریں ان کی طرف جاری کیں اور دینِ حق نے اپنی تمام برکتوں کے ساتھ انھیں گھیر لیا۔ وہ اس کی نعمتوں کے درمیان غرق ہیں، اور خوش و خرّم زندگی میں شادمان ہیں"۔ ؎

ایک نکتہ

فضلِ خدا حساب سے ہوتا ہے

ایک حدیث میں آیا ہے کہ امّت کے فقراء کی ایک جماعت رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: "اے اللہ کے رسولؐ! دولت مندوں کے پاس تو خرچ کرنے کے لیے مال ہے اور ہمارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ ان کے پاس حج کرنے کا ذریعہ ہے۔ ہمارے پاس نہیں ہے۔ ان کے پاس غلاموں کو آزاد کرنے کے وسائل ہیں، ہمارے پاس نہیں ہیں"۔

پیغمبرؐ نے فرمایا: "جو شخص سو مرتبہ "تکبیر" کہے وہ ایک غلام کے آزاد کرنے سے افضل ہے، اور جو شخص سو مرتبہ خدا کی تسبیح کرے وہ سو گھوڑے زین و لگام کے ساتھ جہاد کے لیے آمادہ کرنے سے افضل ہے اور جو سو مرتبہ لا الٰہ الّا اللہ کہے، اس کا عمل تمام لوگوں کے اس دن کے عمل سے افضل ہے مگر یہ کہ کوئی اس سے زیادہ کہے"۔

یہ بات اغنیاء کے کانوں تک پہنچی تو وہ بھی یہ اذکار کرنے لگے۔ فقرائے امّت پھر پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ "آپ کا ارشاد ان کے کانوں تک بھی پہنچ گیا ہے اور وہ بھی اس ذکر میں مشغول ہو گئے ہیں"۔

پیغمبرؐ نے فرمایا: ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء : یہ اللہ کا فضل ہے جسے وہ چاہتا ہے، دے دیتا ہے۔ (یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تم جیسے لوگوں کے لیے ہے جو خرچ کرنے کا شوق تو رکھتے ہیں لیکن اس کا کوئی ذریعہ اپنے پاس نہیں رکھتے۔ لیکن دولت مندوں کے لیے فضلِ الٰہی کے حصول کا طریقہ، ان کا اپنے مالوں سے خرچ کرنا ہی ہے۔ ؎

یہ حدیث بھی اسی بات کی شاہد ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے کہ فضلِ الٰہی حکیمانہ طریقے سے ہوتا ہے۔

؎ نہج البلاغۃ خطبہ ۱۹۲ (خطبہ قاصعہ)

۵ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا
كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

۶ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ
اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

۷ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ
بِالظّٰلِمِيْنَ ۝

۸ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ
تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ

۵ جو لوگ تورات کے مکلّف قرار دیئے گئے، پھر انھوں نے اس کا حق ادا نہ کیا، وہ اس گدھے کے مانند ہیں جو کتابوں کا بوجھ اُٹھائے ہُوئے ہو۔ جس قوم نے آیاتِ الٰہی کو جھٹلایا وہ بُری مثال رکھتے ہیں اور خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کیا کرتا۔

(۶) کہہ دیجئے، اے یہودیو! اگر تمھارا گمان یہ ہے کہ تمام لوگوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے دوست ہو، تو پھر موت کی تمنا کرو، اگر تم سچ کہتے ہو، (تاکہ تم اپنے محبوب کی ملاقات کرو)

(۷) لیکن وہ ان اعمال کی وجہ سے جو وہ آگے بھیج چکے ہیں ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ او خُدا ظالموں کو اچھی طرح جانتا ہے۔

(۸) کہہ دیجئے کہ یہ موت جس سے تم بھاگتے ہو، آخرکار تم سے ملاقات کرکے رہے گی۔ اس کے بعد تمھیں اِس پنہاں و آشکار باتوں کی خبر رکھنے والے کی طرف پلٹا دیا جائے گا اور وہ تمھیں ان باتوں سے آگاہ کرے گا جو تم کیا کرتے تھے۔

تفسیر

ایسا چوپایہ جس پر کتابیں لدی ہوں

بعض روایات میں آیا ہے کہ یہودی یہ کہا کرتے تھے: اگر محمدؐ مبعوث برسالت ہُوا ہے تو اس کی رسالت ہمارے لیے نہیں ہے۔ اِس لیے پہلی زیرِبحث آیت ان کے گوش گزار کر رہی ہے کہ اگر تم نے اپنی آسمانی کتاب کو غور سے پڑھا ہوتا اور اس پر عمل کیا ہوتا تو یہ بات نہ کرتے، کیونکہ اِس میں پیغمبرِ اسلامؐ کے ظہور کی بشارت آئی ہے۔

فرماتا ہے: "وہ لوگ جن پر تورات نازل ہوئی اور وہ اس کے مکلّف قرار دیئے گئے، لیکن انھوں نے اس کا حق ادا نہیں کیا اور اس کی آیات پر عمل نہیں کیا، وہ اس گدھے کی مانند ہیں جو اپنی پشت پر کتابیں اٹھائے ہوئے ہو" (مثل الذین حملوا التوراة ثم لم یحملوها کمثل الحمار یحمل اسفارا)۔

وہ کتاب سے سوائے اس کے بوجھ کے اور کسی چیز کا احساس نہیں کرتا اور اس کے لیے کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ پُشت پر پتھر اور لکڑی اٹھائے ہُوئے ہے، یا ایسی کتابیں جن میں آفرینش کے دقیق ترین اسرار اور زندگی کے مفید ترین ضابطے درج ہیں۔

یہ خود پسند قوم جس نے صرف تورات کے نام یا اس کی تلاوت پر قناعت کی ہُوئی ہے اور اس کے مضامین پر غور و خوض کر کے اس پر عمل نہیں کرتے، وہ اسی جانور کے مانند ہیں جو حماقت اور نادانی میں ضرب المثل اور مشہور خاص و عام ہے۔

یہ بہترین مثال ہے جو عالمِ بے عمل کے لیے بیان کی جا سکتی ہے، جو علم کی مسئولیت کا بوجھ تو اپنے کاندھے پر اُٹھائے ہُوئے ہے، لیکن اس کی برکات سے بہرہ اندوز نہیں ہوتا — اسی طرح سے وہ لوگ جو قرآن کے الفاظ سے تو سروکار رکھتے ہیں لیکن اس کے مطالب اور عملی تقاضوں سے بے خبر ہیں (اور مسلمانوں کی صفوں میں ایسے لوگ بہت ہی زیادہ ہیں) وہ اسی آیت کے مصداق ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہودیوں نے اِس سورہ کی پہلی آیات اور اس کے مانند دوسری آیات کو جو بعثتِ پیغمبرؐ کی نعمت کی گفتگو کرتی ہیں، سُننے کے بعد کہا ہو کہ ہم بھی اہلِ کتاب ہیں، اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی بعثت کے ساتھ مفتخر ہیں۔ قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: اس کا کیا فائدہ ہے تم نے تو تورات کے احکام کو پاؤں تلے روند ڈالا ہے اور ان پر اپنے مسائلِ زندگی میں ہرگز عمل نہیں کیا۔

لیکن بہرحال یہ تمام مسلمانوں کے لیے ایک تنبیہہ ہے کہ وہ اس بات کو نظر میں رکھیں کہ یہودیوں جیسی سرنوشت پیدا نہ ہو۔ یہ خدا کا عظیم فضل ہے، جو ان کے شاملِ حال ہُوا ہے اور یہ قرآن جو ان پر نازل ہُوا ہے اِس لیے نہیں ہے کہ گھروں میں اس پر گرد پڑتی رہے؛ یا نظرِ بد اور آسیب کے لیے تعویذ کے طور پر حمائل کرلیں؛ یا سفر کرنے کے موقع پر حوادث سے محفوظ رہنے کے لیے اس کے نیچے سے گزریں یا برکت اور نیک شگون کے لیے نئے گھر میں 'آئینہ' اور 'جھاڑو' کے ساتھ اُسے بھی بھیجیں اور اس کو اس حد تک نیچے لے آئیں؛ یا ان کی آخری ہمت یہ ہو کہ اس کی تجوید، خوبصورت قرأت و تلاوت، ترتیل اور حفظ کرنے کی سعی و کوشش کریں، لیکن ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس کا معمُولی سا انعکاس بھی نہ ہو اور عقیدہ و عمل میں اس کا کوئی اثر نظر نہ آئے۔

اس کے بعد اسی مثال کو جاری رکھتے ہُوئے کہتا ہے: "وہ قوم جس نے آیاتِ الٰہی کی تکذیب کی یقیناً وہ بُری مثال رکھتی ہے۔" (بئس مثل القوم الذین کذبوا بأیات اللہ)۔

وہ لوگ "بوجھ اُٹھانے والے گدھے" کے مشابہ کیوں نہ ہوں؟ حالانکہ انھوں نے نہ صرف عمل بلکہ زبان سے بھی آیاتِ الٰہی کا انکار کیا ہے جیسا کہ سُورہ بقرہ کی آیت ۸۷ میں اسی قوم یہُود کے بارے میں آیا ہے: افکلما جاءکم رسول بما لا تھوٰی انفسکم استکبرتم ففریقًا کذبتم و فریقًا تقتلون: "کیا جب بھی کوئی پیغمبر تمھاری خواہش کے برخلاف آیا تو تم نے اس کے سامنے تکبر نہیں کیا پس ایک گروہ کو تم نے جھٹلایا، اور ایک گروہ کو قتل کر ڈالا۔"

آیت کے آخر میں ایک مختصر اور پُرمعنی جُملہ میں فرماتا ہے: "خدا ستمگر قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔" (واللہ لا یھدی القوم الظالمین)۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہدایت کرنا خدا کا کام ہے لیکن اس کے لیے ایک مُقدّمہ اور تمہید کی ضرورت ہے، اور اس کا مُقدّمہ جو حق طلبی اور حق جُوئی کی رُوح ہے اسے انسانوں کی طرف سے فراہم ہونا چاہیے اور ستمگر اس مرحلہ سے بہت دُور ہیں۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہودی اپنے آپ کو برگزیدہ اور منتخب اُمت اور اصطلاح کے مطابق "تافتہ ای جُدا بافتہ" (یعنی سب سے الگ مخلوق) سمجھتے تھے۔ یہانتک کہ کبھی تو وہ یہ دعوٰی کرتے کہ "وہ خُدا کے بیٹے ہیں اور کبھی اپنے آپ کو خُدا کے مخصُوص دوست بتلاتے، جیساکہ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۸ میں آیا ہے: وقالت الیھود والنصارٰی نحن ابناؤا اللّٰہ واحباؤہ: یہود و نصارٰی نے کہا کہ ہم خُدا کے بیٹے اور اس کے خاص دوست ہیں (خواہ ان کی مُراد مجازی اولاد ہی ہو۔)

قرآن ان بے دلیل بلند پروازیوں کے مُقابلہ میں، وہ بھی ایسے گروہ کی طرف سے جو کتابِ الٰہی کے حامل ہونے کے باوجود اس پر عامل نہیں تھے، کہتا ہے: "ان سے کہہ دیجئے، اے یہودیو! اگر تمھارا گمان یہ ہے کہ تمام لوگوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے دوست ہو، تو پھر موت کی تمنّا کرو، اگر تم سچ کہتے ہو" (قل یاایھا الذین ھادوا ان زعمتم انکم اولیاء للّٰہ من دون الناس فتمنوا الموت ان کنتم صادقین)۔ [1]

کیونکہ دوست تو ہمیشہ دوست کی مُلاقات کا مشتاق ہوتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ قیامت میں پروردگار کی معنوی مُلاقات ہوگی۔ جب عالمِ دُنیا کے حجاب ہٹ جائیں گے اور شہوات اور ہوس رانیوں کے غبار چھٹ جائیں گے، تو پردے اُٹھ جائیں گے اور انسان چشمِ دل سے محبوب کا جمالِ دلآرا دیکھے گا اور اس کے قرب کی بساط پر قدم رکھے گا اور "فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر" (صاحبِ اقتدار شہنشاہ کے قرب میں صداقت کی جگہ میں) کا مصداق بن کر حریمِ دوست میں راہ پائے گا۔

اگر تم سچ کہتے ہو، اور اس کے دوست خاص ہو تو پھر دُنیا کی زندگی کے ساتھ اس قدر کیوں چمٹے ہُوئے ہو؟ موت سے اتنا کیوں ڈرتے ہو؟ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم اپنے اس دعوٰے میں سچّے نہیں ہو۔

قرآن نے اسی بات کو ایک دوسری تعبیر کے ساتھ سورۂ بقرہ کی آیت ۹۶ میں بھی بیان کیا ہے، جہاں کہتا ہے: ولتجدنھم احرص الناس علٰی حیاۃ ومن الذین اشرکوا یود احدھم لو یعمر الف سنۃ وما ھو بمزحزحہ من العذاب ان یعمر واللّٰہ بصیر بما یعملون: "تم انھیں اس دُنیاوی زندگی کے لیے سب سے زیادہ حریص پاؤ گے۔ یہاں تک کہ مُشرکین سے بھی زیادہ حریص۔ یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ ہزار برس تک زندہ رہے، حالانکہ یہ طولانی زندگی اُسے عذابِ الٰہی سے نہیں چھڑا سکے گی اور خدا اُن کے اعمال کو دیکھتا ہے۔"

❖ ❖ ❖

اس کے بعد ان کے موت سے ڈرنے کی اصل وجہ کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے مزید کہتا ہے: "وہ اپنے ان اعمال کی وجہ سے، جو انھوں نے آگے بھیجے ہُوئے ہیں ہرگز موت کی تمنّا نہیں کریں گے۔" (ولا یتمنونہ ابدًا

---

[1] "من دون الناس" بعض مفسرین کے قول کے مطابق اسم "اَنّ" کا حال ہے اور بعض کے نزدیک اولیاء کی صفت ہے۔

بما قدمت ایدیھم)۔

"لیکن خدا ظالموں کو اچھی طرح سے پہچانتا ہے" (واللہ علیم بالظالمین)۔

حقیقت میں انسان کا موت سے خوف دو عوامل میں سے کسی ایک کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یا تو وہ موت کے بعد کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتا اور موت کو فنا و نیستی کا ایک ہیولا اور عدم کا ظلمت کدہ خیال کرتا ہے۔ یہ ایک طبعی اور فطری امر ہے کہ انسان نیستی اور عدم سے گریز کرے۔

اور یا وہ موت کے بعد والے عالم کا عقیدہ تو رکھتا ہے لیکن وہ اپنے نامۂ اعمال کو ایسا تاریک و سیاہ دیکھتا ہے کہ جس کی وجہ سے اس عظیم دادگاہ اور عدالت میں حاضر ہونے سے ڈرتا ہے۔

اور چونکہ یہودی معاد اور موت کے بعد کے جہان کا عقیدہ رکھتے تھے، لہٰذا طبعی طور پر ان کے موت سے ڈرنے کا عامل دوسری چیز تھی۔

"ظالمین" کی تعبیر ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جو یہودیوں کے تمام ناروا اعمال، خدا کے عظیم پیغمبروں کو قتل کرنے سے لے کر ان کی طرف ناروا نسبتوں، لوگوں کے حقوق غضب کرنے، ان کے اموال ہتھیانے، سرمائے غارت کرنے اور انواع و اقسام کے اخلاقی مفاسد سے آلودہ ہونے تک کو شامل ہے۔

لیکن مسلّمہ طور پر یہ وحشت و اضطراب کسی مشکل کو حل نہیں کرتا۔ موت ایک ایسا اونٹ ہے جو تمام گھروں کے دروازے پر بیٹھا ہے۔ لہٰذا قرآن کہتا ہے: "اے پیغمبرؐ! ان سے کہہ دیجئے کہ یہ موت جس سے تم بھاگتے ہو آخرکار تم سے ملاقات کرے گی" (قل ان الموت الذی تفرون منہ فانہ ملاقیکم)۔

اس کے بعد تمھیں اس کے پاس لے جایا جائے گا جو پنہاں و آشکار سے باخبر ہے۔ اور تم جو کچھ عمل کیا کرتے تھے وہ تمھیں اس کی خبر دے گا" (ثم تردون الیٰ عالم الغیب والشھادۃ فینبئکم بما کنتم تعملون)۔

موت کا قانون اِس عالم کے قوانین میں سب سے زیادہ عام اور سب سے زیادہ وسیع ہے، خدا کے عظیم پیغمبرؐ اور مقرّب فرشتے سب مرجائیں گے اور خدا کی پاک ذات کے سوا اس جہان میں کوئی باقی نہیں رہے گا: کل من علیھا فان ویبقٰی وجہ ربك ذوالجلال والاکرام"[1]

موت اور دادگاہِ عدلِ الٰہی میں حاضر ہو کر حساب دینا بھی اس عالم کے مسلّمہ قوانین میں سے ہے اور خدا بندوں کے تمام اعمال سے دقیقاً آگاہ بھی ہے۔

اس بناء پر اِس خوف و دہشت کے ختم ہونے کی صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ اعمال کی پاکیزگی اور گناہ کی آلودگی سے دل کو پاک صاف کرنا ہے۔ کیونکہ جس کا حساب پاک صاف ہو اُسے محاسب سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس یہی ایک صورت ہے جس میں علیؑ کی طرح کہا جا سکتا ہے:

---

[1] سورہ رحمٰن آیت ۲۶، ۲۷

"هیهات بعد اللتیا و اللتی واللّٰه لابن ابی طالب آنس بالموت
من الطفل بثدی امه"

"ہیہات! ان تمام جنگوں اور حوادث کے بعد، خدا کی قسم! ابوطالب کا بیٹا موت سے
اس سے بھی زیادہ اُنس اور لگاؤ رکھتا ہے جتنا اُنس بچے کو اپنی ماں کی چھاتی سے
ہوتا ہے۔" [1]

اور جب آپ کی پیشانی مبارک "اشقی الآخرین" (ابن ملجم) کی ضرب سے شگافتہ ہوئی تو باآواز بلند فرمایا: "فزت و رب الکعبہ" کعبہ کے پروردگار کی قسم! میں کامیاب ہوا اور نجات پاگیا۔

٭ ٭ ٭

چند نکات

۱: عالم بے عمل

اِس میں شک نہیں کہ تحصیلِ علم میں بہت زیادہ مشکلات پیش آتی ہیں، لیکن یہ مشکلات چاہے جتنی بھی ہوں، علم سے حاصل ہونے والی برکات کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ انسان کی بیچارگی اس دن ہوگی جب وہ تحصیلِ علم کی زحمت کو تو برداشت کرے لیکن اُس کی برکتوں کا اُسے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو، وہ ٹھیک اس چوپائے کی مانند ہوتا ہے، جو کتابوں کی ایک گانٹھ کا وزن تو اپنی پشت پر محسوس کرتا ہے لیکن اس کے مطالب سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتا۔

بعض تعبیرات میں عالم بے عمل کو "شجر بلاثمر" (بغیر پھل کے درخت) یا "سحاب بلا مطر" (بغیر بارش کے بادل) یا اس شمع سے جو جلتی ہے اور اپنے اطراف کو روشن کرتی ہے لیکن خود ختم ہو جاتی ہے یا اس چوپائے سے جسے خراس کے ساتھ جوت دیتے ہیں، وہ مسلسل زحمت اٹھاتا اور راستہ طے کرتا رہتا ہے، لیکن چونکہ وہ اپنے ہی چکّروں میں گھومتا ہے لہٰذا وہ کوئی راستہ طے نہیں کرتا اور کہیں بھی نہیں پہنچتا۔ اِسی قسم کی دوسری تشبیہیں دی جاتی ہیں جن میں سے ہر ایک عالم بے عمل کی منحوس سرنوشت کے کسی ایک گوشے کو بیان کرتی ہے۔

اِسلامی روایات میں بھی اس قسم کے عُلماء کی مذمت میں دل ہلا دینے والی تعبیریں آئی ہیں۔ منجملہ ان کے حضرت رسولؐ سے نقل ہُوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"من ازداد علمًا ولم یزدد هدی لم یزدد من اللّٰه
الا بعدًا"

---

[1] نہج البلاغۃ خطبہ ۵

"جس شخص کا علم زیادہ ہو لیکن اس کی ہدایت میں اضافہ نہ ہو تو یہ علم اُسے خدا سے دُوری کے سوا کچھ نہیں دیتا"۔[1]

دوسری جگہ امیرالمومنین علیؑ سے منقول ہے:

"العلم مقرون بالعمل، فمن علم عمل، والعلم یهتف بالعمل فان اجابه والا ارتحل عنه"۔[2]

"علم عمل کے ساتھ توأم ہے جو شخص جس چیز کو جانتا ہے اُسے اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ علم فریاد کرتا اور عمل کی دعوت دیتا ہے، اگر وہ اُسے مثبت جواب نہ دے تو علم اس کے ہاں سے کوچ کر جاتا ہے۔"

اصُولی طور پر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم بے عمل "عالم" کہلانے کے لائق نہیں ہے۔ حضرت رسولؐ فرماتے ہیں:

"لا یکون المرء عالمًا حتّٰی یکون بعلمه عاملًا"۔[3]

اِس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ وہ عالم کی تمام ذمّہ داریوں کے بوجھ کو اپنے دوش پر اُٹھائے ہوئے ہوتا ہے جبکہ علم کی خصُوصیّات سے بہرہ مند نہیں ہوتا، جیساکہ امیرالمؤمنین علیؑ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک خطبہ کے ضمن میں فرمایا:

"أیها الناس! اذا علمتم فاعملوا بما علمتم لعلکم تهتدون، ان العالم العامل بغیره کالجاهل الحائر الذی لا یستفیق عن جهله بل قد رأیت ان الحجة علیه اعظم والحسرة ادوم"۔[4]

"اے لوگو! جب تم کسی چیز کو جان لو تو اس پر عمل کرو تاکہ ہدایت پاؤ، کیونکہ وہ عالم جو اپنے علم کے برخلاف عمل کرتا ہے اس سرگرداں جاہل کی طرح ہے جو اپنی جہالت سے کبھی ہوش میں نہیں آتا۔ بلکہ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ اس قسم کے عالم پر حجت بہُت بھاری اور اُس کے لیے حسرت دائمی ہے۔

---

[1] محجۃ البیضاء جلد ۱ ص ۱۲۵، ۱۲۶

[2] "نہج البلاغۃ" کلمات قصار، جملہ ۳۶۶

[3] محجۃ البیضاء جلد ۱ ص ۱۲۵، ۱۲۶

[4] اصول کافی جلد ۱ باب استعمال العلم حدیث ۶

بلاشک و شبہ اس قسم کے عُلماء اور دانشوروں کا وجود ایک مُعاشرے کے لیے بہت بڑی مصیبت ہے۔ جن لوگوں کا عالم و دانشور اس قسم کا ہو ان کی سرنوشت خطرناک ہے۔ بقولِ شاعر :

و راعی الشاۃ یحمی الذئب عنھا
فکیف اذا الرعاۃ لھا ذئاب

"چرواہا بکریوں کو بھیڑیے سے بچاتا ہے۔
لیکن ان بکریوں کی حالت پر افسوس ہے کہ جن کے چرواہے ہی بھیڑیے بن جائیں۔

٭ ٭ ٭

۲ : میں موت سے کیوں ڈروں ؟

عام طور پر اکثر لوگ موت سے ڈرتے ہیں۔ صرف ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو موت کا چہرہ دیکھ کر مسکرا دیتا ہے ، اسے پُورے زور سے اپنی آغوش میں لے لیتا ہے اور رنگ برنگی گودڑی دے کر جاودانی زندگی حاصل کر لیتا ہے۔

لیکن آیئے دیکھتے ہیں کہ موت اور اس کی علامات، یہاں تک کہ اس کا نام بھی ایک گروہ کے لیے کیوں تکلیف دہ ہے ؟ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ وہ موت کے بعد کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے اور اگر ایمان رکھتے بھی ہیں تو یہ ایمان ایک گہرے یقین کی صُورت میں نہیں اور وہ ان کے افکار و حالات پر اچھی طرح سے مُتوثر نہیں ہُوا ہے۔

فنا و نیستی سے انسان کی وحشت طبیعی اور فطری ہے ، انسان رات کی تاریکی تک سے ڈرتا ہے ، کیونکہ ظلمت ، نور کی نیستی ہے۔ انسان بعض اوقات مُردہ سے بھی ڈرتا ہے کیونکہ وہ بھی فنا کے راستے پر گامزن ہے۔

لیکن اگر انسان اپنے تمام وجُود کے ساتھ یہ باور کر لے : "الدنیا سجن المؤمن وجنۃ الکافر"[۱] دُنیا مومن کا زنداں اور کافر کے لیے بہشت ہے،"

اگر انسان باور کر لے کہ یہ جسمِ خاکی اس کے طائرِ رُوح کے لیے ایک قفس ہے، جب یہ قفس ٹوٹ جائے گا تو وہ آزاد ہو جائے گا اور کوئے دوست کی فضا میں پرواز کرے گا۔

اگر وہ یہ باور کر لے کہ "حجاب چہرۂ جان می شود غبارِ تنش" اُس کے بدن کا غُبار جان کے چہرے کا حجاب ہے تو یقیناً وہ اس وقت کے انتظار میں ہو گا کہ جب اس چہرے سے پردہ ہٹ جائے گا۔

اگر انسان یہ باور کر لے کہ طائرِ رُوح عالمِ خاک سے نہیں باغِ ملکوت سے ہے اور صرف دو تین دن کے لیے

---

[۱] سفینۃ البحار ج ۱ ص ۶۰۳

اس کے بدن کو اُس کا قفس بنایا گیا ہے۔

"ہاں! اگر موت کے بارے میں انسان کا نظریہ اس طرح کا ہو تو وہ ہرگز موت سے نہیں ڈرے گا جبکہ وہ ارتقاء کی راہ طے کرنے کے لیے زندگی چاہتا ہے۔

اسی لیے حدیثِ عاشورہ میں آیا ہے: امام حسین اور ان کے انصار پر دشمن کے محاصرہ کا گھیرا جتنا تنگ ہوتا اور دشمن کا دباؤ بڑھتا جاتا تھا، اُتنے ہی اُن کے چہرے زیادہ چمکتے اور کھلتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے اصحاب میں سے بوڑھے مُسکرا رہے تھے، جب ان سے پُوچھا گیا کہ وہ کیوں مُسکرا رہے ہیں تو ان کا جواب تھا: "ہم چند لمحہ کے بعد ہی شربتِ شہادت نوش کریں گے اور پھر حورُالعین سے ہم آغوش ہوں گے۔[1]

موت کے خوف کا ایک اور سبب، دُنیا کے ساتھ حد سے زیادہ دل لگانا ہے، کیونکہ موت اس کے اور اس کی محبوب دُنیا کے درمیان جُدائی ڈال دے گی۔ جبکہ وہ تمام امکانات و وسائل جو اُس نے عیش و نوش کی زندگی کے لیے فراہم کیے، تھے ان سے دل کو ہٹانا اس کے لیے طاقت فرسا ہے۔

خوف کا تیسرا عامل نامۂ اعمال کا نیکیوں سے خالی اور بُرائیوں اور سیّئات سے پُر ہونا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ کوئی شخص پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "میں موت کو کیوں پسند نہیں کرتا؟"

آپ نے فرمایا: کیا تیرے پاس کچھ دولت ہے؟

اس نے عرض کیا: جی ہاں!

آپ نے فرمایا: کیا تو نے اس میں سے کوئی چیز آگے بھی بھیجی ہے؟

اس نے عرض کیا: نہیں!

آپ نے فرمایا: یہی وجہ ہے کہ تو موت کو دوست نہیں رکھتا، کیونکہ تیرا نامۂ اعمال حسنات سے خالی ہے۔[2]

ایک دُوسرا شخص ابوذر کے پاس آیا اور یہی سوال کیا کہ ہم موت سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا:

"لانکم عمرتم الدنیا، وخربتم الاٰخرة، فتکرھون ان تنتقلوا من عمران الی خراب" یہ اس بناء پر ہے کہ تم نے دُنیا کو تو آباد کر رکھا ہے اور آخرت کو ویران بنایا ہوا ہے، لہٰذا یہ بات طبعی اور فطری ہے کہ تم آباد جگہ کو چھوڑ کر ویران و برباد جگہ کی طرف جانا پسند نہیں کرتے۔

❖ ❖ ❖

---

[1] مقتل الحسین مقرم ص ۲۶۳

[2] محجۃ البیضاء جلد ۸ ص ۲۵۸

(۹) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ
فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَیْعَ ؕ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ
کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

(۱۰) فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا
مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْکُرُوا اللّٰهَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ
تُفْلِحُوْنَ ۝

(۱۱) وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا ِۨانْفَضُّوْٓا اِلَیْهَا وَ تَرَکُوْکَ
قَآئِمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَ مِنَ
التِّجَارَةِ ؕ وَاللّٰهُ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ۝

ترجمہ

(۹) اے ایمان لانے والو! جب جمعہ کے دن کی نماز کے لیے اذان کہی جائے تو ذکرِ خدا کی طرف دوڑ کر آؤ اور خرید و فروخت کو چھوڑ دو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

(۱۰) اور جب نماز ختم ہو جائے تو تم آزاد ہو۔ زمین میں پھیل جاؤ اور خدا کا فضل طلب کرو اور خدا کو بہت بہت یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

(۱۱) اور جب وہ کوئی تجارت یا کھیل تماشا کی چیز کو دیکھتے ہیں تو اُدھر کو چل کھڑے ہوتے

ہیں اور تجھے اپنی حالت میں کھڑا ہوا چھوڑ جاتے ہیں، آپ کہہ دیجئے جو کچھ خدا کے پاس ہے، وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے اور خدا بہترین روزی دینے والا ہے۔

٭ ٭ ٭

شانِ نزول

ان آیات کے شان نزول میں خصوصاً " و اذا رأوا تجارۃ "کے بارے میں مختلف روایات نقل ہوئی ہیں جو سب کی سب ایک ہی مطلب کی خبر دیتی ہیں کہ : ایک سال مدینہ کے لوگ خشک سالی، قحط اور اجناس کے نرخ کی زیادتی میں گرفتار تھے تو دحیہ ایک قافلہ کے ساتھ شام سے یہاں آن پہنچا، وہ اپنے ساتھ غذائی اشیاء لے کر آیا تھا اُس روز جمعہ کا دن تھا اور پیغمبرؐ نماز جمعہ کے خطبہ میں مشغول تھے کہ انھوں نے معمول کے مُطابق قافلہ کے وُرود کے اعلان کے لیے طبل بجایا اور دُوسرے آلاتِ موسیقی بھی بجائے تو لوگ تیزی کے ساتھ بازار میں پہنچ گئے۔ اس موقع پر جو مسلمان مسجد میں نماز کے لیے جمع ہوئے ہُوئے تھے، انھوں نے خطبہ سُننا چھوڑ دیا اور اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے بازار کی طرف چل پڑے، صرف بارہ مرد اور ایک عورت مسجد میں باقی رہ گئے۔ (تو اوپر والی آیت نازل ہُوئی اور جانے والوں کی سخت مذمّت کی) پیغمبرؐ نے فرمایا: اگر یہ چھوٹا سا گروہ بھی چلا جاتا تو ان سب پر آسمان سے پتھروں کی بارش ہوتی۔[1]

٭ ٭ ٭

تفسیر

ہفتہ کا عظیم ترین عبادی سیاسی اجتماع

گزشتہ آیات میں توحید، نبوّت، معاد اور دُنیا پرست یہودیوں کی مذمت کے بارے میں مختصر مباحث آئے تھے، زیرِ بحث آیات ایک اہم ترین اسلامی فریضہ کے بارے میں ہیں جو ایمان کی بُنیادوں کی تقویت کے لیے حد سے زیادہ تاثیر رکھتا ہے اور ایک لحاظ سے سورۃ کا ہدف اصلی یہی ہے، یعنی نماز جمعہ، اور یہ آیات اس کے احکام کو بیان کرتی ہیں۔

---

[1] مجمع البیان ج ۹ ص ۲۸۷ اور دیگر تفاسیر

سب سے پہلے تمام مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اے ایمان لانے والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان کہی جائے تو ذکرِ خدا (خطبہ و نماز) کی طرف جلدی سے آؤ اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو" (یاایها الذین اٰمنوا اذا نودی للصلٰوة من یوم الجمعة فاسعوا الیٰ ذکر الله و ذروا البیع ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون)۔

"نُودی" "نِدا" کے مادہ سے پکارنے کے معنی میں ہے۔ اور یہاں اس سے مراد اذان ہے، کیونکہ اسلام میں نماز کے لیے اذان کے علاوہ اور کوئی ندا نہیں ہے جیسا کہ سورہ مائدہ کی آیت ۵۸ میں آیا ہے: "واذا نادیتم الی الصلٰوة اتخذوها هزوًا و لعبًا ذالك بانهم قوم لا یعقلون"۔ جب تم لوگوں کو نماز کے لیے پکارتے ہو (اور اذان کہتے ہو) تو وہ اس کا مذاق اڑاتے اور اسے کھیل تماشا سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک بے عقل قوم ہیں۔

اِس طرح سے جس وقت نمازِ جمعہ کی اذان کی آواز بلند ہوتی ہے تو لوگوں کا فرض ہے کہ وہ کاروبار کو چھوڑ کر نماز کی طرف دوڑ کر آئیں کہ جو اہم ترین ذکرِ خدا ہے۔

ذالکم خیر لکم کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس موقع پر کاروبار کو چھوڑ کر نمازِ جمعہ کو قائم کرنا مُسلمانوں کے لیے بہت ہی نفع کی بات ہے، بشرطیکہ وہ اس بارے میں ٹھیک طور پر غور و فکر کریں، ورنہ خدا تو سب سے بے نیاز اور سب پر مہربان ہے۔

یہ جملہ نمازِ جمعہ کے فلسفہ اور فوائد کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہے۔ اِس کے بارے میں ہم انشاءاللہ نکات کی بحث میں گفتگو کریں گے۔

البتہ خرید و فروش کو ترک کرنا ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو ہر مزاحم کام کو شامل ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ جمعہ کے دن کو جمعہ کا نام کیوں دیا گیا ہے؟ تو اس کی وجہ اس دن لوگوں کا نمازِ جمعہ کے لیے جمع اور اکٹھا ہونا ہے، اِس مسئلہ کی ایک مختصر سی تاریخ ہے جو نکات کی بحث میں آئے گی۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بعض اسلامی روایات میں روزانہ کی نماز کے بارے میں یہ آیا ہے: "اذا اقیمت الصلٰوة فلا تأتوها و انتم تسعون و أتوها و انتم تمشون وعلیکم السکینة۔" جب نماز (یومیہ) کھڑی ہو جائے تو نماز میں شرکت کے لیے دوڑو نہیں اور آرام کے ساتھ قدم اٹھاؤ۔ [1]

لیکن نمازِ جمعہ کے بارے میں اوپر والی آیت یہ کہتی ہے: فاسعوا (دوڑ کر آؤ) یہ نمازِ جمعہ کی حد سے زیادہ اہمیت کی دلیل ہے۔

ذکر الله سے مراد پہلے تو نماز ہی ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ نمازِ جمعہ کے خطبات بھی کہ جن میں خدا ہی کا

---

[1] روح المعانی جلد ۲۸ ص ۹۰

ذکر ہوتا ہے حقیقت میں نماز جمعہ کا ایک حصہ ہیں، اس بناء پر ان خطبوں میں شرکت کے لیے بھی دوڑ کر آنا چاہیئے۔

☆ ☆ ☆

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "جب نماز ختم ہو جائے تو پھر تم آزاد ہو، زمین میں چلو پھرو اور خدا کا فضل تلاش کرو اور خدا کو بہت بہت یاد کرو تاکہ تم نجات پاؤ" (فاذا قضیت الصلٰوۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل الله واذکروا الله کثیرًا لعلکم تفلحون)۔

اگرچہ "ابتغوا من فضل الله (اللہ کا فضل طلب کرو) کا جُملہ یا قرآن مجید میں اس سے مشابہ تعبیریں غالبًا روزی طلب کرنے اور کسب و تجارت کے معنی میں آئی ہیں، لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس جُملہ کا مفہوم وسیع ہے اور کسب و کار اس کے مصادیق میں سے ایک ہے، اسی لیے بعض نے عیادتِ مریض، زیارتِ مومن، یا تحصیلِ علم و دانش کے معنی میں اس کی تفسیر کی ہے، اگرچہ یہ ان میں بھی مُنحصر نہیں ہے۔

یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ "زمین میں پھیل جانے" اور "روزی طلب کرنے کا امر" امرِ وجُوبی نہیں ہے، بلکہ اصطلاح کے مُطابق یہ "امر بعد از حظر" و نہی ہے اور جواز کی دلیل ہے، لیکن بعض نے اس تعبیر سے یہ مطلب لیا ہے کہ نمازِ جُمعہ کے بعد روزی کی تحصیل و طلب ایک مطلوبیت اور برکت رکھتی ہے۔ اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نمازِ جمعہ کے بعد بازار میں تشریف لے جاتے تھے۔

"واذکروا الله کثیرًا" کا جُملہ ان تمام نعمتوں کے لیے جو خُدا نے انسان کو دی ہیں، خدا کو یاد کرنے کی طرف اشارہ ہے اور بعض نے یہاں "ذکر" کو "فکر" کے معنی سے تعبیر کیا ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ سنۃ ایک ساعت غور و فکر کرنا ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔[1]

اور بعض نے اس کو بازاروں میں مُعاملات کے وقت، خدا کی طرف توجّہ اور اصُولِ حق و عدالت سے انحراف نہ کرنے سے بھی تعبیر کیا ہے۔

لیکن واضح ہے کہ آیت ایک وسیع مفہُوم رکھتی ہے جو ان تمام مطالب کو اپنے دامن میں سموئے ہُوئے ہے۔ یہ بھی مُسلّم ہے کہ 'ذکر' کی روح فکر ہے اور وہ ذکر جو فکر کے بغیر ہو لقلقۂ زبانی سے زیادہ نہیں اور جو بات فلاح و نجات کا سبب ہے وہ وہی ذکر ہے جو تمام حالات میں غور و فکر کے ساتھ ہو۔

اصولی طور پر بار بار 'ذکر' کرنے سے خُدا کی یاد انسان کی جان کی گہرائیوں میں راسخ ہو جاتی ہے اور غفلت اور بے خبری کی جڑیں جل جاتی ہیں جو ہر قسم کے گناہ کا اصلی عامل ہوتی ہیں۔ پس یوں انسان فلاح و نجات کے راستے پر چلنے لگتا ہے اور "لعلکم تفلحون کی حقیقت حاصل ہو جاتی ہے۔

☆ ☆ ☆

زیرِ بحث آخری آیت میں ان لوگوں کو جنھوں نے پیغمبر اکرمؐ کو نمازِ جمعہ کے وقت چھوڑ دیا اور آنے والے قافلہ سے مال خریدنے کے لیے بازار کی طرف بھاگ کھڑے ہُوئے تھے، شدّت کے ساتھ ملامت کرتے ہُوئے کہتا ہے:

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۸۹

"جب وہ کوئی تجارت یا کھیل تماشہ کی بات دیکھتے ہیں تو پراگندہ ہو جاتے ہیں اور آپ کو (نمازِ جمعہ کا خطبہ پڑھنے کے دوران) کھڑا ہوا چھوڑ کر چل دیتے ہیں" (واذا راٰوا تجارۃ او لھواً انفضوا الیھا وترکوك قائمًا)۔

لیکن ان سے کہہ دیجئے کہ جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ لہو و لعب اور تجارت سے بہتر ہے اور خدا بہترین روزی دینے والا ہے۔" (قل ما عند اللّٰہ خیر من اللھو و من التجارۃ واللّٰہ خیر الرازقین)۔

نمازِ جمعہ میں حاضر ہونے اور پیغمبرؐ کے مواعظ و نصائح سُننے سے جو خدائی اجر و ثواب اور برکتیں اور معنوی و روحانی تربیت تمھیں حاصل ہوتی ہے۔ ان سب برکات کا کسی دوسری چیز کے ساتھ مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ اگر تم اس بات سے ڈرتے ہو کہ تمھاری روزی منقطع ہو جائے گی تو تم غلطی پر ہو۔ خدا بہترین روزی دینے والا ہے۔

لہو کی تعبیر، طبل اور ان تمام دُوسرے آلاتِ لہو کی طرف اشارہ ہے جو وہ لوگ مدینہ میں کسی نئے قافلہ کے وارد ہونے کے وقت بجایا کرتے تھے۔ یہ ایک طرح سے ان کے آنے کی خبر اور اعلان بھی ہوتا تھا اور مال و متاع کو بیچنے کے لیے تشہیر بھی، جیسا کہ وہ منڈیاں اور بازار، جو مغربی طرز کے ہیں، ان میں بھی اس کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔

"انفضوا" کی تعبیر، پراگندہ ہونے، نمازِ جمعہ سے منصرف ہونے اور قافلہ کا رُخ کرنے کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ شانِ نزول میں بیان کیا گیا ہے کہ جس وقت "دحیہ" کا قافلہ مدینہ میں وارد ہوا (اس نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا) تو اس نے طبل اور دوسرے آلاتِ لہو کے ساتھ لوگوں کو بازار کی طرف بُلایا۔ مدینہ کے لوگ، یہاں تک کہ وہ مسلمان بھی جو مسجد میں پیغمبرؐ کا خُطبہ جمعہ سُن رہے تھے، اس کی طرف بھاگ کھڑے ہُوئے اور مسجد میں صرف تیرہ مرد اور ایک روایت کے مُطابق اس سے بھی کم افراد باقی رہ گئے۔

"الیھا" کی ضمیر تجارت کی طرف لوٹتی ہے، یعنی وہ مال تجارت کی طرف دوڑ گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لہو و لعب ان کا اصلی ہدف نہیں تھا بلکہ وہ تو قافلہ کے وارد ہونے کے اعلان کی ایک تمہید تھی۔ یا مال تجارت کے پروپیگنڈہ میں زور پیدا کرنے کے لیے تھا۔

"قائمًا" کی تعبیر بتاتی ہے کہ پیغمبرؐ کھڑے ہو کر نماز جمعہ کا خُطبہ دے رہے تھے، جیسا کہ "جابر بن سمرۃ" کی حدیث میں نقل ہُوا کہ وہ کہتا ہے: "میں نے پیغمبرؐ کو خطبہ کی حالت میں کبھی بھی بیٹھے ہُوئے نہیں دیکھا اور جو شخص یہ کہے کہ آپ بیٹھ کر خُطبہ پڑھتے تھے تو اُسے جھُوٹا سمجھو۔"[1]

یہ روایت بھی آئی ہے: "لوگوں نے عبداللہ بن مسعُود سے پوچھا: "کیا پیغمبرؐ کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے؟ عبداللہ نے کہا: کیا تم نے نہیں سُنا کہ خدا فرماتا ہے: وترکوك قائمًا اور وہ تجھے کھڑا ہُوا ہی چھوڑ کر چل

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۸۶

دیئے۔[1]

تفسیر "در المنثور" میں آیا ہے کہ سب سے پہلا شخص جس نے نمازِ جمعہ کا خطبہ بیٹھ کر دیا، وہ معاویہ تھا۔[2]

* * *

چند نکات

۱: اسلام میں پہلی نمازِ جمعہ

بعض اسلامی روایات میں آیا ہے کہ مدینہ کے مسلمانوں نے پیغمبرؐ کی ہجرت سے پہلے باہم مل کر بات کی اور کہا کہ یہودی ہفتہ میں ایک دن (بروزِ ہفتہ) اجتماع کرتے ہیں اور عیسائی بھی اجتماع کے لیے (اتوار کا) ایک دن رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہم بھی ایک دن مقرر کر لیتے ہیں تاکہ اس میں جمع ہو کر ذکرِ خدا کریں اور اس کا شکر بجا لائیں۔ انھوں نے ہفتہ سے پہلے کا دن کہ جسے اُس زمانہ میں "یوم العروبہ" کہتے تھے، اس مقصد کے لیے منتخب کیا اور (بزرگانِ مدینہ میں سے ایک شخص) اسعد بن زرارہ کے پاس گئے۔ اس نے ان کے ساتھ مل کر جماعت کی صورت میں نماز ادا کی اور انھیں وعظ و نصیحت کی۔ پس وہی دن "روزِ جمعہ" کے نام سے موسوم ہو گیا کیونکہ وہ مسلمانوں کے اجتماع کا دن تھا۔

"اسعد" کے حکم پر ایک گوسفند ذبح کیا گیا اور سب نے دوپہر اور شام کا کھانا اسی گوسفند سے کھایا، کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔

یہ پہلا جمعہ تھا جو اسلام میں پڑھا گیا۔

لیکن وہ پہلا جمعہ جو حضرت رسولؐ نے اپنے اصحاب کے ساتھ پڑھا وہ اس وقت پڑھا گیا جب آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ جب آپ مدینہ میں وارد ہوئے تو اس دن پیر کا دن بارہ ربیع الاول اور ظہر کا وقت تھا۔ حضرت چار دن تک "قبا" میں رہے اور مسجد قبا کی بنیاد رکھی، پھر جمعہ کے دن مدینہ کی طرف روانہ ہوئے (قبا اور مدینہ کے درمیان فاصلہ بہت ہی کم ہے اور موجودہ وقت میں قبا مدینہ کا ایک داخلی محلّہ ہے) اور نمازِ جمعہ کے وقت آپ محلّہ "بنی سالم" میں پہنچے۔ وہاں نمازِ جمعہ ادا فرمائی اور یہ اسلام میں پہلا جمعہ تھا جو حضرت رسولؐ نے ادا کیا۔ جمعہ کی اس نماز میں آپ نے خطبہ بھی پڑھا، جو مدینہ میں آنحضرتؐ کا پہلا خطبہ تھا۔[3]

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۸۶ [2] تفسیر در المنثور جلد ۶ ص ۲۲۲۔ اس روایت کو دوسرے مفسرین مثلاً "آلوسی" نے "روح المعانی" میں اور "قرطبی" نے بھی اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ [3] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۸۶

ایک محدث نے "عبدالرحمٰن بن کعب" سے نقل کیا ہے کہ میرا باپ جب جمعہ کی اذان کی آواز سنتا، تو اسعد بن زرارہ کے لیے رحمت کی دُعا کیا کرتا تھا۔ جب میں نے اس کی وجہ پُوچھی تو اُس نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے ہمارے ساتھ نمازِ جمعہ ادا کی۔ میں نے کہا: اُس وقت کتنے افراد حاضر تھے؟ اس نے کہا: صرف چالیس نفر [1]

۲: نمازِ جُمعہ کی اہمیّت

سب سے پہلے تو اس عظیم اسلامی فریضہ کی اہمیّت کی بہترین دلیل اسی سورہ کی آیات ہیں جو تمام مُسلمانوں اور اہلِ ایمان کو یہ حکم دیتی ہیں کہ جمعہ کی اذان سُنتے ہی اس کی طرف دوڑ پڑیں۔ ہر قسم کے کاروبار اور رُکاوٹ ڈالنے والے کام چھوڑ دیں۔ یہاں تک کہ اگر کبھی سال لوگ غذائی اشیاء کی کمی میں گرفتار ہوں اور کوئی ایسا قافلہ آ جائے جو ان کی ضرورت کی چیزیں ساتھ لے کر آیا ہو تو وہ اس کی طرف نہ جائیں اور نمازِ جُمعہ کے اعمال کو جاری رکھیں۔

اسلامی روایات میں بھی اس سلسلہ میں بہت سی تاکیدیں وارد ہُوئی ہیں، ان میں سے ایک خطبہ ہے کہ جسے موافق و مخالف سب نے پیغمبرِ گرامی سے نقل کیا ہے۔ اس میں آیا ہے:

ان الله تعالیٰ فرض علیکم الجمعة فمن ترکها فی حیاتی او بعد موتی استخفافًا بها او جحودًا لها فلا جمع الله شمله، ولا بارك له فی امره الا ولا صلٰوة له، الا ولا زکٰوة له، الا ولا حج له الا ولا صوم له، الا ولا برله حتی یتوب.

"خُدا نے نمازِ جمعہ تم پر واجب کی ہے۔ اگر کوئی شخص اسے میری زندگی میں یا میری وفات کے بعد استخفاف یا انکار کے طور پر ترک کرے تو خُدا اُسے پریشان حال کر دے گا اور اس کے کسی کام میں برکت نہیں دے گا۔ جان لو کہ اُس کی نماز قبول نہیں ہے اس کی زکوٰۃ قبول نہیں ہے اور جان لو کہ اُس کے نیک اعمال قبول نہیں ہیں جب تک کہ اپنے اس عمل سے توبہ نہ کرے۔" [2]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقرؑ سے مروی ہے:

صلٰوة الجمعة فریضة، والاجتماع الیها فریضة مع الامام، فان ترك رجل من غیر علة ثلاث جمع فقد ترك ثلاث فرائض، ولا یدع ثلاث فرائض من غیر علة الا منافق؛

"نمازِ جمعہ ایک فریضہ ہے اور اس کا اجتماع امام (معصوم) کے ساتھ واجب ہے۔ جب کوئی شخص تین جمعے بغیر کسی عُذر کے ترک کر دے تو اس نے تین فریضے ترک کیے ہیں۔ اور تین فرائض بغیر کسی علّت کے ترک نہیں کرتا مگر منافق۔" [3]

---

[1] روح المعانی جلد ۲۸ ص ۸۸
[2] وسائل الشیعہ جلد ۵ ص ۷، باب وجوب صلٰوۃ الجمعۃ حدیث ۲۸
[3] وسائل الشیعہ جلد ۵ ص ۴ حدیث ۸

ایک اور حدیث میں حضرت رسولؐ سے منقول ہے :

"من اتی الجمعة ایمانًا و احتسابًا استأنف العمل"

"جو شخص از رُوئے ایمان خُدا کے لیے نمازِ جمعہ میں شرکت کرے تو اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور وہ اپنے عمل کا سلسلہ نئے سرے سے شروع کرے گا"۔ [1]

اس سلسلے میں روایات بہت زیادہ ہیں، اور ان سب کا بیان کرنا باعثِ طوالت ہو گا۔ ہم یہاں ایک اور حدیث نقل کرکے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

ایک شخص حضرت رسولؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! میں کئی مرتبہ حج کے لیے تیار ہوا ہوں لیکن مجھے توفیق حاصل نہ ہوئی۔ اس پر آپ نے فرمایا:

"علیك بالجمعة فانها حج المساکین"

"تو نماز جمعہ پڑھا کر کیونکہ مساکین کا حج یہی ہے"۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حج کے عظیم اسلامی اجتماع کے بہت سے برکات نمازِ جمعہ کے اجتماع میں موجود ہوتے ہیں۔ [2]

البتہ یہ بات مدِ نظر رہے کہ شدید مذمتیں نمازِ جمعہ کے ترک کرنے کے بارے میں آئی ہیں، جن میں جمعہ کے ترک کرنے والوں کو منافقین کے زمرہ میں شمار کیا گیا ہے۔ یہ اس صُورت میں ہے کہ جب نماز جمعہ واجب عینی ہو۔ یعنی امام معصوم کے حضور اور ان کے مبسوط الید ہونے کا زمانہ ہو۔ لیکن چونکہ زمانۂ غیبت میں یہ واجب تخییری ہے (نمازِ جمعہ اور نماز ظہر کے درمیان اختیار ہے) اور بطور استخفاف و انکار بھی ترک نہ ہو تو پھر وہ ان مذمتوں کا مشمول نہیں ہو گا۔ اگرچہ نمازِ جمعہ کی عظمت اور اس کی حد سے زیادہ اہمیت اس حالت میں بھی محفوظ ہے۔ (اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔)

۳ : نماز عبادی سیاسی جمعہ کا فلسفہ

نمازِ جمعہ ہر چیز سے پہلے ایک عظیم اجتماعی عبادت ہے اور عبادات کی عمومی تاثیر کہ جو رُوح و جان کو لطیف بنانا، دل کو گناہ کی آلودگیوں سے پاک کرنا اور دل سے معصیت کے زنگ کو اتارنا ہے وہ، اس میں موجود ہے۔ خاص طور پر یہ بات کہ اس میں دو خطبے ہوتے ہیں جو انواع و اقسام کے مواعظ، پند و نصائح اور تقویٰ و پرہیزگاری کا حکم دینے پر مشتمل ہوتے ہیں۔

[1] وسائل شیعہ جلد ۵ حدیث ۱۰

[2] وسائل شیعہ جلد ۵ حدیث ۱۷

لیکن اجتماعی اور سیاسی لحاظ سے یہ ایک عظیم ہفتہ وار کانفرنس ہے، جو حج کی سالانہ کانفرنس کے بعد بزرگ ترین اسلامی کانفرنس ہے۔ اسی وجہ سے اس روایت میں جو پہلے ہم پیغمبر اکرمؐ سے پہلے نقل کر چکے ہیں، یوں آیا ہے کہ جُمعہ ان لوگوں کا حج ہے جو مراسم حج میں شرکت کی قدرت نہیں رکھتے۔

حقیقت میں اِسلام تین عظیم اجتماعوں کو اہمیت دیتا ہے:

۱: روزانہ کے اجتماعات جو نمازِ جماعت میں حاصل ہوتے ہیں۔

۲: ہفتہ وار اجتماع جو نمازِ جمعہ کے اعمال سے حاصل ہوتا ہے۔

۳: حج کا اجتماع جو خانۂ خدا کے پاس ہر سال ایک مرتبہ انجام پاتا ہے۔

ان سب میں سے نمازِ جُمعہ کا اثر بہُت ہی اہم ہے۔ خاص طور پر یہ بات کہ نمازِ جمعہ کے خطبہ میں خطیب کا ایک موضوع اہم سیاسی اجتماعی اور اقتصادی مسائل کے بارے میں ہوتا ہے۔ اس طرح سے اس عظیم اور پُرشکوہ اِجتماع سے ذیل کے برکات حاصل ہو سکتے ہیں:

ا: لوگوں کو معارفِ اِسلامی اور اہم اجتماعی و سیاسی حالات و واقعات سے آگاہ کرنا۔

ب: مُسلمانوں کی صفوں میں ایسی ہم آہنگی اور زیادہ سے زیادہ نظم و اتحاد پیدا کرنا جو دشمنوں کو وحشت میں ڈال دے اور انھیں لرزہ بر اندام کر دے۔

ج: مسلم عوام میں دینی رُوح اور نشاطِ معنوی کی تجدید۔

د: عام مشکلات کے حل کے لیے باہمی تعاوُن حاصل کرنا۔

اسی وجہ سے دشمنانِ اسلام ہمیشہ ایک ایسی جامع الشرائط نمازِ جُمعہ سے خوفزدہ رہتے تھے جس میں خصوصیت کے ساتھ احکام اِسلامی کی رعایت کی جاتی ہو۔

اسی بناء پر نمازِ جمعہ حکومتوں کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک طاقتور ہتھیار رہی ہے۔ البتّہ عادلانہ حکومتیں جیسے پیغمبر اکرمؐ کی حکومت، اس سے اسلام کے نفع کے لیے بہترین استفادہ کیا کرتے تھے اور حکومتہائے جور، جیسے بنی اُمیّہ کی حکومت، اس سے اپنی طاقت اور قدرت کی بُنیادوں کو مضبُوط و محکم کرنے کے لیے سوءِ استفادہ کیا کرتی تھیں۔

ہم طول تاریخ میں مُشاہدہ کرتے ہیں کہ جو شخص یہ چاہتا کہ وہ کسی حکومت کے خلاف قیام کرے تو سب سے پہلے وہ اس کی نمازِ جمعہ میں شرکت سے رُک جایا کرتا تھا جیسا کہ واقعۂ کربلا میں بیان ہُوا ہے کہ شیعوں کا ایک گروہ "سلیمان بن صرد خزاعیؒ" کے گھر میں جمع ہُوا اور انھوں نے کُوفہ سے امام حسینؑ کی خدمت میں ایک خط لکھا کہ جس کا مضمون یہ تھا:

کوفہ میں بنی اُمیّہ کا گورنر نعمان بن بشیر گوشہ نشین ہوگیا ہے اور ہم اس کی نمازِ جُمعہ میں شرکت نہیں کرتے۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ آپ ہماری طرف آ رہے ہیں تو ہم اُسے کوفہ سے نکال دیں گے۔ [1]

[1] بحار الانوار جلد ۴۴ ص ۳۳۳

صحیفۂ سجادیہ میں امام علی بن الحسین علیہما السلام سے وارد ہوا ہے :

"اللّٰهم ان هذا المقام لخلفائك و اصفيائك و مواضع امنائك في الدرجة الرفيعة التي اختصصتهم بها قد ابتزوها"

"خداوندا ! یہ مقام (نمازِ جمعہ اور عید قربان) تیرے خلفاء برگزیدہ ہستیوں اور بلند پایہ امینوں کے لیے مخصوص ہے اور تو نے اس کے لیے انھیں کو مخصوص کیا تھا۔ لیکن (بنی اُمیّہ کے خلفاءِ جور) نے زبردستی اسے اولیاء حق سے لے لیا اور غصب کر لیا ہے"۔[1]

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دشمنانِ اسلام ہفتہ بھر رات دن زہریلے پروپیگنڈے میں مصروف رہتے ہیں لیکن وہ سب کے سب نمازِ جمعہ کے ایک ہی خطبہ اور اُس کے پُرشکوہ اور حیات بخش اعمال سے بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کے جسموں میں ایک نئی رُوح پھونک دی جاتی ہے اور ان کی رگوں میں ایک تازہ خون دوڑنے لگتا ہے۔

اس نکتہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ شیعہ فقہ کے مطابق ہر طرف سے ایک فرسخ کے علاقہ میں ایک سے زیادہ نمازِ جمعہ جائز نہیں ہے تاکہ وہ لوگ جو نمازِ جمعہ کے انعقاد کی جگہ سے دو فرسخ (تقریباً گیارہ کیلومیٹر) کے اندر رہتے ہیں، وہ اس نماز میں شرکت کریں۔ اس حکم سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عملی طور پر ہر چھوٹے اور بڑے شہر اور اس کے اطراف میں ایک سے زیادہ نمازِ جمعہ منعقد نہیں ہوگی۔ اس بنا پر یہی نمازِ جمعہ اِس علاقے کا ایک عظیم ترین اجتماع ہوگا۔

لیکن انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ عبادی سیاسی مراسم جو اسلامی معاشروں میں ایک عظیم تحرّک کا باعث بن سکتے تھے، ان میں فاسد حکومتوں کے نفوذ کی وجہ سے بعض اسلامی ممالک میں یہ ایسے بے رُوح اور بے جان ہو گئے ہیں کہ عملی طور پر ان سے کوئی مثبت اثر حاصل نہیں ہوتا اور ان اجتماعات نے ایک رسمی سے عمل کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مگر واقعتاً یہ ان عظیم سرمایوں میں سے ہے کہ جن کے ضائع ہونے پر رونا چاہیئے۔

سال بھر کی اہم ترین نمازِ جمعہ وہ ہے جو عرفات کی طرف جانے سے پہلے مکّہ میں انجام پاتی ہے۔ اس میں ساری دنیا سے آئے ہوئے خانۂ خدا کے تمام حجّاج شرکت کرتے ہیں جو کرۂ ارض کے مسلمانوں کے تمام طبقات کے واقعی نمائندے ہوتے ہیں۔ ایسی اہم اور حساس نماز کا خطبہ تیار کرنے کے لیے مناسب ہے کہ بہت سے علماء کئی کئی ہفتوں اور مہینوں تک مطالعہ اور تیاری کریں۔ پھر اس کا ماحصل اس حساس دن کے تاریخی خطبے میں تمام مسلمانوں کے سامنے پیش کریں۔ یوں وہ یقینی طور پر اس کی برکت سے اسلامی معاشرے کو زیادہ سے زیادہ

---

[1] صحیفۂ سجادیہ دعا ۴۸

آگاہی دیتے ہوئے اس کی بڑی بڑی مشکلات کو حل کر سکتے ہیں۔

لیکن ان دنوں یہ ایک انتہائی افسوس کی بات دکھائی دیتی ہے کہ حرم پاک میں اس جمعہ پر بہت ہی معمولی اور عام مسائل و مطالب پیش کیے جاتے ہیں جن سے تقریباً سبھی لوگ واقف ہوتے ہیں۔ لیکن وہاں اصولی مسائل کی بالکل کوئی خبر ہی نہیں ہوتی۔ کیا اس قسم کی عظیم فرصت اور عظیم سرمایوں کے ہاتھ سے نکل جانے کے لیے گریہ نہیں کرنا چاہیے؟ اور اس کو بدلنے کے لیے قیام نہیں کرنا چاہیئے؟

❁ ❁ ❁

۴ : نمازِ جمعہ کے آداب اور خطبوں کے مطالب و مضامین

نمازِ جمعہ (ضروری شرائط کی موجودگی میں) بالغ اور صحیح و سالم مردوں پر واجب ہے جو نماز میں شرکت کی طاقت رکھتے ہیں۔ مسافروں اور بوڑھے لوگوں پر واجب نہیں ہے۔ اگرچہ مسافر کے لیے نمازِ جمعہ میں حاضر ہونا جائز ہے۔ اسی طرح سے عورتیں بھی نمازِ جمعہ میں شرکت کر سکتی ہیں اگرچہ وہ ان پر واجب نہیں ہے۔

وہ کم سے کم تعداد پانچ مرد ہے جس سے نمازِ جمعہ منعقد ہو سکتی ہے۔ نماز جمعہ دو رکعت ہے اور وہ نماز ظہر کی جگہ لے لیتی ہے۔ نیز دو خطبے جو نمازِ جمعہ سے پہلے پڑھے جاتے ہیں وہ حقیقت میں دو رکعتوں کی جگہ محسوب ہوتے ہیں۔

نمازِ جمعہ صبح کی نماز کی طرح ہے اور مستحب ہے کہ اس میں حمد و سورہ کو بلند آواز میں پڑھا جائے۔ اس کے علاوہ مستحب ہے کہ پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ اور دوسری رکعت میں سورۂ منافقین کی قرأت کی جائے۔

نمازِ جمعہ میں دو قنوت مستحب ہیں۔ ایک رکعت اوّل میں رکوع سے پہلے اور دوسرا دوسری رکعت میں رکوع کے بعد ہے۔

دو خطبوں کا پڑھنا نمازِ جمعہ سے پہلے واجب ہے، جیسا کہ خطیب کا کھڑے ہو کر خطبہ دینا بھی واجب ہے۔ جو شخص خطبہ دیتا ہے حتمی طور پر نمازِ جمعہ کا امام وہی ہونا چاہیئے۔

خطیب کو اپنی آواز اتنی بلند کرنا چاہیے کہ لوگ اس کی آواز کو سُن لیں، تاکہ خطبہ کا مضمون سب کے کانوں تک پہنچ جائے۔

خطبہ کے دوران سامعین کو خاموش رہنا اور خطیب کی باتوں پر کان دھرنا چاہیئے۔ نیز خطیب کے رُوبرُو بیٹھنا چاہیے۔

خطیب کو مرد فصیح و بلیغ، اوضاع و احوال مسلمین سے آگاہ، اسلامی معاشرے کے مصالح سے باخبر، شجاع، صریح اللہجہ اور اظہارِ حق میں قاطع ہونا چاہیے۔ اس کے اعمال و رفتار اس کے کلام کی تاثیر و نفوذ کا سبب ہونے چاہئیں اور اس کی زندگی لوگوں کو خدا کی یاد دلانے والی ہونی چاہیے۔

مناسب ہے کہ وہ پاکیزہ ترین لباس پہنے ہوئے ہو، اپنے بدن کو خوشبو لگائے، وقار اور سکینہ کے ساتھ قدم اُٹھائے اور جب ممبر پر جائے لوگوں کو سلام کرے، پھر اُن کے سامنے کھڑا ہو جائے اور شمشیر یا کمان یا عصا پر ٹیک لگائے۔ پہلے وہ منبر پر بیٹھ جائے۔ یہاں تک کہ اذان مکمل ہو جائے۔ اذان ختم ہونے کے بعد اُٹھے اور خطبہ شروع کرے۔

خطبہ کا مضمون پہلے خدا کی حمد اور پیغمبر پر درود ہے (احتیاط اس میں ہے کہ یہ حصہ عربی زبان میں ہو لیکن باقی حصہ سُننے والوں کی زبان میں پڑھا جائے) پھر لوگوں کو خوفِ خدا اور تقوٰی کی وصیت و نصیحت کرے۔ قرآن مجید کی کوئی مختصر سی سُورہ پڑھے اور اس امر کی دونوں خطبوں میں رعایت کرے۔ دُوسرے خطبہ میں پیغمبرؐ پر درود کے بعد آئمہ مسلمین کے لیے دُعا کرے اور مومنین و مومنات کے لیے استغفار کرے۔

مناسب ہے کہ خُطبہ کے ضمن میں ایسے اہم مسائل پیش کرے جو مسلمانوں کے دین اور دنیا کے ساتھ مربُوط ہیں۔ اسلامی ممالک کے اندر اور باہر اور اس علاقے کے داخل و خارج میں جن باتوں کی مسلمانوں کو ضرورت و احتیاج ہے ان پر بحث کرے۔ وہ سیاسی، اجتماعی، اقتصادی اور دینی مسائل کو ترجیح کا لحاظ رکھتے ہوئے پیش کرے۔ لوگوں کو آگاہی بخشے اور دشمنوں کی سازشوں سے باخبر کرے۔ بعدہٗ اسلامی معاشرے کی حفاظت اور مخالفین کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے مختصر اور طویل مُدت منصوبے ان کے سامنے بیان کرے۔

خُلاصہ یہ کہ خطیب کو بہُت ہی ہوشیار، بیدار اور اسلامی مسائل کے بارے میں اہلِ فکر اور صاحبِ مُطالعہ ہونا چاہیے۔ اسے جُمعہ کے ان عظیم مراسم کی موقعیت و حیثیت سے اسلام اور مسلمانوں کے اہداف و مقاصد کی کامیابی کے لیے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنا چاہیے۔[1]

ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے آیا ہے:

"انما جعلت الخطبة یوم الجمعة لان الجمعة مشهد عام، فاراد ان یکون للامیر سبب الی موعظتهم وترغیبهم فی الطاعة، وترهیبهم من المعصیة وتوقیفهم علی ما اراد من مصلحة دینهم ودنیاهم ویخبرهم بما ورد علیهم من الآفاق من الاهوال التی لهم فیها المضرة والمنفعة ..... وانما جعلت خطبتین لیکون واحدة للثناء علی الله والتمجید والتقدیس لله عزوجل والاخری للحوائج والاعذار والانذار والدعاء ولما یرید ان یعلمهم من امره ونهیه ما فیه

---

[1] نماز جمعہ کے احکام کی خصوصیات و جزئیات اور اس کے خطبوں میں فقہاء کے فتاوٰی میں جزئی اختلاف ہے۔ جو کچھ اوپر بیان ہُوا ہے وہ مختلف فتاوٰی کا خلاصہ ہے۔

الصلاح والفساد"۔

جمعہ کے دن خطبہ اس لیے شروع کیا گیا ہے کہ نمازِ جمعہ ایک عمومی اجتماع ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے امیر کو یہ موقع فراہم کرے کہ وہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرے، اطاعت کی ترغیب دے، معصیتِ الٰہی سے ڈرائے اور انھیں اس چیز سے آگاہ کرے کہ جس میں ان کے دین و دنیا کی مصلحت اور بہتری ہے۔ نیز وہ اخبار و واقعات جو مختلف علاقوں سے اس تک پہنچے ہیں جو لوگوں کے لیے ان کے سُود و زیاں میں مؤثر ہیں، انھیں ان کی اطلاع دے .... اور دو خطبے اس لیے قرار دیئے گئے ہیں تاکہ ایک میں خدا کی حمد و ثنا اور تمجید و تقدیس کرے اور دُوسرے میں احتیاجات، ضرورتیں، تنبیہیں اور دعائیں قرار دے اور ان کے سامنے اوامر و نواہی، اور ایسے احکام کا اعلان کرے جو اسلامی مُعاشرے کی اصلاح اور فساد کے ساتھ مربُوط ہیں۔ [1]

❖ ❖ ❖

۵ : نمازِ جمعہ کے وجوب کی شرائط

اِس بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ ہر دُوسرے امام جماعت کی طرح امام جمعہ کو بھی عادل ہونا چاہیئے۔ لیکن بحث اس بات میں ہے کہ اس کے علاوہ بھی اس میں کچھ شرائط ہونی ضروری ہیں یا نہیں؟

ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ یہ نماز امامِ معصُوم یا ان کے نمائندۂ خاص کے فرائض میں سے ہے ــــ دُوسرے لفظوں میں یہ امام معصُوم کے زمانہ حضور کے ساتھ مربُوط ہے۔

مگر بہت سے محققین کا نظریہ ہے کہ یہ شرط نمازِ جمعہ کے وجوب عینی کی ہے۔ لیکن وجوب تخییری کے لیے یہ شرط ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا زمانۂ غیبت میں بھی نمازِ جمعہ کو قائم کیا جا سکتا ہے اور وہ نمازِ ظُہر کی جانشین بن سکتی ہے۔ ہاں حق بھی یہی ہے۔ بلکہ جب اِسلامی حکومت اپنی شرائط کے ساتھ امامؑ کے نائبِ عام کی طرف سے تشکیل پائے تو احتیاط یہ ہے کہ امام جمعہ اس کی طرف سے منصوب ہو، اور مُسلمان نمازِ جمعہ میں شرکت کریں۔

اِس سلسلے میں اور نمازِ جمعہ سے مربُوط دوسرے مسائل کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ یہاں ان سب اُمور کا بیان کرنا ایک تفسیری بحث کے احاطہ سے خارج ہے، لہٰذا انھیں فقہ اور حدیث کی کتابوں میں تلاش کرنا چاہیے۔ [2]

❖ ❖ ❖

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۵ ص ۳۹ [2] (اگلے صفحہ پر لکھا گیا ہے)

خداوندا! ہمیں توفیق مرحمت فرما کہ ہم ان عظیم شعائر سے نفوس کی تربیت اور مسلمانوں کو دشمن کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔

پروردگارا! ہمیں ایسے لوگوں میں سے قرار دے کہ ہم تیری ملاقات کے مشتاق ہوں اور موت سے ہرگز نہ ڈریں۔

بارِ الٰہا! نعمتِ ایمان اور انبیاء ؑ کی تعلیم و تربیت کو ہم سے ہرگز سلب نہ کرنا۔

آمین یا رب العالمین

٭ ٭ ٭

سورۂ جمعہ کا اختتام

۱۴ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

اختتام ترجمہ ۱۶ ذیقعدۃ ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۳ جولائی ۱۹۸۷ء بروز پیر بر مکان حقیر، قم مقدس، ایران

ؒ مرحوم علامہ مجلسی نے بحار الانوار کی جلد ۸۹، ۹۰ میں اس اہم مسئلہ اور جمعہ کی باقی خصوصیات کو بیان کیا ہے

سورہ

منافقون

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا اور اس کی ۱۱ آیات ہیں۔

شروع ۱۵ ر رمضان المبارک ۱۴۰۶ ھ

سورہ منافقون کے مَطالب

سُورہٗ منافقون ایسے مطالب و مضامین سے بھرے ہُوئے سوروں میں سے ہے جن کے مباحث کا اصلی محور "منافقین" سے مربُوط حساس مسائل ہیں۔ لیکن اس سُورہ کے ذیل میں کچھ آیات مختلف سلسلوں میں مسلمانوں کے پندو نصائح کے عُنوان سے بھی آئی ہیں۔

مجموعی طور پر اس کے مضامین کو چار حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱ : منافقین کی نشانیاں جو خود کئی حسّاس عنوانوں پر مشتمل ہیں۔

۲ : مومنین کو منافقین سے ہوشیار رہنے کی تلقین اور اس سلسلے میں ہمیشہ نگرانی کی ضرُورت۔

۳ : مومنین کو تنبیہہ کہ دنیا کی مادّی نعمتیں انھیں ذکرِ خُدا سے غافل نہ کر دیں۔

۴ : خدا کی راہ میں خرچ کرنے موت کے آنے اور انسان کی جان میں حسرت کی آگ بھڑکنے سے پہلے، اموال سے فائدہ اُٹھانے کی وصیّت و نصیحت۔

اس کا نام "سُورہٗ منافقون" رکھنے کی وجہ بھی خود بخود واضح ہے۔

قابلِ توجّہ بات یہ ہے کہ ہم نے جو کچھ سورہٗ جمُعہ کی تفسیر میں بیان کیا ہے اس کے مُطابق نمازِ جمُعہ کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ پہلی رکعت میں سورہٗ جمعہ اور دُوسری رکعت میں سورہٗ منافقون پڑھی جائے تاکہ مسلمان ہر ہفتہ ان عظیم عبادی و سیاسی مراسم میں منافقین کی سازشوں کو تازہ بہ تازہ معلوم کرتے رہیں اور ہمیشہ ان کی منحوس تحریکوں تخریب کاریوں اور منصُوبوں پر نظر رکھیں۔

سورہٗ منافقون کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبرِ گرامی سے مروی ہے:

"من قرأ سورة المنافقون برء من النفاق"

"جو شخص سورہٗ منافقون کو پڑھے وہ ہر قسم کے نفاق سے پاک ہو جاتا ہے۔[1]

---

[1] "مجمع البیان" آغاز سورہ منافقون

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے :

"ہمارے شیعوں میں سے ہر مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ شب جمعہ میں "سورۂ جمعہ" اور "سورۂ اعلیٰ" پڑھے اور جمعہ کے دن نماز ظہر میں "سورۂ جمعہ" اور "سورۂ منافقون پڑھے"۔

اس کے بعد آپ نے مزید فرمایا :

"فاذا فعل ذالك فكانما يعمل بعمل رسول الله (ص) وكان جزاؤه وثوابه على الله الجنة."

"جب وہ ایسا کرے گا تو گویا اُس نے حضرت رسولؐ کے عمل کو انجام دیا اور اس کی جزا اور ثواب اللہ کے ہاں جنت ہے"۔[1]

ہم نے ہر سورہ کے فضائل کے ذکر کے بعد بارہا یہ کہا ہے کہ یہ اہم فضائل و آثار، فکر و عمل سے خالی صرف تلاوت کا نتیجہ نہیں ہو سکتے۔ مذکورہ بالا روایات بھی اس بات کی گواہ ہیں کہ زندگی کا طریقہ اس کے مطابق بنائے بغیر اس سورۃ کا پڑھنا انسان میں سے رُوحِ نفاق کو ہرگز خارج نہیں کرتا۔

☆ ☆ ☆

[1] "ثواب الاعمال" مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۳۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ
لَكٰذِبُوْنَ ۚ○
۲ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○
۳ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ
فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ○
۴ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا
تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ
كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ
قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۫ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ○

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خُدا کے نام سے۔

۱ جب مُنافقین تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ یقیناً تو اللہ کا
رسُول ہے، خدا جانتا ہے کہ تو یقیناً اس کا رسُول ہے۔لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں۔

(۲) اُنھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے تاکہ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں ۔ بیشک وہ بہت ہی بُرے کام انجام دیتے ہیں ۔

(۳) یہ اس بناء پر ہے کہ وہ پہلے تو ایمان لائے اور پھر کافر ہو گئے ۔ لہٰذا اُن کے دلوں پر مُہر لگا دی گئی ہے اور وہ حقیقت کو درک نہیں کرتے ۔

(۴) جب تم انھیں دیکھتے ہو تو ان کا جسم اور حلیہ تمھیں تعجب میں ڈال دیتا ہے اور اگر وہ کوئی بات کرتے ہیں تو تو ُان کی باتوں کو کان دھر کے سنتا ہے ۔ حالانکہ وہ ایسی خشک لکڑیاں ہیں جنھیں دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا گیا ہو ۔ جو آواز بھی کہیں سے ُبلند ہوتی ہے اُسے وہ اپنے برخلاف خیال کرتے ہیں ۔ وہ تمھارے حقیقی دشمن ہیں ۔ تم ان سے بچتے رہو ، خدا انھیں ہلاک کرے ، وہ حق سے کس طرح منحرف ہو جاتے ہیں ؟

تفسیر

سرچشمۂ نفاق اور منافقین کی نشانیاں

ان آیات کی تفسیر بیان کرنے سے پہلے ایک مقدمہ کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مسئلہ نفاق اور منافقین ، اسلام میں پہلی مرتبہ اس وقت سامنے آیا جب پیغمبرؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور اسلام کی بنیادیں قوی اور کامیابی آشکار ہو گئی ۔ ورنہ مکہ میں تقریباً کوئی منافق موجود نہیں تھا کیونکہ دشمن اسلام کے برخلاف جو چاہتے کھلم کھلا کہتے اور کرتے اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے ۔ انھیں منافقانہ طرزِ عمل کی کوئی ضرورت نہ تھی ۔

لیکن جب مدینہ میں اسلام کے نفوذ اور پھیلاؤ نے دشمنوں کو ضعیف و ناتواں بنا دیا تو اب مخالفت کا اظہار کھلے عام کرنا مشکل اور بعض اوقات ناممکن تھا ۔ لہٰذا شکست خوردہ دشمنوں نے اپنی تخریبی سرگرمیاں جاری و ساری رکھنے کے لیے اپنے چہرے بدل لیے ۔ وہ ظاہراً مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو گئے ۔ لیکن مخفیانہ طور پر اپنے بُرے مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں رہے ۔

اصولی طور پر ہر انقلاب کی طبیعت و مزاج یہی ہے کہ نمایاں کامیابی کے بعد اُسے منافقین کا سامنا کرنا پڑتا

ہے۔ کل کے سخت ترین دشمن آج کے با اثر افراد کی صورت میں ظاہری دوستوں کے لباس میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ منافقین سے مربوط یہ تمام آیات مدینہ میں کیوں نازل ہوئیں اور مکہ میں کیوں نازل نہ ہوئیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ نفاق اور منافقین کا مسئلہ پیغمبرؐ کے زمانہ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں تھا، بلکہ ہر معاشرہ اور خصوصاً انقلابی معاشرے، اس سے دوچار ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس مسئلہ کے بارے میں قرآن کی تحلیلوں، تجزیوں اور موشگافیوں کو ایک تاریخی مسئلہ کے عنوان سے نہیں ایک بالفعل نیاز و احتیاج کے عنوان سے موردِ تحقیق و تدقیق قرار دیا جانا چاہیے۔ اس سے موجودہ وقت کے اسلامی معاشروں میں رُوحِ نفاق اور منافقین کے طریقوں سے مبارزہ کرنے کے لیے ہدایت حاصل کرنی چاہیے۔

نفاق کی نشانیاں جنھیں قرآن نے شرح و بسط سے بیان کیا ہے، وقت کے ساتھ ان کو بھی پہچاننا چاہیئے اور ان نشانیوں کے ذریعے منافقوں کے طور طریقوں اور منصوبوں کی تہ تک پہنچ جانا چاہیئے۔

ایک دُوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ منافقین کا خطرہ ہر معاشرے کے لیے ہر دشمن کے خطرے سے زیادہ ہے، کیونکہ ایک طرف تو ان کی شناخت عام طور پر آسان نہیں ہوتی اور دوسری طرف وہ داخلی دشمن ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ معاشرے کے تانے بانے میں اس طرح سے نفوذ کرتے ہیں کہ انھیں الگ کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ تیسری طرف سے ان کے باقی ارکان کے معاشرہ سے مختلف روابط ان سے مبارزہ کے کام کو دشوار بنا دیتے ہیں۔

چنانچہ اسی وجہ سے اسلام نے اپنی طویل تاریخ میں زیادہ تر منافقین ہی کے ہاتھوں چوٹ کھائی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے اپنے سخت ترین حملے منافقین ہی پر کیے ہیں اور جس قدر ان کی سرکوبی کی ہے اپنے کسی بھی دشمن کے لیے روا نہیں رکھی۔

اِس مقدمہ پر توجہ کے ساتھ اب ہم آیات کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

پہلی بات جو قرآن یہاں منافقین کے بارے میں پیش کرتا ہے ان کا وہی جھوٹے ایمان کا اظہار ہے کہ جو نفاق کی اصل بنیاد ہے۔ فرماتا ہے: جس وقت منافقین تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو یقیناً اللہ کا رسُول ہے۔ (اذا جاءك المنافقون قالوا نشهد انك لرسول الله)۔[1]

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: "خدا جانتا ہے کہ تو اس کا بھیجا ہُوا ہے لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں: (والله يعلم انك لرسوله والله يشهد ان المنافقين لكاذبون)۔

اِس سے نفاق کی پہلی نشانی واضح ہو جاتی ہے اور وہ ظاہر و باطن کا متفاوت ہونا ہے۔ یعنی وہ تاکید کے ساتھ زبان سے تو اظہارِ ایمان کرتے ہیں لیکن ان کے دل میں ایمان کی کوئی رمق نہیں ہوتی۔ یہ دروغگوئی اور یہ اندر اور باہر

[1] یہاں "ان" مکسور صورت میں ذکر ہُوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خبر کے اوپر لام تاکید آیا ہے اور اس صورت میں تقدیر میں مقدم ہے (البیان فی غریب اعراب القرآن)

کی دورنگی ہی نفاق کے اصلی محور ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ صدق و کذب (سچ اور جھوٹ) دو قسم کے ہوتے ہیں :

۱ : صدق و کذب خبری

۲ : صدق و کذب "مخبری"

پہلی قسم میں تو واقعہ کے موافق یا مخالف ہونا معیار ہوتا ہے جبکہ دوسری قسم میں اعتقاد کی موافقت و مخالفت مدِّنظر ہوتی ہے۔ اس معنی میں کہ اگر انسان کوئی ایسی خبر دیتا ہے جو واقعہ کے مطابق ہے لیکن اس کے عقیدہ کے خلاف ہے تو اس کو ہم کذب مخبری کہتے ہیں اور اگر اس کے عقیدہ کے مطابق ہے تو صدق ہے۔

اس طرح سے منافقوں کا پیغمبر اسلامؐ کی رسالت کی گواہی دینا خبر دینے کے لحاظ سے بالکل جھوٹ نہیں تھا بلکہ یہ ایک واقعیت تھی۔ لیکن کہنے والے اور مخبر کے لحاظ سے چونکہ یہ ان کے عقیدہ کے برخلاف تھا، لہٰذا جھوٹ شمار ہوتا تھا۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ تو خدا کا پیغمبر تو ہے لیکن یہ منافق جھوٹ بولتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں منافقین یہ نہیں چاہتے تھے کہ پیغمبرؐ کی رسالت کی خبر دیں۔ بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ آنحضرتؐ کی نبوت کے بارے میں اپنے اعتقاد کی خبر دیں۔ اور یقیناً اس خبر میں وہ جھوٹے تھے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ انھوں نے اپنی گواہی میں انواع و اقسام کی تاکیدیں استعمال کی ہیں[1]۔ اور خدا تعالےٰ بھی قطعیت کے ساتھ، اسی لب و لہجہ میں ان کی تکذیب کرتا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسی قطعیت کے مقابلہ میں اسی قسم کی قطعیت ضروری ہے۔

یہاں اس نکتہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ "منافق" اصل میں "نفق" (بروزن نفخ) کے مادہ سے نفوذ و پیش روی کے معنی میں ہے۔ لیکن "نفق" (بروزن شفق) کھال اور اس نقب کے معنی میں ہے جو زیر زمین لگاتے اور اس سے چھپنے یا بھاگنے کے لیے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ بہت سے جانور جیسے صحرائی چوہے، لومڑی اور سوسمار اپنے رہنے کے لیے بلوں میں دو سوراخ بناتے ہیں، ایک ظاہری جس سے داخل اور خارج ہوتے ہیں اور دوسرا پوشیدہ۔ جب وہ کوئی خطرہ محسوس کرتے ہیں تو مخفی راستے سے بھاگ جاتے ہیں اور اس پوشیدہ سوراخ کو "نافقاء" کہتے ہیں[2]۔

اس طرح سے منافق شخص وہ ہے جس نے ایک پوشیدہ اور مخفی راستہ اپنے لیے رکھا ہوا ہوتا ہے تاکہ پوشیدہ اور اور مخفی طریقہ سے کام کرتے ہوئے معاشرے میں نفوذ کرے اور خطرے کے وقت دوسری راہ سے فرار ہو جائے۔

❖ ❖ ❖

---

[1] منافقین نے "جملہ اسمیہ" سے استفادہ کیا اور اسی طرح "اِنّ" اور "لام تاکید" سے اپنے قول کو صداقت پر مبنی ظاہر کیا۔

[2] "روح البیان" جلد ۹ ص ۵۲۹

بعد والی آیت میں ان کی دُوسری نشانی بیان کرتے ہُوئے اِس طرح کہتا ہے : "انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنایا ہُوا ہے تاکہ وہ لوگوں کو خدا کی راہ سے باز رکھیں" (اتخذوا ایمانھم جنۃ فصدوا عن سبیل اللہ)۔

" وہ بہت ہی بُرے کام انجام دیتے ہیں" (انھم ساء ما کانوا یعملون)۔

کیونکہ ظاہر میں تو وہ ایمان کا اظہار کرتے ہیں اور باطن میں کفر کرتے ہیں۔ یوں دینِ حق کی طرف لوگوں کی ہدایت کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ ہاں تو اس سے بدتر اور قبیح تر عمل اور کیا ہوگا۔

"جُنَّۃ" "جن" (بروزن فن) کے مادّہ سے۔ اصل میں کسی چیز کو حس سے پنہاں کرنے کے معنی میں ہے۔ نیز "جن" (بروزن رس) ایک نظر نہ آنے والا موجود ہے، لہٰذا اس لفظ کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔ چُونکہ "ڈھال" ان کو دشمن کے اسلحہ کی ضربوں سے چھپا کر رکھتی ہے، اس لیے عربی زبان میں اُسے "جنۃ" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ درختوں سے بھرے پُرے باغ کو ان کی زمین کے مستوُر ہونے کی بناء پر "جنّت" کہتے ہیں۔

بہرحال یہ نفاق کی نشانیوں میں سے ایک ہے کہ وہ اپنے آپ کو خُدا کے مقدس نام اور شدید قسموں کی آڑ میں چھُپا لیتے ہیں تاکہ ان کا اصلی چہرہ دکھائی نہ دے۔ اِس طرح وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرکے انھیں غفلت میں ڈال دیتے ہیں اور "صد عن سبیل اللہ" (لوگوں کو خدا کی راہ سے باز رکھتے ہیں۔)

ضمنی طور پر یہ تعبیر اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ منافق ہمیشہ مومنین کے ساتھ جنگ و جدال کی حالت میں ہیں۔ لہٰذا ان کی ظاہر داری اور چرب زبانی سے ہرگز دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔ کیونکہ ڈھال کا انتخاب جنگ کے میدانوں کے ساتھ مخصُوص ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ بعض مواقع پر انسان کے لیے قسم کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا یا کم از کم قسم موردِ نظر موضوع کی اہمیّت میں اضافہ کرتی ہے۔ لیکن وہ جھُوٹی قسم نہیں ہے اور نہ ہی ہر چیز اور ہر کام کے لیے قسم کہ یہ منافقین کا شیوہ اور طریقہ ہے۔

سورۂ توبہ کی آیت ۷۴ میں آیا ہے یحلفون باللہ ما قالوا ولقد قالوا کلمۃ الکفر "وہ خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ انھوں نے (پیغمبر کی پیٹھ پیچھے چبھنے والی باتیں) نہیں کیں۔ حالانکہ یقیناً انھوں نے کفر آمیز باتیں کی ہیں"۔

مفسّرین نے "صدوا عن سبیل اللہ" کے جُملہ کے دو معانی بیان کیے ہیں۔ پہلا راہِ خُدا سے اعراض کرنا اور دوسرا اوروں کو اس راہ سے باز رکھنا۔ اگرچہ زیرِ بحث آیت میں دونوں معانی کو جمع کرنا ممکن ہے۔ لیکن ان کے جھوٹی قسمیں کھانے کی طرف توجّہ کرتے ہُوئے دُوسرا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔ کیونکہ ان قسموں کا ہدف اور مقصد دوسروں کو غفلت میں رکھنا ہوتا ہے۔

وہ ایک جگہ "مسجد ضرار" بناتے ہیں، جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ اس سے تمہارا مقصد کیا ہے تو قسم کھا کر

کہتے ہیں کہ خیر کے سوا ہمارا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ (توبہ: ۱۰۷)

دُوسرے مواقع پر ان جنگوں میں شریک ہوتے ہیں جن کا فاصلہ تھوڑا اور غنیمتوں کا احتمال زیادہ ہے۔ لیکن معرکۂ تبوک جو مشکلات سے پُر ہے اس میں شرکت نہ کرنے کے لیے ہزارہا بہانے اور عذر کرتے ہیں بلکہ قسم کھاتے ہیں کہ اگر ہم میں توانائی ہوتی تو تمہارے ساتھ ضرور چل پڑتے۔ (توبہ: ۴۲)

وہ نہ صرف لوگوں کے سامنے جھوٹی قسم کھاتے ہیں بلکہ جیسا کہ سورہ مُجادلہ کی آیت ۱۸ میں آیا ہے۔ وہ عرصۂ محشر میں بارگاہِ خداوندی میں بھی جھوٹی قسم سے متوسل ہوں گے۔ یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ عمل ان کے وجُود میں رچ بس چکا ہے، یہاں تک کہ وہ عرصۂ محشر میں خدا کی بارگاہ میں بھی اس سے دستبردار نہیں ہوں گے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں اس قسم کے ناروا اعمال کی علتِ اصلی کو پیش کرتے ہُوئے مزید کہتا ہے: "اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے تو وہ ایمان لائے اور اس کے بعد کافر ہو گئے ہیں۔ اس لیے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی اور وہ حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔" (ذالك بانهم امنوا ثم كفروا فطبع علٰى قلوبهم فهم لا يفقهون)۔

بہت سے مفسّرین کا نظریہ ہے کہ اس ایمان سے مراد یہاں ایمانِ ظاہری ہے جبکہ وہ باطن میں کافر ہی تھے۔

لیکن آیت کا ظاہر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ابتداء میں وہ حقیقتاً ایمان لے آئے تھے۔ لیکن ایمان کا ذائقہ چکھنے اور اسلام و قرآن کی حقانیت کی نشانیاں دیکھ لینے کے بعد اُنھوں نے کفر کی راہ اختیار کر لی مگر ایسا کفر جو نفاق سے توأم تھا، نہ کہ آشکارا اور صراحت کے ساتھ۔ اور یہی بات اس چیز کا سبب بن گئی کہ خدا ان سے حسِّ تشخیص سلب کرے اور وہ حقائق کے ادراک سے محرُوم رہ جائیں۔ کیونکہ اگر انھوں نے ابتداء سے ہی حق کی تشخیص نہ کی ہوتی تو پھر وہ کچھ عُذر رکھتے تھے۔ لیکن حق کو پہچان لینے اور ایمان لانے کے بعد اگر وہ اسے ٹھکرا دیں تو خُدا اُن سے اپنی توفیق سلب کر لیتا ہے۔

حقیقت میں منافقین کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ تو وہ ہے جن کا ایمان پہلے سے ہی نمائشی اور ظاہری تھا دوسرا گروہ وہ ہے جو ابتداء میں تو حقیقتاً ایمان لے آیا لیکن بعد میں اس نے ارتداد و نفاق کی راہ اختیار کر لی۔ زیرِ بحث آیت کا ظاہر دُوسرے گروہ کی بات کرتا ہے۔

حقیقت میں یہ آیت سورہ توبہ کی آیت ۷۴ کے مشابہ ہے کہ جو کہتی ہے: وكفروا بعد اسلامهم "وہ اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے۔"

بہرحال یہ ان کی تیسری نشانی ہے کہ وہ واضح حقائق کے ادراک سے عام طور محروم ہیں۔ یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ یہ چیز ہرگز جبر و اکراہ نہیں ہے، کیونکہ اس کے مقدمات کو انہوں نے خود فراہم کیا ہے۔

بعد والی آیت ان کی مزید نشانیاں بتاتے ہوئے کہتی ہے :
"جب تم انھیں دیکھو گے تو ان کا جسم اور صورت تمھیں تعجب میں ڈال دے گا" (و اذا رأیتھم تعجبك اجسامھم)۔
۱ان کا ظاہر آراستہ اور ان کی شکل وصورت بڑی عمدہ نظر آتی ہے۔
علاوہ ازیں وہ ایسی شیریں اور پُرکشش باتیں کرتے ہیں کہ "جب وہ گفتگو شروع کرتے ہیں تو تم بھی ان کی باتوں کو کان دھر کے سُنتے ہو" (و ان یقولوا تسمع لقولھم)۔
جہاں پیغمبرؐ ظاہرًا ان کی باتوں کی کشش سے متاثر ہو جائے وہاں دوسروں کا معاملہ تو اور بھی آگے جاتا ہے۔
یہ تو ظاہری لحاظ سے ہے، لیکن باطنی طور پر : "وہ ایسی خشک لکڑیوں کے مانند ہیں جنھیں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا کر دیا گیا ہو" (کانھم خشب مسندۃ)۔
وہ ایسے جسم ہیں جن میں رُوح نہیں ہے۔ بے معنی شکلیں اور اندر سے خالی ہیکلیں ہیں۔ نہ خُود سے کوئی استقلال رکھتے ہیں، نہ باطن میں کوئی نور وصفائی، نہ کوئی محکم ارادہ ہے اور نہ ہی اس میں کچھ ایمان ہے۔ وہ ٹھیک خشک لکڑیوں کی طرح ہیں جنھیں دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا ہو۔
بعض مفسرین نے روایت کی ہے کہ منافقین کا سرغنہ "عبداللہ بن اُبی" ایک موٹا تازہ، خوبصورت، فصیح وبلیغ اور چکنی چپڑی باتیں بنانے والا آدمی تھا۔ جب وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حضرت رسولؐ کی مجلس میں داخل ہوتا تو اصحاب اس کے ظاہر سے تعجب کرتے اور اس کی باتیں کان دھر کے سُنتے۔ لیکن وہ (اپنے غرور ونخوت کی بنا پر) دیوار کے پاس جا کر اس کا تکیہ بناتے اور مجلس کو اپنی ظاہری صورت اور باتوں سے متاثر کرتے۔ [۱] یہ آیت ان کی اِس حالت کو بیان کر رہی ہے۔
اس کے بعد مزید کہتا ہے : "وہ اس طرح اندر سے کھوکھلے، خُدا پر توکل اور اپنے نفس پر اعتماد سے محروم ہیں کہ وہ ہر آواز کو جا ہے وہ جہاں سے بھی بلند ہوا اپنے برخلاف سمجھتے ہیں" (یحسبون کل صیحۃ علیھم)۔
ایک عجیب قسم کا خوف اور دہشت ہمیشہ اُن کے دل وجان پر چھائی رہتی ہے۔ ایک بدظنی اور جانکاہ بدبینی کی حالت نے ان کی رُوح کو سرتا سر گھیرے میں لیا ہوا ہے اور "الخائن خائف" کے مُطابق ہر چیز سے، یہاں تک کہ اپنے سائے سے بھی ڈرتے ہیں۔ اور یہ ان کی نشانیوں میں سے ایک اور نشانی ہے۔
آیت کے آخر میں پیغمبرؐ کو خبردار کرتا ہے کہ "یہ لوگ واقعی تمھارے دشمن ہیں، لہٰذا ان سے بچتے رہو (ھم

---

[۱] کشاف جلد ۴ ص ۵۴۰

العدوّ فاحذرهم)۔

اس کے بعد کہتا ہے: "خدا انہیں ہلاک کرے۔ وہ حق سے کس طرح منحرف ہوتے ہیں؟" (قاتلهم الله انّٰی یؤفکون)۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ تعبیر خبر کے طور پر نہیں ہے۔ بلکہ نفرین کی صورت میں ہے اور اس گروہ کی مذمت، سرزنش اور تحقیر کے طور پر ذکر ہوئی ہے، ان روز مرّہ کی تعبیروں کی مانند جو افراد انسانی ایک دوسرے کے بارے میں کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح قرآن خود لوگوں کی زبان میں اُن سے بات چیت کرتا ہے۔

اسی طرح سے زیرِ بحث آیت میں منافقین کی مزید نشانیاں بھی بیان کی گئی ہیں، منجملہ ان کے: ظاہری فریب دینے والی وضع و کیفیت، اندر سے کھوکھلے پن کے ساتھ، اسی طرح ہر چیز اور ہر حادثہ و واقعہ کے بارے میں خوف، دہشت اور بدگمانی وغیرہ ہے۔

✧ ✧ ✧

(۵) وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ
لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ۝
(۶) سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ
لَهُمْ ۚ لَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْفَاسِقِينَ ۝
(۷) هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنْفِقُوا عَلَىٰ مَنْ عِنْدَ
رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنْفَضُّوا ۗ وَلِلَّهِ خَزَائِنُ السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضِ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ ۝
(۸) يَقُولُونَ لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ
مِنْهَا الْأَذَلَّ ۚ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ
الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝

ترجمہ

(۵) جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ (تم رسولؐ کے پاس) آؤ تاکہ حضرت رسولؐ تمہارے لیے استغفار کریں، تو وہ اپنے سروں کو (استہزاء، تکبر اور غرور سے) ہلانے لگتے ہیں اور تم دیکھو گے کہ وہ تمہاری باتوں سے اعراض کرتے ہوئے تکبر کر رہے ہیں۔

(۶) تم ان کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو، ان کے لیے کوئی فرق نہیں ہے۔ خدا انھیں ہرگز

نہیں بخشے گا۔ کیونکہ خدا فاسق قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

(۷) وہ تو ایسے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو رسُول اللہ کے پاس ہیں کچھ خرچ نہ کرو تاکہ وہ سب کے سب پراگندہ ہو جائیں اور (وہ اس بات سے غافل ہیں کہ) آسمانوں اور زمین کے خزانے خدا ہی کے لیے ہیں لیکن منافقین نہیں سمجھتے۔

(۸) وہ یہ کہتے ہیں اگر ہم مدینہ کی طرف لوٹ گئے تو عزت دار لوگ ذلیلوں کو باہر نکال دیں گے، حالانکہ عزت خُدا، اس کے رسولؐ اور مومنین کے لیے مخصُوص ہے۔ لیکن منافق نہیں جانتے۔

شانِ نزول

تاریخ، حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں اوپر والی آیات کے لیے ایک مفصل شانِ نزول بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

غزوۂ بنی المصطلق کے بعد (یہ جنگ ہجرت کے چھٹے سال سرزمین "قدید" میں واقع ہوئی) مسلمانوں میں سے دو افراد کے درمیان جن میں سے ایک انصار میں سے اور دُوسرا مہاجرین میں سے تھا، کنوئیں سے پانی لینے کے وقت اختلاف ہو گیا۔ ایک نے انصار کو اور دُوسرے نے مہاجرین کو اپنی مدد کے لیے پکارا۔ مہاجرین میں سے ایک شخص اپنے ساتھی کی مدد کے لیے آیا اور "عبداللہ بن ابیّ" جو منافقین کے مشہور سرغنوں میں سے تھا، وہ انصاری کی مدد کے لیے آگے بڑھا اور تب اُن دونوں کے درمیان شدید تو تکار ہوئی۔ "عبداللہ بن ابیّ" سخت غصہ میں آگیا جب کہ اس کی قوم کے کچھ اور لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ اُس نے کہا: "ہم نے اس گروہِ مُہاجرین کو پناہ دی اور ان کی مدد کی لیکن ہمارا مُعاملہ اس ضرب المثل کی مانند ہے جو کہتی ہے: "سمن کلبك یأکلك" (اپنے کتے کو موٹا کر دے تاکہ وہ تجھے کاٹ کھائے) واللہ لئن رجعنا الی المدینة لیخرجن الاعز منها الاذل۔ "خدا کی قسم! اگر ہم مدینہ پلٹ گئے تو عزت دار ذلیلوں کو باہر نکال دیں گے۔" یہاں عزت داروں سے اس کی مُراد وہ خود اور اس کے پیروکار تھے، اور ذلیلوں سے مُراد مہاجرین تھے۔ اس کے بعد اس نے اپنے ساتھ والوں سے کہا: "یہ اس کام کا نتیجہ ہے جو خُود تم نے اپنے سروں پر تھوپ لیا ہے۔ تم نے انھیں اپنے شہر میں جگہ دی، اور اپنے مال ان میں تقسیم کیے۔ اگر تم اپنی بچی ہُوئی غذا اس جبیوں کو (اس مدِمقابل مہاجر کی طرف اشارہ ہے) نہ دیتے تو یہ تمھاری گردن پر سوار نہ ہوتے، تمھاری سرزمین سے چلے جاتے اور اپنے قبائل سے جا ملتے۔

اس موقع پر "زید بن ارقم" نے جو اس وقت ایک نوخیز جوان تھا "عبدُاللہ بن ابی کی طرف مُنہ کر کے کہا: "خُدا کی قسم! ذلیل اور کمینہ تو ہی ہے۔ محمّدؐ خدا کی عزّت اور مُسلمانوں کی محبّت میں ہیں۔ خدا کی قسم! میں آج سے تجھے دوست نہیں رکھوں گا" عبداللہ نے چلّا کر کہا: "اے لڑکے خاموش رہ، تو اپنے کھیل کود سے کام رکھ"! زید بن ارقم حضرت رسُولؐ کی خدمت میں آیا اور سارا ماجرا کہہ سُنایا۔

پیغمبرؐ نے کسی کو "عبداللہ" کے پاس بھیج کر اُسے بلایا اور فرمایا:

"یہ کیا بات ہے جو مجھ سے بیان کی گئی ہے"؟

عبداللہ نے کہا: "اس خدا کی قسم ہے جس نے آپ پر آسمانی کتاب نازل کی ہے میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی اور زید جھوٹ بولتا ہے"۔

انصار کے کچھ لوگ وہاں موجود تھے، اُنھوں نے عرض کیا: "یا رسُول اللہؐ! عبداللہ ہمارا بزرگ ہے۔ لہٰذا انصار کے بچّوں میں سے ایک بچّے کی بات اس کے برخلاف قبول نہ کیجئے۔ لہٰذا پیغمبرؐ نے ان کا عُذر قبول کر لیا تو اس موقع پر گروہِ انصار نے "زید بن ارقم" کو ملامت اور سرزنش کی۔

پیغمبرؐ نے کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ بزرگانِ انصار میں سے ایک شخص "اُسید" نامی آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! آپ نے ایک نامناسب وقت میں کوچ کر دیا ہے"۔ آپ نے فرمایا: "ہاں! کیا تُو نے سُنا نہیں ہے کہ تیرے ساتھی عبداللہ نے کیا کہا ہے؟ اُس نے یہ کہا ہے کہ جب وہ مدینہ پلٹ جائے گا تو عزّت والے ذلیلوں کو وہاں سے نکال دیں گے"۔

اُسید نے کہا: "یا رسول اللہ! اگر آپ چاہیں تو اُسے مدینے سے باہر نکال سکتے ہیں۔ خدا کی قسم آپ عزّت دار ہیں اور وہ ذلیل ہے"۔ پھر اُس نے عرض کیا: "یا رسُول اللہؐ! اس کے ساتھ نرمی کیجئے"۔

عبدُاللہ کی باتیں اس کے بیٹے کے کانوں تک پہنچیں تو وہ رسُول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "میں نے سُنا ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ میرے باپ کو قتل کر دیں، اگر ایسا مُعاملہ ہے تو خود مجھے حکم دیجیے کہ میں اس کا سر قلم کر کے آپ کی خدمت میں لے آؤں، کیونکہ سب لوگ جانتے ہیں کہ کوئی بھی شخص اپنے ماں باپ کی نسبت مجھ سے زیادہ نیک رفتار نہیں ہے۔ میں اس سے ڈرتا ہوں کہ کوئی اور اُسے قتل کرے اور میں اس کے بعد اپنے باپ کے قاتل کو نہ دیکھ سکوں گا اور خدانخواستہ میں اُسے قتل کر دوں اور اس قتلِ مومن کی پاداش میں جنّت کے بجائے جہنّم میں چلا جاؤں۔

پیغمبرؐ نے فرمایا: "تیرے باپ کے قتل کا مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ جب تک وہ ہمارے ساتھ ہے، تو اس کے ساتھ مدارا اور نیکی کرتا رہ"۔

اس کے بعد پیغمبرؐ نے حکم دیا کہ سارا دن اور ساری رات لشکر چلتا رہے۔ دُوسرے دن جب سُورج نکل آیا تو آپ نے ٹھہرنے کا حکم دیا۔ لشکر اس قدر تھک گیا تھا کہ زمین پر سر رکھتے ہی سب گہری نیند سو گئے (اور پیغمبرؐ

کا مقصد بھی یہی تھا کہ لوگ کل کا ماجرا اور عبداللہ بن ابی کی بات کو بھول جائیں۔)

آخر کار پیغمبرؐ مدینہ میں وارد ہوئے۔ زید بن ارقم کہتے ہیں کہ میں شدتِ غم اور شرم کے مارے گھر کے اندر ہی رہا اور باہر نہ نکلا۔ اس موقع پر سورۂ منافقون نازل ہوئی کہ جس نے زید کی تصدیق اور عبداللہ کی تکذیب کی۔ پیغمبرؐ نے زید کا کان پکڑ کر فرمایا: "اے جوان! خدا نے تیری بات کی تصدیق کر دی، بالکل اسی طرح سے جیسا کہ تو نے اپنے کانوں سے سنا اور دل میں محفوظ رکھا تھا، خدا نے اس چیز کے بارے میں جو تو نے کہی، قرآن کی آیات نازل کی ہیں۔"

اس موقع پر عبداللہ بن ابی مدینہ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ جب اس نے چاہا کہ مدینہ میں داخل ہو جائے تو اس کے بیٹے نے آکر اس کا راستہ روک لیا۔ عبداللہ نے کہا: "وائے ہو تجھ پر۔ یہ کیا کر رہا ہے؟" اس کے بیٹے نے کہا۔ "خدا کی قسم! رسول خداؐ کی اجازت کے بغیر تو مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور آج تو سمجھ لے گا کہ عزیز کون ہے، اور ذلیل کون؟"

عبداللہ نے اپنے بیٹے کی شکایت رسول خداؐ کی خدمت میں پہنچائی، تو پیغمبرؐ نے اس کے بیٹے کو پیغام بھیجا کہ اپنے باپ کو مدینہ میں داخل ہونے دو۔ تب اس کے بیٹے نے کہا: "اب رسولِ خدا کی اجازت ہو گئی ہے لہٰذا اب تمہارے داخل شہر ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔"

عبداللہ شہر میں داخل ہوا لیکن کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ وہ بیمار پڑ گیا اور پھر دنیا سے چل بسا (اور شاید اُسے جان لیوا تپِ دق ہو گیا تھا۔)

جس وقت یہ آیات نازل ہوئیں اور عبداللہ کا جھوٹ ظاہر ہو گیا تو بعض لوگوں نے اُس سے کہا:

"تیرے بارے میں شدید تر آیات نازل ہوئی ہیں تو پیغمبرؐ کی خدمت میں جا تاکہ وہ تیرے لیے استغفار کریں"۔ اس پر عبداللہ نے اپنے سر کو ہلاتے ہوئے کہا:

"تم نے مجھ سے کہا ایمان لے آ تو میں ایمان لے آیا، تم نے کہا زکوٰۃ دے تو میں نے زکوٰۃ دی۔ اب اس کے سوا کچھ باقی نہیں رہا کہ کہو، محمدؐ کے لیے سجدہ کر! اس موقع پر آیت و اذا قیل لهم تعالوا نازل ہوئی[1]

❖ ❖ ❖

تفسیر

منافقین کی دیگر نشانیاں

ان آیات میں منافقین کے اعمال اور ان کی گوناگوں نشانیوں کا بیان اسی طرح سے جاری ہے۔ فرماتا ہے:

---

[1] "مجمع البیان" زیر بحث آیات کے ذیل میں کامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۱۹۲، سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص ۳۰۲ (تھوڑے سے فرق کے ساتھ)

"جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ آؤ تاکہ رسولِ خدا تمھارے لیے استغفار کریں تو وہ اپنے سروں کو استہزاء اور کبرو نخوت کے ساتھ ہلاتے ہیں۔ اور تو دیکھے گا کہ وہ تیری باتوں سے اعراض کرتے ہوئے تکبّر کر رہے ہیں۔" (واذا قیل لھم تعالوا یستغفر لکم رسول الله لووا رءوسھم ورأیتھم یصدون و ھم مستکبرون)۔

ہاں! ان لغزشوں کے مقابلہ میں جو ان سے سرزد ہوتی ہیں اور ان کے پاس توبہ اور تلافی کی فرصت بھی ہوتی ہے، ان کا کبرو غرور انھیں تلافی کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ اس کا واضح نمونہ "عبداللہ بن ابی" تھا کہ جس کا عجیب و غریب ماجرا شانِ نزول میں بیان ہوا ہے۔

جس وقت اُس نے وہ قبیح اور ناروا بات پیغمبرؐ اور مومن مہاجرین کے بارے میں کہی: "جب ہم مدینہ کی طرف پلٹ کر جائیں گے تو عزّت والے ذلیلوں کو باہر نکال دیں گے"، اس پر قرآنی آیات نازل ہوئیں اور اس کی شدید مذمّت ہوئی۔ لوگوں نے اُس سے کہا کہ وہ رسولِ خدا کے پاس آئے تاکہ حضورؐ اس کے لیے بارگاہِ خداوندی سے بخشش طلب کریں۔ مگر اُس نے ایک اور ناروا بات کی کہ جس کا ماحصل یہ تھا: "تم نے کہا ایمان لے آ، میں ایمان لے آیا تم نے کہا زکوٰۃ دے، میں نے زکوٰۃ دی۔ اب بجز اس کے کوئی چیز باقی نہیں رہی کہ کہو محمدؐ کے لیے سجدہ کر!"

یہ بات واضح ہے کہ روحِ اسلام حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے اور کبرو غرور ہمیشہ اس تسلیم میں رکاوٹ ہے۔ اسی بناء پر منافقین کی ایک نشانی، بلکہ اسی غرور، خود خواہی اور خود کو برتر سمجھنے ہی کو نفاق کا ایک سبب شمار کیا جا سکتا ہے۔

"لووا" "لی" کے مادہ سے اصل میں "رسّی کو بَل دینے" کے معنی میں ہے۔ اور اسی مناسبت سے منہ پھیرنے یا سر کو حرکت دینے اور ہلانے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

یصدون جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں دو معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ "منع کرنا" اور "اعراض کرنا" زیرِ بحث آیت میں دوسرا معنی اور گزشتہ آیت میں پہلا معنی مناسب ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں ہر قسم کے ابہام کو دور کرنے کے لیے اس سلسلہ میں مزید کہتا ہے: "بالفرض اگر وہ تیرے پاس آئیں اور تو ان کے لیے استغفار بھی کرلے تو ان میں بخشش کے اسباب موجود ہی نہیں ہیں۔ اس بناء پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تو ان کے لیے استغفار کرے یا نہ کرے، خدا انھیں ہرگز نہیں بخشے گا۔" (سواء علیھم استغفرت لھم ام لم تستغفر لھم لن یغفر الله لھم)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ "خدا فاسق قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔" (ان الله لا یھدی القوم الفاسقین)۔

دوسرے لفظوں میں پیغمبرؐ کی استغفار بخشش کے لیے علّتِ تامہ نہیں، بلکہ مقتضی ہے۔ یہ صرف اسی صورت

میں اثر کرتی ہے جبکہ موافق اسباب اور ضروری قابلیت فراہم ہو۔ اگر وہ واقعتاً توبہ کر لیں، اپنی راہ کو بدل لیں، کبر و غرور کی سواری سے اُتر آئیں اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں تو پیغمبرؐ کی استغفار یقیناً مؤثر ہے۔ اس صورت کے علاوہ کچھ بھی اثر نہ ہوگا۔

اسی معنی کے مشابہ سورۂ توبہ کی آیت ۸۰ میں بھی آیا ہے جو منافقین کے ایک اور گروہ کے بارے میں کہتی ہے: استغفر لهم اولا تستغفر لهم ان تستغفرلهم سبعين مرة فلن يغفرالله لهم ذالك بانهم كفروا بالله ورسوله والله لا يهدى القوم الفاسقين۔

"چاہے تم ان کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اگر تم ستر مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار کرو گے تو بھی خدا ان کو نہیں بخشے گا۔ کیونکہ وہ خدا اور اُس کے رسُولؐ کے مُنکر ہو گئے ہیں اور خدا فاسق قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

یہ بات واضح ہے کہ ستّر تکثیر کا عدد ہے۔ یعنی چاہے جتنی مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار کرو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

یہ نکتہ بھی معلوم ہے کہ فاسق سے مُراد ہر قسم کا گنہگار نہیں ہے۔ کیونکہ پیغمبر گناہگاروں کی نجات کے لیے ہی آئے ہیں، بلکہ اس سے مُراد وہ گنہ گار ہیں جو گناہوں پر اصرار کرتے ہیں، ہٹ دھرم ہیں اور حق کے مقابلے میں سرکش ہیں۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد ان کی ایک بہُت ہی بُری بات کی طرف، جو ان کے نفاق کی واضح ترین نشانی شمار ہوتی ہے، اشارہ کرتے ہُوئے کہتا ہے: "یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں ان افراد پر جو رسُولِ خُدا کے پاس ہیں کچھ خرچ نہ کرو اور اپنے مال اور امکانات کو ان کے اختیار میں نہ دو تاکہ وہ پراگندہ ہو جائیں۔" (هم الذين يقولون لاتنفقوا على من عند رسول الله حتّٰى ينفضوا)۔

"وہ اس بات سے غافل ہیں کہ آسمانوں اور زمین کے تمام خزانے خدا ہی کے لیے ہیں، لیکن منافقین سمجھتے نہیں ہیں۔" (ولله خزائن السماوات والارض ولٰكن المنافقين لا يفقهون)۔

❖ ❖ ❖

یہ بدبخت نہیں جانتے کہ ہر شخص کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا ہی کا دیا ہُوا ہے اور تمام بندے اسی کے خوان سے روزی کھاتے ہیں۔ اگر 'انصار' مہاجرین کو پناہ دے سکتے ہیں اور انھیں اپنے مال میں حصہ دار اور شریک بنا سکتے ہیں تو یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے جو انھیں نصیب ہے۔ لہٰذا انھیں نہ صرف یہ کہ احسان نہیں جتانا چاہیے، بلکہ خدا کا اس عظیم توفیق پر شکر ادا کرنا چاہیے، لیکن جیسا کہ شانِ نزول میں بیان ہُوا ہے منافقین کی منطق کچھ اور ہی تھی۔

❖ ❖ ❖

اِس کے بعد ان کی ایک اور نفرت انگیز بات کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے مزید کہتا ہے: (یقولون لئن رجعنا الی المدینة لیخرجن الاعز منھا الاذل)۔

یہ وہی گفتگو ہے جو عبداللہ بن ابیّ کے آلودہ دہن سے نکلی اور اس کی مراد یہ تھی کہ ہم مدینہ کے رہنے والے رسُول اللہؐ اور مومن مہاجرین کو مدینہ سے باہر نکال دیں گے۔ مدینہ کی طرف لوٹنے سے مُراد غزوۂ "بنی المصطلق" سے لوٹنا تھا، اور اس کی طرف شانِ نزول میں تفصیل کے ساتھ اشارہ ہو چُکا ہے۔

اگرچہ یہ بات صرف ایک ہی شخص نے کہی تھی لیکن چُونکہ سب منافقین کا طرزِ عمل اور طریقۂ کار یہی تھا، لہٰذا قرآن جمع کی صُورت میں تعبیر کرتے ہُوئے فرماتا ہے: **یقولون**...(وہ کہتے ہیں)

اِس کے بعد قرآن انھیں دندان شکن جواب دیتے ہُوئے کہتا ہے: "عزّت تو خدا، رسولؐ اور مومنین کے لیے مخصوص ہے لیکن منافقین نہیں جانتے۔" (وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین ولکن المنافقین لا یعلمون)۔

یہ صرف مدینہ کے مُنافقین ہی نہیں تھے کہ جنھوں نے مومن مہاجرین کے مقابلہ میں یہ بات کہی، بلکہ اس سے پہلے سردارانِ قریش بھی مکہ میں یہی بات کہا کرتے تھے: اگر ہم مسُلمانوں کے اس چھوٹے سے فقیر گروہ کا اقتصادی محاصرہ کرلیں یا انھیں مکہ سے باہر نکال دیں تو مُعاملہ ختم ہو جائے گا۔

موجودہ زمانہ میں بھی استعماری اور سامراجی حکومتیں اس خیال سے کہ آسمان وزمین کے خزانے ان کے پاس ہیں، یہ کہتی ہیں کہ وہ قومیں جو ہمارے سامنے سرِتسلیم خم نہیں کرتیں ان کا اقتصادی محاصرہ کرنا چاہیے تاکہ ان کی عقل ٹھکانے آجائے اور وہ سرِتسلیم خم کر دیں۔

ان تاریخ کے اندھوں کو، جن کا شیوہ کل بھی یہی تھا اور آج بھی یہی ہے، اس بات کی خبر نہیں کہ خُدا کے ایک ہی اشارہ پر ان کی تمام ثروت اور امکانات تباہ ہو جائیں گے اور ان کی عارضی اور ظاہری عزّت قانونِ فنا کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گی۔

بہرحال یہ طرزِ فکر (کہ اپنے آپ کو عزّت دار سمجھنا اور دوسروں کو ذلیل، اپنے آپ کو ولی نعمت شمار کرنا اور دوسروں کو محتاج) ایک منافقانہ طرزِ فکر ہے۔ یہ ایک طرف تو غرور و تکبّر سے اور دوسری طرف خدا کے مقابلے میں استقلال کے گمان سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر وہ عبُودیّت کی حقیقت سے آشنا ہوتے اور خُدا کی مالکیّت کو ہر چیز پر مسلّم سمجھتے تو ہرگز ان خطرناک غلطیوں کا شکار نہ ہوتے۔

قابلِ توجّہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں منافقین کے بارے میں "لا یفقھون" (نہیں سمجھتے) کی تعبیر آئی ہے اور یہاں "لا یعلمون" (نہیں جانتے) کی تعبیر آئی ہے۔ تعبیر کا یہ فرق ممکن ہے تکرار سے پرہیز کے لیے ہو جو فصاحت کے خلاف ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس بناء پر ہو کہ خدا کا تمام آسمانوں اور زمین کے خزائن کا مالک ہونا بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے جو بہت زیادہ دقّت اور فہم و فراست کا محتاج ہے، جبکہ عزّت کا، خدا پیغمبر اور مؤمنین کے ساتھ

مخصوص ہونا کسی پر مخفی نہیں ہے۔

٭ ٭ ٭

چند نکات

۱ : منافق کی دس نشانیاں

اوپر والی تمام آیات سے منافق کی متعدد نشانیوں کا پتہ چلتا ہے، ان کا یکجا طور پر دس نشانیوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے :

۱ : صریح و آشکار جھوٹ (واللہ یشھد ان المنافقین لکاذبون)

۲ : لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے جھوٹی قسمیں کھانا۔ (اتخذوا ایمانھم جنۃ)

۳ : دین کی شناخت کے بعد اُسے چھوڑ دینے کی بناء پر حقیقت اور واقعیت کو نہ سمجھ سکنا۔ (لا یفقھون)

۴ : باطن کے خالی ہونے کے باوجود ظاہر میں آراستہ اور چکنی چپڑی باتیں کرنا۔ (واذا رأیتھم تعجبک اجسامھم)

۵ : معاشرے میں بے ہودگی اور حق سے عدمِ توجہ کی بناء پر لکڑی کے ایک خشک ٹکڑے کی مانند ہونا۔ (کانھم خشب مسندۃ)

۶ : خائن ہونے کی بناء پر ہر حادثہ اور ہر چیز سے بدگمانی اور خوف و دہشت۔ (یحسبون کل صیحۃ علیھم)

۷ : حق کا مذاق اُڑانا اور تمسخر کرنا۔ (لووا رءوسھم)

۸ : فسق و گناہ۔ (ان اللہ لا یھدی القوم الفاسقین)

۹ : اپنے آپ کو ہر چیز کا مالک جاننا اور دوسروں کو اپنا محتاج سمجھنا۔ (ھم الذین یقولون لا تنفقوا علٰی من عند رسول اللہ حتّٰی ینفضوا)

۱۰ : اپنے آپ کو عزّت دار اور دوسروں کو ذلیل سمجھنا۔ (لیخرجن الاعز منھا الاذل)

اس میں شک نہیں کہ منافق کی نشانیاں انھیں چیزوں میں نہیں ہیں بلکہ، قرآنی آیات، اسلامی روایات اور نہج البلاغۃ سے ان کی اور بھی بہُت سی نشانیوں کا پتہ چلتا ہے۔ یہانتک کہ روزمرہ کی معاشرت سے بھی ان کے دُوسرے اوصاف اور خصوصیات کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سورۃ کی آیات میں جو کچھ آیا ہے وہ ان اوصاف کا ایک اہم اور قابلِ توجہ حصّہ ہے۔

نہج البلاغۃ میں ایک خطبہ منافقین کی کیفیت کے لیے مخصوص ہے۔ اِس خطبہ کے ایک حصہ میں اِس طرح آیا ہے :

"اے خُدا کے بندو! میں تمھیں تقویٰ اور پرہیزگاری کی وصیّت کرتا ہوں اور منافقین سے ڈراتا ہوں، کیونکہ وہ خُود گمراہ اور گمراہ کرنے والے خطاکار اور غلط انداز ہیں"۔

"وہ ہر روز ایک نئے رنگ میں آتے ہیں اور مختلف قیافوں اور زبانوں کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔"

"وہ ہر طریقہ سے تمھیں فریب دینے اور درہم برہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر کمین گاہ میں تمھاری گھات میں بیٹھے ہُوئے ہیں۔"

"وہ بد باطن اور خوش ظاہر ہیں اور ہمیشہ پوشیدہ طور پر لوگوں کو فریب دیتے اور غلط راہ پر چلتے ہیں"۔

"ان کی گفتگو بظاہر شفا بخش ہے لیکن ان کا کردار ایک علاج ناپذیر بیماری ہے۔ وہ لوگوں کی خوشحالی پر حسد کرتے ہیں اور اگر کوئی شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو وہ خوش ہوتے ہیں"۔

"ہمیشہ امیدواروں کو مایوس کرتے ہیں اور ہر جگہ ناامیدی کی آیت پڑھتے ہیں"۔

"ہر راستے میں ان کا کوئی نہ کوئی کشتہ (مارا ہوا) ہے۔ ہر دل میں نفوذ کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی راہ رکھتے ہیں اور ہر مصیبت کے لیے بناوٹی آنسو بہاتے ہیں"۔

"ایک دوسرے کو مدح و ثنا کا قرضہ دیتے ہیں اور ایک دوسرے سے اجر و پاداش کی توقع رکھتے ہیں"۔

"اپنے تقاضوں میں اصرار کرتے ہیں اور ملامت کرنے میں پردہ دری کرتے ہیں۔ جب کوئی حکم لگاتے ہیں تو حد سے تجاوز کر جاتے ہیں"۔

"انھوں نے ہر حق کے مقابلے میں ایک باطل گھڑ لیا ہے۔ اور ہر دلیل کے مقابلے میں ایک شبہ کھڑا کر دیا ہے۔ انھوں نے ہر زندہ کے لیے موت کا عامل، ہر در کے لیے ایک کلید اور ہر رات کے لیے ایک چراغ مہیّا کیا ہے"۔

"وہ اپنی طمع کاری اور گرمیٔ بازار کے لیے اور اپنے مال و اسباب کو گراں ترین قیمت پر بیچنے کے لیے دلوں میں یاس و ناامیدی کا بیج بوتے ہیں"۔

"اپنے باطل کو حق پر ظاہر کر کے دکھاتے ہیں اور تعریف و توصیف میں فریب کی راہ اختیار کرتے ہیں"۔

"اپنی خواہشات تک پہنچنے کی راہ کو آسان اور اپنے جال سے نکلنے کی راہ کو پُر پیچ و خم بنا کر دکھاتے ہیں وہ شیطان کا لشکر اور جہنّم کی آگ کے شرارے ہیں جیسا کہ خدا فرماتا ہے: " اولٰئک حزب الشیطان الاان حزب الشیطان ھم الخاسرون"۔ "وہ شیطان کا گروہ ہیں، جان لو کہ شیطان کا گروہ خسارے میں ہے"[1]

اس روشن خطبہ میں ان کے بہت سے اوصاف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو گزشتہ مباحث کی تکمیل کرتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

---

[1] نہج البلاغۃ خطبہ ۱۹۴ (اختصار کی وجہ سے مکمل خطبہ کا متن نقل نہیں کیا گیا۔)

۲ : منافقین کا خطرہ

جیسا کہ ہم نے اس بحث کے مقدمہ میں بیان کیا ہے منافقین ہر معاشرے کے خطرناک ترین افراد ہوتے ہیں کیونکہ:

اوّلاً: وہ معاشرے کے اندر رہتے ہوئے تمام بھیدوں سے واقف ہوتے ہیں۔

ثانیاً: انھیں پہچاننا کوئی آسان کام نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اکثر اپنے آپ کو اس طرح دوست کے لباس میں پیش کرتے ہیں کہ انسان کو یقین ہی نہیں آتا کہ وہ منافق ہیں۔

ثالثاً: چونکہ ان کا اصلی چہرہ بہت سے لوگوں کے لیے پہچانا ہوا نہیں ہوتا، اس لیے ان سے براہِ راست اُلجھنا اور صریح مبارزہ کرنا مشکل کام ہوتا ہے۔

رابعاً: مومنین کے ساتھ ان کے مختلف قسم کے تعلقات ہوتے ہیں (نسبی، سببی رشتے اور دوسرے تعلقات) اور انھیں رشتوں کی وجہ سے ان کے ساتھ مبارزہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

خامساً: وہ معاشرے کی پیٹھ میں خنجر گھونپتے ہیں اور ان کی ضربیں غفلت کی حالت میں پہنچتی ہیں۔

اسی قسم کی دوسری جہتوں سے بھی وہ معاشروں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتے ہیں، اور اسی بناء پر ان کے شر کو دفع کرنے کے لیے دقیق و وسیع پروگرام مرتب کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا:

"انی لا اخاف علی امتی مؤمنا ولا مشرکا اما المؤمن فیمنعه بایمانه، و اما المشرك فیخزیه الله بشرکه، ولکنی اخاف علیکم کل منافق عالم اللسان، یقول ما تعرفون ویفعل ما تنکرون"

"میں اپنی اُمت کے لیے نہ مومنین سے ڈرتا ہوں اور نہ ہی مشرکین سے۔ مومن کو اس کا ایمان اُس کے ضرر پہنچانے سے مانع ہے اور مشرک کو خدا اُس کے شرک کی وجہ سے رسوا اور ذلیل کرتا ہے۔ لیکن میں تم میں اُس منافق سے ڈرتا ہوں کہ جس کی زبان سے علم ٹپکتا ہے (اور اس کے دل میں کفر و جہالت ہے) وہ ایسی باتیں کرتا ہے جو تمہارے دل پذیر ہیں لیکن (مخفیانہ طور پر) ایسے اعمال انجام دیتا ہے جو قبیح اور بُرے ہیں۔" [1]

منافقین کے بارے میں ہم نے جلد اول (سورۂ بقرہ کی آیات ۸ تا ۱۶ کے ذیل میں اور جلد ۴ (سورۂ توبہ آیت ۴۳ تا ۴۵ کے ذیل میں) اور جلد ۴ (سورہ توبہ آیات ۶۰ تا ۸۵ کے ذیل میں) اور جلد ۹ (سورۂ احزاب آیات ۱۲ تا ۱۷ کے ذیل میں) تفصیلی بحث کی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بہت کم گروہ ایسے ہیں جن کے بارے میں قرآن نے اتنی بحثیں کی ہوں اور ان کی

---

[1] "سفینۃ البحار" جلد ۲ ص ۶۰۶ مادہ "نفق" اسی کے مشابہ نہج البلاغہ خط ۲۷ میں بھی آیا ہے۔

نشانیاں، اعمال اور خطرات بیان کیے ہوں۔ قرآن کا اس سلسلہ میں اتنا وسیع بیان منافقین کے حد سے زیادہ خطرے کی دلیل ہے۔

❖ ❖ ❖

۳ : منافق بے اخلاص اور ٹوٹنے والا ہے

زندگی میں بہت سے طوفان اُٹھتے ہیں اور تُند و تیز لہریں اُبھرتی ہیں۔ مومنین ایمان و توکل کی قوت سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے صحیح منصوبوں کے ذریعہ کبھی جنگ و گریز اور کبھی پے در پے حملے کر کے انھیں سر سے گزار کر کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن منافق ہٹ دھرمی کرتے ہُوئے اکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ٹوٹ کر بے بس ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبر گرامیؐ سے آیا ہے :

"مثل المؤمن کمثل الزرع لا تزال الریح تمیله، ولا یزال المؤمن یصیبه البلاء، ومثل المنافق کمثل شجرة الارز لا تهتز حتی تستحصد"

مومن زراعت کی شاخوں کی طرح ہے، جنھیں ہوائیں گرا دیتی ہیں، لیکن وہ پھر کھڑی ہو جاتی ہیں اور ہمیشہ سخت حادثات اور بلاؤں کو برداشت کرتی اور سر سے گزار دیتی ہیں۔ لیکن منافق صنوبر کے درخت کی مانند ہوتا ہے جو نرمی دکھائے بغیر کھڑا رہتا ہے، یہاں تک کہ اُسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے"۔ [1]

❖ ❖ ❖

۴ : عزت خدا اور اس کے دوستوں کے لیے مخصوص ہے۔

اگرچہ روزمرہ کی فارسی (اور اردو زبان میں) "عزت" آبرو، احترام اور گرانقدر ہونے کے معنی میں ہے، لیکن عربی زبان میں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ "عزت" شکست ناپذیر قدرت کے معنی میں ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیات اور سورۂ فاطر کی آیت ۱۰ میں "عزت" کی صفت خدا میں منحصر شمار کی گئی ہے۔ اور وہ زیرِ بحث آیات میں یہ اضافہ کرتا ہے: "اور اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے"۔ کیونکہ خدا کے اولیاء اور دوست اسی کی عزت کا پرتو رکھتے اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔

---

[1] "صحیح مسلم" جلد ۴ ص ۲۱۶۳ (باب مثل المؤمن کالزرع ـ) اسی مضمون کے مشابہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ تفسیر روح البیان جلد ۹ ص ۵۳۲ میں بھی آیا ہے۔

اسی وجہ سے اسلامی روایات میں اس مسئلہ پر تاکید ہوئی ہے کہ مومن کو اپنی ذات کے وسائل فراہم نہیں کرنے چاہئیں۔ خدا چاہتا ہے کہ مومن عزیز رہے تو پھر اُسے بھی اس عزّت کی حفاظت کی کوشش کرنا چاہیئے۔

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے اسی آیت (وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین) کی تفسیر میں آیا ہے :

"فالمؤمن یکون عزیزًا ولا یکون ذلیلًا ..... المؤمن اعز من الجبل ان الجبل یستقل منه بالمعاول ، والمؤمن لا یستقل من دینه شیء"

"مؤمن عزیز ہے اور وہ ذلیل نہیں ہوتا۔ مومن پہاڑ سے بھی زیادہ سخت اور مستحکم ہوتا ہے ، کیونکہ پہاڑ میں تو کدال سے سوراخ کرنا ممکن ہے۔ لیکن مومن کے ایمان میں سے ہرگز کسی چیز کو ہلایا نہیں جا سکتا۔" [1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ ہی سے آیا ہے :

"لا ینبغی للمؤمن ان یذل نفسه قیل له وکیف یذل نفسه قال یتعرض لما لا یطیق"

"مُناسب نہیں ہے کہ مومن اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ سوال کیا گیا : وہ اپنے آپ کو کس طرح ذلیل کرتا ہے۔ فرمایا : ایسے کام کے پیچھے جائے جو اس سے نہیں ہو سکتا۔" [2]

ایک اور حدیث میں بھی اُنھی سے آیا ہے :

"ان اللّٰه تبارك وتعالٰی فوض الی المؤمن اموره کلها و لم یفوض الیه ان یذل نفسه الم تر قول اللّٰه سبحانه وتعالٰی ههنا "وللّٰه العزّة ولرسوله وللمؤمنین" والمؤمن ینبغی ان یکون عزیزًا ولا یکون ذلیلًا"

"خدا نے مومن کے تمام کام خود اس کے سپرد کر دیئے ہیں۔ لیکن خدا نے اس کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل وخوار کرے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ خُدا نے اس سلسلہ میں یہ فرمایا ہے : عزت خدا، اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہی مخصوص ہے۔ لہٰذا مومن کے لیے یہی بات مُناسب اور لائق ہے کہ وہ ہمیشہ عزیز رہے اور ذلیل وخوار نہ ہو۔" [3]

اس سلسلہ میں ہم نے جلد ۱۰، سورۃ فاطر آیت ۱۰ کے ذیل میں بھی بحث کی ہے۔

---

[1]، [3] "کافی" مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۳۶

(۹) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ
عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ
الْخَاسِرُونَ ۝

(۱۰) وَأَنْفِقُوا مِنْ مَا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ
أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ
قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝

(۱۱) وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا ۚ وَاللَّهُ
خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝

ترجمہ

(۹) اے ایمان لانے والو! تمھارے مال اور اولاد تمھیں یادِ خدا سے غافل نہ کر دیں اور جو ایسا کریں گے وہ خسارے میں رہیں گے۔

(۱۰) ہم نے تمھیں جو روزی دے رکھی ہے اس میں سے خرچ کرو، قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت آ پہنچے اور وہ یہ کہنے لگے "پروردگارا! تو نے میری موت میں تھوڑی سی تاخیر کیوں نہ کی تاکہ میں صدقہ دوں اور صالحین میں سے ہو جاؤں۔

(۱۱) جب کسی کی اجل آ پہنچتی ہے تو خدا ہرگز کسی کی موت کو تاخیر میں نہیں ڈالتا اور خدا

تمھارے ان اعمال سے جنھیں تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے۔

۞ ۞ ۞

تفسیر

مال اور اولاد تمھیں خدا کی راہ سے غافل نہ کردیں

چونکہ نفاق کا ایک اہم عامل حُبِّ دنیا اور مال و اولاد سے بہت زیادہ لگاؤ ہے، لہٰذا سورہ منافقون کی ان آخری آیات میں مومنین کو اس قسم کے اندھے لگاؤ سے باز رکھتے ہوئے کہتا ہے: "اے ایمان لانے والو! تمھارے مال اور اولاد تمھیں یادِ خدا سے غافل نہ کردیں" (یاایھا الذین اٰمنوا لا تلھکم اموالکم ولا اولادکم عن ذکر اللہ)۔

"اور جو ایسا کریں گے وہ خسارے میں رہیں گے۔" (و من یفعل ذالک فاولٓئک ھم الخاسرون)۔

یہ ٹھیک ہے کہ اموال اور اولاد عطیاتِ خداوندی میں سے ہیں، لیکن اس حد تک کہ خدا کی راہ اور سعادت کے حصول کے لیے اُن سے مدد لی جائے۔ لیکن اگر ان کے ساتھ اتنا زیادہ لگاؤ ہو جائے کہ وہ انسان اور خدا کے درمیان رکاوٹ بن جائیں تو پھر وہ سب سے بڑی بلا شمار ہوں گے۔ اور جیسا کہ منافقین کی داستان سے متعلق گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ ان کے انحراف کا ایک عامل یہ حُبِّ دنیا ہی تھا۔

ایک حدیث میں امام باقرؑ سے اس مطلب کو انتہائی واضح صورت میں پیش کیا گیا ہے، جس میں آپ فرماتے ہیں کہ:

"ما ذئبان ضاریان فی غنم لیس لھا راع، ھٰذا فی اولھا وھٰذا فی اٰخرھا باسرع فیھا من حب المال والشرف فی دین المؤمن"۔

"دو درندہ بھیڑیئے بغیر چرواہے کے بھیڑوں کے گلہ میں ہوں جن میں سے ایک اُس کے آگے اور دُوسرا پیچھے ہو، وہ اس قدر ضرر نہیں پہنچاتے جتنا مال پرستی اور جاہ طلبی مومن کے دین کو ضرر پہنچاتی ہے"۔[1]

یہاں ذکرِ خدا سے کیا مُراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں۔ بعض نے پانچ وقت کی نمازوں سے، بعض نے شکرِ نعمت، مصیبتوں پر صبر اور قضا پہ راضی رہنے سے اور بعض نے حج و زکات اور تلاوتِ

---

[1] "اصول کافی" جلد ۲ باب "حُبّ الدنیا" حدیث ۳

قرآن سے اور بعض نے تمام فرائض سے تعبیر کی ہے۔ لیکن واضح ہے کہ ذکر خدا ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو ان سب کو اور ان کے علاوہ دوسرے امور کو بھی شامل ہے۔ اس بناء پر اوپر والے امور سے تفسیر کرنا، واضح مصادیق کے ذکر کی قسم سے ہے۔

"خاسرون" (زیاں کاروں) کی تعبیر اس بناء پر ہے کہ دنیا کی محبت انسان کو اس طرح سرگرم کر دیتی ہے کہ وہ اپنے وجود کے سرمایوں کو ناپائیدار لذتوں کی راہ میں اور بعض اوقات اوہام وخیالات کی راہ میں صرف کر دیتا ہے، وہ اس دنیا سے خالی ہاتھ جاتا ہے' حالانکہ اس کے پاس عظیم سرمائے موجود تھے۔ لیکن اس نے اپنی جاودانی زندگی کے لیے کچھ نہیں کیا۔

❋ ❋ ❋

اس کے بعد مومنین کو اس شدید خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے راہِ خدا میں انفاق کرنے کا حکم صادر کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور جو روزی ہم نے تمھیں دی ہوئی ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت آ پہنچے، اور وہ یہ کہنے لگے: پروردگارا! تو نے میری موت میں تھوڑی سی مدت کے لیے تاخیر کیوں نہ کی، تاکہ میں انفاق کروں اور صالحین میں سے ہو جاؤں"۔ (و انفقوا مما رزقناکم من قبل ان یأتی احدکم الموت فیقول رب لولا اخرتنی الیٰ اجل قریب فاصدق و اکن من الصالحین)۔[1]

اگرچہ بعض نے یہاں انفاق کی تفسیر ادائے زکوٰۃ میں تعجیل کے وجوب کے معنی میں کی ہے لیکن یہ بات واضح ہے کہ آیت کا مقصد ہر قسم کے واجب ومستحب انفاق کو شامل ہے جو آخرت میں انسان کی نجات کا ذریعہ ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ آیت کے ذیل میں کہتا ہے: "میں انفاق کروں اور صالحین میں سے ہو جاؤں"۔ یہ تعبیر انسان کے صالح ہونے میں، انفاق کی گہری اور عمیق تاثیر کو بیان کرتی ہے۔ اگرچہ بعض نے یہاں صالح ہونے کی تفسیر "مراسم حج" انجام دینے سے کی ہے۔ بعض روایات میں بھی یہ صراحت کے ساتھ آیا ہے، لیکن یہ بھی واضح مصداق کی قسم سے ہے۔

"من قبل ان یأتی احدکم الموت" کا جملہ انسان کے آستانۂ موت پر پہنچنے اور اس کی علامات کے ظاہر ہونے کی طرف اشارہ ہے — کیونکہ یہ بات موت کے بعد نہیں کہے گا، بلکہ موت کی چوکھٹ پر کہے گا۔

مما رزقناکم (ہم نے جو روزی تمھیں دے رکھی ہے اس میں سے) کی تعبیر، اس بات کے علاوہ کہ یہ صرف مال میں منحصر نہیں بلکہ تمام مواہب اور نعمتوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے، اس حقیقت کو بھی بیان کرتی ہے کہ یہ سب کچھ کسی دوسری جانب سے ملا ہے اور یہ امانت چند دن کے لیے ہمارے

[1] قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت میں 'اصدق' منصوب ہے اور 'اکن' مجزوم ہے۔ حالانکہ ان کا ایک دوسرے پر عطف ہے۔ یہ اس بناء پر ہے کہ 'اکن' کا 'اصدق' کی جگہ پر عطف ہے۔ اور تقدیر میں اس طرح ہے: ان اخرتنی اصدق و اکن من الصالحین۔

پاس ہے، اس بنا پر بُخل کرنے کے کیا معنی؟

بہرحال بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس وقت جبکہ وہ برزخی آنکھ سے دیکھنے لگتے ہیں اور خود کو زندگی کے آخری لمحات میں قیامت کی چوکھٹ پر دیکھتے ہیں، غفلت کے پردے اور بے خبری کے حجاب ان کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ انھیں اموال اور سرمایوں کو چھوڑ کر جانا پڑے گا اور اب وہ اس میں سے اس طولانی سفر کے لیے کوئی زادِ راہ بھی نہیں لے سکتے تو وہ پشیمان ہوتے ہیں اور حسرت کی آگ ان کی جان میں لگ جاتی ہے۔ پھر وہ زندگی کی طرف لوٹنے کا تقاضا کرتے ہیں، چاہے وہ لوٹنا کتنا ہی مختصر اور جلدی سے گذر جانے والا ہی کیوں نہ ہو تاکہ وہ تلافی کر سکیں۔ لیکن ان کی اس التجا کو ٹھکرا دیا جائے گا کیونکہ سنّتِ الٰہی یہ ہے کہ موت کے راستے میں بازگشت نہیں ہوتی۔

❖ ❖ ❖

اسی لیے آخری آیت میں پوری قاطعیت کے ساتھ فرماتا ہے: "جب کسی کی اجل آپہنچتی ہے تو خدا ہرگز کسی کی موت کو تاخیر میں نہیں ڈالتا" (ولن یؤخر اللّٰہ نفسًا اذا جاء اجلها)۔

یہاں تک کہ ایک لمحہ کے لیے بھی آگے یا پیچھے نہیں ہوگی، جیسا کہ قرآن کی کئی دوسری آیات میں بھی اس امر کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ سورۂ اعراف کی آیت ۳۴ میں آیا ہے: "فاذا جاء اجلهم لا یستأخرون ساعة ولا یستقدمون"۔ جب ان کی اجل آجائے گی تو وہ نہ تو ایک ساعت کے لیے تاخیر کر سکیں گے اور نہ ہی پیشقدمی ہو سکے گی۔

انجام کار آیت کو اس جُملہ کے ساتھ ختم کرتا ہے: "جو عمل بھی تم انجام دیتے ہو، خدا اس سے آگاہ ہے"۔ (واللّٰہ خبیر بما تعملون)۔

ان سب اعمال کو جزا و سزا کے لیے ثبت کر لیا گیا ہے اور تمھیں ان سب کا بدلہ ملے گا۔

❖ ❖ ❖

چند نکات

۱: پریشانیوں پر غلبہ کی راہ

عالم بزرگ شیخ عبداللہ شوشتری جو مرحوم علامہ مجلسی کے معاصرین میں سے تھے، ان کے حالات میں آیا ہے کہ ان کا ایک بیٹا تھا جس سے وہ بہت ہی محبت کرتے تھے۔ یہ بیٹا سخت بیمار ہو گیا۔ اس کے والد مرحوم شیخ عبداللہ جب نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد میں آئے تو پریشان تھے۔ جب اسلامی دستور کے مُطابق دوسری رکعت میں سورۂ منافقون پڑھی اور اس آیت پر پہنچے: یاایها الذین اٰمنوا لا تلهكم اموالكم ولا

اولادکم عن ذکر اللہ۔ ”اے ایمان لانے والو! تمھارے مال اور اولاد تمھیں یادِ خدا سے غافل نہ کر دیں“ تو اس آیت کی کئی بار تکرار کی۔ (نماز میں آیاتِ قرآن کی تکرار جائز ہے۔) جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو بعض دوستوں نے اس تکرار کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا:

”جب میں اس آیت پر پہنچا تو مجھے اپنا بیٹا یاد آگیا۔ لہٰذا میں اس آیت کی تکرار کے ذریعہ اپنے نفس سے مبارزہ کرنے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ میں نے اس طرح سے مُبارزہ کیا کہ میں نے فرض کر لیا کہ میرا بیٹا مرگیا ہے اور اس کا جنازہ میرے سامنے ہے اور میں خُدا سے غافل نہیں ہوں، چنانچہ اس کے بعد پھر میں نے آیت کی تکرار نہیں کی“۔ [1]

۲ : نِفاق - ”اِعتقادی“ و ”عملی“

نفاق ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو ہر قسم کی ظاہر و باطن کی دوگانگی کو اپنے اندر لیے ہُوئے ہے۔ اس کا ظاہری مصداق تو اعتقادی نفاق ہے اور عام طور پر منافقین کے متعلق آیات اِسی بارے میں ہیں۔ وہ ایسے لوگوں سے مربُوط ہیں جو ظاہر میں تو ایمان کا اظہار کرتے ہیں لیکن دل میں شرک وکفر کو چھپائے رکھتے ہیں۔

لیکن نفاق عملی ان لوگوں کے ساتھ تعلّق رکھتا ہے جن کا باطنی اعتقاد تو اسلام ہے لیکن وہ اس تعہد باطنی کے برخلاف اعمال انجام دیتے ہیں کہ جو اندر اور باہر کے چہرے کی دوگانگی کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً عہد شکنی، جھوٹ اور امانت میں خیانت کرنا۔ اِسی لیے پیغمبر گرامیؐ سے ایک حدیث میں آیا ہے:

”ثلاث من کن فیہ کان منافقا و ان صام وصلی و زعم انہ مسلم من اذائتمن خان و اذا حدث کذب، و اذا وعد، اخلف“۔

”تین چیزیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں بھی ہوں وہ مُنافق ہے چاہے وہ روزے رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور خود کو مسلمان سمجھتا ہو۔

جو امانت میں خیانت کرتا ہو۔

جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

جب وعدہ کرے تو اس سے تخلّف کرے۔[2]

ایک اور حدیث میں رسُولِ خُداؐ سے آیا ہے:

---

[1] ”سفینۃ البحار“ جلد ۲ ص ۱۳۱ (مادہ عبد)۔ اس عالمِ بزرگوار نے، جو مختلف علوم میں صاحب نظر اور صاحبِ اثر تھے، ماہ محرم کی چھبیسویں رات ۱۰۲۱ھ صبح کے وقت نمازِ تہجد کے وقت وفات پائی۔ مرحوم سیّد داماد نے علماء کی ایک جماعت کے ساتھ ان کی نماز جنازہ پڑھی۔

[2] ”سفینۃ البحار“ جلد ۲ ص ۶۰۵

"مازاد خشوع الجسد علی ما فی القلب فهو عندنا نفاق۔"

"جو کچھ دل میں ہے اس سے بڑھ کر خضوع و خشوع کرنا ہمارے نزدیک نفاق ہے"۔ [1]

ایک دوسری جگہ امام علیؑ بن الحسین سے آیا ہے :

"ان المنافق ینهی ولا ینتهی و یأمر بما لا یأتی۔"

"منافق نہی عن المنکر تو کرتا ہے ، لیکن خود اُسے ترک نہیں کرتا۔ وہ امر بالمعروف تو کرتا ہے لیکن خود اُسے انجام نہیں دیتا"۔ [2]

عملی نفاق کے شعبوں میں سے شرک و ریاکاری کا مسئلہ بھی ہے کہ جس کی طرف اسلامی روایات میں اشارہ ہوا ہے۔

✣ ✣ ✣

خداوندا ! نفاق کا دامن بہت ہی وسیع و کشادہ ہے اور تیرے لطف و کرم کے بغیر اس سے نجات کی کوئی راہ نہیں ہے۔ تو اس پُرپیچ و خم راہ میں ہماری مدد فرما !

پروردگارا ! ہمیں ایسے لوگوں میں سے قرار دے جو دنیا سے رخصت ہوتے وقت حسرت کی آگ میں نہیں جلتے اور واپس لوٹنے کا تقاضا نہیں کرتے۔

بارِ الٰہا ! آسمانوں اور زمین کے خزانے تیری ہی ملکیت ہیں اور عزت تجھ سے اور تیرے اولیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہمیں ایمان کی برکت سے عزت والا بنا دے اور اپنے بے پایاں خزانوں میں سے ایک حصہ مرحمت فرما۔

آمین یا رب العالمین !

✣ ✣ ✣

سورۂ منافقون کا اختتام

۱۸ ر رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

اختتام ترجمہ بروز منگل بوقت پونے چھ بجے صبح بتاریخ ۲۴ ر ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۱ ر جولائی ۱۹۸۷ء بر مکان سیٹھ نوازش علی۔ ۸۱، ای ماڈل ٹاؤن لاہور

---

[1] اصول کافی جلد ۲ (باب صفت النفاق حدیث ۶)

[2] اصول کافی جلد ۲ (باب صفت النفاق حدیث ۳)

سُورۂ تغابن

یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہوا اور اس کی ۱۸ آیات ہیں۔

تاریخ آغاز
۱۸ ر رمضان المبارک ۱۴۰۶ ھ

سورۃ تغابن کے مضامین و مطالب

اس بارے میں کہ یہ سورہ مدینہ میں نازل ہُوا ہے یا مکّہ میں، مفسّرین کے درمیان سخت اختلاف ہے۔ اگرچہ اس کا مدنی ہونا مشہُور ہے جبکہ بعض اس کو سارا مکّی، بعض اس کی صرف تین آخری آیات کو مدنی اور باقی سُورہ کو مکّی جانتے ہیں۔

یقیناً اس سورہ کی آخری آیات کا لب ولہجہ مدنی سورتوں کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔ لیکن اس کا درمیانی حصّہ مکّی سورتوں کے ساتھ زیادہ موافق ہے۔ بہرحال ہم اسے مجموعی طور پر اس کی شہرت کے مُطابق مدنی قرار دیتے ہیں۔

"ابوعبداللہ زنجانی" اپنی نفیس کتاب "تاریخ القرآن" میں فہرست "ابن ندیم" سے نقل کرتا ہے کہ سورۂ تغابن تیسواں سورہ ہے جو مدینہ میں نازل ہُوا۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ مدنی سُورتیں کُل اٹھائیس ہیں یہ کہنا پڑے گا کہ یہ ان آخری سورتوں میں سے ہے جو پیغمبرؐ پر نازل ہُوئیں۔[1]

تاہم مضامین و مطالب کے لحاظ سے اس سورہ کو چند حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱ : سورہ کا آغاز جو توحید اور خدا کی صفات و افعال سے بحث کرتا ہے۔

۲ : اس کے بعد یہ سورہ علم خُدا سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے لوگوں کو خبردار کرتا ہے کہ وہ اپنے پوشیدہ اور آشکار اعمال کے نگران رہیں اور گزشتہ اقوام کی سرنوشت کو فراموش نہ کریں۔

۳ : سورہ کا تیسرا حصّہ معاد کے بارے میں گفت گو کرتا ہے۔ گویا کہ روز قیامت، روز "تغابن" یعنی ایک گروہ کے خسارے میں ہونے اور ایک گروہ کے بڑھ جانے کا دن ہے۔ (سورہ کا نام بھی اسی سے لیا گیا ہے)

۴ : ایک حصّہ میں خدا اور پیغمبرؐ کی اطاعت کا حکم دیتا اور اس طرح اصل نبوّت کی بنیادوں کو استحکام بخشتا ہے۔

۵ : سورہ کا آخری حصّہ لوگوں کو راہ خدا میں خرچ کرنے کا شوق دلاتا اور مال، اولاد اور بیویوں کے فریب میں آنے سے ڈراتا ہے۔ پھر سورہ کو خدا کے نام اور اس کی صفات پر ختم کرتا ہے، جیسا کہ آغاز کیا تھا۔

❖ ❖ ❖

---

[1] "تاریخ القرآن" ص ۵۴، ۶۱

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

رسولِ خدا کی ایک حدیث میں آیا ہے :

"من قرأ سورة التغابن دفع عنه موت الفجأة " ۔

"جو شخص سورہ تغابن پڑھے گا اس سے ناگہانی موت دور ہو جائے گی" ۱؎

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے :

"من قرأ سورة التغابن فی فریضته کانت شفیعة له یوم القیامة وشاهد عدل عند من یجیز شهادتها ثم لا تفارقه حتّٰی یدخل الجنة "

"جو شخص سُورہ تغابن کو اپنی واجب نماز میں پڑھے گا وہ قیامت کے دن اس کی شفاعت کرے گی اور اس ہستی کے سامنے ایک ایسی شاہد عادل ہو گی جس نے اس کی شفاعت کی اجازت دی ہے پھر اُس سے الگ نہیں ہو گی یہاں تک کہ وہ جنّت میں داخل ہو جائے" ۲؎

ظاہر ہے کہ اس تلاوت کو غور و فکر سے توأم ہونا چاہیئے۔ ایسی فکر جو اس کے مضامین و مطالب کو عمل میں منعکس کرے تاکہ قاری پر یہ تمام آثار و برکات مرتّب ہوں۔

⁂ ⁂ ⁂

۱؎ ، ۲؎ مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۹۶ ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۱) يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ
وَلَهُ الْحَمْدُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○
(۲) هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ
مُّؤْمِنٌ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○
(۳) خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ
صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ○
(۴) يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ
وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○
(۵) اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۫ فَذَاقُوْا
وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○
(۶) ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا
اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۫ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۚ
وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

(۱) جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں وہ خدا کی تسبیح کرتے ہیں۔ مالکیّت اور حکومت بھی اسی کے لیے ہے اور حمد وستائش بھی اسی کے لیے اور وہ ہر چیز پر قُدرت رکھتا ہے۔

(۲) اسی نے تم کو پیدا کیا ہے (اور تمھیں آزادی اور اختیار دیا ہے) پس تم میں سے ایک گروہ تو کافر ہے اور ایک گروہ مومن اور خدا تمھارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

(۳) اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور تمھیں صُورت عطا کی اور تمھاری بہترین صُورت بنائی اور آخر میں سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔

(۴) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اُسے جانتا ہے اور جو کچھ تم پنہاں یا آشکار کرتے ہو وہ اس سے باخبر ہے اور جو کچھ دل میں ہے خدا اِس سے آگاہ ہے۔

(۵) کیا ان (کافر) لوگوں کی خبر جو تم سے پہلے تھے تم تک نہیں پہنچی کہ انھوں نے اپنے گناہوں کا مزہ کس طرح چکھا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

(۶) یہ اس بناء پر ہوا کہ ان کے رسُول واضح دلائل کے ساتھ ان کے پاس آئے تھے، لیکن انھوں نے (کبر و غرور کی بناء پر یہ) کہا: کیا افرادِ بشر ہمیں ہدایت کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح سے وہ کافر ہو گئے، اور انھوں نے رُوگردانی کی۔ اور خدا (ان کے ایمان اور اطاعت سے) بے نیاز تھا، اور خدا غنی اور لائق حمد وستائش ہے۔

تفسیر

وہ دلوں میں چھپے ہوئے اسرار سے آگاہ ہے۔

اس سورہ کا بھی تسبیحِ خُدا سے آغاز ہوتا ہے۔ وہ خدا جو کل جہانِ ہستی کا مالک اور اس پر حاکم ہے اور ہر چیز پہ

قدرت رکھتا ہے، فرماتا ہے : "جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے خدا کی تسبیح کرتا ہے۔" (یسبح للہ ما فی السماوات وما فی الارض)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے : مالکیت اور حاکمیت اسی کے لیے ہے۔ (لہ الملک)۔

"اور (اسی بنا پر) تمام حمد و ستائش کی بازگشت اسی کی پاک ذات کی طرف ہے۔" (ولہ الحمد)۔

"اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔" (وھو علی کل شیء قدیر)۔

چونکہ ہم تمام موجوداتِ عالم کی تسبیح عمومی کے بارے میں بارہا بیان کر چکے ہیں اور متعدد تفاسیر، جو اس موضوع کے بارے میں بیان ہوئی ہیں انھیں ہم نقل کر چکے ہیں اس لیے تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ تسبیح اور حمد حقیقت میں اس کے ہر چیز پر قادر ہونے اور ہر چیز کے اس کی مالکیت ہونے کا لازمہ ہے، کیونکہ اس کے تمام اوصافِ جمال و جلال انھیں دو امور میں چھپے ہوئے ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

اس کے بعد امرِ خلقت و آفرینش کی طرف، جو قدرت کا لازمہ ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : "اسی نے تمھیں پیدا کیا ہے۔" (ھو الذی خلقکم)۔

اور تمھیں آزادی اور اختیار کی نعمت عطا کی۔ اس لیے "تم میں سے ایک گروہ مومن اور ایک گروہ کافر ہو گیا۔" (فمنکم کافر ومنکم مؤمن)۔[1]

اِس طرح سے خدائی امتحان اور آزمائش کا بازار گرم ہو گیا، اور اس اثناء میں "جو عمل بھی تم انجام دیتے ہو خدا اُسے دیکھتا ہے۔" (واللہ بما تعملون بصیر)۔

⁂ ⁂ ⁂

اس کے بعد مسئلہ "خلقت" کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اور خلقت و آفرینش کے ہدف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بعد والی آیت میں فرماتا ہے : "خدا نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔" (خلق السماوات والارض بالحق)۔

اس کی خلقت میں بھی حق اور ایک دقیق نظام ہے اور اس میں حکیمانہ ہدف اور حق پر مبنی مصلحتیں بھی ہیں۔ چنانچہ سورہ ص، کی آیت ۲۷ میں بھی فرماتا ہے : "وما خلقنا السماء والارض وما بینھما باطلًا ذالك ظن الذین کفروا : "ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے۔ یہ کافروں کا گمان ہے۔"

---

[1] 'فاء' تفریع کا ذکر یہاں اس لیے نہیں ہے کہ ایمان و کفر بھی اللہ کی مخلوق ہیں، بلکہ یہ اس بنا پر ہے کہ خلقت کے بعد اس نے انسان کو ارادہ کی آزادی دی ہے، اور اس کا لازمہ یہ ہے کہ کافر و مومن دو گروہ پیدا ہوئے۔

اس کے بعد انسان کی خلقت کو بیان کرتے ہوئے اور ہمیں سیرِ آفاقی سے سیرِ انفسی کی طرف دعوت دیتے ہوئے مزید کہتا ہے: "اس نے تمھیں صورت عطا کی اور تمھاری بہترین تصویر بنائی" (وصورکم فاحسن صورکم)۔

اس انسان کو جس کا ظاہر آراستہ اور باطن پیراستہ ہے، ایک روشن عقل اور قوی شعور عطا کیا اور جو کچھ پورے عالم ہستی میں ہے اس کے نمونے اس کے وجود میں پیدا کیے، اس طرح سے کہ "عالم کبیر" اس "جرمِ صغیر" میں خلاصہ ہو گیا۔

لیکن جیسا کہ آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "انجام کار ہر چیز کی بازگشت اسی کی طرف ہے" (و الیہ المصیر)۔

ہاں! وہ انسان جو مجموعۂ عالم ہستی کا ایک جزء ہے، خلقت کے لحاظ سے کل عالم کے باہدف ہونے کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ پست ترین مراحل سے اس نے چلنا شروع کیا، اور غیر متناہی منزل کی طرف، جو حق تعالےٰ کا وجودِ بے پایاں اور خدا کا قرب ہے، آگے بڑھ رہا ہے۔

"فاحسن صورکم" (تمھاری بہترین صورت بنائی) کی تعبیر ظاہری صورت کو بھی شامل ہے اور باطنی صورت کو بھی، جسم کے لحاظ سے بھی اور روح کے لحاظ سے بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ انسان کے جسم و جان پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے، کہ عالم ہستی کا خوبصورت ترین موجود یہی ہے۔ خدا نے اس موجود کی خلقت میں عجیب و غریب قدرت نمائی کی اور اسے ہر لحاظ سے کامل بنایا ہے۔

٭ ٭ ٭

چونکہ انسان کو ایک عظیم مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے، لہٰذا اُسے ہمیشہ پروردگار کی نگرانی میں رہنا چاہیے۔ وہ پروردگار جو اس کے ظاہر و باطن سے باخبر ہے۔ اس لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "خدا اُسے بھی جانتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور اس سے بھی باخبر ہے جسے تم پنہاں یا آشکارا کرتے ہو، وہ ان عقاید اور نیتوں سے بھی آگاہ ہے جو تمھارے سینوں کے اندر ہیں" (یعلم ما فی السماوات و الارض و یعلم ما تسرون وما تعلنون واللہ علیم بذات الصدور)۔

یہ آیت خدا کے بے پایاں علم کی تین مرحلوں میں تصویر کشی کرتی ہے:

اوّل: اس کا علم آسمانوں اور زمین کے تمام موجودات کے بارے میں۔

دوئم: اس کا علم انسانوں کے اعمال کے بارے میں چاہے وہ چھپا کر کرتے ہوں یا آشکارا کرتے ہوں۔

سوئم: خصوصیت کے ساتھ عقاید باطنی، نیتوں کی کیفیت کو اور جو کچھ انسان کے دل و جان پر حکم فرما ہے، اسے بھی جانتا ہے۔

انسان میں خدا کے اس وسیع علم کی معرفت کا حد سے زیادہ تربیتی اثر ہوتا ہے۔ یہ اس کو خبردار کرتا ہے کہ تو چاہے جو کچھ بھی ہے اور جہاں کہیں بھی ہے تیرا ہر عقیدہ، تیرے دل کی ہر نیّت اور تیری روح و جان کے سارے

اخلاق حق تعالیٰ کے بے پایاں علم کی بارگاہ میں آشکار ہیں۔ مسلّمہ طور پر اس حقیقت کی طرف توجہ انسان کی اصلاح و تربیت میں حد سے زیادہ مُؤثر ہے۔ یہ ایسی تعلیمات ہیں جو انسان کو مقصدِ خلقت اور قانونِ تکامُل تک پہنچنے کے لیے آمادہ کرتی ہیں۔

۞ ۞ ۞

چونکہ وسائلِ تربیت اور انذار کے طریقوں میں سے ایک موثر ترین ذریعہ، گزشتہ اقوام اور اُمتوں کی سرنوشت کی طرف توجہ دلانا ہے، لہٰذا بعد والی آیت ان کی زندگی پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہُوئے انسان کو مخاطب کرکے کہتی ہے:
"کیا تم تک ان کافروں کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے تھے۔ انھوں نے کس طرح اپنے گناہانِ کبیرہ کا تلخ ذائقہ چکھا اور ان کے لیے آخرت میں بھی دردناک عذاب ہے۔" (الم یأتکم نبؤا الذین کفروا من قبل فذاقوا وبال امرھم ولھم عذاب الیم)۔[1]

تم شام اور دوسرے علاقوں کی طرف جاتے ہُوئے ان کے عذابی اور ویران شہروں کے قریب سے گزرتے ہو اور ان کے کفر، ظلم اور گناہوں کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔ ہاں! ان کی خبروں کو تم تاریخ میں پڑھتے ہو۔ وہی لوگ جن کی زندگی کا دفتر طوفان و سیلاب سے درہم برہم ہوا یا بجلیوں نے جن کی خرمنِ عُمر میں آگ لگادی، یا ویران و تباہ کرنے والے زلزلوں نے انھیں زمین کے منہ کا لقمہ بنا دیا اور تیز آندھی نے ان کے بھاری بھرکم جسموں کو تنکوں کی طرح ہر طرف اُڑا دیا۔ یہ تو ان کا دنیاوی عذاب تھا، لیکن آخرت میں بھی ایک دردناک عذاب ان کا منتظر ہے۔

۞ ۞ ۞

بعد والی آیت اس دردناک سرنوشت کے منشاء اصلی کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے مزید کہتی ہے: "اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے انبیاء و رُسل واضح دلائل اور معجزات کے ساتھ ان کی طرف آئے، لیکن وہ لوگ کبر و غرُور کی وجہ سے یہ کہا کرتے تھے: "کیا انسان ہماری ہدایت کریں گے؟ کیا یہ بات ممکن ہے؟" (ذالك بانه كانت تأتيهم رسلهم بالبينات فقالوا ابشر يهدوننا)۔
اس بیہودہ گفتگو کے ساتھ وہ ان کی مخالفت کے لیے اُٹھ کھڑے ہُوئے، "یوں وہ کافر ہو گئے اور انھوں نے حق کو قبول کرنے سے روگردانی کی۔" (فكفروا وتولوا)۔
"حالانکہ خُدا ان کے ایمان اور ان کی اطاعتوں سے بھی بے نیاز تھا۔" (واستغنى الله)۔
اگر انھیں ایمان، اطاعت اور پرہیز گاری کے لیے مکلف فرمایا ہے تو وہ صرف ان کی منفعت یعنی اس جہان میں اور دُوسرے جہان میں ان کی سعادت اور نجات کے لیے تھا۔
ہاں! "خدا بے نیاز ہے اور ہر قسم کی حمد و ستائش کے لائق ہے۔" (والله غنى حميد)۔

---

[1] 'وبال' 'وبل' اور 'وابل' کے مادہ سے سخت بارش کے معنی میں ہے ہر اس اہم موضوع کو جس کے نقصان سے انسان خائف ہو 'وبال' کہا جاتا ہے۔

اگر ساری کائنات کافر ہو جائے تو اس کے دامن کبریائی پہ کوئی گرد نہیں بیٹھتی ۔ اسی طرح اگر تمام مخلوقات مومن اور اس کی مطیع فرمان ہو جائے تو اس کے جلال میں کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا ۔ یہ تو ہم ہی ہیں جو اس قسم کے تربیتی ، اصلاحی اور تکامل و ارتقاء کے اصول وقوانین کے محتاج ہیں ۔

"واستغنی اللّٰہ" (خدا بے نیاز تھا) کی تعبیر، اس طرح مطلق ہے کہ ہر چیز سے ، یہاں تک کہ انسانوں کے ایمان اور اطاعت سے بھی، اس کی بے نیازی کو بیان کرتی ہے تاکہ یہ تصور نہ آئے کہ یہ سب تاکیدیں اور اصرار اس بناء پر ہے کہ اس اطاعت کا فائدہ خدا کی طرف لوٹتا ہے ۔ اس نے مخلوقات کو ہرگز اس لیے پیدا نہیں کیا کہ اُسے اُن سے کوئی فائدہ ہو ، بلکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے بندوں پر جُود وسخا کرے ۔

بعض نے "واستغنی اللّٰہ" کے جملہ کے لیے ایک اور تفسیر بھی بیان کی ہے کہ خدا نے اس قدر واضح آیات ، دلائل اور کافی وعظ و نصائح ان کے لیے بھیجے ہیں کہ اس کے علاوہ کچھ بھیجنے سے بے نیاز تھا ۔

٭ ٭ ٭

۷ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَ
رَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَ ذٰلِكَ عَلَى
اللّٰهِ يَسِيْرٌ ○
۸ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○
۹ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۭ وَ
مَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ يَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ
سَيِّاٰتِهٖ وَ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○
۱۰ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ
النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ○

ترجمہ

۷ کافروں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ انھیں ہرگز زندہ کرکے اُٹھایا نہیں جائیگا۔ کہہ دیجئے۔ ہاں ! مجھے اپنے پروردگار کی قسم ہے۔ تم سب کے سب قیامت میں (زندہ کرکے ضرور) اٹھائے جاؤ گے۔ اس کے بعد جو کچھ تم عمل کیا کرتے تھے اس کی وہ تمھیں

خبر دے گا اور یہ خدا کے لیے آسان ہے۔

(۸) اب جبکہ یہ بات ہے تو خدا اور اس کے رسُول اور اس نور پر ایمان لے آؤ جسے ہم نے نازل کیا ہے۔ اور یہ جان لو کہ خدا تمھارے ان اعمال سے آگاہ ہے جنھیں تم انجام دیتے ہو۔

(۹) یہ اس وقت ہو گا جب وہ تم سب کو اس "اجتماع کے دن" جمع کرے گا۔ وہ تغابن کا دن ہو گا۔ (وہ دن جس میں لوگوں کو معلوم ہو گا کہ گھاٹے میں کون رہا ہے) اور جو شخص خُدا پر ایمان لے آئے اور عملِ صالح انجام دے تو وہ اس کے گناہوں کو بخش دے گا اور وہ اس کو اس جنت کے باغوں میں وارد کرے گا جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ اور وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ ایک عظیم کامیابی ہے۔

(۱۰) لیکن وہ لوگ جو کافر ہو گئے ہیں اور انھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے، وہ دوزخ والے ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور ان کا انجام بہت ہی بُرا ہے۔

تفسیر

تغابن کا دن اور غبنوں کا آشکار ہونا

ان مباحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں خلقت کے بامقصد ہونے کے بارے میں آئے تھے ان آیات میں معاد اور قیامت کے مسئلہ کو پیش کرتا ہے جو انسان کے مقصدِ خلقت کی بحث کی ایک تکمیل ہے۔

پہلے منکرین قیامت کے دعوائے بے دلیل سے شروع کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ "کافروں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ وہ ہرگز مبعوث نہیں ہوں گے۔" (زعم الذین کفروا ان لن یبعثوا)۔

'زعم' زعم کے مادہ سے (بروزن طعم) اس بات کے معنی میں ہے کہ جس کے جھوٹ ہونے کا احتمال یا یقین ہو۔ کبھی باطل خیال کے معنی میں بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور زیرِ بحث آیت میں وہی پہلا معنی مُراد ہے۔

اہلِ لغت کے بعض کلمات سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ مادہ بطور مُطلق خبر دینے کے معنی میں[1]

---

[1] مجمع البحرین مادہ 'زعم'

بھی آیا ہے۔

اگرچہ اس لفظ کے موارد استعمال اور مفسرین کے کلمات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ جھوٹ کے مفہوم کی آمیزش رکھتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے یہ کہا ہے کہ ہر چیز کی ایک کنیت ہوتی ہے اور دروغ کی کنیت "زعم" ہے۔

بہرحال قرآن اس گفتگو کے بعد پیغمبرِ اسلام کو حکم دیتا ہے: "کہہ دیجئے، ہاں! مجھے میرے پروردگار کی قسم ہے، تم سب کے سب (زندہ کرکے) اُٹھائے جاؤ گے۔ اس کے بعد جو کچھ تم نے عمل کیا ہے تمھیں اس کی خبر دیں گے اور یہ خدا کے لیے آسان ہے۔" (قل بلی وربی لتبعثن ثم لتنبؤن بما عملتم و ذالك على الله يسير)۔

حقیقت میں پہلے قاطع لب ولہجہ میں منکرین قیامت کے دعوائے بلا دلیل کی نفی کرتا ہے۔ ایک ایسے تاکیدی لب و لہجہ اور قسم کی آمیزش کے ساتھ جو کہنے والے یعنی پیغمبر کے اعتقادِ راسخ کی حکایت کرتا ہے۔ اس کے بعد "وذالك على الله يسير" کے جملہ کے ساتھ اس پر استدلال کرتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ منکرین معاد کا اہم ترین شبہ اور اعتراض یہ تھا کہ بوسیدہ اور خاک شدہ ہڈیاں کیسے زندہ ہوں گی؟ اوپر والی آیت کہتی ہے کہ جب کام خداوندِ قادرِ متعال کے ہاتھ میں ہے تو پھر کوئی مشکل نہیں ہے۔ چونکہ ابتداء میں تو وہ انھیں عدم سے وجود میں لایا ہے اور مُردوں کو زندہ کرنا اس کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ بلکہ بعض کے نظریہ کے مطابق تو "وربی" کی قسم ہی معاد کی دلیل کی طرف خود ایک لطیف اشارہ ہے۔ کیونکہ خدا کی ربوبیت کا تقاضایہ ہے کہ انسان کی اس حرکت تکاملی کو دنیا کی بے قدروقیمت زندگی کی حدود میں ہی بانجھ نہ کردے۔ دوسرے لفظوں میں جب تک ہم معاد کے مسئلہ کو قبول نہ کریں تو خدا تعالیٰ کی ربوبیت کا انسان اور اس کی تربیت وتکامل کے بارے میں کوئی مفہوم نہیں ہوگا۔

بعض مفسرین و ذالك على الله يسير کے جملہ کو خصوصیت سے قیامت میں خدا کے انسانوں کو ان کے اعمال کی خبر دینے سے مربوط سمجھتے ہیں جس کا ذکر قبل کے جملہ میں آیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ آیت کے پورے مضمون کی طرف لوٹتا ہے۔ (اصل قیامت اور اس کی فرع جو اعمال کی خبر دینے کا مسئلہ ہے، ایسی خبر جو حساب وجزا کے لیے ایک مقدمہ ہے۔)

❁ ❁ ❁

بعد والی آیت میں اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے: "اب جبکہ قیامت یقینی طور پر برپا ہوگی تو تم سب کے سب خدا اُس کے رسولؐ اور اس نور پر ایمان لے آؤ جسے ہم نے نازل کیا ہے۔" (فامنوا بالله ورسوله والنور الذی انزلنا)۔

"اور جان لو کہ خدا تمھارے ان اعمال سے آگاہ ہے جنھیں تم انجام دیتے ہو۔" (والله بما تعملون خبير)۔

اِس طرح سے یہ حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو قیامت کے لیے ایمان اور عمل صالح کے طریق سے آمادہ کریں۔ تین اصولوں پہ ایمان "خدا"، "رسُول" اور "قرآن" جس میں دُوسرے اصول بھی درج ہیں۔

قرآن کی 'نور' کے عنوان سے تعبیر، متعدد آیات میں آئی ہے۔ اور لفظ 'انزلنا' (ہم نے نازل کیا) کی تعبیر، اس پر ایک اور شاہد ہے۔ اگرچہ متعدد روایات میں جو اہلِ بیت کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں، زیرِ بحث آیت میں لفظ 'نور' وجُود 'امام' سے تفسیر ہُوا ہے۔ ممکن ہے یہ تفسیر اس لحاظ سے ہو کہ وجودِ امامؑ کتاب اللہ کا عملی تجسُّم شمار ہوتا ہے۔ اسی لیے بعض اوقات پیغمبرؐ اور امامؑ کو قرآن ناطق سے یاد کیا گیا ہے۔ ان روایات میں سے ایک میں امام محمد باقرؑ سے آیا ہے کہ آپؑ نے آئمہ علیہم السّلام کے بارے میں فرمایا:

"وھو الذین ینورون قلوب المؤمنین"

"اور وہ (ائمہ) وہی ہیں جو مومنین کے دلوں کو نور اور روشنی بخشتے ہیں"۔ [۱]

بعد والی آیت قیامت کے دن کی توصیف کرتے ہُوئے کہتی ہے: "یہ بعث ونشور اور حساب وجزاء اس دن ہو گا جب وہ اجتماع کے دن تمھیں اکٹھا کرے گا"۔ (یوم یجمعکم لیوم الجمع)۔[۲]

قیامت کے ناموں میں سے ایک نام "یوم الجمع" بھی ہے۔ جس کی طرف آیات قرآنی میں مختلف تعبیروں کے ساتھ بارہا اشارہ ہُوا ہے۔ منجملہ ان کے سُورۂ واقعہ کی آیت ۴۹، ۵۰ میں آیا ہے: قل ان الاولین والاٰخرین لمجموعون الیٰ میقات یوم معلوم: "کہہ دیجئے۔ تمام اوّلین و آخرین ایک معین دن کی میقات میں جمع ہوں گے"۔ اور اس سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ تمام انسانوں کی قیامت ایک ہی دن ہے۔ اِس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ دن تغابن کا دِن ہے"۔ (ذالك یوم التغابن)۔

وہ ایسا دن ہے کہ جس میں "غابن" (سبقت کرنے والا) اور "مغبون" (ہارجانے والا) پہچانا جائے گا۔ وہ دن جس میں یہ واضح ہو جائے گا کہ کون کون لوگ اپنی تجارت میں عالم دنیا میں غبن، زیان اور خسارے میں گرفتار ہُوئے ہیں۔

وہ ایسا دن ہے کہ جس میں اہلِ جہنّم جنّت میں اپنی خالی جگہ کو دیکھیں گے اور افسوس کریں گے اور جنّتی دوزخ میں اپنی خالی جگہ کو دیکھیں گے اور خوش ہوں گے۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ ہر انسان کیلئے ایک جگہ جنّت میں اور ایک جگہ جہنّم میں ہے۔ اگر وہ جنّت میں چلا گیا تو اس کی جہنم والی جگہ دوزخیوں کے سپرد کر دی جائیگی۔ اور اگر وہ جہنّم میں چلا گیا تو اس کی جنّت والی جگہ بہشتیوں کو دے دی جائے گی۔ اور احتمال یہ ہے کہ اس مورد

[۱] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۴۱

[۲] "یوم یجمعکم" ممکن ہے کہ "لتبعثن" یا جُملہ "لتنبؤن" یا "خبیر" سے متعلق ہو۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ 'اذکر' جیسے محذوف جملہ سے متعلق ہو لیکن یہ آخری احتمال بعید نظر آتا ہے بلکہ گذشتہ احتمالوں میں سے کوئی ایک مناسب ہے۔ [۳] نور الثقلین جلد ۳ ص ۵۳۲

میں، آیاتِ قرآنی میں ارث کی تعبیر اسی مطلب کے لیے آئی ہے۔

اس طرح سے قیامت کا ایک نام "یوم التغابن" غبنوں کے ظہور کا دن ہے۔[1] اس کے بعد اُس دن میں مومنین کی حالت کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے:

"جو شخص خدا پر ایمان لائے گا اور اعمال صالح انجام دے گا، خدا اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کرتے ہوئے انھیں ختم کر دے گا۔ وہ انھیں جنّت کے ایسے باغوں میں وارد کرے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور یہ ایک عظیم کامیابی ہے"۔ (و من یؤمن باللّٰہ و یعمل صالحا یکفر عنہ سیئاتہ و یدخلہ جنات تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا ابدًا ذالك الفوز العظیم)۔

اس طرح سے جب دو اصل شرطیں یعنی ایمان اور عمل صالح حاصل ہو جائیں گی تو یہ عظیم نعمتیں اسے حاصل ہوں گی:

گناہوں کی بخشش، جو فکر انسانی کو ہر چیز سے زیادہ اپنی طرف مشغول رکھتی ہے:

گناہ سے پاک ہونے کے بعد دائمی بہشت میں داخل ہونا اور فوز عظیم حاصل کرنا۔

اس بناء پر تمام چیزیں ایمان اور عمل صالح کے محور پر ہی گردش کرتی ہیں اور یہی اصلی سرمائے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہوں گے جو اس دن یعنی "یوم تغابن" نہ صرف مغبون نہیں ہوں گے بلکہ عظیم کامیابی پر فائز ہوں گے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "لیکن وہ لوگ جو کافر ہو گئے اور ہماری آیات کی تکذیب کی بیشک وہ اصحاب نار یعنی دوزخ والے ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور ان کا انجام بہت ہی بُرا ہے"۔ (و الذین کفروا و کذبوا بآیاتنا اولٰئك اصحاب النار خالدین فیھا و بئس المصیر)۔

یہاں بھی دو چیزیں بدبختی کی عامل شمار ہوئی ہیں: "کفر" اور "آیاتِ الٰہی کی تکذیب" جو "ایمان" اور "عملِ صالح" کی ضد ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہاں بہشتِ جاودانی کے بارے میں اور یہاں ہمیشہ کے دوزخ کے بارے میں گفتگو ہے۔ وہاں فوز عظیم اور یہاں بئس المصیر اور مرگبار انجام ہے۔

ان دونوں آیات میں جنّتیوں اور دوزخیوں کے درمیان جو فرق نظر آتا ہے، ایک تو یہ ہے کہ جنّتیوں کے بارے میں ہر چیز سے پہلے گناہوں کی مغفرت کا ذکر ہوا ہے کہ جو دوزخیوں کے بارے میں نہیں آیا۔ دوسرا یہ

---

[1] 'تغابن' باب تفاعل سے ہے اور عام طور پر ایسے موارد میں بولا جاتا ہے جو دو جانبہ ہوں۔ جیسے تعارض و تزاحم وغیرہ اور قیامت کے بارے میں یہ معنی ممکن ہے اس طرح سے ہو کہ مومنین کے گروہ اور کفار کے تعارض کا نتیجہ قیامت میں ظاہر ہوگا اور حقیقت میں قیامت کا دن تغابن کے ظہور کا دن ہوگا۔ اہلِ لغت کے بعض کلمات سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ باب تفاعل ہمیشہ اس معنی کے لیے نہیں آتا اور یہاں ظہور غبن کے معنی میں ہے۔

(مفردات راغب مادّہ غبن)

کہ وہاں جنّت میں خلود یعنی ہمیشہ رہنا، لفظ "ابدًا" کے ساتھ ذکر ہُوا ہے لیکن دوزخیوں کے بارے میں صرف خلُود اور ہمیشہ رہنے کے مسئلہ پر اکتفا کی گئی ہے۔

تعبیر کا یہ فرق ممکن ہے اس بناء پر ہو کہ دوزخیوں کے درمیان ایسے کافر بھی ہوں گے جنھوں نے ایمان و کُفر کے مسئلہ کو آپس میں ملا دیا ہے، پھر وہ اپنے ایمان کی بناء پر انجام کار عذاب سے رہائی پا جائیں، یا یہ اس کی رحمت کے اس کے غضب پر غلبہ کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن بعض مفسّرین کا خیال ہے کہ دُوسرے جملے میں 'ابدًا' محذُوف ہے کیونکہ یہ پہلے جملے میں آ چکا ہے۔

☆ ☆ ☆

(۱۱) مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَمَنۡ
یُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ یَہۡدِ قَلۡبَہٗ ؕ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ○
(۱۲) وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ فَاِنَّمَا
عَلٰی رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ○
(۱۳) اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ وَ عَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ○

ترجمہ

(۱۱) کوئی مصیبت رُونما نہیں ہوتی مگر خدا کے اذن سے اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے تو خدا اس کے دل کو ہدایت کر دیتا ہے اور خدا ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

(۱۲) اور تم خدا کی اطاعت کرو اور پیغمبرؐ کی اطاعت کرو۔ اور اگر تم روگردانی کرو گے تو ہمارے رسُول پر تو واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمّہ داری نہیں ہے۔

(۱۳) اللہ وہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں پس مومنین کو اسی پر توکّل کرنا چاہیے۔

تفسیر

تمام مصائب اسی کے فرمان سے ہیں

پہلی زیرِ بحث آیت میں اس جہان کے دردناک مصائب اور حوادث کے بارے میں ایک اصلِ کلّی کی طرف اشارہ کرتا ہے، شاید اس وجہ سے کہ اس جہان میں مصائب کا وجود کفّار کے لیے ہمیشہ نفی عدالت کے بارے میں ایک دستاویز رہا ہے یا اس لحاظ سے کہ ایمان اور عمل صالح کی انجام دہی کی راہ میں ہمیشہ مشکلات موجود رہتی ہیں۔

جن کے مقابلہ میں مقاومت کے بغیر مومن کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اِس طرح سے ان آیات کا رابطہ گذشتہ آیات سے واضح ہو جاتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "کوئی مصیبت رُونما نہیں ہوتی مگر خُدا کے اذن سے۔" (ما اصاب من مصیبة الّا باذن اللہ)۔

اس میں شک نہیں کہ اس جہان کے تمام حوادث اذنِ خُدا سے ہیں۔کیونکہ "توحیدِ افعالی" کے مقتضیٰ کے مُطابق سارے عالمِ ہستی میں کوئی چیز حق تعالیٰ کے ارادہ کے بغیر تحقق نہیں پاتی، لیکن چونکہ مصائب ہمیشہ سے ایک سوالیہ نشان کی صُورت میں ذہنوں میں بیٹھے ہُوئے ہیں، اِس لیے خصُوصیت کے ساتھ اس پر توجّہ ہُوئی ہے۔

البتہ یہاں اذن سے مُراد وہی خدا کا ارادۂ تکوینی ہے نہ کہ ارادۂ تشریعی۔

یہاں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ ان میں سے بہُت سے مصائب ظالموں کے ظلم اور جابروں کے ارادہ سے رونما ہوتے ہیں، یا انسان خود ہی اپنی کوتاہی یا جہالت سے کوئی کام کر بیٹھے یا غلط کاری کی وجہ سے ان میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ توکیا یہ سب کے سب اذنِ خدا سے ہوتے ہیں؟

اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ تمام آیات جو مصائب کے سلسلہ میں قرآن مجید میں آئی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصائب دو قسم کے ہیں:

۱: ایسے مصائب جو انسانی زندگی کی طبیعت میں اور مزاج میں رچے بسے ہُوئے ہیں اور انسان کے ارادہ کا ان میں معمولی سا بھی دخل نہیں ہے۔ مثلاً موت اور کچھ دُوسرے طبیعی اور دردناک حوادث۔

۲: وہ مصائب جن میں انسان کا کسی نہ کسی طرح دخل ہے۔

قرآن پہلی قسم کے مصائب کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ سب اذنِ خُدا سے رُونما ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ خود تمھارے اعمال کی وجہ سے تمھیں دامنگیر ہوتے ہیں۔[۱]

اس بنا پر کوئی شخص یہ بہانہ نہیں بنا سکتا کہ چُونکہ تمام مصائب خدا کی طرف سے ہیں، لہٰذا ظالموں کے مقابلے میں خاموشی اختیار کرتے ہُوئے ان سے مبارزہ کے لیے نہیں اُٹھنا چاہیے۔ نیز انسان اس بہانے سے بیماریوں اور آفات سے مُقابلہ کرنے اور فقر و جہالت سے مبارزہ کرنے سے بھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

البتہ یہاں ایک اور نکتہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسے مصائب کہ جن میں انسان کا کچھ عمل دخل ہے، ان کے اسباب کی تاثیر بھی خدا کی طرف سے اور اس کے اذن و فرمان سے ہے کہ اگر وہ ارادہ کرے تو ہر سبب بیرنگ اور بے اثر ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں مومنین کو بشارت دیتا ہے۔ "جو شخص خدا پر ایمان لے آئے خدا اس کے

---

[۱] سورہ حدید کی آیت ۲۲، شوریٰ کی آیت ۳۰، اور آلِ عمران کی آیت ۱۶۵ کی طرف رجوع کرنے سے مطلب پُورے طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں سورہ حدید کی آیت ۲۲ کے ذیل میں زیادہ تفصیل آئی ہے۔

دل کو ہدایت کرتا ہے (اس طرح سے کہ وہ مصائب کے مقابلے میں گھٹنے نہ ٹیکے ، مایوس نہ ہو اور شور و بیتابی نہ کرے) (ومن یؤمن باللہ یھد قلبہ)۔

یہ خدائی ہدایت جب انسان کے پاس آتی ہے تو وہ نعمتوں میں شاکر ، مصیبتوں میں صابر اور قضائے الٰہی کے مقابلے میں سرِتسلیم خم کردیتا ہے۔

البتہ ہدایتِ قلبی ایک وسیع معنیٰ رکھتی ہے کہ "صبروشکر"، "رضا وتسلیم" اور "انا للہ وانا الیہ راجعون" کہنا ، ان میں سے ہر ایک اس کی شاخ ہے ۔ہاں یہ جو بعض مفسّرین نے خصوصیت کے ساتھ ان میں سے کسی ایک موضوع کو نقل کیا ہے ، حقیقت میں وہ آیت کا پورا مفہوم نہیں بلکہ وہ واضح مصداق کا بیان ہے ۔آیت کے آخر میں فرماتا ہے۔ "خدا ہر چیز کو جانتا ہے۔" (واللہ بکل شیٔ علیم)۔

ممکن ہے اس تعبیر میں مصائب اور بلاؤں کے فلسفہ کی طرف اجمالی اشارہ ہو کہ خدا اپنے علم اور اپنی بے پایاں آگاہی کی وجہ سے بندوں کی تربیت ، بیدار باش کے اعلان اور ہر قسم کے غرور و غفلت سے مبارزہ کے لیے کبھی کبھی ان کی زندگانی میں مصائب کو ایجاد کردیتا ہے تاکہ وہ سوئے نہ رہیں ۔ دنیا میں اپنی حیثیت کو بھول نہ جائیں اور طغیان و سرکشی کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں۔

⁂ ⁂ ⁂

چونکہ مبدء و معاد کی معرفت ، جن کی گزشتہ آیات میں بنیاد رکھی گئی ہے ، اس کا حتمی اثر ، خدا اور پیغمبرؐ کی عملی اطاعت کے لیے سعی و کوشش ہے ، لہٰذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے۔ "اور خدا کی اطاعت کرو اور پیغمبرؐ کی اطاعت کرو۔" (واطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول)۔

یہ بات واضح ہے کہ رسُولِ خداؐ کی اطاعت بھی خدا کی اطاعت کا ہی ایک شعبہ ہے۔کیونکہ رسول اپنی طرف سے کوئی چیز نہیں کہتا ، یہاں 'اطیعو' کی تکرار اسی چیز کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دونوں ایک دُوسرے کے عرض میں نہیں ہیں بلکہ ان میں سے ایک دوسری سے قوت حاصل کرتی ہے ۔ اس سے قطع نظر خدا کی اطاعت ، اصُول و قوانین اور تشریعِ الٰہی سے مربُوط ہے ۔ اس بنا پر ان میں سے ایک اصل ہے اور دوسری اس کی فرع ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے : "اگر تم روگرداں ہوجاؤ اور اطاعت نہ کرو تو وہ تمھیں مجبور کرنے پر مامور نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے رسول کا وظیفہ اور ذمّہ داری تو صرف واضح طور پر احکام پہنچا دینا ہے۔" (فان تولیتم فانما علیٰ رسولنا البلاغ المبین)۔[۱]

---

[۱] "فان تولیتم" جملہ شرطیہ ہے جس کی جزا محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے : فان تولیتم فقد ادی وظیفتہ ۔ یا ۔ فان تولیتم لا یقھرکم علی الایمان یا لاباس علیہ وغیرہ ۔ اگر تم روگردانی کرو تو وہ اپنی ذمّہ داری پوری کرچکا ہے یا وہ تمھیں ایمان پر مجبور نہیں کرتا یا اس کے لیے کوئی حرج نہیں ہے۔

ہاں وہ پیغام حق پہنچانے کا ذمہ دار ہے اور بس یہی اس کی ذمہ داری ہے ۔اس کے بعد تمھارا معاملہ خُدا کے ساتھ ہے ، یہ تعبیر ایک قسم کی پختہ اور اجمالی تہدید ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں توحید درعبُودیّت کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔جو وجُوب اطاعت کے لیے ایک دلیل کی حیثیّت رکھتی ہے۔ فرماتا ہے: "اللہ وہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی معبُود نہیں"۔ (اللہ لا الٰہ الّا ھو)۔

پھر جب یہ بات ہے تو مومن کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ (وعلی اللہ فلیتوکل المؤمنون)۔

اس کے علاوہ کوئی بھی عبودیّت کے لائق نہیں ہے ،کیونکہ مالکیّت ، قدرت ، علم اور غنیٰ سب اسی کے لیے ہیں ۔ دوسروں کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اسی کی طرف سے ہے ۔ اسی وجہ سے انھیں اس کے علاوہ کسی غیر کے سامنے سرِتسلیم و تعظیم خم نہیں کرنا چاہیے ، ہر قسم کی مُشکل کے حل کے لیے اسی سے مدد مانگنی چاہیے اور صرف اسی پر توکّل کرنا چاہیئے۔

٭ ٭ ٭

(۱۴) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ
عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا
وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝
(۱۵) اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ
اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝
(۱۶) فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا
خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝
(۱۷) اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ
وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ۙ
(۱۸) عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

ترجمہ

(۱۴) اے ایمان لانے والو! تمھاری ازواج اور اولاد میں سے بعض تمھارے دشمن ہیں۔ ان سے بچ کے رہو، اور اگر معاف کردو اور صرف نظر کرلو اور بخش دو (تو خدا تمھیں بخش دے گا) کیونکہ خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

(۱۵) تمھارے اموال و اولاد تمھاری آزمائش کا ذریعہ ہیں اور عظیم جزا خدا ہی کے پاس ہے۔

(۱۶) اس لیے جہاں تک ہو سکے تقویٰ اختیار کرو اور کان دھر کے سنو اور اطاعت کرو اور انفاق کرو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے اور جو لوگ اپنے بُخل سے بچ جائیں وہی رستگار و کامیاب ہیں۔

(۱۷) اگر تم خدا کو قرضِ حسنہ دو گے تو وہ اسے تمھارے لیے کئی گنا کر دے گا اور تمھیں بخش دے گا اور خُدا قدردان اور بُردبار ہے۔

(۱۸) وہ پنہاں و آشکار سے باخبر ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے۔

شانِ نزول

ایک روایت میں امام باقرؑ سے آیا ہے کہ آپ نے آیت "ان من ازواجکم ......" کے بارے میں فرمایا:

"اس سے مُراد یہ ہے کہ جس وقت بعض مرد ہجرت کرنا چاہتے تو ان کا بیٹا اور بیوی ان کا دامن پکڑ لیتے اور کہتے تھے: "تجھے خدا کی قسم کہ ہجرت نہ کر۔ کیونکہ اگر تو چلا گیا تو ہم تیرے بعد بے سرپرست رہ جائیں گے۔" پھر بعض اس بات کو قبول کر لیتے اور وہ رہ جاتے تھے۔ لہٰذا اوپر والی آیت نازل ہوئی اور انھیں اس قسم کی گزارشوں کو قبول کر لینے اور اس سلسلہ میں اولاد اور بیویوں کی اطاعت کرنے سے ڈرایا، لیکن کچھ ایسے افراد بھی تھے جو بالکل پروا نہ کرتے اور چلے جاتے تھے لیکن وہ اپنے گھر والوں سے یہ کہتے تھے: "خدا کی قسم! اگر تم ہمارے ساتھ ہجرت نہیں کرو گے اور بعد میں (دارالہجرت) مدینہ میں ہمارے پاس آؤ گے تو ہم بالکل تمھاری پروا نہیں کریں گے۔ چنانچہ انھیں حکم دیا گیا کہ جس وقت ان کے گھر والے ان سے آملیں تو گذشتہ امور کو فراموش کر دیں اور و ان تعفوا و تصفحوا و تغفروا فان اللہ غفور رحیم کا جملہ اسی معنی کو بیان کر رہا ہے۔[1]

❊ ❊ ❊

[1] "تفسیر علی ابن ابراہیم" مطابق نقل "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۳۴۲، یہی مطلب مختصر صورت میں تفسیر "درّالمنثور" اور دوسری (باقی اگلے صفحہ پر)

تفسیر

تمہارے اموال و اولاد تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں۔

چونکہ گزشتہ آیات میں خدا اور اس کے رسُول کی اطاعت کا حکم بلاکسی قید و شرط کے آیا تھا اور اس راستہ کے اہم موانع میں سے ایک اموال و ازواج و اولاد کے ساتھ زیادہ لگاؤ ہے۔لہٰذا زیرِ بحث آیات میں مسلمانوں کو اس سلسلہ میں خبردار کرتے ہُوئے پہلے کہتا ہے: "اے ایمان لانے والو! تمھاری ازواج اور اولاد میں سے بعض تمھارے دشمن ہیں ان سے بچ کے رہو۔" (یاایھا الذین اٰمنوا ان من ازواجکم و اولادکم عدوًا لکم فاحذروھم)۔

یقیناً اس عداوت کی نشانیاں کم نہیں ہیں، جب تم یہ چاہتے ہو کہ ہجرت جیسے کسی مثبت کام کو انجام دو تو وہ تمھارا دامن پکڑ لیتے ہیں اور اس فیضِ عظیم میں رکاوٹ بنتے ہیں۔نیز بعض اوقات تمھاری موت کا انتظار کرتے رہتے ہیں تاکہ تمھاری دولت کے مالک بن جائیں اور اسی قسم کی دوسری باتیں بھی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ نہ تو تمام اولاد اور نہ ہی تمام بیویاں ایسی ہوتی ہیں۔اسی لیے 'من' تبعیضیہ کے ذریعے اس معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان میں سے بعض ایسے ہیں لہٰذا تم ان سے بچ کے رہو۔

البتہ یہ دشمنی کبھی دوستی کے لباس میں اور خدمت کے گمان میں ہوتی ہے۔کبھی سچ مچ بُری نیت اور عداوت و دشمنی کے ارادہ سے انجام پاتی ہے یا اپنے منافع کی غرض سے ہوتی ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ جب انسان دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے جن میں سے ایک راستہ تو خدا کی طرف اور دوسرا بیوی اور اولاد کی طرف ہوتا ہے اور یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو پھر ضروری ہے کہ ارادہ و تصمیم کرتے وقت شک و تردد کو اپنے اندر راہ نہ دے، بلکہ حق تعالیٰ کی رضا کو ہر چیز پر مُقدم شمار کرے، کیونکہ دُنیا و آخرت کی نجات اسی میں ہے۔

اسی لیے سورہ توبہ آیت ۲۳ میں آیا ہے: یاایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا اٰباءکم و اخوانکم اولیاء ان استحبوا الکفر علی الایمان و من یتولھم منکم فاولٰئک ھم الظالمون۔ "اے ایمان لانے والو اگر تمھارے آباؤ اجداد اور بھائی بند کفر کو ایمان پر مقدم شمار کریں تو تم انھیں اپنا دوست نہ بناؤ، وہ ظالم و ستمگر ہیں۔

چونکہ یہ ممکن ہے کہ یہ حکم آباؤ اجداد، شوہروں اور ازواج کی طرف سے خشونت، انتقام جُوئی اور افراط کا بہانہ بن جائے، لہٰذا اسی آیت کے ذیل میں بلافاصلہ ان کے اعتدال میں رہنے کے لیے فرماتا ہے: "اور اگر تم معاف کردو۔

(بقیہ صفحہ سابقہ) تفاسیر میں ابن عباس سے نقل ہُوا ہے۔لیکن کسی میں بھی مذکورہ بالا حدیث جیسی جامعیت نہیں ہے۔

صرفِ نظر کرلو اور بخش دو تو خدا بھی تمھیں اپنے عفو و رحمت کا مورد قرار دے گا۔ کیونکہ خدا غفور و رحیم ہے۔" (و ان تعفوا وتصفحوا وتغفروا فان اللہ غفور رحیم)۔

اس بناء پر اگر وہ اپنے عمل سے پشیمان ہو جائیں اور عذر خواہی کریں یا ہجرت کے بعد تم سے آملیں تو انھیں اپنے آپ سے دور نہ کرو، اور عفو و درگزر کو اختیار کرو جیسا کہ تم توقع رکھتے ہو کہ خدا بھی تمھارے ساتھ ایسا ہی سلوک کرے۔

"بی بی عائشہ" کی داستانِ افک کے متعلق سورہ نور کی تفسیر میں آیا ہے: جب مدینہ میں چرچا کرنے والوں کا کام اونچا چلا گیا تو بعض مومنین کہ جن کے رشتہ دار یہ چرچا کرنے والوں میں سے تھے، انھوں نے یہ قسم کھالی، کہ انھیں کوئی مالی امداد نہیں دیں گے۔ تب اسی سورۂ نور کی آیت ۲۲ نازل ہوئی: "وہ لوگ جو مالی برتری اور زندگی میں وسعت رکھتے ہیں انھیں یہ قسم نہیں کھانی چاہیئے کہ وہ اپنے عزیزوں، حاجت مندوں اور راہِ خدا میں ہجرت کرنے والوں پر خرچ کرنے سے باز رہیں۔ انھیں چاہیئے کہ عفو و درگزر اور صرفِ نظر کریں۔" الا تحبون ان یغفر اللہ لکم: "کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ خدا تمھیں بخش دے۔"

اس بارے میں کہ 'عفو' 'صفح' اور 'غفران' کے درمیان کیا فرق ہے؟ ان کے لغوی مفہوم کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ بخششِ گناہ کے مراتب کے سلسلہ کو بیان کرتا ہے۔ کیونکہ 'عفو' سزا سے صرفِ نظر کرنے کے معنی میں ہے، اور 'صفح' اس سے بالاتر مرتبہ ہے، یعنی ہر قسم کی سرزنش کو ترک کرنا۔ اور 'غفران' گناہ کی پردہ پوشی اور اسے فراموش کر دینے کے معنی میں ہے۔

اس طرح اہلِ ایمان کو اپنے اصولِ اعتقاد کی قطعی حفاظت کرتے ہوئے۔ اس اولاد اور بیوی کے سامنے جو انہیں راہِ خطا کی دعوت دیتے ہیں، سرِ تسلیم خم نہ کرتے ہوئے جتنا ہو سکے تمام مراحل میں محبت اور عفو و درگزر سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ یہ باتیں ان کی تربیت اور انھیں خدا کی اطاعت کی طرف لوٹانے کا ایک ذریعہ ہیں۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں ایک اور اصلِ کلی کی طرف یعنی اموال اور اولاد کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "تمھارے اموال اور اولاد تمھاری آزمائش کا ایک ذریعہ ہیں"۔ (انما اموالکم و اولادکم فتنۃ)۔

اگر تم اس آزمائش کے میدان میں کامیاب ہو جاؤ تو "اللہ کے ہاں (تمھارے لیے) عظیم اجر و پاداش ہے۔" (واللہ عندہ اجر عظیم)۔

گزشتہ آیت میں انسان کے لیے صرف "بعض" بیویوں اور اولاد کی عداوت کی گفتگو تھی، جو اُسے خدا کی اطاعت کے راستے سے منحرف کر کے گناہ اور بعض اوقات کفر کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں تمام اولاد اور اموال کی بات ہو رہی ہے کہ وہ انسان کی آزمائش کا ایک ذریعہ ہیں۔

درحقیقت خدا انسان کی تربیت کے لیے ہمیشہ اُسے امتحان کی گرم بھٹی میں ڈال دیتا ہے اور مختلف امور

کے ساتھ اس کو آزماتا ہے۔ لیکن یہ دونوں (اموال و اولاد) اس کے امتحان کے اہم ترین وسائل ہیں کیونکہ ایک طرف سے ایمان کی کشش اور دوسری طرف سے اولاد سے لگاؤ، انسان میں اس قسم کی قوی کشش پیدا کر دیتے ہیں، ایسے مواقع پر جب خدا کی رضا ان کی رضا سے جُدا ہو جاتی ہے تو انسان سخت فشار اور دباؤ میں ہوتا ہے۔

"انما" کی تعبیر جو عام طور پر حصر کے لیے لائی جاتی ہے اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ یہ دونوں موضوع دوسری ہر چیز سے زیادہ امتحان کا ذریعہ ہیں۔ اسی بناء پر امیرالمومنینؑ نے فرمایا:۔

لا یقولن احدکم "اللّٰھم انی اعوذ بک من الفتنة" لانه لیس احد الا و هو مشتمل علی فتنة، ولکن من استعاذ فلیستعذ من مضلات الفتن فان الله سبحانه یقول: واعلموا انما اموالکم و اولادکم فتنة"۔

"تم میں سے کوئی شخص یہ نہ کہے کہ خداوندا! میں تجھ سے امتحان و آزمائش سے پناہ مانگتا ہوں، کیونکہ ہر شخص کے پاس آزمائش کا ذریعہ ہوتا ہے (اور کم از کم اس کے پاس مال و اولاد ہوتے ہیں۔ اور اصُولی طور پر دُنیا کی زندگی کا مزاج، آزمائش اور امتحان کی کٹھالی ہے) لیکن جو شخص یہ چاہتا ہے کہ خدا سے پناہ لے تو وہ گمراہ کرنے والے امتحانوں سے پناہ لے۔ کیونکہ خدا کہتا ہے: "جان لو کہ تمھارے اموال و اولاد آزمائش کا ایک ذریعہ ہیں"۔ [1]

یہی مطلب تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورہ انفال کی آیت ۲۸ میں بھی نظر آتا ہے (جو کچھ امیرالمومنین علیؑ کے کلام اور اوپر والی روایت کے ذیل میں بیان ہُوا ہے، وہی تعبیر ہے جو سورۃ انفال میں آئی ہے غور کیجیے۔)

اس موقع پر بہت سے مفسرین اور محدثین نے نقل کیا ہے کہ ایک دن رسُول خداؐ منبر پر خطبہ دے رہے تھے۔ حسن وحسین علیہما السلام، جو ان دنوں بچے تھے، مسجد میں وارد ہوئے۔ انھوں نے سُرخ رنگ کے کپڑے پہنے ہُوئے تھے اور چلتے چلتے کبھی پھسل کر گر جاتے تھے۔ جونہی رسُول خداؐ کی نگاہ ان پر پڑی تو خطبہ چھوڑ دیا اور منبر سے اُتر کر انھیں اپنی آغوش میں لے لیا، پھر ان کو منبر پر لے گئے اور اپنی گود میں بٹھا کر فرمایا: "خدا نے عزوجل نے درست فرمایا کہ جو کہتا ہے: "انما اموالکم و اولادکم فتنة"۔ جب میری نظر ان دونوں بچوں پر پڑی اور میں نے دیکھا کہ وہ چلتے چلتے پھسل جاتے ہیں تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے اپنی گفتگو کو چھوڑ کر انھیں اٹھا لیا"۔ اس کے بعد آپؐ نے اپنے خطبہ کو جاری کیا۔ [2]

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار جملہ ۹۳

[2] "مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۰۱ (زیربحث آیت کے ذیل میں) اسی حدیث کو تفسیر قرطبی، روح المعانی، فی ظلال قرآن اور المیزان میں بھی مختصر اختلاف کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔

اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ فتنہ اور آزمائش کبھی تو خیر کی اور کبھی شر کی آزمائش ہوتی ہے۔یہاں ممکن ہے خیر کی آزمائش مُراد ہو اس معنی میں کہ خدا چاہتا ہے اپنے پیغمبرؐ کو آزمائے۔کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ منبر پر خطبہ دیتے وقت ان دونوں شہزادوں کی حالت سے غافل ہو جائے جو جگر گوشہ زہراؑ ہیں اور ان سے ہر ایک آئندہ بلند مقام پر فائز ہونے والا ہے۔یا خطبہ کا جلال وشوکت، محبت وعاطفت کے اظہار میں مانع تو نہیں ہوتا۔ورنہ مُسلّمہ طور پر پیغمبرؐ بچّوں کی محبت کی بناء پر ہرگز خدا کی یاد اور تبلیغ وہدایت کی بھاری ذمہ داریوں کے انجام دینے سے غافل نہیں ہُوئے تھے۔

بہرحال پیغمبرؐ کا یہ عمل تمام مسلمانوں کے لیے ایک تنبیہ تھا کہ وہ علیؑ اور فاطمہؑ کے ان دونوں شہزادوں کی قدرو منزلت اور حیثیت کو پہچانیں۔

اسی لیے ایک حدیث میں جو اہلِ سُنّت کے مشہُور منابع میں نقل ہُوئی ہے یہ آیا ہے کہ "براء بن عازب" (مشہور صحابی) یہ کہتا ہے:

"رأیت الحسن بن علی علی عاتق النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وھو یقول: اللّٰھم انی احبہ فاحبہ"

"میں نے حسنؑ بن علیؑ کو پیغمبرؐ کے دوش پر دیکھا جب کہ آپ فرما رہے تھے: خدایا میں اسے دوست رکھتا ہُوں۔تو بھی اسے دوست رکھ۔"[1]

دوسری روایات میں آیا ہے کہ بعض اوقات حسینؑ آتے اور سجدہ کی حالت میں پیغمبرؐ کے دوش پر سوار ہو جاتے اور حضرت انھیں نہ روکتے۔[2]

چنانچہ یہ سب احادیث ان دو عظیم اماموں کے مقام کی عظمت کو بیان کرتی ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

بعد والی آیت میں نتیجہ کے عنُوان سے فرماتا ہے: "اب جبکہ ایسا ہے تو جتنا بھی تم سے ہو سکتا ہے، تقوائے الٰہی اختیار کرو، اس کے فرامین کو سنو اور اطاعت کرو اور اس کی راہ میں انفاق کرو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے": (فاتقوا اللہ ما استطعتم واسمعوا واطیعوا وانفقوا خیرًا لانفسکم)۔

پہلے گناہوں سے اجتناب کرنے کا حکم دیتا ہے (کیونکہ تقویٰ کی زیادہ تر نظر گناہ سے اجتناب کرنے کی طرف ہے) اس کے بعد اطاعت کرنے کا حکم اور سُننے کا فرمان جو اطاعت کا مقدمہ ہے۔پھر اطاعتوں میں سے خصوصیت کے ساتھ، مسئلہ انفاق پر تکیہ کرتا ہے جو خدا کی اہم ترین آزمائشوں میں سے ہے۔انجام کار کہتا ہے کہ ان سب باتوں

---

[1] صحیح مسلم جلد ۴ ص ۱۸۸۳ (باب فضائل الحسن والحسین علیہما السلام حدیث ۸۵)

[2] بحار جلد ۴۳ ص ۲۹۶ حدیث ۵۷

کا فائدہ خود تمھیں کو ہے۔

بعض مفسرین نے خیرًا کی تفسیر مال سے کی ہے جو مثبت کاموں کے انجام دینے کا ایک ذریعہ ہے۔ جیساکہ آیۂ وصیت میں بھی اسی معنی میں آیا ہے: کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترك خیرًا الوصیة للوالدین والاقربین بالمعروف: تم پر واجب ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے تو اگر وہ اپنی طرف سے یادگار کے طور پر خیر چھوڑ جائے تو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں کے لیے شائستہ طور پر وصیت کر جائے۔ (البقرۃ : ۱۸۰)

بہت سے مفسرین نے 'خیر' کی ایک وسیع معنیٰ میں بھی تفسیر کی ہے اور اسے 'انفاق' کی قید سے مقید نہیں سمجھا ہے بلکہ اسے آیت سے مربُوط سمجھا اور انھوں نے اس بارے میں یہ کہا ہے: "اس سے مُراد یہ ہے کہ ان تمام احکام کی اطاعت خود تمھارے ہی فائدے میں ہے۔ (یہ تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے)[1]

اس نکتہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ طاقت کے مطابق تقوٰی کا حکم سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۰۲ سے کوئی منافات نہیں رکھتا۔ جو یہ کہتی ہے: اتقوا الله حق تقاته۔ "جیساکہ تقوٰی اور پرہیزگاری کا حق ہے ویسا ہی خدا سے ڈرو" بلکہ یہ دونوں حکم ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ کیونکہ ایک جگہ کہتا ہے: "جتنی تم میں طاقت ہے اتنا تقوٰی اختیار کرو" اور دوسری جگہ کہتا ہے: "تقوٰی کا حق ادا کرو"۔ مُسلّم ہے کہ تقوٰی کا حق ادا کرنا، انسان کی قدرت اور توانائی کی مقدار پر مُنحصر ہے، کیونکہ تکلیف ما لا یطاق کا کوئی معنی نہیں، اور ہدف و مقصد یہ ہے کہ انسان اس راستے میں اپنی آخری کوشش کو کام میں لائے۔

اس بناء پر جن لوگوں نے زیرِ بحث آیت کو آلِ عمران کی آیت کا ناسخ سمجھا، وہ غلطی پر ہیں۔

اس آیت کے آخر میں مسئلہ انفاق پر تاکید کے عنوان سے فرماتا ہے: "جو لوگ اپنے بخل اور حرص سے بچ جائیں وہی رستگار و کامیاب ہیں"۔ (ومن یوق شح نفسه فاولئك هم المفلحون)۔

"شح" بخل کے معنی میں ہے جو حرص سے توأم ہو، جیساکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ دو صفاتِ رذیلہ، انسان کی نجات کے سخت ترین مانع اور انفاق اور کارِ خیر کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ اگر انسان لطفِ الٰہی کا دامن تھام لے' اپنے پُورے وجُود کے ساتھ اس کی طلب کرے، خود سازی اور تہذیبِ نفس کی کوشش کرے اور ان دونوں صفاتِ رذیلہ سے نجات حاصل کرلے تو پھر اس نے اپنی سعادت کی ضمانت حاصل کرلی ہے۔

اگرچہ بعض روایات میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے:

"من ادی الزکٰوۃ فقد وقی شح نفسه"

"جس شخص نے زکٰوۃ ادا کردی اُس نے بخل اور حرص سے رہائی پالی۔[2]

---

[1] پہلی تفسیر کی بناء پر "خیرًا" (انفقوا) کا مفعول ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق ایک فعل مقدر کی خبر ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا۔ یکن خیرًا لکم

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۰۱

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ شام سے صبح تک خانۂ خدا کا طواف بجا لاتے اور یہ فرماتے رہتے تھے :

"اللھم ق شح نفسی"

"خداوندا! مجھے میرے حرص و بُخل سے بچا"۔

آپ کے اصحاب میں سے ایک نے عرض کیا : "میں آپ پر قربان جاؤں۔ آج رات میں نے اس دعا کے علاوہ اور کچھ نہیں سُنا، کوئی اور دعا بھی کیجیے"۔ آپ نے فرمایا :

"نفس کے بخل اور حرص سے بڑھ کر اور کون سی چیز زیادہ خطرناک ہے، جبکہ خدا فرماتا ہے" :

"ومن یوق شح نفسه فاولٰئك هم المفلحون" [1]

* * *

اس کے بعد انفاق کرنے کی تشویق اور نفس کو بُخل و شح سے روکنے کے لیے فرماتا ہے : "اگر تم خدا کو قرض حسنہ دو گے تو وہ اسے کئی گنا کر دے گا اور تمھیں بخش دے گا اور خدا قدردان اور بُردبار ہے"۔ (ان تقرضوا الله قرضًا حسنًا یضاعفه لکم ویغفر لکم والله شکور حلیم)۔

کتنی عجیب تعبیر ہے کہ جسے قرآن مجید میں "انفاق فی سبیل اللہ" کے بارے میں بارہا دُہرایا گیا ہے۔ وہ خدا جو ہمارے وجود کی اصل و فرع کا پیدا کرنے والا، تمام نعمتوں کا بخشنے والا اور تمام ملکیتوں کا مالک ہے، وہ ہم سے قرض طلب کرتا ہے پھر اس کے مقابلے میں "اجر مضاعف" اور "بخشش" کا وعدہ دیتا اور ہمارا شکریہ بھی ادا کرتا ہے۔ اس سے بالاتر کسی لطف و محبت کا تصور ہو ہی نہیں سکتا اور اس سے بڑھ کر بزرگواری اور رحمت ممکن ہی نہیں ہے۔ ہم کیا ہیں اور ہمارے پاس کیا ہے کہ ہم اس کو قرض دیں؟ اور سب سے انوکھی بات یہ کہ ہم یہ سب عظیم اجر و ثواب کیوں لیں گے۔

کیا یہ سب کچھ ایک طرف سے مسئلہ انفاق کی اہمیت اور دُوسری طرف سے خدا کا بندوں کے بارے میں لطفِ بے پایاں نہیں ہے؟

"قرض" اصل میں قطع کرنے اور کاٹنے کے معنی میں ہے۔ اور جب لفظ حسن کے ساتھ ہو تو مال کو اپنے سے جدا کرنے اور راہِ خیر میں دینے کے معنی میں ہے۔

"یضاعف" 'ضعف' (بروزن شعر) کے مادہ سے ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ یہ صرف دوگنا کے معنی میں نہیں بلکہ کئی گنا کے معنی بھی دیتا ہے۔ یہ لفظ انفاق کے بارے میں سات سَو گنا تک، بلکہ اس سے زیادہ کے لیے بھی قرآن میں آیا ہے۔ (البقرة۔ ۲۶۱)

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۴۶

ضمنی طور پر یغفرلکم کا جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ انفاق گناہ کی بخشش کے بہت سے عوامل میں سے ایک ہے۔

شکور کی تعبیر کہ جو خدا کی ایک صفت ہے ، اس بات کی دلیل ہے کہ خدا اپنے بندوں کا عظیم اجروں اور ثوابوں کے ذریعے شکریہ ادا کرتا ہے۔ نیز اس کا "حلیم" ہونا گناہوں کی بخشش اور بندوں کو سزا دینے میں جلدی نہ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

❖ ❖ ❖

یہاں تک کہ آخری آیت میں فرماتا ہے : "وہ پنہاں و آشکار سے آگاہ اور قادر و حکیم ہے : (عالم الغیب والشہادۃ العزیز الحکیم)۔

وہ بندوں کے اعمال اور خصوصًا ان کے پنہاں و آشکار انفاق سے باخبر ہے۔ اگر وہ ان سے قرض کا تقاضا کرتا ہے تو یہ احتیاج و نیاز اور عدم قدرت کی وجہ سے نہیں ، بلکہ کمال لطف و محبت کی وجہ سے ہے۔ اگر وہ ان کے انفاق کے مقابلہ میں ان تمام اجروں اور ثوابوں کا وعدہ دیتا ہے تو یہ بھی اس کی حکمت کا مقتضیٰ ہے۔

اس طرح خدا کے پنجگانہ اوصاف کہ جن کی طرف اس آیت اور اس سے پہلی آیت میں اشارہ ہوا ہے ، یہ سب خدا کی راہ میں انفاق کے مسئلہ کے ساتھ ایک قسم کا ربط رکھتے ہیں۔ لیکن خدا کی ان پانچ صفات کی طرف توجہ ، انفاق کی تشویق کے مسئلہ کے علاوہ انسان کو کلّی طور پر پروردگار کی اطاعت اور گناہ سے رکنے میں زیادہ مصمّم بناتی ہے اور اس کو قوتِ قلب ، ارادہ کی طاقت اور روح تقویٰ بخشتی ہے۔

❖ ❖ ❖

ایک نکتہ

ایک پُرمعنی حدیث

ایک حدیث میں پیغمبر گرامیؐ سے آیا ہے :

"ما من مولود یولد الا فی شبابیک رأسہ مکتوب خمس اٰیات من سورۃ التغابن"۔

"کوئی نومولود متولّد نہیں ہوتا مگر یہ کہ اس کے سر کے مشکوں (جالیوں) پر سُورۃ تغابن کی پانچ آیتیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں"۔[1]

ممکن ہے اس سُورہ کی یہی آخری آیات مراد ہوں جو اموال اور اولاد کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔ ان پانچ

---

[1] روح البیان جلد ۱۰ ص ۲۴۔

آیات کا سر کی جالیوں پر لکھا جانا اس مسئلہ کے حتمی ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی ان آیات کا مضمون تمام اولادِ آدم کے لیے بغیر کسی استثناء کے مطلق ہے۔

"شبابیک" "شباک" (بروزن خفاش) کی جمع ہے۔ (مشبک) جالی کے معنیٰ میں ممکن ہے سر کی ان ہڈیوں کی طرف اشارہ ہو جن کے ٹکڑے ایک دوسرے میں گھسے ہوئے ہوتے ہیں یا دماغ کی جالیوں کی طرف اشارہ ہو۔ بہرحال یہ انسان میں ان روحیات وخصوصیات کے موجود ہونے کی دلیل ہے۔

❖ ❖ ❖

خداوندا ! مال و اولاد اور بیویوں کی اس عظیم آزمائش میں ہماری مدد فرما۔

پروردگارا ! ہمیں بخل، حرص اور شحِ نفس سے دور رکھ! کیونکہ جسے تو ان سے دور رکھے گا وہی اہلِ نجات اور رستگار ہیں۔

بارِ الٰہا ! تو ہمیں قیامت کے دن میں جب گنہگار بندوں کا غبن اور نقصان ظاہر ہو جائے گا، اپنے لطف کے دامن میں اس تغابن سے بچائے رکھ۔ آمین یا رب العالمین۔

❖ ❖ ❖

سورہ تغابن کا اختتام
۲۲ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

اختتام ترجمہ
۲۸ ذیقعد ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۵ جولائی ۱۹۸۷
بروز ہفتہ صبح پونے پانچ بجے، ۸۱ ای
ماڈل ٹاؤن لاہور

ادارہ امامیہ قرأت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآن پاک (تفسیر نمونہ جلد ۱۳)
کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا میں
تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعراب
یا لفظی غلطی نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب
حافظ محمد طفیل (سلطان الافاضل)
مدرس / مینیجر
امامیہ قرأت کالج
اندرون موچی دروازہ۔ لاہور

اشاریہ

تفسیر نمونہ ـــــــــــ جلد ۱۳

ترتیب و تزئین ــــــــ سیّد شکیل حسین موسوی

ــــــــ سیّد محمّد حسین زیدی الباھروی

مضامین :

اصول و عقائد ۶۷۳
احکام ۶۷۸
اخلاقیات ۶۷۹
اقوامِ گذشتہ ۶۸۰
شخصیّات //
عُلماء و دانشور ۶۹۵
کُتب سماوی ۶۹۶
کتب تاریخ و تفسیر و سیر ۷۰۰
لُغاتِ قرآن ۷۰۲
متفرق موضوعات ۷۱۱
مقامات ۷۲۵

اُصول و عقائد

اسمائے باری تعالیٰ

الٰہ ۵۰۱، ۶۵۷

اللہ ۳۰، ۶۰، ۷۸، ۱۱۱، ۱۵۷، ۲۱۲، ۲۷۸، ۳۳۹، ۳۴۵، ۳۵۱، ۳۶۸، ۳۷۵، ۳۸۱، ۳۸۹، ۴۰۳، ۴۱۲، ۴۲۱، ۴۲۷، ۴۳۳، ۴۳۸، ۴۴۴، ۴۵۰، ۴۶۱، ۴۷۱، ۴۸۶، ۴۹۲، ۵۱۲، ۵۱۸، ۵۲۷، ۵۳۱، ۵۳۸، ۵۴۹، ۵۵۷، ۵۶۶، ۵۷۰، ۵۸۳، ۵۹۹، ۶۱۶، ۶۲۴، ۶۳۶، ۶۴۵، ۶۵۷، ۶۶۱

باری ۵۰۱

بصیر ۳۴۵، ۴۱۲، ۶۴۵

جبّار ۵۰۱

حکیم ۳۳۹، ۴۶۱، ۵۰۱، ۵۱۸، ۵۳۱، ۵۴۹، ۵۸۳، ۶۶۱

حلیم ۶۶۱

حمید ۳۸۱، ۵۱۸، ۶۴۵

خالق ۵۰۱

خبیر ۳۵۲، ۴۱۲، ۴۳۳، ۴۳۸، ۴۹۲

ذوالجلالِ والاکرام ۲۶۸

ربّ ۴۰، ۵۳، ۶۸، ۹۱، ۱۰۴، ۱۱۵، ۱۳۷، ۱۷۰، ۲۲۵، ۲۲۹، ۲۳۶، ۲۴۳، ۲۴۸، ۲۵۳، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۹ تا ۲۶۱، ۲۶۳ تا ۲۶۵، ۲۶۸ تا ۲۷۰، ۳۱۳، ۳۳۰، ۳۴۸، ۳۵۱، ۳۸۱، ۴۹۲، ۵۱۲، ۵۱۸، ۶۵۱

رحمٰن ۳۰، ۷۸، ۱۵۷، ۲۰۸، ۲۱۲، ۵۱۲، ۵۴۹، ۵۳۸، ۶۱۶، ۶۴۵

رحیم ۳۰، ۴۸، ۷۸، ۱۵۷، ۲۱۲، ۳۵۱، ۴۰۴، ۴۳۸، ۴۷۹، ۵۰۱، ۵۱۲، ۵۲۷، ۵۳۸، ۵۴۹، ۵۸۳، ۶۱۶، ۶۶۱

رؤف ۳۵۱، ۴۷۹

سبحان ۵۰۱

سلام ۵۰۱

سمیع ۴۱۲

شکور ۶۶۱

شہید ۴۲۱

عزیز ۳۳۹، ۳۸۹، ۴۵۰، ۴۶۱، ۵۰۱، ۵۱۸، ۵۴۹، ۵۸۳، ۶۶۱

عفوٌ ۴۱۲

علیم ۳۳۹، ۳۴۵، ۴۲۱، ۵۳۱، ۶۴۵، ۶۵۷

غفور ۴۰۳، ۴۱۲، ۴۳۸، ۵۲۷، ۵۳۸، ۶۶۱

غنی ۳۸۱، ۵۱۸، ۶۴۵

قدوس ۵۰۱، ۵۸۳

قدیر ۳۳۹، ۴۷۱، ۵۲۷، ۶۴۵
قوی ۳۸۹، ۴۵۰
متکبر ۵۰۱
مصوّر ۵۰۱
ملک ۵۰۱
مؤمن ۵۰۱
مہیمن ۵۰۱

توحید

اللہ شرک سے پاک و منزّہ ہے ۶۰
اسے اس ہستی نے تعلیم دی ہے جو عظیم قدرت رکھتی ہے، حد سے زیادہ توانائی اور ہر چیز پر مسلط ہے ۸۳
آسمانوں اور زمین میں سب کچھ اللہ کے لیے ہے تاکہ بدوں کو سزا اور نیکوں کو جزا دے، گناہوں سے بچنے والوں کو جانتا ہے، تمہیں زمین سے پیدا کیا، خودستائی نہ کرو۔ ۱۲۰
اللہ کا علم بے پایاں اور وسعتِ علمی بے انتہا ہے ۱۲۴
تمام امور تیرے رب کی طرف لوٹتے ہیں، وہی ہنساتا، رُلاتا، مارتا، جلاتا، جوڑے پیدا کرتا، عالم ایجاد کرتا، ستارہ شعری کا ربّ ہے۔ ۱۳۷ تا ۱۴۴
توحید وعدل کی اصل کا درمیانی نقطہ ۲۰۵
اللہ کا فرمان صرف ایک کلمہ 'کُن' اور چشم زدن میں عمل ہونا۔ ۲۰۶
خدائے رحمان نے قرآن کی تعلیم دی، انسان کو پیدا کیا، بیان کرنا سکھایا۔ ۲۱۴
تم دونوں اپنے ربّ کی کس کس نعمت کا انکار کروگے۔ ۲۱۸
ہم نے دو دریاؤں کو ایک دوسرے کے قریب قرار دیا۔ ۲۲۹
ربّ ذوالجلال والاکرام کی ذات باقی رہ جائے گی ۲۳۶
جو لوگ زمین و آسمان میں ہیں، اسی سے سوال کرتے ہیں، وہ ہر روز نئی شان اور نئے کام میں ہے۔ ۲۳۶، ۲۳۸
ہمت و قدرت ہو تو زمین و آسمانوں کی حدود سے نکل جاؤ۔ ۲۴۴
ہم نے پیدا کیا تو پھر دوبارہ زندگی کی تصدیق کیوں نہیں کرتے۔ ۳۰۵
نطفہ کو زندگی تم دیتے ہو یا ہم؛ موت کو مقدر کردیا، ہم پر کوئی سبقت نہیں رکھتا۔ ۳۰۵
تمہاری جگہ تم جیسا ہی گروہ لائیں گے، تمہیں ایک اور جہان کی زندگی ملے گی۔ ۳۰۵
یہ جو کاشت کی ہے اسے تم اگاتے ہو یا ہم؛ ہم جب چاہیں اسے برباد کردیں۔ ۳۱۰ تا ۳۱۲
پانی پیتے ہو اسے ہم برساتے ہیں یا تم؛ ہم چاہیں تو اسے تلخ کردیں۔ ۳۱۳
آگ جو روشن کرتے ہو اس کا درخت ہم نے اگایا ہے یا تم نے؛ ربّ کی تسبیح کرو۔ ۳۱۳ تا ۳۱۷

ستاروں کے محلِ طلوع وغروب کی قسم! یہ یقیناً
بہت اہم قسم ہے۔ ۳۱۹
زمین وآسمان کو چھ ادوار میں بنایا، انتظام سنبھالا،
ہر دم تمہارے ساتھ ہیں۔ ۳۴۶
آسمان وزمین کی ملکیت اسی کے لیے ہے ۳۴۸
رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا
ہے، دلوں کا حال جانتا ہے۔ ۳۴۹
آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ کے لیے ہے ۳۵۲
جہاد اور نیکی کرنے والوں سے احسان کا وعدہ کیا ہے ۳۵۳
کیا وقت نہیں آیا کہ مومنین کے دل اللہ کے ذکر
سے خشوع حاصل کریں۔ ۳۶۸
تمہیں آنے والی ہر مصیبت لوحِ محفوظ میں ثبت
ہے۔ اللہ کسی متکبر کو دوست نہیں رکھتا، جو بخل
کرے تو اللہ بے نیاز و لائقِ حمد ہے۔ ۳۸۳
ہم نے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا، میزان
اتاری اور لوہے کو نازل فرمایا جس میں قوت
اور منافع ہیں۔ ۳۸۹
ایمان والو اللہ سے ڈرو کہ تمہیں بخش دے، وہ
غفور و رحیم ہے۔ ۴۰۴
ہم نے واضح آیات نازل فرمائی ہیں، کافروں کے
لیے عذاب ہے۔ ۴۲۱
جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ اسے جانتا
ہے۔ جب وہ سرگوشی کریں تو وہ ان میں موجود ہوتا
ہے۔ ۴۲۲
جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اللہ کی
تسبیح کرتے ہیں۔ وہ عزیز و حکیم ہے۔ ۴۶۲، ۵۴۹، ۵۸۳
اللہ اس سے منزہ ہے جسے یہ اس کا شریک
قرار دیتے ہیں۔ ۵۰۵
وہ خالق ہے، رحمان و رحیم و عزیز و حکیم ہے۔
سب موجودات اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ ۵۰۶
زمین و آسمان کی ہر شے اس کی تسبیح کرتی ہے
ملکیت و حکومت، حمد و ستائش اسی کے لیے
ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔ ۶۴۶
اللہ اس کے رسولؐ اور اس نور پر ایمان لے
آؤ جسے ہم نے نازل کیا۔ ۶۵۲

عدل

میں کبھی اپنے بندوں پر ظلم نہیں کروں گا ۵۲۶
بلاشک و شبہ اعمال کی جزا واقع ہو کر رہے گی ۵۵۵
ہم نے قومِ لوطؑ کے شہروں سے مومنین کو پہلے
ہی نکال لیا۔ مومن کو کافر کی سزا میں کیوں
گرفتار کرتے۔ ۵۹۲
قومِ لوطؑ کو اللہ نے اپنی عدالت کا کرشمہ دکھایا ۱۹۲
ہر چھوٹا بڑا کام لکھا جاتا ہے ۲۰۰
وزن کو عدل کی بنیاد پر قائم کرو۔ میزان کو کم نہ رکھو ۲۱۸، ۲۲۰
تم آج ہرگز اللہ کی عدالت، محکم اور صادر شدہ
سزاؤں سے نہیں بچ سکتے۔ ۲۴۵

مقامِ پروردگار سے عدالتِ الٰہی مراد ہے ۲۵۵
اصحابِ یمین وشمال اور سابقون کا انجام
عین عدالت ہے۔ ۳۳۴
العدل بعد الجوار سے زمین کا عدالت وانصاف
کے ذریعہ زندہ ہونا مراد ہے۔ ۳۷۲
میزان کو نازل کیا تاکہ لوگ عدالت کے ساتھ
قیام کریں۔ ۳۸۹
یہ دادگاہِ الٰہی کے بعض مواقف ہیں ۴۴۸
دشمنوں سے بھی عدالت ۔مسلمان اور کافر عورتوں
کے مہر ومصارف کا تبادلہ۔ ۵۲۷
فضلِ الٰہی بھی از روئے حساب ہے، احادیثِ
رسولؐ کی روشنی میں اللہ کے فضل کی عطا۔ ۵۸۹
تمام مصائب اسی کے فرمان سے ہیں۔ کوئی
مصیبت رونما نہیں ہوتی مگر اذنِ الٰہی سے۔
(بربنائے عمل) اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ ۶۵۷

نبوّت

یہ پیغمبرؐ پہلے ڈرانے والوں میں سے ایک
ڈرانے والا ہے۔ ۱۴۹
اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ، کیوں ایمان
نہیں لاتے، حالانکہ رسولؐ تمہیں دعوتِ ایمان
دیتا ہے، وہ اپنے بندہ محمدؐ پر آیاتِ بیّنات
نازل فرماتا ہے۔ ۳۵۲
ہم نے رسُولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا۔کون
اس کی اور اس کے رسُولوں کی مدد کرتا ہے؟ ۳۸۹
ہم نے متواتر نبی بھیجے، نوحؑ وابراہیمؑ کو بھیجا،
پھر اور نبی بھیجے، پھر مریمؑ کے بیٹے عیسٰیؑ کو بھیجا۔ ۳۹۶
اللہ وہ ہے جس نے امیّین میں رسُول بھیجا، جو
ان پر آیات کی تلاوت، ان کا تزکیۂ نفس کرتا
اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ ۵۸۳
یہ بعثتِ نبوی اللہ کا فضل ہے، جسے چاہے
دے، اللہ صاحبِ فضلِ عظیم ہے۔ ۵۸۴
یہ منافق تمہارے پاس آکر کہتے ہیں کہ تم اللہ
کے رسُول ہو۔ یہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔ ۶۱۷ تا ۶۲۳
اللہ، اس کے رسُولؐ اور اس نور پر ایمان
لے آؤ جسے ہم نے نازل فرمایا۔ ۶۵۲

امامت

بعض روایات میں میزان سے مراد وجودِ امام
لیا گیا ہے۔ ۲۲۰
نور سے مراد وہ امام معصوم ہے جس کی لوگ
اقتدار کرتے ہیں۔ ۴۰۶
امام جماعت کی طرح امام جمعہ کا عادل ہونا بھی
شرط ہے لیکن بعض عُلماء کے نزدیک نمازِ جمعہ
امامِ معصوم کے زمانۂ حضور سے مربوط ہے۔ ۶۱۱

ٹ

قیامت

تمہیں صرف تمہارے اعمال ہی کی جزا ملے گی ۳۶
جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں۔ ۱۱۵
اللہ ہی پر دوسرے عالم کا ایجاد کرنا واجب ہے ۱۳۹
قیامت نزدیک ہوگئی۔ اس کی شدت کو اللہ کے سوا کوئی برطرف نہیں کرسکتا، تعجب کرتے ہو، ہنستے ہو، روتے نہیں۔ ۱۴۹
قیامت کا ورود نئی زندگی کی ابتدا ہے ۱۵۷
وہ دن جس میں سب قبروں سے باہر نکلیں گے ۱۶۶
وحشت کی شدت سے ان کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں گی۔ ۱۶۷
قیامت کا دن بہت سخت کیوں ہے؟ ۱۶۸
مائیں اولاد کو بھول جائیں گی، حمل ساقط ہوجائیں گے ۱۶۹
قیامت ان کی وعدہ گاہ ہے، قیامت کا عذاب ہولناک ہے۔ ۱۹۵
اے جن و انس! ہم عنقریب تمہارا حساب کریں گے ۲۴۴
بغیر دھوئیں کی آگ اور تہ بہ تہ دھواں تم پر بھیجے گا ۲۴۶
آسمان پھٹ کر پگھلے ہوئے تیل کی طرح سرخ ہو جائے گا۔ ۲۴۷
ان ہولناک حوادث کو کوئی بھی برداشت نہ کرسکے گا۔ ۲۴۷
جب قیامت واقع ہوگی تو کوئی اس کا انکار نہ کرے گا، گروہ زیر و زبر ہوں گے، زمین لرزے گی، پہاڑ بکھر جائیں گے۔ ۲۷۸، ۲۷۹
تم تین گروہوں میں بٹ جاؤ گے ۲۷۹
وہ قیامت سے انکار پر اصرار کرتے تھے ۳۰۰
گمراہوں کو قیامت میں کھانے کو زقوم اور پینے کو کھولتا ہوا پانی ملے گا۔ ۳۰۲
ایک گروہ کو دوسرے کی جگہ لائیں گے، تمہیں دوسرے جہان کی زندگی بخشیں گے جسے تم نہیں جانتے۔ ۳۰۵ تا ۳۰۸
پانی برسنا، مُردہ زمینوں کا زندہ ہونا قیامت کی دلیل ہے۔ ۳۱۴
سبز درخت سے آگ پیدا کرنا بھی قیامت کی نشانی ہے۔ ۳۱۵
اللہ قیامت میں سب کو اٹھائے گا اور ان کے اعمال سے باخبر کرے گا۔ ۴۲۲
قیامت کے دن انسان کا اصل سرمایہ اس کے نیک اعمال ہوں گے۔ ۴۹۹
تم ہرگز موت (حیات بعد الموت) کی تمنا نہ کرو گے۔ موت جس سے تم بھاگتے ہو تمہیں آپکڑے گی اور تم اللہ کی طرف پلٹائے جاؤ گے، جہاں تمہارے افعال کی تمہیں خبر دی جائے گی۔ ۵۹۴، ۵۹۵
پروردگار کی قسم تم سب کے سب قیامت میں زندہ کرکے اٹھائے جاؤ گے۔ ۶۵۱

یہ اس وقت ہوگا جب وہ تمہیں اجتماع (تغابن) کے دن جمع کرے گا۔ ۶۵۲
یقیناً مرنے کے بعد ایک دن اٹھائے جائیں گے، غبون ظاہر ہوگا۔ ۶۵۲ تا ۶۵۶

جنّت

مومن پرہیزگار جنّت کے باغوں میں ہوں گے، نعمات سے بہرہ ور اور خوش ہوں گے۔ ان کی اولاد کو جنّت میں ان سے ملحق کر دیں گے۔ ۴۱ تا ۴۶
پرہیزگار جنّت کے باغوں میں ہیں ۲۰۰
جو اپنے پروردگار سے ڈرے اس کے لیے جنّت میں دو باغ ہیں۔ ۲۵۴
اہلِ جنّت بہشت کی نعمات میں ۲۸۶
تمہارے گناہ بخش دے گا، جنّت میں داخل کرے گا۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔ ۶۵۲ تا ۶۵۵

جہنّم

جس دن جہنّم کی آگ میں گرائے جائیں گے۔ اب آتشِ جہنّم کا مزہ چکھو۔ ۱۹۹
جو لوگ کافر ہوگئے، ہماری آیات کی تکذیب کی وہ دوزخ والے ہیں۔ ۶۵۲

فرشتے

جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے ہیں۔ ۱۱۵

معجزہ

چاند شق ہوگیا ۱۵۷، ۱۶۰
ناقۂ صالح ایک معجزہ کے طور پر ۱۸۶
قرآنی پیش گوئیوں کا پورا ہونا بھی معجزہ ہے ۱۹۸

احکام

سجدہ

سب اس کے لیے سجدہ کرو ۱۵۰، ۱۵۳

تسبیح

پس اپنے پروردگار کی تسبیح کر ۳۱۳
اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کر اور اسے پاک شمار کر۔ ۳۳۱

قرضِ حسنہ

کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے تاکہ اللہ اس کے اجر میں اضافہ فرمائے۔

مغفرت

اللہ کی مغفرت اور جنت تک پہنچنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرو۔ ۳۸۳

جہاد

سورہ صف اولاً اسلام کی برتری، پھر اسلام کی حفاظت اور ترقی کے لیے لزومِ جہاد کو بیان کرتی ہے۔ ۵۴۷

اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت (جہاد) کی طرف رہبری نہ کروں جو تمہیں عذاب سے نجات دے۔ ۵۷۱

حواریوں کی طرح ہو جاؤ، اپنے رسُول کی نصرت میں جہاد کرو، تم غالب ہو جاؤ گے۔ ۵۶۷، ۵۷۷

اخلاقیات

(اخلاقِ حسنہ)

نیک عمل

اس جہان میں کوئی چیز ختم نہیں ہوتی، ہر نیکی و بُرائی باقی رہتی ہے۔ ۱۵۹

انفاق فی سبیل اللہ

کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے تاکہ وہ اسے بڑھا کر واپس کرے۔ ۳۵۷

مَیں فضائل اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔ (رسولؐ پاک)

ایک گروہ تو ایمان لایا ۴۰۷

حزب اللہ، اطاعت خدا و رسُولؐ، فلاح و رستگاری، غلبہ و کامیابی۔ ۴۵۵

چراغ گُل کر کے مہمان کو کھانا کھلایا، خود اور بچے بھوکے رہے۔ ۴۸۳

پانی ملا تو زخمی مجاہدین نے پیاس کی حالت میں رہنے پر دوسروں کو ترجیح دی اور جان جانِ آفریں کے سُپرد کر دی۔ ۴۸۳

عزت اللہ، اس کے رسُولؐ اور مومنین کے لیے ہے۔ رسُولؐ، مومنین اور اللہ کے دوست اللہ ہی کے پرتو کے حامل ہیں۔ ۶۳۴

علامہ شوستری کا واقعہ ۶۳۹، ۶۴۰

اخلاقِ رذیلہ

منافقوں کی پیش رو تاریکی ہوگی ۳۶۴

منافقین و ضالّین کی گمراہی اور کیفیات ۳۶۵

جنہوں نے آیاتِ الٰہی کو سُنا مگر دل قساوت پر مائل رہے۔ ۳۷۲ تا ۳۷۴

جو کافر ہو گئے وہ اصحابِ جحیم ہیں ۳۷۵

مگر اکثر فاسقین سے تھے ۳۹۶
نفاق، حق سے دشمنی، یادِ خدا کی فراموشی
جھوٹ اور فریب۔ ۴۵۵
مغضوب علیہ قوم سے دوستی نہ کرو، جن پر اللہ
کا غضب نازل ہوا ان میں کفار و مشرکین کے
علاوہ منافق بھی شامل ہیں۔ ۵۴۴، ۵۴۵
منافق بے اخلاص اور ٹوٹنے والا ہے، اکڑ کر
کھڑا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ ٹوٹ کر بے بس
ہو جاتا ہے۔ ۶۳۴

اقوامِ سابقہ

ثمود

قومِ ثمود کو بھی ہلاک کیا۔ ان میں کسی کو نہیں چھوڑا ۱۴۵
قومِ ثمود خوفِ خدا سے نہیں ڈری ۱۸۳
ثمود کا دردناک انجام، ایک چیخ سے ہلاکت ۱۸۴ تا ۱۸۷

عاد

کیا تمہیں پتہ نہیں کہ اللہ نے قومِ عاد کو ہلاک کر دیا؟ ۱۴۵
قومِ عاد نے ہودؑ پیغمبر کی تکذیب کی، سرد و تیز
وحشت ناک آندھی سے معذب ہوئی۔ ۱۷۶ تا ۱۷۸

فرعون

آلِ فرعون کے لیے تخویف و تنبیہ آئی ۱۹۴

لُوطؑ

قومِ لُوطؑ کے زیر و زبر شدہ شہروں کو زمین پر
دے مارا۔ ۱۴۵
لُوطؑ کی قوم نے انذار کو جھٹلایا۔ ہم نے ایسی
آندھی کے ذریعہ جو پتھروں کو اڑاتی تھی انہیں
تباہ کر دیا۔ ۱۸۹

نوحؑ

ہم نے قومِ نوحؑ کو ہلاک کیا کیونکہ وہ سب
ظالم تھے۔ ۱۴۵

شخصیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام

کیا تم ابراہیمؑ کی کُتب سے باخبر نہیں ہوئے
جس نے اپنی ذمہ داریاں پوری کیں؟ ۱۲۸
تمہارے لیے ابراہیمؑ اور اُن کے ساتھیوں
کی زندگی میں اچھا نمونہ ہے۔ ۵۱۸
بیشک ابراہیمؑ مہربان اور بُردبار تھا۔ ۵۲۱

ابن الکواء

نام عبداللہ، جناب امیرؑ کا دشمن، بظاہر دوست
جناب امیرؑ سے 'ذاریات' کے معنی دریافت کیے ۸۸

حضرت ابوبکرؓ

مفسرین کی ایک جماعت نے انفاق کرنے والے کا مصداق حضرت ابوبکرؓ کو سمجھا ہے۔ ۳۵۶

ابوذرؓ غفاری

جنتی بیوی شوہر سے کہے گی میں نے تجھ سے بہتر کوئی چیز نہیں پائی۔ ۲۶۰

ابوذرؓ کی زیادہ تر عبادت غور و فکر کرنا اور عبرت حاصل کرنا تھی۔ (امام جعفر صادقؑ) ۴۶۶

ابوسعیدؓ خدری

ہوسکتا ہے ایک قوم تمہارے بعد آئے جو تمہیں چھوٹا تصور کرے۔ (حدیث) ۳۵۹

اے فاطمہؑ! فدک تیری ملکیت ہے (حدیث) ۳۷۹

حضرت ابوطالبؑ

اپنے اشعار میں آنحضرتؐ کا اسم گرامی 'احمد' نظم کیا ہے۔ ۵۶۳

ابنِ حزم

قرآنِ پاک کو پاکیزہ افراد کے سوا کوئی نہ چھوئے۔ (حدیث) ۳۲۴

ابنِ عمرؓ

قرآنِ پاک کو پاکیزہ افراد کے سوا کوئی نہ چھوئے۔ (حدیث) ۳۲۴

ابنِ ماسویہ

مامون الرشید کا طبیبِ خاص ۳۲۸

اسعدؓ بن زرارہ

ہجرت سے قبل مدینہ میں نماز جمعہ کی بحکم رسولؐ اقتدار کی۔ ۶۰۴

اسیدؓ انصاری

عبداللہ ابن ابی سے مکالمہ میں زیدؓ بن ارقم کی مدد کیا کرتے تھے۔ ۶۲۶، ۶۲۷

اُمِ حبیبہؓ (اُم المومنین)

مسلمان ہوکر اپنے شوہر عبیداللہ کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ عبیداللہ کے عیسائی ہو جانے پر رسولِ پاکؐ سے عقد ہوا۔ ۵۲۸

اوس بن صامت

اپنی زوجہ خولہ سے ظہار کیا ۴۱۴

بختیشوع

ماموں رشید کا طبیب ۳۲۸

براءؓ بن عاذب

اللہ کو اسم اعظم سے پکارو، سورۂ حدید کی آیات پڑھو۔ (جناب امیرؑ) ۳۵۰

میں نے حسنؑ بن علیؑ کو پیغمبرؐ کے دوش پر دیکھا جبکہ آپؐ فرما رہے تھے خدایا میں اُسے دوست رکھتا ہوں تو بھی اُسے دوست رکھ۔ ۶۶۶

برصیصا

بنی اسرائیل کا ایک عابد جو شیطان کے بہکانے سے کافر ہوگیا۔ ۴۹۵

جعفرؑ بن ابی طالبؑ

آنحضرتؐ کے حکم سے ستر آدمیوں کے ساتھ تبلیغ کے لیے حبشہ گئے۔ ۴۰۵

مہاجرینِ حبشہ کے قائد حضرت علیؑ کے بھائی ۵۲۸

حضرت امام جعفر صادقؑ

آنحضرتؐ نے فرمایا کہ معراج میں سدرہ کے ہر پتّہ کے سایہ میں ایک اُمّت قرار پائی ہے۔ ۹۳

وہ گناہ جو انسان کر بیٹھتا ہے، پھر ایک مدّت رُکا رہتا ہے، پھر آلودہ ہوتا، مگر یہ اس کا معمول نہیں۔ ۱۲۲

لمم یہ ہے کہ انسان سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے پھر اس سے استغفار کرے۔ ۱۲۲

لمم کو انجام دینے والا وہ بندہ ہے جس سے کبھی کبھار گناہ سرزد ہوجاتا ہے، لیکن یہ اس کی عادت نہیں ہے۔ ۱۲۳

بعض اوقات کچھ ضرورتوں کے پیشِ نظر اپنے فضائل بیان کرنا ضروری ہوجاتے ہیں۔ ۲۲۷

جس وقت گفتگو اللہ تک پہنچ جائے تو چپ ہوجاؤ۔ ۱۳۸

سقر جہنّم کا ایک درّہ متکبّر لوگوں کے لیے ہے ۲۰۱

"تکذّبان" کے بعد لا بشیٔ...... کہنے والا دن کو مرے یا رات کو، شہید کا درجہ پائے گا۔ ۲۱۱

رحمٰن اسم خاص ہے، عمومی صفت رکھتا ہے۔ اس کی رحمت سب کے شامل حال ہے۔ ۲۱۳

البیان وہی اسم اعظم ہے جس سے تمام چیزوں کا علم حاصل ہوتا ہے۔ ۲۱۷

علیؑ و فاطمہؑ دو عمیق سمندر ہیں۔ حسنؑ و حسینؑ لؤلؤ مرجان ہیں۔ ۲۳۵

اللہ قیامت میں تمام بندوں کو ایک ہی مقام پر جمع فرمائے گا، آسمانِ اوّل کے فرشتوں کو نزول کا حکم دے گا، وغیرہ۔ ۲۴۶

جو اللہ کو حاضر ناظر جانتا ہے وہ خائف رہتا ہے، ہوائے نفس سے باز رہتا ہے۔ ۲۵۵
نیکی کا جواب نیکی سے دینا چاہیے۔ (طویل حدیث) ۲۶۱
نیکی کے بدلہ میں اس سے بہتر اور بالاتر نیکی کرنا چاہیے۔ ۲۶۲
اللہ فرماتا ہے، دو جنتیں ہیں، جنتوں کے دو درجے ہیں۔ ۲۶۴، ۲۶۵
اپنے بچوں کو انار کھلاؤ، جلدی جوان ہوں گے ۲۶۷
جو شبِ جمعہ سورہ واقعہ پڑھے، اللہ اسے دوست رکھے گا، مفلسی و آفات سے محفوظ رہے گا۔ امیر المومنینؑ کے رفقا میں شمار ہوگا۔ ۲۷۶
ایک جماعت سے فرمایا کہ تم پہلے سابقون اور آخری سابقون ہو، ہماری ولایت اور جنّت کی طرف سبقت کرنے والے ہو۔ ۲۸۴
اگر مقربین میں سے ہے تو اس کے لیے قبر میں روح و ریحان اور آخرت میں پُرنعمت بہشت ہے۔ ۳۳۲
اللہ نے کسی احتیاج کی بنا پر سوال نہیں کیا۔ اللہ کے حقوق اس کے نمائندہ اور ولی کے لیے ہیں۔ ۳۶۰
العدل بعد الجوار سے مراد زمین کا عدالت و انصاف کے ذریعہ زندہ ہونا ہے۔ ۳۷۱
مومن شہید ہے۔ والّذین امنوا..... والشھداء ۳۷۷ تا ۳۷۸
سُورہ مجادلہ پڑھنے والا قیامت میں حزب اللہ میں شمار ہوگا۔ ۴۱۰، ۴۱۱
بصورتِ استطاعت ظہار کا کفارہ اٹھارہ دن کے روزے کافی ہیں۔ ۴۲۰
ہر چیز اس پر واضح و آشکار ہے۔ ۴۲۶
جب تک اپنی جان، والدین، اولاد سے زیادہ اللہ کی محبت نہ ہو ایمان کامل نہیں ہوتا۔ ۴۴۶
ہر مومن کے دو کان ہیں۔ ایک میں وسواس خنّاس پھونک مارتا ہے اور دوسرے میں ملک۔ اللہ مومن کو فرشتے کے ذریعہ تقویت دیتا ہے۔ ۴۵۷
جو شخص سُورۂ رحمٰن و حشر کو غروبِ آفتاب کے وقت پڑھے ایک فرشتہ ننگی تلوار لے کر اس کے گھر کی حفاظت کرے گا۔ ۴۶۰
ابوذرؓ کی زیادہ تر عبادت غور و فکر کرنا اور عبرت حاصل کرنا تھی۔ ۴۶۶
شحیح وہ ہے جو اپنے مال کے علاوہ دوسرے کے مال کا بھی بخیل ہے۔ ۴۸۴
لوگوں کو اپنے عمل کے ذریعہ دعوت دو نہ کہ زبان کے ذریعہ۔ ۵۲۵
جو شخص اللہ کے لیے دوستی، دشمنی اور عطاو بخشش کرتا ہے اس کا ایمان کامل ہے۔ ۵۲۶
مومن کا اپنے بھائی سے وعدہ کرنا ایک نذر ہے جو وعدہ کی خلاف ورزی کرے گا اس نے اللہ کی مخالفت کی۔ ۵۵۲

عالم وہ ہے جس کا عمل اس کے قول کی تصدیق کرے ۵۵۵
ہر مومن شب جمعہ میں سُورۂ جمعہ و اعلیٰ اور بروز جمعہ ظہر میں سُورۂ جمعہ و منافقون پڑھے، یہ عملِ رسُولؐ ہے ۶۱۵
مناسب نہیں کہ مومن اپنے آپ کو ذلیل کرے ۶۳۵
سُورۂ تغابن قیامت میں پڑھنے والے کی شفیع ہوگی ۶۴۴
جس نے زکوٰۃ ادا کردی اس نے بخل و حرص سے نجات پالی۔ ۶۶۷
خداوندا! مجھے حرص و بخل سے بچا ۶۶۸

حاطب ابنِ ابی بلتعہ

جس نے سارہ مغنیہ کے ہاتھ خط روانہ کرکے مشرکینِ مکّہ کو مسلمانوں کے راز بھیجے۔ ۵۱۳، ۵۱۴

حبیب نجّار

حبیب نجّار کا شمار سابقون الاوّلون میں ہے ۲۸۲

حسانؓ بن ثابت

حسانؓ کے اشعار میں آپؐ کا اسم مبارک 'احمدؐ' مذکور ہے۔ ۵۶۳، ۵۶۴

حضرت امام حسنؑ (امام دوم)

حمد ہے اللہ کی جس کی ابتداء و انتہا معلوم نہیں، نہ اس کے ظاہر و باطن کا ادراک ممکن ہے۔ ۳۴۳

حضرت امام حسن عسکریؑ (امام یازدہم)

سعد و نحس ایام پر آپؑ کے ارشادات ۱۸۰، ۱۸۱

حضرت امام حسینؑ (امام سوم)

اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کی ہر روز نئی شان اور نیا کام ہے۔ ۲۴۱
تم بہت بُرے لوگ ہو، اطاعتِ خدا و رسُولؐ کا دعویٰ کرتے ہو اور اب آئے ہو کہ اولادِ پیغمبرؐ کو قتل کرو۔ ۴۴۸

خولہ

اوس بن صامت کی زوجہ، شوہر کے ظہار کرنے کی رسُولِ پاکؐ سے شکایت کی۔ ۴۱۴

حضرت داوٗد علیہ السّلام

اللہ نے زرہیں بنانے کے لیے لوہے کو آپؑ کے لیے نرم کردیا۔ ۳۹۱، ۳۹۲

زعلب یمانی

آیت "قاب قوسین" کے جناب امیرؑ سے معنی دریافت کیے ۸۸

زیدؓ بن ارقم

زیدؓ بن ارقم انصاری کا عبداللہ ابن ابی سے مکالمہ ۶۲۶، ۶۲۷

سارہ (مغنیہ)

مکّی مغنیہ آنحضرتؐ کے پاس مالی امداد مانگنے آئی۔
حاطب بن بلتعہ کا ایک خط مشرکینِ مکّہ کے نام
لے گئی۔ ۵۱۳، ۵۱۴

سبیعہ

مسلمان ہوکر حدیبیہ ہی میں مسلمانوں سے آن ملی،
اس کے شوہر نے آنحضرتؐ سے اس کی واپسی
کا مطالبہ کیا۔ ۵۳۲

سعیدؒ بن جبیر

حجاج کے حکم سے آپ کے قتل پر ایک شخص
کا رونا اور آپ کا آیت "ما اصاب من
مصیبة ...... کا تلاوت فرمانا۔ ۳۸۶

سلمانؓ فارسی

آپؓ نے منافقین سے فرمایا کہ قرآن احسن القصص ہے ۳۶۹
یا علیؑ! آنحضرتؐ نے میری پشت پر ہاتھ رکھ کر فرمایا
کہ علیؑ اور اس کی جماعت کامیاب ہیں۔ ۴۵۵

سلیمانؓ بن صرد

کوفہ کے شیعوں کا سرگروہ جس کے یہاں جمع ہوکر
شیعہ مشورہ کرتے تھے۔ ۶۰۷

شیطانؑ

انسان سے کہا کافر ہوجا۔ جب ہوگیا تو کہا
مَیں تجھ سے بیزار ہوں، پس دونوں جہنّم کی
آگ میں ہیں۔ ۴۹۳

حضرت صالحؑ

قومِ ثمود کو تبلیغ کی۔ ثمود کا عبرت ناک انجام ۱۸۴ تا ۱۸۶

حضرت عائشہ رضؓ (اُم المومنین)

یہودیوں کا آنحضرتؐ کو السام علیک کہنا، آپؓ
کا ناراض ہونا۔ حضورؐ کا تلقین صبر کرنا۔ ۴۲۸

عبداللہ ابن اُبی

منافقین کا سرغنہ، نہایت وجیہہ و لحیم و شحیم ۶۲۲

عبداللہ ابنِ جحش

اسلام لانے کے بعد جنگِ اُحد میں شہادت پائی ۵۲۸

❊

عبداللہ ابنِ سعد

حضرت عثمانؓ کا ایک رشتہ دار، ان سے اُونٹ لے کر ان کے گناہ اپنے سر لینے کا اقرار کیا اور اس پر گواہی کرائی۔ ۱۲۹

عبداللہؓ ابنِ عباسؓ

اللہ نیک اولاد کو جنّت میں مومن والدین سے ملحق کردے گا۔ (رسولِ پاکؐ) ۴۴
علیؑ اور ان کے پیروکار مقربین بارگاہ ہیں ۲۸۳
آنحضرتؐ نے پیاس کی حالت میں دُعا کی اور پانی برسا ۳۲۳
حدیثِ نجویٰ بیان کی۔ ۳۴۲
آنحضرتؐ نے 'وات ذی القربیٰ.....' کے نزول پر فدک کی جاگیر جنابِ فاطمہؑ کو دے دی۔ ۳۷۹
بنی نظیر پر کامیابی کے بعد آنحضرتؐ نے انصار سے فرمایا کہ اپنے گھروں کو مہاجرین پر تقسیم کردو تو بنی نظیر کے مال سے حصّہ لے لو۔ ۴۸۲

عبداللہ زنجانی

عبداللہ نے تاریخ القرآن میں ابن ندیم سے نقل کیا ہے کہ 'تغابن' تیسواں ۳۰ مدنی سُورہ ہے۔

عبداللہؓ ابنِ عمرؓ

آیتِ نجویٰ کے مطابق صدقہ دینے کا عمل حضرت علیؑ نے انجام دیا۔ ۳۴۲

عبداللہؓ ابنِ مسعود

آپؓ نے 'علم القران' تلاوت کیا تو قریش نے آپؓ کو تھپڑ مارے۔ یہ پہلے شخص تھے جس نے کفارِ قریش کے سامنے قرآن پڑھا۔ ۲۷۳
رہبانیت کے بارے میں حدیثِ رسولؐ بیان کی ۴۰۱

عبدالرحمٰن بن کعب

ایک محدّث نے ان سے نقل کیا ہے کہ میرا باپ جب اذانِ جمعہ سُنتا تو اسعد بن زرارہ کے لیے دُعائے رحمت کرتا۔ ۶۰۵

عبیداللہ ابنِ جحش

اُم حبیبہؓ بنت ابوسفیان کا شوہر جس نے مسلمان ہو کر حبشہ کی طرف ہجرت کی، مگر وہاں جا کر عیسائی ہوگیا۔ ۵۲۸

عثمانؓ ابن عفان

ان کے پاس بہت دولت تھی، انفاق کرتے تھے۔ عبداللہ بن سعد نے کہا کہ دولت ختم ہوجائے گی۔ سواری کا اونٹ مع سامان مجھے دے دو میں گناہ اپنے ذمّہ لیتا ہوں۔ ۱۲۹

حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ (امام اول)

• عقیلؓ سے کہا مجھے اس آگ کی طرف کھینچتے ہو جسے اللہ نے اپنے غضب سے بھڑکایا۔ ۳۳
ہوائے نفس کی پیروی انسان کو راہِ حق سے روک دیتی ہے۔ ۸۰، ۸۱
مَیں نے اللہ کو مصمم ارادوں میں ناکام رہنے اور ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا۔ ۱۱۲
اللہ نے خودستائی سے منع کیا ہے ورنہ وہ فضائل بیان کرتا جن سے مومنین کے دل ناآشنا ہیں۔ ۱۲۶
اے اہلِ بصرہ! زیروزبر شدہ زمین کے رہنے والو! اے عورت کے لشکر، اے اونٹ کی پیروی کرنے والو۔ ۱۴۷
دومشرقوں اور دومغربوں پر آپ کی حدیث ۲۲۷، ۲۲۸
حمدوستائش اس اللہ کی جو نہیں مرتا، ہر روز نئی شان، نیا موضوع ہے۔ ۲۳۹
امیرالمومنین کا سابقون الاولون میں شمار ہے ۲۸۲
"ام نحن الخالقون" کی تلاوت پر فرمایا 'بل انت یارب' تا آخر۔ ۲۱۷، ۲۱۸
محتضر کا عمل مجسّم ہو کر سامنے آئے گا۔ (طویل حدیث) ۲۲۳، ۲۳۵
وہ اپنے تسلّط و عظمت کی بنا پر غلبہ رکھتا ہے، اپنے علم و معرفت کی وجہ سے اس کے باطن میں راہ رکھتا ہے۔ ۳۴۲
اس کی اوّلیت کی ابتدا اور بقا کی انتہا نہیں ۳۴۳
سورۂ حدید و حشر کی آخری آیات کی تلاوت و ثواب پر طویل حدیث۔ ۳۵۰
کسی کام میں جلدی نہ کرو، پشیمان ہو گے، حق سے فاصلہ کی بنا پر قساوتِ قلبی ہو گی۔ ۳۷۰
جو اپنے بستر پر مرے، پیغمبرؐ و اہلِ بیتؑ کی معرفت رکھتا ہو، وہ شہید مرا۔ ۳۸۰
جو چیز ہاتھ سے جاتی رہے اس پر غم نہ کرنا، جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس پر فخر نہ کرنا۔ ۳۸۷
لوہے کو نازل کرنے سے مراد اسے پیدا کرنا ہے، منافع سے ہر قسم کا نفع مراد ہے جو لوہے سے ہوتا ہے۔ ۳۹۱
کسی چیز کی اصلاح بھی جہاد کے بغیر ممکن نہیں ۳۹۲
جن کی کوششیں زندگی میں گُم ہو گئیں وہ سمجھتے ہیں کہ اچھا کام کر رہے ہیں، وہی گھاٹے میں ہیں۔ ۴۰۲
راہب جو پہاڑوں، بیابانوں میں خود کو قید کیے ہوئے ہیں وہ اسے اچھا سمجھتے ہیں۔ ۴۰۳
جہاں ہوائے نفس ہو وہاں دین نہیں ہوتا۔ ۴۰۸
اللہ کے اُمنا ساری مخلوق پر تسلّط رکھتے ہیں ۴۲۵
اللہ ہم پر احاطہ کیے ہوئے ہے ۴۲۵، ۴۲۶
جو زمانۂ طالب علمی میں مرجائے اس کے اور انبیاء کے درمیان ایک درجہ کا فاصلہ ہے۔ ۴۳۶

تیری نیازمندی و حاجت مندی گفتگو کی نرمی اور حُسنِ سلوک سے ظاہر ہو۔ ۴۳۷

آیتِ نجویٰ پر نہ مجھ سے پہلے نہ میرے بعد کسی نے عمل کیا۔ ۴۴۱

فتنوں کے وقوع باطل آراء ہیں جن کی پیروی کی جاتی ہے۔ ۴۴۸

سعادت مند وہی ہے جو دوسروں سے عبرت حاصل کرے۔ ۴۶۷

مالک اُشتر کے بارے میں اہالیانِ مصر کے نام مکتوب کی عبارت۔ ۵۴۳

تم لوگوں سے وعدہ کرو اور پھر وعدہ سے تخلف کرو، اس سے پرہیز کرو کہ یہ موجبِ غضبِ خدا ہے ۵۵۲

اپنی صفوں کو آہنی دیوار کی طرح مستحکم کرلو، دانتوں کو مضبوطی کے ساتھ بھینچ کر رکھو (صفین کے مجاہدوں سے) ۵۵۳

(اہلِ عراق سے) محفل میں ڈینگیں مارتے ہو اور میدانِ جنگ میں ہائے وائے کرتے ہو۔ ۵۵۵

مَیں تو اللہ کے لیے احمدؐ کی نصرت میں کوشش کرتا ہوں۔ ۵۶۴

جو لوگ بیدار و آگاہ ہیں دُنیا ان کے لیے بہت بڑا سرمایہ ہے۔ دُنیا دوستانِ خدا کی تجارت گاہ ہے ۵۷۵

وہ اللہ کی نعمتوں میں غرق ہیں اور خوش و خرم زندگی میں شادمان ہیں۔ ۵۸۹

خدا کی قسم! ابوطالبؑ کا بیٹا موت سے اس سے زیادہ مانوس ہے جتنا بچہ ماں کے پستان سے ہوتا ہے۔ ۵۹۵

علم عمل کے ساتھ توام ہے، بے عمل سے علم چلا جاتا ہے۔ عالم بے عمل پر حجت بہت بھاری ہے، اس کے لیے دائمی حسرت ہے۔ (دو احادیث) ۵۹۶

جو کچھ دل میں ہے اس سے بڑھ کر خشوع و خضوع کرنا ہمارے نزدیک نفاق ہے۔ ۶۴۱

کوئی اللہ سے یہ نہ کہے کہ مَیں تجھ سے امتحان و آزمائش سے پناہ چاہتا ہوں۔ اولاد و ازواج ذریعہ آزمائش ہیں۔ ۶۶۵

حضرت امام علی بن الحسینؑ (امام چہارم)

قیامت خافضہ ہے۔ خدا کی قسم وہ دشمنانِ خدا کو جہنّم میں گرا دے گی اور اولیاء اللہ کو بہشت میں لے جائے گی۔ ۲۸۰، ۲۸۱

دربارِ یزیدؒ میں فرمایا، ہمارے لیے تو "ما اصاب من مصیبة"۔۔۔۔ کی آیت اُتری ہے۔ ۳۸۵

جو سورۂ ممتحنہ کو واجب و مستحب نمازوں میں پڑھے گا، اللہ اس کے دل کو ایمان کے لیے خالص اور آمادہ کرے گا، نورِ بصیرت عطا ہوگا، فقر و فاقہ دُور ہوگا، وہ اور اس کی اولاد جنون میں گرفتار نہ ہوگی۔ ۵۱۱

خداوندا! یہ مقام (نمازِ جمعہ اور عید قربان) تیرے
خلفاء و برگزیدہ ہستیوں کے لیے مخصوص تھا۔
بنی اُمیّہ نے زبردستی اولیائے حق سے لے لیا۔ ۶۰۸
منافق نہی عن المنکر اور امر بالمعروف کرتا ہے لیکن
دونوں کے خلاف عمل کرتا ہے۔ ۶۴۱

حضرت امام علیؑ ابن موسیٰؑ رضا (امام ہشتم)

'الرحمٰن علّم القرآن' پر آپؑ کی حدیث ۲۱۷
میزان سے مراد وجودِ امام ہے ۲۲۰
قرآن کو طہارت کے بغیر مَس نہ کرو ۳۲۴
مسلمانوں کے امیر کو جمعہ کا خطبہ موقع فراہم کرتا ہے
کہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرے۔ ۶۱۱

حضرت عیسیٰؑ ابنِ مریمؑ

وہ باتیں نہ کرو جو اللہ کے ذکر سے خالی ہوں ۳۷۰، ۳۷۱
میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا ہوں، تورات
کی تصدیق کرتا ہوں اور اپنے بعد آنے والے
رسول 'احمدؐ' کی بشارت دیتا ہوں۔ ۵۵۷

حضرت فاطمۃ الزہراؑ

رسولِ پاکؐ کا عطیہ جائیدادِ فدک، خلافتِ اوّل
میں بجبر آپؑ سے واپس لے لی گئی۔ ۴۷۷، ۴۷۸

فضیلؒ بن عیاض

ابتداء میں رہزن تھے۔ 'تخشع قلوبھم' کی
آیت سُن کر توجہ کی اور ایمان والوں میں داخل
ہوگئے۔ (امام جعفر صادقؑ کے موثق راوی) ۴۷۰، ۴۷۱

قتیبہ بن سعید

اپنے اونٹوں کے مالک کا صبر و ضبط (تمام اونٹ
مرجانے پر) بیان کیا۔ ۳۸۸

قدار بن سالف

قومِ ثمود کا فرد جس نے ناقہ صالحؑ کی کونچیں
کاٹ دیں۔ ۱۸۷

مامون الرشید عباسی خلیفہ

مامون کی جانکنی کا واقعہ ۳۲۸

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سورۂ طور کی تلاوت کرنے والے کو اللہ عذاب
سے مامون فرمائے گا۔ ۲۸، ۲۹
مومن جنت میں اولاد کے لیے اللہ سے درخواست
کرے گا، نیک اولاد اس سے ملحق کردی جائیگی۔ ۴۴، ۴۵

جنّت میں مخدوم کی خادم پر برتری ایسی ہوگی جیسی
بدرِ کامل کی ستاروں پر۔ ۴۹

یہ وہ کلمات ہیں جن کی اللہ نے مجھے تعلیم دی ہے
یہ اس چیز کا کفارہ ہے جو مجلس میں واقع ہوتی ہے۔ ۷۲

ہوائے نفس کی پیروی انسان کو راہِ حق سے روک
دیتی ہے۔ ۸۰،۸۱

مَیں نے دروازہ کھولا نہ بند کیا۔ یہ عمل مطابق وحیٔ
الٰہی تھا۔ ۸۲

مَیں جب معراج پر گیا تو پروردگار کی ساحتِ
قدس سے بقدر دو کمان یا اس سے بھی کم پر
پہنچ گیا۔ ۸۷

مَیں نے سدرہ کے ہر پتّے پر ایک فرشتہ کو کھڑا
دیکھا جو اللہ کی تسبیح و عبادت میں مصروف تھا۔ ۹۳

آنحضرتؐ کے اللہ کے سوال وجواب (حدیثِ
قدسی کے اقتباسات) ۹۹ تا ۱۰۳

جس کی تمنا رضائے خدا کا موجب ہو وہ نہ مرے گا
جب تک تمنا پوری نہ ہو جائے۔ ۱۰۴

خداوندا! دُنیا کو ہمارے لیے سب سے بڑی
فکری مشغولیت اور ہمارے علم و آگہی کی انتہا
قرار نہ دے۔ ۱۱۸

ابوذرؓ کا سوال: مولا! کتنے پیغمبر آئے، رسولِ پاکؐ
کے جوابات۔ ۱۲۵

اللہ آسمان کو بارش کے ذریعہ رلاتا اور زمین کو
نباتات کے ذریعہ ہنساتا ہے۔ ۱۳۸

اگر تم اس چیز کو جانتے جسے مَیں جانتا ہوں تو
تم روتے زیادہ اور ہنستے کم۔ ۱۴۳

النهر الفضاء واسعة ليس بنهر جار
(حدیث) ۲۰۲

میری اُمت کے دو گروہ 'جبری'، 'قدری'، کا
اسلام میں کوئی حصّہ نہیں۔ ۲۰۵

جس نے سُورۂ رحمٰن کی تلاوت کی، اللہ اس پر
رحم فرمائے گا۔ ۲۱۱

اللہ گناہوں کو بخشتا اور رنج و تکلیف کو برطرف
کرتا ہے۔ ایک گروہ کو بلندی اور ایک کو پستی
عطا فرماتا ہے۔ ۲۲۹

دو جنّتیں، ایک تمام چاندی اور دوسری سونے
کی بنی ہوئی ہے۔ ۲۶۴

ذوالجلال والاکرام کے واسطے سے دعا پر دو
حدیثیں، قبولیتِ دُعا۔ ۲۷۲

سُورۂ 'واقعہ' کا قاری غافلین میں نہیں، مجھے
سُورۂ ہود، واقعہ، مرسلات اور عمّ نے بوڑھا
کردیا ہے۔ ۲۷۶

ہر شب سُورہ 'واقعہ' کا قاری مفلس نہ ہوگا
(عبداللہ ابنِ مسعودؓ) ۲۷۷

'سابقون الاوّلون' پر طویل حدیث ۲۸۲، ۲۸۳

'سدر مخضود' اس بیری سے کانٹے
ختم کرکے عمدہ پھل لگا دیے۔ ۲۹۳

جو بچہ شوہر دار عورت سے پیدا ہو، وہی اس
گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ۲۹۴، ۲۹۵
جو دُنیا کو دیکھتا ہے اور آخرت پر ایمان رکھتا
ہے اور جو آخرت پر ایمان رکھتا ہے مگر اس
کی تمام توجہ دُنیا داری پر ہے، دونوں کا
معاملہ عجیب ہے۔ ۳۰۹
کوئی نہ کہے میں نے زراعت کی، زراع حقیقی
اللہ ہے۔ ۳۱۱
حمد اس اللہ کی جس نے میٹھے پانی سے سیراب
کیا اسے کڑوا نہ کیا۔ ۳۱۵
یہ آگ جو جلاتے ہیں جہنم کی آگ کے ستر
اجزاء میں سے ایک جزو ہے۔ ۳۱۶
تمہارے پاس جو فالتو پانی ہو اسے بندگانِ
خدا کو استعمال کرنے سے نہ روکو۔ ۳۱۸
آنحضرتؐ کو پیاس لگی، دُعا فرمائی، بارش ہوئی۔
کسی نے کہا ستارے کی برکت سے ہوئی۔ ۳۲۳
پاکیزہ افراد کے سوا قرآن کو کوئی مس نہ کرے،
قرآن پوشیدہ کتاب میں ہے۔ ۳۲۴
سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلیٰ کا ذکر
رکوع و سجود میں۔ ۳۲۴
سُورۂ حدید کا قاری مومن ہے۔ حدید، صف،
جمعہ، تغابن کی فضیلت۔ ۳۳۹
تُو ایسا اوّل ہے کہ اس سے پہلے کوئی چیز نہیں،
ایسا آخر ہے کہ اس کے بعد کوئی چیز نہیں۔ ۳۴۳
اللہ کو ہر وقت اپنے ساتھ سمجھنا افضل ایمان ہے ۳۴۸
اللہ، فرشتوں اور رسُولوں پر ایمان کی تفصیل
اور امتیاز۔ ۳۵۴، ۳۵۵
ایسا انفاق اللہ قبول نہیں فرماتا جس میں خیانت
کا دخل ہو۔ ۳۵۸
انفاق میں مسابقت پر حدیث (ابوسعیدؓ خدری) ۳۵۹، ۳۶۰
وقوع قیامت پر تلوار کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں
تاکہ خدائے واحد کی عبادت ہو۔ میری روزی میرے
نیزے کے سایہ میں ہے۔ ۳۹۲
لوگوں کو تلوار کے علاوہ کوئی چیز سیدھا نہیں کرسکتی ۳۹۳
میری اُمّت کی رہبانیت راہِ خدا میں جہاد کرنا ہے ۴۰۰
میری اُمّت کی رہبانیت ہجرت، جہاد، نماز، روزہ
حج اور عمرہ میں ہے۔ ۴۰۱
اگر شیاطین انسانی دلوں پر قبضہ نہ کرتے تو وہ
ملکوتِ سماوات کو دیکھ سکتے۔ ۴۰۸
اوس بن صامت کو سُورۂ مجادلہ کی آیات سنائیں
اور ظہار کا کفّارہ ادا کر دیا۔ ۴۱۵
دو افراد تیسرے سے الگ ہو کر سرگوشی نہ کریں۔
کیا تمہیں نجویٰ سے منع نہیں کیا گیا۔
(بذریعہ ابوسعیدؓ خدری) ۴۳۱
اللہ نے ہمیں بہتر سلام کا حکم دیا ہے۔ ۴۳۲
عالم شہید سے اور شہید عابد سے ایک درجہ
بلند ہے۔ ۴۳۶

عالم کی عابد پر فضیلت، بدرِ کامل کی ستاروں پر فضیلت کی طرح ہے۔ ۴۳۶
انبیاء، علماء، شہداء قیامت میں ۴۳۶
مومن کی دوسرے مومن سے برائے خدا خوشنودی بہترین عمل ہے۔ ۴۵۵
سورۂ حشر کی تلاوت کے بے حساب فضائل ۴۶۰
دشمنوں کو خوف و دہشت میں مبتلا کر کے اللہ نے ایک ماہ کے فاصلہ سے میری مدد کی۔ ۴۶۳
بنی نضیر پر کامیابی کے بعد ان کی جائیداد کی تقسیم ۴۸۲
ایک بھوکے سوالی کے لیے فریاد، کوئی ہے جو اسے کھانا کھلائے۔ ۴۸۳
بخل، حرص اور ایمان ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ ۴۸۴
روزِ قیامت کے لیے انفاق کرو خواہ ایک خرمہ ہو۔ اللہ کا سوال، آگے کے لیے کیا بھیجا، راہِ خدا میں انفاق کرو خواہ خرمہ کا آدھا دانا ہو۔ ۴۹۹
آنحضرتؐ کی تحریک پر ہر شخص کچھ نہ کچھ لایا۔ ایک معقول امداد جمع ہو گئی۔ ۵۰۰
سورۂ حشر کی آخری آیات پڑھنے سے اگلے پچھلے گناہ بخشے جائیں گے، پڑھنے والا مرے تو شہید ہوگا۔ ۵۰۷
سورۂ حشر کی آخری آیات موت کے سوا ہر مرض کا علاج ہیں۔ ۵۰۸
جو سورہ ممتحنہ کی تلاوت کرے قیامت کے دن تمام مؤمنین و مؤمنات اس کے شفیع ہوں گے۔ ۵۱۰
اللہ کی خاطر دشمنی و دوستی، بخل و بخشش ایمان کو محکم کرتی ہے۔ ۵۲۶
سورۂ صف پڑھنے والے کے لیے حضرت عیسیٰؑ استغفار و دعائے رحمت کریں گے۔ ۵۴۷
احمد نام کے ثبوت میں ابوطالبؑ اور علیؑ ابنِ ابی طالبؑ کے اشعار ۵۶۳، ۵۶۵
واقعۂ معراج میں آنحضرتؐ کو احمدؐ نام سے خطاب کیا گیا۔ ۵۶۴
جو لوگ نمازِ جمعہ میں شریک ہوں انہیں شرکائے نماز و عدم شرکاء کی تعداد سے دس گنا ثواب ملے گا۔ ۵۸۱
جس کا علم زیادہ ہو لیکن اس کی ہدایت میں اضافہ نہ ہو تو یہ علم اسے اللہ سے دُوری کے سوا کچھ نہیں دیتا ۵۹۵
عالمِ بے عمل عالم تمام ذمہ داریاں اٹھانے کے باوجود علم سے بہرہ مند نہیں ہوتا۔ ۵۹۶
جو شخص نماز جمعہ بطور استخفاف ترک کرے اس کا ہر عمل نماز، زکوٰۃ نا قبول، اللہ اسے پریشان حال کرے گا اور اس کی ہر شے سے برکت اٹھ جائے گی۔ ۶۰۵
جو شخص از روئے ایمان اللہ کے لیے نماز جمعہ میں شرکت کرے اس کے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ ۶۰۶
تو نماز جمعہ پڑھ یہی تیرا حج ہے۔ (ایک شخص کو ہدایت) ۶۰۶

سُورہ مُنافقون، کی تلاوت کرنے والا ہر قسم کے نفاق سے پاک ہو جائے گا۔ ۶۱۴
مَیں تم میں اس منافق سے ڈرتا ہوں جس کی زبان سے علم ٹپکتا ہے۔ ۶۲۳
مومن زراعت کی طرح ہیں جنہیں ہوائیں گرا دیتی ہیں مگر وہ پھر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ۶۲۴
اللہ نے مومن کے تمام کام خود اس کے سپرد کر دیے ہیں، پس لازم ہے کہ وہ ہمیشہ عزیز رہے، ذلیل و خوار نہ ہو۔ ۶۳۵
منافق امانت میں خیانت، جھوٹی بات اور وعدہ خلافی کرتا ہے۔ ۶۴۰
سُورہ تغابن پڑھنے والا ناگہانی موت سے محفوظ رہے گا۔ ۶۴۴

حضرت امام محمّد باقرؑ (امام پنجم)

اللہ تعالیٰ سُورہ طور کی تلاوت کرنے والے کے لیے دُنیا و آخرت کی بھلائیاں جمع فرمادے گا۔ ۲۹
تم میں کوئی اپنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے زیادہ ہونے پر فخر نہ کرے۔ اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے۔ ۱۲۶
رسُولِ پاکؐ کا پسندیدہ پھل، انار ۲۷۰
ہم اللہ کا جلال اور اس کی کرامت ہیں ۲۷۲
ہم سابقون بھی ہیں اور آخرون بھی ۲۸۴
قرآن کو وضو کے بغیر مس نہ کرو ۳۲۴
اصحابِ یمین ہمارے دوست اور ہمارے شیعہ ہیں۔ ۳۳۳
مسبحات کی تلاوت کرنے والا ظہورِ امامؑ تک زندہ رہے گا یا رسُول پاک کا دوسرے جہان میں ہم نشین ہو گا۔ ۳۳۸
اللہ مردہ زمین کو حضرت مہدیؑ کے ذریعہ زندہ فرمائے گا۔ زمین کے مُردہ ہونے سے مراد اس پر کُفر کا غلبہ ہونا ہے۔ ۳۷۱
صدیقین و شہداء پر آپ کی طویل حدیث ۳۷۹، ۳۸۰
تمام خوبیاں تلوار، تلوار کے نیچے اور تلوار کے سایہ میں ہیں۔ ۳۹۳
اپنے دل کا جائزہ لو۔ اس میں اللہ والوں کی دوستی اور اس کے نافرمانوں کی دُشمنی ہے تو تم اچھے آدمی ہو۔ ۴۵۶
جب انسان زنا کرتا ہے تو روحِ انسان اس سے جدا ہو جاتی ہے۔ ۴۵۷
ہمارے لیے رسُولِ خدا اور ذوی القربیٰ کا حصّہ ہے اور دوسرے حصّوں میں بھی ہم لوگوں کے شریک ہیں۔ ۴۷۴
سُورہ صف کو واجب و مستحب نمازوں میں تلاوت کرنے والے کو اللہ انبیاء و مرسلین کی صف میں قرار دے گا۔ ۵۴۸

آنحضرتؐ کے دس نام تھے جن میں پانچ قرآن میں موجود ہیں: محمدؐ، احمدؐ، عبداللہؐ، یٰسٓ، نٓ۔ ۵۶۴
نماز جمعہ ایک فریضہ ہے۔ امام (معصوم) کے ساتھ اجتماع واجب ہے۔ جب کوئی تین جمعہ ترک کر دے تو اس نے تین فریضے ترک کر دیے۔ تین فرائض بغیر کسی علت کے ترک نہیں کرتا مگر منافق۔ ۶۰۵
آگے پیچھے دو بھیڑیے گلہ کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا مال و اولاد کی محبت مومن کے دین کو نقصان پہنچاتی ہے۔ ۶۳۷
وہ آئمہ وہی ہیں جو مومنین کے دلوں کو نور اور روشنی بخشتے ہیں۔ ۶۵۴

معاذؓ بن جبل

قرآن کو پاکیزہ افراد کے علاوہ کوئی نہ چھوئے۔ (حدیثِ رسولؐ) ۳۲۴

حضرت موسیٰ علیہ السلام

کیا وہ اس سے باخبر نہیں ہوا جو موسیٰؑ کی کتاب میں نازل ہوا۔ ۱۲۸
پروردگار! میں تجھے کہاں پاؤں؟ فرمایا: جب تو میرا ارادہ کرے تو میرے پاس پہنچ گیا۔ ۳۴۸
کیا میرے لیے کسی سے محبت، کسی سے دشمنی کی ہے، حُبّ فی اللہ و بُغض فی اللہ؟ ۴۵۵، ۴۵۶
مجھے کیوں اذیت دیتے ہو، حالانکہ میں تو تمہاری طرف بھیجا ہوا رسول ہوں۔ ۵۵۷

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ (امامِ ہفتم)

آیۂ انفاق امام کو ہدیہ دینے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ۳۶۰
اللہ مُردہ دلوں کو نُورِ حکمت سے زندہ کرتا ہے ۳۷۱
رہبانیت کے طور پر سفر کرنے یا گھر میں بیٹھ رہنے کو منع فرمایا۔ ۴۰۰

مومنِ آلِ فرعون

سابقون الاوّلون میں شمار ہے ۲۸۲

نجاشی

حضرت جعفر ابن ابی طالبؑ کی تبلیغ سے ایمان لایا ۴۰۵

نعمان بن بشیر

۶۰ھ میں کوفہ کا گورنر تھا ۶۰۷

حضرت نوح علیہ السلام

اپنی قوم کو عذاب سے ڈرایا مگر اس نے ہدایت نہ پائی ۱۷۰
ہم نے نوحؑ و ابراہیمؑ کو بھیجا۔ ان کو ذریت میں نبوت و کتاب قرار دی۔ ۲۹۵

ولید بن مغیرہ

دینِ اسلام میں قربت حاصل کی، مشرکین کی سرزنش، ایک نے مال کے بدلہ گناہ اٹھانے کا اقرار کیا، طے شدہ مال سے کم دیا، اسلام سے پھرنا۔ مذمت۔ ۱۳۰

آیت سجدہ کی تلاوت پر مومن و کافر سب سجدہ میں گر گئے۔ اس نے ایک مٹھی مٹی اٹھا کر اسے پیشانی سے لگا لیا، جھک نہیں سکتا تھا۔ ۱۵۲

ویل دورانت

ایک عیسائی مبلّغ، رہبانیت پر بیان۔ چوتھی صدی میں راہبوں سے میل جول ہوا۔ دسویں صدی میں انتہا کو پہنچ گیا۔ ۴۰۱

ہابیل

سابقون الاوّلون میں شمار ہوتے ہیں ۲۸۲

ہندہ بنتِ عتبہ بن ربیعہ

آنحضرتؐ کا شرائطِ بیعت بیان فرمانا اور ہندہ کے جوابات۔ ۵۴۲

عُلماء و دانشور

آلوسی ۳۵۹، ۳۷۶

ابنِ ابی الحدید (مؤرخ) ۴۷۷

ابنِ اثیر (مؤرخ) ۳۹۹

ابنِ منظور (صاحبِ لسان العرب) ۲۴۶

ابنِ ندیم (سُورہ واقعہ کی فضیلت بیان کی) ۲۷۵

ابو عبداللہ زنجانی (مؤلف تاریخ القرآن) ۲۷۵

ابوالفتوح رازی (مفسّر) ۵۴۲

برسوئی (مفسّر روح البیان) ۲۷۴

بیضاوی (مفسّر) ۸۶، ۳۶۹

جلال الدّین سیوطی (مفسّر درالمنثور) ۸۱

حاکم نیشاپوری ۴۷۷

راغب (صاحبِ مفردات) ۳۲، ۴۲، ۴۹، ۵۱، ۵۵، ۵۶، ۷۹، ۸۰، ۱۴۰، ۱۹۱، ۲۱۶، ۲۲۶، ۲۴۶، ۲۵۱، ۲۶۱، ۲۸۳، ۲۸۷، ۳۰۳، ۳۱۴، ۳۲۱، ۳۴۰، ۳۵۸، ۳۹۹، ۴۴۷، ۴۷۳، ۴۸۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۶۸، ۵۷۴، ۶۵۵

زمخشری (مفسّر) ۸۶، ۱۲۹، ۱۳۲، ۵۸۸

سیّد قطب (مفسّر فی ظلال القرآن) ۸۶، ۵۵۲، ۵۸۸

سیوطی (مفسّر) ۴۳۳

☆

طباطبائی (مفسر المیزان) ۸۶، ۵۵۲، ۵۸۸

طبرسی (مفسر مجمع البیان) ۳۳، ۸۶، ۱۲۹، ۲۲۵، ۳۲۳، ۳۵۹، ۴۳۳، ۴۳۹، ۴۴۱، ۵۸۸

طوسی (مفسر، امالی) ۸۷، ۴۱۸

عبداللہ زنجانی (تاریخ القرآن) ۶۴۴

فخرالدین رازی (مفسر) ۸۶، ۱۲۹، ۳۵۹، ۴۷۴

فرید وجدی (صاحبِ دائرۃ المعارف) ۲۱۵، ۲۳۱، ۲۳۲

قرطبی (مفسر، روح البیان) ۸۶، ۵۸۸

مراغی (مفسر) ۸۶، ۵۸۸

ملاصدرائے شیرازی (فلسفی) ۲۴۱، ۲۴۲

ہشام بن حکم (دانشور) ۸۷

کتبِ آسمانی

انجیل

انجیل یا اناجیل، یونانی لفظ، معنی 'بشارت'، حضرت عیسٰیؑ پر نازل ہونے والی کتاب کا نام ۴۰۳

انجیل یوحنا

وہ تمہیں دوسرا تسلی دینے والا دے گا جو ابد تک تمہارے ساتھ رہے گا۔ ۵۶۱

سچائی کی رُوح جو میرے باپ کی طرف سے آئے گی وہ میرے بارے میں شہادت دے گی ۵۶۱

مَیں چلا جاؤں تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا ۵۶۲

سریانی اناجیل میں فارقلیط آیا ہے، یونانی اناجیل میں پیرکلتوش آیا ہے جو محمدؐ و احمدؐ کا معادل ہے۔ ۵۶۲

تورات

کتابِ حزقیل: وہی جان جو گناہ کرے گی وہی مرے گی۔ بیٹا باپ کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائیگا۔ ۱۳۶

تورات، سفرِ تثنیہ۔ باپ اولاد کے بدلہ قتل نہیں کئے جائیں گے۔ اولاد بھی باپ کے بدلہ قتل نہیں کی جائے گی۔ ہر شخص اپنے گناہ کے سبب ہلاک ہوگا۔ ۱۳۶

وہ لوگ اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں، وہی پیغمبر کہ جس کی صفات توریت میں پاتے ہیں۔ ۵۶۰

عہدین (تورات و انجیل) میں ایسی بہت سی تعبیریں نظر آتی ہیں جو ایک عظیم ظہور کی بشارت دیتی ہیں۔ وہ نشانیاں پیغمبرِ اسلام پر ہی پُوری اترتی ہیں۔ ۵۶۱

جو لوگ تورات کے مکلف قرار دیے گئے ہیں مگر انہوں نے اس کا حق ادا نہ کیا وہ گدھے پر کتابیں لادنے کی مثال ہیں۔ ۵۹۰

قرآنِ حکیم

سورۂ طُور کے مطالب

معاد، نیک وپاک لوگوں کی تقدیر پر مجرموں اور بدی کرنے والوں سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے۔ ۲۸
ثوابِ تلاوت :
تلاوت کرنے والے کو اللہ اپنے عذاب سے مامون قرار دے گا۔ (رسُولِ پاکؐ) ۲۸، ۲۹
اللہ دُنیا و آخرت کی بھلائی پڑھنے والے کے لیے جمع فرما دے گا۔ (امام محمد باقرؑ) ۲۹

سُورۂ نجم کے مطالب

سجدۂ واجب کی ایک آیت کا نزول، نبوّت و معاد کے مسائل کی بحث اور ذکرِ معراج۔ ۷۵، ۷۶
ثوابِ تلاوت :
اللہ تعالیٰ پڑھنے والے کو ایمان لانے اور انکار کرنے والوں کی تعداد سے دس گنا نیکیاں عطا فرمائے گا۔ (رسُولِ پاکؐ) ۷۶
شب و روز تلاوت کرنے والا شائستہ سمجھا جائے گا۔ اللہ اسے بخش دے گا۔ (امام جعفر صادقؑ) ۷۶، ۷۷

سُورۂ قمر کے مطالب

مبدا و معاد، صالحؑ، نوحؑ اور لُوطؑ کے ذکر پر مشتمل ہے۔ ۱۵۵، ۱۵۶
ثوابِ تلاوت :
قاریِ سُورہ کے لیے بہت سے فضائل ۱۵۶
ہم نے قرآن کو نصیحت اور انسان کو بیدار کرنے کے لیے آسان کیا ہے۔ کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے؟ ۱۸۸
سُورہ کا آغاز و اختتام ۲۰۶

سُورۂ الرّحمٰن کے مضامین

اللہ کی نعمات، رحمتیں، مؤمنین و مجرمین کا انجام، جنّت و دوزخ کا ذکر۔ ۲۰۹، ۲۱۰
ثوابِ تلاوت :
قاریِ سُورہ شکرِ خدا کے باعث اللہ کے رحم و کرم کا مستحق ہوگا۔ ۲۱۱
رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی۔ ۲۱۴

سُورۂ واقعہ کے مضامین

قیامت پر خصوصی گفتگو، مضامین کے آٹھ حصّے ۲۷۵
ثوابِ تلاوت :
تلاوت کی فضیلت پر ارشاداتِ رسُولؐ و آئمہؑ ۲۷۶
"اِنَّہٗ لقراٰن کریم" قرآنِ کریم محفوظ و مکنون کتاب ہے، پاک لوگوں کے سوا اسے کوئی چھو نہیں سکتا۔ ۳۱۹ تا ۳۲۳

خصوصیاتِ قرآن :
موضوعات و مضامین، عمیق معنی، پاکیزگی، تربیتی پہلو ۳۲۲
قرآن وطہارت :
پاک لوگوں کے سوا اسے کوئی مس نہیں کرسکتا۔ ۳۲۴

سُورۂ حدید کے مضامین

مدنی ہے۔ اجتماعی حکومتی وعملی احکام، انفاق درراہِ خدا
توحید، نبوّت، قیامت۔ ۳۳۷
ثوابِ تلاوت :
قاری کا توحید ورسالت پر مکمّل ایمان ہوگا۔ ۳۳۸
جو کچھ گنوا دیا اس کا غم نہ کرو، جو اللہ نے دیا اس
پر خوش ہونا۔ ۳۸۶
آیت ۲۸، ۲۹ کی شانِ نزول ۴۰۵

سُورۂ مجادلہ کے مضامین

فقہی احکام، اجتماعی نظامِ زندگی، غیر مسلموں
سے باہمی ربط۔ ۴۱۰
ثوابِ تلاوت :
قاری اپنی اور اپنے اہلِ خانہ کی ذات میں کوئی
بُرائی نہ دیکھے گا۔ ۴۱۰، ۴۱۱
شانِ نزول :
خولہ اور اس کے شوہر اوس بن صامت کے خولہ
سے ظہار کرنے کا واقعہ۔ ۴۱۴
آیاتِ نجویٰ کی شانِ نزول : یہود و منافقین
کا سرگوشیاں کرنا، مُسلمانوں کا پریشان ہونا۔ ۴۲۸
'تفسحوا فی المجالس' کی شانِ نزول۔
آنحضرتؐ کی خدمت میں چند بدری اصحاب
کا آنا، انہیں جگہ دینے کے لیے ساتھیوں کو
حُکم دینا۔ ۴۳۲، ۴۳۴
آیاتِ نجویٰ رسُولؐ کی شانِ نزول : نجویٰ سے
برتری حاصل کرنا مقصود تھا، حُکم ہُوا کہ نجویٰ
سے پہلے صدقہ دو۔ ۴۳۹

سُورۂ حشر کے مضامین

بنی نضیر سے لڑائی، جلاوطن کرکے مدینہ کو
پاک کرنا، تسبیحِ الٰہی پر سُورہ کا خاتمہ۔ ۴۵۹، ۴۶۰
ثوابِ تلاوت :
قاری کے لیے رسُولِ پاکؐ اور امام جعفر صادقؑ
کی احادیث میں ثواب کا ذکر۔ (شخصیات) ۴۶۲
شانِ نزول :
بنی نضیر کی عہد شکنی، رسُولِ پاکؐ کی ہلاکت کا
منصُوبہ، بنو نضیر کی جلاوطنی۔ ۴۶۲، ۴۶۴
آیاتِ 'فے' کی شانِ نزول : بنی نضیر کی جلاوطنی
کے بعد متروکہ اموال کی تقسیم، مُسلمانوں کی خواہش
اور حُکمِ خدا۔ ۴۷۲
آیات ۱۱ تا ۱۴ کی شانِ نزول : قرآن پہاڑوں پر
نازل ہوتا تو ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ ۴۸۸

پہاڑ خوفِ خدا سے کانپتے، خشوع و خضوع کرتے۔ ۵۰۲، ۵۰۳
آخری آیات: اسمائے حسنیٰ پر مشتمل پرعظمت آیات کو اپنے وجود میں منعکس کرلو۔ ۵۰۷

سورۂ ممتحنہ کے مضامین

حُبِ فی اللہ اور بُغض فی اللہ کا مسئلہ اور مشرکین سے دوستی کی ممانعت۔ ۵۱۰
ثوابِ تلاوت:
قیامت میں تمام مومنین و مومنات قاری کے شفیع ہوں گے۔ ۵۱۰، ۵۱۱

سورۂ صف کے مضامین

اسلام کی دیگر آسمانی ادیان پر برتری ۵۴۷
ثوابِ تلاوت:
قاری کے لیے حضرت عیسیٰؑ دعائے رحمت کریں گے ۵۴۷
شانِ نزول:
غزوۂ اُحد سے بھاگنے والے ۵۵۰

سورۂ جمعہ کے مضامین

توحید، صفاتِ خدا، ہدفِ بعثت، معاد، نمازِ جمعہ کا اصلاحی نقشہ، کاروبار کی تعطیل۔ ۵۸۱
ثوابِ تلاوت:
سورۂ جمعہ پر ارشاداتِ رسولؐ ۵۸۲
نمازِ جمعہ اور خطبہ کے لیے دوڑ کر آنا، ختمِ نماز کے بعد ذکرِ خدا، تلاشِ فضل، بھاگنے والوں کی مذمت ۶۰۱ تا ۶۰۳

سورۂ منافقون کے مضامین

منافقین کی نشانیاں، ہوشیار رہنا، قبل از موت راہِ خدا میں خرچ کرنا۔ ۶۱۴
ثوابِ تلاوت:
ہر قسم کے نفاق سے پاک ہو جائے (فرمانِ رسولؐ) ۶۱۴
شانِ نزول:
عبداللہ ابن اُبی کا ایک انصاری کی مدد کو آنا، مہاجرین کو بُرا بھلا کہنا۔ زید بن ارقم و اسید انصاری کی گفتگو۔ ۶۲۵ تا ۶۲۷

سورۂ تغابن کے مضامین

توحید، اللہ کی صفات و افعال پر بحث، تیسرا حصہ معاد پر گفتگو۔ ۶۴۳
ثوابِ تلاوت:
قاری ناگہانی موت سے محفوظ رہے گا۔ ۶۴۴
اللہ، اس کے رسولؐ اور اس نور پر ایمان لے آؤ جسے ہم نے نازل فرمایا۔ ۶۵۲
آخری آیات کی شانِ نزول پر امام محمد باقرؑ کی حدیث۔ ۶۶۲

کُتبِ تفسیر و تاریخ و سیر

ابنِ ماجہ ۲۰۵
اسد الغابہ ۲۷۳
اصولِ کافی ۱۰۲، ۱۲۳، ۲۳۹، ۲۶۷، ۲۹۴، ۳۴۰، ۳۷۱، ۴۳۱، ۴۴۸، ۴۵۵، ۴۵۷، ۵۹۶، ۶۳۵، ۶۳۷
الغدیر ۲۴۰، ۵۶۴
المنجد ۵۵، ۲۷۰
امالی ۸۷
اوّلین دانش گاہ ۳۰۶
بحار الانوار ۱۰۲، ۱۱۴، ۱۶۳، ۱۷۹ تا ۱۸۱، ۲۶۶، ۲۶۷، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۹۰، ۴۰۰، ۶۰۷، ۶۶۶
بخاری ۲۰۵، ۲۳۹، ۳۵۵، ۵۱۵، ۵۳۰، ۵۸۸
بلوغ الادب ۴۳۲
تاریخ ابنِ عساکر ۵۶۳
تاریخ القرآن ۲۷۵، ۶۴۳
تاریخِ طبری ۱۱۰
تاریخ ویل دورانت ۴۰۱، ۴۰۲
تحف العقول ۱۸۱
تحفۂ حکیم مؤمن ۲۳۱
ترمذی ۲۰۵
تفسیر ابوالفتوح رازی ۱۷۲، ۲۷۱، ۲۸۸، ۳۱۲، ۳۳۴، ۳۸۸، ۴۰۵، ۴۱۵، ۴۳۴، ۴۶۸، ۵۰۴
تفسیر البیان ۴۴۱
تفسیر المیزان ۸۶، ۹۴، ۹۸، ۴۵۷، ۴۹۶، ۵۵۲، ۵۶۰، ۵۸۸، ۶۶۵
تفسیر انوار التنزیل ۸۶، ۳۶۹
تفسیر برہان ۲۷۲، ۲۷۷، ۳۳۳، ۴۵۶
تفسیر تبیان ۴۱۸
تفسیر خوارزمی ۴۱۹
تفسیر در المنثور (سیوطی) ۷۲، ۸۲، ۸۸، ۱۴۳، ۲۰۲، ۲۳۵، ۲۶۵، ۲۷۰، ۲۷۱، ۳۱۸، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۳۴، ۳۳۸، ۳۴۸، ۳۵۰، ۳۶۰، ۳۶۹، ۴۳۱، ۴۳۴، ۴۴۱، ۴۶۸، ۴۷۷، ۴۸۸، ۴۹۸، ۵۴۲، ۵۶۴، ۵۷۸، ۵۸۸، ۶۰۴، ۶۶۲
تفسیر روح البیان ۴۹، ۷۵، ۸۵، ۸۶، ۸۸، ۱۳۰، ۱۳۵، ۱۳۶، ۲۶۲، ۳۰۹، ۳۱۱، ۳۳۴، ۳۴۸، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۸۶، ۳۸۸، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۷۴، ۴۸۸، ۴۹۸، ۵۱۵، ۵۲۶، ۵۳۰، ۶۱۹، ۶۶۹
تفسیر روح الجنان (رازی) ۴۹، ۵۳۵، ۵۴۲

تفسیر روح المعانی ۱۳۰، ۱۷۳، ۲۰۵، ۲۰۷، ۲۳۸، ۲۳۹،
۲۷۷، ۲۹۵، ۳۰۳، ۳۰۹، ۳۱۵ تا ۳۱۸،
۳۲۳، ۳۳۴، ۳۵۹، ۴۰۵، ۴۳۴، ۴۳۶،
۴۳۹، ۴۷۴، ۵۰۴، ۵۱۵، ۵۲۳، ۶۰۱،
۶۰۴، ۶۰۵، ۶۶۵-

تفسیر صافی ۱۴۷، ۲۰۱، ۲۴۶، ۲۸۴، ۳۶۰

تفسیر علی ابن ابراہیم ۸۷، ۱۳۸، ۲۲۰، ۳۸۵، ۴۶۴، ۶۶۲

تفسیر عیاشی ۲۶۱، ۳۷۷

تفسیر فی ظلال القرآن ۵۹، ۸۶، ۳۵۵، ۴۳۴، ۴۴۱،
۴۷۴، ۵۶۴، ۵۷۴، ۵۸۸، ۶۶۵-

تفسیر قرطبی ۴۹، ۵۵، ۵۶، ۷۲، ۱۳۰، ۲۰۵،
۳۰۹، ۳۱۶، ۳۲۳، ۳۳۴، ۳۴۳،
۳۷۳، ۴۱۵، ۴۳۴، ۴۳۶، ۴۶۰،
۴۶۴، ۴۹۸، ۵۱۵، ۵۸۸، ۶۰۴، ۶۶۵-

تفسیر قمی ۲۳۵، ۲۴۱

تفسیر کبیر (فخر رازی) ۱۵۸، ۲۲۰، ۲۹۴، ۳۵۹، ۴۲۵،
۴۴۱، ۴۴۲، ۴۶۸، ۴۷۴، ۵۰۴،
۵۱۵، ۵۲۳-

تفسیر کشّاف (زمخشری) ۴۹، ۸۶، ۱۲۹، ۱۳۲، ۱۷۲،
۵۸۸، ۶۲۲-

تفسیر مجمع البیان (طبرسی) ۳۳، ۴۹، ۷۲، ۸۶، ۹۳، ۱۱۸،
۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۵، ۱۴۶، ۱۵۸، ۲۱۷،
۲۳۵، ۲۳۹، ۲۴۶، ۲۶۱، ۲۶۴، ۲۶۵-
۲۷۶، ۲۷۷، ۳۰۳، ۳۱۱، ۳۱۸، ۳۲۳،
۳۳۸، ۳۵۹، ۳۶۹، ۳۷۱، ۳۸۰، ۴۰۱،
۴۰۵، ۴۱۴، ۴۱۷، ۴۲۸، ۴۳۱، ۴۳۳،
۴۳۴، ۴۳۶، ۴۳۹، ۴۵۳، ۴۶۰، ۴۶۴،
۴۶۹، ۴۷۲، ۴۷۴، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۹۸،
۵۰۷، ۵۱۰، ۵۱۵، ۵۲۴، ۵۳۲، ۵۳۳،
۵۴۲، ۵۵۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۸، ۵۹۰،
۶۰۰، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۱۴، ۶۴۴، ۶۶۵،
۶۶۷-

تفسیر مراغی ۴۵، ۵۴، ۷۵، ۲۸۳، ۳۰۹، ۳۱۵،
۳۲۳، ۳۳۴، ۳۵۵، ۳۹۲، ۴۲۹،
۴۷۴، ۵۱۵-

تفسیر مفاتیح الغیب (فخر رازی) ۸۶، ۱۲۸، ۱۴۶

تفسیر نور الثقلین ۳۳، ۸۷، ۸۸، ۹۳، ۱۲۶، ۱۳۸،
۱۷۹، ۱۹۳، ۲۲۸، ۲۵۵، ۲۶۱، ۲۷۶،
۲۸۱، ۲۸۳، ۲۹۴، ۳۱۸، ۳۲۳، ۳۳۲،
۳۳۳، ۳۳۵، ۳۴۰، ۳۴۳، ۳۶۴، ۳۷۱،
۳۷۷، ۳۸۵، ۳۹۱، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۲۵،
۴۲۶، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۶، ۴۴۸، ۴۶۴،
۴۶۶، ۴۷۷، ۴۸۴، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۲۱،
۵۵۳، ۵۶۴، ۵۸۱، ۵۸۲، ۶۳۵، ۶۵۴،
۶۶۲، ۶۶۸-

ثواب الاعمال ۲۷۶

جوامع الجامع ۴۳۶

جواہر الکلام ۵۳۵

خصالِ صدوقؒ ۲۷۶، ۲۸۱

دائرۃ المعارف ۱۴۳، ۲۱۵، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۴،
۴۰۱، ۴۰۲

دہی مدرک ۱۸۱

دیوانِ ابوطالبؑ ۵۶۳

دیوان حسانؓ بن ثابت ۵۶۳، ۵۶۴

رازِ آفرینشِ انسان ۲۱۶

سفینۃ البحار ۳۲۹، ۳۷۳، ۴۵۶، ۵۹۷، ۶۲۳، ۶۴۰

سیرت ابنِ ہشام ۲۷۳

شرح ابنِ ابی الحدید ۴۷۷

صحیفۂ سجادیہ ۶۰۸

علل الشرائع ۸۷

فروعِ کافی ۳۹۲

کامل ابنِ اثیر ۲۴۱، ۵۲۰

کتابِ خصال ۴۶۶

کتابِ فدک ۴۷۷

کمال الدین ۳۷۱

کنز العرفان ۳۷۲، ۴۱۵، ۴۱۷، ۴۲۰

کنز العمال ۴۰۳، ۴۷۷

لسان العرب ۴۶، ۵۵، ۲۴۶، ۲۷۰، ۲۹۹،
۳۰۳، ۴۱۹، ۵۰۴

مجمع البحرین ۴۶، ۴۹، ۲۱۵، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۴،
۴۰۱، ۴۰۲، ۶۵۲

محجۃ البیضاء ۵۹۶

مروج الذہب ۳۲۸، ۳۲۹

مسلم ۶۳۴، ۶۶۶

مسندِ احمد ۴۷۷

مفردات ۳۳، ۴۲، ۴۹، ۵۱، ۵۵، ۵۶، ۷۹،
۸۰، ۱۴۰، ۱۹۱، ۲۱۶، ۲۲۶، ۲۴۶،
۲۵۱، ۲۶۱، ۲۸۳، ۲۸۷، ۳۰۳، ۳۱۴،
۳۲۱، ۳۴۰، ۳۵۵، ۳۹۹، ۴۶۶، ۴۷۳،
۴۸۳، ۵۰۳، ۵۶۸، ۵۷۴، ۶۵۵

من لایحضر الفقیہ ۳۱۸

نہایہ ۳۹۹، ۴۱۸

نہج البلاغہ ۳۳، ۷۳، ۸۱، ۸۹، ۹۰، ۱۱۲، ۱۲۶،
۳۴۲، ۳۴۳، ۳۸۰، ۴۷۷، ۵۳۳، ۵۵۲،
۵۵۳، ۵۵۵، ۵۷۵، ۵۸۹، ۵۹۵، ۵۹۶،
۵۹۸، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۶۵

وسائل الشیعہ ۱۲۵، ۳۲۴، ۴۱۸، ۴۲۰، ۴۳۷،
۴۷۴، ۴۷۵، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۱۱

لغاتِ قرآن

(ا)

آن: آنی، کھولتا ہوا پانی ۲۵۲

ابارِیق : ابریق کی جمع ۔ دستہ اور ٹونٹی والا برتن ۲۸۷
اترابا : اتراب جمع ہے 'ترب' کی (بروزن ذہن) مثل و مانند، ہم سن ۲۹۵
احجاج : مادّہ 'اج' (بروزنِ حج) ۔ آگ بھڑکنا ۔ جلانا ۳۱۵
احلام : جمع حلم (بروزنِ فہم) کی ۔ عقل ۵۷
اخذ : پکڑنا، گرفت کرنا ۱۹۶
ادھیٰ : مادّہ 'دہو' ہا، عظیم مصیبت، حادثہ ۱۹۷
ارتبتم : مادّہ 'ریب' شک، قرآن و قیامت پر شک کرنا ۔ ۳۶۵
ازدجر : زجر، دھتکارنا، دُور کرنا، روکنا ۱۷۲
ازفة : ازف (بروزنِ نجف) تنگیِ وقت، (بہت قریب) ۱۵
استبرق : موٹا و ضخیم ریشم ۲۵۷
اشر : (بروزنِ قمر) خوش حالی ۱۸۵
اشیاع : شیَع، شبیہ، مانند و مثل پیروکار ۲۰۱
اعتبروا : مادّہ 'اعتبار' ایک چیز سے گزر کر دوسری کی طرف جانا ۔
مشتقات : عبرہ (اشکِ چشم)، عبارت، تعبیرِ خواب وغیرہ ۔ ۴۶۶
اعجاز : جمع عجز کی ۔ نچلا یا پچھلا حصّہ ۱۷۷
اعراب : (بروزنِ اظہار) ۔ آشکار و ظاہر کرنا، فصیح و خوش بیان ۔ ۲۹۵
اعلام : جمع عَلَم (بروزنِ قلم) کی پہاڑ ۲۳۳
اعین : بڑی آنکھیں ۲۸۸
اغنیٰ : مادّہ 'غنیٰ' بے نیازی ۱۴۰
افنان : فنن (بروزنِ قلم) کی جمع، تروتازہ شاخیں، ٹہنیاں ۲۵۶
اقتباس : مادّہ 'قبس' آگ کا شعلہ لینا ۳۶۴
اقدام : قدم کی جمع، پاؤں ۲۵۱
اقطار : قطر کی جمع، کسی چیز کے اطراف ۲۴۵
اقنیٰ : مادّہ 'قنیہ' (بروزنِ جزیہ) ۔ مال و دولت ۱۴۰
اکمام : کم (بروزنِ جن) کی جمع، بہت سے معنی ہیں، بالخصوص غلاف، چھپانے والی چیز ۔ ۲۲۱
اکواب : کوب کی جمع، پیالے ۲۸۷
الانسان : عالمِ نوعِ انسانی مراد ہے نہ کہ کوئی خاص مرد ۔ ۲۱۴
التناھم : مادّہ 'الت' (بروزنِ شرط) کم کرنا ۴۵
امددناھم : مادّہ 'امداد' ادامہ و افزائش و عطا ۴۸
انام : انسان یا جنّ یا دونوں، یا خلقِ مطلق ۲۲۱
انباء : خبریں، اُمم و اقوامِ سابقہ کی خبریں مراد ہیں ۱۶۶
انتصر : مدد طلب کرنا ۱۷۲
انزلنا : مادّہ 'نزل' مہمان کی تواضع کے لیے پیش کی جانے والی چیز ۳۹۱
انشزوا : مادّہ 'نشز' بلند زمین، اٹھنا، کھڑے ہونا ۴۳۵

انظرونا: مادّہ 'نظر' نگاہ کرنا، سوچ بچار، غور و خوض۔ ۳۶۴

اوجفتم: مادّہ 'ایجاف' تیزی سے ہانکنا ۴۷۳

(ب)

بارئ: مادّہ 'برء' (بروزنِ قفل) صحت یابی۔ ناخوشگوار اُمور سے رہائی ۵۰۵

باس: شدت، قدرت ۳۹۱

براء: بری کی جمع ۵۲۰

بست: مادّہ 'بس' آٹے کو پانی سے نرم کرنا ۲۸۱

بسیما: علامت و نشانی ۲۵۱

بضاعف: مادّہ 'ضعف' (بروزنِ شعر) کئی گنا کرنا۔ ۶۶۸

بطائن: بطانہ کی جمع، استر ۲۵۸

بطش: (بروزنِ فرش) کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑنا۔ ۱۹۲

بکرة: دن کا آغاز ۱۹۳

بیت المعمور: آسمانوں میں خانہ کعبہ کے عین اوپر واقع مکان، فرشتوں کی عبادت کے ساتھ معمور ہے۔ ۳۱

(ت)

تبارك: مادّہ 'برکت' اونٹ کا سینہ، مراد ثابت قدم، پائیدار ۲۶۱

تبوّؤ: مادّہ 'بواء' (بروزنِ دواء) اجزاء و مکان کی مساوات۔ ۴۸۱

تتماریٰ: مادّہ 'تماریٰ' محاجہ جو شک و تردید سے توام ہو۔ ۱۴۸

تجادل: مادّہ 'جدل'، رسی بٹنا، اصرار آمیز گفتگو ۴۱۶

تحاور: مادّہ 'حور' (بروزنِ غور) طرفین کی گفتگو ۴۱۶

تحرثون: مادّہ 'حرث' (بروزنِ درس) کاشت کرنا۔ ۳۱۱

تخشع: مادّہ 'خشوع' بزرگوں کے سامنے مؤدب ہونا۔ ۳۷۰

تدلّی: (بروزنِ تجلّی) نزدیک ہونا ۸۵

تربصتم: مادّہ 'تربص' انتظار کرنا ۳۶۵

تصلیہ: مادّہ 'صلی' (بروزنِ سعی) جلنا، آگ میں داخل ہونا۔ ۳۳۳

تغابن: دو جانب ۶۵۵

تفسحوا: مادّہ 'فسح' (بروزنِ قفل) وسیع مکان، وسعت دینا ۴۳۱

تفکهون: مادّہ 'فاکہہ' پھل، فکاہت، مزاح، خوش طبعی ۳۱۲

تقول: اپنی طرف سے گھڑی ہوئی گفتگو ۵۷

تماروا: مادّہ 'تماری' شک کرنا، جھگڑنا ۱۹۲

تنفذوا: مادّہ 'نفاذ' کسی چیز کو ٹکڑے کرنے کے بعد عبور کرنا ۲۴۵

تورون : مادّہ 'دری' (بروزنِ نفی) چھپانا ۳۱۵

(ث)

ثقلان : مادّہ 'ثقل' علم وشعور اور علم و آگہی کا وزن۔ ۲۴۵
ثلة : پشم کا ایک مجتمع ٹکڑا۔ جماعتِ کثیر ۲۹۶

(ج)

جبّار : مادّہ 'جبر' غلبہ وقوّت سے کسی چیز کی اصلاح کرنا۔ ۵۰۴
جدر : جدار کی جمع، دیوار ۴۹۰
جزاء الاوفیٰ : جزا جو عمل کے عین مطابق ہو ۱۳۲
جنیٰ : (بروزنِ بقا) پکا ہوا پھل جسے توڑنے کا وقت آجائے۔ ۲۵۸
جنّات : جنّت کی جمع۔ وسیع فضا ۲۰۲
جُنّة : مادّہ 'جن' (بروزنِ فن) کسی چیز کو حِس سے پنہاں کرنا۔ ۶۲۰
جنّت الماویٰ : یہ جنّت آسمانی بہشتِ جاودانی کے علاوہ ہے، اس کی وسعت تمام زمینوں اور آسمانوں کے برابر ہے۔ یہ مخصوص مقربین کی جگہ ہے۔ ۹۴
جوار : جاریہ کی جمع، چلنا پھرنا، متحرک ہونا، کشتی کی صفت۔ ۲۳۲

(ح)

حاصب : تیز آندھی جس میں سنگریزے اُڑتے ہوں۔ ۱۹۱
حب : ہر قسم کا دانہ، کٹی ہوئی گھاس ۲۲۲
حسبان : (بروزنِ زعفران) حساب اور نظم وترتیب۔ ۲۱۵
حشر : کسی جماعت کو میدانِ جنگ یا ایسی ہی دوسری جگہ بھیجنا۔ ۴۶۴
حطام : مادّہ 'حطم' (بروزنِ ختم) کسی چیز کا ٹوٹنا۔ زیرِ زمین بوسیدہ نہ اُگنے والا بیج، کٹی ہوئی گھاس۔ ۱۶۱
حمیم : گرم چیز، گرم پانی، حمام اس کا مشتق ہے۔ ۲۹۹
حنث : ہر قسم کا گناہ، حنث العظیم میں سب گناہ شامل ہیں۔ ۳۰۰
حواری : مادّہ 'حور' دھونا، صاف کرنا، صاف باطن۔ ۵۷۸
حور : 'حورا' احور کی جمع، سیاہ چشم، صاف و شفاف، سفید رنگ خاتون ۴۳، ۲۷۰
حیّوک : مادّہ 'تحیّت'، حیات، سلامتی ۴۲۹

(خ)

خصاصہ : مادّہ 'خصاص' گھر کی دیواریں پڑنے والے شگاف ۴۸۲

خوض : (بروزنِ حوض) باطل وغلط عادات میں غرق رہنا۔ ۳۷

خیام : خیمہ کی جمع، کپڑے کے علاوہ اینٹ، پتھر اور لکڑی سے بنے ہوئے مکان کو بھی کہتے ہیں۔ ۲۷۰

خیل : گھوڑے ۴۷۳

(د)

داع : (بروزنِ جد) شدت سے دھکیلنا۔ خشونت سے ہانکنا۔ ۳۸

دان : اصل 'دانی' ہے، نزدیک ۲۵۸

دُبر : قُبل کی ضد، پیٹھ، پُشت ۱۹۷

دُسر : دسار کی جمع، دھتکار، کیل کا شدید چوٹ سے لکڑی میں گھسنا ۱۷۳

دنیٰ : قریب ہونا ۸۵

دھان : (بروزنِ کتاب) پگھلا ہوا روغن، سُرخ چمڑا۔ ۲۵۰

(ذ)

ذواتا : ذات کا تثنیہ۔ صاحب، حامل ۲۵۶

(ر)

رأیتم : یہاں 'روایت' سے علم کے معنی میں ہے۔ ۳۰۶

رُجّت : مادّہ 'رج' (بروزنِ حج) حرکت کرنا ۲۸۱

رفرف : درخت کے بڑے اور چوڑے پتّے۔ رنگ برنگ خوبصورت پارچات ۲۷۰

رق : مادّہ 'رقت'، نازک، لطیف کاغذ، باریک چمڑا۔ ۳۲

رکاب : مادّہ 'رکوب'، سواری کے اونٹ ۴۷۳

رَوح : (بروزنِ قول) تنفّس ۳۳۱

رہبانیت : مادّہ 'رہبہ' خوف، خوفِ خدا ۲۷۹

ریحان : خوشبودار گھاس، ہر قسم کی روزی ۲۲۲، ۲۳۱

(ز)

زاغ : مادّہ 'زیغ' دائیں بائیں لڑنا، انحراف ۹۴

زاغوا : مادّہ 'زیغ'، صراطِ مستقیم سے انحراف ۵۵۹

زبر : زبور کی جمع، کتاب، لکھی ہوئی چیز، اعمال نامہ۔ ۲۰۲

زعم : مادّہ 'زعم' (بروزنِ طعم) وہ بات جس کے جھوٹ ہونے کا احتمال یا یقین ہو۔ ۶۵۲

زقوم : بدبودار تلخ گھاس ۳۰۳

(س)

سامدون : مادّہ 'سمود' (بروزنِ جمود) لہو ولعب'
غرور سے سر اونچا کرنا ۱۵۱
سدرہ : (بروزن حرفہ) بیری کا درخت ۵۱
سُرر : مادّہ 'سُرور' سریر کی جمع، تخت یا پلنگ ۲۸۷
سعی : تیزی سے راستہ طے کرنا ۱۳۱، ۱۳۲
سعر : (بروزنِ شتر) بھڑکتی ہوئی آگ،
سریر کی جمع۔ ۱۸۴
جنون، ہیجان، اشتعال ۲۰۰
سقر : (بروزنِ سفر) دھوپ کی شدت یا کسی
وجہ سے جسم کا رنگ متغیر ہونا ۲۰۰
سقفِ مرفوع : آسمان ۳۲
سلطان : زندہ، یقینی دلائل جو دشمن پر غلبہ کا
سبب ہوتے ہیں۔ ۱۰۶
سموم : مادّہ 'سم' زہر، مراد جلانے والی ہوا ۵۳، ۲۹۹
سور : دیوار، فصیل، شہر پناہ ۳۶۴
سھزم : مادّہ 'ہزم' (بروزنِ جزم) درہم برہم کرنا ۱۹۷

(ش)

شاقوا : مادّہ 'شقاق' شگاف، دو چیزوں میں جدائی ۴۶۷
شبابیک : شباک (بروزنِ خفاش) شُبّک (جالی)
کی جمع ہے۔ ۶۲۰
شتّٰی : مشیّت کی جمع ۴۹۱
شحّ : بخل جس میں حرص شامل ہو۔ ۴۸۳، ۶۶۷
شواظ : بغیر دھوئیں والے آگ کے شعلے ۲۴۶
شہداء : مادّہ 'شہود' شہید کی جمع، ایسا حضور
جس کے ساتھ مشاہدہ وابستہ ہو۔ ۳۷۶

(ص)

صف : کسی چیز کو خطِ مستقیم میں قرار دینا۔
(یہاں اسم فاعل) ۵۵۳

(ط)

طرف : (بروزنِ حرف) پلک ۲۶۰
طغٰی : مادّہ 'طغیان' حد سے تجاوز کرنا ۹۴
طلح : سبز رنگ کا خوشبودار درخت ۲۹۳
طور : پہاڑ، الطور سے وہ پہاڑ مراد ہے جہاں
موسیٰؑ کو وحی کی گئی تھی۔ ۳۱
طیّبہ : طیّب کے معنی ایسی چیز جس سے
ظاہری و باطنی حواس لذّت حاصل کریں ۵۷۴

(ع)

عاقبتم : مادّہ 'معاقبہ' (بروزنِ کدر)
پاؤں کی ایڑی۔ ۵۳۷
عبقری : بے نظیر و بے مثال شے ۲۷۰

عُرباً: عرب کی جمع، عروبہ (بروزنِ ضرورہ) صرف شوہر کو چاہنے والی خوش گفتار عورت۔ ۲۹۵
عسٰی: کسی چیز کے پورا ہونے کی اُمید ۵۲۷
عصف: (بروزنِ اسپ) پتّوں اور گھاس کے اجزاء ۲۲۲
عصم: عصمت کی جمع، منع کرنا ۲۳۰
عقر: مادّہ 'عُقر' بنیاد، جڑ ۱۸۷
عیون: عین کی جمع۔ آنکھ ۱۷۳

(غ)

غابن: سبقت کرنے والا ۶۵۴
غداً: کل، یہاں مراد قیامت یا مستقبل قریب ۱۸۵، ۱۸۶
غرور: مادّہ 'غر' (بروزنِ حر) کسی چیز کا ظاہر اثر ۳۷۸
غویٰ: غی، ایسی حالت جو اعتقادِ فاسد کے ساتھ ہو ۸۰

(ف)

فاکھین: مادّہ 'فکہ' (بروزنِ نظر) ہنسی خوشی ۴۱
فتنہ: آزمائش، امتحان، سونا پگھلانے اور صاف کرنے والی کٹھالی۔ ۱۸۶
فتنتم: مادہ فتنہ، کئی معنی ہیں خصوصاً گمراہی شرک، بُت پرستی ۳۶۵
فخّار: مادّہ 'فخر' بہت زیادہ فخر کرنے والا، کوزہ، ٹھیکری۔ ۲۲۶
فخور: صیغہ مبالغہ، مادّہ 'فخر' دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ فخر کرنے والا۔ ۳۸۷

(ق)

قریٰ: قریہ کی جمع۔ بستی ۴۹۰
قفینا: مادّہ 'قفا' پشت، اسی سے قافیہ بنا ۳۹۶

(ک)

کاس: شراب سے بھرا ہوا پیالہ ۴۹
کاھن: اسرارِ غیبی کی خبر دینے والا ۵۵
کبتوا: مادّہ 'کبت' (بروزنِ ثبت) ایسا مانع جو ذلیل بھی کرتا ہو۔ ۴۲۲
کریم: مادّہ 'کرامت' فائدہ ۲۹۹
کسف: (بروزنِ فسق) کسی چیز کا ٹکڑا، جزو ۶۹
کفل: (بروزنِ طفل) وہ حصہ جو انسان کی حاجت کو پورا کر دے۔ ۴۰۶
کوافر: کافرہ کی جمع ۵۳۶
کید: (بروزن صید) چارہ جوئی ۶۶

(ل)

لمم: (بروزنِ قلم) مادّہ 'المام' گناہ سے قریب ہونا (بلا ارتکاب) ۱۲۱
لم یطمثھن: مادّہ 'طمث' ماہواری خون ۲۶۰

لووا : مادہ 'لی' رسی کو بل دینا، مُنہ پھیرنا، سرہلانا ۶۲۸
لینۃ : مادہ 'لون'، اعلیٰ قسم کی کھجور کا درخت ۴۶۸

(م)

مارج : مادہ 'مرج' (بروزنِ مرض) اختلاط و آمیزش، چراگاہ۔ ۲۲۶
ماویٰ : مقامِ ملاقات ۹۳
متصدع : مادہ 'صدع'، سخت و محکم اشیاء میں شیشہ اور پتھر کی طرح شگاف پڑنا۔
(صداع : دردِ سر) ۵۰۳
مترفین : مترف۔ مادہ 'ترف' (بروزنِ سبب) عیش و عشرت کے باعث نافرمانی ۲۹۹
مثقلہ : مادہ 'اثقال' تحمیل، مشقت ۶۵
محتضر : مادہ 'حضور'، مقررہ وقت ۱۸۶
محتظر : مادہ 'حظر' (بروزنِ مغز) منع کرنا بھیڑ بکریوں کا باڑہ۔ ۱۹۲
محصنہ : مادہ 'حصن' قلعہ ۴۹۰
مختال : مادہ 'خیال' متکبر ۳۸۷
مخضود : مادہ 'خضد' (بروزن مجد) کانٹوں کو کاٹنا۔ ۲۹۳
مخلدون : یہ تعبیر اس لیے ہے کہ تمام اہلِ بہشت جاودانی ہیں۔ ۲۸۷
مدھامتان : مادہ 'ادھیام' معنی دھمہ کی جڑ ہے۔ سیاہی اور رات کی تاریکی۔ ۲۶۵

مدھنون : مادہ 'دھن' روغن، تیل، نرمی سے پیش آنا۔ ۳۲۲
مدینین : مادہ 'دین' مدین کی جمع، معنی جزا ۳۲۸
مرج : (بروزن فلج) خلط ملط کرنا، بھیجنا، چھوڑنا ۲۳۰
مرجان : ایک دریائی جانور جو درخت کی شاخ کے مشابہ ہوتا ہے، عموماً سفید رنگ، مختلف رنگوں میں بھی ہوتا ہے۔ ۲۶۰
مرجئہ : مادہ 'ارجا'، تاخیر میں ڈالنا ۲۰۵
مرصوص : مادہ 'رصاص' سیسہ، سیسہ پلائی ہوئی پختہ عمارت ۵۵۳
مرہ : لپٹی ہوئی رسی کے بل۔ قدرت، توانائی مادی و معنوی استحکام ۸۴
مستطر : مادہ 'سطر'، صف، صف بستہ ۲۰۲
مسجور : بھڑکنے والا، پُر، کناروں تک بھرا ہوا ۳۲
مسکوب : مادہ 'سکب' (بروزن کپک) ماء مسکوب، آبشار ۲۹۴
مشأمہ : شوم سے مشتق ہے، بدبختی، ناراحتی، بے نوا گروہ۔ ۲۸۲
مشفقین : مادہ 'شفق'، خوف سے ملی ہوئی توجہ ۵۱
مصفوفہ : مادہ 'صف'، ساتھ ساتھ قطاروں میں بچھے ہوئے تخت۔ ۴۲
مصیطرون : مادہ 'سطر'، مسیطر وہ شخص جو کسی کام پر غلبہ رکھتا ہو۔ ۶۳، ۶۴

معشر: عُشر سے بنا ہے۔ دس، مراد گروہ ۲۴۵
معین: مادّہ 'معن' (بروزنِ صحن) جاری رہنا ۲۸۷
مغبون: ہار جانے والا ۶۵۴
مغرمون: مادّہ 'غرامت'، زیادہ نقصان اٹھانا ۳۱۲
مقت: اس شخص کے لیے بُغض شدید کے معنی میں
ہے جس نے کوئی قبیح کام کیا ہو۔ ۵۵۱
مقوین: مادّہ 'قوی' (بروزنِ کتاب)۔ خشک و
خالی بیابان۔ ۳۱۶
منافق: مادّہ 'نفق' (بروزنِ نفخ) پیش روی،
نفوذ۔ 'نفق' (بروزنِ شفق) کھال، نقب
زیرِ زمین، 'نافقا' پوشیدہ سوراخ۔ ۶۱۹
منبثاً: پراگندہ و منتشر ۲۸۱
منتصر: مادّہ 'انتصار' انتقام لینا، کامیاب ہونا ۱۹۷
منشآت: منشأ کی جمع۔ ایجاد کرنا ۲۳۲
منشور: پھیلا ہوا، درخشندہ ۳۲
منضود: مادّہ 'نضد' تہ بہ تہ کرنا ۲۹۴
منقعر: مادّہ 'قعر' گہرائی کا آخری نقطہ، مراد جڑ یا
جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ۱۷۷
ممنون: مادّہ 'من'، نقصان، قطع و برید کرنا ۵۵
منھمر: مادّہ 'ھمر' (بروزنِ صبر) شدت سے
آنسو بہنا، پانی برسنا، تھن سے آخری قطرہ
تک دُوہ لینا۔ ۱۶۲
موتفکہ: زیر و زبر شدہ شہر، مراد شہر بصرہ ۱۴۷
مور: (بروزنِ قول) تیزی سے رواں دواں ۳۶
مھطعین: مادّہ 'اھطاع' گردن اٹھا کر دیکھنا ۱۶۸
مھیمن: مادّہ 'ھمن'، نگہبان، سکون و اطمینان ۵۰۴
میراث: کسی معاہدہ والے انسان کو ملنے والا مال ۲۵۵
میقات: مادّہ 'وقت'، مراد قیامت ۳۰۱
میمنہ: یُمن سے مشتق، سعادت و خوش بختی ۲۸۲

(ن)

نجم: ستارہ، بغیر تنے کی گھاس ۲۱۶
نحاس و نحس: دُھواں، سُرخ شعلوں اور
دُھویں سے بھرپور آگ ۱۹۷، ۲۴۶
نُذُر: نذیر کی جمع، ڈرانے والی چیز ۱۶۶
نزل: جن اشیاء سے مہمان کی پذیرائی کی
جاتی ہے۔ ۳۰۴
نشأۃ الأُخریٰ: نشأۃ آخرین اور تربیت،
مراد قیامت۔ ۱۴۰
نضاختان: مادّہ 'نضخ'، پانی اُبل کر نکلنا ۲۶۵
نکر: مادّہ 'نکارہ' غیر معروف اور وحشت ناک چیز ۱۶۷
نواصی: مادّہ 'نصا'، ناصیہ کی جمع، سر کے
اگلے بال۔ ۲۵۱
نودی: مادّہ 'ندا'، پکارنا، اذان ۶۰۱

(و)

وازرہ : مادّہ 'وزر' (بروزن قطر) پہاڑی پناہ گاہ بھاری پتھر، گناہ ۱۴۰
وبال : مادّہ 'وابل' سخت بارش جس کے نقصان سے انسان خائف ہو۔ وبال ۶۴۹
وردہ : ورد کے پھول، مُراد سرخ رنگ ۲۵۰
وَلَہٗ : خدا کے لیے ۲۳۲

(ھ)

ھباء : ہوا میں معلّق رہنے والا بہت باریک غبار ۲۸۱
ھشیم : مادّہ 'ہشم' کسی چیز کو توڑنا، پامال یا کتری ہوئی گھاس۔ ۱۸۷
ھیم : (بروزنِ میم) ہائم کی جمع۔ اُونٹوں کی پیاس کی بیماری۔ ۳۰۳

(ی)

یأن : انیٰ، نزدیک ہونا، کسی کے حضور حاضر ہونا ۳۷۰
یتنازعون : مادّہ 'تنازعہ' کھینچا تانی، ایک دوسرے سے لینا۔ ۴۸
یحادون : مادّہ 'محادہ' لوہے کے ساتھ مسلح ہوکر لڑنا۔ ۴۲۲
یحموم : حمیم سے ماخوذ، بہت گرم ۲۹۹
یسعیٰ : مادّہ سعی، تیزی سے چلنا ۳۶۳
یصدعون : مادّہ صداع، (بروزنِ حباب) دردِ سر ۲۸۸
یصدون : منع کرنا، اعراض کرنا ۶۲۸
یصعقون : مادّہ صعق واصعاق، صاعقہ مار ڈالنا ۷۰
یطوف : مادّہ طواف، چکر لگانا ۲۸۷
یوق : مادّہ وقایہ، جس شخص کو اللہ عیب سے محفوظ رکھے۔ ۴۸۳
یولج : اُیلاج ولوج، داخل ہونا، نفوذ کرنا ۳۴۹
یوم تغابن : غبنوں کے ظہور کا دن، قیامت کا ایک نام۔ ۶۵۵
یھیج : مادّہ ھیجان، گھاس کا خشک ہونا، حرکت میں آنا۔ ۳۷۸

متفرق موضوعات

آپ ہماری مکمل حفاظت میں ہیں

اگر یہ عذاب کا کوئی پتھر آسمان سے گرتا دیکھیں تو یقین نہ کریں، ان کے حال پر چھوڑ دیے، انہیں یہاں بھی عذاب ہوگا۔ صبر سے کام لیجیے، حمد و تسبیح کیجیے۔ ۶۹،۶۸

آدابِ مجلس

سلام کرنا، نواردوں کو جگہ دینا، اہلِ فضیلت کا احترام کرنا۔ ۴۳۷

آسمان کو بلند کیا، ہر چیز کے لیے میزان قرار دی

آسمان سے وحی، بارش اور دوسری نعمات کا نزول اور میزان وضع کی۔ ۲۱۹، ۲۲۰

آیاتِ اسمِ اعظم

اللہ کی صفاتِ ذات اور صفاتِ اعمال چھ آیات میں بیان ہوئیں۔ اسمائے اعظم کی نشانیاں۔ ۳۵۰

ابدی نمونے

عمل مؤثر ترین نمونہ ہے، جو بات دل سے نکلتی ہے، دلوں پر لازمی اثر کرتی ہے۔ ۵۲۴

ابراہیمؑ تم سب کے لیے نمونہ تھے

ابراہیمؑ نے اپنی مشرک قوم سے کہا کہ میں تم سے اور تمہارے خداؤں سے بیزار ہوں۔ ہمیشہ کی جدائی، یہاں تک کہ تم ایمان نہ لے آؤ۔ ۵۱۹، ۵۲۰

اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ

یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ اپنے بیوی بچوں کی تربیت کرو تاکہ وہ راہِ مستقیم اختیار کریں۔ ۵۳۵

اس کے مانند کلام لے آئیں

اے رسولؐ! نصیحت کرتے رہو، کہو انتظار کرو، مَیں بھی انتظار کرتا ہوں۔ اُن کی عقلیں ان کاموں کا حکم دیتی ہیں؛ سچے ہیں تو ایسا کلام لے آئیں۔ ۵۳ تا ۵۹

اصحاب الشمال

نامۂ عمل بائیں ہاتھ میں، گرم ہوا، اُبلتا ہوا پانی، آگ، دُھواں، دنیا میں مست و مغرور تھے، اگلے پچھلے سب جمع کر دیے جائیں گے۔ ۲۹۸ تا ۳۰۱

اصحاب المشئمہ

بدبخت، بیچارہ اور بے نوا گروہ ۲۸۲

اصحاب المیمنہ

جن کے اعمال نامے دائیں ہاتھ میں دیے جائینگے ۲۸۲

اصحاب الیمین

بیری و طلح کا سایہ، آبشار، بے شمار پھل، بہترین ساتھی (شوہر، بیویاں) ایک گروہ پہلی اُمتوں سے اور ایک آخری اُمت سے ہے۔ ۲۹۱، ۲۹۲

اصحاب النار و اصحاب الجنّتہ

یہ برابر نہیں ہیں، نہ اس دنیا میں نہ قیامت میں، نہ بعد از قیامت، اصحاب جنّت ایک کامیاب گروہ ہے۔ ۴۹۷

اعمال نامہ

ہائے افسوس! یہ کیسا نامۂ عمل ہے، چھوٹا بڑا کوئی کام ایسا نہیں جو اس میں درج نہ ہو۔ ۱۶۸

انفاقِ دررِاہِ خدا

اللہ پر ایمان لانے اور راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کی جزا انسان کی عظیم کامیابی ہے۔ ۳۵۲، ۳۵۴

جہاد کے لیے مدد کرنا، حاجت مندوں کی حاجت روائی، بعض انفاق قرض حسنہ شمار ہوا۔ مال کے بہترین حصّے، دس شرطیں۔ ۳۵۸، ۳۵۹

اہلِ نفاق کے اعمال میں بے مقصد شرکت

منافقین بہکاتے ہیں، مدد کا وعدہ کرتے ہیں، مگر مشکل کے وقت الگ ہوجاتے ہیں۔ ۴۹۷، ۴۹۸

ایامِ نحس و سعد

قرآن کی رُو سے شبِ قدر مبارک ہے۔ نحس پر نحاس دلیل ہے۔ مہینہ کا آخری بدھ، قابیل، ہابیل اور قوم عاد کی تباہی کے سبب نحس ہے۔ ۱۷۸ تا ۱۸۱

ایسا جانور جس پر کتابیں لدی ہوں

جو لوگ کتاب پڑھ کر اس پر عمل نہ کریں ان کی زندگی گدھے پر کتابیں لادنے کی مثال ہے ۵۹۱

بشارت اور تکمیلِ دین کا ربط

سورۂ اعراف کی آیت ۵۶ سے حضرت عیسیٰؑ کی بشارت واضح ہے۔ ۵۶۰

بشارتِ عیسیٰؑ

میں تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور ایک آنے والے نبی کے ظہور کی بشارت دیتا ہوں۔ ۵۵۸، ۵۵۹

بعثتِ انبیاؑ کا مقصد

ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا۔ ۳۸۹

بعثتِ پیغمبرِ اسلامؐ کا مقصد

تلاوتِ آیات، تہذیب و تزکیۂ نفس، کتاب و حکمت کی تعلیم ۵۸۴ تا ۵۸۹

بنیادی اصل

حُب فی اللہ و بغض فی اللہ ۵۲۶

بغیر جنگ حاصل شدہ اموال کا حکم

جس کے لیے نہ گھوڑے دوڑائے نہ اُونٹ، اس مال میں مجاہدین کا حصّہ نہیں ۔ یہ اللہ نے صرف اپنے رسُولؐ کو دیا ہے۔ ۴۷۲ تا ۴۷۵

بہر طور ہمیشہ اس کی قدرت آشکار ہے

زمین و آسمان کو چھ ادوار میں بنایا، پھر ان کا انتظام سنبھالا۔ ۳۴۶ تا ۳۴۹

بھڑکتے ہوئے سمندر کی قسم عذاب واقع ہو کر رہے گا

طور کی قسم، کتاب، بیت المعمور، بلند چھت اور بھڑکتے سمندر کی قسم عذاب واقع ہو گا جس میں کوئی رکاوٹ نہ ہو گی ۔ ۳۱ تا ۳۴

بیعتِ مستورات کا ان کی اسلامی شخصیّت کے ساتھ ربط

شرائطِ بیعت نے عورت کی انسانی حیثیت کو بیدار کر دیا۔ ۵۲۸

بیعتِ مستورات کی شرائط

شرک، چوری، زنا، قتلِ اولاد، بہتان و افتراء اور مخالفتِ رسُولؐ نہ کرنا۔ ۵۴۰، ۵۴۱

پانی اور آگ کس کی طرف سے ہیں

پانی ہم نے برسایا یا تم نے، آگ کا درخت ہم نے اگایا یا تم نے ! ۳۱۳

پریشانیوں پر غلبہ کی راہ

صبر، تذکر، علامہ شوستری کا واقعہ۔ ۶۳۹، ۶۴۰

پھلوں کی قدر و قیمت

کھجور، انگور اور سید الفاکہہ انار کے فوائد و خصوصیات۔ ۲۶۶

تغابن، غبنوں کا آشکار ہونا

قیامت میں دوبارہ اٹھنا، جنّت و دوزخ کے مناظر، فیصلہ کا دن۔ ۶۵۲ تا ۶۵۶

تقدیرِ الٰہی اور اس کے ارادہ کی آزادی

ہمارے اعمال بھی اللہ کی مخلوق ہیں، لیکن اعمال پر ہمیں اختیار و آزادی عطا فرمائی ہے ۔ ۲۰۴

تقویٰ اور دور رس نگاہوں کا رابطہ

اگر ایمان لے آؤ، تقویٰ اختیار کرو اور گناہوں سے بچو تو اللہ اسے حق و باطل میں امتیاز قرار دے گا۔ ۴۰۷، ۴۰۸

تمام چیزیں تابع حکمت ہیں

ہم نے ہر چیز کو مقدار پر خلق فرمایا ہے۔ ۲۰۳

تمام مصائب اسی کے فرمان سے ہیں

کوئی مصیبت رونما نہیں ہوتی مگر اللہ کے اذن سے، اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ ۶۵۷

تمہاری جزا صرف تمہارے اعمال ہیں

آسمان کا شدّت سے ہلنا، پہاڑ متحرک ہوں گے، تکذیب کرنے والوں پر وائے۔ جو باطل میں مشغول ہیں انہیں جہنّم میں دھکیلا جائے گا، اعمال کی سزا ملے گی۔ ۳۵ تا ۳۹

تمہارے مال و اولاد تمہیں یادِ خدا سے غافل نہ کردیں

ہم نے جو روزی تمہیں دی ہے اس میں سے راہ خدا میں خرچ کرو۔ ۶۳۶ تا ۶۳۹

تمہارے مال و اولاد ذریعۂ آزمائش ہیں

تمہاری اولاد و ازواج و مال میں بعض تمہارے دشمن ہیں جو ہجرت سے روکتے ہیں، یہ تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں۔ ۶۶۳

جب جان حلق میں آجائے گی

جانکنی کی حالت میں تم زندگی کو واپس نہیں لوٹا سکو گے، دیکھتے ہی رہ جاؤ گے، تمہاری نسبت ہم اس سے زیادہ قریب ہیں۔ ۳۲۵، ۳۲۹

جنّت کی بیویوں کا دوسری بار ذکر

مخصوص خوبیاں (خوش بیان، پاکیزہ، حُسنِ صورت، حُسنِ سیرت، خیراتٌ حسان) ۲۶۹

جنّت کی بے شمار نعمات مقرّبین کے لیے

پاکیزہ شراب کے جام، پرندوں کا گوشت، حورالعین بیویاں، نوجوان خادم، گفتگو میں سلام ہی سلام۔ ۲۸۶

جو لوگ اللہ سے دشمنی کرتے ہیں

جو لوگ اللہ اور رسولؐ سے دشمنی کرتے ہیں وہ ذلیل ہوں گے۔ ۴۲۱ تا ۴۲۴

چاند سورج کی حرکات

چاند، سورج کے ادوار کا انسانی زندگی پر اثر، موسم، رات، دن، ماہ و سال وغیرہ ۲۱۶

چاند شق ہو گیا

خدائے بزرگ و برتر کی قدرت، پیغمبر گرامیؐ کا عظیم معجزہ، تاریخی اعتبار سے شق ہونے کے اسباب۔ ۱۵۷، ۱۶۰، ۱۶۳

حُب فی اللہ، بغض فی اللہ کا اجر

اللہ کی راہ میں محبت اور اللہ کے لیے دشمنی کرنے کے تین اجر اس دُنیا میں اور دو قیامت میں ملیں گے۔ ۴۵۶، ۴۵۷

حرکتِ جوہری

حرکتِ جوہری کے طرفداروں کا قرآن سے استدلال ۲۴۱، ۲۴۲

حزب اللہ اور حزب الشیطان کی نشانیاں

اللہ کے اطاعت گزاروں سے دوستی اور اس کے نافرمانوں سے دشمنی۔ ۴۵۵، ۴۵۶

حزب اللہ کامیاب ہے

اللہ کے گروہ کی کامیابی، اقوام نوح، عاد، ثمود، لُوط کو برباد کرنے والے طوفان اور زلزلے، فتح مکہ، اسلام کی کامیابی، عبداللہ ابن اُبی کا واقعہ ۴۵۱، ۴۵۴

حواریوں کی طرح ہو جاؤ

رسُولؐ کی نصرت میں جہاد کرو، کامیاب و غالب ہو گے جیسے عیسٰیؑ کے حواری تھے۔ ۵۷۴ تا ۵۷۶

حواریّین کون ہیں

حضرت عیسٰیؑ کے بارہ جان نثار ساتھی ۵۷۸

خدا سب سے بے نیاز ہے

علیم و خبیر و غنی و حمید ہے ۵۲۵

خدا کے حصّہ کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہو

لات و عزّیٰ و منات کیا خدا کی بیٹیاں ہیں؛ تم نے اپنے لیے بیٹے پسند کیے، تمہاری یہ تقسیم غلط ہے۔ تم تو بیٹیوں کو زندہ درگور کرتے ہو۔ ۱۰۵، ۱۰۶

خدا کا سلام کون سا ہے

'السلام علیکم' اسلام کا سلام ہے ۴۳۲

خدا کا پوشیدہ لشکر

اللہ والوں کو اللہ پر بھروسہ ہوتا ہے، اس کے لشکر پوشیدہ طور پر مدد کرتے ہیں۔ جنگِ بدر اور بنی نضیر کے واقعات۔ ۴۶۹

خدا کی صفات میں اجتماعِ اضداد

اوّل و آخر، ظاہر و باطن، حیٌّ لایموت متضاد صفات ہیں جو اللہ کی ذات میں موجود ہیں ۴۴۲

خدا اور رسولؐ کے دشمن

ذلیل ترین افراد ہیں جو خدا اور اس کے رسولؐ کے دشمن ہیں۔ ۴۵۰

خودستائی نہ کرو، خدا تمہیں خوب پہچانتا ہے

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ کے لیے ہے تاکہ بدوں کو سزا، نیکوں کو جزا دے۔ جو کبائر سے بچتے ہیں، اللہ جانتا ہے۔ خودستائی نہ کرو، اللہ علیم ہے۔ ۱۲۰ تا ۱۲۴

دُشمن کے لیے بھی عدالت

مسلمان اور کافر عورتوں کے مہر کا تبادلہ ۵۳۷

دُنیا متاعِ غرور کے سوا کچھ نہیں

جو لوگ اللہ اور رسولؐ پر ایمان لائے، وہ صدیقین و شہدا ہیں۔ دنیوی زندگی کھیل کود، تجمل پرستی اور تفاخر ہے۔ ۳۷۶ تا ۳۷۹

دنیاوی زندگی مختلف اسباب و علل کا مجموعہ ہے

قرآن پاک نے لہو و لعب، زینت و تفاخر و تکاثر اور متاعِ قلیل کو اسبابِ زندگی بتایا ہے۔ ۳۸۰

دوسرا دیدار

دوبارہ مشاہدہ کیا، سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک جنت الماویٰ۔ وہاں نور ہی نور تھا۔ اس نے اپنے ربّ کی چند نشانیاں دیکھیں۔ ۹۲ تا ۹۵

دونوں جنتیں اللہ سے ڈرنے والوں کی منتظر ہیں

جو لوگ اللہ کے مراتب سے خائف ہیں، ان کے لیے دُہری جنتیں ہیں، پاکیزہ میوے اور آرام کی جگہ ہے۔ ۲۵۴ تا ۲۶۰

ذی الجلال والاکرام کے نکات

جو کچھ بھی ہے سب اسی کی طرف سے ہے۔ ۲۷۲

رہبانیت

ان کی اختراع ہے، ہم نے مقرر نہیں کی۔ وہ خوشنودیٔ خدا چاہتے تھے، حق کی اعانت نہیں کی۔ دینِ مسیحؑ میں خرابیاں کردیں۔ ۳۹۷

موجودہ رہبانیت قرن اول میں نہ تھی۔ تیسری صدی میں اس کی ابتدا ہوئی جب عیسائیوں نے امراطور (خونخوار) سے شکست کھائی اور جنگلوں میں پناہ لی۔ ۴۰۰

رہبانیت کے باعث اجتماعی و اخلاقی فساد پیدا ہوئے۔ کاہلی، بے دینی اور اخلاقی انحطاط ہوا۔ ۴۰۱، ۴۰۲

زمین بطور ایک نعمت

زمین کا مدار ارضی و مدار محوری، دن رات کا ہونا اور موسم نعمات ہیں۔ ۲۲۱

زندگی ایک نظم و حساب

خود ہماری زندگی ایک عظیم نظم و حساب پر قائم ہے۔ ۲۲۳، ۲۲۴

زندگی کی عمدہ ضروریات لوہے سے متعلق ہیں

زراعت، صنعت، مسکن، حکومت سب میں لوہا ایک بنیادی ضرورت ہے۔ ۴۹۱، ۴۹۲

سب ثمر و صدا اسی کی طرف سے ہے

آسمان کے درخشندہ ستارے اسی کے فرمان و ربوبیت سے چمکتے ہیں۔ ستارہ شعری کے عجائبات وغیرہ ۱۴۱ تا ۱۴۳

سچ بتاؤ تمہاری صحیح بات کون سی ہے

کیا وہ خود بخود پیدا ہوگئے؛ کیا غلبہ و تسلط رکھتے ہیں؛ کیا اسرار وحی کو سنتے ہیں؛ خدا کی لڑکیاں! اور تمہارے لڑکے؛ اللہ شرک سے منزہ ہے۔ ۶۱ تا ۶۷

سحر مستمر

کفار جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں یہ سحر مستمر ہے۔ ۱۵۷، ۱۵۸

سمندر اور اس کے قیمتی ذخائر

دو سمندر پاس پاس ہیں، ان کے درمیان ایک حجاب ہے۔ ان سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں، کشتیاں چلتی ہیں۔ ۲۳۰

سمندر۔ اللہ کی نعمات کے مراکز

ادویات، موتی، مونگے، مچھلی، خوردنی اور استعمال کی دوسری بے شمار چیزیں۔ ۲۳۲

گلف سٹریم۔ بڑی تیزی سے سمندر میں جاری کچھ لہریں گرم پانی کی اور بعض سرد پانی کی۔ یہ آب و ہوا پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ۲۳۴

شفاعت بھی اُسی کے اذن سے ہوگی

عالم اسباب اس کے ارادہ کے محور پر گردش کر رہا ہے۔ ہر موجود کے پاس جو کچھ ہے، اسی کی برکت سے ہے، شفاعت بھی اُسی کے اذن سے ہوگی۔ ۱۱۱ تا ۱۱۴

شیاطین کا گروہ

اللہ کے مخالف گروہ سے دوستی، اپنے کو چھپانا، قسمیں کھانا، وہ بداعمال ہیں جن کے لیے اللہ کا غضب ہوگا۔ گروہِ شیاطین گھاٹے میں ہے ۴۴۶ تا ۴۴۸

شیطان کے بہکانے سے کنوئیں میں نہ گرو

یہ انسان کو کافر بنا کر تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ کہتا ہے تم سے بیزار ہوں اور اللہ سے ڈرتا ہوں۔ واقعات بنی نضیر و بنی قینقاع۔ ۴۹۳ تا ۴۹۶

صحابہ قرآن و تاریخ کی میزان میں

مہاجرین، انصار، تابعین کے جو اوصاف قرآن میں آئے ہیں، تمام صحابہ کے کردار پر منطبق نہیں ہیں، اس لیے سب مرتبہ میں برابر نہیں۔ ۴۸۵، ۴۸۶

صفوں میں وحدت کی ضرورت

صفوں کی درستگی کے لیے نہایت موزوں تعبیر، بنیانِ مرصوص۔ ۵۵۴

ضالّ و مکذبین میدانِ محشر میں

گمراہو! یقیناً زقوم کے درخت سے کھاؤ گے، کھولتا ہوا پانی پیاسے اونٹ کی طرح پیو گے، یہ قیامت میں تمہاری پذیرائی ہے۔ ۳۰۲

ظن و گمان کسی کو حق تک نہیں پہنچاتے

گمان کی پیروی، ہمارے ذکر سے انحراف اتم بھی ان سے منہ موڑ لو جو راہِ خدا سے بھٹک گئے اللہ انہیں اچھی طرح جانتا ہے۔ ۱۱۵ تا ۱۱۹

ظہار

جاہلیت کا عملِ قبیح، اوس بن صامت کا خولہ سے ظہار، رسولِ پاکؐ کا فیصلہ اور کفّارہ کی ادائگی۔ ظہار کے بعض احکام ۴۱۵ تا ۴۲۰

عالِم بے عمل

حصولِ علم میں مشقت اٹھانا برکاتِ علم کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ جس عالم نے علم سے فائدہ نہ اٹھایا اس کی گدھے پر کتابیں لادنے کی مثال ہے۔ ۵۹۵

عزّت اللہ اور اس کے دوستوں کیلیے ہے

عزّت اللہ کے لیے ہے۔ رسولؐ اور مومنین اس کے دوست اور اس کے پرتو کے حامل ہیں۔ ۶۳۴

"عہدین" کی بشارتیں

موجودہ تورات و انجیل میں ایسی بہت سی تعبیریں نظر آتی ہیں جو ایک عظیم ظہور کی بشارت دیتی ہیں۔ ۵۶۱ تا ۵۶۵

غفلت و بے خبری کب تک!

کیا وقت نہیں آیا کہ صاحب ایمان افراد کے دل ذکرِ خدا سے خوف کھائیں؟ ۳۷۰، ۳۷۱

غور و فکر کرنے والوں کی نشانیاں

غور و فکر سے حقائق آشکار ہو جاتے ہیں، اللہ کی ممکنہ معرفت پر عبور ہو جاتا ہے۔ ۳۴۰ تا ۳۴۲

فتحِ قریب کون سی ہے؟

ہر زمانہ میں ہے، اگرچہ مراد فتحِ مکّہ ہے۔ ۵۷۴

فدک کی غم انگیز داستان

رسولِ پاکؐ نے اراضیاتِ فدک جنابِ فاطمہؑ کو ہبہ کر دی تھیں۔ آنحضرتؐ کے بعد یہ جائداد آپؑ سے واپس لے لی گئی۔ ۴۷۷، ۴۷۸

فضلِ خدا از روئے حساب ہے

احادیثِ رسولؐ کی روشنی میں اللہ کے فضل کی از روئے عدل عطا۔ ۵۸۹

فولادی دیوار کی طرح جم کر لڑنے والے

وہ بات کہنا جس پر عمل نہ کرو، موجبِ غضبِ الٰہی ہے۔ سچے مؤمنوں کے گفتار و عمل میں کبھی فرق نہیں ہوتا۔ ۵۵۰، ۵۵۱

قرآن کا حد سے زیادہ نفوذ

سخت ترین دل بھی قرآنی آیات سن کر نرم و اثر پذیر ہو جاتے ہیں۔ ۵۰۷

قرآن میں صدیقین کا ذکر

قرآن نے حضرت ابراہیمؑ و ادریسؑ و جنابِ مریمؑ کو صدیق کہا ہے۔ ۳۷۹

قیامت میں مجرمین کی بے مقصد مدد

مجرم قیامت کو بھی معاملاتِ دُنیا کی طرح خیال کرتے ہوئے مدد کے طلب گار ہوں گے، مگر کوئی کسی کی مدد نہ کر سکے گا۔ ۳۶۶، ۳۶۷

کافر، جو تم سے برسرِ پیکار نہیں ہیں

جن لوگوں (کافروں) نے تمہیں نقصان نہیں پہنچایا، ان سے نیکی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ۵۲۸

کبائر الاثم کیا ہیں

کبیرہ گناہوں کی تعریف، اقسام، اسلام کی روایات میں کبائر کی تعداد مختلف بیان کی گئی ہے۔ ۱۲۵

کُلَّ یومٍ ھو فی شأن

ایک غلام نے تفسیر کی۔ دن رات کا لانا، موت، زندگی، غنی و فقیر۔ ۲۴۱

گروہِ السابقون المقربون

سبقت کرنے والے اور معنوی قربت رکھنے والے افراد۔ ۲۸۲

گفتار بلا عمل

زبان دل کی ترجمان ہے، اگر دونوں میں وحدت نہ ہو تو یہ نفاق ہے۔ ۵۵۴

گنہ گار اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائینگے

سیاہ چہروں سے پہچانے جائیں گے، سر سے پاؤں تک جکڑے ہوئے جہنم میں جھونک دیے جائینگے۔ ۲۴۹ تا ۲۵۲

مجالس میں آنے والوں کا احترام

مجلس میں آنے والوں کو بیٹھنے کی جگہ دو، اللہ تمہارے لیے جنت کو وسیع کرے گا۔ ۴۳۴، ۴۳۵

مجرموں کو دوزخ میں کس طرح لے جائینگے

طوق و زنجیر میں جکڑ کر حقارت و ذلت کے ساتھ ہانکے جائیں گے۔ ۳۸، ۳۹

"مرج البحرین" کی باطنی تفسیر

علیؑ و فاطمہؑ گہرے سمندر ہیں، حسنؑ و حسینؑ لولو و مرجان ہیں۔ (امام جعفر صادقؑ) ۲۳۵

مساکنِ طیّبہ کیا ہیں

قرآن میں رات، گھر، محبّت کرنے والی بیویاں تین چیزیں وجہِ سکون بیان ہوئی ہیں۔ جنّت میں یہ تینوں ہیں۔ ۵۷۴، ۵۷۵

مسلمانوں اور کفّار کے نقصان کی تلافی

جو عورت مسلمان ہو کر آئے یا مسلمان کی کافر بیوی چلی جائے تو مہر و مصارف واپس لے لو یا دے دو۔ ۵۳۳

معراجِ مسلّمہ حقیقت ہے

واقعۂ معراج کو تمام علماء نے قبول کیا ہے، البتّہ بعض نے اسے صرف روحانی اور خواب کی کیفیت سمجھا ہے۔ ۹۵ تا ۹۷

مغضوب علیہ قوم سے دوستی نہ کرو

جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا، ان میں کفّار و مشرکین کے علاوہ منافقین بھی شامل ہیں۔ ۵۴۳ تا ۵۴۵

مقربینِ بارگاہ

قربِ مقامی جن کے لیے بہشت کی مادّی و معنوی سبب نعمات ہیں۔ ۲۸۳

منافق بے اخلاص

ہٹ دھرمی کرتے ہوئے اکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ ٹوٹ کر بے بس ہو جاتا ہے۔ ۶۳۴

منافق کی دس نشانیاں

جھوٹ، قسمیں کھانا، باطن خالی، بے ہودگی، حق کا مذاق اڑانا، فسق و گناہ وغیرہ۔ ۶۳۱

منافق سے خطرہ

معاشرہ میں شامل ہو کر ہر طرح کا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ۶۲۳

منافقین

اہلِ کتاب کافروں سے کہتے ہیں کہ جب تمہیں مسلمان جلاوطن کریں گے تو ہم تمہارے ساتھ ہوں گے، جنگ میں مدد کریں گے، لیکن یہ جھوٹے ہیں۔ ۴۸۷

یہودیوں کی فتنہ انگیزی میں منافقین کی شرکت، آپس میں لڑیں تو جنگجو ثابت ہوں مسلمانوں کے مقابلہ میں وحشت سے قلعوں میں پناہ لیتے ہیں ۴۸۸ تا ۴۹۱

موت کا خوف

فنا کے بعد کی زندگی پر یقین نہ ہونا یا اعمالِ قبیحہ کی بناء پر خوف ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو موت رحمت ہی رحمت ہے۔ ۵۹۷، ۵۹۸

مومنین اپنے نور سے استفادہ کریں گے

ایمان و عملِ صالح کے انوار مجسم ہو کر قیامت میں مؤمنین کی رہنمائی کریں گے۔ ہر مومن کے ایمان کا درجہ الگ ہوگا۔ ۴۶۱ تا ۴۶۴

مہاجرین، انصار، تابعین کے نمایاں اوصاف

گھروں سے نکالے ہوئے مہاجر جو خدا اور رسولؐ کے مددگار ہیں، ان کی مدد کرنے والے انصار، اور بعد میں آنے والے تابعین ہیں۔ ۴۸۰ تا ۴۸۵

میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ

جو شخص ایسا کام کرے گا وہ راہِ راست سے ہٹ گیا۔ ۵۱۵، ۵۱۶

نجویٰ

یہودی اللہ اور رسولؐ کی مخالفت میں سرگوشی کرتے تھے، مومنین کو اس سے منع کیا۔ ۴۲۹، ۴۳۰

مومنین کو رنجیدہ کرنے والا نجویٰ شیطانی ہے،
علیحدہ ہو کر سرگوشی کرنا بداعتمادی پیدا کرتا ہے وغیرہ ۴۳۱
رسُولِ پاکؐ سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ دیا
کرو۔ کیا ڈر گئے کہ فقیر ہو جاؤ گے ؟ ۴۳۸ تا ۴۴۰
نجویٰ سے متعلق اہم نکات ۴۴۱ تا ۴۴۳

نعمتوں کی شناخت

نعماتِ دُنیا سے خالق کی معرفت حاصل کرنا
معرفتِ الٰہی کا زینہ ہے۔ ۲۲۳

نفاقِ اعتقادی وعملی

منافق کی تین نشانیاں، جُھوٹا، خائن اور وعدہ خلاف
(ارشادِ رسُولِ پاکؐ) ۶۴۰

نفاق کا سرچشمہ اور علامات

جھوٹی قسمیں کھانا، چکنی چپڑی باتیں بنانا، اپنے سایہ
تک سے خائف رہنا، کبر و نخوت ۶۱۷، ۶۲۸

نفع بخش وبے مثال تجارت

ایمان والو! جہاد عذاب سے نجات دینے والا ہے۔
اللہ اور رسُولؐ پر ایمان لے آؤ، راہِ الٰہی میں جان و
مال سے جہاد کرو، اللہ گناہ بخش دے گا، جنت
میں داخل فرمائے گا، پسندیدہ نعمت اور فتحِ
مبین عطا فرمائے گا۔ ۵۷۰ تا ۵۷۳

نمازِ جمعہ اسلام میں پہلی مرتبہ

ہجرت سے پہلے اسعد بن زرارہ کی اقتداء میں
نمازِ یوم عروبہ ہوئی۔ رسُولِ پاکؐ کا مدینہ میں
آنا، مسجد قبا کی بنیاد، نمازِ جمعہ بنی سالم میں ادا
فرمائی، نماز کے بعد خطبہ دیا، نمازِ جمعہ کی اہمیت ۶۰۴، ۶۰۵

نمازِ جمعہ کا فلسفہ

ایک عظیم اجتماعی عبادت، دو خطبے، مواعظ،
پند و نصائح اور پرہیزگاری کا حکم، ایک
سیاسی کانفرنس۔ ۶۰۶

نمازِ جمعہ کے آداب اور خطبات کے مضامین ومطالب

نماز کی شرائط، طریق کار، خطبہ میں اللہ کی
حمد و ثنا، دُرود، خوفِ خدا اور تقویٰ کی وصیت ۶۰۹، ۶۱۰

نمازِ جمعہ کی شرائطِ وجوب

امام جماعت کی طرح، امام جمعہ کا عادل ہونا،
بعض کے نزدیک نمازِ جمعہ امام معصوم کے
زمانۂ حضور کے ساتھ مربوط ہے۔ ۶۱۱

نیکوکاروں اور بدکاروں کا انجام

اگر محتضر نیکوکار ہے تو اس وقت راحت و آرام میں ہوگا۔ اگر گمراہ اور جھوٹا ہے تو دوزخ کے گرم پانی سے تواضع ہوگی۔ ۳۲۱ تا ۳۲۴

نیکی اور اس کی جزا

نیکی کا بدلہ اس سے بہتر نیکی سے کرو۔ (رسولِ پاکؐ و ائمہؑ) ۲۶۲ تا ۲۶۴

واقفِ اسرار القلوب

اس نے تمہاری بہترین صورت بنائی، زمین و آسمان کی ہر شے سے واقف، تمہارے پنہاں و آشکار سے باخبر۔ ۶۴۸

وسیع و عریض جنّت کی طرف سبقت کرو

اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا، تائب ہونا، گناہ سے پاک ہونا شرائط کے ساتھ، مصائب غافلوں کے لیے ہوشیار رہو کی آواز ہیں۔ ۳۸۲ تا ۳۸۸

وہ اور نُورِ خدا

اللہ پر جھوٹ باندھنا بڑا ظلم ہے، اسلام کی دعوت دی جا رہی ہے، نُورِ خدا پھونکوں سے نہ بُجھے گا۔ اللہ کا دین غالب ہوگا۔ ۵۶۶ تا ۵۶۹

وہ گنہ گار افراد جنہوں نے آیات کو سُن کر توبہ کی

کیا وقت نہیں آیا کہ ایماندار دل اللہ کے ذکر سے خوف کھائیں اور ان افراد کی طرح نہ ہوں جنہوں نے آیات کو سُنا مگر ان کے دل قساوت پر مائل رہے۔ ۳۷۲ تا ۳۷۴

وہ ہر روز نئی چیز خلقت فرماتا ہے

حضرت ابوذرؓ کو رخصت کرتے وقت حضرت امام حسنؑ و حسینؑ کو جناب امیرؑ کی وصیتیں ۲۴۰

ہر شخص اپنے اعمال کا ذمّہ دار ہے

وہ شخص جس نے اسلام سے منہ پھیر لیا، یہ جان کر کہ کوئی دوسرا کسی کے گناہوں کا بوجھ اٹھا سکتا ہے اور دیگر نکات کی بحث۔ ۱۲۸، ۱۳۶

ہندہ کی بیعت

رسولِ اکرمؐ کا شرائطِ بیعت بیان فرمانا اور ہندہ کے اعتراضات و جوابات ۵۴۲

یہ درس عبرت کے لیے کافی نہیں؟

عاد، ثمود اور قومِ لوطؑ کی سنگین عذاب کے ساتھ تباہی اور قومِ نوحؑ کی تباہی، وہ سب سے زیادہ ظالم تھے۔ تو اپنے پروردگار کی کون سی نعمت میں شکست دیکھتا ہے۔ ۱۴۵ تا ۱۴۸

یہود

بنی نضیر کی عہد شکنی، کعب بن اشرف کا قتل، جلا وطنی، مدینہ سے سازش کا خاتمہ ہوگا۔ ۴۶۴ تا ۴۶۹

موجودہ دور میں یہودیوں کی سازش، براہِ راست مقابلہ ہی سے سازش کا خاتمہ ہوگا۔ ۴۷۰

مقامات

بدیدون

ایک چشمہ کا نام ۳۲۸

جنّت

پرہیزگار جنّت کے باغوں میں ۲۰۰

جو اپنے پروردگار سے ڈرے، اس کے لیے جنّت کے دو باغ ۲۵۴

اہلِ جنّت بہشت کی راحتوں میں ۲۸۶

جہنّم

جس دن جہنّم کی آگ میں گرائے جائیں گے۔ اب جہنّم کی آگ کا مزہ چکھو۔ ۱۹۹

حجر

حجر (قومِ ثمود کی بستی) حجاز کے شمال میں واقع ہے۔ ۱۸۴

دارالندوہ

سردارِ قریش قصی بن کلاب کا گھر جہاں مشورہ کے لیے عرب اکٹھے ہوتے تھے۔ ۵۴

عالمِ برزخ

محتضر کو جو حالات درپیش ہوں گے، روح و ریحان یا دردناک سزائیں، ان میں ایک حصّہ کا قیامت اور دوسرے کا قبر و برزخ سے تعلق ہے۔ ۳۲۴، ۳۲۵

عسقان

مکّہ کے قریب ایک مقام ۳۵۹

قدید

سرزمینِ قدید میں جنگِ بنی مصطلق واقع ہوئی ۶۲۵

قشیرہ

وہ علاقہ جہاں بدیدون کا چشمہ واقع ہے ۳۲۸

ث

مصباح القرآن ٹرسٹ

ایک تعارف

قرآن آئینِ اسلام، فرد اور معاشرے کی بہترین سعادت کا حامل دستورِ الٰہی، مسلمانوں کا فخر اور ہر معنی میں عظمت و صداقت کا معجزہ ہے۔ قرآن کے بغیر مسلمان اور اسلامی معاشرے کا کوئی تصوّر نہیں۔

قرآن کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے معلّم خود رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی ذاتِ پاک ہے۔ اپنے بعد اُمّت کو نہجِ اسلام پر باقی رکھنے کے لیے بھی پیغمبرِ خدا نے رہنمائی فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

" انّی تارك فیکم الثّقلین کتاب اللّٰہ و عترتی اھل بیتی ما ان تمسکتم بھما فلن تضلّوا بعدی۔"

ترجمہ: " مَیں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت اہلِ بیت۔ اگر تم ان دونوں کے دامن سے وابستہ رہے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہیں ہوگے۔"

اس بنیادی فکر کے پیشِ نظر " **مصباح القرآن ٹرسٹ** " کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اسی فکر کے تحت "ٹرسٹ" نے اب تک جو کُتب شائع کی ہیں، ان کی فہرست پیشِ خدمت ہے۔

(ادارہ)

یه کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ھیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ھیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

التماس سورہ فاتحہ برائے تمام مرحومین

۱] شیخ صدوقؒ
۲] علامہ مجلسیؒ
۳] علامہ اظہر حسین
۴] علامہ سید علی نقی
۵] بیگم و سید عابد علی رضوی
۶) بیگم و سید احمد علی رضوی
۷) بیگم و سید رضا امجد
۸) بیگم و سید علی حیدر رضوی
۹) بیگم و سید سبط حسن
۱۰) بیگم و سید مردان حسین جعفری
۱۱) بیگم و سید جبار حسین
۱۲) بیگم و مرزا توحید علی
۱۳) سید حسین عباس فرحت
۱۴) بیگم و سید جعفر علی رضوی
۱۵) سید انعام حسین زیدی
۱۶) سیدہ نماز بیرہ
۱۷) سیدہ رضویہ خاتون
۱۸) سید نجم الحسن
۱۹) سید مبارک رضا
۲۰) سید تہنیت حیدر نقوی
۲۱) بیگم و مرزا محمد ہاشم
۲۲) سید باقر علی رضوی
۲۳) بیگم و سید باسط حسین
۲۴) سید عرفان حیدر رضوی
۲۵) بیگم و اخلاق حسین
۲۶) سید ممتاز حسین
۲۷) بیگم و سید اختر عباس
۲۸) سید محمد علی
۲۹) سیدہ رضیہ سلطان
۳۰) سید مظفر حسنین
۳۱) سید باسط حسین نقوی
۳۲) غلام محی الدین
۳۳) سید ناصر علی زیدی
۳۴) سید وزیر حیدر زیدی
۳۵) ریاض الحق
۳۶) خورشید بیگم